
سسپنس ڈائجسٹ کا مقبول سلسلہ
موت کا سوداگر
1
پہلا حصہ

عرض ناشر

''موت کے سوداگر'' کتابی شکل میں پیش خدمت ہے۔ ڈائجسٹوں میں اب تک جو سلسلے وار کہانیاں شائع ہوئی ہیں ان میں ''دیوتا'' کے بعد یہ سب سے طویل سلسلہ ہے اور مقبولیت میں سب سے آگے ہے۔

کافی عرصے سے قارئین کی یہ خواہش تھی کہ اس کہانی کو کتابی شکل میں شائع کیا جائے لیکن پچھلے چند سالوں سے کتابوں کی اشاعت پر جو بحران آیا ہوا ہے اس کی وجہ سے نئی کتابوں کی اشاعت سراسر گھاٹے کا سودا ہے۔ کاغذ کی منگائی اور چھپائی وبائنڈنگ کے ہوشربا نرخ تو کتابوں کی اشاعت میں مانع تھے ہی کہ ڈاک خانے والوں نے بھی ڈاک کے اخراجات بے تحاشا بڑھادیے۔ مزید ستم یہ ڈھایا کہ 2 کلو سے بڑے پیکٹ بک پوسٹ کے ذریعے نہیں بھیجے جاسکتے (حالانکہ اخبارات اور رسالوں پر ایسی کوئی پابندی نہیں ہے) جس کی وجہ سے کتابوں کا ''بھیجنا'' بھی ناممکن ہوگیا۔

ان حالات کی وجہ سے بے شمار ادارے بند ہوچکے ہیں اور باقیہ بھی سسک رہے ہیں۔

کتابیات پبلی کیشنز بھی پچھلے کئی سالوں سے اس گرداب میں پھنسا ہوا ہے اور نئی کتابوں کی اشاعت بالکل بند کررکھی ہے۔

چونکہ ایک عرصے سے قارئین کا اصرار تھا کہ **''موت کے سوداگر''** کتابی شکل میں شائع کی جائے اور یہ کہانی اس قدر منفرد، دلچسپ اور مقبول ہے کہ نفع نقصان سے ماورا اس کی اشاعت ادارے کے لئے باعث افتخار ہے۔ بلاشبہ یہ ادارے کی گڈول میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔

اس کہانی کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ اس کے مصنف اقلیم علیم ہیں جو کہ محدود رسائل میں لکھتے ہیں اور کم لکھتے ہیں لیکن جو بھی لکھتے ہیں، خوب لکھتے ہیں۔ ان کی ہر تحریر مقبولیت کے ریکارڈ قائم کرتی ہے۔

اس کہانی کی اب تک جو اقساط شائع ہوچکی ہیں وہ تقریباً 13- 14 حصوں میں آئیں گی مزید اقساط جیسے جیسے سسپنس میں شائع ہوتی رہیں گی کتابی شکل میں پیش کی جاتی رہیں گی۔

ہمیں امید ہے کہ کہانی کی اس کتابی شکل کو قارئین پذیرائی بخشیں گے۔ پذیرائی بخشنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ آپ اس کتاب کو خرید کر پڑھیں، مانگ کر نہیں۔ آپ کے اس عمل سے ہمارا حوصلہ بڑھے گا اور ہم مزید اچھے اچھے سلسلے آپ کی خدمت میں پیش کریں گے۔

''موت کے سوداگر'' کے بعد عنقریب ہم ماہنامہ سرگزشت کی مقبول سلسلے وار کہانی ''تاوان'' بھی کتابی شکل میں پیش کریں گے۔

مخلص

اعجاز رسول

27/10/98

ایک نوجوان کی خودنوشت، جو اپنوں کے ہاتھوں برباد ہوکر منزل کا نشان کھو بیٹھا تھا۔ اُن نوجوانوں کی داستانِ عبرت جن کی پرورش رشوت کے مال سے ہوئی تھی۔ اُن زرپرستوں کا احوال جنہیں سونے چاندی کی خیرہ کُن چمک نے بینائی سے محروم کردیا۔ موت کے اُن سوداگروں کا ماجرا جو اپنے بچوں کو اپنے ہی ہاتھوں زہر پلا رہے ہیں۔

سسپنس کا ایک تعمیری سلسلہ ہوشمندوں کی کہانی ناہوشمندوں کی عبرت کے لیے

موت کے سوداگر

اقلیم علیم

ہم تینوں وسیع و عریض مکان سے ملحق سرسبز لان پر بیٹھے کافی پینے میں مصروف تھے اور ہم سے کچھ دور پورچ کے کنارے ایک ملازم مستعد کھڑا ہوا تھا کہ ہم میں سے کسی کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو وہ فوری طور پر فرمائش کی تکمیل کرسکے۔

پورچ میں آگے پیچھے ہم تینوں کی گاڑیاں موجود تھیں۔ ہمارے علاوہ وہاں ملازمین بھی موجود تھے لیکن اس کے باوجود پوری عمارت پر ایک پُرہول سا سناٹا طاری تھا جو ہمیشہ سے جیوا ہاؤز کا طرۂ امتیاز رہا تھا لیکن اس وقت وہ سناٹا مجھے کاٹ رہا تھا۔ کوئی اجنبی وہاں آجاتا تو اسے سب سے پہلے یہی احساس ہوتا کہ اس عمارت میں کوئی سنگین واردات رونما ہوچکی ہے یا ہونے والی ہے اور آنے والے لمحوں کی اس دہشت نے عمارت کے باسیوں سے خوشی کی ہر امنگ چھین لی ہے۔

"باقاعدہ اجلاس نہ ہوتا تو اسکاچ کا ایک دور ضرور چلتا!" میں نے ماحول کے بوجھل پن کو دور کرنے کے لیے دعوت آمیز لہجے میں کہا۔

"نہیں بابا!" طارق بوکھلا کر بولا۔ "جہانگیر ڈسپلن کے معاملے میں بہت سخت ہے۔ اسے شبہ بھی ہوگیا تو بس بپھر ہی جائے گا۔"

نادر نے اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی اور بید کی کرسی میں پہلو بدلتے ہوئے الجھن آمیز لہجے میں بولا۔ "پتا نہیں، وہ کہاں رہ گیا چھ بجنے والے ہیں۔"

"نہ ایک منٹ آگے، نہ پیچھے۔ وہ وقت کا پابند ہے، ٹھیک چھ بجے ہی آئے گا۔" طارق نے غیرارادی طور پر اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ "ابھی تو دو منٹ باقی ہیں۔"

میں طارق کی طرف متوجہ ہوگیا اور چند ثانیوں تک پُرخیال انداز میں اس کی آنکھوں میں دیکھتے رہنے کے بعد بولا۔ "میرا خیال ہے کہ وہ ہم سے بھاگتا ہے۔ ہمارے ساتھ کم سے کم وقت گزارنے کی کوشش کرتا ہے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" طارق نے اعتراف کیا۔ "وہ ہم سے الگ تھلگ رہنے کی کوشش کرتا ہے شاید اس لیے کہ وہ ہمارا سربراہ ہے۔"

"سربراہ ہونے سے پہلے وہ ہمارا دوست ہوا کرتا تھا۔" میں نے انھیں یاد دلایا۔ "لیکن اب یاری دوستی کو وہ بالکل فراموش کر بیٹھا ہے۔ میرا بس چلے تو اسے ہلکی سی سرزنش ضرور کروں تاکہ اسے ماضی کے رشتے یاد آجائیں۔"

"سرزنش!" نادر خان یوں ہنسا جیسے میں نے کوئی احمقانہ بات کہہ دی ہو۔ "مگر کس بنا پر؟ محض اس لیے کہ اجلاسوں میں وہ عین وقت پر پہنچتا ہے، ہم سے گپ شپ میں وقت برباد نہیں کرتا اور میٹنگ ختم ہوتے ہی واپس چلا جاتا ہے؟"

"مشکل یہی ہے۔" طارق گہرا سانس لے کر بولا۔ "اس کا رویّہ ہمیں ضرور چبھتا ہے لیکن اس کی کسی کوتاہی کی نشاندہی نہیں کی جاسکتی۔ ہم اس کے بارے میں صرف اسی قدر جانتے ہیں جتنا کام کی حد تک ہمارے سامنے آتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس کے سر پر اور بھی فکریں سوار

رہتی ہوں۔"

عین اسی وقت سیاہ رنگ کی ایک دمکتی ہوئی سیلون کار کھلے ہوئے پھاٹک میں داخل ہوئی اور پورچ میں پہلے سے موجود گاڑیوں کے پیچھے رُک گئی۔

میرے ساتھ ان دونوں نے بھی بیک وقت اپنی رسٹ واچز پر نگاہیں ڈالیں اور ان کے چہروں پہ مایوسی پھیل گئی کیونکہ جہانگیر روایت کے مطابق بروقت پہنچا تھا۔

میں انھیں چھیڑ ضرور رہا تھا لیکن ڈسپلن کا بہت زیادہ خیال رکھتا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میں نے کرسی چھوڑ دی اور ان دونوں نے بھی میری تقلید کی۔ ہم لان سے برآمدے میں پہنچے تو دراز قامت جہانگیر بھی لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہم سے آن ملا۔

"ہیلو ایوری باڈی!" اس نے ہاتھ لہرا کر خوش دلی سے کہا۔ وہ دونوں اخلاقاً مسکرائے اور میں نے دل پر جبر کرکے ہونٹوں کو قدرے پھیلا لیا۔ اس کی طرف سے بڑے پن کا اظہار مجھے ہمیشہ سے کھلتا تھا۔ وہ ہم میں سے تھا۔ بُرے دنوں میں ہم چاروں ہم نوالہ اور ہم پیالہ رہے تھے لیکن ہم سے اپنے احکامات کی تعمیل کراتے کراتے وہ خودسر سا ہوگیا تھا جیسے پیدائشی طور پر وہ ہم پر مسلط رہا ہو۔

عمارت کے داخلی دروازے پر دو قوی الجثہ اور مضبوط آدمی مجسموں کی طرح ایستادہ تھے۔ ان کے ہاتھ جیبوں میں تھے جو بادی النظر ہی میں پھولی ہوئی اور وزنی محسوس ہو رہی تھیں لیکن ہم میں سے کسی کے لیے بھی وہ نئی بات نہیں تھی لہٰذا ہم سب ان کے قریب سے گزر کر اس پرشکوہ عمارت میں داخل ہوگئے۔

داخلی ہال میں جہانگیر ہم سے آگے ہولیا جیسے ہمارے لیے وہ عمارت اجنبی رہی ہو۔ میں نے دل ہی دل میں اسے ایک گندی سی گالی دی لیکن عملاً ایک مجبور مقتدی کی طرح اس کے پیچھے نادر اور طارق کے ساتھ چلتا ہوا چند راہداریوں سے گزرنے کے بعد جیوا ہاؤز کے اس مخصوص کمرے میں پہنچ گیا جہاں ایک بڑی سی میز کے گرد صرف چار ہی کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔

سب کی نشستیں مخصوص تھیں لہٰذا ہر ایک نے کسی تکلف یا اہتمام کے بغیر اپنی جگہ سنبھال لی۔

"تمھاری وجہ سے یہ اجلاس ڈیڑھ منٹ کی تاخیر سے شروع ہو رہا ہے۔" اپنی نشست سنبھالنے کے بعد میں نے اپنی رسٹ واچ دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے جہانگیر کو مخاطب کیا۔

"مجھے جتانے کی ضرورت نہیں ڈینی!" اس کا لہجہ خشک اور سنجیدہ تھا۔ "چھ بجے ہمیں یہاں پہنچنا تھا اور میں بروقت آگیا تھا۔ اجلاس کی ابتدا یا انتہا کے بارے میں کسی کو مجھے بتانے کی ضرورت نہیں میں اپنی ذمّے داریاں خوب جانتا ہوں۔"

اس کا جواب ضرورت سے زیادہ تلخ تھا لیکن وہ جو کچھ کہہ رہا تھا، بظاہر درست ہی تھا۔ مجھے مجبوراً خاموشی اختیار کرنا پڑی اور میں اپنی جیب ٹٹول کر اپنے دل کو تسلی دینے میں مصروف ہوگیا۔

کمرے کی فضا پر سکوت طاری رہا۔ نادر اور طارق جہانگیر کی طرف دیکھ رہے تھے اور وہ بے پروائی کے ساتھ سگریٹ سلگانے میں مصروف تھا۔

"کچھ عرصے سے ہماری سرگرمیاں مسلسل روبہ زوال ہیں۔" جہانگیر نے سگریٹ کا گہرا کش لے کر دھواں فضا میں بکھیرتے ہوئے کہا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے ایک ایک لفظ سوچ کر بول رہا ہو۔ میرا جی چاہا کہ کھل کر اس اجلاس کا مقصد بیان کرکے اس کا بھرم توڑ دوں لیکن میرے لیے اپنے ہی بنائے ہوئے اس حصار کو توڑنا ممکن نہیں تھا۔ معاملات کی باگ ڈور بظاہر اس کے ہاتھ میں تھی اور مجھے ایک معمولی ماتحت کی طرح اس کی کہی ہوئی ہر بات پر توجہ دینی تھی۔

"چھوٹے چھوٹے گروپ ٹریڈ میں آگئے ہیں۔" نادر خان مدافعانہ لہجے میں کہہ رہا تھا۔ "وہ جس مارجن پر کام کر رہے ہیں وہ ہمارے لیے ناقابلِ قبول ہے۔ ہم نے مجبوراً اپنی سرگرمیاں محدود کی ہیں کیونکہ ہم پالیسی سے انحراف نہیں کرسکتے....."

"لوگوں کو راستے سے....." میں نے بولنا چاہا لیکن جہانگیر شاید اس روز خاص طور سے میری کاٹ پر تُلا ہوا تھا۔ وہ میرا فقرہ پورا ہونے سے پہلے ہی بول پڑا۔

"جو ہوچکا اسے بھول جاؤ۔" غنیمت یہ تھا کہ اس بار اس کا لہجہ نرم ہی تھا۔ "ہم یہاں گڑے مردے اکھاڑنے کے لیے جمع نہیں ہوئے۔"

"میں اس میٹنگ کی وجہ جاننے کا منتظر ہوں۔" اس کے خاموش ہونے پر میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

"ہمیں کام آگے بڑھانا ہے۔" جہانگیر نے باری باری ہم میں سے ہر ایک کا جائزہ لیتے ہوئے پُرعزم لہجے میں جواب دیا۔

"لیکن طریقہ؟" نادر خان نے دلچسپی کے ساتھ سوال کیا۔ "اس وقت بھی شہر کے صرف وہی اڈے ہم سے مال لے رہے ہیں جنھیں تھوڑے سے داموں کے مقابلے میں اپنی ساکھ اور راز داری زیادہ عزیز ہے۔"

"ہم ایک نئی چیز بازار میں لائیں گے۔" جہانگیر کا لہجہ تجسس آمیز تھا۔

"افیم، چرس، شراب، عرق، حشیش، مارفین اور پیتھیڈین سب ہی بازار میں ہیں۔" طارق نے پہلی بار زبان کھولی۔ "دلیسی مال کی بھی سیکڑوں قسمیں ہیں....."

"صرف بیس کے نام گناتے چلو۔" جہانگیر نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ اس کا لہجہ سراسر تادیبی تھا۔

"اوہ سوری۔" طارق معذرت خواہانہ لہجے میں جلدی سے بولا۔ "وہ تو میں نے ایسے ہی کہہ دیا تھا۔"

"جب کہنے کے لیے کچھ نہ ہو تو خاموش رہنا بہتر ہوتا ہے۔"

جہانگیر غرایا۔

"لہجہ قابو میں رکھو۔" اس بار میں خاموش نہ رہ سکا۔ "طارق محاورۃً کہہ رہا تھا۔"

"تمھیں دخل اندازی کی ضرورت نہیں۔" جہانگیر بگڑ گیا۔ "یہ میری اور طارق کی بات ہے۔"

میں نے بے پروائی سے شانے اُچکائے اور اسی لہجے میں بولا۔ "پھر ہمارا یوں جمع ہونا شاید بے سود ہے۔ ہم باہمی افہام و تفہیم کے لیے جمع ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کی غلطیوں کی نشاندہی ہمارا بنیادی فرض ہے جس سے روگردانی نہیں کی جاسکتی۔"

"خاموش رہو۔" وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ اس کی آواز سے غراہٹ ختم ہوگئی تھی لیکن لہجے میں تلخی بدستور باقی تھی۔ "مجھے سبق پڑھانے کی ضرورت نہیں۔ یہ نہ بھولو کہ میں تم لوگوں کا سربراہ ہوں۔"

"میں مانتا ہوں۔" میں نے سینے پر ہاتھ رکھ کر سر کو قدرے خم دیتے ہوئے گہری سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "مگر مائی ڈیئر سربراہ! اپنی سربراہی کا وقار قائم رکھو۔ تم کسی پرائمری اسکول کے ہیڈ ماسٹر نہیں ہو۔"

"بزنس میٹنگ میں ہمیں ذمّے داری کے ساتھ حصہ لینا چاہیے۔" اس نے قدرے توقف کے بعد دھیمی آواز میں کہا۔ "بے تُکی باتیں وقت برباد کرتی ہیں۔"

"ہم میں سے کوئی بھی دانستہ وقت ضائع نہیں کرتا۔" میں نے بھی مصالحانہ لہجہ اختیار کرلیا۔ "اصل بات یہ ہے کہ جب ہم ایک دوسرے کی نیت پر اعتماد کرتے ہیں تو ہمیں آپس میں طنز اور تضحیک کا رویہ اختیار نہیں کرنا چاہیے۔"

"چھوڑ دیار!" طارق مجھ سے مخاطب ہوکر بولا۔ "چھوٹی موٹی باتوں کی تو اب عادت سی ہوگئی ہے۔ میں کسی کی بات کا بُرا نہیں مانتا۔"

"میں بھی جھگڑا نہیں کر رہا۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "تم بہت فراخ دل ہو، تمھیں کوئی بات بُری نہیں لگتی لیکن مجھے یا نادر کو بُرا محسوس ہوسکتا ہے۔ میں پہلے بھی کئی بار زبان کھولتے کھولتے خاموش رہ گیا۔ ہم نے باہمی اعتماد کی فضا برسوں میں قائم کی ہے اور میں اسے برقرار دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"گویا گروپ کا سارا درد تمھارے جگر میں ہے۔" جہانگیر غصّے کے باوجود بے بسی کے ساتھ ہنس پڑا۔ "میں معاملات کو بگاڑ رہا ہوں؟"

"یہ منصب میرے پاس بھی رہا ہے۔" میں نے اسے یاد دلایا۔ "میں جو کچھ کہتا ہوں نیک نیتی کے ساتھ کہتا ہوں۔"

جہانگیر میرے چبھتے ہوئے ریمارک پر بل کھا کر رہ گیا مگر مُنہ سے کچھ نہ بولا۔

"شاید تم کسی نئی چیز کا ذکر کرنے والے تھے۔" نادر خان نے کہا۔ وہ بہت زیرک آدمی معلوم ہوتا تھا اور تلخیوں کو بروقت ٹالنے میں خاصا ماہر تھا۔

"نئی چیز۔" جہانگیر اپنی جھلاہٹ کو پُرخیال لہجے میں چھپاتے ہوئے بڑبڑایا۔ "ہیروئن ہماری منڈی کے لیے ایک اچھوتی چیز ہوگی۔"

"لیکن یہ نام تو نیا نہیں ہے۔" طارق نے مدافعانہ لہجے میں کہا۔

"ہاں۔" جہانگیر نے پہلی بار اس پر کسی برہمی کا اظہار کیے بغیر کہا۔ "لیکن مقامی ٹریڈ کے لیے یہ نام تقریباً نیا ہے۔ ہیروئن جہاں جہاں پہنچی اس کی بے پناہ مانگ ہے لیکن اس کی رسد ناقابلِ ذکر ہے۔ اس کی عالمی ڈیمانڈ اور سپلائی میں ایک زبردست خلا ہے پھر ہماری منڈی کے لیے یہ اچھوتی چیز ہوگی۔ اس کے مُنہ مانگے دام ملیں گے۔"

"مُنہ مانگے دام۔" نادر خان کہنیوں کے بل میز پر آگے جھک آیا۔ "تم جانتے ہو کہ ہمارے یہاں نشہ کرنے والے معاشرے کے کس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں؟"

"ہمارا معاشرہ آسمان سے نہیں اُترا نادر خان!" جہانگیر نے سگریٹ کا گہرا کش لے کر کہا۔ "امریکہ کے خوشحال گھرانوں سے بنگلہ دیش کے ننگے بھوکے دہقانوں تک وہی لوگ منشیات کا سہارا لیتے ہیں جو ناآسودہ ہوں۔ مغرب میں محرومی کا احساس کچھ اور ہے، یہاں کچھ اور۔ عسرت زدہ طبقے کے لوگ کچھ دیر کے لیے خیالی جنت خریدنے کے لیے زیادہ فیاضی سے خرچ کرتے ہیں۔"

"مگر یہاں سستے نشے باآسانی دستیاب ہیں، لوگ انھیں استعمال کر رہے ہیں، انھیں سستی چیزوں سے ہٹا کر ادھر راغب کرنا اتنا آسان نہ ہوگا۔" نادر خان نے کہا۔

جہانگیر معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ "میری باقاعدہ بریفنگ ہوئی ہے، مجھے کامیابی کا پورا یقین ہے۔ شاید تمھیں سمجھانا میرے لیے دشوار ثابت ہو۔"

"مگر ہم بتدریج الگ ہوتے ہوتے دوبارہ کیوں اس طرف راغب ہوں۔" میں نے اعتراض کیا۔

"اس لیے کہ یہ ہماری ضرورت ہے۔" جہانگیر نے براہِ راست میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مضبوط لہجے میں کہا۔

"نہیں۔" میں نے اپنے سر کو نفی میں جنبش دی۔ "میں نہیں مانتا، آج کے حالات بہت مختلف ہیں۔ ہم خاصے ذرائع کے مالک ہیں، ان چکروں میں پڑے بغیر بھی اپنی ضروریات اور ذمّے داریاں آسانی سے پوری کرسکتے ہیں۔"

"تم شاید سات برس پہلے کے حالات سے آج کا موازنہ کر رہے ہو۔" جہانگیر کے لبوں پر زہر خند ابھر آیا۔ "اس وقت ہم سب بے سروسامان تھے، ہم نے اپنی خوشی سے یہ دھندا شروع کیا اور آج ہم اس پر مجبور ہیں۔"

"تو یہ اُوپر کی تجویز ہے؟" میرا لہجہ یک بیک بے جان ہوگیا۔

"میں اتنا حریص نہیں ہوں۔" جہانگیر کی آواز سپاٹ تھی۔" اس کرسی پر بیٹھ کر میں کسی کی نمائندگی کرتا ہوں۔ اس کے حکم کی خود تعمیل کرنا اور تم سے کرانا میری ذمے داری ہے۔"

"اس کے لیے تو کسی بحث کی ضرورت ہی نہیں تھی۔" میری آواز میں شکست اور بے بسی کے اثرات سمٹ آئے اور میں کرسی کی پشت گاہ سے ٹک گیا۔

"غلطی تم تینوں کی ہے کہ میری بات پوری ہونے سے پہلے اپنے اعتراضات لے بیٹھے۔" جہانگیر کے لہجے میں تھوڑا سا غرور سمٹ آیا۔" ہمیں یہاں ہیروئن کی مارکیٹ پیدا کرنی ہے۔"

"ٹارگٹ کیا ہے؟" نادر خان نے سوال کیا۔

"تین کروڑ سالانہ خالص منافع دینا ہے اور وہ بھی فی الحال۔" جہانگیر نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر صاف آواز میں کہا۔

تینوں کے منہ سے تحیّر آمیز آوازیں نکل پڑیں۔

"اسٹاک میں جو کچھ موجود ہے اسے فوراً تلف کرادو۔" جہانگیر کہتا رہا۔" میرے پاس سیمپل آگئے ہیں، ایک ہزار پیکٹ مارکیٹ میں کھلبلی مچا دیں گے۔"

"اسٹاک اونے پونے نہ بیچ دیا جائے؟" نادر خان نے سوال کیا۔

"میں شاید اسی لیے تم لوگوں کا سربراہ بنایا گیا ہوں کہ اتنی بات میں بغیر کسی وضاحت کے سمجھ گیا تھا۔" جہانگیر ہنس کر بولا۔" مجھے معلوم ہے کہ تمھارے پاس خاصا اسٹاک ہے۔ تم ناک کے سامنے دیکھتے ہو لیکن اوپر والے لمبی منصوبہ بندی کرتے ہیں۔ ہم لوگ مارکیٹ میں مال نہیں دیں گے تو دوسروں کو کمانے کا موقع ملے گا، قحط میں دام بڑھا دیں گے۔ گاہک بوکھلا جائیں گے اور کوئی توڑ تلاش کریں گے۔ ادھر تمھارے آدمی مفت اور سستے داموں سیمپل لے کر نکل پڑیں گے۔ انھیں ہر طرف ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔ تجربہ بتاتا ہے کہ ہیروئن نئے آدمی کو چھ سات دن میں اور پرانے نشہ باز کو محض چار دن میں اپنا عادی بنا لیتی ہے۔۔۔۔"

"اور اس وقت تک ہمارے پاس کمرشل لاٹ آچکی ہوگی جسے بازار میں ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔" طارق تحسین آمیز لہجے میں بولا۔

"مال ہاتھ کھینچ کر دیا جائے گا۔" جہانگیر دھیمی آواز میں بولا۔ "ایک دفعہ مارکیٹ پیدا ہو جائے تو ہر ایک مال مانگے گا مگر ہم داموں کو اپنی سطح پر لے جانا ہے۔"

"مشکل یہ ہے کہ ایکسپورٹروں سے ہمیں رابطہ قائم کرنے کی اجازت نہیں ورنہ ہم چرس کا اسٹاک ضائع کرنے کے بجائے انھیں فروخت کر سکتے ہیں۔ مالی نقصان سے بھی بچ جائیں گے اور مقامی مارکیٹ بحران کی زد میں آجائے گی۔ سانپ بھی مر جائے گا اور لاٹھی بھی سلامت رہے گی۔" نادر خان اس صریح نقصان سے ہر صورت میں بچنا چاہ رہا تھا۔

"اوپر والے مال واپس لے کر خود بھی اس کی بیرون ملک نکاسی کا بندوبست کر سکتے تھے مگر وہاں سے براہ راست اتلاف کا حکم ملا ہے۔"

"لمبا کھیل ہے۔" میں بڑبڑایا۔" میں اب کچھ کچھ سمجھ چلا ہوں، ہمارے پاس کراچی اور مضافات کی چار ماہ کی ضروریات کا ذخیرہ ضرور ہوگا، اس کی تباہی کا مطلب ہے کہ اوپر والے عالمی مارکیٹ کا بھی جائزہ لے چکے ہیں، ادھر بحران آیا تو پہلے ہی ہلّے میں وارے کے نیارے ہو جائیں گے۔"

"اوہ خدایا!" نادر اپنی پیشانی رگڑتے ہوئے بولا۔" ضرور یہی بات ہے، ضرور یہی بات ہے۔ اوپر جو فیصلہ ہوتا ہے بہت سوچ سمجھ کر ہوتا ہے، ہمارے لیے اس میں سر کھپانا بے سود ہے بس جو حکم ملے آنکھیں بند کر کے اس پر عمل کرنا چاہیے۔"

"آنکھیں بند کر کے نہیں، آنکھیں کھول کر مائی ڈیئر نادر خان!" جہانگیر نے قہقہہ لگاتے ہوئے کرسی چھوڑ دی اور ہم تینوں بھی اُٹھ گئے۔

جہانگیر کرسی سے اُٹھ کر سیدھا ایک قدِ آدم فولادی تجوری کی طرف گیا۔ میں ٹہلتا ہوا جہانگیر کی کرسی کی طرف آیا پھر میرا داہنا ہاتھ پھُرتی سے جیب سے باہر آگیا، نادر خان طارق سے کچھ بات کرنے میں منہمک تھا۔ وہ دونوں کچھ اس طرح کھڑے تھے کہ ان کی توجہ میری طرف نہیں تھی اور جہانگیر ہماری طرف پشت کیے تجوری کھولنے میں مصروف تھا۔

میں گرد و پیش کا جائزہ لے کر پھُرتی سے نیچے جھکا اور پھر بجلی کی سی سرعت سے میرا داہنا ہاتھ میز کے نیچے رینگ گیا۔

لحظہ بھر بعد میں ٹہلتا ہوا ان دونوں کے قریب پہنچا تو نہ صرف میرے ہاتھ خالی تھے بلکہ جیب بھی قدرے ہلکی ہو چکی تھی۔

"ڈینی ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔" نادر خان پُرجوش لہجے میں طارق سے کہہ رہا تھا۔" معلوم ہوتا ہے کہ چرس کے بعد اب ہیروئن کا طوفان آنے والا ہے۔ اوپر جو لوگ بھی ہیں وہ واقعی بیدار مغز ہیں۔ چرس کا مقابلہ بڑھ گیا تو ہیروئن لے آئے لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ مال کہاں سے آئے گا۔ ویسے وہ کمانے کے فن میں طاق معلوم ہوتے ہیں منصوبہ بنایا ہے تو مال بھی فراہم کریں گے۔"

"چلو اب تک ہیروئن کا نام ہی نام سنتے رہے ہیں اب اس کا دھندا بھی کرلیں گے۔" طارق نے خوش دلی کے ساتھ کہا۔

اس اثنا میں جہانگیر نے فولادی تجوری سے پولی تھین کے تین ہلکے پھلکے تھیلے نکال لیے تھے جن کے حجم کے مقابلے میں وزن نہ ہونے کے برابر معلوم ہو رہا تھا۔

"یہ کسی حساب میں نہیں ہوں گے۔" جہانگیر نے ایک ایک تھیلا ہمارے سپرد کرتے ہوئے کہا۔ پھر خاص طور پر نادر خان کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔" چرس کا سارا اسٹاک فوراً ضائع کرنا ہوگا۔ اس کے لیے سمندر سب سے بہتر رہے گا۔ اوپر والوں کو ہماری پل پل کی خبر رہتی ہے۔ یہ کام پہلی فرصت میں ہونا چاہیے۔ جس نے بھی لالچ کیا وہ خود جوابدہ ہوگا

اور بے موت مارا جائے گا۔"

"تم فکر نہ کرو، جو بات طے ہوگئی اس پر حرف بہ حرف عمل ہوگا۔" نادر خان نے پوری سنجیدگی کے ساتھ اسے یقین دلایا اور تھیلے میں بھری ہوئی پڑیوں کا جائزہ لینے لگا۔

"کھلے بازار کے علاوہ یونیورسٹی اور کالجوں کو نہ بھولنا۔" جہانگیر نے چونک کر کہا جیسے اسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آگئی ہو۔" آج تک کسی نے بھی ان اداروں پر براہ راست توجہ نہیں دی ہے۔ اس محاذ پر منظم طریقے سے محنت کی گئی تو کامیابی کے روشن امکانات ہیں۔"

"یہ کام میں کروں گا۔" طارق نے پیشکش کی۔" پارٹ ٹائم کی ملازمت کی تلاش میں بہتیرے طالب علم میرے پاس آتے رہتے ہیں۔ اس وقت بھی ایک لڑکا کام کر رہا ہے، اسی کو ٹٹولنے سے ابتدا کروں گا۔ وہ شاید یونیورسٹی میں پڑھتا ہے۔"

"تم لوگ جس طرح چاہو کام کرو لیکن یہ خیال رہے کہ اوپر والوں کے نزدیک ساری اہمیت نتائج کی ہے۔" جہانگیر نے یاد دلایا۔" بے سود کوششوں پر کسی کی خوشنودی میسر نہ آسکے گی۔"

آپس میں باتیں کرتے ہم راہداری میں نکل آئے جس کے سرے پر جیوا ہاؤز کا وہ ملازم کھڑا ہوا تھا جس نے ہمیں لان پر کافی سرو کی تھی۔

نکاسی کے راستے پر دونوں محافظ بدستور اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈالے پتھر کے بے جان مجسموں کی طرح اٹل کھڑے ہوئے تھے جیسے انھیں اپنے فرائض کے علاوہ دوسری باتوں سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔

پھر چاروں گاڑیاں یکے بعد دیگرے وہاں سے روانہ ہوگئیں۔ میں گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے دل ہی دل میں اس سچویشن کے بارے میں سوچنے لگا جو جہانگیر سے فون پر میری گفتگو کے نتیجے میں پیدا ہو سکتی تھی۔

ہم میں سے کسی کا بھی ماضی قابلِ فخر نہیں تھا۔

جہانگیر اپنے زمانے کا چھٹا ہوا بدمعاش تھا۔ تین قتل اس کی ذات سے منسوب کیے جاتے تھے لیکن تمام تر شبہات کے باوجود کسی ایف آئی آر میں اس کا نام نہ آسکا۔ پولیس نے اپنی روایتی تفتیش کے دوران اسے حراست میں ضرور لیا لیکن جسمانی تشدد کا حربہ آزمانے کی جرأت کوئی نہ کرسکا۔ بدمعاشوں کے بارے میں خرابی یہی تھی کہ ان کا کینہ مثالی ہوتا تھا، شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہو کہ کوئی نامی گرامی شخص تھانے کی زیادتیوں کو قانونی تقاضے سمجھ کر خندہ پیشانی سے بھولا ہو اس لیے مار دھاڑ کے سارے پیشہ ورانہ نسخے چھوٹے موٹے چور اچکوں کے مقدر میں آتے تھے جن کے سنگدلانہ مظاہرے سے تھانے میں آپھنسنے والے شرفا عبرت پکڑتے تھے اور صاحبانِ قضا و قدر کے لہجوں میں تلخی پیدا ہونے سے پہلے ہی نذرانے کا اہتمام کر کے اپنی چمڑی سلامت نکال لے جانے کی فکر میں مبتلا ہو جاتے تھے۔

جہانگیر جاہل مگر دلیر آدمی تھا اور مجھ سے اپنی دوستی پر فخر کیا کرتا تھا۔ کراچی میں جب سے ہمارا ساتھ ہوا تھا ہم نے ہر اچھے بُرے موقع پر پوری طرح ایک دوسرے کا ساتھ دیا تھا۔

جہانگیر اکثر میرے عملی شعبدوں کے گن گاتا رہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ میں لااُبالی طبیعت کے باوجود اپنے کسرتی جسم کے ہر عضو سے پوری طرح کام لیتا ہوں۔ ذہانت، مکاری اور چرب زبانی کے سلسلے میں وہ تہ دل سے میری بالادستی کا قائل تھا کیونکہ اس کے برعکس مجھے کالج تک تعلیم حاصل کرنے کے مواقع ملے تھے جو میں نے اپنی الجھن کے سبب ضائع کر دیے اور کالج کی فضا میں ڈیڑھ سال گزارنے کے بعد کوئی سند لیے بغیر جرائم کی دنیا کی طرف چلا آیا۔

جہانگیر کی معرفت میں نادر خان اور طارق سے متعارف ہوا۔ نادر خان آزاد علاقے میں زرعی زمینوں کا مالک تھا جہاں بھنگ کاشت ہوتی تھی اور وہ اس سے اعلیٰ قسم کی چرس کشید کر کے سرحد پار فروخت کیا کرتا تھا۔ پھر اس کا دل اپنے افغان خریدار کی بھتیجی پر آگیا۔ وہ بہانے تراش کر بار بار اس کا مہمان ہونے لگا اور آخر لڑکی کو اپنی طرف مائل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

راز و نیاز بڑھتے رہے اور ایک رات نادر خان لڑکی کو ساتھ بھگا لایا۔ اسے معلوم تھا کہ اس طرح اس نے ایک دلیر خاندان کو اپنے لہو کا پیاسا بنا لیا ہے مگر وہ محبت میں اندھا ہو رہا تھا۔ لڑکی کو سیدھا کراچی لایا اور اس سے نکاح کرلیا۔

لڑکی کے مشتعل رشتے داروں نے نادر خان کے گاؤں پر دھاوا بول دیا۔ زبردست تصادم ہوا، فصلیں جلا دی گئیں، طرفین کے دو دو آدمی مارے گئے کئی مکان نذرِ آتش کر دیے گئے اور نادر خان ان حالات سے بے پروا ــــ کراچی میں روپوش ہو کر اپنی محبت کے تشنہ خوابوں کی تکمیل میں کھویا رہا۔ اثاثہ ختم ہونے کو آیا تو اس نے چرس فروشی کا سہل روزگار اختیار کرلیا۔

طارق بظاہر شریف اور سادہ لوح نظر آتا تھا لیکن اپنے دور کا کامیاب ترین جعل ساز تھا۔ اپنی لمبی لمبی ٹیڑھی میڑھی انگلیوں کی مدد سے پیچیدہ تحریر اور دستخطوں کی ایسی مکمل نقل کرتا تھا کہ اسے اصل سے الگ کرنا مشکل ہو جاتا تھا لیکن اسی کے ساتھ وہ کاہل الوجود بھی واقع ہوا تھا۔ ایک آدھ لمبا ہاتھ مار کر مہینوں عیش کرنے کا عادی تھا اور کمال کی بات یہ تھی کہ جعلسازی کے الزام میں کبھی نہیں پکڑا گیا تھا البتہ بظاہر کوئی روزگار نہ ہونے کے باوجود خوشحال زندگی گزارنے کی بنا پر دو بار چوری کے بے بنیاد شبہے میں حوالات کی سیر کر چکا تھا۔

لیکن ان تینوں کے برعکس میرا ماضی قابلِ فخر نہ ہونے کے باوجود المناک ضرور تھا۔

میں اپنے والد مرحوم کی دوسری بیوی کی اکلوتی اولاد تھا۔ میں نے جس عسرت زدہ اور پراگندہ گھریلو ماحول میں ہوش سنبھالا اس کی بنا پر ہمیشہ یہ سوچتا رہا کہ محدود ترین آمدنی اور چھوٹے سے بوسیدہ گھر کی موجودگی میں وہ کیا مجبوری رہی ہوگی جس کی بنا پر والد صاحب نے دوسری شادی کا فیصلہ کیا۔

سوتیلی والدہ کو میں نے ہوش سنبھلتے ہی بڑی ماں کہنا شروع کیا تھا۔ وہ بہت تند خو خاتون تھیں اور میری والدہ کے ساتھ ان کا رویّہ ہمیشہ جارحانہ رہا۔ یہی حال میرے دو سوتیلے بھائیوں کا تھا۔ وہ نہ میری والدہ کا احترام کرتے تھے اور نہ مجھے مُنہ لگاتے تھے۔ جب بھی زبردستی ان کے ساتھ کھیل کود میں شامل ہونے کی کوشش کی، حقارت سے دھتکار دیا گیا۔

آپس کی معرکہ آرائیوں اور دشنام طرازی کو والد صاحب کی محدود آمدنی سے شہ ملتی تھی۔ دو کمروں کے بوسیدہ سے مکان کی وجہ سے بھی امن وسکون کی فضا بمشکل برقرار رہ پاتی تھی۔

ایک چھت کے نیچے دو عورتوں کی موجودگی والد صاحب کو زیادہ عرصے تک راس نہ آسکی اور وہ ہمیں اپنا نوشتۂ تقدیر پورا کرنے کے لیے بے سہارا چھوڑ کر انتقال کر گئے۔ اس وقت میری عمر شاید چار سال کی تھی اور میں اپنی بیوہ ماں کی سسکیوں میں چھپا ہوا درد سمجھنے کے قابل نہیں تھا۔

بڑی ماں اور سوتیلے بھائیوں کی چیرہ دستیاں دن بدن بڑھتی رہیں۔ بڑی ماں میری والدہ کو اکثر نحوست کے طعنے دینے لگیں اور چند ماہ کی کوششوں کے نتیجے میں انھوں نے میدان اس حد تک ہموار کر لیا کہ ایک دن انھوں نے رُوح فرسا معرکے کے بعد میری روتی اور بلکتی ہوئی ماں کو گھر سے نکالا تو پاس پڑوس میں سے کوئی بھی مداخلت کی ہمّت نہ کر سکا۔

اس دن مجھے پتا چلا کہ ہم دونوں ماں بیٹے دنیا میں بالکل بے سہارا رہ گئے تھے۔ والدہ نے فوری طور پر اپنی ایک سہیلی کے گھر پناہ لی لیکن خود اس کا گھر بہت مختصر اور ناکافی تھا۔

خوش قسمتی سے ماں تعلیم یافتہ تھی اس لیے تھوڑی سی تگ و دو کے بعد ایک نوکری مل گئی جس کے سہارے سر چھپانے اور آتشِ شکم سرد کرنے کا بندوبست ہوگیا۔

ہنگامی ضرورت کے تحت ماں نے نئے محلے کی ایک عورت کو اپنی مُنہ بولی بہن بنا لیا اور مجھے اس کے بچوں کے ساتھ اسکول میں داخل کرا دیا۔ صبح ماں مجھے اسکول بھیج کر دفتر چلی جاتی۔ چھٹی کے بعد میں بچوں کے ساتھ محلّے والی خالہ کے گھر کھانا کھاتا اور شام کو ماں کی واپسی تک اسی کے گھر میں کھیلتا رہتا۔

اس وقت مجھے ماں کی زبانی پتا چلا کہ والد مرحوم ایک سرکاری دفتر میں معمولی سی ملازمت کرتے تھے لیکن وہاں رشوت کی آمدنی بے حساب تھی۔ والد صاحب سمجھتے تھے کہ وہ اسی کرسی سے ریٹائر ہوں گے لہٰذا کبھی بُرے وقت کے بارے میں نہیں سوچا، جو کماتے تھے، بیدردی سے خرچ کر دیتے تھے۔ اپنا بوسیدہ مکان کرائے پر دے کر خود اچھی آبادی میں ایک مکان کرائے پر لیا ہوا تھا۔ رشوت کی لائی خوشحالی نے انھیں احساس دلایا کہ پہلی بیوی اگر جاہل ہے تو اسے پڑھانے لکھانے کے مقابلے میں دوسری شادی آسان ثابت ہوگی اور یوں وہ میرے قریب المرگ نانا سے ان کی بیٹی کا رشتہ لینے پہنچ گئے۔ نانا کی صحت جواب دے چکی تھی۔ وہ مرنے سے پہلے بیٹی کے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتے تھے لہٰذا لوگوں سے والد صاحب کی آسودہ حالی کا ذکر سن کر رشتے پر آمادہ ہوگئے اور یوں قدرت نے میری ولادت کی داغ بیل ڈال دی۔

میری ولادت سے چند ماہ پہلے اچانک والد صاحب ایک شکنجے میں آگئے اور انھیں غیبی سہارے فراہم کرنے والی کرسی سے معزول کر کے ایک ایسی جگہ تعینات کر دیا گیا جہاں تنخواہ کے سوا کسی قسم کی کوئی اُمید نہیں تھی۔ والد صاحب بہت پریشان ہوئے لیکن خاصے دن کرائے کے مکان میں اس اُمید میں رہتے رہے کہ شاید کسی طرح دوبارہ پرانی کرسی پر بحال ہوسکیں اور جب اس زرخیز کرسی کے دوبارہ ملنے کی امید بالکل ہی ختم ہوگئی تو گھر کے ماحول میں تنگدستی کے آسیبی سائے منڈلانے لگے تھے جس کا اظہار اس چھت کے نیچے رہنے والی دو سوکنوں کی تلخ نوائیوں کے علاوہ آسائشوں میں کمی سے بھی ہوتا تھا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ کرائے کا مکان چھوڑنا پڑا اور والد صاحب کو اپنی دوہری ذمّے داریوں کے ساتھ اسی مختصر اور بوسیدہ چار دیواری میں پناہ لینی پڑی جسے اچھے دنوں میں بڑی ماں نے حقارت کے ساتھ انسانوں کے رہنے کے ناقابل بتانے کے باوجود ایک مجبور گھرانے کو کرائے پر دیا ہوا تھا۔

ماں کماتی رہی اور میں پڑھتا رہا۔ ماں کو میری تربیت کے بارے میں بہت فکر تھی کیونکہ اپنی ملازمت کی وجہ سے اس کا بیشتر وقت مجھ سے دور گزرتا تھا۔ جب بھی ہم یکجا ہوتے وہ اپنے عبرتناک ماضی کے حوالے سے مجھے اچھی اچھی نصیحت آموز کہانیاں سناتی لیکن ایسے موقعوں پر میرا ذہن عموماً کسی دھندلی سی دلدل میں ڈوبا رہتا۔

وقت گزرنے کے ساتھ معمول میں صرف اتنی تبدیلی آئی کہ اسکول سے میری واپسی اپنے گھر ہونے لگی۔ والد صاحب کی وفات کے صدمے سے ماں مدتوں بہت اُداس رہی۔ اکثر مجھے سینے سے لپٹا کر گھنٹوں رویا کرتی تھی۔ گھر میں ماں کی دلچسپی کا مرکز صرف میری ذات تھی۔ اسے مجھ پر ناز تھا۔ اس نے کم سنی ہی میں میری ذات سے مستقبل کے بہتیرے سنہرے خواب وابستہ کر لیے تھے۔ وہ باتیں کرتی۔ بعض باتیں میری محدود عقل میں نہ سماتیں تو میں سوالات کی یلغار کر دیتا اور وہ پیشانی پر شکن لائے بغیر میرے ہر سوال کا بے تکان جواب دیے جاتی۔ اس کی ساری گفتگو کا محور ایک ہی ہوتا تھا۔ بدی کتنی بھی سر چڑھ کر ناچے، اس کا انجام آخرکار عبرت ناک ہوتا ہے اور سچائی غالب آکر رہتی ہے۔

لیکن وہ کبھی نہ بتا سکی کہ سچائی کتنی دیر میں غالب آتی ہے۔

میری ذہنی تربیت کی یہ رفتار کچھ ایسی تھی کہ بچپن ہی میں میری شوخیاں سنجیدگی کی آغوش میں گم ہوگئیں۔ اپنے ہم سنوں کی باتیں مجھے سطحی اور بے مقصد معلوم ہونے لگیں اور میں ان کے بجائے بڑوں میں اپنا وقت گزارنے لگا کیونکہ ماں کی عدم موجودگی میں دن بھر مجھے کھلی آزادی ہوتی تھی۔

شعور بیدار ہونے کے ساتھ ایک سوال تسلسل کے ساتھ میرے ذہن میں سر ابھارنے لگا کہ ہمارے دو نفری گھرانے کی مالی ذمّے داریوں کا بوجھ اٹھانا کس کی ذمّے داری تھی؟

گرد و پیش میں مجھے کوئی ایسی عورت نظر نہیں آئی جو ملازمت کرتی ہو۔ محلے سے باہر اسکول اور دفتر جانے والیوں کے بارے میں میری رائے یہ تھی کہ وہ کسی مجبوری کے بجائے محض وقت گزاری کے لیے ایسا کرتی ہیں ورنہ اپنے گھر کی کفالت مرد کی ذمّے داری ہے خواہ اس کی عمر کچھ بھی ہو۔

میں پڑھ ضرور رہا تھا لیکن مخصوص ذہنی تربیت کے باعث کبھی ہم جماعتوں میں نہ گھل مل سکا۔ میرے ساتھی میری قامت اور جسامت کے باعث مجھ سے ڈرتے تھے۔ جب بھی کسی نے میرے مُنہ لگنے کی کوشش کی میں نے بے دریغ اسے پیٹ کر رکھ دیا لیکن یہ اطلاعات کبھی بھی میرے گھر تک نہ پہنچ سکیں۔

نویں جماعت میں پہنچتے ہی میں نے تعلیم ترک کر کے ملازمت کا ارادہ ظاہر کیا تو ماں نے مجھے پیٹ کر رکھ دیا۔ وہ مجھے پڑھا لکھا کر بڑا آدمی بنانا چاہتی تھی جبکہ میرے لیے وہ ہم عمر لڑکے مثال بنے ہوئے تھے جو کم سنی ہی میں دکانوں، کارخانوں اور گیراجوں میں کام کرتے تھے۔

ماں کی آرزوئیں میری ذات میں تضاد اُبھارنے کا سبب بن گئیں۔ پراگندہ گھریلو ماحول کے بعد یتیمی اور ماں کی ملازمت نے میرے اندر ہلچل سی مچا دی تھی۔ میں نے ایک آدھ جگہ کام حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن ہر جگہ سے کم سنی اور صاف ستھرے لباس کے باعث مذاق میں ٹال دیا گیا۔

لیکن وہ ناکامیاں میرے آڑے نہ آسکیں۔ میں مسلسل اسی جستجو میں لگا رہا کہ کسی بھی قیمت پر اتنا کمانے کے قابل ہو جاؤں کہ ماں کو ملازمت کی ضرورت نہ رہے۔ اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے جائز راستے بند پا کر میرا ذہن غلط راستوں پر بھٹکنے لگا۔

اسکول میں میرا ایک ہم جماعت کسی اچھے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا اور اکثر خاصی رقم ساتھ لاتا تھا۔ ایک بار فیس کی ادائیگی کے دن میں نے اس کی کتاب میں سو کا نوٹ دیکھا جو وقفے کے دوران میں موقع پا کر کسی نے اس کی کتاب سے نکال لیا۔ فیس کی ادائیگی کا وقت آیا تو اسکول میں سنسنی پھیل گئی۔ دسویں جماعت میں ہر ایک سے فرداً فرداً اس چوری کے بارے میں دریافت کیا گیا۔ کلاس ٹیچر نے بستوں کے علاوہ ہر طالبعلم کی جامہ تلاشی بھی لی جو بے سود رہی لیکن اس مرحلے پر ایک چغل خور ہم جماعت نے کلاس ٹیچر کو بتایا کہ وقفے کے دوران اس نے مجھے اس لڑکے کی کتابوں میں گھستے دیکھا تھا۔

اس چشم دید گواہی کے سامنے آتے ہی میں سُن ہو کر رہ گیا پھر میرے دل و دماغ میں لاوا سا اُبلنے لگا۔ میں کلاس ٹیچر کی موجودگی کی پروا کیے بغیر چغل خور کے خلاف سخت ترین بدکلامی پر اُتر آیا۔ نقصان اٹھانے والا بے چارہ بالکل خاموش رہا اور میری دوبارہ تلاشی کے بعد جب کلاس ٹیچر کو میری بے گناہی کا یقین آگیا تو انھوں نے چغل خور کو بے بنیاد الزام تراشی پر ملامت کی اور اسے مجھ سے معافی مانگنے پر مجبور کر دیا۔

لیکن میرے دل میں قہر اور انتقام کا الاؤ دہکتا رہا۔ اس نے بھری جماعت میں مجھ پر الزام لگا کر میری توہین کی تھی۔ دوسری بار جامہ تلاشی لے کر میری تذلیل کی گئی تھی۔ میں نے سو کا نوٹ دیکھا ضرور تھا لیکن اپنی خواہش کے باوجود اسے نکالنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اگر میں نے وہ چوری کی ہوتی تو شاید اس کھلی تذلیل کو مکافاتِ عمل سمجھ کر خاموش رہتا لیکن اس روز میرے لیے اس بہتان کا ردِّ عمل برداشت کرنا دشوار ہوگیا۔

چھٹی ہوتے ہی میں نے اسکول سے باہر اس چغل خور کو گھیر لیا۔ گالیوں کے مختصر سے تبادلے کے بعد دونوں اپنے بستے ایک طرف پھینک کر ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے۔ خونخوار انداز میں مقابلہ شروع ہوا۔ میں اپنے حریف کو دفن کر دینے کے درپے تھا لیکن وہ مجھ سے خائف ہونے کے باوجود جسمانی طور پر مجھ سے بہتر تھا۔ میں اپنی ناکامیوں پر جھلا کر احتیاطی تدابیر بُھلا بیٹھا اور حریف کے چند شدید گھونسوں نے مجھ پر چودہ طبق روشن کر دیے۔

اسی عالم میں میری نگاہ زمین پر بکھری ہوئی کتابوں کے درمیان چمکتے ہوئے بلیڈ پر پڑی اور میں نے ایک لحظہ بھی ضائع کیے بغیر بلیڈ اٹھا کر اپنے حریف کا پیٹ چاک کر دیا۔

خون دیکھتے ہی تماشائیوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ اساتذہ اطلاع پاتے ہی جائے واردات پر پہنچ گئے۔ میرے شکست خوردہ حریف کو اسپتال بھیج دیا گیا، مجھے خاصی سوچ بچار کے بعد پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔

حوالات میں ماں مجھ سے ملنے آئی تو بلک بلک کر رو رہی تھی ایس کا غرور ٹوٹ گیا تھا، میں سر جھکائے سلاخوں کے سہارے خاموش کھڑا رہا۔

حوالات میں مَیں نے دو راتیں بسر کیں جو میری زندگی میں ہمیشہ کے لیے سنگِ میل بن گئیں کیونکہ وہاں میرے ساتھ ایک چور اور دوسرا جواری بند تھا۔ ان کے چہرے بے رونق اور وحشت زدہ تھے لیکن ان کی باتوں سے زندگی کا تجربہ جھلک رہا تھا۔ انھوں نے سمجھایا کہ مدافعانہ انداز میں زندہ رہنے کی کوشش کرنے والوں کو پیچھے والے روند کر آگے نکل جاتے ہیں۔ زندہ رہنے کا بس ایک ہی باعزّت طریقہ ہے کہ آدمی

مسلسل پیش قدمی کرتا ہے اور حق نہ ملے تو ہاتھ بڑھا کر چھین لے۔

میرے حریف کا زخم خوش قسمتی سے سطحی ثابت ہوا۔ پھر شاید اساتذہ نے بھی اس کے والدین کو سمجھایا کہ ان کے فرزند نے شرارت یا غلط فہمی میں مجھ پر اشتعال انگیز الزام لگایا تھا لہٰذا میرا جرم اس قدر سنگین نہیں تھا کہ میرا مستقبل برباد کر دیا جاتا۔

لڑکے کے والدین شریف لوگ تھے۔ انھوں نے شکایت واپس لے لی اور مجھے رہائی مل گئی۔

میں حوالات سے نکلا تو مجھے اپنے اندر ایک جرأت مندانہ سی تبدیلی محسوس ہوئی۔ طبیعت سے خوف کا عنصر غائب ہو چکا تھا اور میں منفی راستوں کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے لگا تھا۔

ماں کئی روز مجھ سے ناراض رہی، ہر وقت مجھے ملامت آمیز نظروں سے گھورتی رہتی۔ وہ اپنی حق تلفیاں خاموشی سے سہتی آئی تھی لہٰذا اس کا خون ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ اسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ چڑھتا ہوا خون اپنی تذلیل اور توہین کبھی برداشت نہیں کر سکتا۔

میٹرک پاس کر کے میں کالج میں پہنچا تو وہاں ایسے ساتھیوں کا انکشاف ہوا جو تاش پر جُوا کھیلنے کے شوقین تھے پھر ایک روز میں اپنے حوالات کے ساتھیوں سے سیکھی ہوئی شارپنگ آزمانے کے لیے ان کے ساتھ شامل ہوا۔ نتائج حوصلہ افزا رہے اور میں باقاعدگی کے ساتھ اس ٹولی کی نشستوں میں شریک ہونے لگا۔ محرومیوں کے اتھاہ سمندر میں اس دَور میں مجھے بس وہی جیت نصیب ہوئی جہاں میں نے مکّاری کے ساتھ دھوکے بازی کا سہارا لیا ورنہ ہر طرف شکست ہی کے ڈیرے نظر آتے تھے جن سے بچ کر آگے بڑھنے کا خیال سراب معلوم ہوتا تھا۔

میں سیکنڈ ائیر میں تھا تو ایک بار کوئی جواری مجھے میری کسی بے ایمانی پر ٹوک بیٹھا۔ میں نے بے خوفی کے ساتھ اس کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا۔ اس بار میرا حریف میرے ہاتھوں لہولہان ہو گیا۔ میں سچائی پر تھا تو بلیڈ کا سہارا لیے بغیر پٹائی سے نہ بچ سکا تھا۔ اس بار میرا حریف سچا تھا لیکن اس کی سچائی کو میرے بے رحم ہاتھوں نے لہولہان کر دیا تھا۔

قتل عمد کا مقدمہ بنا اور میں ایک بار پھر گرفتار ہو گیا۔ اس مرتبہ میں حوالات میں اکیلا تھا لیکن دو برس پہلے کے ان ساتھیوں کی یادیں میرے ذہن میں تازہ تھیں جنھوں نے زندگی کے بارے میں مجھے دو راتوں ہی میں بہت کچھ سکھا دیا تھا۔

اس بار میری نگاہیں منتظر رہیں لیکن ماں مجھ سے ملنے نہ آئی۔ تیسرے دن عدالت میں پیشی ہوئی تو ماں برآمدے میں ایک وکیل کے ساتھ نظر آئی، آنکھیں ورم آلود تھیں اور چہرے کے ایک ایک نقش سے دلی کرب کا اظہار ہو رہا تھا، مجھے دیکھ کر اس نے مُنہ دوسری طرف پھیر لیا۔

پہلی سماعت مختصر ثابت ہوئی۔ میری پیروی کے لیے ایک وکیل موجود تھا۔ جب اس نے عدالت کو بتایا کہ مضروب کو صرف کھلے زخم آئے تھے لیکن اس کی حالت خطرے سے باہر تھی تو استغاثہ کے وکیل کو ڈاکٹری رپورٹ کی روشنی میں اس سے اتفاق کرنا پڑا اور مجھے پانچ ہزار کی ضمانت پر رہا کرنے کا حکم صادر کر دیا گیا۔

ماں عدالت سے غائب تھی لیکن پیشکار کی میز پر اس کی چار طلائی چوڑیاں اور بُندوں کی ایک جوڑی پڑی ہوئی تھی۔ ماں نے مجھ سے ناراض ہونے کے باوجود میری رہائی کے لیے اپنے سہاگ کی آخری نشانیاں بھی داؤ پر لگا دی تھیں۔

وکیل کو شاید ماں سے پیشگی فیس مل چکی تھی کیونکہ اس نے میری ضمانت کے کاغذات بہت جلد مکمل کرا لیے اور ہتھکڑی کھلوا کر مجھے آزاد کرا دیا۔

میں اداس چہرے اور بوجھل دل کے ساتھ گھر لوٹا تو دروازہ مقفل تھا لیکن وہ تالا میرے لیے نیا تھا۔ میں مُنہ بولی خالہ کے گھر گیا تو ایک دل گداز کہانی میری منتظر تھی۔

ماں میری گرفتاری کی خبر ملتے ہی بڑی ماں کی دہلیز پر مدد کی بھیک لینے گئی تھی لیکن وہاں اسے ننگی گالیوں سے نواز کر دھتکار دیا گیا۔ سوتیلے بیٹوں نے ماں کو اپنی چوکھٹ تک پار نہ کرنے دی اور اسے دھکے دے کر واپس لوٹا دیا۔ ماں کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اس بار معاملہ طول کھینچے گا لہٰذا وہ وکیل تک جا پہنچی۔ پھر اس کی فیس ادا کرنے کے لیے اس نے محلّے والوں کو گھر کا تقریباً تمام سامان فروخت کر دیا جو بہت زیادہ نہیں تھا۔ اس نے فوری طور پر مکان خالی کر کے مالک مکان سے وہ رقم بھی لے لی جو پیشگی دی ہوئی تھی۔ ماں نے دو راتیں خالہ کے گھر میں بسر کیں۔ دن بھر وہ کہیں غائب رہتی تھی۔ بڑی ماں کا قصّہ بتانے کے بعد اسے چُپ سی لگ گئی تھی۔ خالہ کو کچھ بتائے بغیر چپکے چپکے وہ رات بھر روتی رہتی۔ اس روز وہ صبح سویرے خالہ سے اپنا کہا سنا معاف کرا کے نکلی تھی۔ خالہ کے استفسار پر اس نے بتایا کہ اس روز میری پیشی تھی اور وکیل نے پیشی ہوتے ہی ضمانت کی اُمید دلا دی تھی، اس نے بتایا کہ رہائی کے بعد وہ اپنے بیٹے کو محلے میں لا کر شرمسار نہیں کرے گی بلکہ کہیں اور گھر تلاش کر لے گی۔

میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ لاہور اتنا بڑا شہر تھا، ماں نہ جانے کہاں روپوش ہو گئی تھی۔ قانون کی قید سے رہا کرا کے مجھے اپنی فکر میں گرفتار کر دیا تھا۔

میں کسی اندھے، بہرے اور گونگے کی طرح گرد و پیش سے بالکل لاتعلق، اپنے خیالات کی آندھیوں میں کھویا کئی گھنٹوں تک بے مقصد لاہور کی سڑکیں ناپتا رہا۔ قدم رُکے تو میں چونک پڑا کیونکہ سامنے وہی مانوس چوکھٹ تھی جہاں سے پہلے باپ کا جنازہ گزرا، پھر میں ماں کے دامن سے لپٹا مقدر کی ٹھوکریں کھانے کے لیے انسانوں کے بے رحم جنگل میں

دھکیل دیا گیا اور دو روز پہلے اسی دہلیز سے بڑی ماں کے جوان بیٹوں نے اپنی سوتیلی ماں کی رہی سہی آبرو کا جنازہ بھی نکال دیا۔

میں نے پوری قوت سے دروازے پر لات ماری، پٹ پُرشور آواز سے لرز کر رہ گئے۔ اندر سے بڑی ماں کی گرجدار بوڑھی آواز اُبھری اور پھر دروازہ کھل گیا۔

جھریوں دار بوڑھے چہرے پر غصے کے آثار نمایاں تھے، میری صورت دیکھتے ہی بڑی ماں کی آنکھوں میں نفرت اور قہر کے کوندے لپکنے لگے۔ ان کی چنگھاڑتی ہوئی آواز میں قاتل... خونی اور بدمعاش کے الفاظ سن کر پڑوس کے کئی دروازوں پر پردوں کے پیچھے ہلچل سی مچ گئی۔

"ماں کہاں ہے؟" میں نے مضبوطی سے بڑی ماں کے دونوں شانے دبوچ کر ان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سرد لہجے میں سوال کیا۔

جوانی کو قہر بردوش دیکھ کر بڑھاپے کا غصہ ہراس میں بدل گیا۔

"پرسوں آئی تھی، اب پتا نہیں کہاں ہو گی۔"

میں کسی مشینی پتلے کی طرح واپس مُڑ گیا۔ دماغ میں ایک عجیب سی گونج رچی ہوئی تھی جیسے وہاں اچانک خلا واقع ہو گیا ہو۔ میں چلتا رہا، دو دن تک کم و بیش مسلسل ہی چلتا رہا۔ تھک جاتا تو کہیں بھی کسی لان یا پارک میں پڑ جاتا اور پھر چلنے لگتا۔

دوسرا دن گزرنے کے بعد اخبار میں ماں کی تصویر دیکھی۔ وہ مر چکی تھی۔ اس نے شاید بیٹے کے مستقبل سے دل برداشتہ ہو کر خودکشی کر لی تھی کیونکہ اس کی نیلی اور اکڑی ہوئی لاش نور جہاں کے مزار سے دُور ریلوے لائن کے ایک طرف ٹیلے کی اوٹ سے ملی تھی۔

میرے ذہن کا خلا پُر ہو گیا، گونج تھم گئی اور حواس کام کرنے لگے۔ میرے لیے وہ زندگی کا بدترین سانحہ تھا لیکن میری آنکھ میں ایک بھی آنسو نہ آیا۔ ماں نے اپنی زندگی ختم کر کے دکھوں کے جھمیلے سے ہمیشہ کے لیے نجات حاصل کر لی تھی۔ سوتیلے بیٹوں سے تو دھکے کھا ہی لیے تھے، زندہ رہتی تو شاید میری بکھری ہوئی ذات سے بھی اسے دکھ ہی ملتے رہتے۔

لاہور نے مجھے ٹھکرا دیا تھا، بھائی صورت دیکھنے کے روادار نہیں تھے، سوتیلی ماں قاتل، خونی اور بدمعاش سمجھتی تھی، قانون نے سگی ماں کے سہاگ کی نشانیاں رہن رکھ کر مجھے آزاد فضا میں سانس لینے کا حق دیا تھا۔ ماضی کا ایک ایک لمحہ میری نگاہوں میں گھومنے لگا۔ گزرے ہوئے اور سنے ہوئے واقعات سے بس ایک ہی نتیجہ سامنے آتا تھا کہ میں رشوت کی کوکھ سے جنم لینے والا ایک ایسا وجود تھا جسے کوئی اپنانے کے لیے تیار نہیں تھا۔

سرکاری مُردہ خانے میں میں نے ماں کا آخری دیدار کیا اور پھر رات کے اندھیرے میں اس گھر کی دیوار پھاند کر اندر گھس گیا جس کی چوکھٹ سے میری ماں رسوا کر کے لوٹائی گئی تھی۔ اس بار میں نے اپنا حق چھین لیا تھا۔

میرے مُنہ پر رومال بندھا ہوا تھا اور ہاتھ میں چاقو تھا لیکن غنیمت یہ ہوا کہ بڑی ماں سمیت اس گھر کے مکین صحن میں بے خبر سوتے رہے۔ سوتیلے بھائیوں کو یوں بے بس اور بے خبر اپنی دسترس میں دیکھ کر میرے دل میں نفرت کا ایک شعلہ سا لپکا لیکن میں سر جھکا کر اندر چلا گیا۔

شاید وہ دونوں کمانے لگے تھے کیونکہ گھر سے مجھے خلافِ توقع رقم کے علاوہ کچھ زیور بھی مل گئے اور میں بڑی ماں کے پُرغرور وجود پر حقارت آمیز نگاہیں ڈالتا گھر سے نکل گیا۔

اور یوں میں کراچی چلا آیا۔ حالات کے بے رحم دھارے میں پے در پے زخم کھانے کے بعد میرے دل میں اپنی محرومیوں اور اپنے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کا پورا احساس موجود تھا جس نے میرے وجود میں ساری منفی قوتوں کو بیدار کیا ہوا تھا۔

چوری کے مال پر اس شہر نگاراں میں عیش کرتے ہوئے شیدے کی تلاش میں بھٹکتا رہا جو لاہور کی حوالات میں ملنے والوں کا استاد تھا اور چوتھے روز اس سے ملنے میں کامیاب ہو گیا۔

شیدے کی زندگی کا فلسفہ بہت سیدھا سادا تھا۔ دھونس، دھگی اور دھاندلی۔

وہ مار دھاڑ سے نفرت کرتا تھا لیکن اس قدر فطین اور مکّار تھا کہ جس کام کا فیصلہ کر لیتا اسے محض زبانی جمع خرچ سے ہی کر گزرتا تھا۔

اس کی شاگردی میں مَیں نے اس کے فلسفے کی عملی تربیت میں حصّہ لینا شروع کیا تو وہ میری کارکردگی سے بہت خوش ہوا کیونکہ اس کی آمدنی میں معتدبہ اضافہ ہوا تھا جس میں سے میرا حصّہ بھی ادا کیا جاتا تھا۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے میرے مُنہ سے تنویر علی سن کر بُرا سا مُنہ بنا کر کہا تھا کہ داداگیری میں ایسا ہلکا پھلکا نام نہیں چلتا۔ جسم اور کاٹھی کی مناسبت سے میرا نام ڈینی، فینی جیسا دھانسو قسم کا ہونا چاہیے اور اسی دن سے میں نے تنویر علی کے بجائے ڈینی کے نام سے خود کو متعارف کرانا شروع کر دیا۔

لیکن میرا ساتھ شیدے کو راس نہ آیا، وہ ایک معاملے میں اندر ہو گیا اور میں نے باہر رہتے ہوئے اپنے ہاتھ پیر پھیلانے شروع کر دیے۔

اسی دَور میں جہانگیر مجھ سے آٹکرایا پھر اسی کے ذریعے نادر خان اور طارق سے دوستی ہوئی جو دن بدن گہری ہوتی چلی گئی۔ ہمارا شام کا ٹھکانا صدر کا ایک سستا شراب خانہ تھا جہاں دن بھر کے اپنے اپنے دھندوں سے نمٹ کر ہم چاروں بلاناغہ جمع ہوتے تھے۔ اسی دوران میں ہم چاروں نے مل جل کر کئی خطرناک کام بھی سرانجام دیے لیکن اس گہرے تعلق کے باوجود میں نے ان تینوں کو اپنے ماضی کی ہوا بھی نہ لگنے دی۔ ماں کی یاد دل پر بوجھ بننے لگتی تو میں عموماً کسی گوشۂ تنہائی میں دل کا غبار ہلکا کر لیتا اور پھر مسکراتے چہرے کے ساتھ اپنے معمولات

میں مصروف ہوجاتا۔

حالات اسی ڈگر پر چلتے رہے۔ پھر ایک روز میں دوپہر کو تالا کھول کر اپنی کوٹھری میں داخل ہوا تو فرش پر ایک بند لفافہ پڑا ہوا ملا۔ میرے لیے بند کمرے میں اس لفافے کی موجودگی حیرت ناک تھی لہٰذا میں نے لفافہ چاک کرکے فوراً ہی وہ مختصر سا خط پڑھ ڈالا۔ اس میں ہم چاروں کو مستقل بنیادوں پر خطیر ماہانہ آمدنی کی پیشکش کی گئی تھی۔ رضامندی کی صورت میں مجھے اگلے دن سرخ قمیص پہن کر ٹھیک پانچ بجے شام میٹروپول ہوٹل کے قریب لگے ہوئے لیٹر بکس کے پاس پہنچنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ تحریر کے اختتام پر نہ کوئی نام تھا اور نہ دستخط۔

اسی شام میں نے انھیں وہ خط دکھایا تو سب ہی اس سنسنی خیز پیشکش پر پُرجوش نظر آنے لگے۔ کافی دیر تک اس پُراسرار پیغام پر تبادلۂ خیال ہوتا رہا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ خط میں ہماری آمدنی کا ذکر تو موجود تھا لیکن کام کا کوئی تذکرہ نہیں تھا۔

ہم چاروں نیک نام نہیں تھے جو کوئی ہم سے اصلاحی کام کی توقع رکھتا۔ پیغام بھیجنے والا نہ صرف میرے ٹھکانے سے واقف تھا بلکہ اسے ہم چاروں کی گہری دوستی کا بھی علم تھا، پھر پیغام جس پُراسرار انداز میں ہم تک پہنچایا گیا تھا، اس سے ظاہر تھا کہ ہمیں بلانے والے کے مقاصد کچھ زیادہ نیک نہیں تھے۔

فیصلہ کیا گیا کہ کام کرنا یا نہ کرنا تو بعد کی بات ہے کم از کم اگلے دن مقررہ مقام پر جاکر یہ تو دیکھا جائے کہ بلانے والا کون ہے اور کیا چاہتا ہے؟

اگلے دن میں مقررہ لباس میں ٹھیک پانچ بجے میٹروپول ہوٹل کے پاس والے لیٹر بکس کے قریب جا کھڑا ہوا۔ وہ تینوں مختلف مورچوں سے میری نگرانی کر رہے تھے تاکہ ساری کارروائی اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی اچانک ہی مافیا کی سربراہی ملنے والی ہو۔ میں اپنے قریب سے گزرنے والوں کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا تاکہ غفلت کے نتیجے میں مجھ سے مطلوبہ آدمی کو پہچاننے میں غلطی نہ ہوجائے۔

میں ساڑھے چھ بجے تک کسی احمق کی طرح اس لیٹر بکس کے قریب کھڑا سوکھتا رہا لیکن کوئی مجھ سے ملنے نہ آیا اور میں مایوس ہوکر اس سلسلے میں کسی کے مذاق کے امکانات پر غور کرنے لگا۔ ان تینوں کو بھی سخت کوفت ہوئی اور ہم بددلی کے ساتھ اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف روانہ ہوگئے۔

اگلی شام ہم شراب خانے میں اسی تلخ تجربے کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے کہ میزوں پر سرو کرنے والے ہندو لڑکے نے مجھے فون کال کی اطلاع دی اور میں چونک پڑا۔

میرے ذہن میں دُور دُور تک ایسا کوئی نام نہیں تھا جو کسی بھی وجہ سے مجھ سے اس شراب خانے کے فون پر رجوع کرتا لیکن وہ جو بھی تھا اتنا باخبر ضرور تھا کہ اس مے کدے میں میری موجودگی کے اوقات سے پوری طرح واقف تھا۔

فون پر ایک خواب ناک سی آواز سنائی دی۔ کاؤنٹر والا میرے سر پر مسلط، اشتباہ آمیز نگاہوں سے میری طرف دیکھے جا رہا تھا لہٰذا میں ہوں ہاں سے زیادہ کچھ نہ بول سکا، بس سنتا ہی رہا اور پھر دوسری طرف سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

"ہمیں محمود آباد بلایا گیا ہے۔" میں نے واپس اپنی کرسی سنبھالتے ہوئے رازدارانہ لہجے میں انھیں آگاہ کر دیا۔

"کون تھا؟" جہانگیر نے تجسس آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"میں کاؤنٹر والے کی وجہ سے کچھ پوچھ ہی نہیں سکا۔" میں نے کہا۔ "شاید وہی خط والا تھا کیونکہ اس نے کل پانچ بجے میری موجودگی پر خوشی کا اظہار بھی کیا تھا۔"

"تو پھر چلو جلدی سے۔" طارق نے اپنا گلاس ایک ہی گھونٹ میں خالی کر دیا۔

ہم چاروں ٹیکسی سے محمود آباد کے لیے روانہ ہوگئے۔ ٹیکسی چھوڑ کر بتائے ہوئے پتے پر پہنچنے میں ہمیں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔

اس مختصر لیکن پختہ مکان میں دقیانوسی وضع کا ایک ادھیڑ عمر شخص ہمارا منتظر تھا۔ اس نے ہمیں دیکھتے ہی بلا استفسار اندر بلا لیا۔

مکان مناسب اور خاصا محفوظ تھا۔ آبادی کے سرے پر واقع ہونے کی وجہ سے وہاں پڑوسیوں کی غیر ضروری دخل اندازی کا خطرہ بھی نہیں تھا۔ ہمیں ادھیڑ عمر شخص نے جس کمرے میں بٹھایا وہاں فون بھی موجود تھا۔

لیکن مجھے ادھیڑ عمر کی منحنی آواز سن کر سخت مایوسی ہوئی تھی کیونکہ فون پر بولنے والے کی آواز خواب ناک ضرور تھی مگر لاغر ہرگز نہیں تھی۔ مجھے توقع تھی کہ محمود آباد کے مکان میں فون کرنے والا بذاتِ خود ہمارا منتظر ہوگا لیکن وہاں صورت ہی کچھ اور تھی۔

"یہ مکان ڈینی کے نام پر لیا گیا ہے۔" ادھیڑ عمر ہم میں سے کسی سے مخاطب ہوئے بغیر عمومی لہجے میں کہہ رہا تھا غالباً اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ہم میں سے ڈینی کس کا نام ہے۔ "سال بھر کا ایڈوانس دیا ہے، چار سو کرائے کے علاوہ بجلی، گیس اور فون کے بل ادا کرنے ہوں گے۔"

"اور کام؟" میں نے تجسس آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"اس سے آگے مجھے کچھ نہیں معلوم۔" وہ صوفے سے اٹھ گیا پھر فون کی طرف ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولا۔ "باقی ہدایات تمھیں فون پر ملیں گی۔"

"تو ہمیں یہیں رُک کے رہنا ہوگا؟" نادر نے چونک کر سوال کیا۔ شادی کو کئی برس ہوجانے کے باوجود وہ کم ہی گھر سے باہر رات بسر کرنے پر رضامند ہوتا تھا۔

"کم از کم پہلی فون کال تک۔" ادھیڑ عمر کی لاغر سی آواز گونجی۔ "چابیوں کا گچھا یہاں رکھا ہے، اب میں چلوں گا۔"

میرے لیے وہ صورتِ حال ناقابلِ فہم سی تھی۔ پہلے مجھے میٹروپول کے قریب بلایا گیا۔ وہ وہاں مجھ سے ملنے کے بجائے کوئی محض مجھے دیکھتا ہوا گزر گیا اور اب محمود آباد کے اس مکان میں بلا کر میزبان خود لاپتا تھا۔ نے دے کے وہ مدقوق بڈھا سامنے آیا تھا تو وہ بھی گھر اور اس کے لوازم ہمارے رحم و کرم پر چھوڑ کر یوں واپس جا رہا تھا جیسے ہم اس مکان میں مستقل قیام کے پروگرام کے تحت وہاں بلائے گئے ہوں اور ابھی تک کام کے سر پیر کا بھی پتا نہیں تھا۔

میں نے لپک کر اس کا راستہ روک لیا۔ "اور پہلی کال کب تک آئے گی؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں؟" وہ بے چارگی سے شانے اُچکا کر رہ گیا۔

"کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ فون آنے تک تم ہمارے ساتھ رکو؟" میں نے اپنی نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز کرکے سوال کیا۔

"مجھے افسوس ہے۔" وہ سپاٹ آواز میں بولا۔ "ہم اسی قدر کرتے ہیں جتنا حکم ملے۔ میرے لیے ہدایت تھی کہ یہاں کا چارج تمھارے حوالے کرکے فوراً چلا جاؤں۔"

"اور اگر یہ کوئی چال ہو؟"

"تم خود آئے ہو یہاں، میں نے تو نہیں بلایا تھا تمھیں۔"

میں لاجواب ہوگیا مگر پھر مجھے فوراً ہی ایک نیا سوال سوجھ گیا۔ "تم ہمارے لیے اجنبی ہو۔ تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ تم نے اس مکان کا چارج صحیح آدمیوں کو دیا ہے؟"

"یہ میری ذمے داری ہے۔" معلوم ہوتا تھا کہ وہ مسکراہٹ سے قطعاً ناآشنا تھا۔ "میں چار آدمیوں کا منتظر تھا، میں مطمئن ہوں کہ تم چار ہی ہو۔"

"یہ اتفاق بھی تو ہوسکتا ہے۔"

"ہوا کرے، مجھے یہ سوچنے کا حکم نہیں ملا تھا۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"جانے دو، جانے دو اسے۔" جہانگیر ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "اگر یہ حکم کے بغیر سوچ بھی نہیں سکتا تو ایسے چڑھی کے غلام کا یہاں کیا کام؟"

میں نے راستہ چھوڑ دیا اور وہ بُرا مانے بغیر نکاسی کے راستے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ آنا اور غصے سے عاری کوئی مشین ہو۔

ہم چاروں ٹیلی فون کے گرد بیٹھے پُرجوش لہجے میں اس سنسنی خیز صورتِ حال کے بارے میں تبادلۂ خیال کرتے رہے اور آخر فون کی گھنٹی چیخ ہی پڑی۔

میں نے بلا توقف ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا۔

"ہیلو! مکان پسند آیا؟" وہی بھاری اور غنودہ سی آواز میرے کانوں میں گونجی اور میرا دورانِ خون یک بیک تیز ہوگیا۔

"جج..... جی ہاں۔" میں بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "مگر کام.....؟"

"کام بھی مل جائے گا۔" بولنے والے کے لہجے میں کسی جھیل جیسا ٹھہراؤ تھا۔ "ایک بات ہمیشہ کے لیے نوٹ کرلو کہ کسی بھی قسم کا کوئی تحریری ریکارڈ نہیں رہنا چاہیے، پہلے خط کو بھی جلا دو، اب تم اسی مکان میں رہو گے اور میرا رابطہ براہِ راست تم سے ہوگا۔"

"بہتر۔" میں اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

"تمھیں بلیک گولڈ کھپانا ہے۔" غنودہ آواز گونج رہی تھی۔ "تم چاروں پر کافی عرصے سے میری نگاہ تھی، محنت کرو گے تو میں تمھیں آسمان پر پہنچا دوں گا۔"

میرا تنفس تیز ہوگیا۔ "ہم پوری کوشش کریں گے، مارکیٹ میں گھسنا ہمارے لیے دشوار نہیں ہوگا۔"

"تم چاروں کو الگ رہنا ہے۔ پس پردہ رہ کر کارکنوں کا جال پھیلاؤ، میں تقسیم کا منظم بندوبست چاہتا ہوں۔"

وہ تینوں سانس روکے امید بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھے جا رہے تھے۔

"بہتر۔ کیا آپ میرے ساتھیوں سے بات کریں گے؟" میں اس پُراسرار آدمی کی آواز سن کر ہیجان میں مبتلا ہوا جا رہا تھا۔

"نہیں۔" سختی سے کہا گیا۔ "میں اپنی ذات کی طرح آواز کی بھی غیر ضروری تشہیر نہیں چاہتا، میری گفتگو صرف تم سے ہوگی، اپنا ٹیلی فون ہمیشہ تم ہی اٹھاؤ گے۔"

"بہت بہتر۔" میں نے گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے کہا۔ لحظہ بہ لحظہ وہ اجنبی آواز میرے وجود پر اپنی گرفت مضبوط کرتی چلی جا رہی تھی۔

"اب میں کل رات بات کروں گا، سات بجے فون کے قریب موجود رہنا۔"

"بہتر۔ مم، مگر کیا ہم چاروں کو اب اسی مکان میں رہنا ہوگا؟" دوسری طرف سے سلسلہ منقطع ہونے سے پہلے مجھے ہوش آگیا۔

"تمھارے ساتھیوں کے لیے ضروری نہیں ہے مگر تم یہیں رہو گے۔ یہاں ٹیلی فون کی وجہ سے رابطے کی آسانی رہے گی مجھے۔

"پھر تمہاری کھولی بہت تنگ و تاریک ہے۔ اس عفونت زدہ علاقے کے مقابلے میں تم یہاں آرام سے رہو گے۔"

"یہاں کا ساز و سامان....."

میرا فقرہ ادھورا رہ گیا۔ "جو کچھ ہے مالک مکان کی ملکیت ہے مگر کرائے میں شامل ہے۔ کل شام سات بجے یاد رکھنا۔"

دوسری طرف سے یہ کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

"کیا کہہ رہا تھا؟"

میرا ہاتھ کریڈل کی طرف بڑھتے ہی بیک وقت ان تینوں نے بے چینی کے ساتھ سوال کیا۔ ان کی اشتیاق آمیز نگاہیں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔

"بلیک گولڈ۔" میں نے ریسور کریڈل پر رکھ کر گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے کہا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں کوئی لمبی چڑھائی طے کر کے آیا ہوں۔

"وہ مارا۔" نادر خان خوشی سے اچھل پڑا۔ "مجھے معلوم تھا کہ کراچی وفاؤں کا شہر ہے، اسے بے وفا کہنے والے خود غدار ہیں، یہ تو میری لائن مل گئی مجھے۔"

جہانگیر اسے گھورنے لگا۔ "پہلے ڈینی کو اپنی بات پوری کرنے دو۔"

"ہمیں شہر میں چرس کی تقسیم کا نظام قائم کرنا ہے۔" میں انھیں بتانے لگا۔ "باقی ہدایات کل ملیں گی فی الحال اسی قدر بتایا ہے۔"

"کل کب آئے گا وہ؟" جہانگیر نے سوال کیا۔

"شاید وہ کبھی سامنے نہ آئے۔" میں نے پرخیال لہجے میں کہا۔ "ساری ہدایات فون پر ملیں گی۔ اسی لیے اس مکان کا بندوبست کیا گیا ہے۔"

"کام بہت آسان ہے، لوگ دھندا کر ہی رہے ہیں، بس انھیں توڑ کر اپنے ساتھ ملانا ہے۔ دو چار سے تو میں صبح ہی بات کر لوں گا۔" سات سال پہلے کا نادر خان اپنی کارگزاری دکھلانے کے لیے بے چین تھا۔

"ابھی تم کچھ نہیں کرو گے نادر خان!" میں نے تادیبی لہجے میں کہا۔ "پہلے ہمیں پوری طرح سمجھنا ہے کہ وہ ہم سے کیا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ بازار سے مختلف انداز میں سامنے آئے ہیں۔ وہ ہم سے بھی یہی توقع رکھتے ہیں کہ حتی الامکان خود پس پردہ رہیں اور نچلی سطح پر آدمی تیار کریں۔"

"بات معقول ہے۔" طارق نے تائید کی تھی۔ "بھرم رکھا جائے تو بازار میں ہوا کھڑا ہو جاتا ہے اور بے ایمانی کا امکان معدوم ہو جاتا ہے۔ اس طرح ہم چھوٹے موٹے رقیبوں سے بھی محفوظ رہ سکیں گے۔"

اگلی شام مجھے جو ہدایات ملیں وہ واضح اور قابلِ عمل تھیں۔

پہلی کھیپ پانچ کلو گرام کی ملنا تھی جو ہمیں مقررہ قیمت پر بازار میں پہنچانا تھی۔ اس رقم میں سے بیس فیصد کمیشن وضع کرنے کے بعد بقیہ رقم ایک لفافے میں سر بمہر کر کے رکھنی تھی، تین دن بعد جو شخص دوسری کھیپ لاتا وہ پہلی کھیپ کی رقم کا سر بمہر لفافہ بھی لے جاتا۔

مال اور رقم کی آمد و رفت میں گو کسی گھپلے کا امکان نہیں تھا مگر پھر بھی بلیک گولڈ کے الفاظ باہمی شناخت کا کوڈ مقرر کیے گئے تھے۔

طریقۂ کار کے بارے میں جب میں نے وضاحت چاہی تو بس اسی قدر بتایا گیا کہ ہم چاروں کو حتی الامکان پس منظر ہی میں رہنا ہے۔

غنودہ آواز والے کے محتاط رویے کی بنا پر میں اس کا کوئی نمبر یا حوالہ پوچھنے کی ہمت نہ کر سکا۔ اس کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ حسبِ ضرورت وہ خود ہی مجھے فون کرتا رہے گا گویا سارے روابط یکطرفہ ہوں گے۔

زیرِ زمین دنیا میں خود کو پوشیدہ رکھنے کا تصور اس سے قبل میرے لیے سراسر خیالی تھا۔ اکثر میں فلموں میں ایسے کردار دیکھتا رہا تھا جو اپنے قریبی ساتھیوں سے بھی اپنی شخصیت کو راز رکھتے تھے اور کامیابی سے بڑے بڑے گروہوں کی سربراہی کرتے تھے مگر میں عملی دنیا کا آدمی تھا اور اس کی تلخ حقیقتوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ حقیقی زندگی میں ایسے کردار اپنانے والے کبھی کامیاب ہوتے نہیں دیکھے گئے تھے۔

جرائم کی دنیا میں ہر شخص بزعمِ خود تیس مار خاں بنا رہتا ہے اور اس وقت تک اپنی ذات پر کسی کی برتری تسلیم نہیں کرتا جب تک اس کے ہاتھوں خاک چاٹنے پر مجبور نہ ہو جائے یا پھر شورہ پشتوں کے غول میں اس کا نام چلتا ہے جس کی پشت پناہی مضبوط ہو۔ بہت سی با اثر شخصیات کسی بدنام شخص کی سرپرستی کرتی تھیں، یوں اسے سرِعام من مانی کی اجازت مل جاتی۔ قانون کے محافظ اس کی سرگرمیوں سے درگزر کرتے رہتے اور کوئی بڑا جرم سرزد ہو جاتا تو با اثر سرپرست قانون کی توجہ دوسری سمتوں میں مبذول کرا دیتے۔

ایسے بدنام لوگوں سے ہر ایک ڈرتا تھا، نام اور جرائم کی تشہیر ہی ان کی بالادستی کا سبب بنتی تھی اور کوئی ان کے آڑے آنے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ میں نے تو ایسے بھی واقعات دیکھے اور سنے تھے کہ کسی با اثر شخصیت کے پروردہ غنڈے نے کسی کا خون کر دیا مگر واقعاتی اشاروں کے باوجود وہ گرفت میں نہ لیا گیا بلکہ دو چار کمزور ہسٹری شیٹروں کو بند کر کے تشدد شروع کر دیا گیا مگر وہ لوگ بدترین تشدد سہنے کے باوجود اصل قاتل کی نشاندہی کی جرأت نہ کر سکے جس کے جرم کے وہ عینی شاہد ہوتے کیونکہ ان کی سچی شہادت ان کی ہی موت کا پروانہ بن سکتی تھی اور یوں کوئی گواہ نہ ہونے کے باعث قاتل اپنے ہتھیار سجائے نئے شکار کی تلاش میں لگا رہتا۔

ناموں کے اس دور میں اپنی ذات کو تاریکی میں رکھ کر کسی بڑے دھندے کا خواب دیکھنا ناقابلِ یقین ضرور تھا مگر شاید غیر حقیقی نہیں کیونکہ میں بذاتِ خود اس پُراسرار تجربے سے گزر رہا تھا اور پوری سنجیدگی سے اس کا انجام دیکھنا چاہتا تھا۔

پھر کام کا آغاز ہو گیا۔

ابتدا میں قدرے دشواری ہوئی مگر پھر ہمارا دھندا اس سرعت سے بڑھا کہ ہم خود حیران رہ گئے۔ چوتھے ہی مہینے ہم چاروں اس قابل ہو چکے تھے کہ شہر کے پسندیدہ علاقوں میں اپنے مکان خرید سکیں۔ مارکیٹ سے ملنے والی اطلاعات کا نچوڑ یہ تھا کہ ہمارے ذریعے تقسیم ہونے والی چرس اپنی نوعیت کے اعتبار سے عمدہ اور خالص ترین تھی۔ جو اڈے اسے خالص فروخت کرتے ان کے مستقل گاہکوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور ملاوٹ کرنے والے اونچی شرح سے منافع کما رہے تھے۔

شہر میں کسی کو علم نہیں تھا کہ چھوٹے موٹوں کو نکال باہر کر کے مارکیٹ پر قبضہ کرنے والا کوئی پردہ نشین تھا جو سارا کاروبار محض اپنی آواز کے سہارے چلا رہا تھا۔ حریفوں کو صرف اسی قدر معلوم تھا کہ ڈینی، جہانگیر، نادر اور طارق اس دھندے کے روحِ رواں ہیں۔

جب ہم چاروں کے نام حریفوں کے کانوں تک پہنچے تو پانی سر سے گزر چکا تھا۔ ہم چاروں ہی جرائم کی دنیا کے گھاگ لوگوں میں سے تھے اور پھر ہماری رہنمائی کرنے والا بہت عالی دماغ تھا، مال کی کھپت بڑھتے ہی اس نے ہمیں اپنے اثاثوں کو پوشیدہ رکھنے کی سخت ہدایت کی، پھر ہمیں علیحدہ علیحدہ جز وقتی اسٹیٹ ایجنسیاں چلانے کا مشورہ دیا۔

ہم نے چھوٹے پلاٹوں کی خرید و فروخت سے ابتدا کی۔ دس ہزار کی خریداری کے کاغذات چھ ہزار میں بنوائے، پھر بیس کی فروخت تیس میں ظاہر کی۔ یوں قانونی طور پر تلیل سے واجبات ادا کر کے چھ ہزار کی سرمایہ کاری پر چوبیس ہزار منافع ظاہر کر دیا۔ دو چار ہی سودوں میں ہم اس قابل ہو چکے تھے کہ کسی مواخذہ کے بغیر اپنی مرضی کے مطابق بود و باش اختیار کر سکیں۔

ہمیں اُبھرنے کی ترکیب سمجھانے کے بعد باس نے بھی ہم پر سے اثاثوں کو پوشیدہ رکھنے کی پابندی ہٹا دی۔

حریفوں کے ایما پر پولیس نے نادر خان اور جہانگیر پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی مگر ان کی اچانک خوشحالی کا ٹھوس قانونی جواز دیکھنے کے بعد کوئی کچھ نہ کر سکا اور حریف منہ دیکھتے رہ گئے۔

لائن میں موجود دوسرے لوگوں کے برعکس ہم چاروں نے آبکاری اور پولیس کے عملے سے کوئی ربط ضبط نہیں رکھا کیونکہ بھاری مقدار میں چرس لانا اور لے جانا ہماری ذمے داری نہیں تھی۔ مال ہمیشہ مختلف جگہوں پر اور نئے نئے طریقوں سے پہنچایا جاتا تھا اور کہیں ذخیرہ کیے بغیر محض چند گھنٹوں میں کاروں کے ذریعے شہر میں پھیلا دیا جاتا تھا۔

اندرونِ ملک سے شہر تک چرس کی سپلائی لائن کیسے قائم تھی، یہ ہم چاروں میں سے کسی کے علم میں نہیں تھا۔ جب کبھی مال پکڑے جانے کی اطلاعات آتیں تو ہم فوری طور پر اپنے وسائل کو بروئے کار لاتے اور ہر بار کوئی نہ کوئی معروف نام سامنے آ جاتا۔

مارکیٹ کے جانے پہچانے لوگوں کا مال پکڑا جاتا تھا مگر گمنام کی سپلائی بحال تھی۔

اس سلسلے میں میری اپنی سوچ تھی۔ میرا خیال تھا کہ ہمارا سربراہ بھی آبکاری اور پولیس سے دور ہی دور رہتا ہے۔ عموماً سننے میں آتا تھا کہ آنے والی بیشتر منشیات محکمہ آبکاری کے عملے کے بعض اراکین کی رضامندی سے آتی ہیں۔ یہ رضامندی خاصے مہنگے داموں خریدی جاتی تھی۔ پھر یوں ہوتا کہ کسی کھیپ کی مخبری ہو جاتی یا پولیس کو اپنے ذرائع سے اطلاع مل جاتی تو آبکاری کے محکمے کو ناکارہ ثابت کرنے اور نیچا دکھانے کے لیے پولیس فورس پورے وسائل کے ساتھ حرکت میں آتی اور کروڑوں کی منشیات کی ضبطی کا ایک کارنامہ اخبارات کی سرخیوں میں دمک اٹھتا، کبھی کبھار یوں بھی ہوتا کہ آبکاری حکام اپنا وجود ثابت کرنے کے لیے کوئی کھیپ پکڑ لیتے اور اعلیٰ افسران کی اچانک نگرانی کا غدر راشی عملے کو منشیات فروشوں کے سامنے روسیاہی سے بھی بچا لیتا۔ دونوں صورتوں میں وہی لوگ نشانہ بنتے تھے جنھیں چند اہلکاروں کی خوشنودی مطلوب رہتی تھی جبکہ ہمارا باس ایک ایک کارروائی کو اپنی ذات کی طرح اندھیرے میں رکھنے کا عادی تھا۔

چند ماہ یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہا۔ اس دوران [illegible] مسلسل کام کرتا رہا۔ پھر [illegible] شہر [illegible] نظام کا ڈھانچہ دیکھی تو اس کے طلسم [illegible] نے [illegible] بار بار دیکھی اور میرے دل میں وہ مقام حاصل کرنے کی آرزو انگڑائیاں لینے لگی جہاں آدمی کے ذرا ذرا سے مفاد کے لیے اس کے جاں نثار خود کو داؤ پر لگا دیتے ہیں اور وہ خود معاشرے میں بلند رتبے پر فائز رہتا ہے۔ وہ دہری زندگی میرے لیے جس قدر پُراسرار تھی، اس سے کہیں زیادہ پُرکشش تھی۔

نقطۂ آغاز میرے سامنے تھا، میں کسی ایسے آدمی کے لیے کام کر رہا تھا جو گمنام تھا، مجھے یقین تھا کہ اس نے دوسرے شہروں میں بھی اپنے کارندے پالے ہوئے تھے۔ میں اس تنظیم میں کسی اہم تر منصب کے خواب دیکھنے لگا۔

پھر میں نے اپنی خواہش کا اظہار اس گمنام باس پر کر ہی دیا۔

میں خود پس پشت چلا جانا چاہتا تھا، میں نے تجویز پیش کی کہ جہانگیر کو گروپ کا سربراہ مقرر کر دیا جائے۔

باس کا رابطہ بدستور مجھ ہی سے رہتا، اس آواز کا راز برقرار رہتا اور میں اس سے ملنے والے احکام کسی درمیانی آدمی کے روپ میں فون پر جہانگیر کو سنا دیتا، یوں عملی طور پر جہانگیر گروپ کا سربراہ بن جاتا۔ اسے قطعاً علم نہ ہو پاتا کہ اسے احکام دینے والا سربراہ نہیں بلکہ

عملی طور پر میں خود ہوں۔

"مگر تم کیوں اس تبدیلی کے خواہاں ہو؟" گمنام سربراہ نے میری پوری بات سننے کے بعد اسی بھاری اور غنودہ آواز میں سوال کیا تھا۔

"کام کے ساتھ کاروباری رقابتیں بھی بڑھ رہی ہیں سر!" میں نے ادب سے جواب دیا تھا "ہم میں نمبر تین کوئی نہیں ہے..... اگر میں کسی چکر میں آ گیا تو سارا کام رک جائے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ جہانگیر کو آگے لایا جائے، میں بخوشی اس کی سربراہی تسلیم کر لوں گا... اگر خدانخواستہ اسے زک پہنچی تو میں پھر اپنی جگہ سنبھال لوں گا۔"

"تم بہت چالاک ہو ڈینی!" ایک گہرے سانس کے ساتھ کہا گیا "یہ اچھی بات ہے کہ تمھاری مستقبل پر بھی نگاہ ہے، تجویز اچھی ہے میں کل جواب دوں گا۔"

اور پھر اگلے دن میری تجویز پر حکم صادر کر دیا گیا اور مجھے تازہ احکام سنائے گئے جو جہانگیر تک پہنچانے تھے۔

جہانگیر ان دنوں اپنے نئے مکان میں عیش کر رہا تھا اور وہاں فون کی سہولت بھی میسر تھی۔ میں نے نمبر ملایا تو پہلی ہی گھنٹی پر ریسیور اٹھا لیا گیا۔

"ہیلو!" میرے کانوں میں جہانگیر کی بوجھل آواز آئی۔

"شراب پی رہے ہو تم؟" میں بدلی ہوئی آواز میں مادھکہ لیس غرایا۔ مجھے اندازہ تھا کہ یہ وقت جہانگیر کی شراب نوشی کا تھا۔

"تت..... تم کون ہو؟" جہانگیر کی آواز سے خوف جھلک رہا تھا۔

"اپنے حواس یکجا کرو اور پوری توجہ سے میری بات سنو۔" میں نے اپنے لہجے کی درشتگی میں کمی نہ آنے دی "آج سے ڈینی کے بجائے تم سربراہ ہو۔"

"اوہ..... سر! معاف کیجیے گا، میں پہچان نہیں سکا تھا۔" جہانگیر کی آواز میں بوکھلاہٹ عود کر آئی۔ حکم سنتے ہی اس نے فرض کر لیا تھا کہ سربراہ بذاتِ خود اس سے مخاطب ہے "پہلے کبھی آپ کی آواز سننے کا موقع نہیں ملا تھا۔"

"اب احکام تمھاری معرفت ملا کریں گے۔" میں غرایا "سب کو اس تبدیلی سے باخبر کر دو۔" اتنا کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

چند منٹ بعد ہی میرے فون کی گھنٹی بجی اور میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے ریسیور اٹھا لیا۔ دوسری طرف حسبِ توقع جہانگیر ہی تھا۔

"تم کیا کر رہے ہو؟" جہانگیر نے چھوٹتے ہی سوال کیا تھا۔

"تمھیں مبارکباد دینے کا موڈ بنا رہا تھا۔" میں نے اپنی اصلی واز لیکن بے جان لہجے میں کہا۔

"اوہ تو تم باخبر ہو، کیا میرے پاس آ سکتے ہو؟"

"اب تو تم حکم دو، تعمیل کرنا ہی پڑے گی۔" میں نے آواز میں اداسی پیدا کرتے ہوئے جواب دیا۔

"بکومت اور فوراً چلے آؤ، ہم کھانا ساتھ کھائیں گے۔"

میں اس کے گھر پہنچا تو دفورِ مسرت سے جہانگیر کا چہرہ دمک رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی سیدھا اپنی خوابگاہ میں لے گیا۔

"یار آج اس نے مجھے فون کیا تھا۔" اس نے حیرت اور مسرت سے مغلوب لہجے میں کہا جیسے وہ فون کال اس کے لیے بہت بڑا اعزاز رہی ہو۔

"مجھے خوشی ہوئی کہ میرے سر سے ایک بوجھ ہٹ گیا۔"

"شاید وہ ہم سب کو بہت قریب سے جانتا ہے۔" جہانگیر کی آواز میں ہیجان برقرار تھا "جانتے ہو اس کا پہلا جملہ کیا تھا؟"

میں احمقانہ انداز میں سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

"اسے معلوم تھا کہ وہ میرا شراب نوشی کا وقت تھا۔" جہانگیر پُرزور لہجے میں بولا "اس نے بلا کسی تمہید کے اسی بارے میں سوال کیا۔"

"ظاہر ہے وہ اپنے ماتحتوں کے بارے میں اتنا باخبر نہ رہے تو اتنا بڑا بزنس کیسے سنبھال سکے۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔

"حیرت ہے؟" جہانگیر کے لیے اپنے جوش پر قابو پانا دشوار ہو رہا تھا "وہ ہمارے بارے میں اس حد تک جانتا ہے اور ہم اس سے بالکل لاعلم ہیں۔"

"اس چکر میں بھی نہ پڑنا ورنہ وہ دوسروں کی عبرت کے لیے تمھاری کھال میں بھس بھروا دے گا۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"کہہ تو تم ٹھیک ہی رہے ہو۔" جہانگیر پھریری لے کر بولا۔ اس کی آواز بھی کسی خونخوار بلڈاگ کی غراہٹ سے مشابہ تھی۔

میں دل ہی دل میں مسکرایا مگر بظاہر سنجیدگی برقرار رکھی اور یوں اس مختصر سے گروہ میں قیادت پُرامن طور پر تبدیل ہو گئی۔

میں ہر میٹنگ میں موجود ہوتا تھا۔ فاضل وقت بھی زیادہ تر جہانگیر کے ساتھ گزارتا تھا لہٰذا میں نے دوسری حیثیت میں جہانگیر کو ہدایات دیتے ہوئے کئی بار ایسی باتوں کا حوالہ دیا کہ جہانگیر خوفزدہ ہو گیا۔

ابتدا میں اس نے دو چار بار مجھ سے ذکر بھی کیا کہ سربراہ ہم لوگوں کی سرگرمیوں سے بہت زیادہ باخبر رہتا ہے، اسے پل پل کی خبریں ملتی رہتی ہیں مگر پھر اس نے ذکر کرنا بھی چھوڑ دیا۔ شاید اسے خیال آ گیا تھا کہ وہ سربراہ کا نائب ہے اور میں اس کا ماتحت۔

میری ان حرکتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ جہانگیر پر اپنے نادیدہ باس کی دہشت بیٹھ گئی اور وہ ہر وقت اس سے خائف رہنے لگا۔

میں نے ان دنوں جہانگیر کا بہت ساتھ دیا اور ہمارا کاروبار پہلے سے زیادہ بڑھنے لگا مگر وہ صورت زیادہ دن برقرار نہیں رہی۔ ہمارے ایک ہرکارے نے ہماری خطیر رقم مال آگے بیچ کر ہضم کر لی اور کسی دوسری پارٹی کے لیے کام شروع کر دیا۔

جہانگیر کے لیے یہ ایک چیلنج تھا۔ وہ محض ایک آدمی ٹوٹنے کا سرسری واقعہ نہیں تھا بلکہ دوسرے کارندوں کے لیے ایک راہ تھی۔ اگر لطف الرحمٰن ایک ہی جھٹکے میں پونے دو لاکھ خورد برد کر سکتا تھا تو دوسرے بھی طالع آزمائی کر سکتے تھے۔

اس نے معاملے کو سلجھانے کی کوشش کی مگر لطف الرحمٰن کسی طرح ہاتھ نہ آیا ــــ جہانگیر غبن کی رقم اپنی جیب سے سربراہ کو ادا کر چکا تھا مگر اس واقعے کے مضمرات کے پیشِ نظر اسے میرا مشورہ قبول کرنا پڑا اور اس نے تیسرے ہی دن مجھے لطف الرحمٰن کی بدنیتی سے آگاہ کر دیا۔

میں اس معاملے میں بھرپور دلچسپی لے رہا تھا، اس طرح گمنام سربراہ کی قوت، صلاحیت اور طریقۂ کار کا پوری طرح اندازہ ہو سکتا تھا۔ میں نے جہانگیر سے ملنے والی اطلاع من و عن آگے بڑھا دی۔

"تین دن کی تاخیر کیوں ہوئی خبر دینے میں؟" میں نے غنودہ آواز کا برہم لہجہ پہلی بار سنا تھا۔

"جہانگیر اس بدمعاملگی کو خود نمٹانا چاہ رہا تھا۔"

"مگر مجھے تم جواب دہ ہو۔ میں روز تم سے بات کرتا ہوں، مجھ سے ذکر کرنا تمھاری ذمّے داری تھی۔" مجھ کو جھاڑ سنائی گئی۔

"پہلی گڑبڑ تھی، اس لیے معذرت خواہ ہوں۔" میں نے خفت آمیز لہجے میں کہا۔

"فی الحال کام کو یکسر بھول جاؤ اور کل کا دن ایسے پبلک مقامات پر گزارو جہاں ضرورت پیش آنے پر تمھاری موجودگی کے دو چار گواہ بھی مل سکیں۔ کل شام چار بجے سے رات کے گیارہ بجے تک یہ احتیاط برقرار رہنا چاہیے، اس کے بعد سب آزاد ہوں گے۔"

"او۔ کے۔ سر!" میں پھریری لے کر بولا اور لائن بے جان ہو گئی۔

ایسی ہدایات کا مطلب میں خوب سمجھتا ہوں۔

میں نے فون پر جہانگیر سے وہ خبر کسی ردِعمل کے اظہار کے بغیر سنی تھی لہٰذا نیا حکم دیتے ہوئے میں نے اپنے دل کی بھڑاس نکال لی۔

میں نے جہانگیر کو بدلی ہوئی آواز میں ایسی بے بھاؤ کی سنائی کہ وہ اپنے ہمدرد دوست کے طور پر مجھے فون کرنے کے بجائے خود ہی دوڑا چلا آیا۔

"یار! وہ تو درندہ ہے بالکل درندہ۔" جہانگیر نے رسمی گفتگو کے بعد جھینپے ہوئے لہجے میں مجھ سے کہا "تھوڑی دیر پہلے میں نے لطف الرحمٰن کی بے ایمانی کی اطلاع دی تو خاموشی سے سنتا رہا پھر ابھی ابھی دوبارہ ٹیلیفون آیا تو بری طرح برس رہا تھا۔"

"غلطی تمھاری ہے۔" میں نے پُرسکون لہجے میں کہا "تمھیں اس معاملے میں فوراً اس سے ہدایات لینا چاہیے تھیں۔ ساکھ ایک بار بگڑ جائے تو بنانی مشکل ہو جاتی ہے۔ شکر ادا کرو کہ ان تین دنوں میں کسی اور کی نیت میں فتور نہیں آیا ورنہ لطف الرحمٰن کی جگہ اس وقت کئی نام ہمارے سامنے ہوتے۔"

"اگر میری عقل ماؤف ہو گئی تھی تو تم لوگ ہی کچھ پھوٹتے ہوتے۔" وہ جھلّائے ہوئے لہجے میں بولا پھر قدرے سکوت کے بعد نسبتاً دھیمے لہجے میں بولا "کل شام چار بجے سے گیارہ بجے تک ہم چاروں کو اپنی مصروفیات کے گواہ تیار رکھنے کا حکم ملا ہے۔"

میں نے چونکنے کی اداکاری کی "یعنی لطف الرحمٰن۔" اتنا کہہ کر میں نے زبان سے ٹرچ کی آواز نکالتے ہوئے اپنی گردن کے آگے شہادت کی انگلی پھیری۔

"معلوم یہی ہوتا ہے۔" جہانگیر کی آنکھوں میں تشویش کے سائے لہرانے لگے "میں تو کل شام ہی سے کسی ہوٹل میں جم جاؤں گا، شناسا بھی مل جائیں گے اور ہوٹل کا عملہ بھی ہو گا... ضرورت پیش آئی تو بہتیرے گواہ مل جائیں گے۔"

"شاید آج کل بلیرڈ ٹورنامنٹ چل رہا ہے۔" میں نے پُرخیال لہجے میں کہا میں کافی دیر سے اس بارے میں سوچ رہا تھا "طارق بھی اس میں حصّہ لے رہا ہے۔ کیوں نہ کل شام ہم چاروں ساتھ ہی کلب چلیں۔ بلیرڈ روم اور کلب میں خاصی رونق ہو گی۔"

جہانگیر تیار ہو گیا۔

یہ ان دنوں کا قصّہ ہے جب قانونِ امتناع کا دور تک پتا نہیں تھا اور شہر کے ہر تفریحی مرکز میں شامیں رنگین اور مخمور ہوا کرتی تھیں۔ اگلی شام ہم چاروں نے حسین چہروں اور مہکتے لباسوں کے ہجوم میں کلب کے سبزہ زار اور بلیرڈ روم میں گزاری جہاں ہیجان انگیز ماحول میں اسنوکر چیمپئن شپ منعقد ہو رہی تھی۔

اس سے اگلی صبح کے اخبارات میں ایک لرزہ خیز قتل کی تفصیلات موجود تھیں۔ متوفی کو گردن کاٹ کر ہلاک کیا گیا تھا۔ اس کی لاش ایک بوری میں بند منگھو پیر کی پہاڑیوں سے برآمد ہوئی تھی۔ پولیس کے لیے متوفی نامعلوم تھا مگر لاش کے مسخ شدہ چہرے کی تصویر ہم چاروں کے لیے اجنبی نہیں تھی۔ وہ ہمارا غدار لطف الرحمٰن تھا۔

میں وہ خبر پڑھ کر سہم گیا۔ کسی نادیدہ ہاتھ کا وار اس سے بھی بھیانک ہو سکتا تھا۔

تنظیم کے پس پشت جو کوئی بھی تھا اس کے ہاتھ بہت لمبے تھے اور اپنے فیصلوں کو نافذ کرنے کی بھرپور قوت رکھتا تھا اور یہ بات میرے لیے تشویش کا باعث تھی۔

اگلے دن خبریں چھپیں کہ متوفی منشیات فروش تھا اور وقوعہ کی شام سات بجے گھر سے ایک بریف کیس میں رقم لے کر نکلا تھا لیکن

اسے زندہ گھر لوٹنا نصیب نہ ہو سکا۔ اس کے گھر والے رقم کی مالیت کے بارے میں کچھ نہ بتا سکے نہ ہی پولیس کسی نتیجے پر پہنچ سکی کیونکہ لاش موجود تھی مگر بریف کیس کا کہیں سراغ نہ مل سکا تھا۔ پولیس سرجن کے اندازے کے مطابق آٹھ اور نو بجے کے درمیان مقتول کو کسی تیز دھار آلے سے ذبح کیا گیا تھا۔

دو دن بعد گمنام آدمی نے فون کیا تو اس کی آواز ہمیشہ کی طرح پُرسکون اور غنودہ تھی۔ کام کی باتوں کے علاوہ اس نے کوئی ذکر نہیں کیا اور نہ میری ہمت پڑی کہ اس سے لطف الرحمٰن کے قتل کے بارے میں کچھ پوچھتا۔

پولیس تفتیش کے سلسلے میں جہانگیر اور نادر تک بھی پہنچی کیونکہ لطف الرحمٰن براہ راست نادر کے تابع تھا اور جہانگیر اس وقت تک پولیس کے اعلیٰ حکام کو جرائم سے اپنی دستبرداری کا یقین نہیں دلا سکا تھا مگر کلب میں موجودگی کے گواہ مل جانے کے بعد پولیس نے دوبارہ ان کا بھی رُخ نہیں کیا۔

وہ ہمارے ساتھ بددیانتی کا پہلا واقعہ تھا۔ پولیس کے لیے وہ قتل ایک معمہ بنا رہا لیکن جاننے والے جانتے تھے کہ لطف الرحمٰن کا قتل اس کی بددیانتی کا شاخسانہ تھا۔ اس کے نتیجے میں ہمارے مالی لین دین کے حالات پہلے سے کہیں زیادہ استوار ہو گئے۔

بازار میں منشیات کا دھندا کرنے والوں کو اچھی طرح علم تھا کہ لطف الرحمٰن نے بددیانتی کا ارتکاب کیا تھا اور ایک خطیر رقم ہضم کر کے دوسری پارٹی سے منسلک ہو گیا تھا لیکن اس کی موت کے بعد اس رقم کا کہیں پتا نہ چل سکا لہٰذا لوگ یہی نتیجہ اخذ کر سکے کہ اپنے قتل سے پہلے لطف الرحمٰن بریف کیس میں رقم لے کر گھر سے روانہ ہوا تھا۔ شاید اس کے ہاتھوں زک اٹھانے والے نے اس کی لالچی طبیعت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس پر جال ڈالا تھا۔ وہ کسی نفع بخش سودے کی امید میں رقم لے کر لالچ کی زنجیر میں بندھا خود اپنے قاتل کے پاس جا پہنچا اور قاتل نے رقم اپنی تحویل میں لے کر اسے کیفرِ کردار کو پہنچا دیا۔

اس سفاکانہ واردات نے اندر سے مجھے ہلا کر رکھ دیا اور میرے دل میں بغاوت یا کسی بلند منصب کی امید کمزور پڑنے لگی۔

جو شخص اپنے باغیوں کو اتنی مہارت اور چالاکی کے ساتھ اپنے انتقام کا نشانہ بنا سکتا ہے اس سے الجھنا آسان کام نہیں تھا۔ ذرا سا بھی شبہ ہونے پر وہ مہلت دیے بغیر کہیں بھی کوئی وار کر سکتا تھا۔

اس کے معاملے میں سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ وہ مجھ سے بخوبی واقف تھا لیکن میرے لیے اس کی ذات گمنام تھی۔ میں صرف اس کی آواز سے آشنا تھا لیکن یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ اس کی اصل آواز رہی ہو جب مجھ جیسا آدمی آواز بدل کر جہانگیر کو اپنی سربراہی کے رعب میں لے سکتا تھا تو باس کے لیے فون پر اپنی آواز بدل لینا کون سا دقت طلب مسئلہ تھا؟

میں نے سنجیدگی کے ساتھ سوچا کہ اس آسیبی تنظیم سے کنارہ کش ہو جاؤں، برسوں کی مجرمانہ سرگرمیوں کے نتیجے میں میں اتنے اثاثے جمع کر چکا تھا کہ محنت اور ایمانداری سے کام کرتا تو قانون کو پامال کیے بغیر نہایت آسانی کے ساتھ اپنا معیارِ زندگی برقرار رکھ سکتا تھا۔

لیکن اس تنظیم سے چھٹکارا اس قدر آسان نہیں تھا۔

سربراہ نے مجھے اس وقت اپنے وسائل کا سہارا دے کر آگے بڑھایا تھا جب میں شہر کے ایک عفونت زدہ علاقے میں تنگ سی کوٹھری میں رہتا تھا۔ میرا تجربہ اس کے لیے بیش قیمت اثاثہ تھا جس سے وہ آسانی سے ہرگز دست بردار نہ ہوتا۔

پھر وہ اپنی ذات کی رازداری کے سلسلے میں اس قدر حساس تھا کہ اپنی آواز کی غیر ضروری تشہیر تک سے گریز کرتا تھا۔ محض اسی وجہ سے اس نے جہانگیر کو براہِ راست احکام دینے کے بجائے میرا وسیلہ برقرار رکھا تھا تاکہ میرے سوا کوئی اس کی آواز سے واقف نہ ہو سکے۔

پھر کیا وہ اپنی تنظیم سے ایک ایسے آدمی کی کنارہ کشی برداشت کر لیتا جو جہانگیر، نادر اور طارق کے علاوہ خود اس کی آواز سے بھی واقف تھا؟

یہ ایک بڑا وسیع سوالیہ نشان تھا جس کا جواب میرے نزدیک نفی کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ میرے ٹل جانے پر شاید وہ مجھے زبانی طور پر علیحدگی کی اجازت دے دیتا لیکن مجھے پورا یقین تھا کہ اُس کے بعد میری لاش بھی شہر کے کسی ویرانے ہی سے دستیاب ہو گی نہ قاتل پکڑا جا سکے گا اور نہ قتل کے اسباب روشنی میں آسکیں گے۔

میں نے وہ خیال ترک کر دیا تھا بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ میرا وہ فیصلہ بالکل درست اور منطقی تھا۔ حالات میری توقع کے برعکس تیزی سے تبدیل ہوئے اس بارے میں میری کہانی سے زیادہ اہمیت واقعات کے تسلسل کی ہے کیونکہ بہت سے واقعات سراسر میری لاعلمی میں رونما ہوئے جن کی تفصیلات مجھے دوسرے ذرائع سے ملیں لہٰذا آگے آپ ان بنیادی واقعات کی تفصیل پڑھیں گے جو آپ بیتی کے انداز سے ہٹ کر لکھے گئے ہیں لیکن کچھ محدود ادراق کے بعد میں دوبارہ آپ کو اپنی کتھا سناؤں گا کیونکہ اس موڑ سے کہانی کا محور میری ذات ہی رہی ہے اس میں دوسروں کا دخل ثانوی ہو کر رہ گیا ہے۔

❋

جہانگیر گھر پہنچ کر لباس تبدیل کر رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ وہ قمیص مسہری پر اچھال کر تیزی سے فون کی طرف جھپٹا۔

اس کا خیال تھا کہ دوسری طرف اس کا گمنام سربراہ ہو گا مگر ریسیور کان سے لگاتے ہی اسے طارق کی آواز سنائی دی اور اس کا منہ بن گیا۔

"کیا بات ہے؟" اس نے خشک لہجے میں سوال کیا۔

"میں ایک اہم بات پوچھنی بھول گیا تھا۔" طارق کی آواز معذرت خواہانہ تھی۔

"دوبارہ بھولنے سے پہلے پوچھ ڈالو ورنہ سکھ کی نیند نہ سو سکو گے۔" جہانگیر نے مضحکانہ لہجے میں کہا۔

"آج رات مجھے ایک ڈلیوری دینی ہے، اس کا کیا کروں؟" الجھن آمیز لہجے میں پوچھا گیا۔

"اتنی اہم بات تم میٹنگ میں پوچھنی بھول گئے؟" جہانگیر ملامت آمیز لہجے میں بولا۔

"بس چوک ہو گئی۔"

"احکام وہی تھے جو میں نے بتائے۔"

"یعنی فوری طور پر سب کچھ بند۔"

"میٹنگ کے بعد یہی صورت حال ہے۔" جہانگیر کو اس پر غصہ آنے لگا۔

"مگر میں ایڈوانس لے چکا ہوں۔"

"ہوں۔ یہ معاملہ ذرا مختلف ہے۔" جہانگیر سوچ میں پڑ گیا پھر دراُہی بولا "یہ کب کا واقعہ ہے؟"

"آج صبح سودا ہوا تھا۔"

"احکام نئے سودوں کے بارے میں تھے۔" جہانگیر نے بلا پس و پیش اپنا فیصلہ صادر کر دیا۔ "ڈلیوری کر دو۔"

"تھینک یو۔" کہہ کر دوسری طرف سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

مگر جہانگیر کو قمیص پہننی نصیب نہ ہو سکی۔ اس کے پلٹتے ہی فون کی گھنٹی دوبارہ بجنے لگی تھی وہ زیرِ لب بڑبڑاتا ہوا مڑا اور جھلاہٹ کے عالم میں ریسیور اٹھا لیا۔

مگر فون پر وہ مانوس غراہٹ سنتے ہی اس کی جھلاہٹ کافور ہو گئی کیونکہ اس بار دوسری طرف اس کا باس تھا۔

یہ اس کا معمول تھا کہ ہر میٹنگ کے بعد وہ فون کر کے جہانگیر سے رپورٹ ضرور لیتا تھا۔

"تو لوٹ آئے تم اپنی میٹنگ سے۔"

اس کا استہزائیہ لہجہ سن کر جہانگیر چونک پڑا۔ وہ گفتگو کا آغاز ہمیشہ نرم لب و لہجے سے کیا کرتا تھا یہ اور بات تھی کہ اس کی نرم آواز میں بھی جہانگیر کو دبی دبی غراہٹ کا احساس ہوتا رہتا تھا مگر اس وقت تو باس کے تیور ہی کچھ اور تھے۔

"یس سر!" وہ عجلت کے ساتھ بولا "ہدایات پہنچا دی گئی ہیں۔۔۔ اگلا سگنل ملتے ہی سیمپل بازار میں پھیلا دیے جائیں گے۔"

"بس یہی کچھ ہوا اجلاس میں؟"

باس کے لہجے کی چبھن جہانگیر کے لیے ناقابلِ برداشت ہونے لگی اور اس کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں ابھر آئیں۔

باس اس کی رپورٹ سے مطمئن نہیں تھا اور اس سے مزید کچھ سننے کا متمنی تھا۔ مگر کیا؟ یہ جہانگیر نہ سمجھ سکا۔

معاً اس کا ذہن طارق کی تازہ فون کال کی طرف گیا۔ اسے اندازہ تھا کہ باس بہت زیادہ باخبر آدمی تھا، شاید اسے طارق کی الجھن کا علم تھا۔

"ایک سودا آج صبح ہوا تھا۔" اس نے جلدی سے کہا۔ "ایڈوانس لیا جا چکا تھا، اس لیے اس کی ڈلیوری کسی وقت دے دی جائے گی۔"

"غیر ضروری باتیں مت کرو۔" غصیلی غراہٹ ابھری۔ "میں تم سے میٹنگ کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔"

"سوری سر!" جہانگیر بوکھلا گیا۔ "بس یہی ہوا تھا میٹنگ میں۔ میں نے آئندہ حکمتِ عملی کے بارے میں بھی بریف کر دیا تھا۔"

"ہوں۔" ریسیور میں زہریلی آواز گونجی۔ "ڈینی کیا بکواس کر رہا تھا؟"

"وہ۔۔۔۔ وہ مہنگے داموں پر معترض تھا۔" جہانگیر کی گھبراہٹ میں اضافہ ہو گیا اور اسے اپنے پیٹ میں بل سے اٹھتے محسوس ہونے لگے۔

اسے دوسری طرف سے بولنے والے کی سفاکانہ ہنسی سنائی دی۔ "وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ تم بتدریج الگ ہوتے ہوئے دوبارہ کیوں اس طرف راغب ہو رہے ہو؟"

"جج۔۔۔ جی۔" جہانگیر پھنسی پھنسی آواز میں کراہا۔

"اور تمہارے نزدیک اس کی یہ موشگافی ناقابلِ ذکر تھی؟" پھاڑ کھانے والے لہجے میں پوچھا گیا۔

"وہ سمجھ رہا تھا کہ تجویز میری ہے۔" جہانگیر کے لیے بولنا دشوار ہو رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بولنے والے نے میٹنگ میں موجود نہ ہونے کے باوجود ڈینی کے الفاظ من و عن کیسے دہرا دیے تھے؟

وہ ڈینی کے چڑانے والے رویّے کی بنا پر خود بھی اس سے اکثر نالاں رہتا تھا مگر وہ اس کا جاں نثار دوست تھا۔ اس کے بارے میں جہانگیر سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ سربراہ سے اس کی شکایت کرے مگر اب باس خود ڈینی کے بارے میں کرید رہا تھا۔

"وہ تمہارے احکام کا پابند تھا۔" جہانگیر کو پھنکار سنائی دی۔ "اسے یہ جرأت کیسے ہوئی کہ اس قسم کی بکواس کرے؟"

"بس ذرا وہ زیادہ بولتا ہے۔" جہانگیر اپنی پیشانی سے پسینہ صاف کرتے ہوئے نقاہت زدہ آواز میں بولا۔

"مجھے اس کے لب و لہجے سے بغاوت کی بُو آرہی تھی۔" سرد اور بے رحمانہ لہجے میں کہا گیا۔ "شاید اس کا علاج کرنا پڑے گا۔"

جہانگیر کانپ اٹھا۔۔۔ علاج کا مطلب وہ بخوبی سمجھتا تھا۔

"اس بار اسے معاف کردیں، آئندہ محتاط رہے گا۔"
جہانگیر گھگھیایا۔

لائن پر چند ثانیوں کے لیے سکوت چھا گیا جیسے وہ سوچ میں پڑ گیا ہوں۔ اس کی پُرسکون آواز سنائی دی "تم ذمے دار آدمی ہو، تمھاری سفارش کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ یاد رکھو کہ میں ہر وقت اپنی آنکھیں کھلی رکھتا ہوں۔"

"مجھے اندازہ ہے سر!" جہانگیر جھجکتے ہوئے بولا "مگر میں حیران ہوں کہ آپ لفظ بلفظ ہر بات سے واقف ہیں۔"

مختصر سی ہنسی پُرغرور تھی "جیوا ہاؤز پوری طرح بگڈ ہے۔ میں میلوں دور ہونے کے باوجود اس چھت کے نیچے لیے جانے والے سانسوں کی آواز بھی سن سکتا ہوں۔ وہاں بہت کچھ کہا جاتا ہے، یہ اور بات ہے کہ میں غیر ضروری باتوں میں سر نہیں کھپاتا۔"

جہانگیر کے بدن میں سنسناہٹ دوڑ گئی "میرے لیے آپ کی ذات حیرت ناک ہے سر! وہاں کوئی بھی چیز ایسی نہیں ہے جس پر بگ ہونے کا شبہ کیا جا سکے۔"

"اس چکر میں کبھی نہ پڑنا" تادیبی لہجے میں کہا گیا "تم کبھی ان کا سراغ نہیں پا سکو گے... ہاں میٹنگ روم میں نصب آلے کے ریسیور میں کچھ فنی خرابی ہو گئی ہے تو مجھے ایک عارضی ٹرانسمیٹر وہاں پہنچانا پڑا۔ وہ ننھا سا طاقتور ٹرانسمیٹر تمھاری کرسی کے پاس میز کی نچلی سطح سے چپکا ہوا ہے۔ میرا پرانا ریسیور ٹھیک ہو چکا ہے چاہو تو نیا ٹرانسمیٹر نکال کر تلف کر دو۔"

جہانگیر سن رہ گیا۔ اس کا ذہن ماضی کے ان تبصروں میں الجھ گیا جو وہ جیوا ہاؤز میں کرتا رہا تھا... کہیں اس کے منہ سے کوئی ایسی غیر ذمے دارانہ بات نہ نکلی ہو جو اس کی گرفت کا سبب بن جائے کس قدر بے بس تھا وہ سربراہ کے سامنے۔

"بہت بہتر سر!" اسے اپنی آواز کسی گہرے کنویں کی تہہ سے ابھرتی ہوئی محسوس ہوئی۔

بغیر کسی جواب کے سلسلہ منقطع ہو گیا اور جہانگیر ریسیور کریڈل پر ڈال کر تھکے ہوئے انداز میں مسہری پر گر گیا۔

اس کا دل کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا، بدن میں چیونٹیاں رینگ رہی تھیں اور تنفس کی رفتار تیز ہو چکی تھی۔

اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اسی وقت جیوا ہاؤز کی طرف دوڑ لگا دے اور کانفرنس ٹیبل کے نیچے سے ٹرانسمیٹر اکھاڑنے کے بعد اس عمارت کو ادھیڑ کر رکھ دے مگر خوف کے باعث اسے اپنی خواہش دبانی پڑی۔ اسے واضح طور پر ایسی کسی حماقت کے ارتکاب سے روکا گیا تھا۔

گروپ میں اس کی سربراہی کا آغاز بہت اچھے انداز میں ہوا تھا۔ مگر پھر غیر محسوس طریقے پر اس کی ذات پر سربراہ کی گرفت مضبوط ہوتی چلی گئی اور اب وہ اپنے سائے سے بھی خوف محسوس کر رہا تھا، اس کا اندازہ تھا کہ اب وہ اپنے پُراسرار سربراہ کی مرضی کے بغیر آزادی سے سانس بھی نہ لے سکے گا۔ بظاہر وہ آزاد تھا مگر حقیقت میں کسی نادیدہ ذات کا قیدی۔

وہ بستر پر چت پڑا چھت کو گھورتے ہوئے گہرے گہرے سانس لیتا رہا۔ غنیمت یہ تھا کہ ان دنوں اس کی بیوی لاہور گئی ہوئی تھی ورنہ وہ یقینی طور پر اس سے خاصی کڑی بازپرس کرتی اور اس کے لیے جواب دہی مشکل ہو جاتی۔

اس کی بیوی لاہور کے ایک معزز گھرانے کی بیٹی تھی جس کا کراچی میں بھی کاروبار تھا۔ گو ان کی شادی روایتی انداز میں ہوئی تھی مگر وہ جہانگیر کو بے حد چاہتی تھی۔

اس کے نزدیک جہانگیر ایک اوسط درجے کی ٹیکسٹائل فیکٹری کا بلا شرکت غیرے مالک تھا جہاں سے اسے معقول آمدنی تھی، وہ اس کے خفیہ کاروبار سے قطعی لاعلم تھی۔

اور جہانگیر کے لیے اس کا خفیہ کاروبار ہی سب کچھ تھا۔ اسی میں کما کر اس نے اسٹیٹ ایجنسی کی آڑ لی اور اپنے اثاثوں کے اظہار کی ایک قانونی راہ نکال لی پھر مکان کے بعد وہ فیکٹری کی خرید لی۔ جب اس کے پاس پیسہ آیا تو کسی نے بھی اس کے ماضی کے بارے میں زیادہ جستجو نہیں کی اور رفتہ رفتہ وہ معاشرے کا ایک آبرومند رکن بن گیا۔

اب اسے آمدنی کے ساتھ اپنی یہ آبرو بھی بہت عزیز تھی۔

⁂

چرس کے مضمرات خاصے تباہ کن تھے۔

بھنگ کے پودے کی کاشت بہت آسان تھی اور پھر اس سے چرس کی تیاری بہت زیادہ دشوار نہیں تھی۔ ملکی قانون سے ماورا [illegible] میں چرس فروش فخریہ اپنی دکانوں پر پہاڑی بکروں کی سفید بالوں والی کھال کی نمائش کیا کرتے تھے جو اس طریقۂ کار کی تشہیر کا ایک جانا بوجھا ذریعہ تھی جس کی مدد سے بہترین چرس تیار کی جاتی تھی۔

چرس کی ایک گولی چار سے چھ گھنٹوں کے لیے کافی ہوتی تھی۔ گہری سیاہی مائل سبز گولی کو دیا سلائی کی حرارت نرم کر دیتی تھی پھر اسے تمباکو میں ملا کر ہتھیلی پر خوب اچھی طرح رگڑا جاتا تھا تاکہ دونوں [illegible] یک جان ہو جائیں۔

پھر اس تمباکو سے بھری ہوئی سگریٹ کے گہرے گہرے کش دوسرے ہی عالم کی سیر کرانے لگتے تھے۔

آنکھیں بتدریج سُرخ ہوتے ہوتے خونِ کبوتر کا رنگ اختیار کر لیتیں، دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتیں، پیاس کا احساس بڑھنے لگتا، سینے پر کھنچاؤ طاری ہو جاتا، ہلکی سی غنودہ کیفیت لطافت کے ایک سمندر میں ہچکولے دینے لگتی اور بھوک کھل جاتی۔

مگر پینے والوں کو ان اثرات کا نہ زیادہ احساس ہوتا تھا، اور نہ انھیں ان سے کوئی غرض تھی۔ ان کے لیے چرس ایک ایسا سستا نشہ تھا جس کی مدد سے ذہن عالمِ سرور میں کھو کر زمان و مکان کے احساس سے یکسر عاری ہو جاتا تھا۔

چرس کے سہارے آٹھ گھنٹے کام کرنے والا مزدور پلک جھپکائے اور تکان محسوس کیے بغیر سولہ اور اٹھارہ گھنٹے تک کام کر سکتا تھا، کراچی سے حیدرآباد تک پہنچ کر اونگھنے والا ٹرک ڈرائیور کہیں رکے بغیر ملتان تک مسلسل ڈرائیونگ کر سکتا تھا۔

اس کے مضر اثرات سے نشئی باز بے خبر تھے یا جان بوجھ کر اس بارے میں سوچنا نہیں چاہتے تھے۔ نئے عادی تو آسانی سے اعصابی اختلال کا شکار ہو جاتے جو عادی تھے ان کے بھی اعصابی ردِعمل میں ہم آہنگی برقرار نہ رہتی، بصارت کے زاویے بدل جاتے، خدوخال سے لے کر سراپا تک بدلا بدلا نظر آنے لگتا اور سب سے بڑا اثر قوتِ فیصلہ پر پڑتا، جو گاڑی چند سو گز دور ہوتی میلوں دور نظر آتی، سامنے سے سڑک کے وسط میں آتا ہوا دیوہیکل ٹرک کچی پٹری پر چلتا ہوا نظر آتا اور یوں ہولناک حادثے رونما ہوتے، متعدد ہلاک ہو جاتے، جو بچ رہتے وہ بھی زخموں سے چور ہوتے یا زندگی بھر کے لیے معذور ہو جاتے لیکن ان تباہ کاریوں کے باوجود چرس مقبول تھی۔ روز بروز اس کا استعمال بڑھتا جا رہا تھا۔ سستی آبادیوں میں ٹھکانا بنانے کے بعد یہ وبا معزز گھرانوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی اور شہر میں چرس کی روزانہ کھپت منوں کی مقدار میں ہو رہی تھی۔

مگر ماہرین کو ایک ہی امید تھی۔ ابلاغِ عامہ کے ذرائع سے چرس کی تباہ کاری کی تشہیر لوگوں کو غول در غول اس وبا میں مبتلا ہونے سے بچا سکتی تھی اور جو اسے ترک کرنا چاہتا تھوڑی سی قوتِ ارادی کے ساتھ اسے ترک کر سکتا تھا چونکہ چرس کا چنگل بہت زیادہ ہولناک نہیں تھا۔ دو چار دن کی طلب، سستی اور تکان کے بعد اس کے اثرات یکسر ختم ہو سکتے تھے۔

ان امیدواروں کے ساتھ ہی ایماندار اہل کاران چور دروازوں کا بھی قلع قمع کرنے میں مصروف تھے جن سے گزر کر یہ زود اثر نشہ معاشرے کی رگوں میں سرایت کرتا جا رہا تھا۔

پاکستان ہی میں نہیں بلکہ دنیا کے گوشے گوشے میں چرس مقبول ہو رہی تھی۔ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے گروپ اجتماعی تلذذ میں مبتلا ہو رہے تھے، موسیقار اس کے سرور میں لافانی دھنیں تلاش کرنے کے دعویدار تھے، طالب علموں میں یہ شوق فیشن بن رہا تھا۔ اداکار اس کے دم لگا کر سیٹ پر گھنٹوں تیز ترین روشنیوں میں کام کرتے رہتے تھے اور پھر نیا شاٹ دینے کے لیے تیار رہتے۔ زندگی کا کوئی شعبہ اس وبا سے محفوظ نہیں تھا۔

ملکی مفاد کو اپنی ذمے داری سمجھنے والی حکومت پوری قوت کے ساتھ اس لعنت کا قلع قمع کرنے میں مصروف تھی عالمی ادارے حرکت میں آ چکے تھے اور ساری کوششیں اس ایک نکتے پر مرکوز تھیں کہ ان زمینوں کو بانجھ کر دیا جائے جہاں برگِ حشیش کے پنپنے کے آثار ہوں، اس کے پیداواری مراکز کو نیست و نابود کیے بغیر اس زرعی لعنت سے نجات ناممکن تھی۔

مگر یہ کام اتنا آسان نہیں تھا۔ جنوبی امریکہ، شمالی افریقہ اور ایشیا کے دشوار گزار علاقوں میں اس منفعت بخش فصل کی کاشت جاری تھی۔ وہ علاقے اوّل تو ویسے ہی بیرونی عناصر کی پہنچ سے باہر تھے اور جہاں پہنچا بھی جا سکتا تھا وہاں شہری قوانین کی رسائی نہیں تھی۔

یونیسکو کا نارکوٹک ڈرگس کا کمیشن اپنے طویل اجلاسوں میں انسدادِ منشیات کی پالیسیوں میں [illegible] ڈھونڈ کر انھیں بند کرنے کی راہیں تلاش کر رہا تھا اور بین الاقوامی نارکوٹکس کنٹرول بیورو اپنے پورے انتظامی اختیارات بروئے کار لا رہا تھا لیکن اس طوفان میں کسی کمی کے دور دور تک آثار نہیں تھے بلکہ وہ دن بدن بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

شہر میں انسدادِ منشیات کے بارے میں ایک بین الاقوامی سیمینار ہو رہا تھا جس میں دنیا کے چیدہ چیدہ ماہرین شریک تھے۔

وہ سر جوڑے تدبیریں کر رہے تھے اور شہر میں ہزارہا لوگ اپنے گاڑھے خون پسینے کی کمائی سے چرس خرید رہے تھے، دم لگا رہے تھے اور اپنی دنیا میں مگن تھے۔

اس دوران میں جب آبکاری کے محکمے کو مخبروں سے یہ اطلاع ملی کہ شہر میں اچانک چرس کا قحط پڑ گیا ہے تو پورے محکمے میں حیرت کی ایک خوشگوار لہر دوڑ گئی۔ چند ایسے بھی تھے جو اس خبر کو اپنے سہانے مستقبل کے لیے فالِ بد سمجھ کر منہ لٹکائے بیٹھے تھے۔

پچھلے چار پانچ ہفتوں میں نہ پولیس نے کوئی بڑا چھاپہ مارا تھا نہ آبکاری کے حکام نے بھاری مقدار میں مال پکڑا تھا، ساری کارروائی گھومتے پھرتے آوارہ گرد لوگوں تک محدود تھی جن کے قبضے سے دو چار سو گرام "مال" برآمد ہوتا تھا، ایسے زرخیز ماحول میں چرس کا قحط ایک انہونی سی بات لگتی تھی لہٰذا اعلیٰ افسران ذاتی طور پر ان اطلاعات کی تصدیق پر تل گئے۔

گل باز خان شہر کے ایک مشہور ترین اڈے کا مالک تھا۔ ٹھرے اور چرس سے اعلیٰ ولایتی شراب تک ہر شے اس کے ٹھکانے

پر مل جاتی تھی لیکن اڈے کے قرب وجوار میں ان اشیا کا استعمال ممنوع تھا۔ ضرورت مند آتے اور رقم ادا کر کے مطلوبہ نشہ ساتھ لے جاتے۔ اپنے اس کاروبار کے تحفظ کے لیے وہ ماہانہ ایک بھاری رقم متعلقہ ایجنسیوں کو ادا کرتا تھا لیکن جب چرس کا بحران پیدا ہوا تو گل باز کی آمدنی بُری طرح متاثر ہوئی کیونکہ اس علاقے میں سب سے زیادہ کھپت چرس ہی کی تھی۔

جب اس کی آمدنی میں فرق آیا تو اس نے بھتے کی رقم میں بھی نمایاں کمی کر دی۔ اس نے درمیانی آدمی کو رقم میں کمی کا سبب بتا دیا تھا جس کی تصدیق پچھلے ہفتوں میں مخبروں کی اطلاعات سے ہوتی تھی مگر جب اپنے مفادات پر ضرب پڑی تو لوگ یقین نہ کر سکے کہ ان کی چشم پوشی کے باوجود شہر میں چرس کا بحران ہے۔

اس بے یقینی کا ایک ہی نتیجہ برآمد ہوا اور گل باز خان کی نیت پر شبہ کیا جانے لگا۔

اسے اس کے اڈے پر گھیرنا نامناسب تھا، وہاں اس کے حواریوں کے علاوہ گاہک بھی اس کے حامی ہو جاتے اور پارٹی سنگین دشواریوں سے دوچار ہو سکتی تھی لہٰذا فیصلہ کیا گیا کہ گل باز خان کو تھانے میں بلا کر باز پرس کی جائے۔

اسے بلانا بھی ایک مسئلہ تھا، وہ لاکھ ناپسندیدہ اور غنڈہ سہی لیکن باقاعدہ خراج گزار تھا۔ اس کے بھتوں کی باقاعدگی نے اسے بہت خودسر اور بدزبان بنا دیا تھا یہی وجہ تھی کہ گشت والے بھی اس کے اڈے سے کنی کاٹ کر نکلتے تھے۔

اس کی اپنے اڈے پر کسی سرکاری اہلکار کی موجودگی سے برہمی کا جواز بھی تھا جس کا وہ برملا اظہار کرتا پھرتا تھا۔

اس کے گاہکوں میں نشئیوں کے ساتھ شرفا کی بھی معقول تعداد تھی جو نشے کے ساتھ عزت کے بھی شوقین تھے، ان ہی کا اعتماد قائم رکھنے کے لیے گل باز خان بھاری رقوم ادا کرتا تھا تاکہ اس کے گاہک بلا کسی خوف یا تردد کے اس کے اڈے پر آتے رہیں۔

آخر کار ایک نئے اے۔ ایس۔ آئی کو طلبی کا پیغام گل باز خان تک پہنچانے پر مامور کیا گیا۔ اسے سمجھا دیا گیا تھا کہ وہاں جاتے ہوئے وہ وردی کے بجائے سادہ لباس استعمال کرے۔

وہ سادہ پوش جوان افسر گل باز خان کے اڈے پر پہنچا تو وہاں لوگوں کی خاصی آمدورفت جاری تھی۔ وہ افسر سیدھا کاؤنٹر پر جا پہنچا۔

گل باز خان اپنے گاہکوں کے چہرے خوب پہچانتا تھا، ایک اجنبی کو سامنے پایا تو اس کی تیوریوں پر بل آ گئے۔

”گل باز خان تم ہی ہو؟“ افسر نے اپنی تسلی کے لیے سوال کیا۔ وہ اس کا نام ہی سنتا رہا تھا، صورت آشنا نہیں تھا، بس اندازے سے کاؤنٹر پر چلا گیا تھا۔

”کیا بات ہے؟“ کاؤنٹر والے نے درشت لہجے میں پوچھا۔

”تھانیدار صاحب نے تمھیں بلایا ہے۔“ اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

”خوب۔“ وہ مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے تضحیک آمیز انداز میں مسکرایا اور پھر کاؤنٹر کے پیچھے سے باہر نکل آیا۔

”میرے ساتھ آؤ۔“ اس نے افسر کا بازو تھاما اور ایک بیٹھک میں گھس گیا۔

”ہاں اب بتاؤ کیا کہہ رہے تھے؟“ وہ دروازے کی کنڈی چڑھا کر پلٹا تو اس کی نگاہیں خشمناک ہو رہی تھیں۔

”تمھیں تھانیدار صاحب نے بلایا ہے۔“ نوجوان افسر نے تحمل سے کام لیتے ہوئے کہا۔

”کیا کام ہے؟“

”مجھے نہیں معلوم۔“

”سنو دوست!“ گل باز خان گستاخانہ انداز میں اس کے شانے پر ہاتھ مار کر بولا۔ ”تم سادہ لباس میں ہو اس لیے میں کہتا ہوں کہ تم کون ہو، تمھاری ٹھکائی کرا کے باہر پھنکوا سکتا ہوں، پوچھے گا تو کہہ دوں گا کہ تم نے ہنگامہ کرنے کی کوشش کی تھی اور یہاں کے لوگ میری بات کی گواہی دیں گے، چاہوں تو تمھیں آبکاری والوں کے حوالے بھی کر سکتا ہوں جو تمھارے قبضے سے آدھا کلو چرس کی برآمدگی کی کہانی سنائیں گے جو تم مجھے بیچنا چاہتے تھے۔“

”مگر کیوں؟ یہ سب تم کیوں کرو گے؟“ نوجوان افسر شدید غصے کے باوجود موقع کی نزاکت بھانپ چکا تھا۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ وہ نادانستگی میں بھیڑیوں کے غول میں آ پھنسا تھا۔

”اس لیے کہ مجھے تم پر شبہ ہے۔“ گل باز اپنی بائیں مونچھ مروڑتے ہوئے مکارانہ لہجے میں بولا۔ ”مجھے آج تک تھانے میں طلب کرنے کی نوبت نہیں آئی ہے۔“

”میں سرکاری گاڑی میں آیا ہوں جو ڈرائیور سمیت اگلے نکڑ پر موجود ہے۔“

”اوہ، تو اس جیپ میں تم ہی آئے ہو۔“ گل باز خان کا لہجہ نرم پڑ گیا۔ ”اس جیپ کی آمد کی اطلاع تو مجھے تمھارے آنے سے پہلے مل گئی تھی۔۔۔ جیپ وہاں کیوں چھوڑ دی ہے؟“

نوجوان افسر تاؤ کھا کر رہ گیا۔ ”سنا تھا کہ تم اپنے اڈے پر سرکاری گاڑی اور وردی پسند نہیں کرتے اس لیے جیپ وہاں چھوڑ کر سادہ لباس میں آیا ہوں۔“

”ذرا ٹہلنے کا موڈ تھا۔“ پہلا جواب اس نے سوچا لیکن اس بات کو خوشامد سمجھتے ہوئے گول کر گیا اور ٹہلنے کی بات چھیڑ دی۔ ”تم چلو، میں ابھی آتا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے دروازے کی کنڈی کھول دی۔

جب وہ افسر باہر نکلنے کے لیے گل باز خان کے قریب سے گزرا تو اس نے مربیانہ انداز میں اس کی کمر پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”بُرا نہ ماننا میری کسی بات کا۔۔۔ تمھاری طرح ہمارا پیشہ بھی ایسا ہی ہے کہ ہر ایک کو اس وقت تک مشکوک سمجھتے ہیں جب تک وہ خود کو قابلِ اعتماد نہ ثابت کر دے۔“

وہ افسر وہاں سے نکلا چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد ہی تھانے کی حدود میں ایک چم چم کرتی ہوئی سفید کار داخل ہوئی۔ اس میں اگلی نشست سے دو دراز قامت مسلح آدمی اترے جن کے ہولسٹروں میں ریوالوروں کے دستے چمک رہے تھے ان میں سے ایک نے عقبی دروازہ کھولا اور گل باز خان سینہ تانے نیچے اتر کر عمارت کی طرف بڑھ گیا۔

نخوت آمیز اشاروں سے شناساؤں کے سلام کا جواب دیتے ہوئے وہ سیدھا انچارج کے کمرے میں گھستا چلا گیا۔

اندر رسمی تپاک فقروں کا تبادلہ ہوا اور گل باز خان ایک کرسی پر جم گیا۔ وہاں تین افسر موجود تھے۔

”کیسے یاد کیا مجھ ناچیز کو؟“ اس نے بیٹھتے ہی سوال کر ڈالا۔

”دھندا کیسا چل رہا ہے؟“ معنی خیز لہجے میں سوال کیا گیا۔

”مندا ہے۔۔۔ آپ لوگوں کو دے دلا کر ٹھیے کا خرچ بھی نہیں نکل رہا۔“ وہ بے پروائی کے انداز میں بولا۔ ”سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا ہو رہا ہے۔“

”سمجھ میں تو ہماری بھی نہیں آ رہا گل باز خان!“ دوسرے افسر نے کہا۔ ”اسی لیے تمھیں یہاں تک آنے کی تکلیف دی ہے۔“

”مارکیٹ میں مال ایک دم نایاب ہو گیا ہے۔“ گل باز خان کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ ”کسی قیمت پر نہیں مل رہا۔“

”باہر کی کوئی پارٹی تو نہیں آ گئی شہر میں؟“

گل باز خان ہنسا۔ ”کوئی پارٹی وارٹی نہیں آئی بس اوپر سے مال نہیں آ رہا۔“

”کوئی ایک ہی پارٹی تو دھندا نہیں چلا رہی۔“

”بڑی پارٹی ایک ہی ہے جس کی مٹھی میں پورا شہر ہے۔“ گل باز خان یوں بولا جیسے کوئی بزرگ نوآموز بچوں سے مخاطب ہو۔ ”جو چھوٹے موٹے ہیں وہ اپنی چاندی کر رہے ہیں، ملاوٹ کیا ہوا مال اصل سے چار گنا داموں پر بیچ رہے ہیں۔“

”خیر یہ تمھارا اپنا معاملہ ہے۔“ انچارج اکتائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”آج قحط ہے تو کل مال کی فراوانی بھی ہو گی اور تم بھی سونا کماؤ گے۔۔۔۔“

”مارکیٹ بڑی مشکل سے بنتی ہے تھانیدار صاحب!“ گل باز خان اس کی بات کاٹ کر قدرے طنزیہ لہجے میں بولا۔ ”جو گاہک ایک بار دوسرے اڈے پر لگ گئے وہ سمجھو ہاتھ سے گئے، ان چند دنوں کا اثر سال ڈیڑھ سال سے پہلے قابو میں نہیں آئے گا۔“

”اونچ نیچ دیکھنا تمھارا کام ہے۔“ انچارج کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔ ”ہم سے جو وعدہ ہے اس پر تمھیں ہر حال میں عمل کرنا ہو گا۔“

”میں جو دے چکا اس سے زیادہ میرے بس سے باہر ہے۔“ گل باز خان نے خشک لہجے میں کہا۔ ”اگلے مہینے تو شاید یہ بھی نہ دے سکوں، اڈے پر میل کا مال نہ ہو تو دھندا بڑی تیزی سے چوپٹ ہوتا چلا جاتا ہے۔“

”تو پھر اڈہ بند کر دو۔“

”شاید یہ بھی کرنا پڑ جائے مگر ابھی کچھ دن انتظار کرنا پڑے گا۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے کرسی چھوڑ دی اور کھڑا ہو گیا۔

”کہاں چلے؟“ انچارج نے اپنے بید کے سرے سے میز کی سطح بجاتے ہوئے سوال کیا۔

”یہ رش کا وقت ہے۔“ گل باز خان اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالتے ہوئے بولا۔ ”پیغام ملا تو دوڑا چلا آیا، پھر کبھی فرصت کے وقت آؤں گا۔“

”اس کی ضرورت نہیں پڑے گی گل باز خان!“ انچارج نیم وا آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرایا۔ ”اب تم ہمارے مہمان رہو گے۔“

گل خان کے چہرے پر زلزلے کے آثار ابھر آئے۔ ”مجھے ایسا مذاق پسند نہیں ہے تھانیدار صاحب!“ لہجے سے برہمی ٹپک رہی تھی۔

”بیٹھو“ انچارج بید زور سے میز کی سطح پر مار کر دہاڑا۔ پھر دو تین ثقیل گالیاں دے کر بولا۔ ”مذاق کروں گا میں تجھ سے؟“

گل باز خان کھڑا کینہ توز نگاہوں سے انچارج کو گھورتا رہا۔ اس کا چہرہ غصے سے لال بھبوکا ہو رہا تھا۔

بقیہ دونوں افسروں نے حفظِ ماتقدم کے طور پر اپنے سروس پستول نکال لیے تھے۔

”بیٹھ جاؤ گل باز! اس وقت تم حراست میں ہو۔“ ان میں سے ایک نے پستول کی آہنی نال کو جنبش دیتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔

گل باز خان کی قہربار نگاہیں بولنے والے کے چہرے سے پھسلتی ہوئی پستول پر رک گئیں۔ معاً اسے احساس ہوا کہ بالادستی

کے گھمنڈ میں وہ چوہے دان میں آ پھنسا ہے مگر یہ احساس بھی اس کے دماغ میں کھولتے ہوئے لاوے کو سرد کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

"میں دیکھ لوں گا۔" وہ کسی زخمی بھیڑیے کی طرح غرّایا۔ "ایک ایک کو دیکھ لوں گا۔ میرا بال بھی بیکا نہ ہو سکے گا۔"

اور پھر وہ بُری طرح چیخ پڑا۔ انچارج نے پوری قوت سے بید اس کے سینے پر مارا تھا۔ گل بازخان نے جھلا کر بید کا سرا پکڑ لیا اور دوسرے ہی جھٹکے میں اسے چھین لینے میں کامیاب ہو گیا۔

وہ چیخ پکار معمولی بات نہیں تھی۔ تھانے کی حدود میں کسی کی اودھم بازی قابلِ دست اندازی پولیس تھی۔

اردلی نے بوکھلا کر اندر جھانکا اور پھر برآمدے میں سیٹی کی تیز آواز گونجتی چلی گئی۔ آناً فاناً میں دس بارہ مسلح اور غیر مسلح سپاہی دندناتے ہوئے کمرے میں گھس آئے۔

"لے جاؤ اسے دھکّے مار کر۔" انچارج غصّے سے بے قابو ہو کر دہاڑا۔ "بند کر دو حوالات میں۔"

"باہر گاڑی میں اس کے باڈی گارڈ بھی ہیں سر اس کے ساتھ۔" سپاہیوں میں سے [illegible] سنایا۔

"انھیں بھی ... کہیں سمجھا ہے انھوں نے قانون کو۔" وہ دہاڑا۔

دو سپاہیوں نے [illegible] ہاتھ دے کر گل بازخان کو جکڑ لیا، تیسرا بندوق کے کندے سے اسے آگے دھکیلنے لگا، بقیہ سپاہی اس سے پہلے ہی اپنے سربراہ کے حکم کی تعمیل میں گل بازخان کے ساتھیوں کو گرفتار کرنے نکل گئے تھے۔

گل بازخان اور اس کے دونوں حیرت زدہ محافظوں کو جب تنگ اور نیم روشن حوالات میں آہنی سلاخوں کے پیچھے دھکیلا گیا تو احساسِ شکست سے اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ شاید نوآموز اے۔ ایس۔ آئی کی بددعا اس کا دبدبہ نگل گئی تھی ورنہ وہ کبھی رسوا نہ ہوا تھا۔

اس کے باڈی گارڈز غیر مسلح کیے جا چکے تھے اور وہ حیران و پریشان اپنے آقا کی زبان سے کچھ سننے کے منتظر تھے مگر وہ خاموشی سے ایک دیوار سے جا لگا تھا۔

نشہ کوئی بھی ہو، بہت موذی ہوتا ہے۔ غرور اور بالادستی کا نشہ ہو تو حشر گل بازخان جیسا ہوتا ہے۔ مگر شاید نشے کے بغیر کام بھی نہیں چلتا۔ مزدور اپنے دن بھر کے دکھ درد اور تھکان کو نشے میں اڑا دیتا ہے، سیٹھ کاروباری رقابتوں اور گھاٹے منافع کے دکھڑوں کو ڈبل وہسکی کے گلاس میں گھول کر پی جاتا ہے، اداکار کسی قبر کے سرہانے اپنی بے وفا محبوباؤں کی گنتی کو بوتلوں کی قبر میں دفن کر دینے کی کوشش کرتا ہے... نشہ لوگ اس لیے کرتے ہیں کہ اعصاب کو سکون مل سکے، خمار کی ایک دلفریب کیفیت طاری ہو جائے اور جب لوگ قانون کو سُلانا چاہتے ہیں تو اس کے لیے رشوت کی خواب آور گولیاں استعمال کراتے ہیں۔

جب تک اثر رہتا ہے، قانون اپنی ضخیم کتابوں میں بند میٹھی نیند سویا رہتا ہے اور جہاں خواب آور گولیوں کی مقدار میں کمی ہوئی پوری قوت سے انگڑائی لے کر بیدار ہو جاتا ہے، اندھی آنکھیں خوردبین بن جاتی ہیں، معاشرے کے رِستے ہوئے ناسوروں کے بارے میں یکایک الہام ہونے لگتا ہے، مظلوم ناموں کا [illegible] شروع ہو جاتا ہے۔

انچارج کو وہ مظلوم سماجی کارکن یاد تھے جو بارہا وفود لے لے کر اس کے آستانے پر حاضری دے چکے تھے، وہ علاقے کو منشیات سے پاک دیکھنا چاہتے تھے لیکن جاننے کے باوجود گل بازخان کا نام لینے سے ڈرتے تھے اور انچارج ہمیشہ تان اسی ایک نکتے پر توڑتا تھا کہ اس کی کتابیں صاف ہیں، عملہ کسی اڈے سے لاعلم ہے، وہ لوگ کسی فرد یا اڈے کی نشاندہی کریں تو وہ اس انکشاف کی بنیاد پر کارروائی کریں۔

اس کی دانست میں ان مظلوموں کی دادرسی کا موقع آ گیا تھا۔ اس نے فوری طور پر ماتحت عملے کو دوڑا کر ان میں سے دو سربرآوردہ افراد کو تھانے میں بلوا لیا۔ وہ اپنی جملہ خطائیں یاد کرتے اور لرزتے فریادی بنے انچارج کے حضور پہنچے تو خلافِ توقع یہ انکشاف سن کر حیران رہ گئے کہ سر توڑ کوشش کے بعد تھانے والوں نے علاقے میں منشیات کے ایک خفیہ اڈے کا سراغ لگا لیا تھا جہاں ان کی موجودگی میں چھاپہ مارنے کی تیاریاں مکمل تھیں۔

تھانے میں عملہ زیادہ تھا اور سواریاں کم۔ وہ دونوں شریف آدمی پریشان ہو گئے کہ کہیں اس فنی دشواری کی بنا پر ان کی دعاؤں کی قبولیت کی ساعت سعید نہ گزر جائے لہٰذا قریبی گھروں سے دو گاڑیاں ادھار لی گئیں اور یہ پُرشکوہ جماعت دشمن کی کمین گاہ پر دھاوا بولنے روانہ ہو گئی۔

گل بازخان کے اڈے پر تو کیا، اس کے قرب و جوار میں بھی کبھی پولیس نہیں دیکھی گئی تھی اور جب پولیس وہاں پہنچی تو اُسے سجا سجایا میدان خالی ملا۔

گلیوں میں پھیلے ہوئے مخبروں میں سے کسی نے اڈے پر پولیس کی آمد کی خبر پہنچا دی تھی اور جو جس حال میں تھا وہاں سے بھاگ نکلا تھا۔ ٹھرا، دیسی وہسکی، بیئر کے کریٹ، غیر ملکی وہسکی، مینڈریکس، پیتھیڈین، افیم، کیا تھا جو اس اڈے سے نہ برآمد ہوا۔ کمی تھی تو

بس چرس کی جو ان دنوں شہر میں عنقا ہو رہی تھی۔

محلے داروں کی موجودگی میں مشیر نامے تیار ہوئے، سامان کی فہرست بنائی گئی اور اڈہ سیل کر دیا گیا۔ گرفتاری کوئی نہ ہو سکی۔

تھانیدار اور اس کے عملے نے کسی کو ہوا بھی نہ لگنے دی کہ گل بازخان اپنے دو ساتھیوں سمیت پہلے ہی حوالات میں تھا۔

"یہ بُرا ہوا کہ وہ نکل گیا۔" واپسی میں ایک سماجی کارکن تشویش زدہ لہجے میں بولا۔ "وہ یہی سمجھے گا کہ ہماری مخبری پر چھاپہ مارا گیا ہے.... اب وہ ہم سے ضرور انتقام لے گا۔"

تھانیدار ہنسا اور مربیانہ لہجے میں بولا۔ "قانون امن پسند شہریوں کو پورا تحفظ فراہم کرتا ہے۔ آپ فکر نہ کریں، اس کی گرفتاری تک آپ دونوں کے گھروں پر ایک ایک مسلح سپاہی کا پہرا رہے گا۔ ...ابھی تو پوری رات پڑی ہے، ہم شہر کا کونا کونا چھان ماریں گے، وہ ہاتھ نہ آیا تو ہماری ساری کارروائی رائیگاں جائے گی اور وہ لعین شہر کے کسی اور حصّے میں معصوم شہریوں میں اپنی زہر فروشی کا جال پھیلا لے گا۔"

تشویش کا اظہار کرنے والوں کی آنکھوں میں ممنونیت کے جذبات امڈ آئے۔

گھر لوٹتے ہوئے وہ دونوں نہ صرف خوش تھے بلکہ تہہ دل سے اپنے علاقے کے تھانیدار کی شرافت اور ہمدردی کے معترف بھی تھے کیونکہ اس نے انھیں محض زبانی بہلاوا نہیں دیا تھا۔ چلتے ہوئے حسبِ وعدہ بندوقوں سے لیس دو سپاہی بھی ساتھ کر دیے تھے اور ان کی موجودگی میں سپاہیوں کو حکم دیا تھا کہ ان دونوں کے گھروں کے قرب و جوار میں گل بازخان کا سایہ بھی نظر آئے تو بے دریغ اسے گولی مار دو۔

مگر گل بازخان کے ستارے اچھے تھے کہ اس نے ان میں سے کسی مکان کا رُخ نہیں کیا پھر صبح کے چار بجے تھانے سے آنے والے ایک قاصد نے باری باری ان دونوں کو جگا کر خوشخبری سنائی کہ گل بازخان اپنے دو آدمیوں سمیت اسی علاقے کے ایک ناکے سے گرفتار کر لیا گیا۔

مسلح سپاہی قاصد کے ساتھ لوٹ گئے۔

ان دونوں کو اس وقت زحمت دینے کے بجائے صبح تھانے بلایا گیا تھا تاکہ ملزموں کی شناخت کے ساتھ ضابطے کی دوسری کارروائیاں بھی پوری کرا سکیں۔

اگلی صبح وہ دونوں تھانے پہنچے تو روزنامچہ ان کے سامنے رکھ دیا گیا جس میں پچھلی رات کے چھاپے کی تفصیل درج تھی۔

"اس کا کیا کرنا ہے جی؟" ایک نے سوالیہ نگاہوں سے انچارج کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"چھاپے میں آپ دونوں بھی شریک تھے۔ اس رپورٹ پر اپنے تصدیقی دستخط کر دیں۔" انچارج نے سکون سے کہا۔

"پھر تو اسے پڑھنا ہو گا۔"

وہ دونوں روایتی مُنشیانہ رسم الخط اور زبان میں لکھی ہوئی رپورٹ پڑھنے لگے جس میں جابجا قانونی دفعات کے حوالے سے مختلف اقدامات درج تھے۔

چھاپے کے دوران گل بازخان اور اس کے دو ساتھیوں کی گرفتاری کا ذکر پڑھ کر وہ چونک پڑے کیونکہ اس مرحلے پر رپورٹ خلافِ واقعہ تھی۔

"وہ تینوں اڈے سے تو نہیں پکڑے گئے تھے۔"

"مقدمہ مضبوط بنانے کے لیے یہی کہنا پڑے گا۔" انچارج مضبوط لہجے میں بولا۔ "اگر یہ ظاہر کیا گیا کہ ان تینوں کو چھاپے کے کئی گھنٹے بعد کسی اور جگہ سے پکڑا گیا تھا تو قانوناً انھیں بڑا ملزم قرار نہ دیا جا سکے گا اور وہ ضمانت پر رہا ہو جائیں گے۔"

"مگر عدالتی کارروائی سے تو نہ بچ سکیں گے۔"

"مقدمے میں شروع سے جھول رہا تو زیادہ سے زیادہ انھیں چند ماہ کی سزا ہو سکے گی اور وہ رہا ہو کر پھر وہی دھندا شروع کر دیں گے۔" تھانیدار کی بات میں خاصا وزن تھا۔ "میری تو پوری کوشش یہی ہے کہ علاقے کو ہمیشہ کے لیے اس بدنام آدمی سے نجات مل جائے۔ ایسے چالاک لوگ روز روز قانون کی گرفت میں نہیں آتے.... ایک بار دس بارہ سال کی سزا کاٹ کر جیل کی سلاخوں سے باہر آئے گا تو دوبارہ سر اٹھانے کی ہمّت نہ کرے گا۔"

تھانیدار کی نیّت سراسر مخلصانہ تھی۔ ان دونوں کی سلامتی بھی اسی میں تھی کہ گل بازخان ضمانت پر رہا ہوئے بغیر سیدھا لمبی مدّت کے لیے جیل بھیج دیا جائے۔ وقتی جوش اور معاشرتی خدمت کا جذبہ ایک الگ چیز تھی مگر اس وقت وہ سنگین حقائق سے دوچار تھے۔

محلے برادری کے معزز اور عیال دار ارکان تھے۔ اگر گل بازخان رہا ہو جاتا تو انتقام لینے کے لیے ان کے گھروں کو آگ لگا سکتا تھا، کسی چوراہے پر انھیں زدوکوب کر سکتا تھا یا ان کے بال بچّوں پر ہاتھ ڈال سکتا تھا اور وہ ایمانداری سے اپنی سماج دوستی کی یہ قیمت ادا کرنے کے لیے قطعاً تیار نہیں تھے۔

"مگر وہاں تو لوگوں کے ٹھٹھ لگ گئے تھے۔" دوسرے نے نیم رضامندی کا اظہار کرتے ہوئے ایک نکتہ اٹھایا تھا۔ "یہ افواہ تو پھیل ہی گئی ہو گی کہ اڈے سے سارے ملزم فرار ہو چکے تھے۔"

"سب دور کے تماشائی تھے۔" تھانیدار مکّارانہ انداز میں

مسکرایا۔" استغاثے کے گواہ تو آپ دونوں ہوں گے۔ بدنام مجرموں کو ہم لوگ چوری چھپے ہی گرفتار کرتے ہیں۔۔۔ انھیں سامنے لایا جائے تو ہجوم مشتعل ہو کر ایسے مجرموں کی بوٹیاں اڑا سکتا ہے۔"

تھانیدار شروع سے اب تک معقول استدلال سے کام لیتا آیا تھا۔ گل باز خان سے علاقے کے لوگوں کو شدید نفرت تھی مگر اس کی بدمعاشیوں اور چیرہ دستیوں کے خوف سے لوگ اس سے سلام دُعا رکھنے پر مجبور تھے۔ ان حالات میں کسی کو کیا پڑی تھی کہ عدالت میں پولیس کے موقف کو چیلنج کر کے گل باز خان کی طرفداری کرتا۔

وہ تھانیدار سے متفق ہو گئے اور اس کی ہدایت پر اپنے دستخط کر دیے۔

تھانیدار انھیں گل باز خان اور اس کے ساتھیوں کی گرفتاری کے رموز ذہن نشین کرانے لگا۔

✱

شام کے اخبارات میں جلی سرخیوں میں گل باز خان کے اڈے پر پولیس کے ڈرامائی چھاپے اور تین اہم گرفتاریوں کی خبر موجود تھی۔

ڈینی نے بڑی دلچسپی سے ان تفصیلات کو پڑھا اور زیرِ لب مسکرانے لگا۔

اخباری نمائندوں کو گل باز خان یا اس کے ساتھیوں سے نہیں ملنے دیا گیا تھا لہٰذا اس کارروائی کا دوسرا رُخ سامنے نہ آسکا تھا۔

مگر ڈینی بہت گھاگ تھا۔ سُرخیاں دیکھتے ہی اس نے رائے قائم کر لی تھی کہ گل باز خان کی پولیس والوں سے اَن بن ہو گئی ہو گی۔

ان لوگوں سے چپقلش کا عموماً ایک ہی سبب ہوتا تھا کہ ان کے زیرِ اقتدار علاقے کا کوئی بڑا آدمی ان کے مطالبات تسلیم کرنے سے انکار کر دے یا طے شدہ شرائط میں کٹوتی کر کے عہد شکنی کا ارتکاب کرے۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ ایماندار افسر اپنے علاقے میں کسی بھی قیمت پر کسی برائی کو نہیں پنپنے دیتا تھا اور بدی کا بیج پھوٹتے ہی اس کی بیخ کنی کر گزرتا تھا۔

مگر گل باز خان کا معاملہ دوسری قسم میں نہیں شمار کیا جا سکتا تھا۔ وہ دس برس سے اس علاقے میں ڈنکے کی چوٹ پر اڈہ چلا رہا تھا۔ امتناعِ شراب تو خیر نئی چیز تھی مگر دوسری خطرناک منشیات کا خریدنا، بیچنا، رکھنا یا استعمال کرنا ہمیشہ سے جرم تھا۔

اس اعتبار سے نہ گل باز خان کا جرم نیا تھا نہ علاقے کا۔۔۔ تھانیدار تبدیل ہوا تھا جو ڈینی جیسا خرانٹ آدمی اس خوش فہمی کا شکار ہو جاتا کہ وہ چھاپہ کسی نیک نیّت افسر کی مستعدی کا نتیجہ تھا۔ ایک رائے قائم کرنے کے بعد اس کے لیے واقعات کی کڑیاں ملانی آسان ہو گئیں۔

چرس کی کھپت کے اعتبار سے گل باز خان کے اڈے کا شمار شہر کے بڑے اڈوں میں کیا جاتا تھا اور وہ شروع ہی سے نادر خان کے معتمد تاجروں میں شامل تھا۔

نادر خان اس سے بارہا کہتا رہا تھا کہ گل باز خان ان لوگوں میں سے ہے جو اپنی ذات پر بدترین تشدد سہنے کے باوجود زبان نہیں کھولتے، جسے حقیقی معنوں میں راز تصور کر لیں وہ بات اپنے ساتھ قبر ہی میں لے جاتے ہیں مگر پیسے کے معاملے میں وہ بنیا کاروباری ذہنیت کا مالک تھا پیسے پیسے کے لیے سودے بازی کرتا تھا۔

ان لوگوں کو چرس کے ذخائر تباہ کیے پانچ دن ہونے والے تھے، اس دوران میں ان کے ذریعے ایک تولہ چرس بھی بازار میں نہیں گئی تھی اور ہیروئن کے سیمپل بھی اگلی ہدایات تک روک لینے کا حکم مل گیا تھا لہٰذا بازار میں عجیب افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔

جن لوگوں کی سپلائی کا انحصار اس گروپ پر تھا، بلبلاتے پھر رہے تھے۔ ہزاروں روپے روزانہ کی آمدنی سے محرومی کے ساتھ ہی ان کا مستقبل بھی خطرے میں پڑ گیا تھا۔

آمدنی میں اس خطیر کمی سے دل برداشتہ ہو کر شاید گل باز خان نے بھتے کی رقم میں کٹوتی کرنے کی کوشش کی ہو گی اور شاید یہ تنازع بڑھ گیا ہو گا جس کا نتیجہ اس کے اڈے پر چھاپے کی صورت میں رونما ہوا تھا۔

ڈینی کو یقین تھا کہ وقتی پریشانیوں کے باوجود گل باز خان بچ نکلنے میں کامیاب ہو جائے گا کیونکہ اپنے تحفظ کے معاملے میں وہ بلا کا عیّار تھا۔ جس جگہ اڈہ قائم تھا وہ اس کے ایک ملازم کی ملکیت تھی۔ اسے پوری رقم ادا کرنے کے باوجود کاغذات اپنے نام منتقل نہیں کرائے تھے اور اس کی ملازمت برقرار رکھتے ہوئے اتنی ڈھیل دی ہوئی تھی کہ اڈے کے بیشتر معاملات اسی کی مرضی سے طے پاتے تھے اور نئے آنے والے عموماً اسی کو گل باز خان سمجھتے تھے۔

پولیس زیادہ مستعدی دکھاتی تو اس ملازم کو گھیر لیتی سارا الزام اسی کے سر جاتا اور گل باز خان دوبارہ آزاد ہو جاتا۔ پھر وہی ہوتا جو زیرِ زمین مجرمانہ دنیا میں ایسے قربانی کے بکروں کے لیے ہوا کرتا تھا۔ بچنے والے اپنے ملازم کی وفاداری کے صلے میں نہ صرف جیل میں اس کی خبر گیری کرتے تھے بلکہ اس کی قید کی پوری مدت میں اس کے اہل و عیال کی جملہ مالی ذمہ داریوں کا بوجھ بھی اٹھاتے تھے۔

بڑے مجرموں کے اس روایتی سلوک کا نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ ...کے گرد رہنے والوں میں سے ہر ایک اپنے گھر بار سے بےفکر ...ان کے مفادات کے لیے لڑتا تھا اور سزا سے رہائی کے بعد ...ان کا حواری بنا ہوا نظر آتا تھا۔

فکرمندی کی بات صرف اتنی تھی کہ گل باز خان جیسا جہاں ...دیدہ شخص اپنے اڈے سے ننگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا حالانکہ ...شیات فروشی کا بنیادی اصول یہ تھا کہ خطرہ اچانک سامنے ...جائے تو مال کی پروا کیے بغیر ٹھکانے سے بھاگ نکلو، خواہ ...کوشش میں تشدد یا تھوڑی بہت خونریزی کی نوبت ہی ...ون نہ آ جائے۔ ایک بار جائے واردات سے فرار کے بعد ...می گرفتار بھی ہو جائے تو بےیقینی کے خوف کے باعث کوئی اس ...ے خلاف گواہی دینے کو تیار نہیں ہوتا یہ عدم تعاون قانون اور ...ن کا نفاذ کرنے والوں کو بےبس بنا دیتا ہے۔

ایسے رسوائے زمانہ لوگوں کی بریت پر لوگ بھانت بھانت ...بولیاں بولتے ہیں۔ قانون اور اس کا تحفظ کرنے والوں کو تنقید ...نشانہ بناتے ہیں لیکن ان چشم دید گواہوں کی بزدلی کے بارے ...ں کوئی نہیں سوچتا جو محض اپنے خوف کے باعث آنکھوں دیکھے ...قعات کو زبان پر لانے کی جرأت سے محروم ہوتے ہیں اور یوں ...اشرے پر یلغار کرنے والے بھوکے درندوں کے غول میں ایک ...ی بھیڑیے کا اضافہ کرنے کا سبب بن جاتے ہیں۔

یہ سب خالص نظریاتی باتیں تھیں جن سے ڈینی کو صرف ...ی حد تک دلچسپی تھی کہ وہ رجحانات برقرار رہیں جن سے اس ...آمدنی کو تقویت ملتی رہے۔ وہ معاشرے کی اصلاح کا داعی ...ہیں تھا جو لوگوں کو ان کی بزدلی پر شرم دلا کر انھیں گل باز خان ...ے خلاف سامنے لانے کے لیے نکل کھڑا ہوتا۔

ان دھندوں سے وہ اتنا کما چکا تھا کہ اب آزادانہ طور ...ایمانداری سے زندگی گزار سکتا تھا۔ چاروں کے گروپ میں وہ ...بلا آدمی تھا جس نے اپنی ناجائز آمدنی کو نہایت سُرعت سے ...شک و شبہے سے بالا کر لیا تھا۔

ابتدا میں جائیدادوں کے دھندے کا مشورہ گمنام سربراہ ...سے ملا تھا پھر ڈینی نے عقل پر زور دیا تو اسے بہتیرے دوسرے ...ستے بھی نظر آ گئے۔ ان میں انعامی بونڈ سب سے سہل نظر آئے۔

کسی ضرورت مند اور غریب کے لیے دس بیس ہزار یا لاکھ ...دو لاکھ کا انعام بہت بڑی بات تھی جس کے ذریعے وہ اپنی حسرت ...بھری زندگی کے بہت سے موہوم خوابوں کو عملی شکل دے سکتا تھا۔ ...اس لیے وہ انعام کا انکشاف ہوتے ہی بینک کا رُخ کرتا تھا مگر وہاں ...اس پر انکشاف ہوتا کہ کاؤنٹر سے انعام کی وصولیابی اس قدر سہل کام نہیں تھا۔

بڑے انعام کی صورت میں انعامی بونڈ، اپنے شناختی کارڈ کی فوٹو کاپی کے ساتھ کاؤنٹر پر جمع کرانا پڑتا تھا جہاں سے دس پندرہ دن بعد کی تاریخ دے دی جاتی تھی بہت سے بےصبرے لوگوں کے لیے اتنے دنوں تک اپنی آرزوؤں پر قابو پانا محال ہوتا تھا پھر ایسے میں کوئی نیک فرشتہ ان کے کان میں امید کا پیغام پھونکتا تھا اور وہ قطار سے الگ ہو کر باہر آ جاتے۔

اسٹیٹ بنک کی عالی شان عمارت سے باہر فٹ پاتھ پر چلتے پھرتے مسیحاؤں کی ایک دنیا آباد رہتی تھی جو بڑی دلفریب شرائط پر ایسے عجلت پسند لوگوں کی حاجت روائی کے لیے سراپا انکسار بنے گھومتے رہتے تھے۔

ان کے پاس نہ شناختی کارڈ کا چکر ہوتا نہ دس پندرہ روز انتظار کی زحمت بلکہ مالیت کے تناسب سے وہ انعام کی نقد رقم میں چند سو کا اضافہ بھی کر دیتے تھے یوں دس ہزار کے انعام کے بجائے ضرورت مند کو کسی گلی کوچے میں خاموشی سے ساڑھے دس، گیارہ ہزار نقد مل جاتے، بونڈ کی مالیت الگ سے ادا کی جاتی اور انعام پانے والا گھر پہنچنے تک اسی سوچ میں کھویا رہتا کہ لمبی قطار، دس پندرہ روز کے انتظار اور ہزار پانچ سو کے نقصان میں ایسا کیا مزہ ہے جو ایک دو نہیں دسیوں بنک سے باہر خدمتِ خلق میں اپنا وقت اور پیسہ برباد کرتے رہتے ہیں۔

دوسری طرف یہی مسیحا ڈینی جیسے لوگوں کے درد کا درماں ہوتے تھے۔ انعامی رقم کی مالیت کے لحاظ سے پانچ سے پچیس فیصد تک کمیشن پر انعامی بانڈ ضرورتمندوں کو بیچ کر اپنی لگائی ہوئی رقم معہ منافع وصول کر لیتے تھے۔

ڈینی نے اس طرح کتنے ہی انعامی بونڈ خریدے اور اپنے شناختی کارڈ کی نقول کے ساتھ بنک میں جمع کرا کے لاکھوں کی رقم وصول کی۔ اس ہیر پھیر میں اسے تھوڑا سا نقصان ضرور ہوا لیکن اس نے بہت جلد اپنے کھرے اثاثوں کی مالیت لاکھوں تک پہنچا لی جس پر کوئی انگشت نمائی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ قانونی طور پر اس کے پاس انعام یافتہ بونڈ کی ملکیت کا ہر ثبوت موجود تھا جس کی تصدیق بنک سے کی جا سکتی تھی۔

اس رقم سے اس نے قلیل عرصے میں ایک بڑی پلاسٹک فیکٹری خرید لی تھی اور اپنی شاہانہ بود و باش کے جملہ اخلاقی اور قانونی جواز پیدا کر لیے تھے۔

وہ ہمیشہ سے تحکم اور تعیش کا عادی تھا مگر جب بھی اسے یہ خیال آتا کہ وہ ایک بےنام آقا کے سامنے قطعی بےبس ہے تو وہ اپنے اوپر جھلا جاتا۔۔۔ اسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ ہر

چیز کا مالک ہوتے ہوئے بھی بالکل تہی دست ہو... اس کی انانیت اسے ہمیشہ اس منزل کی طرف اکساتی رہتی تھی جہاں اسے ہر ایک سے باز پرس کا مکمل اختیار ہو مگر اسے ردکنے ٹوکنے والا کوئی نہ ہو۔ بالکل گاڈ فادر کی طرح۔

ڈینی اپنے شاندار دفتر میں میز پر اخبار پھیلائے انھی سوچوں میں گم تھا کہ انٹر کام کی گھنٹی نے اس کے خیالات کا تسلسل توڑ دیا۔

انٹر کام پر اس کی سیکرٹری ہی ہوسکتی تھی۔ اس نے کاہلانہ انداز میں ریسیور اٹھایا تو وہ اسے ملاقات کے لیے دو لڑکیوں کی آمد کی اطلاع دے رہی تھی۔

ڈینی چونک پڑا۔ اُس کی دوستی کے حلقے میں صنفِ نازک کی اکثریت تھی۔

اس کے ذہن کی اسکرین پر یکے بعد دیگرے بہت سے حسین پیکر آتے چلے گئے مگر وہ کوئی اندازہ قائم نہ کر سکا۔

وہ اصولوں کا پابند آدمی تھا۔ دفتر میں صرف کاروبار سے دلچسپی لیتا تھا۔ اس کی سیکریٹری خاصی خوب صورت اور پرکشش لڑکی تھی اور شاید اس کی نگاہِ التفات کی منتظر بھی مگر ڈینی نے کبھی اس کے بارے میں سوچا تک نہ تھا، ساری فضولیات دفتر سے باہر کرتا تھا۔ حد تو یہ ہے کہ اس نے اپنی تمام دوست لڑکیوں کو دفتری اوقات میں فون وغیرہ کرنے سے بھی منع کیا ہوا تھا۔

ایسے میں کسی لڑکی کا دفتر آنا حیرت انگیز تھا۔

پھر اسے خیال آیا کہ سیکریٹری ایک نہیں دو لڑکیوں کی بات کررہی تھی۔

ہوسکتا ہے کہ وہ چندے وغیرہ کے لیے آئی ہوں۔ اس نے سوچا اور ماؤتھ پیس میں سیکریٹری سے کہا۔ ”انھیں اندر بھیج دو۔“

چند ثانیوں بعد سیکریٹری نے دروازہ کھولا اور دھوپ کے چشمے ہاتھوں میں لیے، دو حسین اور جوان العمر لڑکیاں اس کے دفتر میں آگئیں۔

انھوں نے اندر آتے ہی ڈینی کو سلام کیا، ایک دفتر پر سرسری نگاہیں دوڑانے لگی اور دوسری دلکش آواز میں اپنا تعارف کرانے لگی۔

وہ دونوں ایک مشہور مقامی کالج میں زیرِ تعلیم تھیں اور اپنی سالانہ تقریبات کے موقع پر شائع کیے جانے والے سووینئر کے لیے اشتہار لینے آئی تھیں۔

بولنے والی ڈینی کو بہت ذہین اور شوخ نظر آئی۔ اس نے انھیں بیٹھنے کی پیشکش کی جو شکریے کے ساتھ قبول کرلی گئی۔

دوسری لڑکی نے بیٹھتے ہی اپنا قدرے وزنی چرمی بیگ میز پر رکھا اور اس میں سے کئی رسالے نکال کر ڈینی کی طرف بڑھا دیے۔

”یہ ہمارے پچھلے سووینئر ہیں۔“ دوسری لڑکی کی آواز ڈینی کے کانوں میں رس گھولنے لگی۔ ”دراصل ہماری یونین کا بجٹ بہت محدود ہوتا ہے اس لیے ہمیں آپ جیسے کرم فرماؤں کو زحمت دینی پڑتی ہے۔ اس طرح اشتہارات کے ذریعے رسالے کا خرچ نکال کر اتنی رقم بچ جاتی ہے کہ کالج کا سالانہ فنکشن بہتر طریقے سے منعقد کیا جاسکے۔“

ڈینی بلا مقصد رسالوں کی ورق گردانی کرنے لگا۔

”بڑی خوشی ہوئی مس.... !“ ڈینی کہتے کہتے مستفسرانہ انداز میں رک گیا۔

مترنم آواز والی نے کرسی میں بے چینی سے پہلو بدلا اور ترنم آواز میں بولی۔ ”غزالہ اور یہ میری ساتھی عابدہ ہیں۔“

غزالہ نے دوسری کا نام بلا وجہ ہی بتایا ورنہ اس کے چہرے پر چھائی ہوئی متانت اور سنجیدگی دیکھتے ہی ڈینی کے ذہن میں عابدہ، زاہدہ اور عفت آرا جیسے نام کلبلائے تھے۔

”مجھے خوشی ہے مس غزالہ! کہ آپ نے دوٹوک لفظوں میں سووینئر کی اشاعت کا مقصد بتادیا۔ ورنہ اس سے پہلے لوگ محض تشہیری فوائد گنوا کر اشتہار لینے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔“ ڈینی نے براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

”تشہیری فائدے بھی شاید ہوتے ہوں۔“ اس بار عابدہ کی آواز سنائی دی اور ڈینی کو مجبوراً اس کی طرف متوجہ ہوجانا پڑا۔ وہ بھی خاصی خوش شکل تھی مگر اس کے بشرے پر زندگی کی چہکتی گنگناتی رونق کے بجائے گمبھیر سنجیدگی کے ڈیرے تھے اور خدشہ تھا کہ وہ بیٹھے بیٹھے اچانک زندگی کی بے ثباتی پر خشک تقریر شروع کردے گی۔

”مگر سووینئر کا مقصد ایک محدود حلقے میں اپنی سرگرمیوں کے تعارف کے ساتھ مالی وسائل کی فراہمی بھی ہوتا ہے۔“ وہ کہہ رہی تھی۔ ”ہمیں کئی جگہ خاصی مایوسی ہوئی کیونکہ بہت سے ناکام ادیب یا شاید ان کے ناشرین نے ادبی گداگری شروع کی ہوئی ہے۔ بے مغز کتاب کی تقریبِ رونمائی پر سووینئر کا اہتمام ہوتا ہے جو ردی میں تل جاتی ہے یا مفت تقسیم ہوتی رہتی ہے البتہ سووینئر کے اشتہارات سارے خرچے نکال کر بھی دس پانچ ہزار کا منافع دے جاتے ہیں۔“

”لہٰذا بیشتر اشتہارات وہ لوگ لے اڑتے ہیں۔“ غزالہ نے اس کی بات میں وقفہ آتے ہی مسکرا کر کہا۔ ”اور ہمیں معذرتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔“

ڈینی کھلے دل سے ہنسا۔ ”آپ لوگ میری معلومات میں اضافہ کررہی ہیں ورنہ میں تو آج تک رونما ہونے والی کتابوں کے خالقوں کو بلند پایہ سمجھ کر مرعوب ہوتا رہا ہوں۔“

”اس میں استثنیٰ بھی ہوتا ہے۔“ عابدہ نے ابرو اٹھا کر کہا۔ ”بعض ادیب اور شاعر واقعی اس پائے کے ہوتے ہیں کہ ان کی تخلیق پر سووینئر تو کیا ضخیم رسائل چھپیے جائیں مگر جو رَو چل پڑی ہے، وہ ہمیں بھی بہائے لیے جارہی ہے۔“

”ایسی تقریبات میں تقریریں بھی بڑی زوردار ہوتی ہیں۔ مقرر اپنے موصوف کو اس کے عہد کا نادر الوجود شاہکار قرار دینے پر تلے رہتے ہیں۔“ ڈینی نے عابدہ کو اکسایا۔

غزالہ کے ہونٹوں پر دبا دبا سا تبسم پھیل گیا۔

”مہمان بڑی احتیاط سے بلائے جاتے ہیں.... تقریر کا موقع صرف انھیں دیا جاتا ہے جن سے تنقید کا ذرا بھی خطرہ نہ ہو۔ سامعین شاید اس بارے میں پہلے سے بھری بیٹھی ہوتی ہیں۔ یہ سب تحسین باہمی کے پلیٹ فارم ہوتے ہیں، بس من ترا حاجی بگویم تو مرا ملا بگو والی بات ہوتی ہے۔“

”دراصل عابدہ خود بھی افسانہ نگار ہیں۔“ غزالہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اس لیے ان کی معلومات خاصی ہیں۔ کچھ لوگوں نے ان کا بھی سووینئر نکال دینا چاہا تھا اور یہ سارے رموز سمجھائے تھے مگر یہ تیار نہیں ہوئیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے افسانوں کا مجموعہ ابھی تک کسی ناشر کا منتظر ہے۔“

”اوہ۔“ ڈینی نے ہونٹ سکوڑ کر کہا، اسے غزالہ کی باتوں میں لطف آرہا تھا۔ ”گویا یہ سووینئر کو بھی کچھ بُرا سمجھتی ہیں.... ؟“

عابدہ غزالہ کو گھورتے ہوئے بولی۔ ”نہیں بالکل یہی بات ہے، غیر ضروری تعریف و توصیف اندر کے فنکار کو لوری دے دے کر سلا دیتی ہے اور اس کے فن کا ارتقا رُک جاتا ہے۔“

ڈینی سنجیدہ ہوگیا۔ عابدہ نے جوش میں ثقیل الفاظ کا استعمال شروع کردیا تھا۔ ڈینی کو اندیشہ ہوا کہ اسے چھوٹ دی گئی تو وہ اس خوشگوار ملاقات کی ہلکی پھلکی فضا کو برباد کردے گی۔

”آپ کتاب خود شائع کریں۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔ ”ناگوار نہ ہو تو اس کے اخراجات میں پورے کروں گا.... “

”آپ ہمارے کالج کی تقریب میں ضرور آئیے گا۔“ عابدہ سے پہلے غزالہ بول پڑی۔ ”اس دوران میں یہ کوئی فیصلہ کرلیں گی۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے ایک لفافہ ڈینی کی طرف بڑھا دیا۔ لفافہ ڈینی کی کمپنی کے منیجنگ ڈائریکٹر کے نام تھا اور پہلے سے لکھا ہوا تھا۔

”اور آپ کا ریٹ کارڈ؟“ ڈینی نے لفافے میں سے کارڈ نکال کر پڑھنے کے بعد کہا کیونکہ وہ کالج کی سالانہ تقریب کا دعوت نامہ تھا۔

عابدہ نے ایک چھپا ہوا فارم اسے دے دیا۔

”پچھلا ٹائیٹل بک کرلیں۔“ ڈینی نے سرسری لہجے میں کہا۔

”بہت بہت شکریہ جناب!“ غزالہ اس فیاضانہ رویے پر قدرے بوکھلا گئی۔

ڈینی نے انٹر کام پر سیکریٹری کو ہدایت کی کہ اکاؤنٹنٹ کو چیک بک سمیت اس کے کمرے میں بھیج دے اور چند منٹ بعد اس نے کالج کے نام کراسڈ چیک دستخط کرکے غزالہ کے آگے ڈال دیا۔

پچیس فیصد کے بجائے پورے معاوضے کا پیشگی چیک دیکھ کر غزالہ کی آنکھوں میں ممنونیت کے جذبات امڈ آئے۔

”اشتہار کا مواد کب عنایت کریں گے؟“ اس نے چیک تہہ کرکے پرس میں رکھتے ہوئے سوال کیا۔

”کل شام فون کرلیں مجھے۔“ ڈینی نے دراز سے اپنا وزٹنگ کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا جس پر صرف اس کا نام اور گھر کا فون نمبر پتے سمیت درج تھا۔ وہ غزالہ کی آواز سننے کا ایک اضافی موقع ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔

وہ دونوں اس کا شکریہ ادا کرکے کرسیوں سے اٹھ گئیں۔

اس روز کے لیے دفتر میں کوئی قابلِ ذکر کام باقی نہیں رہا تھا، ڈینی کے دل میں خواہش ابھری کہ انھیں اپنی کار میں لفٹ دینے کی پیشکش کرے مگر اس نے اپنی خواہش کو دبا لیا۔

پہلی ملاقات میں وہ کسی بے تکلفی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتا تھا اور نہ ہی اپنے عملے کو کسی قسم کی چہ میگوئیوں کا موقع دینا چاہتا تھا۔

ان کے جانے کے چند منٹ بعد وہ بھی اٹھا اور اپنی کار جہانگیر کے گھر کی طرف جانے والے راستے پر ڈال دی۔ وہ پچھلے دو دن سے اپنا کچھ وقت اس کے ساتھ مل بیٹھ کر گزارنا چاہتا تھا لیکن مصروفیات میں الجھا رہا تھا اب اس کے پاس وقت تھا تو وہ اس کو استعمال کرنا چاہتا تھا۔

جہانگیر کے بارے میں پچھلے کئی دن سے اس کے دل میں ایک پھانس سی چبھ رہی تھی اور وہ اس بارے میں جلد از جلد کسی نتیجے پر پہنچنا چاہتا تھا۔

چند روز پیشتر اس نے میٹنگ کے بعد میز کے نیچے خود ہی ٹرانسمیٹر چھپایا تھا جس کا نہ کوئی ریسیور تھا اور نہ ہی کوئی دوسرا مصرف... بس اس طرح وہ جہانگیر کو اپنے پوشیدہ رویے سے بہت زیادہ خوفزدہ کرنا چاہتا تھا۔

میٹنگ کے بعد اس نے جہانگیر کو فون کرکے خاصا مطعون کیا تھا اور اس پر یہ ظاہر کیا تھا کہ دور ہونے کے باوجود وہ میٹنگ کی پوری کارروائی سے باخبر رہتا ہے۔ اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے اس نے جہانگیر کو پوشیدہ ٹرانسمیٹر کے بارے میں بھی بتادیا تھا۔

جہانگیر سے گفتگو کے دوران ڈینی نے جس طرح اپنے بارے میں شبہات کا اظہار کیا تھا اس کے پیش نظر اسے پورا یقین تھا کہ جہانگیر فوری طور پر اس سے رابطہ قائم کر کے اسے لعن طعن کرے گا اور آئندہ جیوا ہاؤز کی میٹنگوں میں محتاط رہنے کا مشورہ دے گا لیکن جہانگیر نے اس معاملے میں بالکل ہی چپ سادھ لی تھی۔ گو ان دونوں کی کسی ملاقات کی نوبت نہیں آسکی تھی لیکن دوبار فون پر ضرور گفتگو ہوئی تھی اور جہانگیر نے اس بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔

اب ڈینی بذاتِ خود اس معاملے کو دیکھنا چاہتا تھا۔

ڈینی کے لیے اپنے ہمدردانہ رویّے کے اظہار کے باوجود جہانگیر دل میں نجانے کیا منصوبہ لیے بیٹھا تھا۔

ڈینی اس کے گھر پہنچا تو جہانگیر نے خوشگوار حیرت سے اس کا استقبال کیا۔

ان دنوں جہانگیر کی بیوی لاہور گئی ہوئی تھی لہٰذا وہ شاید اس مہلت سے پوری طرح فائدہ اٹھا رہا تھا کیونکہ ڈرائنگ روم میں وہ اکیلا نہیں تھا۔

"مجھے علم ہوتا کہ تم مصروف ہو گے تو فون کر کے آتا۔" ڈینی نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"کچھ نہیں ..." جہانگیر فضا میں ہاتھ لہرا کر قدرے ناخوشگوار لہجے میں بولا۔ "یہ بتاؤ کہ اس وقت تمہارا کیسے آنا ہوا؟" ڈینی کے شوخ لہجے نے اس کا موڈ خراب کر دیا تھا۔

"بس کئی دن ہو گئے تھے، سوچا ملتا ہی چلوں۔" ڈینی نے کہا۔

"تم بیٹھو۔ میں ابھی دس منٹ میں آتا ہوں۔" جہانگیر اٹھتے ہوئے بولا۔ اسی کے ساتھ لڑکی نے بھی صوفہ چھوڑ دیا۔

جانے سے پہلے اس نے اپنے ایک ملازم کو آواز دی۔

"دیکھو کون آیا ہوا ہے۔" جہانگیر نے ملازم سے کہا۔ "کیبنٹ سے بوتل اور گلاس وغیرہ لے آؤ، یہ جتنی دیر میں ایک گلاس ختم کرے گا، میں لوٹ آؤں گا۔"

ملازم دانت نکالتا ہوا اندر چلا گیا اور جہانگیر اس لڑکی سمیت نکاسی کے راستے کی طرف بڑھ گیا۔

جہانگیر وعدے کے مطابق بہت جلدی لوٹ آیا۔

"ہر معاملے میں ٹانگ اڑاتے ہو۔" جہانگیر صوفے میں گرتے ہوئے خوشدلی سے بولا۔ "نئی نئی دوستی میں ذرا سی احتیاط کرنی پڑتی ہے۔"

"ورنہ چڑیا اڑ جاتی ہے۔" ڈینی بائیں آنکھ دبا کر بولا۔

"یہی سمجھ لو۔" جہانگیر بولا۔ "ویسے میں کئی دن سے تمھیں ایک بات سمجھانی چاہ رہا تھا۔"

"وہ کیا؟" ڈینی اپنے لبوں کو زبان سے تر کرتے ہوئے بولا۔

"تم بہت زیادہ بولتے ہو۔" جہانگیر نے بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کم اور سوچ سمجھ کر بولنے والے زیادہ فائدے میں رہتے ہیں۔"

"کیا کہہ دیا میں نے تمھیں؟"

"میں تمھاری بکواس کی پروا نہیں کرتا۔ لیکن یہ انکشاف کر کے تمھیں شاید زیادہ خوشی نہ ہو کہ جیوا ہاؤز کا چپہ چپہ بگڈ ہے۔"

"نہیں۔" ڈینی نے بے یقینی کے انداز میں چونکنے کی اداکاری کی۔

"پچھلی میٹنگ میں تم نے جو بے سروپا باتیں چھیڑی تھیں ان کے حوالے سے مجھ سے باز پرس کی گئی ہے۔" جہانگیر نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

"کس نے کی باز پرس؟"

"باس کے علاوہ اور کون کر سکتا ہے؟" جہانگیر نے الٹا سوال داغ دیا۔

"لیکن اسے کیا خبر کہ وہاں کیا باتیں ہوئیں؟" ڈینی نے حیرت آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ جیوا ہاؤز میں جگہ جگہ خفیہ آلات لگے ہوئے ہیں اور وہ ہم سے دور رہ کر بھی ایک ایک لفظ سے باخبر رہتا ہے۔"

"میں نہیں مان سکتا۔" ڈینی نے بے یقینی کے ساتھ کہا۔ "یہ رپورٹ تم خود دیتے ہو اور اب اپنا خلوص جتانے کے لیے مجھے مگر کی کہانی سنا رہے ہو۔"

"میں خود حیران رہ گیا تھا۔" جہانگیر اپنے لیے گلاس تیار کرتے ہوئے بولا۔ "اس نے بعض باتیں لفظ بلفظ دہرائی تھیں اور مجھے تنبیہ کی تھی کہ اس عمارت میں جابجا بگ نصب ہیں۔ ایک عارضی ٹرانسمیٹر تو خود میں نے وہاں سے نکالا ہے۔"

"کہاں ہے وہ؟"

"ہدایت کے مطابق ضائع کر دیا۔" جہانگیر بولا۔ "آئندہ تمھیں بہت زیادہ محتاط رہنا ہو گا۔"

"بہت زیادہ برہم ہوا ہو گا؟" ڈینی نے خوفزدہ ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے سوال کیا۔

"بمشکل اسے راضی کر سکا۔" جہانگیر سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا۔ "ورنہ وہ تو تمھیں سزا دینے پر تلا ہوا تھا اور اس کی سزا معمولی ہرگز نہ ہوتی۔"

"اس سے تمھاری بات کب ہوئی تھی؟"

"میٹنگ کے بعد۔ وہ تو اس کا سدا کا معمول ہے۔"

"اور تم آج پانچویں دن بعد مجھے بتا رہے ہو۔" ڈینی نے ملامت آمیز لہجے میں کہا۔

"میں غصے میں تھا۔" جہانگیر نے ایماندارانہ لہجے میں کہا۔ "شاید تم سے ذکر ہی نہ کرتا مگر تفصیل جانے بغیر تم اپنی حرکتوں سے باز نہ آتے۔"

ڈینی اس کی طرف دیکھ کر اپنے سر کو تفہیمی انداز میں جنبش دینے لگا۔

○

جس رات ہیروئن بازار میں پہلی مرتبہ تقسیم کی گئی لوگوں نے زیادہ داموں کی بنا پر اس میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لی مگر اگلے دن بازار میں اسی کا چرچا تھا۔

نشے بازوں کے لیے ہیروئن سنسنی خیز ثابت ہوئی تھی۔ سرور، لذت اور گرد و پیش پھیلے ہوئے دکھوں سے بے خبری کا ایسا قیامت خیز امتزاج پہلے کبھی ان کے تجربے میں نہیں آیا تھا۔

اُن کے آدمیوں کو ہیروئن قیمتاً بازار میں فروخت کرنے کا حکم ملا تھا جس میں قیمت کا تعین ان ہی پر چھوڑ دیا گیا تھا، لگے بندھے اصولوں کے تحت کام کرنے والوں کے لیے یہ چھوٹ بہتی گنگا بن گئی اور بازار کی خستہ حالی میں ہر ایک نے بڑھ چڑھ کر دام کمائے۔

اگلے دن چرس کی بھی ایک بڑی کھیپ شہر میں آگئی۔ مال کی کمی کو سنہری موقع سمجھتے ہوئے کچھ نئے لوگوں نے قدم جمانے کی کوشش کی تھی اور چھوٹے موٹے منشیات فروشوں نے بھی پورے وسائل جمع کر کے مارکیٹ پر قبضہ جمانے کی کوشش کی تھی۔

یہ صورتِ حال کچھ مناسب نہیں تھی لیکن حیرت کی بات تھی کہ چرس بازار میں آجانے کے باوجود بہت سے لوگ ہیروئن کے طلبگار تھے۔

پہلے دن کا کوٹہ خاصی مقدار میں جاری کیا گیا تھا اس لیے دوسرے دن بھی ہیروئن کے نئے پنچھیوں کو مایوسی کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا لیکن تجربہ کار دلالوں اور اڈے کے مالکان نے پہلے ہی ہلے میں بازار کا رُخ بھانپ لیا تھا لہٰذا ہر طرف سے مال کی طلب شروع ہو گئی تھی۔

اس غیر متوقع صورتِ حال سے وہ چاروں ہی بوکھلائے ہوئے تھے۔ جہانگیر بے چینی سے باس کے فون کا منتظر تھا اور تھوڑے تھوڑے وقفوں سے اس بارے میں ڈینی کا دماغ بھی چاٹ چکا تھا لیکن ڈینی احمق نہیں تھا جو اس نازک مرحلے پر اپنے طور پر جہانگیر سے رابطہ قائم کر کے اسے اپنا بوجھ ہلکا کرنے کا موقع دیتا اسے خود باس کے فون کا انتظار تھا۔

چرس کی سپلائی سے اچانک ہاتھ کھینچ لینے کی بنا پر بازار میں ان کے آدمیوں کی ساکھ خاصی بگڑ گئی تھی مگر انھوں نے یہ امید دلاتے ہوئے بازار سے اپنا رابطہ قائم رکھا کہ جلد ہی وہ 'نیا مال' بازار میں لانے والے ہیں۔ نیا مال کیا ہو گا؟ یہ نہ ان کارندوں کو معلوم تھا اور نہ وہ آگے کچھ بتا سکتے تھے۔

پھر جب ان ہی ذرائع سے ہیروئن بازار میں پھیلی اور تیزی سے مقبول ہوئی تو ان کی ساکھ حیرت ناک طور پر بحال ہوتی نظر آنے لگی جس کا ثبوت خطیر مالیت کے فوری آرڈر تھے۔

ڈینی سخت اضطراب سے دوچار تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ اس بار وہ وقت پر بازار کی ضروریات نہ پوری کر سکے تو ہمیشہ کے لیے بازار سے باہر ہو جائیں گے۔

ان کی لاکھوں کی ریل پیل کا سارا انحصار ان چھوٹے چھوٹے اڈوں پر تھا جو شہر کی گنجان آبادیوں میں گلی گلی پھیلے ہوئے تھے اور گاہکوں کو دو چار یا دس روپے کا مال فروخت کرتے تھے۔

ان اڈوں میں کوئی باہمی ربط نہیں تھا، خودرو طریقے پر ان علاقوں میں ابھرتے اور پھر جمتے چلے گئے جہاں مقامی آبادی میں منشیات کی سرپرستی کا ڈھکا چھپا رجحان موجود تھا۔ لاکھوں کے مال کا ہیر پھیر کرنے والوں کے لیے ان خودرو اڈوں کے متوازی اپنی تنظیم قائم کرنا اور اسے اسی قدر کامیابی سے چلانا ناممکنات میں سے تھا۔ دوسری طرف خرابی یہ تھی کہ ایسی کسی کوشش کے نتیجے میں بڑی آسامیوں کے گریبان بآسانی پولیس کی دسترس میں آجاتے لہٰذا نچلی سطح پر سارا لین دین ان ہی پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ یہ لوگ شہر میں قائم چند بڑے مراکز سے واقف تھے اور اپنی ضرورت کی جملہ منشیات ان مراکز سے تھوک داموں پر لے آتے تھے اور ان کی خوردہ فروخت سے بھاری 'انتظامی اخراجات' کے علاوہ خطیر منافع بھی کما لیتے تھے۔

ایکسائز، محکمۂ پولیس یا کسی دوسری ایجنسی کی طرف سے کارروائی ہوتی تو یہی خودرو اڈے نشانہ بنتے اور بڑے لوگوں کا بھرم قائم رہتا۔

ان حالات میں اگر چھوٹے اڈوں کے مالکان مال کی فراہمی میں بے یقینی کی صورتحال کے پیشِ نظر کسی مال یا پارٹی سے متنفر ہو جاتے تو اس کے لیے مقامی بازار میں اپنا وجود برقرار رکھنا دشوار ہو جاتا تھا اس خدشے کے پیشِ نظر ڈینی پریشان تھا۔

اس کا باس ہیروئن بازار میں لے آنے کا حکم دینے کے بعد سے غائب تھا۔ پچھلا دن اس سے کسی رابطے کے بغیر گزرا تھا

اور وہ دوسرا دن تھا۔

مجبوری یہ تھی کہ ڈینی کو نہ اس کے کسی ٹھکانے کا علم تھا اور نہ وہ اس کی شخصیت سے واقف تھا جو اپنے طور پر اس سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرتا۔

آخر شام کے چھ بجے فون کی گھنٹی بجی اور ڈینی نے جھپٹ کر ریسیور اٹھالیا۔

"تجربہ کامیاب رہا ہے۔" دوسری طرف سے وہی جانی پہچانی بھاری اور غنودہ آواز سنائی دی۔

"خدا کا شکر ہے سر!" ڈینی نے اطمینان کا گہرا سانس لے کر کہا۔ "ہم بوکھلائے ہوئے ہیں۔ شہر میں لوگ فوراً مال چاہتے ہیں۔"

"پچھلی بار کھلی چھوٹ تھی، اب ہم اپنے دام لیں گے۔"

"پہلی ڈلیوری کے ساتھ ہی اگلے دام بتادیے گئے تھے پارٹیاں اس پر آمادہ ہیں بلکہ رقوم پیشگی دینے کو تیار ہیں۔"

"سیدھے گلشن اقبال چلے آؤ۔" خلافِ معمول پہلی بار اسے کہیں پہنچنے کا حکم دیا گیا "وہ حسن اسکوائر دیکھا ہوا ہے تمہارا؟"

"یس سر!"

"اس بار طریقۂ کار میں تبدیلیاں کی گئی ہیں.... تم ٹیکسی سے پہنچو گے۔ چوراہا عبور کرتے ہی بائیں ہاتھ پر فلیٹوں کی طرف گھومنے والی سڑک کے کنارے اناسی کے ماڈل کی سرخ کرولا کھڑی ہوگی ڈرائیونگ سیٹ والا تمہارے بلیک گولڈ کینے پر گرے ہاؤنڈز کا حوالہ دے گا، باقی باتیں وہی سمجھائے گا۔"

"کار کا نمبر کیا ہوگا سر؟" ڈینی نے جھجکتے ہوئے سوال کیا۔

"اسے بھول جاؤ، وہ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔" خشک لہجے میں کہا گیا اور سلسلہ منقطع ہوگیا۔

ڈینی ریسیور کو ہاتھ میں لیے چند ثانیوں تک یوں گھورتا رہا جیسے اس میں سے کسی کے نکل پڑنے کی توقع ہو پھر اسے آہستگی سے کریڈل پر ڈال دیا۔

وہ ایک پیر کرسی پر رکھ کر ہولے ہولے اپنی کھوپڑی سہلانے لگا۔

اس سے پیشتر باس سارے احکام اس کو اسی انداز میں دیا کرتا تھا جیسے وہ سب ڈینی کو خود کرنا ہو مگر برسوں پہلے طے شدہ طریقۂ کار کے تحت ڈینی غراتی ہوئی مخصوص آواز میں وہ ہدایات جہانگیر کو سنا کر مطمئن ہوجاتا تھا۔

مگر اس بار وہ کیا کرے؟

احکام پہلے کی طرح دیے گئے تھے، طریقۂ کار میں تبدیلیوں کا بھی ذکر تھا مگر وہ یہ پوچھنا بھول گیا تھا کہ وہ ہدایات اسے جہانگیر تک پہنچانی تھیں یا خود ہی حسن اسکوائر کی طرف دوڑ لگانی تھی۔

وہ کئی منٹ تک سوچتا رہا پھر اسی نتیجے پر پہنچا کہ اسے شک کا فائدہ اٹھانا چاہیے۔ بدلے ہوئے حالات میں اگر وہ جہانگیر کو آگے کر دیتا تو شاید حقیقی معنوں میں اس کا ماتحت ہو کر رہ جاتا کیونکہ جہانگیر اسے اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات کی ہوا بھی نہ لگنے دیتا اور پھر جہانگیر کے نئے طریقۂ کار سے متعارف ہونے کے بعد باس بھی یہ سوچ سکتا تھا کہ درمیان میں ڈینی کا رابطہ کیوں برقرار رکھا جائے جب کہ پچھلے برسوں میں اس دوہرے نظام کی افادیت کبھی سامنے نہیں آئی تھی۔

ڈینی یہ خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ حتی الامکان اندرونی داؤ پیچ سے واقف رہنا چاہتا تھا تاکہ برسوں کے خواب کی تکمیل کے راستے کی تلاش جاری رکھ سکے۔

اس نے کپڑے تبدیل کیے اور جوتے پہن کر گھر سے نکل آیا۔ گھر میں ایک بوڑھی ملازمہ اور خانساماں کے علاوہ صرف چوکیدار ہی تھا۔ ان تینوں نے اسے پیدل جاتے ہوئے بہت حیرت سے دیکھا کیونکہ وہ چہل قدمی تک کا عادی نہیں تھا۔

شہر کے اس پرسکون علاقے کی آبادی آسودہ حالوں پر مشتمل تھی اس لیے قرب وجوار کی ذیلی سڑکوں پر کسی ٹیکسی کے ملنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ وہاں سے حسن اسکوائر تک کا فاصلہ چند منٹ کا تھا اس لیے وہ ٹہلتا ہوا کشمیر روڈ کی طرف بڑھ گیا۔

ٹیکسی ملنے کے چند منٹ بعد وہ حسن اسکوائر پر اتر چکا تھا۔

اس نے دور چوراہے سے ہی اس کار کا دھندلا سا خاکہ دیکھ لیا تھا جو طے شدہ مقام پر موجود تھی مگر براہِ راست ادھر جانے کے بجائے ڈینی پان والے کے کیبن کی طرف ہولیا۔

سگریٹ کا نیا پیکٹ خرید کر وہ آگے بڑھا تو پارک کی ہوئی گاڑیوں کے درمیان کرسیاں ڈالے تین مسلح سپاہی نظر آئے جو فرصت کے چند خوشگوار لمحوں کی تلاش میں آتے ہوئے جوڑوں کی قانونی نگرانی پر مامور رہتے ہوئے غیرقانونی طور پر اپنی نگاہیں سینک رہے تھے۔

ڈینی اور آگے بڑھا تو اس کی آنکھوں پر پڑنے والی روشنیوں کا انعکاس پیچھے رہ گیا۔ اس نے اندھیرے میں ایک کنارے سے کھڑی ہوئی کار کے خدوخال پہچان لیے، وہ یقیناً اناسی کی کرولا تھی۔

ڈینی بلا جھجک آگے بڑھتا چلا گیا۔ سرخ رنگ کی ایک جھلک دیکھنے کے بعد رکنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

اناسی کی اس سرخ کرولا کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک قوی الجثہ شخص براجمان تھا۔ ڈینی اس کے قریب پہنچ کر کھلی ہوئی کھڑکی پر جھکا اور اس شخص نے مشینی انداز میں "گرے ہاؤنڈز" کہہ کر کار کا انجن اسٹارٹ کر دیا۔

سامنے سے آکر اسی سمت میں مڑنے والی ایک کار کے ہیڈ لیمپس کی روشنی میں ڈینی نے دیکھا کہ کرولا والا خطرناک چہرے کا مالک تھا۔

وہ گھوم کر ڈرائیور کے برابر والی نشست پر بیٹھ گیا اور کار چند گز بڑھنے کے بعد یونیورسٹی روڈ پر مڑ گئی۔

ریلوے لائن عبور کرنے کے بعد کار داہنی طرف گھوم گئی۔ خطرناک صورت والے کی تمام تر توجہ سڑک پر مرکوز تھی اور ڈینی اپنی طرف سے گفتگو میں پہل نہیں کرنا چاہتا تھا کہ مبادا اس کی کوئی حرکت خطرناک صورت والے کے ذریعے باس کے علم میں آکر اس کی ناپسندیدگی کا باعث بنے۔

کار تیزی سے دائیں بائیں گھومتی رہی پھر ایک ایسے مکان کے سامنے رک گئی جو آبادی میں ہونے کے باوجود الگ تھلگ نظر آرہا تھا۔

چار سو گز کے مکانات کی آخری قطار میں وہ سرے کا مکان تھا جس کے ایک طرف نیم پختہ سڑک تھی اور سامنے وسیع میدان پھیلا ہوا تھا جس کے ایک حصے میں تاریکی کے باوجود، ناروں کی چھاؤں میں جھاڑیوں کے ہیولے نظر آرہے تھے۔ باقی حصہ شاید علاقے کے بے فکرے نوجوانوں نے صاف کر کے کھیلنے کے قابل بنا لیا تھا لیکن ڈینی کے لیے اس میدان سے زیادہ وہ مکان اہم تھا۔

ڈینی عرصۂ دراز سے اپنے گمنام باس کے لیے کام کررہا تھا لیکن اس کے نام ونشان تک سے بے خبر تھا۔ وہ مکان کوئی پہلا ٹھکانا تھا جو باس کے حوالے سے اس کی نگاہوں میں آیا تھا۔

خطرناک صورت آدمی نے گاڑی سے اتر کر دروازہ لاک کر دیا، ڈینی نے بھی اس کی تقلید کی پھر پھاٹک کی ذیلی کھڑکی کھل گئی۔ اس میں سے ایک استخوانی چہرہ نمودار ہوا اور فوراً ہی غائب ہوگیا۔ وہ دونوں اس کھڑکی نما دروازے سے جھک کر گزر گئے۔

اندر ڈرائنگ روم میں مخالف سمت کے اندرونی دروازے سے تقریباً ان کے ساتھ ہی ایک حسین لیکن پختہ عمر کی عورت نمودار ہوئی اس کے چہرے پر ہلکی سی حیرت نمایاں تھی۔

"آج بغیر اطلاع کیسے آنا ہوا ہے؟" عورت نے جس لب ولہجے میں خطرناک صورت والے سے سوال کیا تھا اس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ ان دونوں کے مراسم خصوصی نوعیت کے حامل تھے۔

"ذرا ایک کام سے آیا ہوں۔" خطرناک صورت والا بولا۔ تو اس کی آواز سن کر ڈینی کو مایوسی ہوئی حالانکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ پراسرار باس کسی بھی مرحلے پر اتنا غیر محتاط نہیں ہو سکتا کہ براہِ راست اس کے سامنے آجائے۔

"تم اندر جاؤ اور ہوسکے تو ایک پیالی چائے پلوا دو۔" خطرناک صورت والا اس سے کہتے ہوئے ایک صوفے پر اس طرح بیٹھ گیا کہ بیک وقت ڈرائنگ روم کے دونوں دروازے اس کی نگاہ میں رہیں۔

عورت کے اندر چلے جانے کے بعد ڈینی بھی بیٹھ گیا۔

چند سیکنڈ کے لیے سکوت رہا پھر خطرناک صورت والا ڈینی کی طرف متوجہ ہوگیا۔ "ان دنوں ٹیلیفون بہت زیادہ مخدوش ہوگیا ہے۔ بات کرتے کرتے درمیان میں کوئی اور لائن مل جاتی ہے اس طرح اہم گفتگو کسی غیر متعلق آدمی تک بھی پہنچ سکتی ہے۔ اس لیے فوری طور پر فون کا استعمال ترک کر دیا گیا ہے۔"

"مجھے خود بھی پچھلے دنوں ایسا تجربہ ہوچکا ہے۔" ڈینی بولا۔ "درمیان میں آنے والا اگر دخل اندازی کے بجائے خاموش رہے تو ساری گفتگو لفظ بلفظ سن سکتا ہے۔"

"یہ کوئی عارضی خرابی نہیں ہے۔" خطرناک صورت والا اسے بتانے لگا۔ "پچھلے دنوں لائنوں میں اضافہ کیا گیا ہے۔ شہر بھر میں کھدائیاں ہورہی ہیں، ساری لائنیں گڈمڈ ہوکر رہ گئی ہیں۔ یہ خرابی دور ہونے کے بجائے دن بدن بڑھتی ہی جائے گی۔"

"تو پھر رابطے کا ذریعہ کیا ہوگا؟"

"ٹرانسمیٹر۔" خطرناک صورت والے نے یہ کہتے ہوئے جیکٹ کی اندرونی جیب سے ایک مختصر سا جیبی ٹرانسمیٹر نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

ڈینی نے اسے الٹ پلٹ کر دیکھا اور اپنی جیب میں ڈال لیا۔

"پہلے کبھی استعمال کیا ہے؟" اس نے سوال کیا اور ڈینی نے صاف دلی سے اس معاملے میں اپنی لاعلمی کا اعتراف کرلیا۔

"سرخ بٹن دبانے سے یہ آن ہوجاتا ہے اور دوسری طرف سے آنے والا پیغام براہِ راست سنا جاسکتا ہے۔" وہ ڈینی کو بتانے لگا۔ "دندانے دار ناب کو گھما کر آواز میں کمی بیشی کی جاسکتی ہے دوسری طرف کا پیغام مکمل ہونے کے بعد سیاہ بٹن دبا کر جواب نشر کیا جاسکتا ہے۔"

"یعنی سیاہ بٹن دبانے کے بعد ہی یہ ٹرانسمیٹر بنتا ہے۔ ورنہ ریسیور رہتا ہے؟"

"تم بالکل ٹھیک سمجھے۔" خطرناک صورت والا تحسین آمیز لہجے میں بولا۔ "ایسے لاسلکی آلات یکطرفہ کام کرتے ہیں اگر دونوں بیک وقت بولنا شروع کر دیں تو کوئی بھی دوسرے کی آواز نہ سن سکے گا۔ اس پر گفتگو کے لیے تمہارا شناختی کوڈ ڈی ون ہوگا۔"

"اس پر میں کس سے رابطہ قائم کرسکوں گا؟"

اس کا منہ بن گیا۔ "یہ مجھے نہیں معلوم جس جس کے پاس ایسا ٹرانسمیٹر ہوگا، اس سے تم بات کرسکو گے کیونکہ یہ صرف ایک مخصوص

فری کوئنسی پر کام کرتا ہے۔"
ڈینی خاموش رہا۔
کیسا عجیب اتفاق تھا کہ چند روز قبل اس نے جہانگیر کو مرعوب کرنے کے لیے جیوا ہاؤز میں ایک ٹرانسمیٹر چھپایا تھا اور غالباً اسی وقت اس کا باس ترقی یافتہ مواصلاتی رابطے کو اپنانے کے بارے میں سوچ رہا تھا لیکن ڈینی اس شخص پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ ٹرانسمیٹر وغیرہ سے مانوس ہے۔
"آج رات کے لیے پچھلے انتظامات برقرار رہیں گے پھر تم لاتعلق ہو جاؤ گے۔"
"کس سے؟" ڈینی نے حیرت سے پوچھا۔
"سوالات مت کرو۔" وہ شخص چڑ گیا۔ "جتنا مجھے بتایا گیا ہے وہی دہرا رہا ہوں۔ پچھلے انتظامات کیا تھے؟ یہ تمھیں معلوم ہونا چاہیے لاتعلقی کس سے اختیار کرنی ہے، یہ تمھیں خود سمجھ لینا چاہیے۔ آئندہ تم ہدایت ملے بغیر اس مکان کا رُخ نہیں کرو گے، یہاں تمھیں ایک خاص مقصد سے لایا گیا ہے۔"
اسی وقت عورت چائے کی ٹرے لیے کمرے میں داخل ہوئی اور وہ خاموش ہو گیا۔
وہ عورت اس قدر موقع شناس تھی کہ ٹرے میں صرف دو پیالیاں لائی تھی اور ٹرے تپائی پر رکھنے کے بعد فوراً واپس چلی گئی۔
"نام کیا ہے تمھارا؟" چائے نوشی کے دوران میں غیر ارادی طور پر ڈینی سوال کر بیٹھا اور جواب ملنے سے قبل ہی اسے خود بخود اپنی حماقت کا احساس ہو گیا مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ خطرناک صورت والا اسے خشمناک نگاہوں سے گھور رہا تھا۔
"غیر ضروری سوالات کے بجائے اپنے کام سے کام رکھو۔" وہ غرایا۔ "آئندہ اتفاقاً کہیں ٹکرا بھی گئے تو انجان بن کر قریب سے گزر جانا۔"
ڈینی سر کو خفیف سی جنبش دے کر رہ گیا۔ اس کے علاوہ وہ کر بھی کیا سکتا تھا؟
چائے پینے کے بعد وہ شخص ڈینی کو ایک اندرونی کمرے میں لے گیا جہاں ایک دیوار کے سہارے بڑی سی لکھنے کی میز پڑی ہوئی تھی اور دو بڑی دیوار گیر الماریوں میں کھسکنے والے شیشوں کے پیچھے ضخیم کتابیں ترتیب سے سجی ہوئی تھیں۔
اس شخص نے میز کی دراز سے اِنک پیڈ اور ایک سفید کاغذ نکالا اور کاغذ کو میز کی ہموار سطح پر پھیلا کر رومال سے صاف کرنے لگا۔
"بیٹھ جاؤ۔" اپنا کام کرتے کرتے اس نے ڈینی سے کہا اور وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔
اگلے ہی لمحے اس نے اسی دراز سے گتے کی ایک چھوٹی سی ڈبیہ نکالی اور اس میں سے تہہ ہو جانے والا پری فوکسڈ کمپاؤنڈ لینس نکال کر کھول لیا جو عموماً جوہری ہیرے اور دیگر قیمتی پتھروں کی تراش کے مشاہدے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔
اس لینس کو کاغذ کے مختلف حصوں پر کھسکا کر، اس سے آنکھ لگائے وہ کاغذ کی سطح کا جائزہ لیتا رہا پھر مایوسانہ انداز میں کاغذ کو مروڑ کر ایک طرف پھینک دیا۔ دراز سے برآمد ہونے والے دوسرے کاغذ کا بھی یہی حشر ہوا۔ آخر اس نے دراز کُرید کر آرٹ پیپر کا ایک ٹکڑا برآمد کیا اور اس کو باریک بینی سے جانچنے لگا۔
ڈینی اس وقت خود کو پرلے درجے کا احمق سمجھ رہا تھا۔ اس شخص نے ڈینی کو یوں نظر انداز کیا ہوا تھا جیسے اسے اپنے ساتھ وہاں لا کر وہ یکسر فراموش کر بیٹھا ہو۔
اس دوران میں اس کی حرکات و سکنات سے ڈینی اندازہ لگا چکا تھا کہ وہ مکان اس حد تک اس شخص کا دیکھا بھالا تھا کہ وہ اس اندرونی کمرے کی رائٹنگ ٹیبل کی درازوں میں موجود رہنے والی چیزوں تک سے واقف تھا۔
"گڈ۔ اب آجاؤ تم۔" چند ثانیوں بعد خطرناک صورت والا اس کی طرف مڑا۔
ڈینی اٹھ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید اسے بھی عدسے کے ذریعے کاغذ کی چکنی سطح پر کوئی نادیدہ تحریر پڑھنے کی دعوت دی جائے گی لیکن اس نے کالی سیاہی والا انک پیڈ ڈھکن ہٹا کر ڈینی کی طرف کھسکا دیا۔
"اس کاغذ پر اپنا انگوٹھا لگا دو۔" خطرناک صورت والا کہہ رہا تھا۔ "ذرا پیڈ سے اچھی طرح سیاہی لینا مجھے بالکل بے داغ اور مکمل نشان چاہیے۔"
اس نادر شاہی حکم پر ڈینی جھلا گیا۔ اتنی چھان بین کے بعد ایک سادہ کاغذ پر اس کے انگوٹھے کا نشان لینے کا کیا مطلب ہو سکتا تھا؟
"اگر کوئی تحریر درکار ہے تو میں دستخط بھی کر سکتا ہوں۔" ڈینی نے اپنی کھوپڑی کو قابو میں رکھتے ہوئے پرسکون لہجے میں کہا۔
"یہ میں بھی جانتا ہوں۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔ "اس نشان سے مجھے ایک صاف ستھری اور شارپ تصویر بنانی ہے۔"
ڈینی نے داہنے انگوٹھے کو اِنک پیڈ کی نرم اور نم سطح پر دبانے کے بعد انگوٹھے کا نشان سفید کاغذ پر منتقل کر دیا۔
خطرناک صورت والے نے عدسے سے اس نشان کا جائزہ لیا پھر بال پوائنٹ قلم سے نشان کے گرد دائرہ بنا کر باقی ماندہ کاغذ پر بے مقصد آڑی ترچھی لکیریں بنا دیں۔
"اب تو مطمئن ہو کہ یہ کاغذ کسی غلط مقصد کے لیے استعمال نہیں ہو سکے گا؟"

"مطمئن پہلے بھی تھا۔" ڈینی بولا۔ "بس یہ غلط فہمی ہو گئی تھی
م شاید مجھے جاہل مطلق سمجھ رہے ہو۔ اس لیے زبان کھولی تھی۔"
"اب تم میری گاڑی لے جاؤ۔" خطرناک صورت والے نے
ب سے چابی نکال کر ڈینی کی طرف بڑھا دی۔ "کسی محفوظ مقام پر
ں نشست اور پشت گاہ کو ہٹا کر دیکھ لینا۔"
"کیا ہے اس میں؟" اضطراری طور پر پھر ایک سوال ڈینی کی
ن سے بہہ نکلا۔
"میں خود لاعلم ہوں۔" اس بار خطرناک صورت والا پرسکون
تھا۔
وہ ڈینی کو پھاٹک تک چھوڑنے آیا۔
کشادہ اور سنسان سڑک پر آہستہ رفتار سے کار چلاتے ہوئے
ں کا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔ مونو فریکوئنسی ٹرانسمیٹر ملنے کے
سے محسوس ہو رہا تھا جیسے تنظیم میں اس کا درجہ بڑھا دیا گیا ہو۔
رقی کے اس احساس کے باوجود سب کچھ پہلے جیسا تھا۔
اسے ترقی کی خبر شاید ایک معمولی آدمی کے ذریعے دی گئی
جسے اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں تھا۔ جتنا بتایا گیا تھا، سربراہ تو
اس کے سائے سے بھی وہ اب تک لاعلم تھا۔ کسی معمولی مجرم کی
ے اس کے انگوٹھے کا نشان لیا گیا تھا اور وہ اچھی طرح جانتا تھا
ں کی شناخت کے لیے اس کی دس میں سے ایک انگلی کا نشان
کافی ہوتا ہے۔
اسے لاتعلق ہونے کا مبہم سا حکم ملا تھا۔ مگر کس سے؟
اس باس کی ماتحتی میں تو اس کا تعلق بس اپنے تین ساتھیوں
سے تھا یا پھر بازار کے دو دلال اس سے مال لے جاتے تھے۔
جتنا سوچتا رہا یہی خیال مستحکم ہوتا چلا گیا کہ اسے رات گزارنے کے
جہانگیر، طارق اور نادر سے کنارہ کر لینا چاہیے۔
اس کا مطلب ہے کہ اسے کوئی نئی ذمے داری سونپی جانے
ں تھی، ایسی صورت میں شاید مقامی دھندا براہ راست جہانگیر کی
یل میں دے دیا جاتا۔
یہ خیال آتے ہی وہ چونک پڑا۔ اب تک جہانگیر اور باس
ے درمیان وہ رابطے کا کام سرانجام دیتا رہا تھا اور اپنی شخصیت کو
سا پردہ رکھتے ہوئے متعدد مواقع پر جہانگیر کو غیر ضروری لعن طعن
ر چکا تھا۔ بلکہ اپنے مستقبل کے خوابوں کی تکمیل کی امید میں اس نے
انگیر کو اسی طرح اپنی آواز کا قیدی بنانا چاہا تھا جس طرح وہ خود
س کی غنودہ آواز کا اسیر تھا۔ اس کوشش میں وہ اس حد تک چلا
ا تھا کہ جیوا ہاؤز میں ٹرانسمیٹر چھپا کر خود ہی جہانگیر پر اس کا انکشاف
ی کر دیا تھا۔ اس کی یہ حرکات باس کے احکام سے بالا تھیں۔ اگر
انگیر براہ راست باس کا ماتحت ہو جاتا تو خدشہ تھا کہ کسی وقت
ڈینی کی ان حرکات کا راز فاش ہو جاتا اور وہ لاکھ حیلہ جوئی کرتا۔ باس کی نگاہوں میں اپنا برسوں کا بنا بنایا بھرم کھو بیٹھتا۔
پھر اچانک ایک ہولناک خیال نے اس کے ذہن میں سر اُبھارا اور وہ پھریری لے کر رہ گیا۔
کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ باس کو کسی طرح جیوا ہاؤز والے ڈرامے کی خبر مل گئی ہو اور اس نے کسی سزا سے پہلے اپنی آگاہی کی علامت کے طور پر وہ ٹرانسمیٹر اس تک پہنچایا ہو جو خطرناک صورت والے نے اسے دیا تھا۔
اس کے چہرے کے عضلات تن گئے اور زبان میں اینٹھن ہونے لگی۔ وہ لاکھ بے خوف اور بلند حوصلہ سہی لیکن جانتا تھا کہ نادیدہ دشمن سے مقابلے میں کوئی صلاحیت کام نہیں آتی۔ اندھیرے میں کہیں سے بھی چلائی گئی ایک سچی گولی ہر بے جگر اور عالی حوصلہ کے سینے میں ایک بھیانک غار بنا سکتی تھی۔
غیر ارادی طور پر ایکسلریٹر پر اس کے پاؤں کا دباؤ بڑھ گیا۔
عقبی نشست اور پشت گاہ میں چھپے ہوئے مال کے بارے میں اسے یقین تھا کہ وہ ہیروئن ہو گی۔ کیا بدلا ہوا طریق کار یہی تھا کہ وہ چارے کے طور پر کام شروع کر دے۔ کسی غیر معروف آدمی کے بجائے مقررہ ٹھکانوں سے پیکٹ جہانگیر تک پہنچاتا رہے۔
اگر بدلا ہوا طریقۂ کار یہی تھا تو یہ ترقی کے بجائے تنزلی تھی۔
وہ اُلجھ کر رہ گیا تھا۔ جتنا سوچ رہا تھا، آخری خیال ہی قرینِ قیاس معلوم ہوتا تھا۔ وہ ٹرانسمیٹر کسی سزا سے پہلے علامتی تنبیہ تھی اور یہ بھی سزا ہی تھی کہ اسے تنظیم اور فروخت کے اہم شعبے سے ہٹا کر محض مال ڈھونے پر لگا دیا گیا تھا۔
اس نے اپنی کار جیوا ہاؤز کے راستے پر ڈال دی۔
شہر میں اس کے لیے وہی ایسا محفوظ ترین ٹھکانا تھا جہاں وہ عقبی نشست اور پشت گاہ میں چھپے ہوئے مال کا جائزہ لے سکتا تھا اور ٹرانسمیٹر پر باس یا کسی اور سے رابطے کی کوشش بھی کر سکتا تھا تاکہ ذہن پر چھایا ہوا بوجھ ہلکا کر سکے۔

○

جیوا ہاؤز ایک خاصی پرانی عمارت تھی جو ایک وسیع خطۂ زمین پر تعمیر تھی۔ اس کے سامنے کم از کم ایک ہزار مربع فٹ پر پھیلا ہوا سر سبز لان تھا جس میں دیواروں کے سہارے رنگ برنگے موسمی پھولوں کے تختے اُگے ہوئے تھے۔ دونوں پہلوؤں پر احاطے کی دیواروں کے ساتھ ناریل اور آم کے بلند و بالا درخت اُگے ہوئے تھے جن پر موسم میں کثرت سے پھل آتے تھے۔
ابتدا میں ان کا کام محدود تھا۔ لہٰذا بغیر کسی ٹھکانے کے چلتا رہا مگر جب کام بڑھا اور وہ کو اپڑ زادر کھولیوں سے اپنے

مکانات میں منتقل ہوئے تو اپنی سرگرمیوں کو پوشیدہ رکھنے کے لیے انھیں شدت سے کسی خفیہ اور محفوظ ٹھکانے کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔

اس ضرورت کے اظہار پر باس نے خود ہی جیوا ہاؤز کی نشاندہی کی تھی۔ وہ عمارت کلفٹن کے ایک ایسے علاقے میں واقع تھی جہاں شاید ہی کوئی رہائشی پلاٹ خالی رہا ہو مگر تعمیرات کے اس ہجوم میں وہاں بنا ہوا ہر مکان ایک تنہا اکائی کی طرح نظر آتا تھا۔

علاقے کے مکینوں کی مصروفیات بھی اس قدر ہمہ گیر اور ان کی ذات کے خول میں سمٹی ہوئی تھیں کہ آپس میں کوئی معاشرتی رابطہ نہیں تھا۔ لے دے کے ملازمین ہی اپنے کاموں سے فراغت پانے کے بعد کسی درخت کے سائے میں مل بیٹھتے تھے اور ان کے درمیان اپنے مالکان کی سرگرمیوں کے بارے میں پُرجوش لیکن رازدارانہ تبادلۂ خیال کا سلسلہ چھڑ جاتا تھا۔

ان دنوں وہ تینوں جائدادوں کی خرید و فروخت کا کاروبار ترک کر چکے تھے۔ البتہ طارق بدستور وقت گزاری کے لیے اس کام سے چمٹا ہوا تھا اس وجہ سے جیوا ہاؤز کو کرائے پر حاصل کرنے کی ذمے داری اسی کے سر ڈال دی گئی۔

چھان بین سے پتا چلا کہ وہ عمارت سندھ کے ایک معزز زمیندار گھرانے کی ملکیت تھی جس کے نوجوان آبائی پیشے کو اختیار کرنے کے بجائے یکے بعد دیگرے ترکِ وطن کر کے امریکہ میں جا بسے تھے اور وہاں خاصی اچھی زندگی گزار رہے تھے۔ جیوا ہاؤز پر مستقل تالا پڑا رہتا تھا۔ سال میں ایک آدھ بار گاؤں سے کوئی شہر آتا تو چند دنوں کے لیے اس کا تھوڑا سا حصہ آباد ہو جاتا پھر وہی ویرانی اور اداسی چھا جاتی۔

ایسے میں طارق نے جیوا ہاؤز کے عمر رسیدہ قانونی مالک کا کھوج نکال کر اسے دو ہزار روپے ماہانہ کرائے کی پیشکش کی تو وہ بخوشی قبول کر لی گئی۔

بوڑھے زمیندار کا خیال تھا کہ عمارتیں آباد ہی اچھی رہتی ہیں ان کے در و دیوار پر انسانی ہاتھ لگتے رہیں تو عمارت کا حسن برقرار رہتا ہے۔

اور ہوا بھی یہی۔ ابتدا میں جیوا ہاؤز میں صرف ایک ملازم رکھا گیا جو کل وقتی چوکیدار کے ساتھ وہاں کا مالی بھی تھا۔ چند ہی ہفتوں میں جیوا ہاؤز کا زرد اور خزاں رسیدہ لان بہاروں کے رنگ بکھیرنے لگا۔ تیز ہوا کے ساتھ پختہ روشوں پر خزاں کے نوحے گنگنانے والے خشک پتے بھی مفقود ہو گئے اور محض ایک آدمی کے قدموں کی برکت سے اس ویران عمارت میں جا بجا زندگی کے آثار نظر آنے لگے۔

مال پہنچانے والے جیوا ہاؤز نہ ہی پہنچتے تھے اور جہانگیر وہاں ان سے نیا مال وصول کر کے پرانی کھیپ کی رقم ایک سیل بند لفافہ میں انھیں دے دیتا تھا مگر جب چرس کے بازار میں تیزی ہوئی تو ان کے پاس بڑی کھیپیں آنے لگیں۔ ایک لاٹ کئی کئی ... کے لیے کافی ہوتی اور یہ ذخیرہ جیوا ہاؤز ہی میں محفوظ کیا جانے لگا۔

وہ چاروں وہاں آتے جاتے رہتے تھے مگر مالی ... ہر وقت وہیں رہتا تھا۔ اسی دوران میں جیوا ہاؤز میں چوری ہو گئی۔ عمارت اتنے بڑے رقبے میں پھیلی ہوئی تھی کہ اکیلے آدمی کے لیے اس کی چوکیداری ناممکن تھی۔ مالی اپنے عقبی کوارٹر میں ... رہا اور چور اگلے حصے کی ایک کھڑکی سے اندر گھس کر قیمتی ... پلیئر، ٹیلی وژن، قیمتی غیر ملکی شراب کی بہت سی بوتلیں اور دیگر آرائشی اشیا نکال لے گئے۔

وہ لوگ رپورٹ کرتے تو پولیس کے سوال جواب میں اپنے رازوں کی پردہ دری کا خوف تھا، خاموش رہتے تو چوروں کی حوصلہ افزائی ہوتی۔

وہ تو غنیمت ہوا کہ چور گیراج کی طرف متوجہ نہیں ہوئے ... چوری والی رات بھی وہاں تین من سے زائد چرس موجود تھی جو ان کی سرگرمیوں کے راز فاش کرنے کے لیے کافی تھی۔

عمارت ایک فرضی نام سے حاصل کی گئی تھی، جہانگیر نے اسی نام سے رپورٹ درج کرا دی۔ وہ معاملہ ان کی توقع سے ... سیدھا ثابت ہوا۔

علاقے کی اہمیت کے پیشِ نظر پولیس کی مستعدی تھی یا ان کی خوش نصیبی کہ اگلے ہی دن دو چور گرفتار کر لیے گئے جو اسی علاقے کے چوکیدار ثابت ہوئے۔ تھانے میں مار پڑی تو انھوں نے ... کر سب کچھ اُگل دیا اور سارا مال برآمد کر لیا گیا۔

مگر وہ لوگ ہوشیار ہو گئے تھے، انھیں مکان ... اشیا سے زیادہ فکر اپنے اسباب تجارت کی طرف سے لاحق تھی۔ باہمی مشورے سے فوری طور پر دو بدنام غنڈوں کو ... بنا لیا گیا اور وہ اپنے غیر قانونی اسلحے سے لیس جیوا ہاؤز میں ... گئے ان کا کام دن رات جیوا ہاؤز کی حفاظت کرنا تھا۔

بعد میں جہانگیر کو پتا چلا کہ چوروں کی گرفتاری پولیس کی مستعدی سے زیادہ چوری کی شراب کی مرہونِ منت تھی ... تو وہ شوقین چور خود بھی اپنی جسارت پر سہمے رہے پھر ... دھکا دیا تو شراب پر منہ مار بیٹھے۔

وہ اپنے مالکان کے گھروں سے پھینکی جانے والی خالی بوتلوں کو ہمیشہ اشتیاق کی نگاہوں سے دیکھتے رہے تھے۔ ... بوتلیں انھوں نے پاک کر کے اپنے مصرف میں بھی لی تھیں مگر بھری ہوئی مہر بند بوتلیں دیکھنے کا وہ پہلا موقع تھا۔ لہٰذا ایک کوٹھری کا ... بند کر کے انھوں نے بوتل کھول لی۔

ان کی دس پُشتوں میں بھی کسی نے شراب نہیں چکھی تھی مگر ... سوں وغیرہ میں لال پری کا جادو دیکھتے رہے تھے۔ جو سر ... کر بولتا تھا۔ پینے کا سلیقہ انھیں خاک نہیں تھا بس گلاسوں ... انڈیل کر کچھ ملائے بغیر چڑھانے لگے اور آناً فاناً میں پوری ... بوتل چوس گئے۔

اتنی شراب تو کسی ہاتھی کو بھی دیوانہ کر دینے کے لیے ... ہوتی۔ وہ بے چارے کس گنتی میں تھے، بس آپس میں لڑ پڑے ... لڑتے لڑتے کوٹھری کا دروازہ توڑ کر باہر آ گئے۔

مالک مکان کے سکون میں خلل پڑا تو باہر آیا اور دور ہی ... ان لڑتے ہوئے درندوں کو پھٹکارنے لگا جو جھوم جھوم کر ایک ... کے سائے پر جھپٹ رہے تھے۔ جب ان پر ڈانٹ پھٹکار ... انداز نہ ہوئی تو آگے بڑھا۔ آدمی تجربے کار تھا۔ ان کے چڑھے ... سانسوں کے بھبکے سے معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا اور گھر کے ... دروازے بند کر کے تھانے فون کر دیا۔

پولیس آئی اور انھیں لے گئی۔ ٹھنڈے پانی کی بالٹیوں کے ... بعد برسنے شروع ہوئے تو ان کا سارا نشہ ہرن ہو گیا اور ... اِفات کا دفتر کھل گیا۔

اس کے بعد جیوا ہاؤز میں کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا۔ ... لوگ کسی دخل اندازی کے بغیر اسے مسلسل استعمال کرتے آ رہے ... محافظوں نے ہمیشہ اپنے کام سے کام رکھا تھا۔ ان لوگوں کی ... سرگرمیوں کے بارے میں کسی تجسس کا مظاہرہ نہیں کیا تھا مگر وہ بُرے ... تھے اور اتنا اندازہ بآسانی لگا سکتے تھے کہ وہ چاروں اس عمارت ... مقصد کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔

ڈینی وہاں پہنچا تو گہری فکر میں ڈوبا ہوا تھا۔

کار کا ہارن سن کر چوکیدار نے پھاٹک کا ذیلی دروازہ کھولا ... سرخ رنگ کی کار دیکھ کر چونک پڑا کیونکہ وہ اس کے لیے ... پہچانی نہیں تھی۔

"پھاٹک کھولو صلاح الدین!" ڈینی نے اسے متذبذب انداز ... کار کی طرف آتے دیکھ کر اونچی آواز میں کہا، ساتھ ہی ہیڈ لیمپس ... کر دیے تاکہ سامنے کی تیز چمک ختم ہونے کے بعد چوکیدار ونڈ ... اسکرین کے پیچھے اسے پہچان سکے۔

یہی ہوا اور پھاٹک کھول دیا گیا۔ پھاٹک کھلتے ہی اندر سے ... دونوں مسلح آدمی اپنے مخصوص انداز میں جیبوں میں ہاتھ ڈالے برآمدے ... میں آ چکے تھے۔

ڈینی گاڑی پورچ میں لے جانے کے بجائے عمارت کی بغل ... میں واقع پُختہ روش پر لیتا چلا گیا جس کے اختتام پر عقبی دیوار کے ساتھ گیراج بنا ہوا تھا۔ کار وہاں بند کر کے وہ نیچے اتر آیا اور واپس پورچ کی طرف چل دیا۔

دونوں محافظوں نے اسے سلام کیا اور وہ سر کی جنبش سے جواب دیتا ہوا بولا: "ذرا گاڑی کا خیال رکھنا، جتنی دیر میں اندر ہوں تم باہر ہی رہنا۔"

یہ کہہ کر وہ تیزی سے عمارت میں گھستا چلا گیا۔ گلشنِ اقبال والے شخص سے ملاقات کے بعد وہ بہت زیادہ پراگندہ ہو چکا تھا اور فوری طور پر اپنی نئی حیثیت کے بارے میں جاننے کے لیے بے چین تھا۔

سب سے پہلے اس نے ڈائننگ روم کی دیوار گیر چوبی الماری میں سے بوتل نکال کر اپنے لیے بلیک ڈاگ کا ایک ڈبل پیگ بنایا۔ پھر کانفرنس روم میں جا گھسا۔

اندر سے دروازہ بند کرنے کے بعد اس نے گلاس سے دو گھونٹ لیے پھر جیب سے ٹرانسمیٹر نکال لیا۔ ایسے آلات ڈینی کے لیے اجنبی نہیں تھے مگر اس ٹرانسمیٹر پر کوئی لیبل نہیں تھا جس کی مدد سے وہ اس کی قوت یا فریکوئنسی معلوم کر سکتا، البتہ اس کا اندازہ تھا کہ اس کا حیطۂ عمل چند میل سے زیادہ نہ ہو گا جس کا مطلب تھا کہ وہ صرف شہر ہی کے لیے کارآمد تھا۔

ٹرانسمیٹر کے سیل کمپارٹمنٹ میں بیٹری موجود تھی۔ ڈینی نے ٹرانسمیٹر کا انٹینا باہر کھینچ کر سُرخ بٹن دبایا اور اپریٹس آن ہو گیا جس کا اظہار اسپیکر اور کنڈنسڈ مائیکرو فون پر لگی ہوئی جالی کے اوپر روشن ہو جانے والے سرخ نقطے سے ہو رہا تھا۔

والیوم ناب کو بتدریج گھماتے ہوئے ڈینی نے آواز اس حد تک بڑھائی کہ اسپیکر پر منتشر ریڈیائی لہروں کا دھیما دھیما بے ہنگم شور گونجنے لگا جس کا مطلب تھا کہ وہ اپریٹس اس بند کمرے میں بھی بخوبی کام کر رہا تھا۔ وصول ہونے والے ریڈیائی اشاروں کی آواز معقول سطح تک کم کرنے کے بعد ڈینی نے آخر کار آلے پر لگا ہوا سیاہ بٹن دبایا اور ٹرانسمیٹر منہ کے قریب لانے کے بعد بولا: "ہیلو، ڈی ون کالنگ، اوور۔" اتنا کہہ کر اس نے سیاہ بٹن پر سے انگلی ہٹا لی اور دھڑکتے دل کے ساتھ جوابی سگنل کا منتظر رہا لیکن کئی سیکنڈ گزر گئے اور ریسیور پر سناٹا چھایا رہا۔

اس نے تھوڑے تھوڑے وقفے سے تین مرتبہ پیغام نشر کیا لیکن مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ معاً اسے خیال آیا کہ وہ اپنی شناخت تو نشر کر رہا تھا لیکن جسے مخاطب کرنا چاہ رہا تھا اس کی شناخت سے لاعلم تھا اگر اس جیسے ٹرانسمیٹر ایک سے زائد لوگوں کے پاس موجود تھے، تو وہ اس کی آواز سننے کے باوجود اس وقت تک جواب نہ دیتے جب تک انھیں یہ علم نہ ہو جاتا کہ ڈی ون کس سے بات کرنا چاہ رہا تھا۔ اتنے عرصے میں ڈینی نے یہی اندازہ لگایا تھا کہ اس

کا باس ڈسپلن کا سختی سے پابند تھا اور اس کا کوئی بھی ماتحت کسی معاملے میں بے اعتدالی کا مظاہرہ نہیں کر سکتا تھا۔

"ڈی ون کالنگ۔" ایک مرتبہ پھر وہ سیاہ بٹن دبا کر بولا۔ "جو کوئی بھی سُن رہا ہو، میری آواز کا جواب دے۔۔۔ اوور۔" اور بٹن چھوڑ دیا۔

لیکن دوسری طرف وہی سناٹا۔ اتھاہ سناٹا چھایا رہا۔

ڈینی نے ٹرانسمیٹر بند کیے بغیر جیب میں رکھ لیا۔ اسے امید تھی کہ انٹینا کے بغیر بھی شاید وہ اشارے پکڑ لے گا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ باس اس سے رابطہ قائم کرنا چاہے اور محض ٹرانسمیٹر آف ہونے کی وجہ سے وہ اس موقع کو گنوا بیٹھے۔

پھر اس نے باہر آ کر جہانگیر کو فون کیا۔ وہ گھر پر نہیں تھا لیکن کلب کے برج روم میں مل گیا۔

"میں انتظار کر رہا ہوں، فوراً جسے اپیج چلے آؤ۔" جہانگیر کی آواز سنتے ہی اس نے جیوا ہاؤز کے مخفف حروف استعمال کرتے ہوئے کہا۔

"خیریت تو ہے نا؟" ڈینی کے اس خلافِ معمول رابطے پر جہانگیر کا بوکھلا جانا قدرتی امر تھا۔

"ہاں ہاں۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔" اس نے پرسکون لہجے میں کہا۔ "لیکن یہ خیال رہے کہ میں یہیں تمہارا منتظر ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" ڈینی نے اس کا جواب سنا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

بیس منٹ میں جہانگیر جیوا ہاؤز آ پہنچا۔ ڈینی برآمدے ہی میں اس کا منتظر تھا۔

"کیا بات ہے؟ تم یہاں کیسے ہو؟" جہانگیر نے کار سے اترتے ہی تشویش آمیز لہجے میں سوال کیا۔ غیر قانونی دھندا کرنے والوں کے لیے معمول سے ہٹی ہوئی کوئی بھی بات خوف اور تشویش کا باعث بن ہی جایا کرتی ہے۔

ڈینی برآمدے سے نیچے اتر کر جہانگیر کی کار کے بانٹ سے ٹک گیا۔ "ادھر گاڑی کھڑی ہے۔" اس نے عمارت کے بائیں پہلو والی راہداری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس میں پیچھے مال ہے۔"

"اوہ۔" جہانگیر کا چہرہ کھل اٹھا مگر یکبارگی وہ چونک کر ڈینی کو گھورنے لگا۔ "یہ مال کون لایا؟"

"میں۔" ڈینی نے پرسکون لہجے میں کہا۔

"کیوں؟ یہ تبدیلی کیسے ہوئی؟" جہانگیر اسے اشتباہ آمیز نگاہوں سے گھورتے ہوئے بولا۔

"میں خود حیران ہوں۔" ڈینی بدستور پرسکون رہا۔ "ہم حکم کے بندے ہیں، جو حکم ملا اس پر عمل کر لیا، چاہو تو سبب خود دریافت کر لینا۔"

جہانگیر نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ اسے یاد آیا نامعلوم باس جیوا ہاؤز میں ہونے والی ہر گفتگو سننے پر قادر لہٰذا سختی سے ہونٹ بھینچ لیے۔

دونوں محافظوں نے حکم ملتے ہی سُرخ کرولا کی عقبی نشست اور پشتگاہ باہر نکال دی اور ان کے پیچھے چھپے ہوئے کپڑے کے چار تھیلے سامنے آ گئے جنھیں محض غلاف کے طور پر استعمال کیا گیا ورنہ ان میں جو کچھ موجود تھا۔ اس کی مقدار بہت قلیل تھی۔ جہانگیر نے ایک تھیلا اٹھایا تو وہ تقریباً خالی تھا۔ تھوڑا سا وزن سمٹ کر نیچے جمع ہو گیا تھا۔

دونوں محافظوں کو نشست واپس لگا دینے کا حکم دے وہ تھیلے اندر لے آئے۔

ان تھیلوں میں دو دو سو گرام کی پلاسٹک کی سیل کی ہوئی شفاف تھیلیوں میں بھورے رنگ کی آٹھ کلوگرام ہیروئن موجود تھی۔

"یہ بہت اچھا ہوا۔ آج رات یہ مال پارٹیوں کو پہنچ جانا چاہیے۔" جہانگیر نے کھولے ہوئے تھیلے کو دوبارہ بند کرتے ہوئے کہا۔ "تم کتنا لے جاؤ گے؟"

"میری ڈیلنگ احمد یار اور ٹائیگر سے ہے۔" ڈینی نے ... ہوئے لہجے میں کہا۔ "دونوں ہی ایک ایک کلو مانگ رہے تھے ... یا نادر میں سے کوئی ان سے مل لے گا۔"

"مگر کیوں؟" جہانگیر نے چڑ کر سوال کیا۔

"مجھے افسوس ہے کہ میں اس کا جواب نہیں دے سکتا۔ آج رات کے بعد تم تینوں میں سے کوئی بھی مجھ سے ملنے یا رابطہ قائم کرنے کی کوشش نہ کرے۔" ڈینی نے خطرناک صورت والے ... ملی ہوئی ہدایات کی روشنی میں اپنے اخذ کیے ہوئے نتائج بیان کر دیے۔

"پولیس کی نگاہوں میں آ گئے ہو؟" جہانگیر نے معنی خیز ... لہجے میں سوال کیا۔

"کچھ نہیں کہہ سکتا۔" ڈینی نے یہ اعتراف کرتے ہوئے ... کو جہانگیر کے سامنے بہت حقیر محسوس کیا۔ "پابندی ہٹ گئی تو ... ہی تم لوگوں سے ملوں گا۔"

"اچھی بات ہے۔" جہانگیر جگہ چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ مقصد ... تھا کہ ڈینی وہاں سے روانہ ہو جائے۔

یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ ڈینی نامعلوم سربراہ کے عتاب میں آیا ہوا ہے۔ وہ غیر ضروری طور پر ایک لمحے کے لیے بھی اس کا قرب برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

ڈینی جہاندیدہ آدمی تھا۔ اس نے جہانگیر کا بدلا ہوا ... بھانپ لیا۔ اس کا دل چاہا کہ اسے گریبان سے پکڑ کر بے ... گالیاں سنا ڈالے مگر اس نے بمشکل اپنے غصے پر قابو پایا اور باہر آ کر سُرخ کرولا ہی میں گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

وہ شدید غصے کے عالم میں کار ڈرائیو کرتا رہا۔ چوراہے سے وہ اس سڑک پر ہو لیا جو گزری اور ڈیفنس سوسائٹی کے درمیان سے گزرتی ہوئی کورنگی روڈ سے جا ملتی تھی۔

وہ اپنے خیالات کی رو میں کھویا ہوا تھا کہ جیب میں جھنجھناہٹ محسوس کر کے چونک پڑا۔ یہ یاد آتے ہی اس کے بدن میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی کہ اس کی جیب میں پڑا ہوا ٹرانسمیٹر مسلسل آن تھا۔

اس نے پھرتی سے ٹرانسمیٹر نکالا اور انٹینا قدرے باہر کھینچ لیا۔ چند ثانیوں کے سکوت کے بعد اس پر ایک بھرائی ہوئی غنودہ سی آواز سنائی دی اور ڈینی کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

کوئی ڈی ون کو پکار رہا تھا۔ ریڈیائی لہروں کے دھیمے دھیمے شور میں وہ آواز قدرے بھرائی ہوئی محسوس ہوئی تھی لیکن ڈینی برسوں سے وہ آواز سنتا آیا تھا۔ وہ آواز ہر وقت اس کے اعصاب پر سوار رہتی تھی۔ لہٰذا اس سے شناخت میں کوئی غلطی نہیں ہوئی۔

اس نے جلدی سے اپریٹس اپنے بائیں ہاتھ میں لیا اور وہ آواز معدوم ہوتے ہی انگوٹھے سے سیاہ بٹن دبا کر بول پڑا۔ "ڈی ون ریسیونگ سر۔۔۔ اوور۔"

"خوب۔ تم اس وقت کہاں ہو؟۔۔۔ اوور۔"

"سن سیٹ بلے وارڈ پر کورنگی روڈ کی طرف آ رہا ہوں۔" ڈینی نے جواب دیا۔ "مجھے اس کار کا کیا کرنا ہو گا سر؟ اوور۔"

"وہی بتا رہا ہوں۔" غنودہ لہجہ ترش ہو گیا۔ "لبرٹی ہوٹل سے بائیں ہاتھ گھوم کر جہاں بھی جگہ ملے۔ گاڑی پارک کر دینا چابی ایش ٹرے میں ڈال دینا، گاڑی لاک کرنے کی ضرورت نہیں۔۔۔ اوور۔"

"سامنے سے ٹریفک آ رہا ہے۔" ڈینی نے جلدی سے کہا۔ "کسی کی نگاہ نہ پڑ جائے، میں ابھی بات کرتا ہوں سر۔۔۔! اوور۔"

یہ کہہ کر اس نے ٹرانسمیٹر گود میں ڈال لیا۔

"مجھے تمھاری محتاط روی اور پیش بینی بہت پسند ہے۔" ریسیور سے آواز آنے لگی۔ "اب تم اسے آف کر دو، گھر پہنچنے کے بعد رابطہ قائم کرنا۔ برٹی سے اپنے گھر تک تمھیں زیادہ نہیں چلنا پڑے گا۔ اوور اینڈ آل۔"

اپریٹس بے جان ہو گیا۔

ڈینی نے دوبارہ سُرخ بٹن دبایا جو باہر آ گیا۔ جالی پر لگا ہوا سُرخ نقطہ روشنی سے محروم ہو گیا۔ ڈینی نے انٹینا دبا کر اپریٹس جیب میں ڈال لیا۔

باس کی سحر انگیز آواز سن کر اس کا غصہ کافور ہو چکا تھا۔

باس کا لہجہ نہ صرف نرم اور حسبِ معمول تھا بلکہ اس نے ڈینی کی محتاط روی اور پیش بینی کی تعریف بھی کی تھی جس کا مطلب تھا کہ اس کے سارے اندیشے محض خیالی تھے۔ نئے انتظامات اگر یوں ہی برقرار رہتے تو بھی تحقیر آمیز ہرگز نہیں تھے۔

اپنی مست خیالی میں شارع قائدین کا چوراہا عبور کر کے طارق روڈ پر پہنچنے کی فکر میں وہ مزارِ قائد سے آنے والی ایک تیز رفتار کار سے ٹکرانے سے بال بال بچا پھر ٹریفک کے ہجوم میں رینگتا ہوا لبرٹی ہوٹل کے سگنل تک پہنچ گیا۔

اس وقت رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ بازار بند ہو چکا تھا اور طارق روڈ پر بھی پارکنگ کی جگہیں خالی تھیں مگر ڈینی کو ہدایت پر عمل کرنا تھا لہٰذا اس نے گاڑی بائیں طرف گھمائی اور ذرا آگے فٹ پاتھ کے کنارے پارک کر دی۔

جیبوں میں ہاتھ ڈالے گھر کی طرف لوٹتے ہوئے وہ دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ باس کی فون کال کے بعد مخمصے میں پڑنے کے باوجود اس نے خود ہی گلشنِ اقبال جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اگر وہ اپنے بجائے جہانگیر کو بھیجنے کی حماقت کر بیٹھتا تو باس کی آواز تک کا سامنا کرنے کے قابل نہ رہ جاتا۔

گھر پہنچتے ہی اس نے خود کو خوابگاہ میں محصور کر لیا اور ٹرانسمیٹر آن کر کے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرنے لگا جو فوراً ہی بار آور ہوئی۔

"تو تم گھر آ گئے۔" باس کی آواز سنائی دی۔ اس بار ریڈیائی شور نہ ہونے کے برابر تھا اور آواز بہت واضح تھی۔ "احکام پر عمل درآمد ہو گیا؟ اوور۔"

"یس سر! اوور۔" ڈینی نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"رپورٹ۔۔۔ اوور۔"

"مال جہانگیر کے حوالے کر دیا۔ میرے گاہکوں کو وہ کسی کے سپرد کر دے گا اور کل سے وہ تینوں مجھ سے قطعی لاتعلق ہو جائیں گے۔۔۔ اوور۔" آخری فقرہ ڈینی نے خوفزدہ آواز میں ادا کیا تھا۔

"ویری گڈ۔" باس کے تحسین آمیز کلمات نے اس کا خون بڑھا دیا۔ "ہدایت میں نے دانستہ مبہم رکھی تھی مگر تمہارا فیصلہ درست تھا۔ یہ تمھارے امتحانات کی ابتدا ہے۔ میں تمھیں بڑے کاموں کے لیے تیار کرنا چاہتا ہوں۔۔۔ اوور۔"

"میں شکر گزار ہوں سر!" ڈینی اس وقت خود کو بادلوں سے بھی اوپر اُڑتا محسوس کر رہا تھا۔ "مگر ان تینوں کا کیا ہو گا؟ اوور۔" بے یقینی کے ساتھ کیا گیا۔ اس کا ہر فیصلہ درست ثابت ہوتا جا رہا تھا۔

"چند روز تک تمھارے لیے کوئی کام نہیں ہے۔ تم پہلے کی طرح فون پر ہدایات دیتے رہو گے۔ بعد میں کوئی راہ نکالی جائے گی۔ میں تمھیں ان سے الگ کر کے یہ یقین کرنا چاہتا ہوں کہ کوئی سرکاری ایجنسی تو تمھاری طرف متوجہ نہیں ہے ... اوور۔"

وہ خلافِ معمول بہت کُھل کر بات کر رہا تھا۔ برسوں میں پہلی بار ڈینی نے اس کی زبان سے اپنے کسی سوال کا جواب سنا تھا۔ اس کا دل شیر ہو گیا۔

"میں ہمیشہ محتاط رہا ہوں سر... اوور۔"

"مجھے معلوم ہے۔ مگر طریقۂ کار دوسرا ہے۔ ہاں ایک بات ضروری ہے۔ تمھاری فیکٹری منافع دینے کے باوجود ایک آڑ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی مگر اس کا برقرار رہنا ضروری ہے۔ آئندہ چند روز میں وہاں ایسا طریقۂ کار اپنانے کی کوشش کرو کہ تمھاری دس پندرہ روز کی غیر حاضری کام پر اثر انداز نہ ہو سکے... اوور۔"

ڈینی کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ باس نے پہلی بار اس کے نجی کاروبار کے بارے میں زبان کھولی تھی "میں دیکھ لوں گا سر! ویسے وہاں سارا حساب لگا بندھا ہے۔ ہر مشین کا پیداواری ہدف مقرر ہے۔ مالی معاملات کئی ہاتھوں سے گزرنے کے بعد مکمل ہوتے ہیں۔ کوئی رقم لے بھاگے تو دوسری بات ہے۔ ورنہ غبن کے امکانات معدوم ہیں... اوور۔"

"روزانہ رات نو بجے سے گیارہ بجے تک تم ایریئل آن رکھو گے" اس نے کہا "چاہو تو اس دوران اہم معاملات پر خود بھی بات کر سکتے ہو... اوور۔"

"بہت بہت شکریہ سر!.. اوور۔" ڈینی کے لیے وہ زندگی کا خوشگوار ترین دن ثابت ہو رہا تھا۔ فون پر ہر وقت لیے دیے رہنے والا نادیدہ باس اس پر اتنا مہربان تھا کہ اسے اپنی مرضی سے بھی بات کرنے کی اجازت مل گئی تھی۔

"کل رات شاید میں نہ مل سکوں لیکن مقررہ اوقات میں تم ایریئل آن رکھو گے... اوور اینڈ آل۔"

ٹرانسمیٹر کے رسیور سے آواز آنی بند ہو گئی اور ڈینی کو یوں محسوس ہوا جیسے کوئی رنگین اور سہانا خواب دیکھتے دیکھتے اچانک اس کی آنکھ کھل گئی ہو

❋

اگلے دن وہ بہت ہی خوش تھا۔ اس کے ذہن پر چھائے ہوئے تفکرات کے سارے بادل چھٹ چکے تھے اور اسے یقین ہو گیا تھا کہ آخر کار اس کے ترقی کے سفر کا آغاز ہو گیا تھا۔

دفتر سے روانگی سے پہلے اس نے میز پر رکھے ہوئے کاغذات الٹ پلٹ کیے تو ان کے درمیان سے غزالہ کا دیا ہوا دعوت نامہ اس کی گود میں آگرا اور غزالہ کا تر و تازہ، ہنستا مسکراتا سراپا اس کی چشم تصور میں مجسم ہو گیا۔

سووینیئر کے لیے اشتہار لے جانے کے اگلے دن اس نے اشتہاری مواد کے لیے ڈینی کی ہدایت کے مطابق اس کے گھر فون کیا تھا جو ڈینی نے خود ریسیو کیا تھا۔

اشتہار کے بارے میں فون کی تجویز تو ڈینی نے محض اس کی مترنم آواز سننے کے ایک بہانے کے طور پر تجویز کی تھی۔ ورنہ اشتہار بک کراتے ہوئے ڈینی فیصلہ کر چکا تھا کہ اس صفحہ پر کمپنی کے نام کے ساتھ بس کالج کے طلبا و طالبات کے لیے نیک خواہشات شائع کرائے گا۔

غزالہ نے فون پر سلام کے بعد ہی میٹر کے بارے میں پوچھا تھا۔

"تیار ہے... اگر آپ کہیں مل سکیں تو ابھی دے سکتا ہوں۔" ڈینی نے مکارانہ لہجے میں کہا تھا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ کب کون سا حربہ کارگر ہوتا ہے۔

"اوہ۔" وہ شاید الجھن میں پڑ گئی تھی پھر اس کی جھجکتی ہوئی آواز سنائی دی "کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ مجھے ڈکٹیٹ کرا دیں؟ میں چھپنے سے پہلے پروف آپ کو دکھا دوں گی۔"

وہ دھیمے سے ہنس دیا "میں آپ کو کسی الجھن میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ پھر کسی دن پر رکھ لیں۔"

"شاید آپ نے دعوت نامہ نہیں دیکھا۔" اس کی آواز سے پریشانی اور معذرت مترشح تھی۔ "پرسوں شام ہمارا فنکشن ہے۔ سووینیئر چھپ رہا ہے، بس ٹائیٹل باقی ہے، کل چھپائی ختم ہونے کے بعد ہی پرسوں وہ بائینڈ ہو کر تیار ہو سکتا ہے... پلیز آپ مجھے بتا دیں۔"

اس کی آواز میں التجا تھی، ڈینی کچھ نادم سا ہو گیا "پھر ایسا کریں کہ ایک تہنیتی سطر کے ساتھ کمپنی کا نام چھاپ دیں۔"

"اور آپ کا میٹر؟"

"اسے بھول جائیں، مجھے آپ کی سہولت زیادہ عزیز ہے۔" اس نے ہنستے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"دد... دراصل میرا اس وقت گھر سے نکلنا دشوار ہے۔" وہ دبی دبی خوشامدانہ آواز میں بولی تھی "مجھے امید ہے کہ آپ نے برا نہ مانا ہو گا۔"

"ہرگز نہیں۔" ڈینی نے فراخ دلی سے کہا۔

"تو پھر آپ آرہے ہیں نا ہمارے فنکشن میں؟" غزالہ نے پر امید لہجے میں سوال کیا تھا۔

"پوری کوشش کروں گا۔"

اس شام اس کے پاس کوئی مصروفیت نہیں تھی۔ باس

کی جانب سے چند دن کے لیے کھلی چھوٹ مل گئی تھی بس رات کو اسے تین گھنٹے تک ایریئل آن رکھ کر باس کے کسی پیغام کا انتظار کرنا تھا۔

دفتر سے گھر پہنچ کر ڈینی نے دیر تک غسل کیا پھر وسکی کا ایک لارج پیگ لے کر بیٹھ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ موڈ بنانے کے لیے ایک ڈبل پیگ بہت موثر ثابت ہوتا ہے۔

لباس تبدیل کر کے وہ خراماں خراماں غزالہ کے کالج پہنچا تو وہاں ایک میلے کا سا سماں تھا۔ ڈینی کار پارک کر کے نیچے اترا تو کالج کے پھاٹک سے ایک اسمارٹ سا طالبعلم اس کی طرف لپکا جس کے شانے پر لگا ہوا سبز اور سرخ ساٹن کا پھول یہ ظاہر کر رہا تھا کہ وہ فنکشن کے انتظامی گروپ سے وابستہ تھا۔ ڈینی نے اسے کارڈ دکھایا تو وہ احترام سے اسے اندر لے آیا۔

خورد و نوش کی اشیا کے مختلف اسٹالز کے درمیان سے گزرتے ہوئے ڈینی نے لاؤڈ اسپیکر پر گونجتی ہوئی آواز سنی تو چونک پڑا۔

کوئی مقرر مدلل انداز میں نوجوان نسل پر منشیات کے تباہ کن اثرات کا ذکر کر رہا تھا۔

ڈینی میدان میں شامیانوں کے نیچے قناتوں کی دیواروں میں گھرے ہوئے پنڈال میں پہنچا تو وہاں رنگ و بو کا ایک سیلاب آیا ہوا تھا جوان اور شگفتہ چہروں کا ایک ہجوم وہاں سکون سے بیٹھا تقریر سن رہا تھا۔ اس میں شوخ و شنگ لڑکے بھی تھے اور سنجیدہ رو لڑکیاں بھی۔

روسٹرم پر ایک عینک پوش چہرہ موجود تھا۔ اسٹیج کی صدارتی کرسی پر شیروانی میں ملبوس ایک متین اور وجیہہ شخص چند لوگوں کے درمیان موجود تھا۔ ان میں شاید طلبا بھی تھے اور ان کے مدرس بھی، مگر ان سب سے زیادہ جو چیز ڈینی کی توجہ کا مرکز بنی۔ وہ عقبی قنات پر لگا ہوا لمبا سا سفید بینر تھا جس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اس وقت پنڈال میں ایک مذاکرہ ہو رہا تھا جس کا موضوع 'نئی نسل اور منشیات کی تباہ کاریاں' تھا۔

ڈینی سرچ لائٹوں کی تیز روشنی سے بچتا ہوا ایک قنات کے ساتھ پڑی عقبی کرسیوں میں سے ایک پر براجمان ہو گیا۔

وہ خوش پوش ضرور تھا لیکن اس کے چہرے کی پختگی دور ہی سے بتا دیتی تھی کہ وہ پڑھنے پڑھانے کی عمر سے برسوں پہلے گزر چکا ہے۔ لہٰذا ایک دو طالبعلم اس کی طرف لپکے۔

"سر آپ آگے چلے جائیں، مہمانوں کے لیے اسٹیج کے قریب بندوبست کیا گیا ہے۔" ایک لڑکے نے آگے پڑے ہوئے صوفوں کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"شکریہ۔" ڈینی اخلاقاً مسکرایا "میں یہیں ٹھیک ہوں، چند تقریریں سن کر چلا جاؤں گا۔"

"آپ کا یوں اکیلے بیٹھنا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔" وہ شانے اچکا کر بولا "اگر آپ بتا سکیں کہ کس نے مدعو کیا ہے تو شاید میں ان ہی کو تلاش کر سکوں۔"

ڈینی کا دل باغ باغ ہو گیا۔ اس نے ڈینی کے دل کی بات پڑھ لی تھی "دو طالبات میرے دفتر آئی تھیں... شاید غزالہ اور عابدہ نام تھے ان کے۔" درمیان میں وہ لحظہ بھر کے لیے یوں رکا تھا جیسے ان کے نام سوچ رہا ہو۔

"اوہ۔ وہ ہری مرچ تو ابھی یہیں تھی۔" وہ بے اختیار بول پڑا۔

"کون؟" ڈینی نے حیرت سے پوچھا۔

نوجوان طالبعلم کے چہرے پر خجالت آمیز مسکراہٹ پھیل گئی "معاف کیجیے گا، گستاخی ہو گئی، دراصل عابدہ اپنی تنک مزاجی کے لیے خاصی مشہور ہے۔"

"مگر آپ نے کہا کیا تھا ان کو؟" ڈینی حوصلہ افزا انداز میں مسکرایا۔

لڑکا جواب دیے بغیر سر جھٹکتا وہاں سے چلا گیا۔

تقریر ختم ہو چکی تھی، اناؤنسر دوسرے مقرر کی آمد کا اعلان کر رہی تھی۔

چند منٹ بعد ہی وہ دونوں ہانپتی ہوئی وہاں آپہنچیں شاید تیز تیز چلتی ہوئی آئی تھیں۔

"بڑا اچھا ہوا کہ آپ آگئے۔" غزالہ نے اس سے اگلی قطار کی کرسی گھما کر بیٹھتے ہوئے کہا "شاہد نے کسی مہمان کے بارے میں بتایا تو خیال آپ ہی کی طرف گیا تھا۔"

عابدہ نے ادب سے سووینیئر ڈینی کی طرف بڑھا دیا جس کے عقبی سرورق پر ڈینی کی پلاسٹک فیکٹری کا تہنیتی پیغام موجود تھا۔

"وعدہ کر لیا تھا اس لیے آگیا۔ بمشکل وقت نکال سکا ہوں۔" ڈینی اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالتے ہوئے بولا "بس چند منٹ بعد اجازت چاہوں گا۔"

"ارے!" غزالہ نے معصومانہ حیرت سے کہا "تو آپ ورائٹی پروگرام نہیں دیکھیں گے ہمارا؟"

اور ان میں گفتگو چل پڑی۔ ڈینی کا خیال تھا کہ شاید وہ اس کے پاس زیادہ دیر نہیں رکیں گی تاکہ کسی کی نگاہوں میں نہ آسکیں مگر وہ بے تکلفانہ انداز میں جمی رہیں۔ ڈینی نے جو کچھ سوچا۔ وہ اس کے دل کا چور تھا مگر لڑکیوں کا دل صاف تھا۔ وہ اپنے ادارے سے تعاون کرنے والے ایک مخیر شخص کی مہمانداری

کر رہی تھیں جس میں کوئی برائی نہیں تھی۔

مذاکرہ کب ختم ہوا اور کب مہمانِ خصوصی کو اختتامی تقریر اور پھر تقسیم انعامات کے لیے بلایا گیا، ڈینی کو معلوم ہی نہ ہو سکا۔

پھر وہ اچانک اپنی کرسی سے اچھل پڑا اور حیرت اور بے یقینی کے ساتھ اسٹیج کی طرف دیکھنے لگا۔ جہاں صدارتی کرسی والا متین اور وجیہہ شخص روسٹرم پر مائیک کے سامنے کھڑا تھا۔

"نوجوان دوستو اور بزرگ ساتھیو! مجھے خوشی ہوئی کہ آج یہاں مذاکرے کے شرکا نے بہت معلوماتی تقریریں کیں"۔ مہمانِ خصوصی کی ٹھہری، بھاری اور غنودہ سی آواز فضا میں کسی لاہوتی گونج کی طرح پھیل رہی تھی اور ڈینی کے رگ و ریشے میں سرایت کرتی جا رہی تھی۔ وہ کسی سحر زدہ معمول کی طرح سر اٹھائے اس کے افکارِ عالیہ سُنے جا رہا تھا۔

"کیا ہوا؟ کیا بات ہے تنویر صاحب؟" اس کے بشرے کی کیفیت اچانک بدل جانے پر غزالہ بوکھلا گئی۔ اس کی ترنم ریز آواز ڈینی کو بہت دور سے آتی محسوس ہوئی۔

وہ پھریری لے کر پھیکے پن سے مسکرا دیا۔ "نن... نہیں... کچھ نہیں، مجھے باتوں باتوں میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہو سکا۔"

"منشیات اس مشینی دور کا ایک موذی تحفہ ہیں۔ زہر زندگی کو ختم کرتا ہے مگر یہ انسانی ذہن کو تباہ کر کے اسے ایک بے مصرف ڈھانچا بنا دیتی ہیں۔" غنودہ آواز فضا پر محیط تھی۔ "اگر اس بڑھتے ہوئے ریلے کے سامنے بند نہ باندھا گیا تو معاشرہ تباہی سے دوچار ہو جائے گا... ۔"

ڈینی نے کرسی چھوڑ دی۔ ہیجان کی شدت سے اس کا حلق سوکھنے لگا تھا، وہ زبان تر کرنے کے لیے بے چین تھا۔ وہ روشنیوں سے بچتا ہوا پنڈال سے باہر آ گیا۔

غزالہ اور عابدہ اس کے پیچھے پیچھے تھیں۔

ڈینی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ جس آواز نے برسوں سے اسے اپنا قیدی بنایا ہوا تھا۔ وہ یوں سرِ عام فضا میں گونج رہی تھی۔

کیمپس کے ہاسٹلوں میں عجیب اضطراب کی سی کیفیت طاری تھی جو طلبا محض پڑھنے کی خاطر وہاں مقیم تھے، ان کے لیے تو خیر سب کچھ معمول کے مطابق ہی تھا مگر ایسے لوگ اکثریت میں ہونے کے باوجود معاشرتی زندگی میں اتنے سرگرم نہیں تھے۔ ہاسٹل کی رونق، مردان خان، عبدالوہاب، جبار، نوری السعید اور طلحہ جیسے لوگوں کے دم سے تھی جو نصابی معاملوں سے ذرا پرہیز ہی کرتے تھے مگر غیر نصابی سرگرمیوں اور دوسروں کی پگڑیاں اچھالنے میں پیش پیش رہتے تھے۔

وہ لوگ مختلف علاقوں بلکہ ملکوں سے تعلق رکھتے تھے مگر ان میں ایک شوق مشترک تھا جس نے انھیں سارے امتیازات بھلا کر شیر و شکر ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ اکثر رات گئے بھی ایک دوسرے کے دروازوں پر دستک دیتے یا وہاں سے برآمد ہوتے نظر آتے تھے کیونکہ ان کا نشہ مشترک تھا جو سستا ہونے کے ساتھ ہی کارگر بھی تھا، بس ذرا آنکھیں ہی سرخ ہوتی تھیں۔ ورنہ طاقت، ہمت اور جرأت کے سارے سوتے ہوئے سوتے ایک ساتھ بہہ نکلتے تھے، جو جس دُھن میں لگ جاتا، لگا ہی رہتا۔ محبت کا ذکر آتا تو آوازوں میں رقت طاری ہو جاتی، دلربا نازنینوں کے نام لیتے ہوئے آنکھوں کے گوشے نم ناک ہو جاتے اور ایسے میں اگر کسی کے منہ سے کوئی تلخ بات نکل جاتی تو وہ ہڑبونگ اور مار دھاڑ مچتی کہ وارڈن کی دھمکی کے بغیر ہنگامہ فرو ہی نہ ہوتا مگر رات گئی، بات گئی کے مصداق اگلی صبح وہ پھر اکٹھے ہوتے۔ ایک دوسرے **کا تھوڑا بہت خون بہا لینے کے باوجود بھی ان کی آپس کی محبت میں کوئی کمی نہیں آتی تھی۔**

اس وقت بھی وہ سب ہاسٹل سے باہر ایک لان میں موجود تھے، سب ہی تھکے تھکے، مضمحل اور اداس نظر آ رہے تھے۔

"سارا شہر رو رہا ہے۔" مردان خان جھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "پتا نہیں سالی کہاں غائب ہو گئی۔ کل سارے شہر کے دھکے کھانے کے بعد لسبیلہ سے چار گنے داموں پر ایک پوا لایا تھا جو اُڑ گیا، سمجھ میں نہیں آتا کہ کیسے گزارا ہو گا۔"

"وہ ٹیکسی بھی شہر میں کہیں نظر نہیں آتی؟" جبار نے پوچھا۔ "تم تو آج بھی گئے تھے۔"

"گیا تھا مگر بھاڑ جھونک کر آ گیا۔" مردان خان برا سا منہ بنا کر بولا۔ "ٹیکسی نظر آ جاتی تو ڈرائیور ہی کی گردن پر سوار ہو کر تھوڑی بہت لے آتا۔"

"للی بے چاری بھی تڑپ رہی ہے۔" عبدالوہاب ٹھنڈا سانس لے کر بولا۔ "تھوڑی دور چلتی ہے تو ٹانگیں کانپنے لگتی ہیں اور آنکھوں کے سامنے دھندلاہٹ سی ناچ جاتی ہے... ہائے، مجھے تو اس کا غم کھائے جا رہا ہے۔"

لان پر دو تین زہریلے قہقہے اُبھرے مگر ان میں زندگی نام کو نہیں تھی، کھوکھلے اور بیزار بیزار سے قہقہے جیسے خوشی سے محرومی کے بعد مایوس ہو کر وہ زندگی کی ہر حقیقت کا مضحکہ اڑانے پر تل گئے ہوں۔

"اب تو کیمپس کے زیرِ تعمیر حصوں میں بھی جانے کی پابندی لگ گئی ہے، پھر کیسے دوستی چل رہی ہے اس کے ساتھ؟" عدنان نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ "اس کا پیچھا چھوڑ دو پیارے! وہ بیک وقت تین چار کو اُلّو بنا رہی ہے، مقابلہ کراتی ہے اپنے چاہنے والوں میں۔

...ہ سب سے تحفے بٹورتی رہتی ہے۔"

"ختم کرو یہ بکواس۔" نوری السعید اکتائے ہوئے لہجے میں ...ریزی میں بولا۔ وہ اُردنی طالب علم تھا، چار برس سے یونیورسٹی میں ...سٹ رہا تھا مگر ماسٹرز کی ڈگری اب بھی ایک خواب بنی ہوئی تھی۔ ...دو خوب سمجھ لیتا تھا لیکن بولنے پر قادر نہیں تھا۔ "یہ سوچو کہ اب ...با ہو گا؟"

"مینڈرکس ٹرائی کی جائے۔" کسی نے تجویز پیش کی اور سب کے ...ہ بن گئے۔

ان کی یہ بحث و تمحیص گزشتہ کئی دنوں سے یونہی چل رہی ...ی۔ چرس کی نایابی پر وہ دوسرے نشوں کے بارے میں بھی تبادلۂ ...ل کرتے رہے تھے مگر کہیں متفق نہ ہو سکے تھے۔ ان دنوں شراب ...صول سب سے آسان تھا مگر وہ ایک مہنگا نشہ تھا۔ ایک آدھ ...تو اس کی عیاشی کی جا سکتی تھی لیکن روز شراب پینے کا وہ تصوّر ...نہیں کر سکتے تھے۔ اس میں اور بھی کئی خرابیاں تھیں۔ اسے رکھنا ...چھپانا دشوار تھا، پینے کے لیے ایسی جگہ ضروری تھی جہاں بے فکری سے ...بلستہ گلاس تیار کر کے ایک ایک گھونٹ میں خالی کیے جائیں۔ اس ...بو بھی ایک بڑا مسئلہ تھی جسے ساتھیوں تک سے نہیں چھپایا جا ...تا تھا۔ اگر کبھی اچانک وارڈن وغیرہ سے سامنا ہو جاتا تو محض بو ...وجہ سے پکڑے جانے کا خطرہ رہتا جس کا انجام جامعہ سے دو تین ...رس کے لیے اخراج سے کم پر ہرگز نہ ہوتا جب کہ چرس تھی سدا بہار ...راستعمال میں نہایت آسان تھی۔

سُلگائے بغیر ایک عام آدمی کے لیے بے بو تھی۔ جب اس کی ...ارزانی تھی تو وہ ڈنکے کی چوٹ عام سگریٹوں کے ساتھ چرس بھری ہوئی ...سگریٹیں بھی جیبوں میں لیے پھرتے تھے اور کسی کو شبہ نہیں ہوتا تھا پھر ...جب موڈ ہوا، ہجوم سے کٹ کر کسی گوشے یا میدان میں ہو لیے۔ ...دیا سلائی کا شعلہ لپکا اور گہرے، حیات آفریں سکون کی لہریں سگریٹ ...کے سلگتے ہوئے سرے سے نکلنے والے بل کھاتے ہوئے سرمئی دھوئیں میں ...انگڑائیاں لینے لگتیں۔ جلتی ہوئی چرس کی بُو ہوا کے جھونکوں میں جلد ...ہی تحلیل ہو جاتی تھی ایسے میں اگر کوئی اچانک آ جاتا تو سگریٹ بجھائی ...اور میدان صاف۔

"اسکوٹر کی چابی دو مجھے۔" نوری السعید نے اٹھتے ہوئے عبدالوہاب سے کہا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" اس نے گھاس پر لیٹے لیٹے ٹانگیں پسار کر پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے سوال کیا۔

"لل... لی کے پاس۔" مردان خان نے للی کا نام کھینچ کر کہا اور فضا میں بے اختیار قہقہے گنگنا اٹھے۔

"میں ذرا اسٹینڈ تک چکر مار کر آتا ہوں۔" نوری السعید نے عبدالوہاب سے چابی لیتے ہوئے کہا۔ "شاید آج وہ آ ہی جائے۔"

"مشکل ہے۔" طلحہ نے اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالتے ہوئے مایوسانہ لہجے میں کہا۔ "آٹھ بج رہے ہیں، اب کیا آئے گا۔"

لیکن طلحہ کا تبصرہ نوری السعید کو نہ روک سکا۔ وہ اسکوٹر کی چابی گھماتا ہوا ہاسٹل کی طرف چل دیا جہاں گاڑیاں پارک رہتی تھیں۔

وہ پوائنٹ پر پہنچا تو وہاں شہر جانے والی آخری بس اپنے چند مسافروں سمیت روانگی کے لیے تیار تھی۔ اس کے سوا دور تک کسی سواری کا نام و نشان نہیں تھا۔ اس کی مایوسی میں مزید اضافہ ہو گیا مگر واپس لوٹنے کے بجائے اس نے معاملے کی پوری تفتیش کی ٹھان لی۔ اسے معلوم تھا کہ ٹیکسی ڈرائیور جامعہ کے ایک مالی کا واقف کار تھا اور جب بھی ادھر آتا، مالی سے ضرور ملتا تھا لہٰذا اس نے اسکوٹر کا رخ اس طرف کر دیا جہاں درجہ چہارم کے ملازمین کے کوارٹر بنے ہوئے تھے چند ہی منٹ میں وہ کوارٹروں کے درمیان پہنچ گیا لیکن پھر خود ہی چکرا کر رہ گیا۔

چرس کے بغیر شاید اس کا ذہن بھی ناکارہ ہو چلا تھا۔ وہ وہاں تک تو دوڑا چلا آیا تھا مگر نہ مالی کے مکان سے واقف تھا، نہ اس کا نام جانتا تھا۔ بس ایک حد تک صورت آشنا ہی تھا۔ ایسی صورت میں وہاں کے رہنے والوں سے محض حلیہ اور خدوخال بتا کر مالی کا گھر دریافت کرنا اسے مناسب محسوس نہ ہوا۔ وہ ایک غیر ملکی طالب علم تھا اور ایسا مشکوک رویّہ اختیار کر کے مالی کے لیے کوئی دشواری نہیں کھڑی کرنا چاہتا تھا۔

ان دنوں کچھ لڑکوں کی احمقانہ بے پروائیوں سے جامعہ کی حدود میں عموماً اور ہاسٹلز میں خصوصاً منشیات کے استعمال کی خبریں انتظامیہ کو مل چکی تھیں اور اس امر پر سخت تشویش کا اظہار کیا جا رہا تھا کہ جامعہ کی حدود میں منشیات کیسے پہنچتی ہیں؟

غور و خوض کے بعد جو نتائج اخذ کیے گئے ان میں جامعہ کی حدود میں واقع اِکّا دُکّا دکانوں، کینٹین کے عملے اور جامعہ کے نچلے درجے کے کم تنخواہ یافتہ ملازمین پر شبہات کا اظہار کیا گیا تھا جو اضافی آمدنی کے لالچ میں اس لعنت کے فروغ میں معاون ہو سکتے تھے۔ عام خیال یہ تھا کہ شاید ایسے مشتبہ افراد کو بے نقاب کرنے کے لیے ان پر نگاہ بھی رکھی جا رہی تھی۔

ان لوگوں کو منشیات کی فراہمی میں اندر کے کسی آدمی کا دخل نہیں تھا۔ وہ ٹیکسی ڈرائیور جبار کے ذریعے ان سے متعارف ہوا تھا۔ جبار اس کی ٹیکسی میں شہر سے یونیورسٹی لوٹ رہا تھا کہ راستے میں اچانک ڈرائیور نے سگریٹ نوشی شروع کر دی۔ دھوئیں کی مخصوص بو پہچانتے ہی جبار بے چین ہو گیا۔ وہ اس وقت بھی چرس کا تھوڑا بہت عادی تھا لہٰذا اس نے بے تکلفی سے ڈرائیور سے سگریٹ مانگی جو قدرے حیرت

کے اظہار کے ساتھ اسے دے دی گئی۔

"تم بھی گولی لگاتے ہو بابو؟" ڈرائیور نے پوچھا تھا۔

"ارے اسی سے تو زندگی کا مزا ہے۔" جبار نے سگریٹ کا کسیلا دھواں اپنے پھیپھڑوں میں بھرتے ہوئے کہا۔ "مل جاتی ہے تو پی لیتے ہیں ورنہ ترستے رہتے ہیں۔"

"کہاں سے لیتے ہو؟"

"ایک دوست کو سبیلہ کا ایک اڈہ معلوم ہے، وہ شہر آتا ہے تو تھوڑی بہت لے جاتا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ اور لڑکے بھی پیتے ہیں۔" ڈرائیور کی آواز پُرخیال ہوگئی تھی۔ "کتنے ہوں گے پینے والے؟"

"پندرہ بیس کو تو میں خود جانتا ہوں۔"

ڈرائیور نے ٹیکسی کی رفتار سست کر دی۔ "اس کا مطلب ہے کہ یہاں مال نکلنے کا آسرا ہے۔" اس نے گردن گھما کر سوال کیا تھا۔

"کیا تم چرس بیچتے ہو؟" جبار نے حیرت سے پوچھا۔

"بس جی، کچھ کہنے کی بات نہیں۔" ڈرائیور حسرت بھرے لہجے میں بولا تھا۔ "کرائے کم تھے تو دو پیسے بچ بھی جاتے تھے، جب سے پٹرول میں آگ لگی ہے اور ہمارے کرائے بڑھائے گئے ہیں، دھندا ہی چوپٹ ہوگیا۔ لوگ گھنٹہ آدھا گھنٹہ بس، منی بس کا انتظار کر لیتے ہیں لیکن ٹیکسی کے بارے میں نہیں سوچتے۔ اب تو سفید پوش لوگ بھی ڈھیٹ بن کر بال بچوں کو بسوں میں دھکے کھلوانے لگے ہیں، گزارے کے لیے ہمیں بھی کچھ ہاتھ پیر چلانے پڑتے ہیں۔"

"یونیورسٹی میں تمہارا کام خاصا چلے گا۔" جبار نے رائے ظاہر کی تھی۔ "مگر بس ادھار کسی سے نہ کرنا۔ . ."

"اجی اپنا ہر ایک سے کیا واسطہ۔" وہ اس کی بات کاٹ کر بولا تھا۔ "میں کالج کے لڑکوں کو خوب جانتا ہوں، ادھار کی عیاشی ہر ایک کو اچھی لگتی ہے۔ دس حساب صاف کر دیتے ہیں تو دو چار کنگلے بھی نکل آتے ہیں جن سے ادھار کی واپسی کا مطالبہ کرو تو دس پانچ ساتھی لا کر ٹھکائی کر ڈالتے ہیں، تھوڑے دن میں نے ناظم آباد میں ٹھیلے پر حلیم بھی بیچی ہے صاحب! شام کو کالجوں کے پاس کھڑا ہو جاتا تھا۔ ان لڑکوں سے نمٹنا اپنے بس سے باہر ہے بس جس سے تم سامنا کرا دو گے اسی سے نقد لین دین رکھوں گا۔"

"پھر کب سے آؤ گے؟"

"کل آؤں گا مال لے کر۔" اس نے گہرا سانس لے کر کہا تھا۔ "ٹھیک ساڑھے پانچ بجے آخری بس اسٹینڈ پر پہنچوں گا اور اسی وقت تم بتا دینا کہ پھر کب آؤں۔"

"تو روز نہیں آؤ گے؟"

"ارے کیوں مرواؤ گے صاحب!" وہ ہنس پڑا۔ "روز آنے لگا تو ٹیکسی ہر ایک کی نگاہوں میں کھٹکنے لگے گی۔ دن کے آنے کا وقت بھی بدلتا رہے گا۔ تم بھی آدمی بدل بدل کر بھ ایسے دھندوں میں بڑی احتیاط کرنی پڑتی ہے۔"

"مگر نئے آدمی تمھیں کیسے پہچانیں گے؟"

"ویسے تو ٹیکسی کا نمبر بھی ہے مگر یہ میری اپنی نہیں سکتا ہے کہ خراب ہو جائے یا کسی دوسرے مالک کی گا لگوں، اچھا یہی رہے گا کہ ہر دفعہ کے لیے پہلے سے کوڈ مقر جو اپنی شناخت بتائے گا پیسے دے کر مال لے جائے گا۔"

"پہلے سے اگلی ملاقات کا دن، وقت اور کوڈ مقر بڑا مشکل ہوگا۔"

ڈرائیور پُراعتماد انداز میں ہنسا۔ "مثلاً اب میں تمھ رہا ہوں کہ کل شام ساڑھے پانچ بجے اسی ٹیکسی میں آ آدمی مجھ سے سفید ہاتھی کہے گا اور میں میٹر گرا کر اسے ٹیکسی لوں گا۔ ٹیکسی چلنے کے بعد وہ مجھے سو روپے دے گا او کی تھیلی دے کر تھوڑے فاصلے پر اسے اتار دوں گا اور اگلی ملاقات کے بارے میں بتا دوں گا۔"

وہ چرس بہت عمدہ لاتا تھا اور شروع سے طے شدہ کے تحت پورے گروپ کی ضروریات ایک ہی آدمی لے آ باری وہ سب ہی ہر بار ایک نئے کوڈ کے ساتھ اس ڈرا مل چکے تھے۔ اس کے آنے کا وقت بھی بدلتا رہا تھا لیکن صبح دس بجے سے پہلے اور شام چھ بجے کے بعد نہیں آیا پروگرام کے مطابق اسے چار دن پہلے شام کے چار بجے بام مچھلی کہنے والے کو مال دینا تھا مگر مردان خان پانچ کے انتظار میں جھک مارنے کے بعد مایوس و نامراد لو اس جانکاہ واقعے کی خبر سینہ بہ سینہ گروپ کے تمام ارا گئی تھی۔

ان کا گروپ بتدریج بڑھتے بڑھتے بائیس لڑ لڑکیوں پر مشتمل ہوگیا تھا جو سب کے سب مختلف ہاسٹل ہوئے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو ایک دوسرے کو برداش تھے۔ ورنہ وہ بہتیرے دوسرے طلبا کو بھی جانتے تھے جو عادی تھے مگر اپنی عادات و اطوار کی بنا پر ان میں گھ سکتے تھے۔ ان لوگوں نے اپنے لیے چرس کی فراہمی کا ذریعہ سے راز ہی رکھا تھا۔ ورنہ انھیں اندیشہ تھا کہ کوئی نک کی تذلیل کے لیے انتظامیہ سے مخبری کر کے ان کے کسی ساتھی اور چرس سمیت رنگے ہاتھوں نہ پکڑوا دے۔

نوری السعید واپس ہاسٹل کی طرف جاتے ہوئے مسلس کے بارے میں سوچتا رہا جو لوگ پچیس کی ٹولی سے باہر تھے

بھی یقیناً کچھ نہ کچھ ذرائع رہے ہوں گے۔ اس نے سوچا کہ اس بُرے وقت میں انا کو ایک طرف رکھ کر اگر انھیں ٹٹولا جائے تو شاید بات بن ہی جائے۔

یہ فیصلہ کرتے ہوئے اس کے ذہن میں یوسف کا نام کلبلا رہا تھا جو فلسطین کا باشندہ تھا، حکومت پاکستان کے وظیفے پر جامعہ میں کیمسٹری میں آنرز کر رہا تھا۔ وظیفے کی رقم خاصی بڑی تھی۔ لہٰذا وہ بڑی فراخدلی سے رہتا تھا۔ ایک سیکنڈ ہینڈ کار بھی رکھی ہوئی تھی جس میں آئے دن اپنی دوست لڑکیوں کو تفریحی مقامات پر لے جاتا رہتا تھا۔ نوری السعید اور اس جیسے دوسرے غریب عرب طلبا سے وہ دور دور ہی رہتا تھا۔ سامنا ہوتا تو بات رسمی مزاج پرسی سے آگے نہ بڑھتی مگر نوری السعید کو پورا یقین تھا کہ وہ چرس کا عادی ہے۔ وہ دونوں ہم جماعت تھے اور نوری السعید نے کلاس روم میں بھی ہمیشہ اس کی آنکھوں میں سُرخ ڈورے تیرتے دیکھے تھے جو چرس نوشی کی پہلی اور بنیادی پہچان ہوتی ہے۔

یوسف کا کمرہ اندر سے بند تھا اور کئی عرب لڑکوں کے ہنسی مذاق کی آوازوں کے ساتھ ہی کیسٹ پر بجتے ہوئے عربی نغمے کے بول بھی سنائی دے رہے تھے۔ نوری السعید دروازے پر پہنچ کر لحظہ بھر کے لیے جھجکا پھر آہستہ سے دروازے پر دستک دے ڈالی۔

اندر کیسٹ بجتا رہا، آوازیں تھم گئیں پھر انگریزی میں ایک سخت آواز گونجی۔ "کون ہے؟"

"میں نوری السعید ہوں۔" وہ عربی میں بولا۔ "ذرا ایک ضروری کام ہے تم سے۔"

کنڈی گرائی گئی، دروازہ تھوڑا سا کھولا گیا اور یوسف اس کے سامنے آگیا۔ "ہاں، کیا بات ہے؟"

اس کے سانسوں میں ڈرائی جن کی دھیمی سی مگر واضح بُو رچی ہوئی تھی۔ اندر باتیں دوبارہ شروع ہو چکی تھیں، دروازے کی جھری میں سے نوری السعید کو کسی کے ہاتھ میں تھامے ہوئے ایک بے ہودہ انگریزی رسالے کی تصاویر نظر آئیں پھر وہ یوسف کی طرف دیکھنے لگا۔ اسے یوسف سے اس بے رُخی کی امید نہیں تھی کہ وہ اسے اندر آنے کو بھی نہیں کہے گا اور محض دروازے سے ٹالنے کی کوشش کرے گا۔

"مجھے افسوس ہے کہ میں تمھاری محفل میں مخل ہوا۔" نوری السعید نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔ "دراصل ایک الجھن تمھارے دروازے تک لے آئی ہے، اگر تم تھوڑی سی چرس ادھار دے سکو۔"

"یہ محتاج گھر نہیں ہے بھائی!" وہ مضحکانہ لہجے میں بولا۔ "نشہ کرنے کا شوق ہے تو ہاتھ پھیلانے کے بجائے مال پیدا کرو۔"

نشے باز نشے کے بغیر جو ہے سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ یہی حال نوری السعید کا بھی تھا، یوسف کے زہریلے کٹیلے الفاظ اس کے سر پر سے گزر گئے۔ "مال بہت ہے مگر چرس ناپید ہوگئی ہے۔" اس نے کہنا چاہا مگر یوسف نے درمیان ہی سے بات اچک لی۔

"ہمارے پاس ہوتی تو جن نہ پی رہے ہوتے۔" یوسف نے خشک لہجے میں کہا۔ "مجھے افسوس ہے کہ میں تمھاری جھولی میں کچھ نہ ڈال سکوں گا۔" یہ کہہ کر اس نے نوری السعید کی روانگی کا انتظار کیے بغیر دروازہ بند کر کے بولٹ چڑھا دیا۔

وہ واپسی کے لیے سیڑھیاں اتر رہا تھا تو یوسف کے کمرے سے پُرشور قہقہوں کی گونج اُبھری اور دھیمے دھیمے اس کی کھوپڑی سلگنے لگی۔ یوسف نے یقیناً اپنے ساتھیوں سے اس کا تذکرہ تضحیک آمیز لہجے میں کیا تھا جو وہ یوں خوش ہو رہے تھے۔ وہ مٹھیاں بھینچے تیزی سے سیڑھیاں اترتا چلا گیا اور پھر اسکوٹر اسٹارٹ کر کے اپنے دوستوں کی طرف روانہ ہوگیا۔

❁

حامد کے لیے طارق کی شخصیت نہایت عجیب و غریب اور پُراسرار تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اسے اسٹیٹ ایجنسی کے کام اور آمدنی سے کوئی دلچسپی ہی نہ ہو۔ ساری باگ ڈور منیجر کے ہاتھ میں تھی جو نہایت بے ایمان آدمی تھا۔

حامد چار بہنوں کا بڑا بھائی اور ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کے والد صاحب ٹیلیگراف اکاؤنٹس آفس میں کلرک تھے۔ ان کی تنخواہ اتنی قلیل تھی کہ گاڑی بمشکل چل رہی تھی۔ اگر سر چھپانے کو سرکاری کوارٹر نہ ہوتا تو شاید اس تنخواہ میں زندہ رہنا بھی دشوار ہو جاتا۔ اس کے گھر کا ماحول خالص مشرقی انداز کا تھا جہاں باہمی رشتوں کا احترام بنیادی عنصر ہوتا ہے۔ اس نے گریجویشن کیا تو سب گھر والوں کو امید تھی کہ وہ کسی کے کہے سُنے بغیر خود ہی ملازمت کی جستجو میں لگ جائے گا کیونکہ دوسروں کی طرح گھر کے حالات اس کے بھی سامنے تھے۔ مہنگائی دن بدن بڑھتی جا رہی تھی، تن ڈھانکنے کو تو موٹا جھوٹا کافی ہوتا مگر آتش شکم سرد کرنے کی کوئی سستی صورت باقی نہیں رہی تھی۔ پہلے گوشت کی جگہ دال پکانے سے خرچہ چوتھائی رہ جاتا تھا مگر اب انھیں دال بھی عیاشی کے زمرے میں محسوس ہونے لگی تھی کیونکہ داموں میں گوشت کے منہ آنے لگی تھی۔ لہٰذا آخری تاریخوں میں بھانت بھانت کی چٹنیاں تیار کی جاتی تھیں۔

ایک طرف گرانی اور تنگدستی کا یہ عالم تھا اور دوسری طرف باوا جان کی تنخواہ میں بیس روپے سالانہ کا اضافہ جس سے کوئی بات بنتی نظر نہیں آتی تھی جس دن حامد کے امتحان ختم ہوئے اسی دن سے اس نے ملازمت کے لیے تگ و دو شروع کر دی مگر شہر بھر کی خاک چھاننے اور جوتیاں چٹخانے کے باوجود اسے کہیں نوکری کی اس

نہ مل سکی۔ ایسا نہیں تھا کہ شہر میں نوکریاں ہی ختم ہوگئی تھیں، کام بہت تھے مگر بات صرف اتنی تھی کہ کراچی میں پڑھے لکھے ضرورت سے زیادہ ہوگئے تھے، شہر کی بیشتر آبادی تعلیم یافتہ تھی اور پھر تعلیمی ادارے ہر سال ہزاروں سرٹیفکیٹ، ڈپلومے اور ڈگریاں دیے جارہے تھے۔ آخر شہر کے بنک، دفاتر اور کارخانے انھیں کہاں تک کھپائے چلے جاتے۔

ہاں جاہلوں کا اس شہرِ خرافات میں قحط تھا تو ان کے لیے بڑے کام تھے جنھیں کوئی پڑھا لکھا اپنانے کو تیار نہیں تھا۔ فروٹ یا سبزی کا ٹھیلا، پان کا خوانچہ، مال کا لادنا اتارنا، پتھر توڑنا، سڑکیں کھودنا ہر طرف کام ہی کام بکھرے ہوئے تھے جو حامد کے کسی کام کے نہ تھے۔ تنگ آکر اس نے تدریس کے شعبے میں مقدر آزمانا چاہا تو خود کو لاچار پایا، زیادہ جدوجہد کی تو اپنی قیمت کا اندازہ ہوا کہ تین چار سو روپے میں کسی نجی اسکول میں پرائمری کے بچوں کی استادی مل سکے گی۔ سارے در آزمانے کے بعد اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ کم از کم ماسٹرز کی ڈگری ضرور حاصل کرے گا تاکہ کم از کم لیکچرز کے طور پر اپنی عملی زندگی کی باعزت ابتدا کرسکے۔ تین چار سو روپے تو وہ کسی اور طرح بھی کما لے گا۔

جُز وقتی ملازمت کی تلاش میں وہ اس دفتر میں پہنچا تھا۔ خوش قسمتی سے اس دن طارق خود موجود تھا۔ منیجر کو اپنی مطلق العنان بادشاہی میں کسی کا دخل گوارا نہیں تھا لیکن مالک کے سامنے وہ مجبور تھا، طارق نے اسے تین سو روپے ماہانہ پر ملازم رکھ لیا۔ اسے شام چھ سے آٹھ بجے تک ایجنسی جاکر کچھ اندراجات کرنے ہوتے تھے۔ رفتہ رفتہ اس نے ایجنسی کے ٹائپ رائٹر پر قدرے مہارت حاصل کرلی تو کرائے نامے، رسیدیں، فروخت کے معاہدے اور دوسری دستاویزات بھی ٹائپ کرنے لگا۔ ایک روز طارق نے اسے ٹائپ کرتے دیکھا تو خوش ہوکر بیک جنبشِ ابرو اس کی تنخواہ پانچ سو تک پہنچا دی۔

وقت گزرنے کے ساتھ حامد پر منیجر کی بے ایمانیاں ظاہر ہونے لگیں۔ دلالی کوئی رسیدی کاروبار تو تھا نہیں جس کا ریکارڈ رہتا۔ منیجر بیشتر سودے بالا ہی بالا نمٹا کر کمیشن ہضم کر جاتا اور صرف اسی قدر کام کا اندراج کرتا کہ دفتر کے اخراجات نکلنے کے بعد ہزار بارہ سو روپے مالک کو بھی پہنچتے رہیں۔ ابتدا میں حامد نے اس بے ایمانی کی شکایت کرنے کا ارادہ کیا مگر طارق کی عدم دلچسپی کو دیکھتے ہوئے خاموش ہی رہا۔ وہ کسی پیچیدگی میں پڑ کر اس صاف ستھری روزی کو [illegible]نا نہیں چاہتا تھا جس کی وجہ سے اس کے گھر میں نمایاں تبدیلیاں رونما ہونے لگی تھیں۔

طارق اس دن کئی ہفتوں بعد دفتر آیا تھا اور گاڑی سے اتر کر سیدھا اندرونی دفتر میں چلا گیا جہاں سفید میز کے پیچھے گھومنے والی کرسی پر منیجر بیٹھا اپنے حواریوں سے گپ شپ لڑاتا رہتا تھا۔ طارق کے اندر جاتے ہی تین آدمی باہر نکلے اور کاغذات بغلوں میں دبائے وہاں سے روانہ ہوگئے، چند ثانیوں بعد منیجر بھی باہر آگیا [illegible] کے بشرے سے ناگواری کا اظہار ہو رہا تھا۔

" جاؤ، صاحب تمھیں بلا رہے ہیں "۔ اس نے منہ بنا کر [illegible] لہجے میں کہا اور حامد نے خوشگوار حیرت کے ساتھ اپنی کرسی چھوڑ [illegible] اندرونی کمرے کی طرف بڑھتے بڑھتے حامد نے پلٹ کر دیکھا [illegible] حیران رہ گیا۔ منیجر شیشے کے دروازے سے سڑک کا منظر دیکھتے ہو[ئے] سگریٹ سلگانے میں مصروف تھا جس کا مطلب تھا کہ منیجر کو باہر روک کر طارق [نے] اسے تخلیے میں اندر بلایا تھا۔

حامد کا دل تیزی کے ساتھ دھڑکنے لگا۔ اسے چھوٹتے ہی گ[مان] گزرا کہ طارق شاید اپنے منیجر کی جانب سے شک میں مبتلا ہوگیا اور اپنی رائے کی تائید یا تردید کے لیے اس سے اکیلے میں بات [کرنا] چاہتا ہے۔ اس کے اندر داخل ہونے پر طارق نے اسے دروا[زہ] بند کرنے کو کہا تو حامد کا گمان یقین میں بدل گیا اور وہ دون[وں] ہاتھ پشت پر باندھ کر مؤدبانہ انداز میں میز کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

" بیٹھ جاؤ "۔ طارق نے کرسی کو قدرے جھلاتے ہوئے [نر]م آواز میں کہا اور حامد نے شکریہ ادا کرکے ایک کرسی سنبھال لی۔ [حامد] کا دل اس وقت کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا اور طارق کی تجربہ [کار] نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

" تم محنتی اور ایماندار آدمی ہو حامد! " چند ثانیوں کے تو[قف] کے بعد اس نے کہنا شروع کیا۔ " پہلے دن کے انٹرویو میں تم نے [اپنی] اور اپنی ذمے داریوں کے بارے میں مجھے کھل کر سب کچھ بتا دیا تھا [جس] سے مجھے خوشی ہوئی اور شاید یہ تمہارے گھریلو حالات سے ا[س] واقفیت کا ہی نتیجہ ہے کہ میں مسلسل تمھاری آمدنی بڑھانے کے امکا[نات] پر غور کرتا رہا ہوں "۔

" میں آپ کا ممنون ہوں سر! کہ آپ مجھ پر اتنے مہربان ہیں " حامد نے تشکر آمیز لہجے میں کہا۔ " ورنہ کون اپنے ملازمین کے لیے اتنا فکرمند ہوتا ہے۔ جب کہ میں شاید اپنے فرائض میں کوتاہی کا مرتکب ہوتا رہا ہوں "۔ وہ تھوڑا سا جذباتی ہونے لگا۔

" میں سمجھا نہیں کہ تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟ " طارق نے حیرت سے پیشانی پر بل ڈال کر سوال کیا۔

" منیجر صاحب۔ اس دفتر اور اپنے منصب کا۔۔۔ "

" شش "۔ طارق نے اسے ٹوک کر خاموش کردیا اور سنجیدگی سے بولا۔ " تمھاری ہی طرح وہ بھی محنتی ہے مگر بے ایمان ہے، میں نے اسے آٹھ سو پر ملازم رکھا تھا اور آج بھی اس کی یہی تنخواہ ہے جب کہ تم دو تین گھنٹوں کے لیے یہاں آکر پانچ سو کما لیتے ہو، میں اس بات کا قائل ہوں کہ جو جس کے مقدر میں ہے اسے مل کر رہتا ہے۔ وہ ایماندار ہوتا تو آج میں اسے ڈھائی تین ہزار دے رہا ہوتا مگر وہ یہی رقم میری لاعلمی میں اڑا رہا ہے، میری چشم پوشی کی بھی وجہ ہے۔ میرے دوسرے کام ہیں، میں یہاں زیادہ وقت نہیں دے سکتا۔ وہ میرا دیکھا بھالا آدمی ہے، میرے لیے یہی کافی ہے کہ یہ ادارہ قائم ہے اور اپنے اخراجات کے علاوہ کچھ نہ کچھ دے ہی رہا ہے "۔

" جی یہ تو درست ہے "۔ حامد نے مرعوب ہو کر کہا۔ طارق کی سوچ بہت صاف ستھری اور منطقی محسوس ہوئی تھی اسے۔

" مگر تم نوجوان آدمی ہو "۔ طارق پھر کہنے لگا۔ " تم پر اپنے گھر کی بھاری ذمے داریاں ہیں جن کے بوجھ تلے تمھاری ذات دب کر رہ گئی ہے ورنہ تمھارے بھی بہت سے خواب ہوں گے، آرزوئیں ہوں گی جن کی تم تکمیل چاہتے ہو مگر پیسے کے بغیر یہ محال ہے "۔

" آپ نے میرا ایک بڑا بوجھ ہلکا کیا ہے سر! " حامد نے تشکر آمیز لہجے میں کہا۔ " آپ کے یہاں آنے سے قبل میں نے گریجویشن کی بنیاد پر شہر بھر میں کل وقتی ملازمت حاصل کرنے کے لیے جوتیاں چٹخائیں لیکن کہیں بات نہ بن سکی۔ اب خدا کا شکر ہے کہ یہاں سے ملنے والے پانچ سو روپوں میں سے اپنے تعلیمی اخراجات نکال کر بھی گھر والوں کا خاصا ہاتھ بٹا رہا ہوں۔ ورنہ میرے لیے تو زندہ رہنا بھی دشوار ہوجاتا "۔

" پانچ سو روپے "۔ طارق نے میز پر جھکتے ہوئے دہرایا۔ " تم کب تک اس پر گزارا کرسکو گے؟ تمھاری محنت اور ایمانداری کو دیکھتے ہوئے شاید میں اگلے برسوں میں دو چار سو اور بڑھا دوں لیکن یہ آمدنی تمھاری امنگوں کا ساتھ نہ دے سکے گی۔ میں تو خیر جاہل آدمی ہوں، تم پڑھے لکھے ہو، اچھی طرح جانتے ہوگے کہ افراطِ زر کیا ہے۔ پیسے کی قدر و قیمت دن بدن تیزی سے گھٹتی جارہی ہے۔ جو کام کل سیکڑوں میں ہوجاتے تھے، آج اس کے لیے ہزاروں درکار ہیں اور یہ سلسلہ بس چلے ہی جارہا ہے، پتا نہیں اس کا اختتام کہاں اور کیسے ہوگا؟ "

حامد خاموش رہا۔ طارق کی ہر بات اس کے دل کو لگ رہی تھی، اس کی دکھتی رگوں کو چھیڑ رہی تھی۔ وہ خود بھی شہر کی کشادہ اور صاف ستھری سڑکوں پر رواں دواں نت نئی گاڑیوں کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا تھا۔ مارٹن کوارٹر کے شکستہ و بوسیدہ مکان سے نکل کر یونیورسٹی جاتے ہوئے گلشنِ اقبال میں بنے ہوئے وسیع اور دلکش مکانات کو حیرت سے دیکھتا اور سوچتا تھا کہ وہاں بسنے والوں نے کساد بازاری کے اس دور میں اتنے مالی وسائل کہاں سے اور کیسے جمع کیے ہوں گے مگر وہ یہ سب طارق سے نہیں کہہ سکتا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ طارق خود ہی اس کے دل میں مچلتی آرزوؤں کو پڑھتا جارہا تھا۔

" مجھے معلوم ہے کہ تم میری عزت کرتے ہو "۔ وہ کہہ رہا تھا۔ " میرا احترام کرتے ہو، صرف اس لیے کہ میرے پاس وسائل ہیں، میں تمھاری محنت کے صلے میں تمھیں معقول معاوضہ دے رہا ہوں، اس میں کمی آجائے گی تو تم مجھ سے نگاہیں بدل لوگے، اس دور میں انسان کی عزت، آبرو، حیثیت اور مقام کا تعلق صرف پیسے سے ہے۔ خواہ وہ کسی بھی طرح کمایا گیا ہو۔ پیسہ کمانے کے لیے بڑے ہیر پھیر کرنے پڑتے ہیں مگر اس کے بعد آدمی مطمئن ہوتا ہے کیونکہ اس پیسے کو وہ اپنی مرضی سے استعمال کرسکتا ہے "۔

" آپ درست کہہ رہے ہیں "۔ حامد نے دھیمی آواز میں کہا۔ " یہ تو کھلی کھلی باتیں ہیں۔ میں خود بھی نہ جانے کیسے کیسے خواب دیکھتا ہوں مگر میں اناڑی ہوں، پیسہ کمانے کے راستے میری سمجھ میں نہیں آتے "۔

" اور اگر میں کوئی تجویز پیش کروں؟ " طارق نے کہا۔ " کوئی آسان سا راستہ، کوئی ایسا کام جس کے لیے سرمائے کے بجائے بس تھوڑی سی ہمت اور ہوشیاری کی ضرورت ہو؟ "

" میں سر کے بل تیار ہوں "۔ حامد نے پُراشتیاق لہجے میں کہا۔ طارق کی امید افزا گفتگو نے اس کا دورانِ خون تیز کردیا تھا اور اس کے تصور میں چمکتی دمکتی نئی نئی گاڑیوں کے ہیولے چکرانے لگے تھے۔ مارٹن کوارٹر کے اس بوسیدہ مکان کی بنیادوں سے ایک خوبصورت سا بنگلہ ابھرتا محسوس ہو رہا تھا۔

طارق ایک گہرا سانس لے کر گھومنے والی کرسی کی پشتگاہ سے ٹک گیا۔ " نہیں۔ میں زبان کھول کر اپنا بھرم نہیں کھونا چاہتا۔ تم ایک ایماندار نوجوان ہو اور ایمانداری کے روایتی مفہوم کے قائل معلوم ہوتے ہو، شاید یہ کام تم نہ کرسکو "۔

حامد کا چہرہ لٹک گیا۔ " کون دیکھتا ہے سر! ایمانداری اور بے ایمانی کوئی اٹل چیزیں نہیں ہیں۔ کسی کی گردن کاٹے بغیر اگر دو پیسے حاصل کرلیے جائیں تو میں اسے کسی طرح بے ایمانی نہیں سمجھتا "۔

طارق اس کی طرف دیکھتا رہا، اس کی نگاہوں سے بے اعتباری مترشح تھی۔ " بالفرض میں تم سے یہ کہوں کہ تم اپنے حلقوں میں ہیروئن متعارف کراؤ جس کی فروخت میں تمھارا معقول منافع شامل ہوگا تو شاید تم میری دماغی صحت پر شبہ کرنے لگو گے "۔

" آپ غلط سمجھ رہے ہیں مجھے "۔ حامد نے احتجاج کیا۔ " میرے لیے یہ کام ایک سنسنی خیز تجربہ ہوگا، میں اسے چیلنج سمجھ کر قبول کروں گا لیکن سوال یہ ہے کہ میں ہیروئن کہاں سے لاؤں گا، کون اعتماد کرے گا مجھ پر؟ "

" یعنی تم ایمانداری کو ایک ڈھکوسلا سمجھتے ہو؟ "

حامد چونک پڑا مگر فوراً ہی سنبھل گیا۔ " ہیروئن کو اگر کشتہ طلا

کہہ کر فروخت کیا جائے تو ایمانداری مجروح ہوتی ہے سر! اسے اس کے اصل نام سے بیچنے میں ایمانداری پر کیا حرف آتا ہے؟"

"تمہارا ضمیر منشیات فروشی پر تمھیں ملامت نہیں کرے گا؟"

حامد کا حوصلہ بڑھ گیا تھا، اس کے لبوں پر تلخ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ "ضمیر تو اب بھی ملامت کرتا ہے سر! اور یہ ملامت زیادہ شدید ہے۔ چار بہنوں میں سے دو شادی کے قابل ہیں اور میں اس قابل بھی نہیں کہ ان کی شادی کر سکوں۔ میرے باپ نے اپنی ساری عمر کلرکی میں گزار دی ہے۔ ان کی تنخواہ میں پیٹ بھرنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ اگر میری بات پر شبہہ ہو تو کبھی آخری تاریخوں میں ہمارے گھر کا حال دیکھیں، بات بات پر ہر ایک دوسروں کو پھاڑ کھانے کو دوڑتا ہے، میں خود بارہا یہ سوچ چکا ہوں کہ جب ان کی آمدنی اتنی قلیل تھی تو انھیں بچوں کی کیا ضرورت تھی، انھیں پہلے دن سے فیملی پلاننگ پر عمل کرنا چاہیے تھا۔ بچے پیدا کیے، انھیں بھوک اور افلاس کے سائے میں پال کر جوان کیا اور اب انھیں دیکھ دیکھ کر سہمتے رہتے ہیں، چار بیٹیوں کا بوجھ کم نہیں ہوتا سر! وہ دوہری رفتار سے بوڑھے ہو رہے ہیں اگر میں بھی ضمیر کے بہکاوے میں الجھا رہا تو حشر ان سے مختلف نہ ہوگا مگر میں سسک سسک کر زندہ نہیں رہنا چاہتا۔ زندگی بس ایک بار ملتی ہے اس کا جو لمحہ گزر گیا سو گزر گیا، وہ دوبارہ کبھی واپس نہیں آئے گا۔"

طارق دلچسپی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ وہ تو اسی لیے اسے چھیڑ رہا تھا، اس کی انا پر ہلکے ہلکے تازیانے لگا رہا تھا کہ وہ اپنے خول سے باہر نکلے اور اس کے خیالات سن کر اسے خاصی خوشی ہوئی تھی۔

"تو میں سمجھ لوں کہ تم تیار ہو؟" چند ثانیوں کے بوجھل سکوت کے بعد طارق نے سوال کیا۔

حامد نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا مگر اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ اب تک حامد یہی سمجھ رہا تھا کہ طارق نے محض اس کے حوصلے کا اندازہ لگانے کے لیے ہیروئن کا ذکر چھیڑا تھا مگر وہ اس کے اقرار کا منتظر تھا۔

"میں تیار ہوں سر!" اس نے سر جھکا کر آہستہ سے کہا۔

"گڈ۔" طارق تحسین آمیز لہجے میں بولا۔ "مگر جو کچھ بات ہوئی ہے وہ تمھاری ذات سے آگے نہیں بڑھے گی۔" اس کا لہجہ یک بیک گمبھیر ہو گیا۔ "مجھے تمھاری کوئی خاص ضرورت نہیں ہے بس تمھاری مدد کرنا چاہتا ہوں، یونیورسٹی میں ہیروئن تمھارے ہاتھوں متعارف ہوگی، اپنی حدود سے باہر تم ایک پڑیا بھی نہیں بیچو گے کیونکہ علاقے مختلف لوگوں میں بٹے ہوئے ہیں اور کوئی بھی اپنی حدود میں دوسرے کی مداخلت برداشت نہیں کر سکتا۔"

حامد کے ذہن میں وہ چہرے گردش کرنے لگے جن کے بارے میں یونیورسٹی میں مشہور تھا کہ وہ منشیات کے عادی تھے، جبار، ملی، توقیر، اسلم، عاشق، بیسیوں نام تھے، وہ کسی سے بھی کام کا آغاز کر سکتا تھا۔

"طریقۂ کار کیا ہوگا؟" اس نے دھیمی آواز میں سوال کیا۔

"اس دفتر میں یہ تمھارا آخری دن ہے، آئندہ تم یہاں سے کوئی واسطہ نہیں رکھو گے۔" طارق نے پیڈ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "کل شام سات بجے تمھیں ایک جگہ پہنچنا ہے۔ پتا نوٹ کر لو۔"

حامد نے اس کا بتایا ہوا پتا لکھ لیا۔ اس پتے پر اسے [illegible] نامی کسی شخص سے مل کر کالے گلاب کا حوالہ دینا تھا۔ بقیہ معلومات وہ اسے حاصل ہونی تھیں جو شاید طارق کا کوئی خاص آدمی تھا۔

تھوڑی دیر بعد طارق نے منیجر کو اندر بلا کر حامد کا حساب بیباق کرنے کی ہدایت کی تو اسے خاصی خوشگوار حیرت ہوئی۔ اس بات کی تھی کہ حامد کے کام سے خوش ہونے کے باوجود طارق نے یکایک اسے نکال دینے کا فیصلہ کیا تھا اور خوشی اس بات کی تھی کہ اس کے راستے کی رکاوٹ دور ہو رہی تھی اور گیارہ مہینے کے صبر کے بعد اسے دوبارہ من مانی کرنے کی چھوٹ مل رہی تھی۔

حساب کر کے منیجر نے بارہ دن کی تنخواہ کے دو سو روپے جیب سے فوراً حامد کو ادا کر دیے اور وہ خاموشی سے سر جھکائے وہاں سے چلا گیا۔

"پتا ہے میں نے اسے کیوں نکالا ہے؟" حامد کے جانے کے بعد طارق نے چبھتے ہوئے لہجے میں منیجر سے سوال کیا۔ منیجر بے بسی سے شانے ہلا کر رہ گیا۔ اس وقت اس کے چہرے پر رحم انگیز معصومیت چھائی ہوئی تھی۔

"میں ڈسپلن کا سخت پابند ہوں۔" طارق سرد لہجے میں بولا۔ "وہ تمھارا ماتحت تھا مگر اس نے تمھارے ہیر پھیر کے واقعات بتلانے چاہے تھے، میں یہ پسند نہیں کرتا کہ ایک ایسا آدمی تمھارے نیچے کام کرتا رہے جو تمھیں بے ایمان سمجھتا ہو۔"

منیجر کا چہرہ دھواں ہو گیا اور وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولا۔ "اسے غلط فہمی ہوئی ہوگی جناب... میں تو ہمیشہ اپنے فرائض ایمانداری سے سرانجام دینے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔"

"فریدوں پاشا کا مکان کس نے فروخت کرایا تھا؟" طارق نے اسے گھورتے ہوئے زہریلی آواز میں پوچھا۔

منیجر کی آنکھوں کے سامنے تاریک دائرے ناچنے لگے۔ طارق اس قدر بے خبر نہیں تھا جتنا وہ سمجھتا رہا تھا۔ فریدوں پاشا کا مکان واقعی اس کی معرفت فروخت ہوا تھا اور سودے کی تکمیل پر اسے بارہ ہزار روپے کمیشن کے طور پر ملے تھے لیکن یہ رقم ایجنسی کے حساب میں ڈالنے کے بجائے وہ بالا ہی بالا اڑا گیا تھا۔ اپنی صفائی میں اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن زبان نے ساتھ نہیں دیا اور وہ فقرے کی ابتدا کرنے کی کوشش میں ہکلاتا ہی رہ گیا۔

"اب تک جو ہوا، سو ہوا۔" طارق نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا تو منیجر کی ذرا جان میں جان آئی۔ "یہ نہ بھولو کہ تمھیں ملازم رکھنے سے پہلے یہ ایجنسی میں خود چلاتا تھا۔ میری معلومات کے بہتیرے ذرائع ہیں، آئندہ کوئی خیانت ہوئی تو میں تمھاری چمڑی ادھیڑ ڈالوں گا۔"

"آئندہ آپ کو کوئی شکایت نہ ہوگی۔" اس نے رو دینے والی آواز میں کہا اور طارق نے کرسی چھوڑ دی۔

●

سکندر علی کا نام ڈینی کے ذہن سے چپک کر رہ گیا تھا۔ اسے سو فیصد یقین تھا کہ غزالہ کے کالج کے فنکشن میں اس نے جو آواز سنی تھی وہ سو فیصد اس کے پراسرار سربراہ کی تھی۔ وہی آواز، وہی غنودہ سا لب و لہجہ جیسے وہ سننے والے کو سو جانے کی ترغیب دے رہا ہو۔

ڈینی پنڈال سے نکلا تو دونوں لڑکیاں بھی اس کے ساتھ تھیں اور اس کے رویے میں یکایک رونما ہونے والی تبدیلی پر حیران تھیں لیکن ہمت نہیں پڑی تھی کہ اس سے زیادہ باز پرس کرتیں۔

یہ اتفاق ہی تھا کہ ڈینی نے اسٹیج کے قریب مہمانوں کے لیے بچھائے گئے صوفوں کے بجائے عقبی حصے میں پڑی ہوئی کرسیوں پر بیٹھنے کا فیصلہ کیا تھا اور یوں اس کے گمنام باس کو پنڈال میں اس کی موجودگی کا علم ہی نہ ہو سکا تھا، پنڈال سے نکلتے ہوئے بھی ڈینی نے احتیاط رکھی تھی کہ روسٹرم پر منشیات کے خلاف تقریر کرنے والا مہمانِ خصوصی اس کی شکل نہ دیکھ سکے۔ ڈینی سوچ رہا تھا کہ اگر وہ ابتدا ہی میں اگلے صوفوں پر جا بیٹھا ہوتا تو وہ شخص لازماً اسے پہچان لیتا کیونکہ وہ ہر ایک کو جانتا تھا مگر اس کی ذات سب کے لیے ایک راز تھی پھر شاید وہ اپنے راز کے تحفظ کی خاطر اس مذاکرے کے اختتام پر اپنی تقریر کا پروگرام ہی منسوخ کرا دیتا لیکن اتفاقات نے صورتحال کو بالکل ہی بدل کر رکھ دیا تھا۔

پنڈال سے باہر میدان میں لگے ہوئے ایک اسٹال پر غزالہ اور عابدہ کے ساتھ چائے پیتے ہوئے ڈینی نے آہستہ آہستہ خود پر قابو پا لیا اور مسکراتے ہوئے غزالہ سے مخاطب ہو گیا۔ "آپ کی ذات بہت دلچسپ ہے، باتوں ہی باتوں میں کافی وقت گزر گیا لیکن مجھے اندازہ نہ ہو سکا۔"

"مگر مہمانِ خصوصی کی تقریر شروع ہوتے ہی آپ کو اچانک کیا ہو گیا تھا؟" عابدہ نے اس کی طرف جھک کر سوال کیا۔

"مہمانِ خصوصی کی آواز سن کر ہی میں چونکا تھا۔ ورنہ آپ کی باتوں میں کھویا ہوا تھا۔" ڈینی نے خصوصی طور پر غزالہ کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔

"مگر آپ کے تو چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔" غزالہ نے ہنستے ہوئے شوخ لہجے میں کہا۔ "میں تو سہم ہی گئی تھی۔"

"آج ساڑھے آٹھ بجے ایک پارٹی کے ساتھ میری اہم میٹنگ مقرر تھی۔" ڈینی نے مسکراتے ہوئے بات بنائی۔ "لاکھوں کا سودا ہونے کی امید تھی لیکن آپ کی میٹھی میٹھی باتوں میں ڈوب کر مجھے اندازہ ہی نہ رہا کہ ساڑھے آٹھ کب بجے۔"

"اوہ۔" غزالہ سنجیدہ ہو گئی۔ "یہ تو بہت برا ہوا... اگر آپ نے پہلے ہی اپنی مصروفیت کی نوعیت بتا دی ہوتی تو میں آپ کو بروقت یاد دلا دیتی۔ اب آپ کو دوبارہ میٹنگ کا وقت مقرر کرنا ہوگا۔"

"اس کی نوبت نہیں آئے گی۔" وہ لہجے میں ہلکے سے تاسف کا تاثر شامل کرتے ہوئے بولا۔ "داموں پر بات الجھی ہوئی تھی میری غیر حاضری کو میری عدم دلچسپی سمجھا گیا ہوگا۔"

ڈینی ان دونوں کے ساتھ اسٹال میں بیٹھا باتیں کرتا رہا لیکن اس کے کان لاؤڈ اسپیکر پر گونجتی ہوئی غنودہ آواز پر لگے رہے۔ مہمانِ خصوصی کی تقریر زیادہ طویل نہیں تھی لیکن اس کے ایک ایک لفظ سے منشیات کے فروغ سے گہری نفرت کا اظہار ہو رہا تھا۔

اس نے باتوں ہی باتوں میں لڑکیوں سے مہمانِ خصوصی کے بارے میں دریافت کیا تو اسے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ وہ شہر میں خاصا مقبول آدمی تھا۔ اس کا نام سکندر علی تھا۔ وہ شہر کی کئی سماجی اور معاشی بہبود کی تنظیموں کا روحِ رواں تھا۔ اجتماعی فلاح کے کاموں میں نہ صرف اپنا وقت دیتا تھا بلکہ وقتِ ضرورت مالی اعانت سے بھی دریغ نہیں کرتا تھا۔ طلبا میں وہ اتنا ہر دل عزیز تھا کہ سووینیر میں اس کا پیغام بھی شامل تھا۔

معلومات حاصل ہو جانے کے بعد ڈینی وہاں سے اٹھ گیا۔ اس بار لڑکیوں نے ورائٹی شو کے لیے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی اور وہ باہر آ کر کار میں تیز رفتاری کے ساتھ گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

گھر پہنچنے کے بعد ڈینی نے ٹیلیفون ڈائرکٹری سنبھال لی اور تھوڑی سی محنت کے بعد سکندر علی کا فون نمبر تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ نمبر اور مکان کا پتا ایک کاغذ پر نوٹ کر کے اس نے ڈائرکٹری ایک طرف پھینکی اور خود فون پر جم گیا۔ تیسری گھنٹی پر ریسیور اٹھایا گیا تھا۔ بولنے والے کی آواز سے ڈینی نے اندازہ لگایا کہ وہ کوئی ملازم تھا۔ اس کے استفسار پر ملازم نے بتایا کہ وہ گھر پر نہیں تھا اور نہ ہی

وہ اس کی واپسی کے بارے میں کوئی اندازہ لگا سکا تھا۔ فون بند کر کے ڈینی نے رسٹ واچ دیکھی تو ٹرانسمیٹر آن کرنے کا وقت گزرے چند منٹ ہو چکے تھے۔

اس نے سرخ بٹن دبا کر آپریٹس آن کیا اور اس کا انٹینا باہر کھینچ کر آپریٹس ایک تپائی پر رکھ دیا۔

لباس تبدیل کر کے وہ ستانے کے لیے بستر پر دراز ہوا تو اس کے ذہن میں باس کے الفاظ گونجنے لگے۔ اس نے پچھلی رات ہی ڈینی سے کہہ دیا تھا کہ شاید اگلے دن مقررہ اوقات میں اس سے رابطہ نہ ہو سکے۔ باس کو پہلے سے اندازہ رہا ہو گا کہ وہ کالج کے مذاکرے کی صدارت سے جلدی فارغ نہ ہو سکے گا۔

وہ سکندر علی کی آواز کے بارے میں پُریقین ہونے کے باوجود ایک عجیب سی بے یقینی کا شکار تھا اور جلد از جلد ایک بار پھر اپنے باس کی آواز سن کر اپنی تسلی کرنا چاہتا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنے باس کی پُراسرار شخصیت سے اس قدر سرسری انداز میں متعارف ہو سکے گا۔ پھر اسے یاد آیا کہ اس کے باس نے ٹرانسمیٹر ملنے کے بعد اسے بھی رابطہ قائم کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ یہ یاد آتے ہی اس نے آپریٹس اٹھایا اور اس کا سیاہ بٹن دبا کر تھوڑے تھوڑے وقفے سے پیغام نشر کرنے لگا۔

وہ تقریباً دس منٹ تک اس لاسلکی آلے پر مصروف رہا لیکن دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔ آخر کار ڈینی نے آپریٹس آف کر کے الماری کے ایک خفیہ خانے میں مقفل کر دیا۔ اور کنڈی گرا کر خواب گاہ سے نکل آیا۔ اسے یک بیک بھوک کا احساس ستانے لگا تھا۔

کھانے کے دوران بھی اس کا ذہن مسلسل اسی مسئلے میں الجھا رہا۔ وہ کئی برس سے اس کے لیے کام کر رہا تھا لیکن اس سے واقف نہیں تھا۔ البتہ آواز سے اس قدر مانوس تھا کہ اسے ہزاروں میں پہچان سکتا تھا۔ پھر عزالہ کے کالج میں اس نے سکندر علی کی آواز مائیکروفون کے راستے لاؤڈ اسپیکر پر گونجتی سنی جو پُراسرار باس کی آواز سے مطابقت رکھتی تھی۔ ڈائرکٹری سے نمبر تلاش کر کے اس نے سکندر علی کے گھر فون کیا تو وہ موجود نہیں تھا۔

اسی طرح ٹرانسمیٹر پر باس سے بھی رابطہ قائم نہ ہو سکا۔ یہ سب نکتے ایک ہی سمت کی نشاندہی کر رہے تھے۔ سکندر علی جو ایک طرف ہر دل عزیز شخصیت کا مالک اور سماج دشمن حرکتوں کا کٹر مخالف تھا اپنے دوسرے روپ میں منشیات کا ایک بڑا کاروبار چلا رہا تھا۔ اس میں نت نئی راہیں تلاش کر رہا تھا۔ چرس عام ہو جانے کے بعد مقامی بازار میں ہیروئن متعارف کرا رہا تھا اور اسی پر بس نہیں تھی بلکہ اپنے آدمیوں کے ساتھ مالی بددیانتی کا ارتکاب کرنے والے کو بھی وہ بے داغ طریقے پر ٹھکانے لگا چکا تھا۔

ڈینی محسوس کر رہا تھا کہ اسے رواروی میں ترقی کا دوراز مل گیا تھا۔

اس کے ذہن میں خیالات کی آندھیاں سی چل رہی تھیں پہلا خیال تو یہی آیا تھا کہ وہ سکندر علی کی زندگی کا چراغ گل کر کے بآسانی اس کی جگہ لے سکتا ہے اور پھر سارے دھندے پر اس کا تصرف ہو گا لیکن تھوڑی دیر بعد خیال آیا کہ وہ تو اس کی سرگرمیوں کے بارے میں بالکل اندھیرے میں تھا آخر وہ اسے مار کر کس دھندے پر قابض ہو سکے گا؟ اس کی ساری معلومات جہانگیر، طارق اور نادر تک محدود تھیں۔ وہ پُراسرار باس کا فراہم کیا ہوا مال اس کے مقررہ داموں پر بازار میں پھیلا دیتے تھے اور ایک وقت میں ان کے پاس زیادہ سے زیادہ پندرہ بیس لاکھ کا مال یا اتنی رقم ہوتی تھی سکندر علی کا پتہ صاف کر کے ڈینی زیادہ سے زیادہ اس رقم پر قبضہ کر سکتا تھا مگر اس کے بعد دھندا جاری رکھنا اس کے لیے مشکل تھا کیونکہ باس کی دوسری سرگرمیوں سے وہ یکسر لاعلم تھا۔

وہ مال کہاں سے فراہم کرتا تھا؟ ان چاروں کے علاوہ وہ کن لوگوں سے کام لیتا تھا؟ اس کی دیگر سرگرمیاں کیا تھیں؟ آمدنی کے دوسرے ذرائع کیا تھے؟ یہ سب بہت ٹیڑھے سوال تھے۔ ان معلومات کے بغیر باس کی جگہ لینے کا تصور بھی احمقانہ ہوتا۔

اگلے دن وہ دفتر میں بھی ان ہی خیالات میں کھویا رہا وہ سے اٹھا تو سیدھا گھر جانے کے بجائے گارڈن ایسٹ کے علاقے کی پیچ در پیچ گلیوں میں جا گھسا۔ ٹیلیفون ڈائرکٹری کے مطابق سکندر کی رہائش اسی علاقے میں تھی۔ پتے کے بارے میں وہ کسی سے معلوم نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے وسیع مکانات کے پھاٹکوں کے باہر لگے ہوئے نمبروں کے سہارے کافی دیر تک گلیوں میں بھٹکتا رہا اور آخر کار مطلوبہ مکان تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔

وہ زرد رنگ کی ایک دو منزلہ عمارت تھی جس کے گرد احاطہ موجود تھا۔ سرے کا وہ مکان بظاہر ایک عام سا مکان تھا جس پر بادی النظر میں غیر آباد ہونے کا شبہ ہوتا تھا۔ مکان کے پھاٹک کے ساتھ والے ستون پر پلاسٹک کی تختی پر سکندر علی کا نام اور مکان نمبر درج تھا۔ ڈینی دھیمی رفتار سے مکان کے سامنے سے گزرتا ہوا عقبی سڑک پر آیا اور پھر اس کی کار تیز رفتاری سے آگے بڑھتی چلی گئی۔

رات کو اس نے مقررہ اوقات کا آغاز ہوتے ہی ٹرانسمیٹر آن کر دیا۔ اپنی طرف سے رابطے میں پہل کرنے سے قبل وہ کچھ انتظار کرنا چاہتا تھا۔ چند منٹ بعد ہی اسے ٹرانسمیٹر پر پُراسرار باس کی غنودہ آواز سنائی دی اور وہ لپک کر آپریٹس کے قریب پہنچ گیا۔

"ڈی ون ریسیونگ سر! اوور۔" باس کا سگنل ختم ہوتے ہی ڈینی نے سیاہ بٹن دبا کر کہا۔

"کیا خبر ہے؟ اوور۔" سوال کیا گیا۔

"میں نے کسی سے رابطہ قائم نہیں کیا سر! حکم کے مطابق گوشہ نشینی اختیار کر لی ہے... اوور۔"

"گڈ۔" جذبات سے عاری سپاٹ لہجے میں کہا گیا۔ "لیکن باخبر رہنے میں کوئی ہرج نہیں ہے، آج شام کے اخبارات دیکھے تھے تم نے؟ اوور۔"

"نہیں سر!" ڈینی نے اپنے دل کی دھمک کنپٹیوں میں محسوس کرتے ہوئے کہا۔ "آئندہ میں ان اخبارات کا مطالعہ اپنے معمول میں شامل کر لوں گا... اوور۔"

"کل رات گئے قائد آباد میں دو گروہوں میں تصادم ہوا ہے۔ دونوں کا تعلق منشیات فروشوں سے تھا۔ ایک آدمی ہلاک ہوا، تین زخمی ہوئے ہیں۔ مجھے اس واقعے کی تفصیلی رپورٹ درکار ہے کب تک فراہم کر سکو گے؟ اوور۔"

"ابھی کوشش کرتا ہوں سر! اوور۔" اس نے مستعد لہجے میں کہا۔

"حماقت کی ضرورت نہیں۔" دوسری طرف سے ناگواری کے ساتھ کہا گیا۔ "واقعہ تازہ ہے، پولیس کے ساتھ علاقے میں اس کے مخبر بھی سرگرم ہوں گے، یہ کام خود کو مشکوک بنائے بغیر صبح تم بہتر طور پر کر سکو گے... اوور۔"

"ہو سکتا ہے جہانگیر کو اس بارے میں کچھ معلوم ہو... اوور۔"

"اس سے بھی بات کر لو، میرا مدعا صرف اتنا تھا کہ تم براہ راست ان لوگوں سے نہ ملو۔" باس کی آواز ابھری۔ "اگر بالکل ہی کٹ کر رہ گئے تو کام چلانا دشوار ہو جائے گا۔ فون کی حد تک تمہیں کھلی آزادی ہے... اوور۔"

"او کے سر! اوور۔" اس [redacted] پر اس نے خوشی محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"کل صبح تم گلشنِ اقبال کے اسی مکان میں چلے جاؤ جہاں پہلے لے جائے گئے تھے۔" ایک بات طے ہو جانے کے بعد باس دوسرے موضوع کی طرف آ گیا۔ "وہاں وہی عورت موجود ہو گی۔ تم اسے اینی زولا کہہ کر مخاطب کرو گے اور وہ ایک بریف کیس تمہارے حوالے کرے گی۔ اسے احتیاط سے اپنے ساتھ لے آنا۔ وہ بریف کیس بہت قیمتی اور نازک ہے جسے تمہارے لیے تیار کرایا گیا ہے۔ اس کے دونوں سروں پر سلیٹ جیسے دو ہموار مستطیل موجود ہوں گے جو اندر نصب چھوٹے سے کمپیوٹر سے منسلک ہیں، تم پہلے بائیں پھر دائیں مستطیل پر اپنا انگوٹھا رکھو گے تو نشان پہچان کر کمپیوٹر خود بخود تالا کھول دے گا۔ اس کے علاوہ کسی بھی ذریعے سے بریف کیس کھولنے کی کوشش کی گئی تو اندرونی استر میں پوشیدہ بارودی مادہ بریف کیس سمیت اس پر زور آزمائی کرنے والے کے ٹکڑے اڑا دے گا... اوور۔"

"مجھے مادام اینی زولا کے پاس کب پہنچنا ہے سر؟ اوور۔" ڈینی نے مرعوب ہوتے ہوئے سوال کیا۔

"نہ مادام نہ مس، تم اسے اینی زولا کہو گے۔" باس نے تادیبی لہجے میں کہا۔ "یہ اس کا نام نہیں تمہارا کوڈ ہے، نو اور بارہ کے درمیان تم کسی بھی وقت وہاں پہنچ سکتے ہو لیکن اس سے غیر ضروری طور پر بے تکلف ہونے کی ضرورت نہیں... اوور۔"

"میں سمجھ گیا سر! ہدایت پر حرف بہ حرف عمل ہو گا... لیکن مجھے اجازت ہے کہ میں اس بریف کیس کو کھول سکوں؟... اوور۔" اس نے جھجکتے ہوئے سوال کیا۔

"نہ صرف کھولو گے بلکہ کل رات میں تم سے اس کے بارے میں تفصیلی بات کروں گا... اب تم آپریٹس آف کر کے بے فکری سے سو سکتے ہو... اوور اینڈ آل۔" دوسری طرف سے خاموشی چھا گئی۔ ڈینی نے گہرا سانس لے کر سرخ بٹن دبایا اور وہ ٹرانسمیٹر ریسیور آف ہو گیا۔

ڈینی کو اجازت مل چکی تھی لہٰذا اس نے فوراً ہی فون پر جہانگیر کو کھڑکانے کا فیصلہ کر لیا۔ دوسری طرف دو بار گھنٹی بجی اور تیسری بار درمیان ہی میں ریسیور اٹھا لیا گیا۔ "ہیلو جہانگیر اسپیکنگ۔" ڈینی کے کانوں میں بوجھل آواز آئی۔

"کیا اس وقت تم اس قابل ہو کہ میں کچھ اہم بات کر سکوں؟" ڈینی نے چبھتے ہوئے تلخ لہجے میں سوال کیا۔

"میں نارمل ہوں باس!" بوکھلائی ہوئی آواز میں جواب دیا گیا۔ "شام کو تھوڑی سی لی تھی، شاید آواز پر اسی کا اثر ہے۔"

"مال تمہیں مل گیا تھا؟"

"جی، ڈینی کے ذریعے۔" دبی دبی آواز میں کہا گیا۔

"میں لکیر کا فقیر نہیں ہوں۔" ڈینی زہریلے لہجے میں بولا۔ "حالات اور مواقع کی نزاکت کے پیشِ نظر اپنی کھوپڑی بھی استعمال کرتا ہوں۔ یہ بتاؤ کہ مارکیٹ کی کیا رپورٹ ہے؟"

"حیرتناک تیزی کے فوراً بعد بازار ایک دم ٹھنڈا ہوتا نظر آ رہا ہے۔" جہانگیر نے رک رک کر کہا۔ "بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چند روز کے بحران سے فائدہ اٹھانے کے لیے ہر ایک بلیک گولڈ کے چکر میں پڑ گیا اور اس وقت بازار میں منوں مال آ گیا ہے۔"

"شام کے اخبارات دیکھے تھے؟" ڈینی نے اپنے اوپر آزمایا جانے والا سوال دہرایا۔

"شاید آپ راجو کے اڈے پر ہنگامے کی بات کر رہے ہیں،"

مجھے اخبار سے پہلے اس کی اطلاع مل گئی تھی، بعد میں اخبار بھی دیکھا مگر اس میں کوئی تفصیل نہیں ہے یہ معاملہ ذرا سنگین بھی ہوسکتا ہے۔" جہانگیر اس سے کہیں زیادہ باخبر تھا۔

"جو کچھ معلوم ہے، رُکے بغیر دہرا جاؤ، جہاں ضرورت محسوس ہوگی ٹوک دوں گا۔"

"راجو قائد آباد کے علاقے میں دیسی شراب بیچتا ہے، تین چار دن سے اس نے کسی سے لے کر مہنگے داموں چرس بھی بیچنی شروع کر دی، علاقے میں چرس کا دھندا کرنے والوں نے اسے روکنا چاہا لیکن وہ باز نہ آیا اور کل رات گئے ہمارے دلال نے راجو کے اڈے پر مسلح دھاوا بول دیا۔ ہوٹل اور اس کے پیچھے واقع ساقی خانے کو آگ لگا دی۔ آدھے گھنٹے تک گولیاں چلیں جس کے نتیجے میں راجو کا بھائی مارا گیا۔ پولیس نے بہت سے آدمیوں کی گرفتاری کے لیے چھاپے مارے لیکن جو ملوّث تھے وہ سب روپوش ہو چکے تھے البتہ سات دوسرے آدمی پکڑے گئے ہیں۔"

"ویری گڈ۔" ڈینی اسے بے ساختہ داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ "مجھے خوشی ہے کہ تم آنکھیں کھلی رکھتے ہو، ہمارا آدمی کسی قیمت پر پولیس کی تحویل میں نہ جانا چاہیے ہوسکے تو اسے شہر سے ہی نکلوا دو۔"

"او کے باس!" جہانگیر کی سعادت مندانہ آواز سنائی دی۔ "ویسے نئی لائن پر بھی کام شروع کر دیا گیا ہے۔"

"کون کام کر رہا ہے؟" ڈینی نے سوال کیا۔

"طارق نے یونیورسٹی کے ایک ضرورت مند اور غریب طالبعلم پر ڈورے ڈالے ہیں اور وہ فوری طور پر مال بیچنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔" جہانگیر نے بتایا۔ "امید ہے کہ وہاں بہت جلد کامیابی ہوگی۔"

"شہر کے دوسرے کالج بھی زرخیز ثابت ہوسکتے ہیں۔" ڈینی نے اسے یاد دلایا۔ "اپنے آدمیوں کو ہر طرف پھیلا دو، اگر ابھی سے پوری کوشش نہ کی گئی تو آخر میں ٹارگٹ پورا نہ ہوسکے گا۔"

"میں خود بھی پرانے اڈوں کے بجائے نئے علاقوں پر توجہ دینے کے بارے میں سوچ رہا ہوں، آپ فکر نہ کریں باس! میں پوری کوشش کروں گا کہ ٹارگٹ میں کسی قسم کی کمی نہ ہونے پائے۔"

"بس یہ خیال رہے کہ یہ ہم سب کی بقا کا سوال ہے۔" ڈینی نے یہ کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

●

دوست محمد اَن پڑھ لیکن سیدھا سادا محنتی انسان تھا۔ بچپن سے محنت کرتے کرتے جوان ہوگیا تھا لیکن کبھی راتوں رات لکھپتی بننے کے خواب نہیں دیکھے تھے جب اس نے رکشا چلانا شروع کیا تو اسے یہ جان کر حیرت ہوئی تھی کہ میٹر کی مرمت کا کام کرنے والے دراصل گراریوں کی ردوبدل میں پیسے کماتے تھے ان کا ہنر یہ تھا کہ وہ گاہک کی مرضی کا کام بھی کر دیتے تھے اور سرکاری سیل چیکرز کی توں نظر آ... تھی۔ گراریوں کی اس ردوبدل کے نتیجے میں سواریوں سے کرائے کی م... میں رقم کی وصولی میں حسبِ مرضی اضافہ کیا جاسکتا تھا مگر دوست م... کو خوشی تھی کہ اس کا میٹر صرف بیس پیسے فی میل زیادہ دکھاتا ہے جب کہ شہر کی سڑکوں پر بہتیرے ایسے رکشے چل رہے تھے جن کے می... کم و بیش اصل سے ڈیوڑھا کرایہ ظاہر کرتے تھے۔ شاید وہ اس گرار... کو بھی درست کرا لیتا لیکن اس نے پہلے دو تین دن میں ہی حساب لگا لیا تھا کہ میٹر بالکل درست کرانے کے بعد مالک کو دی جانے وا... یومیہ رقم، پٹرول اور تیل کا خرچ اور پولیس والوں کے ناگہانی ناشتہ پا... کے اخراجات نکال کر وہ ایک وقت کی روٹی بھی بمشکل کھا سکے گا او... اگر کبھی ٹریفک پولیس کے کسی گشتی مورچے کا سامنا ہوگیا تو مالک ک... گرہ سے رقم دینی ہوگی یا حوالات کی ہوا کھانی ہوگی لہٰذا اس نے یہ مناسب سمجھا کہ اسی قدر ایمانداری پر اکتفا کرے جو اس کے زندہ او... آزاد رہنے میں بھی معاون ہوسکے۔

پھر غیر محسوس طریقے پر دن بدن اس کے اخراجات بڑھنے لگے تو وہ پریشان رہنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کی گھروالی پیسے کہاں اُڑائے دے رہی تھی۔ اس سے بات کرتا تو وہ بازار کے بھاؤ سنانا شروع کر دیتی۔ اس کی صاف ستھری سوچ کو تنگ دستی کا زنگ لگنا شروع ہوگیا اور اس نے سواریوں کو ریزگاری لوٹانی بند کر دی کچھ لوگ چند پیسوں کی پروا بھی نہ کرتے، بعض برا سامنہ بنا کر زیرِ لب بڑبڑاتے ہوئے آگے بڑھ جاتے جو ذرا زیادہ ڈھیٹ ہوتے انھیں نوٹ لوٹا کر وہ خود ریزگاری کا مطالبہ کر ڈالتا لیکن یہ طریقہ بھی زیادہ دن کارگر نہ رہا، بڑھتی ہوئی مہنگائی دن بدن اس کی دسترس سے باہر ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے پاس کوئی ہنر بھی نہیں تھا کہ رکشا چلانے کے بجائے دوسرا کام کر لیتا جس میں زیادہ آمدنی کے مواقع ہوتے

کافی سوچ بچار کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ اسے ایک شفٹ کے بجائے دو شفٹوں میں رکشا چلانا چاہیے۔ مالک اس تجویز پر بہت خوش ہوا کیونکہ دوست محمد رکشے کو اپنی روزی سمجھ کر اس کی قدر کرتا تھا جب کہ دوسری شفٹ والا ڈرائیور رکشے کو اپنی مہارتوں کے اظہار کا واحد ذریعہ سمجھتا تھا لہٰذا اگلے ہی دن سے دوست محمد کو دونوں شفٹوں کے لیے رکشا مل گیا۔

اس وقت تک وہ نشہ کرنے والوں کو دل سے برا سمجھتا تھا وہ جب بھی کسی اڈے پر کھڑا ہوتا اسے دو چار ڈرائیور حلقہ بنائے چرس بھری سگریٹوں کے دم لگاتے نظر آتے مگر وہ دعوت ملنے کے باوجود کبھی ایسی کسی محفل میں شریک نہیں ہوا۔

مگر جب پہلا دن ڈھلا اور اسے سیٹ پر بیٹھے شہر کی سڑکیں ناپتے شام ہوگئی تو اس پر تکان طاری ہونے لگی بے اختیار اس کا دل چاہا کہ سواری اتار کر رکشا گھر لے جا کر کھڑا کر دے، دل کھول کر نہائے پھر چائے پی کر بستر پر دراز ہوجائے لیکن وہ ایسا نہ کرسکا کیونکہ وہ رش کا وقت تھا۔ خالی رکشا گلی سے نکل کر جونہی سڑک پر آتا بہت سے ہاتھ اسے روکنے کے لیے بے تابانہ فضا میں ہلنے لگتے۔ انھیں نظرانداز کر کے اسے خالی ہاتھ ہی گھر لوٹنا پڑتا کیونکہ مالک کو دو شفٹوں کی دوگنی رقم دینی تھی جو اس وقت بمشکل ہی پوری نکلتی۔

نیو ٹاؤن کی سواری اتار کر وہ سیدھا جمشید روڈ پر ہولیا اور پھر اس نے ڈرتے ڈرتے ایک پان والے سے بنی بنائی دو سگریٹیں خریدیں، ان میں سے ایک سُلگا کر رکشا اسٹارٹ کیا اور شہر کی طرف روانہ ہوگیا۔ سگریٹ ختم کرنے سے پہلے ہی اسے اپنے وجود میں توانائی سی اُبھرتی محسوس ہوئی جیسے وہ تازہ دم ہوگیا ہو۔ ذہن بالکل خالی تھا اور اس خالی پن میں سرور کی ایک عجیب سی کیفیت تھی، اس کا دل چاہ رہا تھا کہ دوسری سگریٹ سُلگا لے لیکن کیپری سینما سے سواریاں مل گئیں جن کی موجودگی میں وہ بدبودار سگریٹ نہیں سُلگانی چاہتا تھا۔

رفتہ رفتہ وہ چرس کا عادی ہوتا چلا گیا۔ سنگل شفٹ میں گھر کا خرچہ پورا کرنا مشکل تھا اور چرس کے بغیر ڈبل شفٹ کی ڈیوٹی ناممکن تھی۔ لہٰذا اس سمجھوتے کے تحت گھر کی گاڑی بھی مزے سے چلنے لگی اور وہ خود فراموشی کے ایک لذت انگیز احساس میں ڈوبا رہنے لگا۔

لیکن چند روز پہلے اس نے باری باری کئی ٹھکانے چھانے مگر چرس کہیں سے نہ مل سکی۔ سویرے ہی سے اس کا بدن ٹوٹنے لگا، بار بار معدے میں کڑک چائے کی پیالیاں انڈیلنے کے باوجود جمائیوں پر جمائیاں آتی رہیں، آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔ اسے یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے اس کا وجود ادھورا رہ گیا ہو۔ اس دن اپنی روایتی نرم خوئی کے باوجود کئی سواریوں سے اس کی تو تکار ہوتی ایک سے ہاتھا پائی ہوتے ہوتے رہ گئی، دوپہر ہوئی تو وہ اپنے ذہن پر گرفت کھو چکا تھا اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اگر وہ کچھ دیر اور سڑک پر رہا تو کسی کو کچل دے گا یا کوئی بس اس پر سے گزر جائے گی۔ وہ سخت بیزاری اور جھلاہٹ کے عالم میں گھر لوٹ آیا۔

شوہر کے خلافِ معمول جلد گھر لوٹ آنے پر بیوی نے خوش مزاجی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ازدواجی تصرفات سے کام لینا چاہا تو وہ بھڑک اٹھا، کھانا آیا تو اس میں مرچیں تیز اور نمک کم محسوس ہوا آخر گھر کے سارے محاذوں پر سکوت طاری کرانے کے بعد وہ بستر پر گر گیا۔

اس کے لیے وہ چند روز زندگی کے بدترین دن تھے ہر روز وہ سوچتا کہ قوتِ ارادی سے کام لے گا، پورے وقت رکشا چلائے گا لیکن شہر کے ہنگاموں میں آتے ہی اس کے اعصاب انتشار کا شکار ہو جاتے۔ اس سے دو چھوٹے موٹے حادثے بھی ہوئے مگر چرس کے بغیر وہ آدھے دن سے زیادہ کام نہ کرسکا۔ جمع پونجی سے رقم ملا کر مالک کو اس کا حصہ ادا کرنا پڑا کیونکہ اپنی ساری پسند اور ناپسند کے باوجود وہ اُدھار سے سخت نفرت کرتا تھا۔

پھر ایک دن دوست محمد کے ترسے ہوئے کانوں نے ایک ٹھکانے پر امید کا پیغام سنا، چرس تو نہیں تھی لیکن ہیروئن مل سکتی تھی وہ مہنگی تھی مگر اثر بھی اس کا دوآتشہ تھا۔ دوست محمد نے جیب سے نوٹ نکال کر دکاندار کے حوالے کیے اور پُڑیا لے کر وہاں سے چلا آیا۔ اس نے بھورے رنگ کا وہ حیرتناک سفوف سگریٹ کے ذریعے استعمال کیا تو زبان پر گھلتے ہوئے لطیف ذائقے کی پُراسرار مقناطیسی لہریں اپنی رگ و پے میں کوندتی محسوس ہوئیں اور پھر وہ تیزی سے خود کو تندرست و توانا محسوس کرنے لگا۔ اس کے اعصاب پر چھائی ہوئی کھولت یوں صاف ہوگئی تھی جیسے تیز برسات نے مکان کے در و دیوار سے برسوں کی جمی ہوئی گرد دھو ڈالی ہو۔

ہیروئن چرس کے مقابلے میں مہنگی ضرور تھی لیکن دوست محمد کو استعمال میں سستی محسوس ہوئی۔ اثر میں وہ نہایت تیز تھی۔ دوست محمد کا خیال تھا کہ اگر قریب المرگ آدمی بھی اس کی ایک پُڑیا لیتا تو ایک بار پھر ہیری لے کرانو کی یا محمد علی باکسر تک سے بھڑ جانے پر تُل جاتا۔

پھر چند روز کے بحران کے بعد بازار میں چرس کی بھرمار ہوگئی لیکن دوست محمد ہیروئن ہی خریدتا رہا جو اسے آزادی، صحتمندی اور توانائی کے سرور انگیز تصور سے مالامال کر دیتی تھی مگر اس کی یہ عیش کوشی زیادہ دن جاری نہ رہ سکی۔ صبح سویرے وہ گولیمار سے رکشا لے کر نکلا تو ایک گلی کے نکڑ پر جناح اسپتال کی سواری مل گئی۔ صبح کا وقت تھا، سڑکوں پر زیادہ ٹریفک نہیں تھا۔ لہٰذا وہ دل کھول کر رکشا بھگانے لگا تاکہ اس سواری کو اتارنے کے بعد کالا پُل کے علاقے سے ہیروئن کا تازہ کوٹہ خرید سکے۔ پچھلے دنوں میں اس نے شہر میں ہیروئن ملنے کے کئی ٹھکانے دریافت کر لیے تھے لیکن کالے پُل یا جیل روڈ کے علاوہ کہیں سے خریدنے میں کامیاب نہ ہوسکا تھا۔ بیچنے والے اپنے جانے پہچانے گاہکوں کو یا ان کی سفارش پہنچنے قابلِ اعتماد لوگوں کو ہی ہیروئن بیچ رہے تھے۔ چرس کی طرح اس نشے تک ہر کس و ناکس کی رسائی نہیں تھی۔

اس دن شاید دوست محمد کے ستارے گردش میں تھے کیونکہ جونہی وہ تیز رفتاری سے نمائش کا چوراہا گھومنے لگا اچانک اس کی نگاہ سڑک پر گرے ہوئے موبل آئل پر پڑی جو شاید کسی گاڑی وغیرہ سے گرا تھا اور کافی بڑے رقبے میں پھیلا ہوا تھا۔ دوست محمد نے بریک پیڈل پر پاؤں رکھ کر رفتار کم کرنے کی کوشش کے

ساتھ رُخ بدل کر چکنی سڑک سے بچنا چاہا لیکن کامیاب نہ ہو سکا اور رکشا ایک پل میں قلابازی کھا کر گھسٹتا ہوا چوراہے کی منڈیر سے جا ٹکرایا۔ رکشا پلٹتے ہی دوست محمد اچھل کر دور جا گرا تھا مگر سوار آہنی پائپوں اور کینوس کے مضبوط جال میں پھنسا ہوا تھا۔

دوست محمد نے اٹھ کر رکشے کے پچکے ہوئے ڈھانچے میں پھنسے ہوئے مسافر کی مدد کے لیے جانا چاہا لیکن اس کی داہنی پنڈلی سے ران تک درد کی ایک ناقابلِ بیان ٹیس دوڑ گئی اور پھر وہ درد اور اذیت میں ڈوبی ہوئی نگاہوں سے اپنی خون میں لتھڑی ہوئی شلوار کو دیکھنے لگا۔

دھماکا بہت زوردار ہوا تھا۔ اس لیے پولیس چوکی پر مامور عملہ فوراً جائے حادثہ پر آ پہنچا۔ بے ہوش مسافر کو شکستہ ڈھانچے سے نکالا گیا تو اس کا سر اور چہرہ لہو کی سُرخی میں ڈوبا ہوا تھا اور یوں وہ دونوں جناح اسپتال کے بجائے سول اسپتال کے شعبۂ حادثات میں پہنچا دیے گئے۔

دوست محمد کو شدید چوٹیں آئی تھیں مگر وہ ہڈیوں کی ٹوٹ پھوٹ سے محفوظ رہا تھا لہٰذا ضابطے کی کارروائی اور مرہم پٹی کے بعد اسے جنرل وارڈ کے ایک بستر پر ڈال دیا گیا جہاں اس کے سر پر ایک سپاہی مسلّط تھا۔ اسے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ زیرِ حراست مریض کے طور پر اس بستر پر پڑا ہوا تھا۔

ایک بجے تک وہ اپنا بیان وغیرہ قلمبند کرا کے فارغ ہو چکا تھا۔ وقت دھیمے دھیمے گزرتا رہا اور وہ بستر پر پڑا پہلو بدلتا رہا پھر اسے اپنا حلق سوکھتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اس وقت تک شاید گھر والی کو خبر نہیں ملی تھی اس لیے نرم دل سپاہی توجہ سے اس کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ دوست محمد نے ایک ہی سانس میں اس کا لایا ہوا گلاس خالی کر دیا مگر حلق بدستور سوکھا محسوس ہو رہا تھا۔ جب حلق میں کانٹے پڑنے لگے تو وہ پھر پانی کے لیے کراہا مگر پانی اس کی پیاس کا درماں نہ بن سکا، حلق سوکھا جا رہا تھا، زبان اینٹھ رہی تھی، جسم برف کی طرح ٹھنڈا ہوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا پھر بدن کے مساموں سے پسینہ پھوٹنے لگا، دل بیٹھتا ہوا محسوس ہونے لگا، کانوں میں سیٹیاں سی بجنے لگیں جیسے تیز ہوائیں کسی آسیب زدہ حویلی کے بوسیدہ در و دیوار کے روزنوں سے زور کرتی گزر رہی ہوں۔

وہ گھبرا گیا۔ اسے یاد آیا کہ اس کا ہیروئن لینے کا وقت گزر چلا ہے لیکن اس کا ذہن کوئی فیصلہ کرنے کے قابل نہیں تھا۔ نجانے وہ خون بہہ جانے کے بعد دی جانے والی دواؤں کے اثرات تھے یا ہیروئن کی طلب۔ اس نے کربناک انداز میں اپنا سر جھٹکنا شروع کر دیا۔

اسے سانس رُک رُک کر آ رہے تھے جیسے سینہ یک بیک تنگ ہو گیا ہو، اعصاب پر ہلکا سا تشنج طاری ہو چلا تھا، آنکھیں سلگ رہی تھیں۔ کبھی اسے یوں نظر آتا جیسے چھت سے جھولتا ہوا پنکھا سیکڑوں فٹ کی بلندی پر خلا میں معلق ہو پھر اچانک ہی وہ پنکھا اپنی چھاتی سے چند انچ اوپر رُکا ہوا نظر آتا۔ نگاہوں کے اس فریب سے چھٹکارا پانے کے لیے اس نے اپنا سر ایک پہلو کی طرف گھما لیا اور برابر میں بچھا ہوا دوسرے مریض کا پلنگ اور قریبی بینچ پر بیٹھی ہوئی سوگوار سی عورت نظر آنے لگی جس کی پشت دوست محمد کی جانب تھی۔

چھوٹے چھوٹے سانسوں کی وجہ سے اس کے پھیپھڑوں کو تازہ ہوا مناسب مقدار میں نہیں مل رہی تھی۔ لہٰذا اس کے تنفس کی رفتار تیز ہو گئی، حلق بالکل سوکھ گیا۔ اینٹھی ہوئی زبان ہونٹوں پر پھیری تو ڈر گیا، ایسا معلوم ہوا تھا جیسے کسی کھردری دیوار کو چاٹ لیا ہو، اسی لمحے بینچ پر بیٹھی ہوئی چالاک عورت اپنی جگہ سے جنبش کیے بغیر اچانک اپنی بینچ مریض کے بستر سمیت اتنی دور دھکیل لے گئی کہ اس کا وجود دوست محمد کو ایک موہوم سے ہیولے کی طرح نظر آنے لگا پھر وہ مسہری پہلے سے بھی زیادہ قریب گھسیٹ لائی سیٹیوں کے شور میں دوست محمد کے کانوں میں عجیب عجیب آوازیں گونجنے لگیں، دماغ میں پتلے پتلے بانسوں جیسے جسموں والے کریہہ صورت سائے ناچنے لگے جو اس کا مضحکہ اُڑا رہے تھے، وہ بے حس و حرکت بستر پر پڑا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بینچ والی عورت کو دیکھتا رہا۔

وہ عورت شاید اپنی پشت پر بھی دیکھ سکتی تھی۔ کیونکہ وہ اسے ستانے پر تلی ہوئی تھی۔ وہ تیزی سے بستر کو بہت دور دھکیل لے گئی اور اگلے ہی لمحے اسے گھسیٹ کر دوست محمد کی آنکھوں سے آ لگی۔

جب بار بار یہی ہونے لگا تو وہ دونوں مٹھیاں بھینچ کر کربناک آواز میں پوری قوت سے چیخ پڑا۔ ”بند کرو... با... آ... ند کرو... یہ حرکتیں۔“

چیختے ہوئے اس نے بستر سے اٹھنے کی کوشش بھی کی تھی مگر اسے ہر طرف دھندلاہٹ ہی دھندلاہٹ دکھائی دے رہی تھی جس میں بانسوں جیسے جسموں پر تربوز نما چہرے مضحکانہ انداز میں مسلسل مسکرائے جا رہے تھے۔ دوست محمد نے ہذیانی انداز میں بے مقصد آوازیں نکالتے ہوئے اپنے بال مٹھیوں میں جکڑ لیے اور سر مسہری کے آہنی پائپ پر دے مارا۔

اس کی نگرانی پر مامور سپاہی نے اگر اسے فوراً ہی نہ دبوچ لیا ہوتا تو وہ مسہری سے نیچے گر گیا ہوتا۔

اس ہذیانی چیخ پکار میں کراہتے ہوئے مریض اپنا دکھ بھول گئے۔ دوست محمد کے بستر کے گرد تماشا دیکھنے والوں کی بھیڑ لگنے لگی۔ ہر شخص اسے عبرت کی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا اور اس کی حالت کے بارے میں سرگوشیوں میں اظہارِ خیال کر رہا تھا۔

”دماغ میں بخار چڑھ گیا ہے۔“ ایک عمر رسیدہ عورت سہمی
ئی آواز میں دوسری سے کہہ رہی تھی۔

”او میرے مولا!“ ایک ادھیڑ عمر مریض دونوں ہاتھ ملتے ہوئے
دینے والی آواز میں کراہا۔ ”جرا آنکھیں تو دیکھو بے چارے کی، کیسا
پ رہا ہے بس ابھی یہ جندہ نہیں بچے گا۔ میرے مولا! ہم سب
ادھر سے جندہ نکال دے۔“ اس کی دہشت بالکل بجا تھی کیونکہ
ست محمد کی آنکھوں کی پتلیاں اوپر چڑھ گئی تھیں اور کھلے ہوئے
وٹوں میں چمکتی ہوئی سفیدی بھیانک لگ رہی تھی۔ اس کے
ن پر شدید کپکپاہٹ طاری تھی اور سپاہی کے علاوہ کوئی اس کے
یب جانے کو تیار نہیں تھا۔

یہ ہنگامہ معمولی نہیں تھا۔ دو میل نرسوں کے ساتھ آر ایم او
راً ہی آ پہنچا۔

دوست محمد کی حالت دیکھ کر کالج سے تازہ تازہ نکلے ہوئے
اکٹر کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ بادی النظر میں وہ سمجھا تھا کہ مریض شاید
ی موذی نشے کا عادی ہوگا مگر دوست محمد کی تو حالت ہی عجیب
ی۔ وہ مینڈریکس، راکٹ، پیتھیڈین اور مارفیا کے عادی مریضوں
و نشہ ٹوٹنے کی حالت میں بارہا دیکھ چکا تھا مگر اس قسم کا کیس وہ
لی بار دیکھ رہا تھا۔

فوری طور پر ایک سینئر ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ اس نے آتے
ی بستر کے گرد لگی ہوئی بھیڑ کو منتشر کیا اور دونوں میل نرسوں سے
وست محمد کے کانپتے ہوئے جسم کو قابو میں کر لیا۔ ڈاکٹر نے دوست محمد
ی حرکتِ قلب دیکھی، خون کا دباؤ چیک کیا، پپوٹے سرکا کر پتلیاں دیکھنے
ی کوشش کی اور پھر بڑبڑاتے ہوئے مریض کی یخ بستہ پیشانی پر ہاتھ رکھتے
ہوئے اپنا فیصلہ صادر کر دیا۔

”مریض کسی خطرناک نشے کا عادی ہے۔“ اس نے نوجوان ڈاکٹر سے مخاطب ہو کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”بڑی عجیب علامات ہیں سر!“ نوجوان ڈاکٹر نے انگریزی میں کہا۔ ”یہاں مارفین سب سے موذی نشہ ہے مگر یہ علامات اس کی بھی نظر نہیں آتیں۔ اسی وجہ سے میں الجھ گیا تھا۔“

”کوئی بھی نشہ ہر مریض پر یکساں اثر نہیں کرتا۔“ سینئر ڈاکٹر نے بھی اس بار انگریزی کا سہارا لیا تھا۔ ”کمزور اعصاب کے لوگ نشہ نہ ملنے پر بدترین ردِعمل کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ اسی قسم کا کیس ہو یا پھر یہاں ہیروئن بھی بازار میں آ گئی ہے۔“ آخری فقرہ اس نے پُرخیال اور تشویشناک لہجے میں ادا کیا تھا۔ ”فی الحال اسے مارفین دے دو، ہوش میں آنے کے بعد دیکھیں گے کہ یہ کیا کہتا ہے۔ اس دوران خون ٹیسٹ کرالو اس کا۔“

اینی زولا، اینی زولا۔

گلشن اقبال کی طرف جاتے ہوئے ڈینی کا ذہن مسلسل اسی لفظ یا نام کی تکرار کیے جا رہا تھا۔ پتا نہیں اس کا تعلق کس زبان سے تھا۔ باس سے گفتگو ختم ہونے کے بعد بھی یہ نام اس کے ذہن پر ٹھوکریں لگاتا رہا تھا اور سونے سے قبل وہ کافی دیر تک ڈکشنری کھولے اس میں ممکنہ حروفِ تہجی کے تحت صفحات کھنگالتا رہا لیکن یہ لفظ کہیں نظر نہ آیا۔ اس سے پہلے بارہا وہ کوڈ ورڈز سے دوچار ہوتا رہا تھا لیکن ہمیشہ اردو یا انگریزی کے جانے بوجھے نام یا الفاظ ہی باہمی شناخت کا ذریعہ مقرر کیے گئے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اسے اینی زولا جیسا بیہودہ لفظ استعمال کرنا تھا جو اپنی اجنبیت اور غیر معمولی صوتی آہنگ کے باعث اس کے ذہن سے چپک کر رہ گیا تھا۔

پچھلی بار وہ سُرخ کرولا والے کے ساتھ گلشن اقبال کے اس مکان پر گیا تھا تو وہاں رہنے والی عورت سے بھی اس کا سامنا ہوا تھا۔ نہ صرف سامنا ہی ہوا تھا بلکہ کرولا والے کی فرمائش پر اس نے چائے بھی پلائی تھی۔ اپنی وضع قطع اور بول چال کے اعتبار سے وہ عورت سو فیصد مقامی نظر آتی تھی۔ اس وقت ڈینی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ مشرقی عورت براہ راست اس کے باس کی آلۂ کار ہوگی۔ اس نے یہ رائے قائم کی تھی کہ شاید خطرناک صورت والے کی اس عورت سے گہری آشنائی تھی اور وہ اسے بتائے بغیر اس کا مکان اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتا رہتا ہوگا۔

اسے ایک مرتبہ پھر بلاوجہ غصّہ آنے لگا۔ ایک مقامی عورت کے لیے اینی زولا جیسا نامانوس کوڈ ورڈ مقرر کرنا اس کے نزدیک حماقت تھی لیکن وہ مجبور و محکوم ماتحت تھا۔ اپنے باس کی ہر عقلمندی اور حماقت کو ہنستے کھیلتے برداشت کرنا اس کے فرائضِ منصبی میں شامل تھا۔ اپنی شدید ترین خواہش کے باوجود بھی وہ اس کوڈ ورڈ میں تبدیلی کرنے پر قادر نہیں تھا۔

مکان کے پھاٹک کے عین سامنے اس نے دانستہ انجن کو خاصی ریس دے کر اگنیشن آف کیا لیکن مکینوں کو کسی کی آمد سے باخبر کرنے کی یہ ترکیب بار آور ثابت نہ ہو سکی اور نیچے اتر کر اسے پختہ ستون میں لگے ہوئے اطلاعی گھنٹی کے پش بٹن کو دبانا پڑا۔ اسے توقع تھی کہ حسبِ سابق اس بار بھی ملازم فوراً ہی ذیلی دروازے سے طلوع ہو کر اس کی آمد کا مدعا دریافت کرے گا مگر ایسا نہ ہوا۔

چند سیکنڈ کے سکوت کے بعد پختہ فرش پر کسی زنانہ سینڈل کی ایڑیوں کی کھٹ کھٹ سُنائی دی اور پھر ذیلی دروازہ کھول دیا گیا۔ خاتون نے جونہی جائزہ لینے کے لیے ذیلی دروازے سے سر باہر نکالا ڈینی نے اپنے ذہن میں کلبلاتا ہوا وہ بیہودہ کوڈ ورڈ سُنا ڈالا۔

”اوہ... اندر چلے آؤ۔“ عورت نے اپنا سر واپس اندر کرتے

ہوئے کہا اور ڈینی ذیلی دروازے سے اندر داخل ہوگیا۔ اسے حیرت تھی کہ پہلی بار سادہ اور گھریلو نظر آنے والی وہ عورت اس وقت سر سے پیر تک فیشن میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس نے بغیر آستینوں کا ٹی شرٹ نما بلاؤز اور جینز پہنی ہوئی تھی۔ چہرہ غازہ کی تہہ میں گلنار ہو رہا تھا اور لبوں پر گلابی رنگ جما ہوا تھا۔ وہ اس کی مستانہ چال کے بارے میں کوئی نادر سی تشبیہہ سوچتے ہوئے اس کی تقلید میں ڈرائنگ روم میں داخل ہوا جہاں وہ مسکراتے ہوئے اس کی طرف مڑ گئی۔ "دو منٹ بیٹھو میں ابھی آتی ہوں۔"

وہ اندرونی دروازے سے گزر کر غائب ہوگئی۔ اس کے سینڈلز کی کھٹ کھٹ چند ثانیوں تک گونجنے کے بعد معدوم ہوگئی اور ڈینی یہی سوچتا رہ گیا کہ پہلے تاثر کے بارے میں انگریزی کہاوت کس قدر گمراہ کن ہے۔ پہلی ملاقات میں ان دونوں کا سامنا ضرور ہوا تھا لیکن براہ راست گفتگو کی نوبت نہیں آئی تھی لیکن اس وقت وہ ڈینی سے اس قدر اعتماد سے بے تکلفانہ مخاطب ہوئی تھی جیسے ان میں پرانی شناسائی ہو۔

واپسی میں اس کے داہنے ہاتھ میں سیاہ رنگ کا ایک بریف کیس جھول رہا تھا جو بادی النظر میں عام ساخت کا نظر آ رہا تھا۔ وہ سیدھی اسی ڈبل صوفے پر آ بیٹھی جس پر ڈینی بیٹھا ہوا تھا اور بریف کیس اس نے اپنی ٹانگوں پر رکھ لیا پھر مسکراتے ہوئے دلآویز نگاہوں سے ڈینی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "نام کیا ہے تمھارا؟"

"اینی زولا۔" ڈینی نے گہری سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

"اور میرا؟" اس نے شوخ لہجے میں سوال کیا۔

"نہیں بتاؤ گی تو تمھیں بھی اینی زولا ہی سمجھتا رہوں گا۔" ڈینی نے اپنی سنجیدگی میں فرق نہ آنے دیا۔ اسے یاد تھا کہ باس نے اسے اس عورت سے غیر ضروری طور پر بے تکلف ہونے سے منع کیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ پہلی ملاقات میں ہلکا پھلکا تاثر چھوڑنے والی وہ عورت خاصی خطرناک ثابت ہوسکتی تھی جو ڈینی کا جواب سن کر فراخ دلی سے کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔

"یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ہم دونوں ہی بیک وقت اینی زولا ہوں؟"

"انگریزی قاعدے سے قطعی ہوسکتا ہے۔ بلکہ انگریزی میں تو یہی ہوتا ہے۔" ڈینی بدستور سنجیدہ رہا۔

"وہ کیسے؟" عورت بیگ پر ہاتھ رکھے مسلسل ہنسے جا رہی تھی۔

"مسٹر اور مسز کے ساتھ، بلکہ کوئی لڑکی ہو تو وہ مس اینی زولا ہوسکتی ہے۔"

"تو میں تمھیں لڑکی نظر نہیں آتی؟" اس نے قدرے بگڑ کر سوال کیا۔

"مجھے افسوس ہے کہ میں عجلت میں ہوں ورنہ وجہ[...]" ڈینی نے بلاوجہ رسٹ واچ پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ عو[...] خاصی شوخ تھی اور وہ بھی اس سے الجھنے میں دلچسپی رکھ[...] لیکن باس کی خصوصی ہدایت نے اسے سرد مہری پر مجبور کرد[...]

"عجلت؟" اس نے طنزیہ لہجے میں کہتے ہوئے برا[...] ڈینی کی طرف بڑھا دیا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں سے ڈر[...]"

ڈینی اس توہین آمیز ریمارک پر بس اسے گھور کر پھر کچھ کہے بغیر اٹھا اور بریف کیس سمیت باہر نکلا چلا آیا۔ کار میں آ بیٹھا۔ اس عورت نے باہر جھانکے یا کوئی الوداعی[...] کہے بغیر ذیلی کھڑکی بند کرلی۔

گھر لوٹتے ہوئے ڈینی مسلسل اسی عورت کے بار[ے میں] سوچتا رہا۔ نہ جانے وہ کون تھی اور ان لوگوں کے درمیا[ن اس] کی کیا حیثیت تھی۔ خطرناک صورت والے شخص کے بعد وہ دا[...] شخصیت تھی جس سے ڈینی اپنے باس کے ذریعے متعارف ہ[وا تھا] ورنہ مدت سے وہ یہی سوچتا رہا تھا کہ شہر میں باس کے براہ [راست] رابطے میں صرف وہی تھا یا پھر اس کے ذریعے جہانگیر نادر[...] طارق تھے مگر نئے تجربات سے ظاہر ہو رہا تھا کہ باس کے [...] کرنے والوں کی تعداد اتنی محدود نہیں تھی۔ اس عورت اور [...] صورت والے کے علاوہ نہ جانے کتنے لوگ اس نادیدہ شخصیت [...] سہے ہوں گے۔

پھر قابل غور بات یہ بھی تھی کہ باس نے دو ٹوک ہ[...] کے لگے بندھے معمول سے ہٹ کر ڈینی کو اس عورت سے غیر ض[روری] طور پر بے تکلف ہونے سے منع کیا تھا جب کہ وہ ڈینی سے [...] ہونے اور فریب حسن میں مبتلا کرنے پر تلی ہوئی تھی جس کا ایک واضح [مطلب] یہ تھا کہ باس اس عورت کی فطرت سے بخوبی واقف تھا۔ [...] دانست میں ایسی واقفیت براہ راست اور بے تکلفانہ مرا[سم کے] بغیر ممکن نہیں تھی۔ یعنی باس اس عورت کی اور وہ باس کی شخ[صیت] سے بخوبی واقف تھی۔ یہ خیال آتے ہی ڈینی نے سوچا کہ بحیثیت عورت وہ بری نہیں تھی۔ خوش مزاج اور خوش گفتار تھی اگر و[ہ باس] کی لاعلمی میں اس سے دوستی کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو با[س تک] رسائی آسان ثابت ہوسکتی تھی۔ اس عورت کو اعتماد میں ل[...] تصدیق بھی کی جاسکتی تھی کہ بظاہر مخیر، نرم دل، ہمدرد اور دوست نظر آنے والا سکندر علی ہی ان کا سرغنہ تھا۔

گھر پہنچ کر کار سے اترتے ہوئے وہ باس اور گفت[گو کرنے] والی مست خرام دلربا کو بھول کر بریف کیس میں الجھ گیا اور سیدھا اپنی خوابگاہ میں پہنچ گیا۔ جوتے اتار کر وہ چند ثانیوں [تک] اس سیاہ بریف کیس اور اس کے دستے کے دونوں جا[نب]

[ن]صب سلیٹ نما مستطیلوں کو دیکھتا رہا پھر بریف کیس [...]وری سے [...]ھری پہ بیٹھ گیا پہلے اس نے پیادا ہنا انگوٹھا داہنی طرف کے مستطیل [...]ا پھر چند ثانیوں بعد یہی عمل بائیں طرف والے مستطیل پر آزمایا لیکن بریف کیس [...] کا توں رہا۔ ڈینی نے ڈھکن پکڑ کر قدرے اوپر اٹھانا چاہا لیکن [بد]ستور مقفل تھا جس کا مطلب تھا کہ باس نے اسے کھولنے کے لیے [ت]رتیب بتائی تھی اس میں تبدیلی کر کے بریف کیس کو بحفاظت [کھو]لنا ناممکن تھا۔

دوسری بار ڈینی نے بائیں مستطیل سے ابتدا کی اور پھر داہنے [مستط]یل پہ انگوٹھا رکھتے ہی کلک کی ہلکی سی آواز آئی اور بریف کیس [کا ڈ]ھکن اچھل کر قدرے اوپر آگیا۔ ڈینی نے جھری کے قریب سے [پکڑ ک]ر ڈھکن اٹھایا تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔ بریف [کیس] میں کچھ کاغذات کے اوپر ہی پولی تھین کی دو شفاف تھیلیوں [میں س]فید رنگ کا نہایت باریک سفوف نظر آ رہا تھا۔ ڈھکن کی [اندرو]نی سطح پر کلپ کے ذریعے اعشاریہ تین دو کا خودکار اسمتھ اینڈ [وی]ڈنی پستول لگا ہوا تھا اسی کے ساتھ جلد کی رنگت کے باریک [ر]بڑ دستانوں کی کئی جوڑیاں موجود تھیں۔ اس نے کسی چیز کو چھوئے [بغیر] بریف کیس کی ساخت کا جائزہ لینا شروع کیا تو اسے بنانے والے [کی] ہنر مندی کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔

بریف کیس کی تہہ معمول کے مطابق تھی البتہ اس کی دیواریں [غیر م]عمولی طور پہ موٹی تھیں۔ غالباً نشانات انگشت کی شناخت کرنے [والا] کمپیوٹر اور کمپیوٹرائزڈ تالا اگلی دیوار کی موٹائی میں پوشیدہ تھا جبکہ [بارو]دی مادہ اور اس میں دھماکا پیدا کرنے والی بیٹریاں بغلی دیواروں [میں] اس طرح ضم تھیں کہ استر اور شاید اس کے بعد دفتی ادھیڑے [بغی]ر انھیں دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ ڈینی کو یقین تھا کہ اس حفاظتی غلاف [میں] بھی کہیں نہ کہیں ایسے مہلک تار پوشیدہ ہوں گے جو اندرونی ساخت [می]ں خلل کے باعث آپس میں شارٹ ہو کر طاقتور بارودی مادے [کو] موثر بنا دیں لہٰذا اس نے اس بریف کیس کے بارے میں اپنے [ذہ]ن میں ابھرنے والے سارے تجسس کو وہیں دفن کر دیا اور ہیروئن کی [تھی]لیوں کے نیچے دبے ہوئے کاغذات نکال لیے۔

اوپر کے سادہ حفاظتی کاغذ کے نیچے ابھری ہوئی گول مہر [وا]لا ایک چھپا ہوا سرٹیفکیٹ تھا جس پر ڈینی کی تصویر چسپاں تھی۔ [سر]ٹیفکیٹ کسی ایشین سنڈیکیٹ لمیٹڈ کا تھا۔ جس کے مندرجات کے [مط]ابق ڈینی اس فرم کا اسسٹنٹ سیلز منیجر تھا۔ سرٹیفکیٹ کے اختتام پر [فر]م کے چیئرمین کے قلمی دستخط تھے جن سے نام پڑھنے میں نہیں آتا تھا۔ [ا]بھری ہوئی بے رنگ مہر اس طرح لگائی گئی تھی کہ ڈینی کی تصویر کا [ایک] حصہ بھی اس کی زد میں آگیا تھا اور یوں تصویر بدلنا تقریباً [نام]ممکن ہو کر رہ گیا تھا۔ فرم کے نام کے ساتھ اوپری گوشوں میں

تین ٹیلی فون نمبر، تار کا پتا اور ٹیلکس نمبر درج تھے۔ نام کے نیچے لاہور کے مال روڈ کا ایک پتا درج تھا۔

ڈینی اس تصدیق نامے کو دیکھ کر چکرا کر رہ گیا۔

ایک طرف تو باس اتنی رازداری برت رہا تھا کہ برسوں سے سامنے آئے بغیر محض آواز سے سارا کام چلا رہا تھا۔ محض اپنی آواز کی غیر ضروری تشہیر سے بچنے کے لیے اس نے جہانگیر سے براہ راست بات نہیں کی تھی بلکہ ڈینی کے ذریعے سارے احکام دیتا رہا تھا یا اب اس نے ایک ایسا تصدیق نامہ اس کے حوالے کر دیا تھا جس پر اس کے ایک ادارے کا نام، پتا، فون نمبر، تار کا پتا اور ٹیلکس نمبر تک موجود تھا جس کے سہارے اس کی ذات کا سراغ لگا لینا نہایت آسان ثابت ہوسکتا تھا۔

اس کے نیچے چار ٹیلکس تھے جن میں سے دو ایمسٹرڈم کی کسی فرم کی جانب سے ایشین سنڈیکیٹ لمیٹڈ کو بھیجے گئے تھے اور بقیہ دو ایشین سنڈیکیٹ کے جوابات کی نقول تھیں۔ ان چاروں میں گرے کلاتھ کی خرید اور داموں کے بارے میں تذکرہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ایمسٹرڈم کی فرم ایشین سنڈیکیٹ لمیٹڈ سے گرے کلاتھ کی ایک بڑی مقدار مستقل بنیادوں پر درآمد کرنا چاہتی تھی مگر نمونے کی منظوری اور داموں کی وجہ سے معاملہ التوا میں پڑا ہوا تھا۔ دیگر کاغذات ایشین سنڈیکیٹ لمیٹڈ کے لیٹر فارم پر ٹائپ کیے ہوئے تھے اور ان کا تعلق بھی اسی سودے سے معلوم ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ بکرے کی شکل کا ایک نقرئی ٹائی پن بھی موجود تھا۔

اپنے شناخت نامے کے ساتھ ان کاغذات کی موجودگی سے ڈینی نے ایک ہی نتیجہ اخذ کیا کہ اسے ایشین سنڈیکیٹ لمیٹڈ کے نمائندے کے طور پر اس سودے کو تکمیل تک پہنچانا تھا اور یہ تو ظاہر ہی تھا کہ گرے کلاتھ کی برآمد محض ایک کاروباری آڑ تھی ورنہ وہ سارا قصہ ہیروئن ہی سے متعلق تھا۔

اس نے بریف کیس اپنی الماری میں مقفل کیا اور کھانا کھا کر فیکٹری روانہ ہوگیا۔ وہاں پہنچا تو دوسرے کاروباری پیغامات کے علاوہ اسے سیکرٹری سے معلوم ہوا کہ کوئی عورت دو بار اس کے لیے فون کر چکی تھی اور اس کی عدم موجودگی کی اطلاع پا کر نہایت تجسس اور بے چینی کے عالم میں یہ جاننا چاہا تھا کہ وہ کس وقت تک دفتر آئے گا اور آئے گا بھی یا نہیں۔ سیکرٹری نے جب اس عورت کا نام جاننا چاہا تو اس نے کوئی جواب دیے بغیر سلسلہ منقطع کر دیا۔ دوسری بار محض آواز اور ڈینی کے بارے میں سوالات کی یکسانیت سے سیکرٹری نے اندازہ لگایا تھا کہ بولنے والی وہی تھی۔

اس عورت کی دونوں فون کالز گیارہ اور بارہ بجے کے در[میان] آئی تھیں لہٰذا ڈینی کا ذہن گلشن اقبال والی خوش مزاج عورت کی

طرف گیا لیکن اسے ڈینی کی فیکٹری کا فون نمبر کیسے ملا؟ اسے یہ تو ضرور بتایا گیا ہوگا کہ کوئی شخص اینی زولا کے حوالے سے اس کے پاس آئے گا لیکن اسے یہ کیسے معلوم ہوا کہ آنے والا ڈینی ہوگا؟ وہ تنظیم سے وابستہ تھی تو مقررہ طریقے سے ہٹ کر رابطہ قائم کرنے کی کوشش کا کیا مطلب تھا؟ پھر جب ڈینی اس سے ملا تو اس نے اشارۃً بھی ایسی کوئی بات نہیں کہی جس سے یہ ظاہر ہوتا کہ اس نے ڈینی کے لیے اس کے دفتر فون کیا تھا۔ یہ سب ایسے پیچیدہ سوال تھے کہ وہ الجھن میں پڑ گیا۔ نجانے گروہ میں اس کا کیا مقام تھا اور وہ ڈینی میں کیوں اتنی دلچسپی لے رہی تھی؟ مگر پھر بھی اس نے ڈینی کو اپنے دام میں پھنسانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی اگر ڈینی کو باس کی خصوصی ہدایت یاد نہ ہوتی تو شاید وہ خود بھی اس کی لگاوٹ کا شکار ہو کر بہک جاتا۔

دوسرے کاموں میں مصروف ہونے سے پہلے معمول کے مطابق وہ ڈاک کے مطالعے میں مصروف ہوگیا۔

وہ جاپان سے آیا ہوا پلاسٹک مولڈنگ اور ایکسٹروژن مشینوں کے بارے میں لٹریچر دیکھنے میں مصروف تھا کہ فون کی گھنٹی کی مدھم آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس نے ریسیور اٹھایا تو آپریٹر کی آواز سنائی دی "سر! کوئی خاتون آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔ پہلے بھی آپ کی غیر موجودگی میں دو بار ٹرائی کر چکی ہیں۔"

ڈینی کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ یقیناً اسی عورت نے دو بار آپریٹر کے توسط سے سیکریٹری سے بات کی ہوگی۔ اس نے سوچا اور پھر آپریٹر سے کہا "لائن دے دو۔"

"ہیلو، تنویر صاحب؟" ہلکی سی کلک کے بعد ریسیور میں ایک نسوانی آواز ابھری تو ڈینی کی پیشانی پر تحیر آمیز شکنیں نمودار ہوگئیں کیونکہ وہ مترنم اور رسیلی آواز اس کے لیے نئی نہیں تھی۔ بالمشافہ اور فون پر، دونوں ہی طرح وہ اس آواز کے سحر سے آشنا ہو چکا تھا۔

"جی بول رہا ہوں۔" اس نے ماؤتھ پیس میں سنجیدہ اور باوقار لہجے میں کہا۔

"مم... میں ایک الجھن میں پڑ گئی ہوں۔" جھجکتی ہوئی آواز سنائی دی "پتا نہیں میں غیر ارادی طور پر جھوٹ کیوں بول بیٹھی؟"

"آپ خاصی پریشان معلوم ہوتی ہیں مس غزالہ!" وہ ہنستے ہوئے بولا "فرصت ہو تو چلی آئیے کسی گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر سکون سے باتیں کر لیں گے۔"

"بڑی عجیب بات ہوئی ہے تنویر صاحب!" وہ اس کی بات ان سنی کر کے بولی "سالانہ فنکشن ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے لیکن اس بار فنکشن کے دو روز بعد پروگرام میں مدعو کیے جانے والوں کی فہرست بنائی جا رہی ہے اور یہ بھی پوچھا جا رہا ہے کہ ا... سے کس کس کے مہمانوں نے پروگرام میں شرکت کی تھی؟"

"کیوں؟" ڈینی نے تحیر آمیز لہجے میں سوال کیا "یہ ... کر رہا ہے؟"

"یہ سارے کوائف فنکشن کی استقبالیہ کمیٹی کا سیکریٹری ... کر رہا ہے۔ مجھے بیس کارڈ دیے گئے تھے، میں نادانستگی میں ... کا تذکرہ گول کر گئی اور اس سے ایک کارڈ ضائع ہونے کا بہانہ ..."

ڈینی وہ خبر سن کر تشویش میں مبتلا ہوگیا تھا مگر بظاہر ... ہوئے بولا "اوہ، تو اس جھوٹ کی الجھن ہے تمھیں۔" بے دھیانی ... وہ اسے آپ کے بجائے تم سے مخاطب کر بیٹھا تھا، خیال آیا تو ... سے نکل چکا تھا مگر اسے خوشی ہوئی کہ غزالہ نے اس انداز تخاطب پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا یا بالفاظ دیگر وہ بے تکلفی قبول کر ... لہٰذا لحظہ بھر کے توقف کے بعد اس نے اپنی بات جاری ر... ہوئے کہا "مگر اس جھوٹ کی ضرورت کیا تھی تمھیں؟"

"آپ نجانے میرے بارے میں کیا سوچیں گے؟" غزا... آواز خفت آمیز تھی "اس روز آپ نے اپنے رویے میں ... تبدیلی کے بارے میں مجھے اور عابدہ کو بھی بتایا تھا مگر یہ ... میرے ذہن سے چپکی رہی کہ شاید مہمانِ خصوصی کی تقریر ... ہی آپ پریشان ہو گئے تھے لہٰذا میرے منہ سے غیر ارادی ... پر ایک جھوٹ نکل گیا جسے نبھانے کے لیے مجھے ایک کارڈ ... ہونے کا عذر تراشنا پڑا۔"

ڈینی کے کان کھڑے ہوگئے۔ اس نے اپنی دانست ... دونوں لڑکیوں کو موقع پر ہی مطمئن کر دیا تھا لیکن غزالہ ... چالاک معلوم ہوتی تھی۔ اس نے ڈینی کا بہانہ سن ضرور لیا تھا ... اس کا ذہن معاملے کی تہ تک پہنچ گیا تھا۔ اب وہ مزید بات ... غزالہ کے شبہے کو تقویت نہیں دینا چاہتا تھا۔ مگر ساتھ ہی ... کے لیے بھی بے چین تھا کہ آخر استقبالیہ کمیٹی کا سیکریٹری وہ کوا... کیوں پھیلا رہا تھا؟

"چلو میں بھی اسے نباہ لوں گا۔" وہ ہنستے ہوئے بے ... سے بولا "پتا نہیں تمھیں کیا وہم تھا۔ ورنہ میری دانست ... سچ بولنے میں کوئی ہرج نہیں تھا۔"

"اوہ، اصل بات تو ابھی سنی ہی نہیں آپ نے۔" غزا... آواز سے دبا دبا سا جوش نمایاں تھا "سیکریٹری نے کسی کو بھی چھان بین کے بارے میں کچھ نہیں بتایا، بس یہی کہتا پھر رہا ... کہ خورد و نوش سمیت، جملہ انتظامی اخراجات کی نئی کس شرح نکا... چاہ رہا ہے تاکہ دوسرے مواقع پر اخراجات کا صحیح اندازہ رہے۔ ... عابدہ کی کلاس میں پڑھتا ہے، ان میں خاصی دوستی ہے، مجھے

... پتا چلا ہے کہ سیکریٹری ساری تفصیلات سکندر علی کے ایما پر ... کرتا پھر رہا ہے۔"

ڈینی کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ تو کیا باس کو اس کی ... موجودگی کا احساس ہوگیا تھا؟

وہ بمشکل اپنے لہجے میں لاتعلقانہ بے پروائی قائم رکھ سکا۔ "... سکندر علی کون ہے؟"

"بھول گئے؟" غزالہ تیزی سے بولی "وہی تو مذاکرے میں مہمانِ خصوصی تھا اس دن... اسی نے سیکریٹری سے بیرونی مہمانوں کی فہرست مانگی ہے جو اس شام مذاکرے میں موجود تھے... اب ... یے میری الجھن بجا ہے یا نہیں؟" اس کا لہجہ داد طلب تھا اور ... وہ سچ بول رہی تھی تو اس نے فہرست سے ڈینی کا نام حذف ... کے اسے ایک بہت بڑی دشواری سے بچا لیا تھا۔

"تمھاری الجھن تو خیر بجا ہے۔" اس بار ڈینی کو سنجیدہ ہو جانا ... "لیکن سکندر علی کے دماغ میں کون سا کیڑا کلبلایا ہے جو اس نے ... رونی مہمانوں کی فہرست مانگی ہے اور پھر تمھارا سیکریٹری بھی کاٹھ ... کا الو ہے کہ آنکھیں بند کر کے اس کے حکم پر چل پڑا۔"

"سکندر علی نے اس روز اعلان کیے بغیر کمیٹی کو دس ہزار ... عطیہ دیا ہے۔ تاکہ وہ زیادہ بڑے پیمانے پر ایسے ہی ایک اور ... ذاکرے کا انعقاد کرے جس میں سماجی کارکنوں کے علاوہ ایکسائز ... یس اور دوسرے اعلیٰ سرکاری حکام کو بھی بلایا جائے۔" غزالہ ... انے لگی "لہٰذا اس سے تعاون تو ہمارے کالج کے ہر طالب علم کی ... لاقی ذمے داری ہے۔ پھر اس نے فہرست کی طلبی کا بہت مضبوط ... از بھی پیش کیا ہے۔ فنکشن کے اگلے دن یعنی کل اسے ایک گمنام ... ھمکی آمیز خط ملا ہے جس میں اسے انسداد منشیات کی مہم جاری ... ھنے پر بدترین نتائج کا سامنا کرنے کی دھمکی دی گئی ہے خط کالج ... کی جانے والی تقریر کے حوالے سے ہے اور سکندر علی کا خیال ہے کہ مہمانوں میں کوئی ایسی کالی بھیڑ بھی تھی جو شرافت اور کسب حلال کے پاکیزہ لبادے کی آڑ میں منشیات فروشی میں بھی ملوث ہے۔ وہ ... رگرم اور فعال آدمی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ مہمانوں کی فہرست دیکھ ... کر شاید وہ خط بھیجنے والے کو پہچان لے گا۔"

ڈینی کا دل ڈوبنے لگا۔ معاملہ کسی حد تک اس کی سمجھ میں ... آگیا تھا۔ اس کا باس یقینی طور پر سکندر علی ہی تھا۔ شاید گھر جا کر ... س نے سوونیئر کے آخری سرورق پر ڈینی کی فرم کا نام تہنیتی پیغام کے ساتھ دیکھا ہوگا اور پھر اس الجھن میں گرفتار ہوگیا ہوگا کہ کہیں ... ینی بھی اس مذاکرے کے مہمانوں میں شامل نہ رہا ہو اور یوں اس ... کی آواز سن کر اپنے سربراہ کی پراسرار شخصیت کے راز سے واقف ہو گیا ہو۔ اس کے پاس اپنے خدشے کی تصدیق یا تردید کے لیے اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں تھا جو اس نے اختیار کیا تھا۔ کسی ایک فرد کے بارے میں چھان بین کے بجائے اس نے سارے ہی شرکا کے نام مانگ لیے تھے اور غزالہ نے محض چھٹی حس کے سہارے ڈینی کا نام چھپا لیا تھا۔ ورنہ اپنی شخصیت کا راز فاش ہو جانے کے خوف سے سکندر علی، ڈینی کو موت کے گھاٹ اتارنے کا فیصلہ بھی کر سکتا تھا کیونکہ معاشرے میں اپنی انسان دوستی، سماجی خدمات، فیاضانہ مالی اعانت اور خدا ترسی کی ہر دل عزیز خوبیاں اس نے منشیات فروشی سے کمائے ہوئے کالے دھن کے سہارے ہی برقرار رکھی ہوئی تھیں اور اس جیسا محتاط آدمی کبھی یہ خطرہ مول نہ لیتا کہ کوئی اس کے چہرے سے عزت، شرافت، امانت، دیانت، سخاوت اور شجاعت کا دبیز غلاف نوچ کر اس میں چھپے ہوئے منشیات فروش کو معاشرے اور قانون کے سامنے بے نقاب کر سکے۔

وہ دل کی گہرائیوں سے غزالہ کا احسان مند تھا لیکن اس لڑکی سے اپنی احسان مندی کا اعتراف نہیں کر سکتا تھا۔ لہٰذا معتدل لہجے میں بولا "میں پھر یہی کہوں گا کہ تم نے جھوٹ بول کر خود کو بلاوجہ ذہنی عذاب میں مبتلا کیا ہے یہ محض ایک اتفاق تھا کہ میں مہمانِ خصوصی کی آواز سن کر محویت سے چونکا تھا اور پھر دل ہی دل میں اپنے کاروباری خسارے کا ملال کرتا رہ گیا۔ اگر تمھاری پریشانیوں کا خیال نہ ہوتا تو میں اب بھی تمھیں یہی مشورہ دیتا کہ استقبالیہ کمیٹی کے سیکریٹری سے رجوع کر کے اپنے بیان کی تصحیح کرا لو۔ ایسے پیچیدہ معاملات میں جھوٹ آخر کار تکلیف دہ ثابت ہوتا ہے۔"

"میری پریشانی؟" غزالہ کی آواز تحیر آمیز تھی "تصحیح کرانے میں کیا پریشانی لاحق ہو سکتی ہے مجھے؟"

"معاملہ خطرناک دھمکیوں کا ہے۔" ڈینی نے کہا "فہرست درست کرا کے تم خواہ مخواہ نگاہوں میں آ جاؤ گی اور پھر سکندر علی نے اگر خوفزدہ ہو کر معاملہ پولیس کے سپرد کر دیا تو وہ سب سے پہلے تم پر اپنی توجہ مرکوز کرے گی اور تم محض اس بنا پر مشکوک سمجھ لی جاؤ گی کہ پہلی بار تم نے جھوٹ بول کر دانستہ ایک نام چھپانے کی کوشش کی تھی۔"

"اوہ میرے خدا!" ریسیور پر غزالہ کے گہرا سانس لینے کی آواز سنائی دی "اس حد تک تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ خیر میں جو کچھ بتا چکی اس میں ترمیم نہیں کروں گی اور آپ بھی بھول جائیں گے کہ اس فنکشن میں آئے تھے۔"

"کس فنکشن کی بات کر رہی ہو؟" ڈینی نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"ارے وہی ہمارے کالج کا بور مذاکرہ۔"

"کب کی بات ہے یہ؟" ڈینی بدستور سنجیدہ رہا اور یکبارگی اس کے کانوں میں جلترنگ بج اٹھے۔ غزالہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

"تو آپ میرے کہتے ہی بھول بھی گئے؟"

"حکم کا بندہ ہوں۔" ڈینی نے ذومعنی سا جواب دیا۔ غزالہ کے بارے میں اس کے دل میں پہلے ہی دن سے ایک نرم سا گوشہ موجود تھا اور وہ اس سے بے تکلفی پیدا کرنے کا یہ موقع گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ اسے تو یہی سوچ سوچ کر خوشی ہو رہی تھی کہ بے دھیانی میں وہ اسے ناراض کیے بغیر آپ کے بجائے تم سے مخاطب کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ "جب چاہو آزما سکتی ہو۔"

"کافی دیر ہو گئی، فون بند کر دوں؟" وہ سنجیدہ ہو گئی۔

"ایک بات تو ہم دونوں بھول ہی رہے ہیں۔" ڈینی نے چونک کر کہا اور "ہم دونوں" کی مٹھاس میں کھو گیا۔

"وہ کیا؟" غزالہ کے استفسار میں باوقار سنجیدگی آ گئی تھی۔

"کہیں عابدہ میرا نام نہ لے بیٹھے۔" ڈینی نے خدشہ ظاہر کیا۔

"وہ اپنی دنیا میں کھوئی رہنے والی ایک بے ضرر سی لڑکی ہے۔ اسے خبر ہی نہیں کہ میں نے کیا لکھوایا ہے، نہ وہ فہرست دیکھے گی، نہ منہ کھولے گی، اس کی طرف سے میں بے فکر ہوں، آپ بھی پریشان نہ ہوں۔"

"اچھا فون نمبر کیا ہے تمہارا؟" ڈینی نے ڈھٹائی کے ساتھ سوال کیا۔

"جب میں خود آپ کو فون کر لیتی ہوں تو اس کی کیا ضرورت ہے؟" سنجیدہ ہو جانے کے باوجود وہ ڈینی کی جسارت پر برافروختہ نہیں تھی۔

"کبھی مجھے بھی ضرورت پڑ سکتی ہے، میرا دل بھی چاہ سکتا ہے بات کرنے کو۔" ڈینی گویا مچل گیا۔

"نمبر بتا بھی دوں گی تو کوئی فائدہ نہ ہو گا۔" اس کا لہجہ استفسار طلب تھا جیسے ڈینی کی زبان سے نمبر جاننے کا کوئی زیادہ بہتر جواز سننا چاہتی ہو۔

"ایسا کوئی نقصان بھی نہ ہو گا، میں بہت شریف اور شائستہ انسان ہوں۔"

وہ شاید بے اختیار ہنس پڑی۔ "مگر میرے ڈیڈی اتنے شائستہ نہیں ہیں کہ آپ کی فرمائش پر مجھے فون پر بلا دیں گے۔"

"میں ایسے وقت فون کروں گا جب وہ گھر پر ہی نہ ہوں۔" ڈینی نے صدقِ دل سے معصومانہ لہجے میں کہا۔ اس خوبصورت سی لڑکی کے لیے اس کا دل موم ہوا جا رہا تھا۔

"وہ ریٹائرڈ کرنل ہیں تنویر صاحب!" وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولی۔ "سارا دن گھر پر رہتے ہیں اور خود ہی فون ریسیو کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔"

"تم نمبر تو بتاؤ، مردانہ آواز سنائی دی تو بولے بغیر فون بند کر دوں گا۔"

"زنانہ آواز سے بات کریں گے؟"

"ظاہر ہے۔" ڈینی نے بلا سوچے سمجھے کہا۔

وہ پھر ہنس پڑی، پہاڑی جھرنوں جیسی رل ترل ڈینی کے کانوں میں گنگنا اٹھی۔ "میری امی بھی نیم فوجی ہیں، اگر آپ سے ذرا بھی لغزش ہو گئی تو مجھے فون کے قریب بھی نہیں پھٹکنے دیا جائے گا۔ اب کم از کم فون کر تو لیتی ہوں۔"

"پلیز غزالہ!" اسے بے تکلفی سے پکارتے ہوئے ڈینی کا دل سینے میں تیزی سے دھڑک اٹھا۔ "تم یقین کرو کہ میری وجہ سے کسی دشواری میں نہیں پڑو گی، میں تمہاری آواز پہچانے بغیر منہ ہی نہ کھولوں گا۔"

اور غزالہ نے اسے اپنا نمبر لکھوا دیا۔

وہ جب تک دفتر میں رہا۔ اس کا رواں رواں خوشی سے سرشار رہا۔ اس کا خیال تھا کہ مبہم کنایوں میں وہ غزالہ تک اپنی بات پہنچانے میں کامیاب ہو گیا تھا جس کا جواب زیادہ حوصلہ افزا نہیں تو مایوس کن بھی نہیں تھا۔ اس کی زندگی میں صنفِ نازک کی وقعت کبھی ایک کھلونے سے زیادہ نہیں رہی تھی۔ پیتے ہوئے وہ اچھی گفتگو ضرور پسند کرتا تھا لیکن استعاروں اور شاعرانہ تعلیوں کا اس نے کبھی سہارا نہیں لیا تھا۔ مائل بہ کرم نگاہوں کو خوب پہچانتا تھا، فقرہ بازی کو پسند کرتا تھا اور پھر انھیں بھول جاتا تھا مگر غزالہ نے اس کی ذات کے کچھ نازک سے گوشوں کو چھیڑا تھا، چاہتے ہوئے بھی وہ اس کے بارے میں محض گوشت پوست کے ایک خوبصورت پیکر کی طرح نہیں سوچ سکا تھا اور اس ابتدا کی انتہا دیکھنے کا تہہ دل سے متمنی تھا۔

دفتر کا وقت ختم ہوا تو وہ وہاں سے کینٹ اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ اسکاچ کا شوقین تھا اور گھر پر اس کا مناسب ذخیرہ رکھتا تھا مگر اس دن گھر پر آخری بوتل زیرِ استعمال تھی جس کے ختم ہونے سے پہلے وہ نیا مال حاصل کر لینا چاہتا تھا۔ جب تک قانونِ امتناع نافذ نہیں ہوا تھا اسے کبھی دشواری نہیں ہوئی تھی۔ شہر کی کسی بھی دکان سے من پسند بوتل خرید لیتا تھا لیکن پابندی کے بعد ذرا الجھن پیدا ہو گئی تھی۔

شراب کی درآمد اور فروخت کی اجازت تھی تو ڈھائی سو روپے میں عمدہ وھسکی کی بوتل مل جاتی تھی جبکہ اس پر درآمدی ڈیوٹی کی شرح بہت زیادہ تھی لیکن سیاسی ہنگاموں میں ڈولتی ہوئی حکومت نے آخری داؤ کے طور پر عوام کی مذہبی ہمدردیاں حاصل کرنے کی کوشش میں امتناعِ شراب کا قانون نافذ کر کے پرانے پاپیوں کی نیندیں اڑا دی تھیں۔ چند روز بازار میں ایسا سناٹا رہا جیسے ولایتی سے دیسی تک کشید کی کا آخری قطرہ بھی نالیوں میں بہا دیا گیا ہو مگر کچھ چور دروازے کھل گئے۔ ڈھونڈنے والوں کو کئے چنے ٹھکانوں سے ملنے لگی۔ سمندر سودے کرنے والے شاید اسی موقع کی تاک میں تھے کراچی کے ساحلوں پر دوسری اشیا کے ساتھ بھانت بھانت کی شرابوں کے کریٹوں سے بھری ہوئی لانچیں آنے لگیں بغیر ڈیوٹی کا مال پہلے سے بھی مہنگے داموں بیچا جانے لگا اور اس پر طرہ یہ کہ گاہکوں کو پسند ناپسند کا بھی اختیار نہ رہا جو ملتی لینی پڑتی۔ کالے کتے کے شوقین سفید گھوڑے بغل میں دبائے پھرتے اور خوش ہوتے کہ کچھ مل تو گیا۔ ساقی خانے ویران ہو گئے، مے کدوں کی محفلیں اجڑ گئیں مگر جو پیے بغیر سو نہ سکتے تھے، ان رندوں نے اپنے گھروں میں ایک گوشۂ خرابات بنا لیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے شہر کی ہنستی، کھنکتی، رنگین سماجی زندگی کو کسی کی نگاہ کھا گئی ہو۔

پینے والے دربدر مارے مارے پھرتے رہے اور پھر ان کے مہربان میدان میں آ گئے۔ اس بار نرخ چار سو سے شروع ہوا اور پھر بڑھتا ہی رہا لیکن کسی کو دم مارنے کی جرأت نہ ہو سکی۔

ڈینی شروع ہی سے مرجینا کا گاہک تھا۔ وہ قوی اعصاب کی مالک ایک ادھیڑ عمر عورت تھی جو کینٹ سے کانٹی نینٹل جانے والی سڑک کے بائیں جانب اپنے وسیع و عریض آبائی مکان کے ایک حصے میں رہتی تھی۔ اس کا شوہر موہن داس بڑا مرنجاں مرنج آدمی تھا۔ گھر میں فرش دھونے سے کھانا پکانے تک سارا کام خود کرتا تھا۔ کوٹھی کے مختلف حصوں میں مقیم کرائے داروں کے ٹپکتے ہوئے نل درانتے ہوئے فیوز بھی درست کر لیتا تھا اور آنے والے گاہکوں کو بھی سنبھالتا تھا۔ وہ لاولد جوڑا کوٹھی کے صرف تین کمروں پر قابض تھا اور بقیہ عمارت کا کرایہ ان کی گزر اوقات کے لیے کافی تھا مگر پھر بھی وہ غیر قانونی مے فروشی کرتے تھے۔ لوگ کہتے تھے کہ مرجینا کو کین کی عادی ہے لیکن ڈینی کو اس سے کوئی غرض نہیں تھی، کبھی کبھار مرجینا اچھے موڈ میں ہوتی تو اسے ایک آدھ پیگ اپنی طرف سے بھی پلا دیتی تھی۔ نجانے اس کے ذرائع کیا تھے کہ بدترین قحط کے زمانے میں بھی اس نے اپنے پرانے گاہکوں کو کبھی مایوس نہیں کیا تھا بس مال روک کر دیتی تھی تاکہ ہر ایک کو کچھ نہ کچھ مل ہی جائے۔

ڈینی نے ویران گلی میں گھومنے کے بعد تیسرے مکان میں کار روک دی۔ اس وسیع و عریض کوٹھی کا وہ سالخوردہ چوبی پھاٹک مرجینا اور موہن کے تصرف میں تھا اور ہمیشہ کھلا رہتا تھا۔ کرائے داروں کی آمد و رفت کے لیے دوسرے تین پھاٹک موجود تھے۔

مرجینا ہمیشہ کی طرح برآمدے میں بید کی کرسی پر براجمان تھی۔ یہ اس کا سدا کا معمول تھا کہ گرمی، سردی اور برسات میں شام چار بجے سے سات بجے تک برآمدے میں ایسے زاویے سے اپنی کرسی پر بیٹھی رہتی تھی کہ اس کی نگاہوں سے بچ کر چوہے کا بچہ بھی کھلے ہوئے پھاٹک کو عبور نہیں کر سکتا تھا۔ یہ اس کی دکانداری کا وقت ہوتا تھا۔ ٹھیک سوا سات بجے دونوں میاں بیوی گھنٹی کا سوئچ آف کر کے اندر سے دروازے مقفل کر لیتے تھے پھر کوئی خواہ عمارت کے داخلی دروازے سے سر ٹکراتا ہی رہے، اندر سے کوئی جواب نہیں ملتا تھا۔

ڈینی انجن بند کر کے پختہ فرش پر چلتا ہوا برآمدے کی طرف بڑھا تو مرجینا نے ورم آلود ہونٹوں پر تھوڑا سا زور دے کر سر کو ہولے ہولے جنبش دیتے ہوئے اس کا استقبال کیا اور جواباً ڈینی بھی مسکرانے لگا۔

"اے موہن!" بڑھیا نے کراری آواز میں اپنے شوہر کو پکارا پھر چند ثانیوں کے بعد سر اٹھا کر دوبارہ دہاڑی۔ "اے موہن! کدھر مر گیا تم؟"

فوراً ہی استخوانی چہرے اور اکہرے بدن والا موہن داس کھیسیں نکالتا ہوا آموجود ہوا۔ اس اثنا میں ڈینی دوسری خالی کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔ "یس سر؟" موہن داس نے کسی مودب خادم کے انداز میں سر کو قدرے خم دے کر کہا۔

"کیا مال ہے؟" ڈینی نے دھیمے لہجے میں سوال کیا۔

"زبردست۔" وہ شہادت کی انگلی کو انگوٹھے سے ملا کر حلقہ بناتے ہوئے بولا۔ اس عمل میں اس کی بائیں آنکھ خود بخود دب گئی تھی۔ "بلیک لیبل، ریڈ لیبل، وھائٹ ہارس، بلیک ڈاگ، شیواز، کوئن این۔ آج سب ملے گا، نیا مال آیا ہے۔"

مرجینا نے اسے ایک گندی سی گالی دی۔ "...... واڈ کا تیرا باپ لے گیا ساری۔"

"مرجینا!" موہن نے کربناک لہجے میں احتجاج کیا۔ "مجھے معلوم ہے کہ ڈینی بابو سفید نہیں پیتا۔"

مرجینا نے دوسری گالی کسی پتھر کو دی ہوتی تو وہ غیرت سے چٹخ گیا ہوتا۔ "ریڈ لیبل لیا ہے کبھی اس نے؟ پھر تو نے اس کا نام کیوں لیا؟"

ڈینی کے لیے وہ کوئی نیا تجربہ نہیں تھا لہٰذا جھگڑے کے طول پکڑنے سے پہلے ہی دخل دے بیٹھا۔ "بلیک ڈاگ کا کریٹ لے آؤ۔"

مرجینا زیرِ لب کچھ بڑبڑاتی رہی، موہن پھرتی سے اندر غائب ہو گیا۔ ڈینی نے جیب سے پچاس کے نوٹوں کی گڈی نکال کر مرجینا کی طرف بڑھا دی۔

"کتنا ہے؟" مرجینا نے گڈی گنے بغیر بے پروائی سے اپنی جیکٹ کی جیب میں ڈالتے ہوئے سوال کیا۔

"پانچ ہزار۔" ڈینی نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"ٹو ففٹی اور مانگتا ہے۔" وہ بولی۔ "کوسٹ گارڈز نے دو

لانچ پکڑ لیا ہے، مال ایک دم مہنگا ہوگیا۔"

ڈینی نے ایک لفظ بھی کہے بغیر پرس نکال کر ڈھائی سو روپے اسے دے دیے۔

"کل پرسوں تک شاید ساڑھے پانچ سو ہوجائے گا۔" بڑھیا نے نوٹ جیب میں اڑستے ہوئے اسے پیشگی اطلاع دی۔ "دونوں لانچوں پر فل لوڈ تھا، مارکیٹ میں مال شارٹ ہونے والا ہے۔ دو تین کریٹ اور لے جاؤ۔"

ڈینی ہنس پڑا۔ "تم سارا دن تو گھر میں گھسی موہن پر برستی رہتی ہو پھر تمھیں مارکیٹ کی خبریں کہاں سے مل جاتی ہیں؟"

مرجینا نے پُرغرور انداز میں اپنے سر کو خفیف سی جنبش دی پھر بولی۔ "ہمارا سپلائر مارکیٹ کا کِنگ ہے، وہ جو بولتا ہے ہو کر رہتا ہے، کل ہم کو ایک کسٹم آفیسر بھی بولا تھا کہ دو چار دن میں پورا کوسٹ سیل ہونے والا ہے۔ وہ بیچارہ ہفتے میں ایک بوتل سے زیادہ نہیں خرید سکتا مگر کل سات بوتل لے گیا ہے۔۔۔"

ڈینی اس کی بات پوری ہونے سے قبل اٹھ گیا کیونکہ موہن اخبار میں لپٹا ہوا گتّے کا وزنی کارٹن اٹھائے باہر آرہا تھا۔ اس نے کارٹن ڈکی میں رکھوایا اور وہیں سے ہاتھ ہلا کر مرجینا کو الوداع کہتا ہوا روانہ ہوگیا۔

گھر پہنچ کر وہ دیر تک نیم گرم پانی کے شاور کے نیچے کھڑا رہا۔ اس کے ذہن میں رہ رہ کر غزالہ کے ہنستے مسکراتے فقروں کی بازگشت گونج رہی تھی اور وہ اپنے وجود میں ایک عجیب سی سنسنی ابھرتی محسوس کر رہا تھا جس سے وہ ابھی تک نا آشنا تھا۔ نہانے کے بعد لباس تبدیل کرتے ہوئے وہ غیر ارادی طور پر گنگنانے لگا مگر خوابگاہ میں آتے ہی وہ چونک پڑا۔ اسے رات میں باس سے بات کرنی تھی مگر اس سے پہلے جہانگیر سے گفتگو کرنی ضروری تھی تاکہ لانڈھی والے واقعے کی مکمل رپورٹ کے علاوہ دوسرے معاملات سے بھی پوری طرح آگاہی حاصل کر سکے۔

اس نے فون پر جہانگیر کا نمبر ملایا تو پہلی ہی گھنٹی پر ریسیور اٹھا لیا گیا مگر ریسیور پر نسوانی آواز سنائی دی جسے وہ فوراً پہچان گیا۔ ڈینی کی حیثیت میں وہ بارہا جہانگیر کی بیوی سے مل چکا تھا اور وہ بھی اس کی اصل آواز پہچانتی تھی۔ تو وہ لاہور سے لوٹ آئی ہے۔ ڈینی نے سوچا پھر بدلی ہوئی آواز میں ریسیور پر جہانگیر کے لیے دریافت کیا۔ وہ ڈینی کی اس آواز کی اہمیت سے یوں واقف تھی کہ جہانگیر اس کی کال سننے کے لیے ہر وقت اپنی ہر مصروفیت ترک کرنے کے لیے تیار رہتا تھا۔

چند ثانیوں بعد جہانگیر لائن پر تھا۔ "یس باس!" اس کی آواز میں چڑھتے ہوئے سانسوں کا آہنگ بھی شامل تھا۔ شاید وہ مکان کے کسی دور افتادہ گوشے سے دوڑتا ہوا فون تک پہنچا تھا۔

"راجو کے اڈے کا کیا رہا؟" ڈینی نے بدلی ہوئی غرّاتی آواز میں براہِ راست سوال کیا اور فوری طور پر اسے خیال آیا کہ اس کے اور باس کے درمیان رابطے کے لیے ٹیلی فون مخدوش تو اس کے اور جہانگیر کے مابین بھی فون پر کھلی کھلی گفتگو خطرناک تھی۔ شہر میں لائنوں کا نظام گڈمڈ ہو رہا تھا۔ ان کی گفتگو میں کوئی بھی تیسرا کراس کنکٹ ہوسکتا تھا اور اگر وہ خاموش رہتا تو ان کے علم میں لائے بغیر پوری گفتگو سن سکتا تھا۔

"ساتوں نے اعتراف کر لیا ہے۔" جہانگیر کہہ رہا تھا۔ "ان کی نشاندہی پر دو ملزم اور پکڑے گئے ہیں۔۔۔"

"اعتراف کر لیا ہے؟" ڈینی تحیر زدہ لہجے میں غرایا۔ "مگر تم تو کہا تھا کہ وہ غیر متعلقہ لوگ تھے؟"

"یس سر!" جہانگیر کی آواز سنائی دی۔ "لاوارث لفنگوں سے کسی بھی قسم کا اعتراف کرانا پولیس کے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل ہوتا ہے، جو پکڑے گئے ان میں سے کسی کی بھی پشت پر مضبوط ہاتھ نہیں ہیں۔ لہٰذا تشدد نے انھیں اعتراف پر مجبور کر دیا۔ ہمارے آدمی محفوظ ہیں، وہ خود بھی اپنے وسائل بروئے کار لے آئے ہیں، پولیس منظم حملے کے بجائے شرابیوں کے باہمی تصادم کے امکانات کی روشنی میں تفتیش کر رہی ہے۔"

"گڈ۔" ڈینی کی غراہٹ تحسین آمیز تھی۔ "میں چاہوں گا تم پس پردہ رہ کر گرفتار ہونے والوں کے گھرانوں کی مالی مدد کرتے رہو، رہائی کے بعد وہ تمھارے اچھے کارکن ثابت ہو سکیں گے۔"

"بازار بالکل مندا ہوگیا ہے سر!" جہانگیر کی جھجکتی ہوئی تشویش زدہ آواز ابھری۔

"کیوں؟" ڈینی کو اس اطلاع پر بلاوجہ ہی غصہ آگیا جیسے بازار کی مندی میں جہانگیر ذاتی طور پر قصور وار ہو۔

"بلیک گولڈ سر!" جہانگیر کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔ "حالانکہ نئے مال کی رپورٹ بہت حوصلہ افزا ہے۔ آج سول اسپتال میں ایک رکشا ڈرائیور حادثے کے بعد داخل ہوا ہے، وہ چار دن لے رہا تھا۔ آج اسپتال میں ہونے کی وجہ سے ڈوز نہ لے سکا حالت غیر ہوگئی، سنا ہے کہ ڈاکٹر خود اسے ڈوز دینے پر مجبور ہوگئے۔"

"اچھی خبر ہے لیکن یہ اثرات تو تمھیں پہلے ہی بتا دیے گئے تھے۔"

"جی بلیک گولڈ کے ٹریفک کی روک تھام کے لیے انٹرنیشنل نارکوٹکس کنٹرول بورڈ کا ایک وفد ان دنوں شہر میں آیا ہوا ہے۔" جہانگیر بتا رہا تھا۔ "اس کے سربراہ ڈاکٹر ولسیلر نے بھی آج اس مریض کو دیکھا اور بعد میں اخباری نمائندوں پر اپنی تشویش کا اظہار کیا کہ شاید ڈائی ایسی ٹائل مارفین بھی آخر کار کراچی کے زیرِ زمین بازار میں آگئی ہے۔ ڈاکٹر ولسیلر نے اسے بدترین خطرے کی گھنٹی قرار دیا ہے۔"

ڈینی ہنسا تو اس کی آواز میں درندگی نمایاں تھی۔ "سنو! یہ سب بے کار لوگ ہیں، آتے جاتے رہیں گے مگر فائلیں موٹی کرنے کے سوا کچھ نہ کر سکیں گے۔ یہ اچھا ہوا کہ اس نے پریس کانفرنس کر ڈالی، اس کے بیان کی اشاعت سے تشہیر ہوگی اور جو لوگ ابھی تک اس سرور سے نا آشنا ہیں، وہ بھی اس کی تلاش میں نکل کھڑے ہوں گے۔ کیا اس کا بیان کسی اخبار میں چھپا ہے؟"

"نہیں سر! یہ ابھی شام کا واقعہ ہے۔ شاید صبح کے اخبارات میں آجائے، آج شام کے اخبارات میں تو بس رکشے کے حادثے کی خبر ہے۔"

ڈینی نے فون بند کر دیا اور اسکاچ کی بوتل لے بیٹھا۔ دنیا کا چکر ہی کچھ عجیب تھا۔ ہلکے سے سرور کے عالم میں اس نے سوچا۔

فکر اور نشہ۔ جدید مشینی دور کی بس یہی ایک پہچان رہ گئی تھی۔ ورنہ قتل و غارت گری سے چوری اور بے ایمانی تک سارے ہی واقعات پتھر کے عہد سے اس خلائی دور تک ہوتے ہی چلے آرہے تھے اور آج بھی شہروں کے ہنگاموں سے دور، لہلہاتے کھیتوں میں گھری ہوئی دیہاتی آبادیوں میں جہاں جدید تہذیب کے قدموں کی چاپ نہیں گونجی تھی، جہاں کے نیلے نیلے صاف آسمان کو ملوں کی دھواں اگلتی چمنیوں نے نہیں دھندلایا تھا، جہاں کے غبار آلود اور کچے راستوں کی سوندھی خوشبو میں تیل اور ڈیزل کی کثیف بدبو شامل نہیں ہوئی تھی وہاں بھی گندم، کپاس، گنّے اور جوار کی قد آدم فصلوں میں عزت، غیرت، عیش و عشرت اور پھر قتل و غارت کے واقعات روز ہی رونما ہو رہے تھے۔ دشمنیاں بھی خوب پروان چڑھ رہی تھیں، کھڑی فصلوں کو آگ لگائی جاتی تھی، مکینوں کو اندر بند کر کے مکان کا محاصرہ کر کے آگ لگا دی جاتی تھی اور پھر اس وقت تک آسمان کی طرف گولیاں چلائی جاتی تھیں جب تک مکان کا ایک بھی تنکا راکھ ہونے سے بچ رہتا یا کوئی آواز جلتے اور سلگتے ہوئے ملبے میں سسکتی رہتی، مویشی بھی آئے دن کھولے جاتے اور غفلت کا تاوان لے کر لوٹائے جاتے تھے۔ کمی تھی تو ان دیہاتوں میں دو ہی چیزوں کی تھی۔ فکر اور نشہ۔ کوئی دہقان فکر کا روگ نہیں پالتا تھا، غیرت نے جوش مارا تو لاٹھی، کلہاڑی، رائفل یا کچھ نہ ملا تو زورِ بازو کے بل پر گھر سے نکلا، دشمن کو للکارا، موت کی نیند سلایا اور خود تھانے جا پہنچا یا گھر آکر گہری نیند سو گیا۔

مگر یہاں پُراسرار باس کو اپنی ذات چھپائے رکھنے کی فکر تھی، اپنا مال بیچنے اور پیسہ کمانے کی فکر تھی، ڈینی کو سکندر علی کی فکر تھی، اسے بے نقاب کر کے خود سربراہی سنبھالنے کی فکر تھی، جہانگیر کو ہیروئن کی مندی کا روگ لگا ہوا تھا، مرجینا کو شاید زیادہ مقدار میں آئی ہوئی واڈکا اپنے گاہکوں کے سر تھوپنے کی فکر تھی، ڈاکٹر ولسیلر بے چارہ عالمی فکروں میں گھلے جا رہا تھا، بھاگ بھاگ کر ہلکان ہو رہا تھا اور ہر ایک کو ان تفکرات سے چھٹکارے کے لیے خود فریبی کا سہارا درکار تھا۔ چند ایسے لمحوں کی طلب تھی جن میں نہ کوئی دکھ ہو نہ فکر۔ انسان بس اپنی ذات کے خول میں بند مسرت، انانیت اور لذت کے سمندر میں غرق رہ سکے، عملی زندگی میں نہ سہی تو بھرپور تصور ہی میں اپنے دل کے ارمان نکال سکے۔ یہ ڈینی کا ایمان تھا کہ اگر چنڈو، مدک، گانجے، افیم، کوکین، ہیروئن اور چرس کے دم لگانے والے مفلسوں کی مخمور نگاہوں میں رقصاں تصورات کی عکس بندی ممکن ہو تو وہ سب ان خوفناک آسیبوں سے نبرد آزما نظر آئیں جو عالمِ ہوش میں ان کے جسموں اور دماغوں کو خونی جونکوں کی طرح تباہ کرتے رہتے ہیں۔ کوئی اپنے ولی نعمت کی چڑھی ہوئی تیوریوں کو اپنی ایڑیوں سے رگڑتا نظر آئے تو کوئی اپنے سیٹھ کے پُرجلال چہرے پر پھٹی ہوئی جوتیاں برساتا نظر آئے۔

ڈینی ان مفلسوں کو عملی نہ سہی تصوراتی تسکین پہنچانے کا بندوبست فراہم کرتا تھا، وہ پہلے چرس اور اب ہیروئن بیچ کر کماتا تھا اور خود شراب کا نشہ کرتا تھا، مرجینا اس کے لیے شراب بیچتی تھی اور خود کوکین کھاتی تھی۔ بالکل گول چکّر تھا جس کا نہ کوئی آغاز تھا نہ انجام۔

تیسرا ڈبل پیگ معدے میں تہ نشین ہوا تو ڈینی کو جہانگیر کی تشویش یاد آئی، ہیروئن کو بازار میں آئے چند ہی روز ہوئے تھے اور وہ ابھی سے اس کے لیے فکرمند تھا۔ احمق نے ذرا بھی سوچا ہوتا تو اپنی گونگی اور بے جان ہیروئن کا کسی چہکتی ہوئی نئی ہیروئن سے ہی موازنہ کر لیتا جو ادائیں دکھا سکتی ہے، اپنے خواص خود گنوا سکتی ہے، ابرو کی جنبش، نگاہوں کے اشارے، ہونٹوں کی مسکان، زبان کی شوخی، سراپا کا نکھار، بالی عمریا کی مار، سانسوں کے آہنگ، رخساروں کے رنگ۔ غرض ہزار مورچوں سے وار کر سکتی ہے مگر وہ بھی فوراً کامیاب نہیں ہوتی، چکھے اور پرکھے بغیر تو کوئی بھی کسی نشے کو نہیں اپناتا۔ ڈینی کو یقین تھا کہ ہیروئن ضرور کامیاب ہوگی کیونکہ اس کا نشہ تیز تھا کسی کمسن ہیروئن کی طرح۔ عام لوگ تو بیچارے اتنے سادہ لوح ہوتے ہیں کہ پردے پر ہیروئن کا ناچتا تھرکتا عکس دیکھنے کے لیے بخوشی دس بیس روپے خرچ کر آتے ہیں۔ تو بھلا وہ ایسی ہیروئن کیوں نہ خریدتے جو ہر طرح ان کے

تصرف میں ہوتی۔

اس نے ڈھکن ہٹا کر بوتل سے گلاس بھرنا چاہا لیکن بوتل الٹی ہوگئی اور اس میں سے کچھ برآمد نہ ہوا۔ وہ بوتل قالین پر لڑھکا کر آپ ہی آپ مسکرا دیا۔ "چڑھ گئی ہے ڈینی بیٹے" اس نے سوچا۔ "اب بس کرو ورنہ۔۔۔"

اس سے آگے سوچتے ہی وہ بوکھلا گیا۔ کچھ دیر بعد اسے باس سے بات کرنی تھی لیکن اس وقت حواس میں ہونے کے باوجود وہ اپنے بارے میں زیادہ پُراعتماد نہیں تھا کیونکہ اسے یاد آگیا تھا کہ وہ احمقانہ طور پر دو ہیروئنوں کا موازنہ کرنے بیٹھ گیا تھا۔

وہ سگریٹ سلگا کر اٹھا اور باہر آگیا۔ میز تیار تھی اسے دیکھتے ہی سالنوں کی ڈشیں بھی لگا دی گئیں، اور وہ کھانا کھانے بیٹھ گیا۔ اچار اس نے نہایت فراخ دلی سے اپنی پلیٹ میں ڈالا تھا۔ پینے کے معاملے میں وہ بہت گھاگ تھا نشے کو اڑانے اور بڑھانے کے رموز سے اچھی طرح واقف تھا۔ کھانا کھا کر اٹھا تو کھویا ہوا اعتماد بحال ہوچکا تھا، بس سر میں گرانی کا ہلکا سا احساس باقی تھا۔

باہر شاید چوکیدار ریڈیو سن رہا تھا جس پر کوئی لوچدار آواز غزل سرا تھی۔ وہ ٹہلتے ہوئے سُننے لگا۔ غزل کے بعد ایک تقریر شروع ہوئی تو وہ خوابگاہ میں لوٹ آیا لیکن ہلکے ہلکے سرور میں ڈوبے ہوئے ذہن میں حسرت بھری آواز میں گاتے ہوئے چار مصرعے مسلسل گونجتے رہے۔

کاش ایسا ہو کہ اب کے بے وفائی میں کروں
تُو پھرے قریہ بہ قریہ، کُو بہ کُو میرے لیے
میں تو لامحدود ہو جاؤں سمندر کی طرح
تُو بہے دریا بہ دریا، جُو بہ جُو میرے لیے

بہت اچھوتا خیال تھا مگر دوسرے ناتے ذہن کے لیے بس خیال ہی تھا۔ وہ سوچ رہا کہ کسی ملاقات میں موقع پیدا کرکے یہ شعر غزالہ کو ضرور سُنائے گا۔

مقررہ وقت پر اس نے ٹرانسمیٹر ریسیور آن کیا تو خلافِ توقع چند ہی ثانیوں بعد اسے باس کی مخصوص غنودہ آواز سنائی دی۔

ڈینی نے کال اکنالج کرنے کے بعد باس کا اشارہ ملتے ہی اپنی رپورٹ شروع کردی۔ گلشنِ اقبال والی عورت کی بے تکلفی کا تذکرہ دانستہ گول کر گیا۔

"مجھے خوشی ہے کہ تم پہلے امتحان میں کامیاب ہوگئے۔۔۔ اوور۔" ڈینی کی بات مکمل ہونے پر باس کی آواز ابھری۔

"کون سا امتحان سر؟ اوور۔" ڈینی نے حیرت سے سوال کیا۔

"اس نے ہدایات کے مطابق تمھیں الجھانے کی کوشش مگر تم بچ نکلے۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ تم ترغیب سے کس حد سکتے ہو کیونکہ اب تمھیں ایک اہم کام دیا جانے والا ہے، میں عورت سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہوتی ہے۔ خیر بعد میں ہوگی، پہلے رپورٹ مکمل کرو۔۔۔ اوور۔"

ڈینی نے جہانگیر سے ملی ہوئی معلومات دُہرانی شروع راجو کے اڈّے پر قتل، آتش زنی، گرفتاریوں اور اعترافات سول اسپتال میں رکشہ ڈرائیور کے داخلے اور ڈاکٹر ولسیلر کے ذکر چھیڑ دیا۔

"تم بہت اچھے جارہے ہو۔" باس واقعی اس پر مہرباں "ڈاکٹر ولسیلر کل واپس جارہا ہے، اگر چند روز یہاں رکتا تو ایسا اسکینڈل کھڑا کرتا کہ ہیروئن کا نام ایک دم ہر طرف گو چاہو تو اب بھی کوشش کرسکتے ہو کہ اس کے سامان میں ہزار گرام ہیروئن پہنچا دو اور پھر کلکٹر کسٹم کو کسی پبلک بوتھ سے فو ڈاکٹر ولسیلر کی یہ ناکام کوشش ساری دنیا کے اخبارات میں نما میں جگہ پائے گی۔۔۔ اوور۔"

"میں کوشش کروں گا سر!" ڈینی نے دھڑکتے دل کہا۔ "لیکن ایسی کوشش کے بعض اثرات ہمارے لیے بد ہوسکتے ہیں۔ ڈاکٹر ولسیلر یونیسکو کا آدمی ہے اور اسے بہتیری م حاصل ہوں گی۔۔۔ اوور۔"

"ہوں۔" دوسری طرف سے پُرخیال لہجے میں کہا گیا۔ اعتماد کا اہل ثابت کرتے جارہے ہو، تمھارا خیال درست ہے بھی ہے کہ داؤ الٹ جائے اور مقامی حکّام پوری قوت سے کی بیخ کنی پر تُل جائیں۔ سوئے ہوئے شیر کو جگانا کسی بھی طرح ثابت نہ ہوسکے گا۔۔۔ اوور۔"

"شکریہ سر!" ڈینی کا سینہ خوشی سے پھول گیا۔ پُراسرار اس کے لیے لاکھ ناپسندیدہ سہی لیکن تھا اس کا باس ہی اور زبان سے نکلے ہوئے داد وتحسین آمیز کلمات بھی اس کے لیے رکھتے تھے۔ "لیکن فوری توجہ کا طالب یہ امر ہے کہ چرس بازا آتے ہی ہیروئن کی اٹھان گر گئی ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے شروع کرنے والوں نے چرس کی افراط ہوتے ہی دوبارہ لے لیا ہے۔ اوور۔"

"اس کا مجھے پہلے سے اندازہ تھا۔ اس کے لیے تمھا ساتھیوں کو ذرا آگے بڑھنا پڑے گا۔" غنودہ آواز پُرسکو "ہمارے سامنے صرف تین نشانے ہیں۔ چرس، شراب اور دیسی تمھیں ان کے خلاف میدان میں آنا پڑے گا۔۔۔ اوور۔"

"میں سمجھا نہیں سر! اوور۔" ڈینی نے حیرت کے ساتھ کہا۔

"پولیس اور آبکاری کے محکموں میں اب بھی ایماندار افسر موجود ہیں۔ تمھارے ساتھی ان سے تعاون کریں گے۔ چرس، شراب اور دیسی نشوں کے بارے میں خود گمنام رہ کر مخبری کریں گے اور پے پے چھاپے پڑوائیں گے۔ اسی طرح میدان صاف ہوسکے گا۔ اوور۔"

ڈینی کے ذہن میں بے اختیار موہن داس کی مظلوم صورت اور مرجینا کا بُجھا ہوا چہرہ ابھر آیا۔ "بڑی انوکھی تدبیر ہے سر! ڈھنگ سے کام کیا گیا تو چند ہی روز میں میدان صاف ہوجائے گا۔ مگر ایک بات میرے ذہن میں مسلسل کھٹک رہی ہے۔۔۔ اوور۔"

"ادھوری بات مت کیا کرو۔" تادیبی لہجے میں کہا گیا۔ "کیا الجھن ہے تمھیں؟"

"میری اور جہانگیر کی گفتگو سن لیے جانے کا امکان ہے۔" ڈینی نے پژمُردہ لہجے میں کہا۔ نرم سی پھٹکار سُن کر چند ثانیے پہلے ابھرنے والا سارا جوش پل بھر میں کافور ہوگیا تھا۔ "نئے پروگرام کی بھنک بھی کسی غیر متعلقہ آدمی کے کانوں میں پڑ گئی تو ہم دشواریوں میں پڑ جائیں گے۔۔۔ اوور۔"

"میں فوری طور پر تنظیم نو کر رہا ہوں، نیا کام روایتی طریقے پر نہ چل سکے گا۔ آج شام جیوا ہاؤز میں تمھارے نام ایک دستی پارسل پہنچا ہے جس میں دو ٹرانسمیٹر ریسیور موجود ہیں۔ ان میں سے ایک تمھارے پاس رہے گا، دوسرا جہانگیر کے پاس، اسی قسم کا تیسرا آپریٹس میرے پاس ہے۔ ایک آپریٹس پر نشر کیا جانے والا پیغام بیک وقت بقیہ دو آدمی سن سکیں گے۔ آئندہ پیغام رسانی اسی ذریعے سے ہوگی۔ تمھارا کوڈ بدستور ڈی ون رہے گا، جہانگیر ڈی ٹو کہلائے گا اور میری شناخت بی فور ہوگی، اس طرح میں براہِ راست بھی ڈی ٹو کو ہدایات جاری کرسکوں گا۔ پارسل میں ایک چھپا ہوا بروشر بھی ہے، بقیہ تفصیلات کے لیے اسے غور سے پڑھ لینا۔۔۔ اوور۔"

"اور موجودہ آپریٹس کا کیا ہوگا سر؟ اوور۔" ڈینی نے سوال کیا۔

"وہ صرف میرے اور تمھارے درمیان رابطے کے لیے ہے وہ الگ فریکوئنسی پر کام کرتا ہے اور اس پر ہونے والی گفتگو کوئی اور نہیں سن سکے گا، ہاں، اب یہ بتاؤ کہ تم نے بریف کیس کا جائزہ لے لیا تھا؟ اوور۔"

"یس سر!" ڈینی نے جلدی سے کہا۔ "لیکن میں ان کاغذات سے کوئی نتیجہ اخذ نہیں کرسکا۔ اوور۔"

"ایشین سنڈیکیٹ لمیٹڈ دستکاری کی اشیا کا ایک برآمدی ادارہ ہے جس کے کاروباری روابط انگلینڈ، یورپ اور امریکہ تک پھیلے ہوئے ہیں۔ تم اس فرم کے نمائندے ہو۔ گرے کلاتھ ہیروئن کے لیے ایک خفیہ نام ہے۔ ایمسٹرڈم کی فرم نمونہ دیکھ کر آرڈر کنفرم کرے گی۔ وہ فرم بھی دراصل ہالینڈ اور اٹلی کی ایک مشترکہ سنڈیکیٹ کی ملکیت ہے۔ اس کے نمائندے سے ایک میٹنگ میں تمھیں معاملات نمٹانے ہیں۔۔۔ اوور۔"

"میں تیار ہوں سر! اوور۔" مقامی دھندے سے بین الاقوامی سودوں میں اختیارات ملنے کی اطلاع نے اس کے بدن میں سنسنی کی لہریں دوڑا دی تھیں۔

"پرسوں صبح کے ایل ایم کی ایمسٹرڈم سے براہ لندن آنے والی پرواز پر تمھیں ٹوکیو کے لیے سفر کرنا ہے۔" باس اسے بتا رہا تھا۔ "پوری مہم میں تم باریک دستانے استعمال کرو گے۔ تاکہ کہیں بھی تمھاری انگلیوں کے نشانات باقی نہ رہیں۔ سفر کے لیے تم ایسا سوٹ منتخب کرو گے جس کے ساتھ گہرے نیلے رنگ کی سادہ ٹائی پہن سکو اور اس پر تم بکرے کی شکل والا نقرئی ٹائی پن لگاؤ گے۔ فرسٹ کلاس میں موجود ایجنٹ ٹائی کے رنگ اور ٹائی پن سے تمھیں پہچان کر خود تمھاری طرف متوجہ ہوگا اور تم سے تمھاری داہنی پنڈلی کے فریکچر کے بارے میں دریافت کرے گا، تم اسے آپریشن کے نتیجے میں صحت یابی کی اطلاع دو گے۔ اس ابتدائی شناخت کے بعد تم کو وہ اپنا مصدقہ شناخت نامہ دکھائے گا جس پر اس کی تصویر اور اس کی فرم کی مہر ہوگی۔ تم پولی تھین کی سربمہر تھیلی اسے دے دو گے۔ وہ بنکاک میں اتر جائے گا اور تم ٹوکیو اترو گے۔ اگلے دو تین روز میں وہ ٹوکیو پہنچ کر تم سے ملے گا اور ضروری نکات کی وضاحت کے بعد گرے کلاتھ کی گانٹھوں کا باقاعدہ تحریری آرڈر دے دے گا۔ بس یہ یاد رکھنا کہ دام انھیں بتائے جاچکے ہیں جس میں کمی بیشی کا تمھیں کوئی اختیار نہیں ہے بقیہ معاملات میں تم آزاد ہوگے۔ ٹوکیو ایئرپورٹ پر تم گروپ ٹورز آرگنائزرز نامی ادارے کے کاؤنٹر پر سوکوموتو نامی شخص سے رجوع کرو گے۔ تمھارا شناخت نامہ دیکھنے کے بعد وہی تمھاری رہائش کا بندوبست کرے گا، اپنی ضروریات کے لیے تم اس پر آنکھیں بند کرکے اعتماد کرسکو گے۔۔۔ اوور۔"

"او۔کے سر! میں فوری تیاری شروع کردیتا ہوں۔ جہانگیر کے لیے ٹرانسمیٹر جیوا ہاؤز ہی میں چھوڑ دوں گا۔ بلکہ آپ اجازت دیں تو اب میں کسی گمنام آدمی کا ڈھونگ ختم کرکے جہانگیر سے اپنی اصل آواز میں گفتگو کرنی شروع کردوں؟ اوور۔"

"نہیں۔" سخت لہجے میں کہا گیا۔ "تنظیم کو ماتحتوں کے لیے حتی الامکان پیچیدہ بنائے رکھو، تمھاری دوہری شخصیت ہر لحاظ سے سودمند رہے گی لیکن یہ یاد رکھنا کہ ڈی ون، بی فور کا ماتحت اور ڈی ٹو کا افسر ہے۔۔۔ اوور۔"

"او۔کے۔ سر!" ڈینی نے دھیمی آواز میں کہا۔ "آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اسے مجھ پر ذرا بھی شبہہ نہیں ہے۔ جب میں اپنے

سامنے کہی ہوئی باتوں پر سربراہ کے طور پر اسے تادیب کرتا ہوں تو وہ بوکھلا جاتا ہے اور اب تو شاید وہ اپنے سائے سے بھی محتاط رہتا ہے ... اوور۔"

"تم خود ذمے دار آدمی ہو، اچھی بری باتوں کو سمجھتے ہو، آئندہ چھوٹے موٹے مسائل اپنی صوابدید کے مطابق حل کرسکتے ہو، اہم معاملات میں مجھ سے مشورہ کرسکوگے اور ہاں طارق سے اب ہر ایک کو دور ہی رکھو، مجھے شبہ ہے کہ وہ کسی کی نگاہوں میں آگیا ہے۔ اوور اینڈ آل۔"

آپریٹس بے جان ہوگیا۔ ڈینی نے اس کا سوئچ آف کردیا۔ طارق کے بارے میں آخری ہدایت سن کر وہ پریشان ہوگیا تھا۔ اگر باس کا خدشہ درست تھا تو طارق کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی تھی۔

❁

جہانگیر نے باس سے تو کہہ دیا تھا کہ راجو کے اڈے پر حملے اور اس کے بھائی کے قتل کے سلسلے میں گرفتار ہونے والوں کے اعتراف کے بعد اس کے آدمی محفوظ ہوگئے تھے لیکن خود اس کا دل مطمئن نہیں تھا۔ اس نے اپنا دل لاکھ ٹٹولا لیکن اپنی بے اطمینانی کا کوئی جواز نہ پاسکا۔

راجو کی طرف سے اسے یقین تھا کہ وہ حملہ آوروں کے بارے میں سختی سے اپنی زبان بند رکھے گا۔ وہ اپنے علاقے کا نوجوان اور ابھرتا ہوا بدمعاش تھا جسے اپنے زور بازو پر بہت ناز تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بار بار کی تنبیہہ کے باوجود وہ قحط کے دنوں میں چرس فروشی میں ہاتھ ڈالنے سے باز نہ آیا۔ شاید وہ اپنے اڈے پر حملہ آور ہونے والوں سے بخوبی واقف تھا لیکن پولیس کے سامنے ان کے نام ظاہر کرکے زیر زمین دنیا میں اپنی جگ ہنسائی نہیں کرانا چاہتا تھا۔ جرائم کی دنیا میں یہ ایک لگا بندھا اصول تھا کہ آپس کے اختلافات ہر حال میں خود ہی طے کیے جائیں، تصادم کی نوبت آتی تو فضا اس وقت تک بارود اور انسانی لہو کی بو سے رچی رہتی جب تک پولیس جائے واردات پر نہ پہنچ جاتی اور اس کے آتے ہی فریقین رضاکارانہ جنگ بندی کرکے میدان سے بھاگ لیتے۔ اگر ایک آدھ زخمی پولیس کے ہاتھ لگ بھی جاتا تو سراسر لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے خود کو فساد کی زد میں آیا ہوا بے گناہ راہگیر ثابت کرتا اور یوں پولیس کو باہمی رقابتوں سے دور رکھ کر سارے جھگڑے آپس میں نمٹائے جاتے تھے۔

فکر کی ایک موہوم سی وجہ یہ ہوسکتی تھی کہ پولیس ان ساتوں کے اعتراف کی اصلیت سے واقف تھی۔ افسران خوب جانتے تھے کہ متفرق مقامات سے گرفتار ہونے والوں نے محض ہولناک تشدد سے اپنی جان بچانے کے لیے اقبال جرم کیا تھا۔ ایسے میں اگر کوئی محنتی آڑے آجاتا تو اپنے طور پر تفتیش جاری رکھتے ہوئے اصل مجرموں کی ٹو لگا رہتا مگر متعلقہ علاقے میں ہر ایک نے ہی اقبال جرم کے ساتھ فائل پراسیکیوٹنگ برانچ کو بھجوانے میں عافیت سمجھی تھی۔

پھر بھی جہانگیر فون پر گفتگو ختم ہوتے ہی گھر سے نکل

"کہاں جارہے ہو؟" اسے روانگی پر آمادہ دیکھ کر ا بیوی نے سوال کیا تھا۔

"ایک ضروری کام ہے۔" جہانگیر نے اسے سمجھاتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تھوڑی دیر میں لوٹ آؤں گا۔"

"فون پر کس سے بات ہوئی تھی تمھاری؟" اس نے بار اس پراسرار فون کے بارے میں سوال کیا۔

"ایک دوست تھا۔" جہانگیر نے موضوع کو وہیں ختم ک کے لیے بات بنائی۔

"میں نہیں مان سکتی۔" اس نے بے یقینی سے کہا "دو سے یوں ادب سے سر کہہ کر بات نہیں کی جاتی۔ وہ جب بھی کرتا ہے، تم معلق ہوجاتے ہو۔"

جہانگیر خفت آمیز انداز میں ہنس پڑا۔ "ارے بھئی دو جگہ ہے، دراصل وہ ایک اہم افسر ہے۔ ذرا خوشامدی واقع ہے لہٰذا میں بھی اسے مکھن لگالیتا ہوں۔"

"میں فون اٹھاتی ہوں تو ایسے خشک لہجے میں غرا کر با کرتا ہے جیسے تمھیں اپنا زر خرید سمجھتا ہے۔ میں نے آج ... تک اپنی زبان بند رکھی لیکن آئندہ میں یہ سب برداشت نہیں گی اس سے کہو کہ گھر فون نہ کیا کرے۔" وہ شاید کافی دنوں بھری بیٹھی تھی۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو، میں کوشش کروں گا کہ وہ گھ نہ کرے، مگر خدا کے لیے تم اس سے کوئی بدتمیزی نہ کر بیٹھنا

"مجھے آئے ہوئے تیسرا دن ہو رہا ہے لیکن تمھیں ا تک فرصت نہیں ملی ہے۔ بس یہ یاد رکھنا۔" اس کی بیوی غ لہجے میں یہ کہتی ہوئی وہاں سے چلی گئی اور وہ وہاں سے روانہ

اس کا رابطہ قاسم بھائی تک محدود تھا۔ شہر کے مضافا علاقوں میں مال کی تقسیم کا کام وہی سرانجام دیتا تھا۔ قاسم بھ کھارادر میں اپنے ٹھکانے پر موجود تھا۔ جہانگیر کو دیکھتے ہی اس طرف آیا اور جہانگیر اسے گاڑی میں بٹھا کر ٹاور کی طرف ہولیا

"غلام قادر کو کچھ دن کے لیے پنجاب بھیج دو۔" قاسم بھا کے استفسار پر جہانگیر نے اپنا مدعا ظاہر کیا۔

"مگر کیوں؟" قاسم بھائی نے حیرت سے پوچھا۔ "وہ سا ادھر اپنے فلیٹ میں آرام سے رہتا پڑا ہے، پولیس کا باپ بھی ا

پہنچ سکتا پھر تم کیوں اس کا فکر کرتا ہے سیٹھ؟ ابھی اس کا ملہ میرے اوپر چھوڑ دو۔ ذرا بھی گھٹالا ہووے تو بس میری گردن دینا۔"

ویران سڑکوں پر بے مقصد ڈرائیونگ کرتے ہوئے جہانگیر نکل اسے آمادہ کرسکا کہ وہ اگلی صبح کی پہلی پرواز سے غلام قادر لاہور روانہ کردے تاکہ معاملہ ختم ہونے تک اطمینان رہے کیونکہ م قادر ہی راجو کے اڈے پر حملہ کرنے والوں کا سرغنہ تھا۔

پھر قاسم بھائی اسے مندی کا رونا سناتا رہا۔ اس کا اصرار تھا مرف ہیروئن کے بجائے چرس کا دھندا بھی ساتھ ساتھ جاری جائے تاکہ کارندے بھی دو پیسے کماتے رہیں اگر ایک مرتبہ آدمی گئے تو انھیں یکجا کرنے میں دانتوں پسینہ آجائے گا۔ جہانگیر مفروضہ اسکیم کے سہانے خواب دکھاتا رہا اور پھر اسے اس کے کانے پر اتار کر واپس ہولیا۔

گھر پہنچ کر کھانے سے فراغت کے بعد وہ روٹھی ہوئی ی کی دلجوئی میں مصروف ہوگیا۔ کھانے سے فارغ ہونے بعد وہ دونوں خوش گپیوں میں مصروف تھے تو ناگہانی فون گھنٹی چیخنے لگی اور جہانگیر نے بیوی سے پہلے لپک کر فون اٹھالیا سری طرف سے ڈینی کی آواز سن کر جہانگیر کا منہ بن گیا۔ "کہو بات ہے؟"

"انگارے چبا رہے ہو، معلوم ہوتا ہے کہ بھابی سے پھٹکار ن کر بیٹھے ہو۔" ریسیور میں ڈینی کی معنی خیز آواز ابھری۔

"میں ذرا مصروف ہوں اس وقت۔" جہانگیر نے کنکھیوں سے ی کی طرف دیکھتے ہوئے قدرے بلند آواز میں کہا۔ "اگر کوئی خاص م نہ ہو تو میں صبح فون کرلوں گا۔"

"فوراً جیوا ہاؤز چلے آؤ، میں یہیں تمھارا منتظر ہوں۔" ڈینی آواز اسے زہر محسوس ہونے لگی۔

"کل پر رکھ لو، اس وقت میں شہر کی خاک چھان کر ابھی ا ہوں۔" اس نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔

"اوپر کا حکم ہے، باز پرس ہوئی تو تمھارا عذر دہرا دوں گا۔" ینی کی سپاٹ آواز آئی۔

"اچھا، میں آرہا ہوں۔" جہانگیر نے شکست خوردہ لہجے ں کہا اور ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔

"اب کہاں جارہے ہو؟" اس کے کانوں میں بیوی کی تلخ واز آئی، شاید اس نے جہانگیر کا آخری فقرہ سن لیا تھا۔

"ایک پارٹی کا فون تھا۔" وہ بے بسی سے بیوی کی طرف یکھتے ہوئے جھوٹ بولا۔ "کچھ کاغذات پر میرے دستخط ہونے رہ ئے ہیں اور وہ لوگ صبح لاہور جارہے ہیں ورنہ میں تو معاملہ کل پر ٹال رہا تھا۔"

"دیکھو جہانگیر!" اس کی بیوی اپنی جگہ چھوڑ کر اٹھ گئی اور سنجیدہ لہجے میں کہنے لگی۔ "ہماری شادی کو ایک سال ہونے والا ہے اور اس دوران میں تمھاری مصروفیات میرے اور تمھارے درمیان خلیج سی بنی رہی ہیں، تمھارے پاس خدا کا دیا سب کچھ موجود ہے پھر تم اس قدر الجھے الجھے کیوں رہتے ہو؟ تمھارے بغیر یہ گھر مجھے کھانے کو دوڑتا ہے مگر تم گھر میں ٹکتے ہی نہیں۔"

"رفتہ رفتہ سب ٹھیک ہوجائے گا ڈارلنگ!" وہ زبردستی مسکرایا۔ "تم گھر میں اکیلی تو نہیں رہتیں ..."

"ملازموں کو میں اپنی تنہائی کا ساتھی نہیں بناسکتی۔" وہ جہانگیر کی بات کاٹ کر تنک کر بولی۔ "ان سے دل کی بات نہیں کرسکتی، ان کے ساتھ گھومنے نہیں جاسکتی، آخر تم یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ تم پر۔ تمھارے وقت پر میرا بھی کچھ حق ہے۔"

"میں سب کچھ سمجھتا ہوں سلمیٰ!" وہ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر نرم اور شکست خوردہ لہجے میں بولا۔ "لیکن برسوں کے معمولات دھیرے دھیرے ہی تبدیل ہوں گے، تمھیں اندازہ نہیں ہے کہ میری ذات کن گورکھ دھندوں میں الجھی ہوئی ہے۔"

"مجھے اندازہ نہیں تھا کہ پردیس میں بیاہنے کے بعد میں اس قدر تنہا ہوجاؤں گی۔" وہ اپنا منہ دوسری طرف پھیر کر رندھی آواز میں بولی۔ "مگر خیر۔ مجھے تم سے بھی کوئی شکایت نہیں ہے میں اس وقت کا انتظار کروں گی جب تم سونے کے علاوہ بھی گھر کی کچھ افادیت سمجھنے لگو گے۔"

وہ اندر چلی گئی اور جہانگیر بھاری قدموں سے چلتا باہر نکل آیا۔ وہ سلمیٰ کو کیسے بتاتا کہ اپنے وقت کے استعمال میں وہ خود آزاد نہیں ہے، اس کا لمحہ لمحہ اس غراتی ہوئی آواز کے اختیار میں ہے جس سے وہ خود متنفر تھی اور جہانگیر باحیثیت ہوجانے کے باوجود بھی اس سے کنارہ کش نہیں ہوسکتا تھا۔

جیوا ہاؤز کے راستوں پر کار ڈرائیو کرتے ہوئے جہانگیر مسلسل ڈینی کے بارے میں سوچتا رہا۔ جب سے جہانگیر کو گروپ کا سربراہ بنایا گیا تھا، ہر معاملے میں باس سے اسے براہ راست ہدایات ملتی رہی تھیں اور وہ خوش اسلوبی سے ان ہدایات پر عمل کرتا چلا آیا تھا۔ کوئی کام ایسا نہ تھا جس میں اس نے ہاتھ ڈالا ہو اور کامیابی نہ ہوئی ہو۔ بجز گل باز خان کے معاملے کے۔ گل باز کے سلسلے میں تھانے نے اس قدر مکمل اور بھرپور کارروائی کی تھی کہ اس پر عائد مختلف الزامات میں سے کم از کم تین دفعات نے اس کے جرائم کو ناقابل ضمانت بنادیا تھا مگر پھر بھی مذاکرات جاری تھے ڈ لاکھ ڈیڑھ لاکھ پر بات بننے کی امید تھی جس کے نتیجے میں دو بنیادی

گواہ منحرف ہوجاتے اور یوں گل باز خان قابلِ ضمانت ملزموں کے زُمرے میں آجاتا۔

لیکن جہانگیر کی اس اعلیٰ کارکردگی کے باوجود پچھلے کچھ عرصے سے ڈینی اونچا اُڑ رہا تھا۔ باس نے اسی کے ذریعے ہیروئن جیوا ہاؤز بھجوائی تھی اور اب دوسری بار ڈینی نے پھر اسے وہاں طلب کیا تھا۔ جس کا مطلب تھا کہ اسے دوبارہ کوئی اہم کام سونپا گیا تھا۔

جیوا ہاؤز میں دونوں محافظ برآمدے میں موجود تھے اور ڈینی آرام سے پاؤں پسارے ایک صوفے پر براجمان تھا۔

"یہ پیکیٹ ہے تمھارے لیے۔" ڈینی نے اپنے برابر میں رکھا ہوا خاکی کاغذ میں لپٹا ہوا پیکیٹ جہانگیر کی طرف بڑھاتے ہوئے نیچی آواز میں کہا۔ "شاید اس میں ایک ٹرانسمیٹر ہے جس پر باس ڈی ون کے حوالے سے تم سے بات کرے گا۔" جہانگیر پیکٹ ہاتھ میں لیے اسے گھورتا رہا، اس وقت وہ ڈینی کے سامنے خود کو خاصا حقیر محسوس کر رہا تھا اور ڈینی کہے جا رہا تھا "یہ خاص ساخت کا ٹرانسمیٹر ہے، آف ہونے کے باوجود اس کا اطلاعی سرکٹ آن رہتا ہے اور ریڈیائی اشارہ موصول ہونے پر اس میں سے گھڑی کی ٹک ٹک جیسی آواز پیدا ہوتی ہے۔ آن کر کے دوسری طرف کا پیغام سنا جا سکتا ہے اور سبز بٹن دبا کر اپنا پیغام نشر کیا جا سکتا ہے۔"

"اونچے اُڑ رہے ہو آج کل۔" ڈینی کے مقابل بیٹھتے ہوئے جہانگیر کوشش کے باوجود طنز کرنے سے باز نہ رہ سکا۔ ڈینی نے بوکھلا کر اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور جہانگیر کا چہرہ دھواں ہوگیا۔ اسے یاد آگیا تھا کہ جیوا ہاؤز میں لیے جانے والے سانسوں کی آواز بھی باس کے کانوں سے محفوظ نہیں رہتی۔ یہ یاد آتے ہی وہ بات بنانے کے لیے بولا۔ "تم سے تو ملاقات کو بھی ترس گئے ہیں ہم لوگ۔"

ڈینی بہت مکّار تھا، فوراً ہی جہانگیر کی قلابازی کا مطلب سمجھ گیا اور داہنی آنکھ دبا کر بولا۔ "ہم لوگ تو تمھارے اور دوسروں کے حکم کے غلام ہیں۔ کبھی پردہ نشین ہوجاتے ہیں، کبھی میدان میں آجاتے ہیں۔"

چند منٹ تک اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد وہ دونوں ساتھ ہی باہر نکلے تھے۔ برآمدے سے پورچ میں اترنے کے بعد جہانگیر اس کا ہاتھ تھام کر اسے کھلے ہوئے لان کی طرف لیتا چلا گیا اور پھر اسے گھورتے ہوئے بولا۔ "تم نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیوں کیا تھا؟" اس معاملے میں جہانگیر کی الجھن بجا تھی کیونکہ اس کی دانست میں جیوا ہاؤز میں بگ نصب ہونے کا معاملہ ایک راز تھا جسے باس نے فون پر اس پر ظاہر کیا تھا اور ڈینی کو اس راز سے لاعلم ہونا چاہیے تھا مگر اس نے جس طرح جہانگیر کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا، اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ معاملے سے پوری طرح باخبر تھا اور جہانگیر یہ بھول چکا تھا کہ ... ہمدردی میں وہ خود اسے جیوا ہاؤز میں بگس کی موجودگی ... دے چکا تھا۔

"اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جیوا ہاؤز کے ملازمین ... رکھے ہوئے ہیں لیکن مجھے پورا یقین ہے کہ ان کی وفادار... نے بھی خریدلی ہوں گی۔ میں جو کچھ کرتا ہوں، احکام کے ... کرتا ہوں۔ اس بارے میں تمھارے طنز آمیز تبصرے اگر ... ملازم کے ذریعے باس تک پہنچ جائیں تو شامت آجائے گی ... کا جواب سن کر جہانگیر مطمئن ہوگیا کہ وہ مخبری کے خفیہ نظ... بے خبر تھا۔

"میں جا رہا ہوں، تم چند منٹ بعد نکلنا۔" جہانگیر کی طرف مُڑتے ہوئے کہا۔

"تو کیا بس یہی ایک سوال پوچھنے کے لیے مجھے لا... لائے تھے؟" ڈینی نے مضحکانہ لہجے میں سوال کیا اور جہانگ... قہر آلود نگاہوں سے گھورتا ہوا اپنی گاڑی کی طرف بڑھتا... ڈینی نے وہیں رُک کر اپنے لیے سگریٹ سلگالی۔

جہانگیر تیزی سے کار ڈرائیو کرتے ہوئے گھر پہنچا تو ... کے باہر سڑک کے کنارے کتھئی رنگ کی ٹویوٹا مارک ون ... چونک پڑا کیونکہ طارق کی کار وہ اچھی طرح پہچانتا تھا لیکن حیرت یہ تھی کہ وہ ایسے ناوقت اس کے پاس کیوں آیا ... اپنی گاڑی پورچ میں بند کر کے وہ اندر پہنچا تو ... ڈرائنگ روم میں اکیلا بیٹھا ہوا تھا اور چہرے سے ہوائیاں ... رہی تھیں۔ صوفے کی سائڈ ٹیبل پر چائے کی آدھی پیالی مو... جس کا مطلب تھا کہ اسے وہاں آئے کافی دیر ہو چکی تھی ... نے اسے مصروف رکھنے کے لیے چائے بھجوادی تھی۔ وہ جہ... دیکھتے ہی بوکھلائے ہوئے انداز میں اپنی نشست سے اٹھ ک...

"کیا بات ہے ... اس وقت کیسے آئے ہو؟" جہانگ... ناخوشگوار لہجے میں اس سے سوال کیا۔

"میں خطرے میں ہوں جہانگیر!" وہ اس کے قر... سرسراتے ہوئے خوفزدہ لہجے میں بولا۔ "تمھیں معلوم ... گھر میں اکیلا رہتا ہوں۔ تین دن سے مجھے ایسا محسوس ہو... جیسے کچھ لوگ ہر وقت میری نگرانی کر رہے ہوں۔ پہلے ... اسے وہم سے زیادہ اہمیت نہیں دی لیکن کل رات ... یقین میں بدل گیا ہے۔" وہ سرگوشیانہ لہجے میں کہے جا ر... حد ہوگئی، آٹھ بجے حیرتناک طور پر میرے مکان کی بجلی ... پھر میں نے تاروں کی چھاؤں میں کئی انسانی ہیولوں کو

...اطے میں چلتے پھرتے دیکھا پھر اس سے قبل کہ وہ مکان کا ... حاطے میں چلتے پھرتے دیکھا پھر اس سے قبل کہ وہ مکان کا ...ھیراؤ کرتے یا اندر داخل ہوتے، میں عقبی راستے سے چوروں کی ...رح باہر نکلا اور خاموشی سے گاڑی اسٹارٹ کر کے بھاگ نکلا۔ ...یڈ لیمپس کی روشنی میں میں نے کم از کم تین آدمیوں کو چھلانگیں ...گا کر باڑھ میں روپوش ہوتے دیکھا تھا۔"

"اور سیدھے یہاں چلے آئے؟" جہانگیر کا لہجہ تلخ اور ...انت آمیز تھا۔

"پھر کہاں جاتا؟" طارق نے حیرت سے سوال کیا۔ "پتا نہیں ...ہ کون لوگ تھے اور مجھ سے کیا چاہتے تھے؟"

"روئے زمین پر تم سے بڑا احمق ملنا مشکل ہے طارق!" ...ہانگیر دانت پیستے ہوئے بولا۔ اس کی رگ بس ڈینی سے ہی دبتی ...ی۔ ورنہ طارق اور نادر پر تو وہ بُری طرح حاوی رہتا تھا۔ "اگر ...مھاری کہانی درست ہے تو وہ تمھیں تمھارے ہی گھر میں چوہے ...ی طرح گھیر سکتے تھے، بجلی اڑا کر احاطے میں نقل و حرکت کرنے کا ...طلب یہ ہے کہ وہ تمھیں خوفزدہ کر کے گھر سے باہر ہانکنا چاہتے ...ھے صرف یہ دیکھنے کے لیے کہ ایسے مخدوش حالات میں تم کس ...ھوٹھکانے کا رُخ کرتے ہو۔ تم اپنی دانست میں انھیں چکمہ دے کر ...لے مگر ان کے کسی آدمی نے ضرور تمھارا پیچھا کیا ہوگا اور تم کاٹھ کے ...و کی طرح اپنے تعاقب میں اسے یہاں لے آئے۔ ایسے ہی بودے ...ھے تو نکلنے سے پہلے مجھے فون کرلیا ہوتا۔"

"کوشش کی تھی۔" طارق اس سے نگاہیں چراتے ہوئے بے جان ...ہجے میں بولا۔ "مگر میرے گھر کی لائن بے جان تھی، شاید انھوں نے ...ہر سے تار کاٹ دیے تھے۔"

"اور راستے میں کہیں فون نہیں تھا۔" جہانگیر نے زہریلے لہجے ...یں کہا۔ "تم بالکل ڈفر ہو طارق! پتا نہیں میں تمھیں کیسے برداشت ...کر رہا ہوں۔ اپنی حماقتوں سے نہ صرف تم خود مروگے بلکہ مجھے بھی ...بے موت مرواؤ گے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" طارق بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ...میری عقل ماؤف ہوکر رہ گئی تھی۔ ورنہ یہاں آنے سے پہلے مجھے ...کہیں سے فون کرلینا چاہیے تھا۔ مگر سوال تو یہ ہے کہ اب میں کیا کروں؟"

"گھر پر کچھ مال وغیرہ تو نہیں ہے؟" قدرے توقف کے بعد جہانگیر نے سوال کیا اور طارق نے اپنا سر نفی میں ہلا دیا جس پر جہانگیر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "پھر تم اپنے کسی ایجنٹ سے دو آدمیوں کا بندوبست کرو اور خفیہ طریقے سے اپنے گھر میں گھسنے کی کوشش کرو۔ میدان صاف ہو تو اگلی ہدایات تک وہیں محدود ہوجاؤ، تصادم کی نوبت آجائے تو شہر میں کہیں بھی روپوشی اختیار کر کے مجھ سے فون پر رابطہ قائم کرنا۔"

"اور اگر... " طارق نے کچھ پوچھنا چاہا لیکن جہانگیر نے بوکھلائے ہوئے انداز میں ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور بولا۔ "تم ذرا بیٹھو۔ میں ابھی چند منٹ میں واپس آتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اندر اپنی خوابگاہ کی طرف جانے کے بجائے اوپری منزل پر جانے والے زینوں کی طرف ہو لیا کیونکہ اسے اپنی جیب میں رکھے ہوئے آپریٹس پر ہلکی سی ٹک ٹک سنائی دینے لگی تھی اور وہ بیوی کی نظروں سے قطعی محفوظ رہ کر اس آلے کو استعمال کرنا چاہتا تھا۔

اوپر پہنچ کر اس نے زینوں کے اختتام پر لگا ہوا دروازہ اندر سے بولٹ کر دیا اور روشنیاں جلاتے ہوئے ایک کمرے میں جا گھسا۔

آپریٹس نکال کر اس نے ایریل باہر کھینچا اور سوئچ آن کر دیا۔ فوراً ہی اسے بھنبھناتی ہوئی آواز سُنائی دی جس میں غراہٹ کا عنصر نمایاں تھا۔ "ہیلو۔ ڈی ون۔ کالنگ ڈی ٹو... اوور۔"

"ڈی ٹو رسیونگ سر! اوور۔" جہانگیر نے دھڑکتے دل کے ساتھ ٹرانسمیٹر پر پہلی بار اپنی آواز نشر کی۔

"ڈینی سے تمھیں جو کچھ معلوم ہوا، اس میں یہ اہم اضافہ اور کرلو کہ بی فور ہم دونوں سے برتر ہے۔ وقتاً فوقتاً تمھیں اس سے بھی براہِ راست ہدایات ملتی رہیں گی۔ اس کے علاوہ تم طارق سے دور رہو گے... وہ خطرناک ہوگیا ہے۔ اوور۔"

"وہ میرے ڈرائنگ روم میں موجود ہے سر!" جہانگیر نے کہا اور پھر وہ سب دہراتا چلا گیا جو طارق سے سن چکا تھا۔

پھر جونہی اس نے اپنی بات مکمل کر کے لائن اوور کی، رسیور پر ڈی ون کے بجائے ایک نئی بھرائی ہوئی آواز سنائی دینے لگی۔ "اٹ از بی۔ فور کالنگ ڈی۔ ٹو! طارق کو تمھارا مشورہ مناسب ہے۔ اس نے براہِ راست تمھارے پاس آکر حماقت کی ہے، یہ اس سے تمھاری آخری ملاقات ہوگی۔ اس سے یہ ضرور معلوم کرنا کہ اس کا پیچھا کرنے والوں میں چوڑے شانوں والا ایسا کوئی دراز قامت شخص تو نہیں تھا جو ہلکی سی لنگڑاہٹ کے ساتھ بائیں ٹانگ پر زور ڈال کر چلتا ہو۔ اوور۔"

"او کے۔ سر!" جہانگیر نے جواب دیتے ہوئے اپنی آواز میں ہلکی سی لرزش محسوس کی۔ "حکم پر لفظ بلفظ عمل ہوگا۔ اوور۔"

"طارق کا معاملہ میں خود دیکھ رہا ہوں، کوئی بھی اہم پیش رفت ہو تو تم مجھے براہِ راست رپورٹ دو گے۔" وہی آواز سنائی دی پھر وہ دوسرے شخص سے مخاطب ہوگیا۔ "ڈی ون! اب تم اپنی بات مکمل کرسکتے ہو۔"

"ڈی۔ ٹو! تمھیں اب تھوڑی سی محنت کرنی ہے۔" ڈی ون کی آواز ابھری۔ "تم اپنے آدمیوں سمیت گمنام رہ کر ہیروئن کے علاوہ

ہر نشے کی مخبری کردو گے۔ چند روز میں شہر سے چرس، شراب اور دوسرے نشوں کا صفایا ہو جانا چاہیے۔ اوور۔"

"میرے آدمی شہر میں کہرام مچا دیں گے سربا اوور۔" جہانگیر پرجوش لہجے میں بولا۔ یہ احساس اس کے لیے بہت شدید تھا کہ وہ بیک وقت نائب سربراہ اور سربراہ سے مخاطب تھا۔ اس اعزاز کے ساتھ ہی اسے اپنی جانب سے رابطہ قائم کرنے کی اجازت بھی مل گئی تھی۔

"وِش یو آل دی لک۔۔۔ اوور اینڈ آل۔" اختتامی کلمات کے ساتھ ہی ڈی۔ ون کی آواز معدوم ہوگئی۔

جہانگیر نے ٹرانسمیٹر آف کرکے جیب میں رکھا اور چند ثانیوں بعد بشاش چہرے کے ساتھ نیچے ڈرائنگ روم میں جا پہنچا جہاں طارق اس کے انتظار میں بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ سیڑھیوں پر جہانگیر کے قدموں کی چاپ سنتے ہی وہ اس کی طرف گھوم گیا تھا۔

"جو لوگ تمھیں ہراساں کر رہے ہیں، ان میں کشادہ شانوں والا کوئی ایسا لمبا تڑنگا آدمی بھی ہے جو بائیں ٹانگ پر تھوڑا سا لنگڑاتا ہو؟" جہانگیر نے اس کے قریب پہنچ کر سوال کیا تو طارق حیرت سے اچھل پڑا اور اس کی آنکھوں کے ڈھیلے کشادہ ہوگئے۔

"تمھیں کیسے معلوم ہوا؟" اس نے حیرت اور بے یقینی کے عالم میں سوال کیا۔

"سوال کرنے کے بجائے جواب دو۔" جہانگیر نے اہانت آمیز لہجے میں کہا۔

"تین دن پہلے اسی پر میری توجہ مبذول ہوئی تھی۔ تقریباً تین گھنٹے تک میں شہر کے مختلف مقامات پر اسے اپنے آس پاس ہی دیکھتا رہا تھا۔ وہ سفید رنگ کی فاکسی میں تھا پھر جب فریئر روڈ پر وہ سیدھا میرے پیچھے آنے کے بعد ایک گلی میں گھس گیا تو میں نے اسے نظر انداز کر دیا۔ آج شام شیر شاہ میں وہ مجھے چند لمحوں کے لیے دوبارہ نظر آیا تھا۔ پھر میں اسے تلاش کرتا ہی رہ گیا لیکن وہ کہیں نظر نہ آیا۔"

"اسے میں دیکھ لوں گا۔" جہانگیر نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ "تم جاؤ اور جو کچھ میں نے بتایا ہے اس پر عمل کرو۔"

"ذرا ایک فون کر لوں؟" طارق نے لجاجت سے کہا اور جہانگیر نے بے پروائی سے اپنا سر اثبات میں ہلا دیا۔

⁂

جیسے ہی طارق کی کتھئی ٹویوٹا آگے بڑھی، جہانگیر کے مکان سے کچھ دور ایک تاریک گلی میں کھڑی ہوئی سفید فاکسی بھی سڑک پر رینگ آئی اور طارق کی کار کے پیچھے روانہ ہوگئی۔ اس کے اسٹیئرنگ وھیل پر کشادہ شانوں اور مضبوط جسم والا ایک طویل قامت شخص موجود تھا جس کی رگ رگ سے چالاکی اور ذہانت کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی گاڑی کے ہیڈ لیمپس روشن نہیں کیے تھے اس کے باوجود وہ یوں مہارت سے کار چلا رہا تھا جیسے سڑ[ک] اس کے دیکھے بھالے ہوں۔ وہ مناسب فاصلے سے طارق کی پیچھا کرتا رہا پھر جونہی کتھئی ٹویوٹا ایک مصروف سڑک پر گ[ئی] کشادہ شانوں والے نے فاکسی کے ہیڈ لیمپس روشن کر لیے

رات ڈھل رہی تھی اس لیے سڑک پر ٹریفک خا[صا کم تھا] لہٰذا اگلی کار تیز رفتاری سے جا رہی تھی۔ گارڈن روڈ پر اگ[لی کار] اچانک بائیں جانب فٹ پاتھ کے کنارے رکی اور اسٹریٹ لا[ئٹ] کی ناکافی روشنی میں دیوار کے سہارے کھڑے ہوئے دو آدمی لپکے اور کار میں سوار ہوگئے، اگلے ہی لمحے کتھئی ٹویوٹا پھر آگے روا[نہ]

کشادہ شانوں والے کے چہرے پر تشویش کے آثار ا[بھر آئے] پتا نہیں وہ دونوں کون تھے اور طارق نے انھیں اپنی کار کیوں بٹھایا تھا۔ وہ پچھلے کئی دنوں سے طارق کے پیچھے لگا ہ[وا تھا] لیکن اس کے بارے میں کوئی خاص بات معلوم کرنے میں کام[یاب] نہیں ہو سکا تھا۔ طارق کا ایک دو مشکوک افراد سے میل جول [بھی] تھا لیکن اس سے کوئی نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس جیسا ما[ل] رکھنے والے لوگ حالات بدل جانے کے باوجود بھی اپنے برے [دنوں] کے دوستوں سے زندگی بھر میل جول رکھنے پر مجبور ہوتے ہ[یں] کیونکہ ان ہی کے سامنے وہ کھلے دل سے ہر قسم کی گفتگو کر [سکتے] ہیں۔ نئے دوستوں سے تو بس ایسی ہی رسمی باتیں کی جا سکتی ہیں [جن] سے اپنے بے پناہ تمول اور اختیار کا اظہار کیا جا سکے۔

لیکن عیسٰی خان بھی بہت باخبر آدمی تھا۔ کشادہ شانو[ں والا] بارہ برس سے اس کے لیے کام کر رہا تھا اور اس نے عیسٰی خ[ان] کے اندازے شاذ و نادر ہی غلط ثابت ہوتے دیکھے تھے عیسٰی [خان] بظاہر شہر کا ایک معروف ٹرانسپورٹر تھا جس کے ٹرکوں کا بیڑہ [شہر] اور ملک کے بالائی شہروں کے درمیان سامان کی نقل و حمل [میں] مصروف رہتا تھا لیکن اس کی اصل آمدنی اس غیر قانونی مال [کی] نقل و حمل سے تھی جو افغانستان کے راستے اسمگل ہوکر ملک [میں آتا] تھا لیکن جب سے افغان فضاؤں میں سرخ انقلاب کے پھریرے [لہرانے] لگے تھے، عیسٰی خان کی آمدنی بری طرح متاثر ہوئی تھی۔ ابتدا[ء میں] وہ حالات میں کسی بہتری کا انتظار کرتا رہا لیکن دوستی کے معاہ[دے] کی آڑ میں پڑوس سے مسلح افواج افغانستان میں گھس آئیں۔ [سڑکوں] پر سرخ ٹینک گڑگڑانے لگے۔ دوسری طرف افغان سرزمین [پر] بیرونی مداخلت کے خلاف مزاحمت شروع ہوگئی، سادہ لوح [اور] آزادی کے متوالے، غیور افغانوں نے ہتھیار سنبھال کر پہاڑوں [میں] مورچے جمائے تو ان کی مدد میں اپنا اسلحہ اور افرادی قوت [جھونک] لگانے والے دوست جوشِ غضب میں باؤلے ہوگئے۔ وہ توپوں، فوجیوں، ٹینکوں، توپوں اور ہزاروں ٹن بارود کی تباہی مول لے کر دوستی کا پرچم سربلند رکھنے کی کوشش کر رہے تھے مگر غیور شہری اور قبائلی انھیں خوش آمدید کہنے کے بجائے غاصب اور مداخلت کار قرار دے رہے تھے پھر وہی ہونے لگا جو انتقام کی صورت میں ہوتا ہے جس علاقے میں کسی فوجی قافلے پر حملہ ہوتا وہاں قرب و جوار کی آبادیوں سے ہر مرد کو گرفتار کرکے جنگی بیگار یا دوسری خدمات پر لگا دیا جاتا۔ آبادیوں پر طیارے مشین گنوں سے گولیاں برساتے، زیادہ غصہ آجاتا تو بمباری سے بھی دریغ نہ کرتے۔

جو محض تماشائی تھے، ان حالات سے وہ بھی دل برداشتہ ہوتے چلے گئے۔ اپنی ہی سرزمین پر دوستوں کے ہاتھوں جنگی قیدیوں جیسا سلوک بھگتنا ان کے بس سے باہر تھا۔ لہٰذا تباہ حال، بھوکے اور پریشان کنبوں پر مشتمل قافلے سرحد پار ہجرت کرنے لگے۔ پہاڑوں میں بارود و آہن کا تصادم روز بروز شدید ہونے لگا کوئی دن ایسا نہ جاتا جب روپوش باغیوں کی تلاش میں چٹانوں کے ریزے نہ اڑائے جاتے ہوں۔

حالات سے مایوس ہوکر عیسٰی خان نے چرس کی لائن پکڑلی۔ وہ عزت دار آدمی تھا، اس لیے بڑے دھندے کا خطرہ مول لیے بغیر برسوں محدود مقدار میں چرس شہر میں لاتا رہا اور اپنے اعتماد کے چار چھ آدمیوں کے ذریعے معقول رقم کماتا رہا پھر پچھلے دنوں چرس کا قحط پڑا تو عیسٰی خان جیسے قناعت پسند کی بھی رال ٹپک پڑی۔ اس کا تجربہ تھا کہ چرس فروشی میں سب سے تگڑا نفع خوردہ فروش کو حاصل ہوتا ہے لہٰذا اس نے لانڈھی والے راجو کو اپنے ساتھ ملا لیا اور اپنا مال شہر میں اونے پونے داموں اِدھر اُدھر پھینکنے کے بجائے راجو کے ذریعے فروخت کرانے لگا لیکن چند روز بھی نہ گزرے تھے کہ راجو کے اڈّے پر مسلح حملہ ہوا۔ ہوٹل راکھ کا ڈھیر بنا دیا گیا اور فائرنگ کے نتیجے میں راجو کا بھائی ہلاک ہوگیا۔ راجو نے اس واقعے کے بارے میں پولیس سے ذرا بھی تعاون نہیں کیا لیکن عیسٰی خان کے سر پر سوار ہوگیا۔ اس کا قیاس تھا کہ اس کے اڈّے کی تباہی میں غلام قادر کا ہاتھ تھا۔ اس نے حملہ آوروں میں سے کئی کو بارہا غلام قادر کی اردلی میں دیکھا تھا مگر غلام قادر واردات کے بعد ایسا غائب ہوا تھا کہ خود اس کے جاں نثار اسے شہر بھر میں ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔

عیسٰی خان غیور آدمی تھا۔ اتنی معلومات سامنے آنے کے بعد اس کا قبائلی خون بھی جوش مارنے لگا اور اس نے غلام قادر کو برآمد کرنے کی ذمّے داری کشادہ شانوں والے پر ڈال دی۔ اس نے پہلے ہی دن پتا لگا لیا کہ کسی زمانے میں غلام قادر، طارق کا گہرا دوست تھا اور اب وہ اسے اچھی طرح ہراساں کرنے کے بعد اچانک ہی اس پر ہاتھ ڈالنا چاہتا تھا۔ تاکہ اس سے غلام قادر کا پتا معلوم کرکے عیسٰی خان کے سامنے سرخروئی حاصل کرسکے۔

جمشید روڈ تک تعاقب بآسانی جاری رہا خطرناک صورت والے کا اندازہ تھا کہ طارق کو آخر تک اپنے تعاقب کا شبہ نہ ہو سکا تھا وہ ایک ویران گلی کے تاریک نکڑ پر فاکسی روک کر طارق کی کار کو اس کے احاطے میں مڑتے دیکھتا رہا اور پھر اپنی کار گلی میں موڑ کر اندھیرے میں پارک کر دی۔ چند ثانیوں بعد وہ کار سے نکلا۔ اور اسے لاک کرکے آہستہ آہستہ طارق کے مکان کی طرف بڑھنے لگا۔

گرد و پیش میں ہر طرف ویرانی کا راج تھا۔ کشادہ شانوں والے نے پھاٹک سے اچک کر اندر کا جائزہ لیا۔ جہاں ہر طرف اتھاہ سناٹے کی حکمرانی تھی، وہ ہتھیلیوں پر زور دے کر کسی بندر کی سی سرعت سے اچھلا اور اگلے ہی لمحے ہلکی سی دھمک کے ساتھ اندر کود گیا۔ کچی زمین پر وہ کئی سیکنڈ تک اکڑوں بیٹھا چوکنے انداز میں کسی ردِعمل کا انتظار کرتا رہا مگر وہاں بدستور ایسا سناٹا چھایا رہا جیسے قرب و جوار میں اس کے علاوہ کوئی دوسرا ذی روح موجود نہ ہو۔ وہ آہستگی سے پنجوں کے بل کھڑا ہوگیا۔

آخری راتوں کا تھکا ہارا چاند اس وقت بادلوں کی اوٹ میں تھا، وہ اپنی بائیں ٹانگ پر زور دے کر قدرے لنگڑاتا ہوا اس سمت میں بڑھنے لگا جدھر اندر داخل ہونے کے لیے وہ ایک غیر محفوظ کھڑکی کا پہلے ہی انتخاب کر چکا تھا پھر جونہی وہ عمارت کے قریب پہنچا، عقب میں جھاڑیوں کی اوٹ سے ایک بے آواز شعلہ لپکا اور اس کی عقبی پسلیاں توڑتا ہوا بائیں پہلو میں اتر گیا۔ اس کے حلق سے ایک موہوم سی آواز نکلی، دونوں ہاتھ بے بسی سے فضا میں لہرائے اور پھر وہ کسی کٹے ہوئے شہتیر کی طرح کچی زمین پر ڈھیر ہوگیا۔

طارق کے لیے وہ خبر سنسنی خیز ثابت ہوئی جو جہانگیر کے ذریعے فون پر ملی تھی۔

"لا۔۔۔ آش!" اس نے بے یقینی سے ماؤتھ پیس میں دہرایا۔ "تمھیں کیسے معلوم کہ میرے لان میں ایک لاش پڑی ہے؟"

"شاید تم نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ تمھارا فون جو ڈیڈ ہوکر رہ گیا تھا، یک بیک کیسے کام کرنے لگا؟" جہانگیر کا لہجہ تلخ اور طنزیہ تھا۔

"اوہو۔۔۔ ہوہو۔" طارق بوکھلا کر بولا۔ "یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ میں قسم کھا سکتا ہوں کہ تمھارے پاس روانہ ہونے سے پہلے میرا فون ڈیڈ تھا۔"

"مرنے والا تمھارا تعاقب کرتا ہوا میرے گھر تک آیا تھا۔"

جہانگیر کی آواز زہریلی ہوگئی "اور یہاں سے تمہارے پیچھے ہی گیا تھا تمہارے اندر گھسنے کے بعد وہ دیوار سے اندر کودا اور دھر لیا گیا۔ وہاں موجود ہمارے آدمی نے اسے ٹھکانے لگانے کے بعد تمہارے فون کے باہر سے کٹے ہوئے تار جوڑے تھے، اگر اوپر والے اپنی آنکھیں کھلی نہ رکھیں تو تم کسی روز ہمیں جہنم کے دہانے میں ہی دھکیل دوگے۔"

"اب مجھے بتاؤ کہ میں کیا کروں؟" طارق نے اضطراری لہجے میں سوال کیا۔

"دونوں آدمی تمہارے پاس موجود ہیں؟" چند ثانیوں کے سکوت کے بعد اس سے پوچھا گیا۔

"ہاں۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھے پی رہے ہیں۔" طارق نے جلدی سے جواب دیا۔

"تمہارے مکان سے تھوڑی دور ایک تاریک گلی میں مرنے والے کی سفید فوکسی کھڑی ہے، دستانے پہن کر لاش اس میں ڈالو اور کار ماری پور کے علاقے میں چھوڑ دو، کہیں بھی تم تینوں میں سے کسی کی انگلیوں کے نشانات نہ رہنے چاہئیں۔" جہانگیر کی آواز ابھری پھر ذرا سے توقف کے بعد اس نے پھر سوال کیا "وہ دونوں قابلِ اعتماد ہیں نا؟"

"مر جائیں گے مگر زبان نہ کھولیں گے۔" طارق نے کہا "وہ اس قابل نہ ہوتے تو میں ہرگز انہیں ساتھ نہ لاتا۔"

اس کا فقرہ مکمل ہوتے ہی لائن بے جان ہوگئی اور وہ ریسیور رکھ کر تشویش زدہ انداز میں اپنی پیشانی مسلتا ہوا ڈرائنگ روم کی طرف چل دیا جہاں اس کے دونوں مسلح ساتھی رات بھر کی بیگار کے خیال سے اسکاچ پیتے ہوئے پیسہ پوائنٹ پر رمی کھیل کھیل کر دل بہلا رہے تھے۔

طارق کے چہرے کی اڑی اڑی رنگت دیکھتے ہی وہ چونک پڑے "خیریت تو ہے باس؟" ان میں سے ایک نے خالص بازاری لب ولہجے میں سوال کیا "معلوم ہوتا ہے کہ فون پر کوئی بری خبر سن کر آئے ہو۔"

"تمہیں جس کام سے لایا تھا، وہ نمٹ گیا۔" طارق گہرا سانس لے کر بولا "باہر لان میں ایک لاش پڑی ہوئی ہے۔ جسے پوری احتیاط کے ساتھ ٹھکانے لگانا ہے۔"

"چلو۔" وہ دونوں ہی بیک وقت اٹھ گئے "کہیں کسی مین ہول میں گھسیڑ دیں گے، وقت بھی بڑا اچھا چنا ہے اس نے مرنے کے لیے۔"

"باہر کہیں اس کی گاڑی موجود ہے۔" طارق ہاتھ سے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا "میں اسے دیکھ کر آتا ہوں پھر ہم لاش اسی میں ڈالیں گے اور گاڑی لاش سمیت شہر کے دور افتادہ حصے میں چھوڑ آئیں گے۔"

دونوں خاموش رہے، طارق نے اپنا اسکاچ کا آدھا گلاس خالی کیا اور پھر باہر کے راستے کی طرف بڑھ گیا۔

باہر ہر طرف سکوت اور سناٹے کی حکمرانی تھی۔ طارق جیب میں ہاتھ ڈالے چند ثانیوں تک احاطے کا جائزہ لیتا رہا پھر اس کی نگاہیں تاریکی میں پڑے ہوئے ایک بڑے سے بے حس و حرکت ڈھیر پر جم گئیں۔ اس نے جیبی ٹارچ نکالی اور اسی طرف چل دیا۔

وہ مضبوط جسم والے کسی دراز قامت شخص کی لاش تھی مرنے والا شاید آخری لمحات میں نہایت کرب کے عالم سے گزرا تھا کیونکہ اس کے دونوں گھٹنے پیٹ کے ساتھ جڑے ہوئے تھے اور چہرہ سینے کی طرف مڑ کر زمین سے لگا ہوا تھا۔ طارق نے ٹھوکر سے اس کا سر سیدھا کیا اور ٹارچ کی روشنی میں اس کا چہرہ دیکھتے ہی اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔ کیونکہ وہ کشادہ شانوں والا وہی شخص تھا جو اپنی بائیں ٹانگ پر زور دے کر قدرے لنگڑاتا ہوا چلتا تھا اور جس کے بارے میں جہانگیر نے اس سے خاص طور پر سوال کیا تھا۔ اسے حیرت تھی کہ جہانگیر نے خطرے کی اطلاع ملنے کے آدھے گھنٹے کے اندر ہی اندر ایسا مکمل بندوبست کرلیا تھا کہ اسے ہراساں کرنے والا کسی شور شرابے کے بغیر نہایت خاموشی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔

لاش کا بغور جائزہ لینے کے بعد طارق اس کے بدن کو ہاتھ لگائے بغیر جیبوں کی تلاشی لینے لگا۔ اسے معلوم تھا کہ دنیا کا کوئی بھی ماہر کپڑوں پر سے نشاناتِ انگشت نہیں لے سکتا تھا۔ طارق نے مرنے والے کی جیب سے ریوالور اور چاقو نکالا پھر دونوں چیزوں کو رومال سے صاف کر کے واپس ڈال دیا اور دوسری جیبیں ٹٹولنے لگا۔ آخر کار پتلون کی جیب سے اسے مطلوبہ چیز مل گئی۔ اس کی چین میں کار کی چابی کے علاوہ دوسری چابیاں بھی تھیں لیکن اس وقت طارق کی دلچسپی صرف فوکسی کی چابی تک محدود تھی۔

وہ باہر آیا تو گلی میں دور تک سناٹے کا راج تھا۔ وہ بلا تامل ایک طرف ہولیا اور پھر اسے ایک بغلی گلی میں سفید فوکسی بھی نظر آگئی جو ایک پھیلے ہوئے درخت کے سائے میں خاصی تاریکی میں کھڑی ہوئی تھی۔ گاڑی پر ایک سرسری نگاہ ڈال کر وہ رکے بغیر آگے بڑھتا چلا گیا۔ تاکہ کسی پھاٹک کی اوٹ میں اونگھتے ہوئے کسی چوکیدار کی غنودہ نگاہوں میں نہ آسکے۔ وہ چکر کاٹ کر دوسرے راستے سے گھر پہنچا تو دونوں اسے باہر ہی ٹہلتے ہوئے ملے۔

"یہاں کیا کر رہے ہو تم دونوں؟" طارق نے ان کے قریب پہنچ کر قدرے تادیبی لہجے میں پوچھا۔

"وزن ہلکا کر رہے تھے۔" ان میں سے ایک بولا "کل ساڑھے تین سو روپے، ایک چاقو اور ایک ریوالور ملا ہے۔"

"دستانے پہنو اور اگلی گلی میں سے سفید فوکسی ادھر لے آؤ۔" طارق نے کی چین دوسرے کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"دستانے تو ہر وقت جیب میں رہتے ہیں باس۔" وہ چابی لے کر فخریہ لہجے میں بولا "جب سے اپنی ہسٹری شیٹ کھلی ہے دستانوں کے بغیر مرے ہوئے کتے کو بھی ہاتھ لگانا چھوڑ دیا ہے۔"

طارق اندر سے باریک جھلی جیسے دستانے پہن کر نکلا تو دروازہ مقفل کر دیا۔ اتنی دیر میں دوسرا آدمی لاش کو سیدھا کرچکا تھا جو گرم ہونے کے باعث ابھی تک اکڑی نہیں تھی پھر گاڑی آتے ہی اگلی سیٹ جھکا کر وہ لاش عقبی پائدان میں ٹھونس دی گئی۔ اس وقت ان تینوں کو پہلی بار اندازہ ہوا کہ دو دروازوں والی کار ہنگامی صورتحال میں کس قدر لونگی ثابت ہوتی ہے۔

ان میں سے ایک ڈرائیونگ سیٹ پر جم گیا۔ دوسرا پچھلی نشست پر چلا گیا، طارق نے پسنجر سیٹ سنبھال لی اور پھر وہ قافلہ وہاں سے روانہ ہوگیا۔ جمشید روڈ سے گلشن اقبال ہوتے ہوئے وہ حسن اسکوائر سے لیاقت آباد کی طرف مڑ گئے۔ وہاں سے ناظم آباد سے گزر کر پُل عبور کیا اور سائٹ میں جیب بنک سے بخیر و عافیت گزر گئے جہاں سڑک کے وسط میں بنے ہوئے پختہ آئی لینڈ پر تین سپاہی اپنی بندوقوں سمیت براجمان تھے لیکن ان میں سے کسی کو فوکسی پر شبہ نہ ہوا اور وہ دندناتے ہوئے شیر شاہ سے بھی گزر گئے

گلبائی سے ذرا پہلے سڑک ویران تھی۔ آس پاس کوئی خوانچہ فروش یا جھونپڑا ہوٹل بھی نہیں تھا۔ لہٰذا طارق کے ایما پر کار سڑک سے اتار کر کچے میں جھاڑیوں کے قریب روک دی گئی اور چابی اگنیشن میں لگی چھوڑ کر وہ تینوں تھوڑے تھوڑے وقفے سے اتر کر مختلف سمتوں میں چل پڑے۔

طارق کے ستارے اچھے تھے کہ سڑک عبور کرتے ہی اسے ایک خالی رکشا مل گیا۔ حالانکہ ڈرائیور اسی طرف جا رہا تھا مگر پھر بھی ناظم آباد پہنچانے کے لیے میٹر سے دو روپے زائد کا مطالبہ کر ڈالا جو طارق کو منظور کرنا پڑا اور وہ ہوائی گھوڑا اسے لے کر برق رفتاری سے آگے روانہ ہوگیا۔

آتے ہوئے سارے راستے طارق کا دل کنپٹیوں میں دھڑکتا رہا تھا کیونکہ وہ لوگ فوکسی میں ایک لاش کے ساتھ سفر کر رہے تھے اور اگر راستے میں کہیں بھی روک لیے جاتے تو گلو خلاصی ناممکن ہو کر رہ جاتی مگر اس بار اس کا دل شیر تھا اور وہ خود اس آسان گلو خلاصی پر خوش تھا لیکن اس خوشی میں بھی اس نے اپنا بنیادی اصول فراموش نہیں کیا تھا کہ جائے واردات سے مجرم کو براہ راست اپنے ٹھکانے کا رخ نہیں کرنا چاہیے کیونکہ اکثر پولیس کے اہلکار کڑیاں ملاتے ملاتے اس نکتے کے سہارے مجرم کو بے نقاب کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اس کا ارادہ تھا کہ ناظم آباد اتر کر بس کے ذریعے لسبیلہ جائے گا اور وہاں ایرانی کے ہوٹل میں لمبے پانی والی کڑک چائے پی کر گھر روانہ ہوگا لیکن رکشا کی دم توڑتی ہوئی رفتار نے اس کے پُرسکون منصوبوں کا تسلسل توڑ دیا۔

ڈرائیور انجن کو نیوٹرل کر کے کسی کا نام لیے بغیر بے مقصد مغلظات بکے جا رہا تھا اور پھر طارق کو اس کی برہمی کا جواز بھی نظر آگیا۔ اگلا چوک آنے والا تھا مگر اس سے ذرا پہلے پہرے پر مامور ایک سپاہی اپنی بندوق ہاتھ میں تھامے اس طرح سڑک کے وسط میں کھڑا ہوا تھا۔ جیسے اس تک پہنچنے سے پہلے رکشا نہ روکا گیا تو وہ بندوق کا کندا مار کر اسے پیچھے الٹ دے گا۔

رکشے کی رفتار کے ساتھ ہی ڈرائیور کی آواز بھی دھیمی ہوتی چلی گئی اور جب اس نے بائیں طرف بجلی کے کھمبے کے قریب کچے میں اتار کر رکشا روکا تو اس کی خوش مزاجی بھی بحال ہوچکی تھی۔ فوراً ہی دو سپاہی رکشے کی طرف لپکے اور گردنیں لمبی کر کے یوں طارق کے ارد گرد جھانکنے لگے جیسے وہ اپنی بغل میں کوئی ایٹم بم چھپائے لیے جا رہا ہو۔

"نیچے اترو۔" ایک سپاہی اپنی مونچھ کو بل دیتے ہوئے کرخت آواز میں طارق سے گویا ہوا اور وہ بے چون و چرا نیچے اتر گیا۔

"کدھر جا رہے ہو اتنی رات کو؟" وہ اسٹریٹ لائٹ کی روشنی میں اپنی اشتباہ آمیز نگاہیں طارق کے چہرے پر مرکوز کر کے معنی خیز لہجے میں بولا۔

"ارے جانا کہاں ہے، ناظم آباد جا رہے ہیں سنتری بادشاہ!" رکشا ڈرائیور نے خوشامدانہ لہجے میں دخل اندازی کی۔

"تو چپ رہ اوئے۔" دوسرا سپاہی اس کی گدی پر ہاتھ جما کر گرجا۔

"ناظم آباد۔" طارق نے اپنے چہرے میں پیوست ہوتی ہوئی تابکار نگاہوں کا سامنا کرتے ہوئے حتی الامکان نرمی سے جواب دیا۔

"اور کہاں سے آ رہے ہو اتنی رات کو؟" وہ ناقدانہ نظروں سے طارق کے سراپا کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔

"ایک دوست کے گھر سے۔"

"ہاتھ سر پر رکھو۔" دوسرا سپاہی بھی اپنے ساتھی کی مدد کو آگیا اور طارق کے ہاتھ بلند ہوتے ہی اس کی تفصیلی تلاشی لینے میں

مصروف ہو گیا ان میں سے کوئی بھی اس کے ہاتھوں پر چڑھے ہوئے جلد کی رنگت کے دستانوں کو دیکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا لیکن تلاشی لینے والے نے اس کی جیب سے ساری رقم نکال لی تھی۔

سپاہی نے نوٹ گنے اور دو سو کی رقم اپنی جیب میں ڈال کر بائیس روپے طارق کو تھما دیے۔

"اور باقی رقم؟" طارق نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے نرم آواز میں احتجاج کیا۔

"پکڑو اسے۔" وہ طارق کو جواب دینے کے بجائے اپنے ساتھی سے مخاطب ہو کر بولا۔ "ایک سو نو میں اندر کریں گے اس آوارہ گرد کو، واردات کے لیے موقع تلاش کرتا پھر رہا ہے اتنی رات کو، اور پھر ہمارے منہ لگتا ہے۔"

"اور اس گھڑی کی رسید کہاں ہے؟" دوسرے سپاہی نے آس پاس میدان صاف دیکھتے ہوئے طارق کی بائیں کلائی پر جھپٹا مارا اور رسٹ واچ اتار کر اس کا معائنہ کرتا ہوا بولا۔ "صورت بھکڑوں جیسی اور سیکو لگائے گھوم رہا ہے، مجھے تو یہ بھی چوری کی معلوم ہوتی ہے۔"

"یہ میری اپنی ہے۔" طارق غصے اور بے بسی کے عالم میں بولا۔ "کوئی رسیدیں ساتھ نہیں لیے پھرتا، تم نے سمجھا کیا ہے مجھے؟"

"لگاؤ جی ایک سو نو اس پر۔" اس نے بندوق کندھے سے لٹکاتے ہوئے کہا۔ "حوالات کا شوقین معلوم ہوتا ہے... بید پڑیں گے تو سب قبول دے گا۔"

اسی وقت رکشا ڈرائیور اپنی نشست سے اتر آیا اور طارق کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے پچکارتے ہوئے ہمدردانہ لہجے میں بولا۔ "آجاؤ بابوجی! کیوں سنتری بادشاہوں سے الجھ رہے ہو؟ حوالات لے گئے تو مٹی خراب ہو جائے گی۔"

طارق بے بسی سے سپاہیوں کو گھورتا ہوا رکشے میں جا بیٹھا اور ڈرائیور نے انجن اسٹارٹ کر کے آگے دوڑ لگا دی کسی سپاہی نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"تمھارا مقدر خراب تھا بابو!" ڈرائیور ہمدردانہ لہجے میں بولا۔ "گھڑی اور پیسے تو گئے ہی تھے، زیادہ بحث کرتے تو چھٹانک بھر چرس تمھاری جیب میں ڈال کر برآمد کر لیتے اور حوالات میں بند کر دیتے۔ رات بے رات رکشا ٹیکسی میں سفر کرنا اسی لیے لوگ چھوڑ رہے ہیں، ہاں پرائیویٹ کار میں لاش لے کر بھی شہر میں گھومتے رہو تو کوئی مائی کا لال تمھیں نہیں روکے گا۔"

اس کے آخری تبصرے پر طارق چونکا مگر پھر پُرسکون ہو گیا کیونکہ رکشا ڈرائیور نے وہ بات محض مثال کے طور پر کہی تھی۔

رکشا ڈرائیور خاصا شریف ثابت ہوا، طارق ناظم آ... اترا تو اس نے میٹر سے دو روپے تو کیا، اصل کرایہ بھی لینے ... کر دیا۔ اس کی دانست میں طارق مظلوم تھا جس کی وہ زیاد... زیادہ یہی مدد کر سکتا تھا۔

*

پچھلی رات بہت ہنگامہ خیز رہی تھی، ڈینی نے ایک بوتھ سے مرجینا اور موہن داس کے خلاف مخبری کر دی تھی ا... پولیس نے اپنی فہرست سے باہر کے اس اڈے پر چھاپہ ما... میں نہایت چابکدستی کا مظاہرہ کیا تھا اور غالباً اطلاع ملنے کے بعد ہی بھاری نفری نے اس عمارت کا محاصرہ کر لیا تھا۔ پول... افسران کافی دیر تک گھنٹیاں بجاتے رہے پھر دروازے پر د... بھی دی لیکن اندر موت کا سا سکوت چھایا رہا آخر جب پولیس کی موجودگی کا اعلان کر کے دروازہ توڑنے کی دھمکی دی گئی موہن داس نے دروازہ کھول دیا جس کا ستا ہوا استخوانی چہ... خوف سے زرد ہو رہا تھا اور اندر سے مرجینا کی گالیوں آوازیں آ رہی تھیں۔

اندر مرجینا کوکین کے نشے میں دھت تھی اور موہن ا... اس کے پاؤں داب رہا تھا۔ اس نے چھاپہ مارنے والے پول... افسران کو بتایا کہ مرجینا جوانی سے اس قیمتی اور موذی نشے کی عا... تھی۔ جب وہ دھت ہو جاتی تو اس کی پنڈلیوں میں شد... درد شروع ہو جاتا تھا اور موہن داس کسی سعادتمند شوہر کی ط... اس وقت تک مرجینا کی پنڈلیاں دباتا رہتا تھا۔ جب تک وہ غافل ہو کر گہری نیند نہ سو جاتی تھی اگر ایک لحظہ کے لیے... موہن کے ہاتھ رکتے تو مرجینا تڑپ تڑپ کر اسے گالیاں د... لگتی تھی۔ اسی تماشے کی وجہ سے ہر شام وہ دونوں اپنے گھر... محصور ہو جاتے تھے۔

اس کے مکان سے روسی واڈکا کی اسّی بوتلیں اور مختلف... برانڈ کی اسکاچ کی ایک سو اڑتیس بوتلیں برآمد ہوئیں جو موہن... کے بیان کے مطابق ایک دن پہلے انھوں نے خریدی تھیں۔ ا... طرح ڈینی کے اس قیاس کی توثیق ہو گئی کہ مرجینا کے پاس وا... کا خاصا ذخیرہ آگیا تھا جسے وہ کسی نہ کسی طرح اپنے گاہکوں... سر منڈھنے کی فکر میں تھی۔

ڈینی نے یہ تفصیل مزے لے لے کر صبح کے اخبار... پڑھی تھی ورنہ رات کو تو وہ پولیس کو اطلاع دینے کے بعد... بے فکری سے لمبی تان کر سو گیا تھا۔

وہ اخبار کے آخری صفحے پر پہنچا تو اس کی سرسری نگاہیں... ایک تین کالمی سرخی پر مرکوز ہو گئیں۔ پولیس کی ایک گشتی جماعت...

...ل ایریا میں گلبائی کے قریب مشکوک حالت میں کھڑی ہوئی ... فوکس ویگن دریافت کی تھی جس کے عقبی پائدان میں ... سفید فوکس ... دراز قامت اور مضبوط بدن والے شخص کی تازہ لاش پڑی ... تھی۔ لاش کی حالت سے ظاہر تھا کہ متوفی پر عقب سے چند ... کے فاصلے سے بڑے بور کے پستول سے فائر کیا گیا تھا اور ... بائیں پہلو میں دل کو چھیدتی ہوئی سینے سے پار ہو گئی تھی۔ ... کی دریافت رات گئے ایسے وقت عمل میں آئی تھی کہ اخبار ... آخری کاپی طباعت کے لیے تیاری کے آخری مراحل میں ... لہٰذا متوفی کے بارے میں زیادہ تفصیلات دستیاب نہ ہو ... تھیں لیکن ڈینی کے لیے معاملے کی تہ تک پہنچنا دشوار ... نہیں تھا۔ کیونکہ پچھلی رات ٹرانسمیٹر پر باس کی زبان سے بائیں ... پیر لنگڑانے والے کسی دراز قامت کا ذکر سنتے ہی اس کا ... ن عیسٰی خان کے معتمد خاص مقرب خان کی طرف گیا تھا جو ... ون کی زد میں نہ آنے کے باوجود بھی مشکوک سرگرمیوں میں ... رث رہا کرتا تھا۔

اسے یقین تھا کہ مقرب خان کے قتل میں پچھلی رات ... گفتگو کا دخل ضرور رہا تھا۔ پھر اسے افسوس ہونے لگا کہ وہ ... ت اپنے معمول سے پہلے کیوں سو گیا۔ عین ممکن تھا کہ بعد میں ... یا جہانگیر نے اس سے رابطہ قائم کرنا چاہا ہو اور ناکامی ہوئی ہو۔ اسے ایک بے نام سی خلش ستانے لگی۔ دوسرا ٹرانسمیٹر ملنے ... بعد پہلی خرابی تو یہ ہوئی کہ جہانگیر کو براہ راست بی فور سے ... بطے کی اجازت مل گئی اور دوسری خرابی مقرب خان کے مقدر ... واقع ہوئی تھی جس کے اسرار و رموز سے ڈینی یکسر لاعلم تھا ... ئی ذمّے داریوں کے ساتھ اسے بقیہ لوگوں سے دور رہنے ... ہدایت کی گئی تھی۔ ورنہ وہ کسی سے مل بیٹھ کر پوری صورتحال ... سے آگاہی حاصل کرنے کی کوشش کرتا۔

آخر وہ دوسرا ٹرانسمیٹر لے بیٹھا جس پر جہانگیر کے علاوہ ... فور سے بھی رابطہ قائم کیا جا سکتا تھا اور بی فور کے لیے پیغام ... نشر کرنے لگا دوسرے نشریے کے بعد ٹرانسمیٹر کے ریسیور پر ایک ... والی آواز سنائی دی۔ "بی فور اس وقت باہر ہے، پیغام نوٹ ... کرادو، اسے پہنچا دیا جائے گا۔ اوور۔"

یہ ڈینی کے لیے ایک نئی دریافت تھی کہ بی فور کی غیر حاضری ... میں اس کی ٹرانسمیٹر کالز کو ... عورت ریسیو کرتی تھی، اس کا ذہن ... پھر اسی عورت کی طرف گیا جس سے وہ اپنی زولا کے حوالے ... سے ملا تھا مگر فوراً ہی اسے یہ خیال سر سے جھٹک دینا پڑا کیونکہ ... ٹرانسمیٹر والی آواز گلشن اقبال والی عورت کی آواز سے یکسر مختلف ... تھی۔ "کوئی خاص پیغام نہیں ہے۔" ڈینی نے چونک کر جواب دیا۔

"دوبارہ رابطہ قائم کر لوں گا۔ اوور اینڈ آل۔"

پھر وہ جہانگیر سے رابطے کی کوشش کرنے لگا اور اس میں بھی فوری کامیابی ہوئی۔ جہانگیر پہلے ہی پیغام کے جواب میں لائن پر آگیا۔

"رپورٹ... اوور۔" ڈینی نے اس کا جواب سنتے ہی اپنی بدلی ہوئی مخصوص آواز میں مبہم سا سوال کیا۔

"شاید آپ کو علم ہو گا کہ رات بی فور نے مجھے طارق کے مکان کے لان میں ایک لاش کی موجودگی کی اطلاع دی تھی۔" جہانگیر بتانے لگا اور ڈینی خاموشی سے سنتا رہا۔ "دراصل ہمارا ایک آدمی پہلے سے اس لنگڑے کا پیچھا کر رہا تھا۔ یہ مجھے بی فور سے معلوم ہوا تھا، بہر حال طارق نے ہدایت کے مطابق لنگڑے کی لاش اسی کی کار میں ڈال کر مل ایریا میں چھوڑ دی۔ جہاں سے وہ پولیس کے ہاتھ لگ گئی۔ طارق نے اپنے احاطے سے واردات کا ہر نشان مٹا دیا ہے۔ اوور۔"

"یہ رپورٹ تمھیں براہ راست بی فور کو دینی تھی۔" ڈینی ٹرانسمیٹر میں کسی بھیڑیے کی طرح غرایا۔ "میں اپنے معاملے کی رپورٹ چاہتا ہوں۔ اوور۔"

"سوری سر!" جہانگیر گڑبڑا گیا۔ "دراصل وہ واقعہ میرے ذہن پر سوار ہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ہمارے آدمی اس سُرعت سے کارروائی کر سکتے ہیں۔ آپ کی ہدایت کے مطابق میں نے احکام جاری کر دیے تھے، چنڈو سے ولایتی شراب تک ہر نشے کے خلاف کارروائی کی جائے گی۔ آج کے اخبار میں مرجینا کے اڈے پر چھاپے کی خبر ہے، ہو سکتا ہے کہ یہ کارروائی ہمارے ہی کسی آدمی کے ایما پر کی گئی ہو... اوور۔"

"مجھے جلد از جلد نتائج چاہئیں ڈی لو!" ڈینی نے اسے متنبہ کیا۔ "غیر ضروری باتوں کے بارے میں سوچ کر اپنی ذہنی صلاحیتیں برباد نہ کرو، بی فور ہم دونوں کا سربراہ ہے اور اگر اپنے وسائل سے کام لینے پر تل جائے تو اس سے زیادہ محیر العقول کام سرانجام دے سکتا ہے۔ ... اوور اینڈ آل۔" ڈینی نے آخری فقرے محض یہ سوچ کر ... کہ بی فور کی نیابت کرنے والی اپنے ایریٹس پر ان دونوں کی گفتگو سن رہی ہو گی۔

جہانگیر سے گفتگو کے بعد ڈینی کے ذہن سے ... کی دھند صاف ہو گئی اور وہ واردات کی کڑیاں ... کامیاب ہو گیا۔ بی فور ان چار ... علاوہ ... دوسرے وسائل بھی رکھتا تھا جس کا ... والے مرد اور گلشن اقبال والی عورت ... شاید وہ اپنے ایسے ہی آدمیوں کے ...

کی نگرانی بھی کراتا رہتا تھا۔ اسی طرح اسے علم ہوا ہوگا کہ وہ لنگڑا طارق کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ لہٰذا اس نے مقرب خان کا پیچھا کرنے والے کو آخری کارروائی کا حکم دیا ہوگا جس کے نتیجے میں اس کا پتا صاف کر دیا گیا۔ بی فور نے ٹرانسمیٹر پر جہانگیر سے گفتگو کے دوران جس طرح بائیں ٹانگ پر لنگڑانے والے دراز قامت کا حوالہ دیا تھا، اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس معاملے سے بے خبر نہیں تھا بلکہ شاید یہ بھی جانتا تھا کہ مقرب خان کس کے ایما پر طارق کو ہراساں کر رہا تھا۔

دن میں ڈینی ٹوکیو کے سفر کی تیاری میں اپنے ٹریول ایجنٹ کے ساتھ مصروف رہا لیکن اس کو اس وقت خوشی ہوئی، جب ویزا، زرِ مبادلہ اور کے ایل ایم کا کنفرمڈ ٹکٹ اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ اس وقت ساڑھے تین بج رہے تھے لیکن ڈینی فیکٹری واپس جانے کے بجائے گھر کی طرف ہو لیا۔ وہ بی فور کی کال کا اس قدر شدّت سے منتظر تھا کہ باتھ روم میں نہاتے ہوئے بھی اس نے ٹرانسمیٹر ایک ریک پر رکھا ہوا تھا۔

شام کے چھ بجے دوسرے ٹرانسمیٹر پر ٹک ٹک کی آواز سنائی دی تو وہ دوڑتا ہوا اپنے کمرے میں جا پہنچا۔ دروازہ بند کر کے اپریٹس بند کر دیا۔

"بی فور کالنگ ڈی ٹو... اوور" آواز سنائی دی اور ڈینی کا منہ لٹک گیا۔ باس غیر ضروری طور پہ جہانگیر کو اس پر فوقیت دے رہا تھا۔

"ڈی ٹو رسیونگ سر... اوور" دوسری آواز جہانگیر کی تھی۔

"اسٹینڈ بائی رہو اور غور سے ایک ایک لفظ سنتے رہنا، میں ڈی ون کو ایک اہم کام سونپ رہا ہوں جو اگر آج مکمل نہ ہوا تو تمھیں سنبھالنا ہوگا" باس کی غنودہ آواز سنائی دی پھر قدرے توقف کے بعد اس نے ڈینی کے لیے سگنل نشر کیا۔ جس کا جواب ڈینی نے حسبِ معمول بدلی ہوئی آواز میں دیا۔ باس سے دوسرے ٹرانسمیٹر پر وہ اپنی اصلی آواز میں گفتگو کرتا تھا کیونکہ اس آپریٹس پر کسی دوسرے کے سننے کا امکان نہیں تھا لیکن اس وقت جہانگیر بھی گفتگو سن رہا تھا لہٰذا دوسری شخصیت برقرار رکھنی ضروری تھی۔

"مرجینا کی تباہی میں کس کا ہاتھ ہے ڈی ون! اوور" باس نے سوال کیا۔

"میں نے ہی پولیس کو ادھر متوجہ کیا ہے سر!" ڈینی نے بدلی ہوئی کھردری آواز میں کہا "وہ عرصے سے میری نگاہ میں تھی... اوور"

"ہمیں بس تین چار ہفتوں کے لیے میدان صاف کرنا ہے تاکہ نئے مال کے لیے مارکیٹ بنا سکیں۔ اس کے بعد ہمیں اس سے کوئی سروکار نہ ہوگا۔ اس لیے نئی مہم پر پورے وسائل ہونے چاہئیں۔ اور اب ایک اہم قصّہ سنو! طارق کے قتل میں مارے جانے والے کا نام مقرب خان ہے اور وہ عیسیٰ خان نامی کسی شخص کے لیے کام کرتا ہے۔ عیسیٰ خان نے نام نہاد راجو کے اڈے کو چرس کی فروخت کے لیے استعمال کر رکھا تھا مگر تمھارے آدمیوں نے اسے تباہ کر دیا۔ مقرب خان کو شک تھا کہ راجو کے اڈے پر حملے میں طارق کا بھی کچھ نہ کچھ ہاتھ تھا اس لیے وہ اس کا پیچھا کرتا رہا تھا مگر اس کے قتل نے عیسیٰ کو خوفزدہ کرنے کے بجائے بھڑکا دیا ہے۔ شاید اسے علم نہیں کہ مقرب موت سے پہلے طارق کی راہ پر لگا ہوا تھا۔ وہ طارق سے براہ راست بھڑ جاتا۔ اس کا قبائلی خون جوش میں آیا ہوا ہے مگر میں خون خرابے سے حتی الامکان گریز کرنا چاہتا ہوں۔ عیسیٰ خان لالچی آدمی ہے، تم فون پر اپنا نام ظاہر کیے بغیر آفر دو کہ اگر وہ چرس کے دھندے سے الگ رہے تو اسے ماہانہ ایک رقم ملتی رہے گی، رقم کا تعین میں تم پر چھوڑتا ہوں مگر آخری حد پچاس ہزار سے تجاوز نہ ہونی چاہیے۔ اوور"

"تو کیا ہم واقعی یہ رقم اسے ادا کریں گے؟ اوور" جہانگیر نے حیرت سے سوال کیا۔

"ہاں" باس کی غنودہ آواز ابھری تھی "اگر وہ راضی ہو جائے تو ادائیگی پیشگی اور فوری ہوگی مگر سارا کام خود کو سامنے لائے بغیر کرنا ہوگا۔ اوور"

"اس خطیر رقم کی ادائیگی کے لیے تو سامنے آنا ہی پڑے گا سر! اوور"

"شہر میں بہتیرے غیر معروف لیٹر بکس ہیں۔ جن سے دن میں صرف ایک بار ڈاک نکالی جاتی ہے۔ تم ایسے لیٹر بکس کا انتخاب کر کے اس کے تالے کی دو چابیاں تیار کرو اور ایک کسی ذریعے سے عیسیٰ خان کو بھجوا دو گے پھر لیٹر بکس کی ڈاک نکالے جانے کے بعد تالا کھول کر رقم کا پیکٹ اس میں ڈال کر تالا لگا دو گے اور عیسیٰ خان کو فون کر دو گے کہ وہ چابی استعمال کر کے اس لیٹر بکس سے رقم کا پیکٹ نکال لے۔ ممکن ہو تو تم دور رہ کر جائزہ بھی لے سکتے ہو، ورنہ اس کی بھی ضرورت نہیں۔ وہ رقم لینے کے بعد منکر نہیں ہوگا۔"

"میں سمجھ گیا سر!" ڈینی نے دل ہی دل میں باس کی بے ضرر تجویز کی تعریف کرتے ہوئے کہا "ہو سکتا ہے اسے دوسری بار رقم دینے کی نوبت ہی نہ آئے اور ہمارا مال پوری مارکیٹ میں چھا جائے۔ اوور"

"تم عقل مند ہو" بلا تامل کہا گیا "یہ بھی میدان صاف کرنے کی ایک ترکیب ہے لیکن ہر ایک کو ہم خطیر رقم نہ دے سکیں گے۔ عیسیٰ خان کا معاملہ مختلف ہے۔ اس کے دو آدمی مارے جا چکے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ رقم کے لالچ میں وہ چرس فروشی کے ساتھ ہی دونوں معاملوں کی تفتیش سے بھی کنارہ کش ہو جائے، وہ پیروی کرتا رہا تو پولیس بھی بال کی کھال نکالنے پر مجبور ہو جائے گی۔ اوور"

"میں عیسیٰ خان سے ابھی رجوع کرتا ہوں سر! اوور"

"معاملات طے کر کے تم ڈی ٹو کو بریف کر دینا۔ رقم کی ادائیگی وہی کر دے گا۔ اوور اینڈ آل" بی فور نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

ڈینی عیسیٰ خان کے ٹرانسپورٹ کے دھندے سے واقف تھا۔ اس لیے ٹیلی فون ڈائرکٹری میں اس کے نمبر تلاش کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ ڈینی نے پہلے اس کے گھر فون کیا۔ لیکن وہ وہاں موجود نہیں تھا لیکن دفتر میں وہ مل گیا۔

"عیسیٰ خان! میں تمھارا ایک دوست اور ہمدرد بول رہا ہوں" ڈینی نے نرم اور دوستانہ لہجے میں کہا "مجھے تم سے کچھ اہم بات کرنی ہے، کیا تم دفتر میں اکیلے ہو؟"

"بولو، بولو کیا بات ہے؟" عیسیٰ خان کی اکھڑی اکھڑی آواز سنائی دی "ادھر سب ہمارا دوست، برادر لوگ ہے لیکن تمھارا نام کیا ہے؟"

"میرا نام تم جو چاہو رکھ سکتے ہو، لیکن ہوں تمھارا خیر خواہ" ڈینی نے جواب دیا "شاید آج کل تم پریشان ہو، تمھارے دو ساتھی بھی تم سے بچھڑ چکے ہیں، میں اسی سلسلے میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ ایسے نقصانات کا سلسلہ دراز نہ ہونے پائے"

"اوہ!" عیسیٰ خان کی تحیر آمیز آواز سنائی دی پھر وہ شاید ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھے بغیر کسی سے مخاطب ہوا تھا "اوئے شہباز خان! تم لوگ باہر ٹھہرو، میں بات کر کے تمھیں اندر بلاؤں گا" پھر قدرے سکوت کے بعد وہ ڈینی سے مخاطب ہو گیا "تو مقرب خان کو تم نے مارا ہے؟" اس کا لہجہ سرد اور جذبات سے یکسر عاری تھا۔

"تم اپنے نتائج اخذ کرنے کے لیے آزاد ہو، میں بس اتنا کہوں گا کہ مقرب خان اپنی حماقت کی وجہ سے مارا گیا اور جو بھی اس کی تقلید کرے گا، اسی انجام سے دوچار ہوگا"

"تو صرف یہی دھمکی دینے کے لیے فون کیا ہے تم نے؟" عیسیٰ خان کی آواز تلخ ہو گئی "قسم پروردگار کی اگر تمھاری پرچھائیں کا بھی پتا چل گیا تو میں خود اپنے ہاتھوں سے تمھاری ہڈیوں کا سرمہ بناؤں گا۔ آخر تم نے مجھے سمجھا کیا ہے؟ اور تمھاری یہ مجال کہ تم نے میرے آدمی پر ہاتھ ڈالا؟"

"جوش و انتقام کی باتیں ناتجربہ کار نوجوان کو زیب دیتی ہیں خان! تمھیں نہیں" ڈینی بدستور پرسکون رہا "تمھیں قیامت تک بھی معلوم نہ ہو سکے گا کہ مقرب خان پر کیا گزری تھی۔ میں تمھیں زیادہ الجھانا نہیں چاہتا۔ اس لیے معاملے کی بات طے کرنا چاہتا ہوں"

"کیا معاملہ؟" عیسیٰ خان کے لہجے میں بدستور برہمی باقی تھی۔

"تم عزت دار آدمی ہو۔ ظاہر ہے کہ چرس کی خرید و فروخت میں اپنی گرفتاری پسند نہیں کرو گے"

"بکواس ہے یہ" عیسیٰ خان بھڑکے ہوئے لہجے میں بولا۔ "چرس سے میرا کیا واسطہ؟ میں ایسے دھندوں میں نہیں پڑتا"

"پھر راجو سے شاید پولٹری فارم چلانے کے لیے شراکت ہوئی تھی تمھاری؟" ڈینی نے طنزیہ لہجے میں کہا "مجھے بے خبر نہ سمجھو خان! پوری معلومات حاصل کرنے کے بعد ہی میں نے تم سے براہ راست بات کرنے کا فیصلہ کیا ہے"

عیسیٰ خان نے راجو کو ایک گندی سی گالی دی پھر بولا۔ "اب شاید تم اپنی زبان بند رکھنے کی قیمت چاہتے ہو؟"

"میں بلیک میلر نہیں ہوں عیسیٰ خان!" ڈینی ہلکی سی ہنسی کے ساتھ بولا "بس اتنا چاہتا ہوں کہ تم شریف آدمی ہو، اپنے ٹرانسپورٹ کے دھندے پر توجہ دو، چرس کا لین دین تمھارے بس کی بات نہیں ہے، اس سے اپنا دامن صاف رکھو"

"اور بھوکے مرو" عیسیٰ خان کی زہریلی آواز ریسیور پر ابھری "شاید تم یہ سمجھتے ہو کہ ٹرانسپورٹ کے کاروبار میں دھن برستا ہے" یہ کہہ کر اس نے یکے بعد دیگرے دو تین ثقیل گالیاں دیں پھر بولا "ڈیزل مہنگا، سڑکیں خراب اور اسپیئر پارٹس سونے کے مول ملتے ہیں، مقابلہ اتنا سخت ہے کہ جس کے پاس پندرہ بیس ہزار روپیہ ہے۔ وہ قسطوں پر ٹرک لے کر ٹرانسپورٹر بن جاتا ہے اور روپے کے بدلے بارہ آنے میں مال اٹھاتا ہے۔ جب جائز دھندے کا یہ حال ہو تو آدمی بال بچوں کا پیٹ کہاں سے بھرے"

"میں تمھیں دس بارہ ہزار روپے مہینہ دینے کو تیار ہوں" ڈینی نے پیشکش کی۔

"خیرات" عیسیٰ خان کا لہجہ تحقیر آمیز تھا "ابھی میں اتنا کنگال نہیں ہوا ہوں، صبح شام میرے دسترخوان پر دس بیس مہمان ضرور ہوتے ہیں"

"تم غلط سمجھے" ڈینی اس کی بات کاٹ کر بولا "یہ اس بات کی قیمت ہوگی کہ تم چرس کا دھندا نہیں کرو گے"

"اب سمجھا۔ تم مجھے میدان سے باہر رکھنا چاہتے ہو"

"جو ٹرانسپورٹ کا حال ہے، وہی ہمارا ابھی ہے" ڈینی نے

کہا۔ ہم اپنی روزی میں کسی کو شریک نہیں ہونے دیں گے، راجو کو ساتھ ملا کر تم نے حشر دیکھ ہی لیا مگر ہم سیدھی انگلیوں سے گھی نکالنا چاہتے ہیں، تم نہ مانو گے تو ایک روز اپنے آخری آدمی کو بھی اپنے ہاتھوں سے مٹی دے کر تنہا رہ جاؤ گے پھر تمھیں میری پیشکش یاد آئے گی۔"

"لیکن دس ہزار کم ہے۔" چند ثانیوں کے بوجھل سکوت کے بعد عیسٰی خان کی گمبھیر آواز آئی۔ وہ سیانا آدمی تھا اور اس نے ڈینی کے الفاظ کا حقیقی وزن محسوس کر لیا تھا۔ "مجھے کچھ بھی نہیں کرنا پڑتا، آزاد علاقے سے میرے مخصوص آدمی مال لاتے ہیں اور بازار میں پہنچا دیتے ہیں، میں بیٹھے بٹھائے اس سے کئی گنا منافع کما لیتا ہوں۔"

"یہ پرانی بات ہے عیسٰی خان!" ڈینی نے نرم لہجے میں کہا۔ "مگر اب ایسا نہ ہو سکے گا، مقرب خان سے ہم نے سب معلوم کر لیا تھا، تمھارے آدمی اور ان کا طریقۂ کار ہماری نگاہوں میں ہے۔ نفع تو درکنار اب تم اصل بھی وصول نہ کر سکو گے۔ روز تمھارے آدمی ہلاک یا زخمی ہوں گے تو پولیس بھی تم سے اُکتا جائے گی اور بھاء ساتھ دینے کے بجائے تم ہی کو اندر کر دے گی۔ خوش فہم کے بجائے حقیقت پسند بننے کی کوشش کرو۔"

"کم از کم بیس ہزار ماہانہ ہونے چاہئیں۔" عیسٰی خان کے لہجے سے ظاہر تھا کہ اس نے تذبذب کے ساتھ اپنا مطالبہ پیش کیا تھا۔

"کچھ نہ کرنے کے بیس ہزار۔" ڈینی نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ "خدا کا خوف کرو عیسٰی خان!" کہنے کو اس نے کہہ دیا تھا لیکن دل ہی دل میں وہ خوش تھا کہ باس کے دیے ہوئے ٹارگٹ سے کہیں کم پر بات بنتی نظر آ رہی تھی۔

"ابھی ایک بات کرو۔" اس بار عیسٰی خان کی آواز میں اعتماد کی توانائی تھی۔ "پندرہ سے ایک پیسہ کم نہیں ہوگا۔"

"چلو منظور۔" ڈینی نے خوش دلی سے کہا۔ "لیکن تم یا تمھارا آدمی ایک تولہ مال بھی کہیں نہیں دے گا۔"

"حرام سمجھو۔" عیسٰی خان نے اسے یقین دلایا۔ "تو بات پکی ہو گئی نا؟"

"بالکل پکی، بلکہ اس مہینے کی رقم تمھیں کل پیشگی مل جائے گی۔" ڈینی نے کہا۔

"دھوکا تو نہیں ہوگا؟"

"کس بات کا دھوکا؟" ڈینی نے سوال کیا۔ "تم سے کچھ خریدا نہیں جا رہا جو ہم رقم دیے بغیر اڑا لے جائیں گے۔ رقم ملتی رہے گی تو تم پابند رہو گے۔ رقم نہ ملی تو بازار میں اپنی مرضی کا مال پھینکنے کے لیے پوری طرح آزاد ہو گے۔"

"پھر رقم کس وقت لاؤ گے کل؟" عیسٰی خان نے احمقانہ سوال کی خفت چھپانے کے لیے دوسرا سوال کیا۔

"تم سے میں یا میرا کوئی آدمی نہیں ملے گا۔" بات طے ہو جانے کے بعد ڈینی کا لہجہ قدرے آمرانہ ہو گیا تھا۔ "تمھیں آم کھانے سے غرض ہونی چاہیے، پیڑ گننے سے نہیں، رقم کل سورج غروب ہونے سے پہلے کسی نہ کسی طرح تمھیں مل جائے گی۔"

"ٹھیک ہے، میں انتظار کروں گا۔" اپنی قیمت طے ہونے کے بعد عیسٰی خان کی آواز کی تندی رفع ہو گئی تھی۔ ڈینی نے کامیابی پر مسکراتے ہوئے فون بند کر دیا۔

اگلی صبح وہ ٹوکیو کے لیے روانہ ہونے والا تھا۔ اس کے لیے یہ مشن بہت پُراسرار تھا۔ گو جرائم کی دنیا سے اس کا رابطہ پرانا تھا مگر ایک بین الاقوامی پرواز پر محض حلیے یا کوڈ کے ذریعے ایک اجنبی سے ملاقات کا تصوّر اس کے لیے بالکل نیا تھا۔ کسی بھی شہر یا ملک میں ایسی ملاقات مخدوش ہو سکتی تھی لیکن جہاز پر مختلف مقامات سے مختلف منزلوں کے لیے سفر کرنے ہونے والے مسافروں کی گفتگو پر کوئی چالاک ترین سراغ رساں بھی شبہ نہیں کر سکتا تھا۔ ڈینی کو ماننا پڑا تھا کہ ان کا باس انتہائی ذہین آدمی تھا اور خطرات کو ٹالنے میں خصوصی ملکہ رکھتا تھا۔

غیر ملکی پارٹی سے ہیروئن کے نمونے کی منظوری کے لیے اس نے عمدہ پروگرام ترتیب دیا تھا پھر عیسٰی خان کو ماہانہ رقم کی ترسیل کے لیے بھی اس نے بے داغ منصوبہ تجویز کیا تھا ورنہ ڈینی کو سامنے آئے بغیر عیسٰی خان کو رقم دینا ناممکن نظر آ رہا تھا۔

لیکن دونوں ہی طریقے خاصے مہنگے تھے۔ عیسٰی خان کو چرس فروشی سے روکنے کے لیے پندرہ ہزار روپے ماہانہ کی ادائیگی ڈینی کی سمجھ سے بالا تھی۔ پھر دوسری ٹوکیو کے سفر اور واپسی کی صورت میں ڈینی ہزاروں روپے خرچ کرنے والا تھا۔ ظاہر ہے یہ اخراجات اسی طور پر آمدنی ہی میں سے ادا ہونے تھے۔

ہیروئن کے بارے میں ڈینی لاعلم تھا۔ کیوں کہ یہ نئے دور کا ایک نیا نشہ تھا مگر چرس وغیرہ کے بارے میں وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کے تیار کرنے والے واجبی نفع کے ساتھ اسے فروخت کرتے تھے پھر درجہ بدرجہ کئی ہاتھوں سے گزرنے کے بعد چرس کے ٹکڑے اصل سے کئی گنا داموں پر گاہکوں کو فروخت کیے جاتے تھے جس کی وجہ اس کی ممنوعیت، نقل و حمل، کئی افراد کا نفع اور پھر مال پکڑے جانے کی صورت میں ہونے والے نقصان کے پیشگی ازالے کے لیے مال کی بنیادی قیمت میں اضافہ ایسے عناصر تھے جو بظاہر خطیر نظر آنے والے نفع کو کم کر دیتے تھے پھر انتظامی اخراجات اور امتناعی اداروں سے وابستہ بعض بددیانت اہلکاروں کے بندھے ٹکے نذرانے اس کے علاوہ تھے۔ ان تمام امکانات کی روشنی میں اگر ایک پیسے میں تیار ہونے والی چرس کی گولی نشے بازوں کو ڈیڑھ روپے میں فروخت کی جاتی تھی تو یہ قیمت جائز ہی تھی۔

تھوک داموں اور خوردہ قیمت فروخت میں اس زبردست فرق کو اخبارات میں عموماً رنگ آمیزی کے ساتھ پیش کیا جاتا تھا۔ ایک عام قاری کو اس دھندے میں درپیش الجھنوں کا کوئی علم نہیں ہوتا تھا۔ لہٰذا وہ دونوں قیمتوں کے فرق کو اس کالے دھندے کا نفع تصوّر کرتا تھا اور پھر بہت سے کچے ذہن راتوں رات لکھپتی بننے کے چکر میں اس راہ کو اختیار کر بیٹھتے تھے اور یوں پیشہ ور منشیات فروشوں کو بازار میں ایسے طالع آزماؤں کا سامنا بھی کرنا پڑتا تھا جو انفرادی طور پر بہت کم مقدار لاتے تھے لیکن ایسے سیکڑوں شوقینوں کی وجہ سے بعض علاقوں میں طلب اور رسد کا توازن خاصا بگڑ جاتا تھا۔

ڈینی کے نزدیک عیسٰی خان بھی ایک شوقیہ منشیات فروش تھا جو فاضل آمدنی کے چکر میں چرس کا کام کرنے لگا تھا لیکن اس جیسا فردِ واحد بھی ڈینی کے باس کے لیے اتنا اہم ہو گیا تھا کہ اسے راستے سے ہٹانے کے لیے ماہانہ ایک بڑی رقم کی ادائیگی برداشت کرنی پڑ گئی تھی۔

بہرحال ڈینی خوش تھا کہ وہ نت نئے اسرار و رموز سیکھتا جا رہا تھا۔ مقامی رابطے تو خیر اس کی نگاہ میں تھے ہی، مگر ایک بار کسی مضبوط بین الاقوامی گروہ سے مل بیٹھنے کے بعد وہ زبردست کارنامے دکھا سکتا تھا۔

اس کا ذہن اپنے باس کی پُراسرار شخصیت میں الجھ گیا۔ وہ کس قدر خوبصورتی اور مہارت کے ساتھ معاشرے میں اپنی دوہری حیثیت برقرار رکھے ہوئے تھا۔ سکندر علی کے روپ میں وہ بدی کا دشمن اور نیکیوں کا پیغام بر تھا۔ مگر وہی سکندر علی جب باس یا بی۔ فور کی کینچلی بدلتا تو بدی کے ان داتا کا بھیانک روپ دھار کر ہر طرف سے نیکیوں کی بیخ کنی پر تل جاتا۔

ڈینی نے فیصلہ کر لیا کہ ٹوکیو سے واپسی پر وہ سکندر علی کے مکان میں ضرور نقب لگائے گا۔

کے ایل ایم کی اس مخصوص پرواز پر ڈینی کی نشست مخصوص تھی مگر پھر بھی وہ مقررہ وقت سے چند منٹ پہلے ہی ایئرپورٹ پہنچ گیا۔ اس نے بریف کیس سے پستول نکال کر گھر پر ہی چھوڑ دیا تھا اور باریک دستانے گھر سے نکلتے ہوئے ہاتھوں پر چڑھا لیے تھے۔ اسے کچھ ایسا محسوس ہوا تھا جیسے باس اس کی انگلیوں کے نشانات ہالینڈ کی فرم کے نمائندے تک بھی نہ پہنچانا چاہتا ہو۔ لہٰذا وہ اسی نوع کی احتیاط بروئے کار لایا تھا۔

ہیروئن کے سفوف کی ایک سربمہر تھیلی اس نے اپنے انڈرویئر میں چھپائی ہوئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ایک بار بحفاظت جہاز پر سوار ہونے کے بعد وہ ٹوائلٹ میں کسی خطرے کے بغیر اس تھیلی کو نکال کر کوٹ کی اندرونی جیب میں منتقل کر سکے گا۔ دوسری تھیلی وہ گھر ہی چھوڑ آیا تھا۔

ایئر لائن کے کاؤنٹر پر اس نے اپنے مختصر سے سوٹ کیس کا وزن کرانے کے بعد بورڈنگ کارڈ سمیت بیگیج ٹکٹ حاصل کیا اور پھر بے پروائی سے بریف کیس کو جھلاتا ہوا سیکورٹی والوں کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس مقام پر تجربے کار افراد مامور تھے جو شہادت یا مخبری سے زیادہ اپنے تجربے کے سہارے تخریبی عناصر کو پہچان سکتے تھے مگر ڈینی بھی اناڑی نہیں تھا۔ اپنے تاثرات پر اسے مکمل کنٹرول حاصل تھا اور اسے یقین تھا کہ اس کے دل کی دھڑکنیں بھی معمول پر تھیں۔ وہ قریب پہنچا تو اس کا بارودی بریف کیس ایکسرے مشین میں چلتی ہوئی بیلٹ پر ڈال دیا گیا، اس کے پہلوؤں اور پشت پر ہاتھ پھیر کر سرسری جامہ تلاشی لی گئی اور پھر اسے اندر جانے کی اجازت مل گئی جہاں امیگریشن حکام نے اس کے پاسپورٹ پر ملک سے اخراج کی مہر لگا کر اس کی روانگی کے مراحل مکمل کر دیے۔

ڈینی بے پروائی سے لاؤنج میں بیٹھا رہا اور جب اس کی پرواز کی روانگی کے لیے تیاری کا اعلان کیا گیا تو وہ لاؤنج سے نکل آیا۔ اس پرواز پر کراچی سے فرسٹ کلاس میں پرواز کرنے والے کل دو مسافر تھے۔ ڈینی اپنے ادھیڑ عمر ساتھی کے ہمراہ وین میں سوار ہوا اور پھر جہاز میں پَروں سے آگے لگی ہوئی سیڑھی کے قریب ضابطے کی آخری کارروائیوں کے بعد دیو ہیکل طیارے پر سوار ہو گیا۔

فرسٹ کلاس کیبن میں پہلے سے صرف تین مسافر موجود تھے۔ تینوں ہی سفید فام تھے مگر ان میں دو مرد تھے اور تیسری ایک جواں سال عورت جو کھڑکی کے قریب والی نشست میں دھنسی صبح کی تیز دھوپ میں کھڑکی سے باہر رن وے پر کچھ دیکھ رہی تھی۔ ڈینی نے اپنی نیلی ٹائی پر لگے ہوئے بکرے کی شبیہ والے نقرئی ٹائی پن کو دانستہ چھیڑا، ایک سفید فام غیر ملکی اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ تھوڑا سا مسکرایا اور ڈینی بھی اخلاقاً مسکرا دیا۔ اس کا دل اچانک تیزی سے دھڑکنے لگا تھا کہ ہالینڈ اور اٹلی کے سنڈیکیٹ کے نمائندے نے شاید اسے پہچان لیا تھا۔

وہ اپنی نشست پر بیٹھ گیا لیکن بے چینی کا شکار رہا۔ اس

کی نگاہیں غیرارادی طور پر بار بار اس سفید فام کی طرف اٹھ رہی تھیں جو اسے دیکھ کر مسکرایا تھا مگر وہ اپنے گردوپیش سے بے خبر اپنی گود میں پھیلے ہوئے اخبار کے مطالعے میں منہمک تھا۔

تھوڑی دیر بعد طیارے سے سیڑھیاں ہٹالی گئیں۔ دروازے بند کر دیے گئے۔ کارگو کی لوڈنگ غالباً پہلے ہی مکمل ہو چکی تھی۔ لہٰذا انجن اسٹارٹ کر دیے گئے۔ دلنڈیزی ایئر ہوسٹس نے اپنے سدا بہار سراپے سے کیبن کو رونق بخشی اور پھر پیجنگ سسٹم پر طیارے کے کپتان کی آواز گونجنے لگی۔ وہ کراچی سے بمبئی کے لیے پرواز کی نوید سنا رہا تھا۔ مسافروں نے اپنی نشستیں سیدھی کیں۔ پھر کیبن میں حفاظتی بیلٹ کے آہنی بکلوں کی آواز سنائی دینے لگی۔

ڈینی بہت چوکنا بیٹھا ہوا تھا۔ لہٰذا جب سفید فام دوشیزہ نے قدرے اچک کر پہلی بار کیبن میں ہونے والے اضافے کا جائزہ لیا تو ڈینی اس کی ستواں ناک، بھرے بھرے رخساروں اور جھیل جیسی گہری نیلی آنکھوں کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ مقررہ ملاقات سے نمٹنے کے بعد وہ اس حسین لڑکی کو اپنے ساتھ ایک جام کی پیشکش ضرور کرے گا۔

طیارہ کئی منٹ تک فضا میں آگے بڑھنے کے ساتھ اوپر اٹھتا رہا۔ ڈینی کو اپنے سینے پر ہلکے سے دباؤ کا احساس ہو رہا تھا۔ کان بھی بار بار سن ہوتے جا رہے تھے لیکن وہ اپنے جبڑوں کو بھینچ کر ٹیک آف کے اس اثر کا ازالہ کرتا رہا۔ آخر کار طیارہ مقررہ بلندی پر پہنچ گیا، تمباکو نوشی کی ممانعت کی سرخ روشنیاں پہلے ہی بجھ چکی تھیں، حفاظتی بیلٹ باندھنے کی ہدایت بھی معدوم ہوگئی اور ڈینی نے گہرا سانس لے کر حفاظتی بیلٹ کا بکل کھول دیا۔

اس نے سفید فام کی طرف دیکھا اور بھنا کر رہ گیا۔ وہ اس قدر انہماک سے اخبار کے مطالعے میں ڈوبا ہوا تھا جیسے محض اسی وجہ سے اس نے سفر کا فیصلہ کیا ہو، ڈینی اپنی نشست سے اٹھا اور ٹوائلٹ کی طرف بڑھ گیا۔

ٹوائلٹ کا دروازہ بند کر کے اس نے آئینے میں دیکھا کہ کوٹ کے بٹن کھلے ہوئے ہونے کے باعث اس کی نیلی ٹائی اور اس پر لگا ہوا نقرئی ٹائی پن بالکل واضح طور پر نظر آ رہا تھا۔ اس نے برا سا منہ بنایا اور پھر انڈر ویئر سے ہیروئن کے نمونے کی تھیلی نکال کر کوٹ کی اندرونی جیب میں منتقل کرنے میں مصروف ہو گیا۔

لباس درست کر کے اس نے باہر نکلنے کی نیت سے دروازہ کھولا تو خوشگوار حیرت اس کے چہرے پر مجسم ہوگئی کیونکہ تنگ سی راہداری میں نیلی آنکھوں والی بانکی نار ٹوائلٹ خالی ہونے کی منتظر تھی اور اس کے داہنے ہاتھ کی لمبی لمبی مخروطی انگلیوں میں سلگتی ہوئی سگریٹ دبی ہوئی تھی۔

وہ لحظہ بھر کے لیے اندر ٹھٹکا تھا مگر لڑکی بہت جلد فوراً ہی بول پڑی۔ ”اتنا نہ گھورو مجھے۔“

ڈینی مسکراتا ہوا باہر آیا تو اس نے سگریٹ کا گہرا کش لے کر دھواں بے تکلفی سے ڈینی کے چہرے پر چھوڑ دیا اور ہاتھ سے ٹائی پن کو چھوتے ہوئے بولی۔ ”اس کے بجائے زر... ہی لٹکا لیا ہوتا تو زیادہ اچھا ہوتا۔“ پھر اس سے قبل کہ ڈینی جواب میں کچھ کہتا۔ اس نے پھرتی سے ٹوائلٹ میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔ ڈینی اپنی نشست کی طرف واپس چلا تو اس کے سرور سے لڑکھڑا رہے تھے۔

’سفر اچھا کٹے گا‘ اس نے دل ہی دل میں سوچا اور اپنی نشست پر آ بیٹھا۔ اس نے اپنا زاویہ ایسا رکھا تھا کہ لڑکی کی خالی سیٹ اس کی نگاہ میں تھی۔ ڈینی کو دیکھ کر مسکرانے والا سفید فام اپنے چہرے پر متانت طاری کیے بدستور اخبار کے مطالعے میں غرق تھا۔

چند منٹ بعد ڈینی پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ وہ لڑکی ٹوائلٹ سے واپس آ کر اپنی جگہ پر بیٹھنے کے بجائے ڈینی کے برابر والی خالی سیٹ پر آ بیٹھی تھی۔

”اگر ناگوار نہ ہو تو...“ بیٹھنے کے بعد اس نے مسکراتے ہوئے صاف اور شستہ انگریزی میں ڈینی سے کہا۔

” بڑی خوشی سے۔“ ڈینی نے فراخ دلی سے کہا۔ ”اجنبی حسینوں کی ہم نشینی میں بڑا لطف آتا ہے۔“

”اسی لیے یہ سینے سے لگائے پھر رہے ہو؟“ اس نے ٹائی پن کی طرف اشارا کرتے ہوئے شوخ لہجے میں چوٹ کی۔

ڈینی نے دل ہی دل میں باس کے والدین کی شان میں کچھ نازیبا کلمات ادا کیے پھر مسکرا کر بولا۔ ” ایک حسین کی دی ہوئی یادگار ہے۔“

” خاصا وزنی معلوم ہوتا ہے۔“ لڑکی نے سنجیدگی سے کہا مگر اس کی آنکھیں مسلسل مسکرائے جا رہی تھیں۔

” نہیں... “ ڈینی نے اس بے ہودہ موضوع سے جان چھڑانے کے لیے بے پروائی سے کہا۔ ”ایک ڈیڑھ تولے کا ہوگا۔“

” پھر لنگڑا کیوں رہے تھے؟“ اس نے سنجیدگی سے سوال کیا اور ڈینی بھنا گیا لیکن اس نے ڈینی کو بولنے کا موقع دیے بغیر اپنی بات جاری رکھی۔ ” داہنی پنڈلی کا فریکچر کیسا ہے؟“

ڈینی ایک گہرا سانس لے کر پشت گاہ سے ٹک گیا اور سپاٹ آواز میں بولا۔ ” آپریشن کے بعد اب ٹھیک ہے۔“

” مجھے تو اب بھی گڑبڑ معلوم ہوتی ہے۔“ وہ تشویش بھرے لہجے میں بولی۔ ” ذرا کچھ دور چل کر دکھاؤ۔“

” چپ چاپ بیٹھی رہو، تم نے میرا سارا موڈ غارت کر دیا۔“ ڈینی اس کی طرف جھک کر دھیمے لہجے میں بولا۔ ” مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اس بکرے کی والدہ تم ہی ہو۔“

” اکانومی میں چلے آؤ، پچھلی نشستیں خالی ہیں، وہیں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔“ اس نے بھی رازدارانہ لہجے میں کہا۔ ” لندن سے یہاں تک اکیلے پن کی وجہ سے اکتا گئی ہوں۔“

لڑکی کو ڈینی کی طرف جھکے ہوئے دیکھ کر پچھلی نشست پر کسی کو خواہ مخواہ کھانسی کا دورہ پڑ گیا مگر ڈینی نے پلٹنے کی زحمت نہیں کی، اسے معلوم تھا کہ اس کے پیچھے کراچی سے سوار ہونے والا ادھیڑ عمر بیٹھا ہوا تھا اور شاید اس ڈھلی ہوئی عمر میں بھی تنہا... رییے پن کا شکار تھا۔

لڑکی اٹھ کر اپنی نشست پر چلی گئی اور ڈینی ایئر ہوسٹس سے اسکاچ کے دو پیگ کی فرمائش کرتا ہوا فلائٹ کچن سے ہوتا ہوا طویل راہداری کی طرف بڑھ گیا۔ اکانومی کلاس میں نشستوں کے درمیان پہنچ کر اسے اندازہ ہوا کہ اس پرواز پر مسافروں کی تعداد واقعی کم تھی۔ عقبی نشستیں تو کم و بیش خالی ہی پڑی ہوئی تھیں۔ ڈینی عقبی کچن سے ملحق درمیانی چار نشستوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔ چند ثانیوں بعد فرسٹ کلاس کیبن کی ایئر ہوسٹس ٹرے میں اسکاچ کے دو پیگ لیے اسے ڈھونڈتی ہوئی وہاں آ پہنچی اور اگلی سیٹ کے پیچھے لگی ہوئی ٹرے سیدھی کر کے ڈینی کے لیے پیمانہ وہاں رکھ دیا پھر مسکراتے ہوئی بولی۔ ” دوسرا کسے دوں سر؟“

” یہیں رکھ دو، وہ بھی آتی ہی ہوگی۔“ ڈینی نے معنی خیز لہجے میں کہا اور ایئر ہوسٹس نے تفہیمی انداز میں اپنے سر کو جنبش دیتے ہوئے دوسرا بلوریں پیگ بھی وہیں رکھ دیا۔ وہ اپنے کیبن کی طرف گئی ہی تھی کہ ڈینی کو نیلی آنکھوں والی آتی نظر آئی۔ اس نے ہاتھ ہلا کر اسے اشارہ کیا اور وہ اٹھلاتی ہوئی ڈینی کے برابر میں آ بیٹھی۔

” میں سمجھ رہا تھا کہ اخبار بین میرا مطلوبہ آدمی ہے۔“ اس کے آ جانے پر ڈینی نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

” انتہائی بور آدمی ہے۔“ وہ برا سا منہ بنا کر بولی۔ ” میں نے اس سے مل بیٹھنے کی کوشش کی تھی مگر اس نے موسم سے بات شروع کر کے موسمی سیاروں پر اپنی معلومات کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔ ڈچ اس معاملے میں عموماً سرد مہر ہی ثابت ہوتے ہیں۔“

” بین الاقوامی تجربہ رکھتی ہو۔“ ڈینی کو طنز کرنے کا موقع ہاتھ آ گیا۔ ” ایشیائیوں کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

” بکروں کے عاشق ہوتے ہیں۔“ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی پھر پیگ اٹھایا اور کچھ کہے بغیر ڈینی کی طرف لہرا کر منہ سے لگا لیا۔

” کاش تم مجھے کسی اور موقع پر ملی ہوتیں۔“ ڈینی پیگ سے اپنے لبوں کو تر کرتے ہوئے بولا۔ ” پھر میں دیکھتا کہ تم کیسے اتنا بولتی ہو۔“

اس نے اپنا وینٹی بیگ کھولا اور ایک تہ کیا ہوا کاغذ نکال کر ڈینی کی طرف بڑھا دیا۔ ڈینی نے پیگ سے دوسرا گھونٹ لے کر کاغذ کی تہیں کھولیں تو لڑکی کی تصویر سامنے آ گئی۔ وہ ایمسٹرڈم کی ایشلے ہاؤز نامی فرم کے لیٹر پیڈ پر ٹائپ کیا ہوا شناخت نامہ تھا۔ جس کی رو سے ویرا لائیڈ نامی وہ لڑکی ایشلے ہاؤز کی سفری ایجنٹ تھی جسے فرم کی جانب سے کاروباری سودوں کے پورے اختیارات حاصل تھے۔ ڈینی نے کوٹ کی اوپر کی جیب سے اپنا ایشین سنڈیکیٹ لمیٹڈ کا شناخت نامہ نکال کر اسے تھما دیا جو اس نے سرسری نظر ڈال کر اسے لوٹا دیا۔ باہمی شناخت کے مراحل طے ہو چکے تھے۔ لہٰذا ڈینی نے فوری طور پر اپنا بوجھ ہلکا کرنے میں عافیت سمجھی اور نائیلون کی تھیلی میں بند پولی تھین کا وہ لفافہ لڑکی کے حوالے کر دیا جس میں ہیروئن کا سربمہر نمونہ موجود تھا۔ لڑکی نے وہ تھیلی فوری طور پر اپنے بلاؤز میں چھپالی۔

” اس کام کے لیے ایشلے ہاؤز والوں کو کوئی مرد نہیں ملا تھا؟“ ڈینی نے اسے گھورتے ہوئے سوال کیا۔

”عورتوں سے عموماً نرم سلوک کیا جاتا ہے۔“ وہ مسکرائی۔

” مرد آسانی سے بے وقوف بھی بن جاتے ہوں گے؟“

” عورت کے معاملے میں تو پیدائشی بے وقوف ہوتے ہیں۔“ ویرا نے برجستہ کہا۔ سامنے سے آتی ہوئی ایئر ہوسٹس نے ان دونوں کو مسکرا کر دیکھا اور تیز قدموں سے چلتی ہوئی عقبی کچن میں روپوش ہوگئی۔

●

انسپکٹر یاور سخت پریشان تھا۔ مخبری اوپر ہوئی تھی اور اسے ہدایت ملی تھی کہ فوری طور پر نیشنل ہائی وے کی ناکہ بندی کرالے جہاں سے زرد رنگ کی ایک ڈاٹسن وین سے کئی من چرس شہر لائی جانے والی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ زرد وین عبداللہ کی ملکیت تھی اور اس میں اسی کا مال آتا تھا جس کے لیے وہ ماہانہ ایک بھاری رقم اس کے محکمے کو ادا کرتا تھا۔ تاکہ اس کے کارندوں کی سرگرمیوں سے چشم پوشی اختیار کی جائے۔ اس بندوبست کے نتیجے میں آج تک اس کا مال نہیں پکڑا گیا تھا مگر آج یہ صورت حال بدلتی نظر آ رہی تھی۔

پہلے اس نے سوچا کہ کسی طرح عبداللہ کو ہوشیار کر دے

تاکہ وہ فوری طور پر نیشنل ہائی وے سے کوئی گاڑی آگے دوڑا دے اور زرد وین کا راستہ تبدیل کر دیا جائے لیکن خاصی سوچ بچار کے بعد اس نے اپنا یہ ارادہ ملتوی کر دیا کیونکہ ایسی خبریں زیادہ دن راز نہیں رہتی تھیں۔ ایک بار یہ خبر پھیل جاتی تو انسپکٹر یاور اپنے محکمے کے بڑوں کے عتاب سے نہ بچ سکتا۔

حکمِ حاکم، مرگِ مفاجات کا مفہوم پہلی بار صحیح معنوں میں اس کی سمجھ میں آیا اور وہ کارروائی کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔ سرکل آفس سے جیپ حاصل کر کے ڈرائیور کو ٹنکی میں پٹرول ڈلوانے بھیجا پھر اسلحہ خانے سے فاضل راؤنڈز حاصل کیے اور دس بجے دفتر سے ایک سب انسپکٹر اور دو سپاہیوں سمیت جیپ میں ڈرائیور کے ہمراہ ملیر کی طرف روانہ ہو گیا۔ ان لوگوں کی حتی الامکان یہی کوشش ہوتی تھی کہ جرائم پیشہ افراد کا گھیراؤ آبادی سے باہر نکل کر کیا جائے۔ تاکہ تصادم کی نوبت آ جائے تو قرب و جوار میں کسی بے گناہ شہری کے ہلاک یا زخمی ہونے کا امکان نہ رہے۔

اس نے ملیر سٹی سے آگے نکل کر پُل سے پہلے اپنی جیپ ایک طرف رکوالی اور آدمیوں کو مختلف مقامات پر پوشیدہ رہنے کی ہدایت دے کر اپنی جیپ میں آ بیٹھا۔ وقت دھیمے دھیمے گزرتا رہا اور جب اس کی رسٹ واچ نے بارہ بجائے تو وہ اکتاہٹ کا شکار ہونے لگا۔ اسے معلوم تھا کہ عبداللہ کی گاڑی ہفتے میں ایک دو بار اندرون ملک سے بھوسے کے بوروں کی آڑ میں چرس لے کر آتی تھی لیکن اس کا کوئی وقت مقرر نہ تھا۔

آخر ایک بجے کے قریب سادہ لباس میں پل پر مامور سپاہی نے وسل بجا کر نیچے والوں کو سگنل دیا اور وہ تیار ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد پل پر زرد وین نظر آئی جس کے عقبی حصے میں خشک بھوسے کے پھٹے پرانے بوروں کا انبار لدا ہوا تھا۔ پُل پر کھڑے ہوئے سادہ پوش سپاہی نے بندوق کی نال کے اشارے سے زرد وین کو روکنا چاہا لیکن اس کی رفتار کم ہونے کے بجائے یک بیک تیز ہو گئی۔ شاید اس کے ڈرائیور نے مسلح سادہ پوش کو دیکھ کر خطرہ بھانپ لیا تھا۔

پُل والے سادہ پوش سپاہی نے وارننگ کے طور پر گولی چلا دی جو زرد وین سے گزوں دور سے گزر گئی پھر جوں ہی وہ گاڑی پُل سے نیچے آئی، دونوں سمتوں سے اس پر فائر کیے گئے، گولیاں اس کی آہنی باڈی سے ٹکرا کر ضائع ہو گئیں مگر وین کی رفتار میں کوئی فرق نہ آیا بلکہ یاور کو تو شبہ ہوا تھا کہ ڈرائیور کے برابر میں بیٹھے ہوئے شخص نے شاید ریوالور سے اپنی سمت میں فائر بھی کیا تھا۔ وہ اچھل کر جیپ میں سوار ہو گیا۔

محکمے میں ایسی سنگین کارروائیوں کی نوبت شاذ و نادر ہی آتی تھی لیکن عملہ خوب جانتا تھا کہ ایسے مواقع پر انھیں کیا کرنا ہ لہٰذا جب جیپ کا انجن بیدار ہوا تو سب آدمی اس میں ہو چکے تھے۔

انسپکٹر یاور اپنے محکمے کی کہن سالی سے ہمیشہ سے بیز بوڑھے افسران میں بیشتر لکیر کے فقیر تھے اور اس اصول پ رکھتے تھے کہ چور کے پاؤں نہیں ہوتے، اگر کوئی باوردی کسی مجرم کو للکار بیٹھے تو مجرم کو فوراً ہاتھ سر سے بلند کر کے خود کو قانون کے حوالے کر دینا چاہیے۔ وہ لوگ اپنے افسر سے جدید اسلحہ یا تیز رفتار گاڑیاں مانگتے ہوئے بھی جھجکتے ایسی کسی فرمائش کو اپنی افسرانہ شان کی ناکامی کا اعتراف تصو تھے۔ اس رویے کا نتیجہ تھا کہ محکمے میں برسہا برس سے بندوقیں زیرِ استعمال تھیں جو ملک کے بٹوارے کے بعد حصے آئی تھیں۔ کئی بار ایسا بھی ہو چکا تھا کہ نازک مواقع پر ان بندو نے چلنے سے انکار کر دیا تھا مگر ہر بار ان ہی کے کل پرزے کرنے پر اکتفا کیا جاتا تھا۔ گاڑیاں تھیں تو وہ اپنے موجد زمانے کی یادگار تھیں جن میں مجرموں کی جدید اور تیز رفتا کے تعاقب کا خیال ہی مضحکہ خیز معلوم ہوتا تھا وہ تو غنیمت کہ چھ سلنڈروں والی جیپیں جب پٹرول کی گرانی کے باعث بازار میں نہ کھپ سکیں تو انھیں اہمل کرنے والے سرکاری ادار بھاری نقصان سے بچانے کے لیے سیکڑوں جیپیں مرکزی صوبائی محکموں کو فروخت کرا دی گئیں۔ اس مال غنیمت سے چھ سلنڈروں والی ایک جیپ انسپکٹر یاور کے دفتر حصے میں آئی تھی اور اس مہم میں وہ اسی پر نکلا تھا۔ خیال تھا کہ محکمے میں ایک وہی گاڑی حقیقی معنوں میں کار

جیپ نہایت تیز رفتاری کے ساتھ زرد وین ک میں روانہ ہوئی اور پھر لحظہ بہ لحظہ دونوں گاڑیوں کا درمیا کم ہونے لگا۔ انسپکٹر یاور نے اپنی طرف سے جھک کر ایک بھی جھونک مارا۔

زرد وین والے شاید اس خیال میں تھے کہ ماہانہ وجہ سے انھیں پورا پورا تحفظ حاصل ہے۔ لہٰذا اکا دکا فائ باوجود وہ صاف بچ نکلنے میں کامیاب ہو جائیں گے لیکن جیپ تیزی سے بڑھتی ہی رہی تو شاید ان کے ہاتھ پیر گئے اور زرد وین اسی رفتار پر کچے میں اتار دی گئی۔ غبا کثیف بادل میں کچھ دور دوڑنے کے بعد زرد وین رک گئی۔ جیپ اس کے پہلو میں جا کر رکی تو وین میں کسی پتا نہیں تھا۔ عبداللہ کے آدمی خطرہ بھانپ کر مال سمیت گ چھوڑ کر کسی طرف بھاگ نکلے تھے۔

انسپکٹر یاور نے بذاتِ خود ڈرائیونگ کیبن کی تلاشی لی یکن اس میں سے بے مصرف کاغذات اور فلمی اداکاراؤں کی ہودہ تصاویر کے تراشوں کے علاوہ کوئی کارآمد چیز دستیاب نہ ہو سکی۔ گاڑی کے رجسٹریشن کے کاغذات سے ڈرائیونگ لائسنس تک سی چیز کا پتا نہیں تھا۔

وہ باہر نکلا تو سپاہی اپنی بندوقیں جیپ میں چھوڑ کر شک بھوسے سے بھرے ہوئے ٹاٹ کے بورے نیچے گرا رہے تھے ور اس کے ساتھ آیا ہوا سب انسپکٹر ان بوروں کا جائزہ لینے میں صروف تھا۔ انسپکٹر یاور بھی اس تلاشی میں شریک ہو گیا۔ اس وران میں لانڈھی سے شہر جانے والی کئی گاڑیاں بھی وہاں رک ئی تھیں۔ جیپ کی سرکاری نمبر پلیٹ اور چند سرکاری وردیوں ی موجودگی نے اس تماش بین مجمع میں قیاس آرائیوں کا سلسلہ شروع کر دیا تھا لیکن انسپکٹر یاور نے ڈانٹ ڈپٹ کر ان لوگوں و زرد وین سے دور ہی رکھا ہوا تھا۔

بھوسے کے بورے زمین پر گرتے رہے لیکن ان میں سے کوئی چیز برآمد نہ ہوئی لیکن جب وین پر چند بورے رہ گئے تو تہ میں کورے لٹھے کے تھیلے نظر آنے لگے۔ سپاہیوں کے ہاتھوں میں اچانک تیزی آ گئی اور بورے گرا کر وہ سب وین پر چڑھ گئے۔

بوروں کے نیچے چھپے ہوئے تھیلے تعداد میں چھ تھے۔ ان کے منہ زرد رنگ کے موٹے دھاگے سے سِلے ہوئے تھے۔ چاقو کے ذریعے پہلے تھیلے کا منہ کھولا گیا تو ان سب کی نگاہیں چمکنے لگیں۔ اس میں سیاہی مائل سبز رنگ کی چرس بھری ہوئی تھی۔

پھر یکے بعد دیگرے تمام تھیلے کھول دیے گئے، وہ سب چرس سے بھرے ہوئے تھے اور کسی بھی تھیلے میں اس کی مقدار پچیس تیس سیر سے کم نہیں تھی۔

انسپکٹر یاور نے چرس کے تھیلے جیپ کے پچھلے حصے میں لدوائے اور ایک باوردی سپاہی کو زرد وین کی نگرانی پر مامور کر کے واپس شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ پیشہ ورانہ اعتبار سے اس کی کارروائی کامیاب رہی تھی جس پر اسے خوش ہونا چاہیے تھا لیکن اس کے چہرے سے فکرمندی جھلک رہی تھی۔ بازار میں چار ساڑھے چار من چرس کے خاصے دام مل سکتے تھے۔ اسے خدشہ تھا کہ عبداللہ اپنے اس نقصان کو خاموشی سے برداشت نہیں کرے گا۔ اس کی پہلی اور فوری انتقامی کارروائی تو یہی ہوتی کہ وہ مقررہ رقم کی ادائیگی کا سلسلہ یکلخت موقوف کر دیتا۔ اس کا دوسرا ردِعمل جس سے یاور پریشان تھا یہ ہوتا کہ وہ ہمیشہ کے لیے یاور سے بدظن ہو جاتا۔ عبداللہ دل کا اتنا نیک آدمی تھا کہ یاور بھولے بھٹکے جب بھی اس سے ملنے چلا جاتا، معاہدے کی رقم سے قطع نظر، وہ کچھ کہے سنے بغیر اسے ہزار پندرہ سو روپے پکڑا دیتا تھا۔ تازہ کارروائی کے نتیجے میں یاور اپنے اس محسن سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو چکا تھا۔

"سارے تھیلے مال خانے میں جمع ہوں گے؟" راستے میں سب انسپکٹر کے سرگوشیانہ سوال نے انسپکٹر یاور کو چونکا دیا۔

یاور ایک لحظے کے لیے سوچ میں پڑ گیا۔ موقع غنیمت تھا، ایک آدھ تھیلا غائب کر کے وہ سب خاصی رقم کما سکتے تھے لیکن وہ عبداللہ کا مال تھا جسے ہضم کرنا اتنا آسان نہیں تھا۔ اسے خود تو نقصان ہوا ہی تھا مگر وہ اس سے کسی اور کو بھی فیض نہیں اٹھانے دیتا۔ تھیلوں کی تعداد یا مال کی مقدار میں ذرا بھی کمی ہوتی تو وہ بلاجھجک چھاپہ مارنے والوں پر خورد برد کا الزام لگا کر ان کی بھی گردن پھنسوا دیتا اور وہ مہینوں محکمہ جاتی تحقیقات میں الجھے رہتے۔

"ہاں۔ ایک تولے کا بھی ہیر پھیر نہ ہونا چاہیے۔" انسپکٹر یاور نے سنجیدگی سے کہا۔ "ورنہ عبداللہ سارے شہر میں ڈنکے پٹوا دے گا۔"

جیپ دفتر کے احاطے میں داخل ہوئی تو اس کے استقبال کے لیے سارا عملہ باہر نکل آیا۔ لوگ انسپکٹر یاور اور اس کے ساتھیوں کو کامیاب چھاپے پر مبارکباد دے رہے تھے۔ ان سب کے لیے وہ کارروائی بہت اہمیت کی حامل تھی۔ یاور سے بغض رکھنے والے البتہ خاموش تھے اور اس وقت کا انتظار کر رہے تھے جب عبداللہ وہاں پہنچ کر اودھم مچاتا لیکن اس منفی پہلو کے باوجود وہ یاور کی بڑی کامیابی تھی۔ سپرنٹنڈنٹ نے اعلیٰ حکام کو چھاپے کی کامیابی کی اطلاع دے دی تھی اور وہ کسی بھی لمحے اخباری نمائندوں کے جھرمٹ میں برآمد ہونے والی بھاری مالیت کی منوں چرس کے معائنے کے لیے پہنچنے والے تھے۔

دفتر کا ہر شخص جیپ سے اتارے گئے تھیلوں تک پہنچنے کے لیے بے تاب تھا جیسے محکمۂ آبکاری میں برسوں کی ملازمت کے باوجود انھوں نے کبھی چرس نہ دیکھی ہو لیکن یاور ان کوششوں کا مطلب خوب سمجھتا تھا۔ تھیلے لاوارث چھوڑ دیے جاتے تو وہاں چرس کی لوٹ مار مچ جاتی جس کے ہاتھ جتنی لگتی، لے بھاگتا اور جب مال خانے کی تحویل میں دینے کے لیے وزن کیا جاتا تو ساری کمی بیشی کی ذمے داری انسپکٹر یاور اور اس کے ساتھ جانے والوں پر عائد کر دی جاتی لہٰذا اس نے فوری طور پر تھیلوں کے منہ بندھوا کر انھیں دفتر ہی کے ایک کمرے میں مقفل کرا دیا۔

❁

الگزینڈر ڈیڑھ ماہ سے یوں ہی کھڑا تھا۔ اسے خریدنے

والوں میں باہمی اختلاف تھے یا مزدور میسر نہیں تھے، وجہ کچھ بھی رہی ہو لیکن گڈانی بیچ والے یہ جانتے تھے کہ اس دیوہیکل تیل بردار جہاز پر توڑ پھوڑ کا آغاز نہیں ہو سکا تھا۔ ان دنوں تو ویسے بھی چڑھتے چاند کی وجہ سے پانی بہت بڑھ چکا تھا۔ جن جہازوں پر آہنی ڈھانچوں کی کٹائی اور توڑ پھوڑ کا کام ہو رہا تھا، ان سے بھی مال اتارنے کا سلسلہ کئی روز سے موقوف تھا۔ جس دن بھی پانی ذرا اترتا، دیوہیکل کرینیں حرکت میں آتیں اور سیکڑوں ٹن لوہا اور فولاد شہر کے کارخانوں اور دکانوں کی طرف روانہ ہونا شروع ہو جاتا۔

بظاہر پانی میں اپنے لنگروں کے سہارے ڈولتا ہوا الگزینڈر ویران نظر آ رہا تھا اور ساحل سے اس کا تاریکی میں ڈوبا ہوا وسیع و عریض ڈھانچا پھیکی چاندنی میں کسی آسیب کی طرح نظر آ رہا تھا۔ لیکن اس کے نچلے حصے میں دو آدمی تشویش زدہ انداز میں خاموش بیٹھے سگریٹیں پھونک رہے تھے۔ ویسے تو ان کا ٹھکانا ایک ایسے اندرونی کیبن میں تھا۔ جہاں نرم بستروں سمیت جملہ آسائشیں میسر تھیں اور وہ بیٹریوں سے جلنے والی روشنیاں بھی بے دھڑک استعمال کرتے تھے کیونکہ وہاں ہونے والی روشنی کا طیارے یا ہیلی کاپٹر کے علاوہ کسی اور ذریعے سے دیکھا جانا ناممکنات میں سے تھا۔ لیکن اس وقت وہ جہاز کے بغلی حصے میں ایسی جگہ موجود تھے، جہاں دو پورٹ ہولز کے شیشے غائب تھے اور ان میں سے خنک سمندری ہوا آ رہی تھی۔ وہ دونوں بار بار ان پورٹ ہولز سے تاحدِ نظر پھیلے ہوئے سیاہ سمندر کی طرف دیکھتے اور پھر اپنی جگہ آ بیٹھتے۔

یہ دوسرا موقع تھا کہ وہ الگزینڈر کو استعمال کر رہے تھے ورنہ اس سے پہلے وھسکی اور دوسری غیر ملکی شرابیں لانے والی لانچ ان کے مخصوص روشنی کے اشاروں کے ذریعے مقررہ مقام پر پہنچتی اور رات کی تاریکی میں ولایتی شراب کی ہزاروں بوتلیں گڑھے میں ڈال کر اوپر سے ریت ڈال دی جاتی اور پھر ان کے آدمی تھوڑی تھوڑی مقدار میں اس نشان زدہ جگہ سے زمین کھود کر بوتلیں لے جاتے رہتے تھے۔ جب تک وہاں سے آخری بوتل بھی نہ چلی جاتی، چوبیس گھنٹے ان کا ایک نہ ایک مسلح آدمی دور رہ کر بوتلوں کی اس اجتماعی قبر کی حفاظت کرتا رہتا تھا۔

اس طریقے میں دوہرا فائدہ تھا۔ لانچ سے مال اتار کر براہِ راست شہر منتقل کرنے کے لیے ساحل کے ان چند گنے چنے حصوں میں سے کسی کا انتخاب کرنا پڑتا تھا، جہاں ٹرک وغیرہ کی رسائی آسان ہو اور ایسا ہر ساحلی علاقہ حکام کی نگرانی میں رہتا تھا پھر ٹرک پر مال بار کرتے ہوئے اگر چھاپہ پڑ جاتا تو لانچ آدمیوں سمیت کھلے سمندر میں فرار ہو جاتی مگر مال کے ساتھ ٹرک بھی پکڑا جاتا جس کے ذریعے اصل ذمے داروں تک بار رسائی ہو سکتی تھی لیکن گڑھوں میں مال دفن کرنے میں بڑی سہولتیں تھیں۔ اس کارروائی کے لیے دشوار گزار ساحلی علاقے بھی منتخب کیے جا سکتے تھے کیونکہ وہاں سے تھوڑی تھوڑی مقدار میں مال نکال لے جانے کا کام جیپوں یا ایسی ہی دوسری فور وھیل ڈرائیو گاڑیوں سے لیا جا سکتا تھا پھر اگر چھاپہ پڑتا تو صرف مال پکڑا جاتا، کوئی ایسی چیز پولیس یا کوسٹ گارڈز کے ہاتھ نہ لگتی جس سے مال درآمد کرنے والے کی نشاندہی کا امکان ہوتا۔ تیسری بڑی آسانی یہ تھی کہ اندھیری راتوں میں لدے ہوئے ٹرک شہر کی طرف سفر با آسانی نگاہوں میں آ سکتا تھا جب کہ قصبوں میں مال لے جانے کے لیے چھوٹی گاڑیاں دن دہاڑے بھی پورے اطمینان سے استعمال کی جا سکتی تھیں۔

مگر جب سے اسمگلنگ کا انسداد کرنے والے اداروں کو اپنے حریفوں کے مقابلے میں اپنی کسمپرسی کا احساس ہوا تھا حالات بدل گئے تھے۔ اس مہم میں اخبارات نے بھی بھرپور طریقوں سے سرکاری اداروں کا ساتھ دیا تھا، سب سے مضبوط جواز یہ تھا کہ فرسودہ مواصلاتی ذرائع اور دقیانوسی ہتھیاروں سے برق رفتار نقل و حمل کے مالک اور اسٹین گنوں سے مسلح اسمگلروں سے مقابلہ کرنا خودکشی اور قانون کو مذاق کا نشانہ بنانے کے مترادف تھا۔

اس مہم کے نتیجے میں کوسٹ گارڈز کو طاقتور انجنوں والی فور وھیل ڈرائیو گاڑیوں کا بیڑہ مل گیا تھا۔ جس کے نتیجے میں ریتیلے اور پتھریلے ساحلی علاقے بھی ان کے گشت کی زد میں آ گئے تھے پھر جدید قسم کی دور مار رائفلیں ملنے کے بعد تو صورتحال ہی بدل کر رہ گئی تھی۔ محکمے کے افسران اپنی کارگزاری دکھانے کے لیے کچھ عرصے سے بحری راستوں کی دن رات کڑی نگرانی کرا رہے تھے اور شہر میں مال کی آمد دھیمی پڑ گئی تھی۔

ان دونوں کو کچھ علم نہیں تھا کہ الگزینڈر کس کی ملکیت ہے۔ انھیں تو بس یہ حکم ملا تھا کہ چوری چھپے اس ناکارہ جہاز میں داخل ہو جائیں اور کھلے سمندر کے رُخ پر واقع پورٹ ہولز کے شیشے توڑ کر جہاز پر مال اتروانے کا بندوبست کریں۔

الگزینڈر بالکل خالی تھا۔ اس لیے اس کے پورٹ ہولز سطح سمندر سے خاصے بلند ہو گئے تھے لیکن پچھلی بار اندھیری رات میں جہاز کے ساتھ لگنے والی لانچ کے عملے نے نہایت آسانی سے ساتھ گتے کے ڈبوں میں بند بوتلیں الگزینڈر کے نچلے حصے میں اتار دی تھیں۔ وہ دونوں مال اتروانے کے بعد رات کے اندھیرے میں پانی میں تیرتے ہوئے واپس ہو گئے تھے لیکن آج جہاز پر پہنچنے کے بعد یہ دیکھ کر حیران رہ گئے تھے کہ پچھلے ہفتے جہاز پر اتارے جانے والے مال کا کہیں پتا نہیں تھا۔

ان کا خیال تھا کہ توڑنے کے لیے خریدے جانے والے جہازوں پر دیگر ساز و سامان کے علاوہ رنگ روغن، تیل، بال بیرنگز اور فاضل پرزہ جات کی پیٹیوں کی بھی کثیر مقدار موجود ہوتی ہے۔ لہٰذا ان ہی کے ساتھ شراب کا ذخیرہ بھی ڈنکے کی چوٹ پر جہاز سے نکال لیا گیا تھا جس کا مطلب تھا کہ جہاز خود ان کے مالک کی ملکیت تھا یا وہ اس میں حصے دار تھا۔ ورنہ اتنے اعتماد سے الگزینڈر کو اپنے بحری اڈے کے طور پر استعمال نہ کر پاتا۔

”سوا بارہ بج رہے ہیں۔“ لمبوترے چہرے والے نے اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالتے ہوئے اپنے ساتھی سے کہا۔

”بس سمندر کی طرف نگاہ رکھو، کسی بھی وقت اشارہ مل سکتا ہے۔“ دوسرے نے اپنی گود میں پڑی ہوئی ٹارچ سے کھیلتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر بعد کافی دور، گہرے سیاہ سمندر کے سینے پر ایک سرخ روشنی چمکی جو چند ثانیوں تک برقرار رہ کر معدوم ہو گئی۔ وہ دونوں بے چینی سے اٹھ کر پورٹ ہول کے قریب پہنچ گئے۔ جہاز کے نچلے حصے سے ٹکرا کر دم توڑتی ہوئی موجوں کے ٹھنڈے ٹھنڈے جھاگ اُڑ کر ان کے چہروں سے ٹکرانے لگے۔

چند سیکنڈ تک ان دونوں کی نگاہیں سمندر کے اسی حصے کی طرف جمی رہیں جدھر سُرخ روشنی چمکتی دکھائی دی تھی پھر دوسرے نے اپنی ٹارچ کا رُخ اسی طرف کر کے اسے جلا دیا اور ٹارچ کے شیشے سے سبز روشنی خارج ہونے لگی۔ تین بار ان اشاروں کا تبادلہ ہوا پھر دوسرے نے اپنی ٹارچ نیچے ڈال دی۔

وہ دونوں پورٹ ہول سے گہرے سیاہ سمندر میں جھانکتے رہے جہاں لہریں ہی لہریں نظر آ رہی تھیں پھر بادلوں سے ڈھکے ہوئے آسمان کا کوئی حصہ صاف ہوا اور دھندلائی ہوئی چاندنی ہر طرف تیر گئی۔ اس پھیکی روشنی میں انھیں ایک لانچ کا تاریک ہیولا نظر آیا جو بتدریج واضح ہوتا جا رہا تھا۔

تقریباً دس منٹ بعد وہ لانچ کوئی آواز پیدا کیے بغیر الگزینڈر سے آ لگی، اس کا انجن شاید لہروں کے شور میں پہلے ہی بند کر دیا گیا تھا۔ اس لانچ سے دو قوی الجثہ افراد رسّہ تھامے یکے بعد دیگرے الگزینڈر پر کود آئے اور انھوں نے وہ موٹا رسّہ ایک مضبوط آہنی ستون سے باندھ دیا۔ اسی کے ساتھ گتے کی دس دس بوتلوں کے سائز کی پیٹیاں برق رفتاری سے اتاری جانے لگیں، لمبوترے چہرے والا آنے والوں کا ہاتھ بٹانے لگا، دوسرا الگ کھڑا پیٹیاں گنتا رہا۔

اندھیرے میں بجلی کی سی سُرعت سے نقل و حرکت کرتے ہوئے ملاح اس وقت بھوت نظر آ رہے تھے، شاید مال کی منتقلی ان کے لیے اہم ترین مرحلہ تھا کیونکہ وہ سب ہی خاموش اور سنجیدہ تھے، بس ان کے ہاتھ اور پیر مشینی انداز میں چل رہے تھے۔

یہ کارروائی چل ہی رہی تھی کہ اچانک اندر والے چونک پڑے کیونکہ باہر سے یک بیک تیز روشنی کا انعکاس اندر در آیا تھا، لانچ کے عرشے سے کئی تحیر آمیز چیخیں ابھریں پھر پے در پے کئی چھپاکے سنائی دیے، شاید کچھ لوگ بوکھلا کر سمندر میں کود گئے تھے۔

”جو جہاں ہے وہیں رُکا رہے۔“ باہر میگا فون پر ایک تحکم آمیز آواز گونجی۔ ”تمھاری لانچ اس وقت کوسٹ گارڈز کے نرغے میں ہے۔“

وہ آواز سنتے ہی جہاز کے اندر موجود لوگوں میں سنسنی پھیل گئی اور اندھیرے میں جس کا جدھر منہ اٹھا، وہ اُدھر بھاگ لیا۔ باہر شراب لانے والی لانچ روشنی میں نہائی ہوئی تھی۔ غالباً اس پر دو طرف سے سرچ لائٹوں کی روشنی پھینکی جا رہی تھی اور فضا میں دو انجنوں کی غراہٹیں گونج رہی تھیں شاید کوسٹ گارڈز کی لانچیں اپنی تمام روشنیاں گل کر کے ساحل پر لنگر انداز جہازوں کے قریب سے ہوتی ہوئی دو سمتوں سے نمودار ہوئی تھیں۔

لمبوترے چہرے والے نے آگے بڑھ کر پورٹ ہول کے ٹوٹے ہوئے شیشے سے باہر جھانکا تو اسے لانچ کے عرشے پر کئی آدمی ہاتھ اٹھاتے ہوئے نظر آئے، دوسری طرف لانچ دھیمے دھیمے ہلکورے لیتی ہوئی جہاز سے دور سرک رہی تھی۔ شاید کسی نے اوپر فرار ہوتے ہوئے آہنی ستون سے بندھا ہوا رسّہ کھول دیا تھا۔ تاکہ لانچ والوں کو بھاگ نکلنے کا موقع ملے تو وہ اس سے بھرپور فائدہ اٹھا سکیں۔

چند ثانیوں بعد اس لانچ کے عرشے پر کوسٹ گارڈز کا باوردی اور مسلح عملہ بھی نظر آنے لگا۔

❋

شہر میں ایک عجیب سی کیفیت تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ پولیس اور دوسرے محکمے منشیات فروشوں..... کی روزی بند کرنے پر تل گئے ہیں۔ زیرِ زمین دنیا کے ذہین لوگ بھی حیران تھے کہ یک بیک پولیس کی کارکردگی کی شرح اتنی بہتر کیسے ہو گئی، آبکاری والوں کو منشیات کی آمد و رفت کا علم کیسے ہونے لگا۔ کوسٹ گارڈز صحیح وقت اور مقام پر کارروائی کیسے کر رہے تھے۔ بس ایسا معلوم ہو رہا تھا، جیسے کسی درویش نے قانون نافذ کرنے والے تمام اداروں کے

اہلکاروں کو کوئی تعویذ گھول کر پلا دیا ہو جس کے نتیجے میں انھیں جرائم اور مجرم اچانک ہی نظر آنے شروع ہوگئے ہوں۔

ایک دن کی قلیل مدت میں منوں کے حساب سے چرس پکڑی گئی تھی، ولایتی شراب کی سیکڑوں بوتلیں ضبط کی گئی تھیں۔ لیاری اور کورنگی کے علاقے میں دیسی شراب تیار کرنے کی دو بھٹیاں تباہ کی گئی تھیں، اس کے علاوہ چھوٹے موٹے چھاپے گنتی سے خارج تھے۔ ایک دن کی اس کارروائی نے زیرِ زمین دنیا کے سربرآوردہ لوگوں کو بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ جس کے نتیجے میں ایک دوسرے کے لہو کے پیاسے لی مارکیٹ کے ایک ٹھکانے پر صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لیے جمع ہوئے تھے۔

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ بڑے چھاپوں کے سلسلے میں مخبری ہوئی ہے۔" عبداللہ نے ہر ایک کا جائزہ لیتے ہوئے گمبھیر آواز میں کہا۔ "مجھے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے کارکنوں میں کسی طرح کالی بھیڑیں شامل ہوگئی ہیں۔ ورنہ میں اتنا جانتا ہوں کہ اس طرح بے خبری میں میرا مال کبھی نہیں پکڑا گیا۔"

"کالی بھیڑیں!" لعل خان نے فکرمندانہ لہجے میں دہرایا۔ "اگر تمھاری بات درست ہے تو کالی بھیڑیں خاصی منظم معلوم ہوتی ہیں۔ سب نے ایک ہی دن اپنی اپنی معلومات حکام تک پہنچائی ہیں۔ بات ذرا سمجھ میں نہیں آتی۔"

"مجھے ایکسائز کے ایک سپاہی نے خود بتایا ہے۔" عبداللہ لعل خان کی طرف متوجہ ہوگیا۔ "اگر سرکل کی بات ہوتی تو شاید کچھ بھی نہ ہوتا مگر مخبری اوپر ہوئی تھی اور اوپر کے احکام ٹالنا نچلے عملے کے بس سے باہر ہوتا ہے۔"

"اپنے اپنے گریبان میں نگاہ ڈالو۔" مکھن خان کی پاٹ دار آواز گونجی۔ "ایسا تو نہیں کہ اپنے اپنے لالچ میں ہم خود ہی ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہے ہوں۔"

چند سیکنڈ تک مجمع پر موت کا سا سناٹا طاری رہا، نگاہیں دوسروں کے چہروں پر پھسلتی رہیں، ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ہر ایک دوسروں کی زبان سے اعترافات سننے کا منتظر ہو۔ پھر اچانک سب نے ایک ساتھ بولنا شروع کر دیا۔ ہر بولنے والا مکھن خان کی رائے پر سخت برہمی کا اظہار کر رہا تھا جیسے اس نے ان سب کو کوئی گندی سی گالی دے ڈالی ہو۔ ہر ایک کا یہی خیال تھا کہ آپس کی رقابتیں علیحدہ بات تھی۔ ایسے معاملات کو وہ آپس میں نمٹانا خوب جانتے تھے، ان میں کوئی اتنا گرا ہوا نہیں تھا کہ اپنے کسی رقیب کو زک پہنچانے کے لیے سرکاری اہلکاروں سے مدد کے لیے رجوع کرتا۔

"پھر یہ بتاؤ کہ شہر میں ایک دم کیا ہونے لگا ہے؟" مکھن خان کا گونجیلا سوال اس ملے جلے شور پر حاوی تھا۔ "کوئی تو وجہ ہو اس کی۔"

"بھائی! میں تو سیدھی سی بات جانتا ہوں۔" لعل خان دونوں ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "ہم دھندا کرنے والے لوگ ہیں، قانون سے مقابلہ کرنے میں سراسر نقصان ہی نقصان ہے۔ جب تک بدمعاشیاں چل رہی ہیں، چپ چپاتے ہاتھ کھینچ لو، ذرا سناٹا ہو تو پھر میدان میں آجائیں گے۔"

"تم لوگ تو موٹی اسامیاں ہو۔" ٹھاکر کے نام سے مشہور دلال کی طنزیہ آواز ابھری۔ "دس پانچ دن غوطہ لگا لیا تو جمع پونجی پر گزارا کر لو گے مگر ہمارے بندوں کا کیا ہوگا جو روز کے روز مال بیچ کر اپنا دال دلیا کماتے ہیں۔"

"یہ حل تو سب کو معلوم ہے لعل خان!" عبداللہ کا لہجہ بھی طنزیہ تھا۔ "ہم یہاں صرف اس لیے جمع ہوئے ہیں کہ اس مخبری کا توڑ کریں اور پتا چلائیں کہ شہر میں کون ہمارے دھندے کا دشمن ہو رہا ہے؟"

"پتا چلا لو تو مجھے بھی بتا دینا میرے بھائی!" لعل خان کے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ ابھر آئی۔ "اس کے دس جوتے میں بھی لگا دوں گا۔"

"اڈوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوئی مگر ڈر کے مارے آج زیادہ تر ٹھکانے بند پڑے ہیں۔" ٹھاکر متاسفانہ لہجے میں بولا۔ "لڑکے بھوکے مر جائیں گے۔"

"یہاں اپنی چمڑی کی فکر ہے اور یہ لڑکوں کو رو رہا ہے۔" چوہدری برہم ہوگیا۔ "ایسے نشے باز نشے کے بغیر سو نہیں سکتا، اڈے بند ہیں تو کیا ہوا، آس پاس چل پھر کر دھندا ہو رہا ہوگا۔ ایسے میں گاہک بھی خوشی خوشی ایک کا سوا دے جاتا ہے۔"

"ایک آدھ روز کاڑی چل جائے گی مگر پھر مال کہاں سے ملے گا؟" ٹھاکر بولا۔ "شہر کے مائی باپ تو سب یہاں جمع ہیں۔"

"تو اپنا دل چھوٹا نہ کر بھائی!" مکھن خان پھر بول پڑا۔ "یہ کوئی پنچایت نہیں ہے جس کا فیصلہ سب مانیں گے۔ جو خطرہ مول لے گا، وہ دوگنا نفع بھی کمائے گا۔ یہاں سب ہاں میں ہاں ملائیں گے مگر باہر ہر ایک اپنی مرضی کرے گا۔"

وسیع کمرے میں ایک مرتبہ پھر شور ہونے لگا۔ مکھن خان کو لتاڑنے میں وہی لوگ پیش پیش تھے جو اس سنگین صورتِ حال میں رسک لے کر ایک کے چار بنانے کی فکر میں پڑے ہوئے تھے۔ انھیں ڈر تھا کہ مکھن خان کی بار بار کی تکرار پر کہیں اس بے قاعدہ اجلاس میں کوئی ایسی تجویز نہ منظور کر لی جائے جس کے نتیجے میں ان کے سنہرے خوابوں کی تکمیل کا معاملہ کھٹائی میں پڑ جائے اور یوں وہ اجلاس کسی نتیجے پر پہنچے بغیر برخواست ہوگیا۔

٭

جہانگیر کا سینہ فخر سے پھولا ہوا تھا۔ اس کے آدمیوں نے ...ری محنت سے کام کیا تھا۔ طارق اور نادر نے بھی بہت پھرتی ...ائی تھی جس کے نتیجے میں شہر میں روایتی نشوں کا کال پڑ گیا ...ا اور زیرِ زمین دھندے کرنے والوں پر ایسا سوگ طاری ہوا ...ہ جیسے وہ سب اپنے قریبی اعزہ کو اجتماعی قبر میں دفن کر کے ...ٹے ہوں۔

اسے عیسیٰ خان کو رقم پہنچانے کا کام بھی سونپا گیا تھا۔ جو ...س نے نہایت خوش اسلوبی سے پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا تھا۔ اس ایک کارکن کسی زمانے میں مشہور نقب زن رہ چکا تھا۔ پھر ایک ...ردات میں موقع سے رنگے ہاتھوں گرفتاری کے بعد پانچ سال ...قید بامشقت سنائی گئی تو اس نے دل ہی دل میں آئندہ کے ...ے اس کام سے توبہ کر لی تھی۔ جیل سے باہر آیا تو اسے اپنی ...وبہ یاد تھی۔ لہٰذا اس نے کوئی سیدھا سادا دھندا اختیار کرنا ...ا لیکن ہر جگہ اس کا ماضی آڑے آتا رہا۔ جھوٹ بول کر ایک ...وٹل میں نوکری کر بھی لی لیکن تیسرے دن جب ایک جیب تراش ...نے ہوٹل کے مالک کو اس کے داغ دار ماضی سے آگاہ کیا تو اسے ...ین دن کی اجرت دیے بغیر کھڑے کھڑے نوکری سے جواب ...ے دیا گیا لیکن اس نے ایسے بدترین حالات میں بھی نقب زنی ...لے پرانے پیشے سے رجوع نہیں کیا اور جب نوبت فاقوں تک ...پہنچ گئی تو وہ ایک چرس فروش سے جا ٹکرایا پھر رفتہ رفتہ وہ ...ہانگیر کے کارندوں میں شامل ہوگیا۔ جہانگیر کو معلوم تھا کہ وہ محض ...یک نظر تالا دیکھنے کے بعد چابی تیار کر لینے کے فن میں ماہر تھا لہٰذا ...س نے اپنے طے کردہ لیٹر بکس کی دوہری چابیاں بنوانے کے لیے ...سی کا انتخاب کیا اور دونوں چابیوں کی کارکردگی سے مطمئن ہونے کے بعد ایک چابی لفافے میں بند کر کے ایک گداگر کے ذریعے عیسیٰ خان کو بھجوا دی۔ وہ دور کھڑا اس وقت تک گداگر کی نگرانی کرتا رہا تھا جب تک وہ عیسیٰ خان کے دفتر میں نہ داخل ہوگیا۔ چند منٹ بعد اس نے ایک پبلک بوتھ سے عیسیٰ خان کو فون کیا اور چابی کے بارے میں اپنے استفسار کا جواب اثبات میں سن کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

شام ڈھلے رقم لیٹر بکس میں بند کر کے جہانگیر نے اسے دوبارہ فون کیا اور لیٹر بکس کا محلِ وقوع بتاتے ہوئے رقم حاصل کرنے کا طریقہ بتایا تو عیسیٰ خان کو پہلی بار اس چابی کی افادیت کا علم ہوا۔ پھر نصف گھنٹے بعد ہی جہانگیر نے اس امر کی تصدیق کر لی کہ پوری رقم عیسیٰ خان کو مل گئی تھی۔

مگر ان کامیابیوں کے باوجود وہ خاصا اداس تھا۔ کیونکہ ٹرانسمیٹر پر بار بار کی کوششوں کے باوجود ڈی ون کی طرف سے کوئی جواب نہیں مل رہا تھا۔ ایک بار بی فور کے لیے پیغام نشر کیا تو دوسری طرف سے کسی نسوانی آواز نے بی فور کی عدم موجودگی کی اطلاع دیتے ہوئے اس سے پیغام دریافت کرنا چاہا لیکن جہانگیر نے کچھ بتانا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ بی فور نے ایسے کسی موقع کے لیے اسے کوئی ہدایت نہیں دی تھی۔

پولیس، کوسٹ گارڈز اور آبکاری کے عملے کی بھرپور کارروائی کے نتیجے میں فوری طور پر تو بازار میں سناٹا چھا گیا تھا لیکن بعض ذرائع نے ہیروئن کی فوری خریداری میں دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔ اسے یہ اطلاعات نادر اور طارق سے ملی تھیں اور اس نے انھیں فوری طور پر سودے کرنے کا اختیار دے دیا تھا۔

اسے قوی امید تھی کہ نئی حکمتِ عملی کے نتیجے میں ہیروئن کی مانگ میں ایک دم تیزی پیدا ہوگی۔ وہ برآمدے میں بید کی آرام کرسی پر نیم دراز تھا کہ اچانک اس کی بیوی سلمیٰ کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ "یہاں بیٹھے کیا سوچ رہے ہو؟ معلوم ہوتا ہے کہ تمھیں دن بدن تنہائی سے پیار ہوتا جا رہا ہے۔"

جہانگیر اس کی طرف مڑا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ "جب سے تم لاہور سے آئی ہو، ہر وقت تنقید کا موقع تلاش کرتی رہتی ہو، میں منتظر تھا کہ تم چائے لے کر یہیں آؤ گی۔"

"چائے خواب گاہ میں پڑے پڑے ٹھنڈی ہو چکی ہے۔" وہ اس کے سامنے پڑی ہوئی خالی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "تم سچ سچ بتاؤ جہانگیر! تمھیں کیا پریشانی ہے؟ تم ہر وقت چُپ چُپ سے رہتے ہو، زیادہ وقت باہر گزارنے کی کوشش کرتے ہو اور گھر میں ہوتے ہو تو مجھ سے بچے بچے پھرتے ہو جیسے مجھ سے اکتا گئے ہو۔ میں اس گھر میں اور اس شہر میں صرف تمھاری وجہ سے آئی ہوں، تم خود ہی انصاف سے بتاؤ کہ میں کب تک اور کس دل سے تمھارا یہ رویّہ برداشت کروں؟"

"تم تو اچھی خاصی تقریر کر لیتی ہو۔" جہانگیر نے بات مذاق میں اُڑانے کی کوشش کی مگر سلمیٰ کے بشرے پر چھائی ہوئی سنجیدگی میں فرق نہ پڑتے دیکھ کر اسے بھی سنجیدہ ہونا پڑا۔ "تمھیں وہم ہونے لگا ہے سلمیٰ! بس تم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ میں تم سے دور رہنے کی کوشش کرتا ہوں۔ لہٰذا میری ہر حرکت کو تم اسی زاویے سے دیکھتی ہو۔"

وہ چند ثانیوں تک اسے ملامت آمیز نظروں سے گھورتی رہی پھر اداس لہجے میں بولی۔ "مجھے مجبور نہ کرو جہانگیر! ایسا نہ ہو کہ تم سے میرے سوال کا جواب ہی نہ بن پڑے۔"

"یہی تو خرابی ہے کہ تم سوچتی زیادہ ہو۔" وہ کرسی میں سیدھا

ہوتا ہوا بولا۔ "اگر یہ بات دل میں رکھنے کے بجائے مجھ سے تبادلۂ خیال بھی کرتی رہا کرو تو اس ذہنی گھٹن سے بچی رہو گی جو تمھیں میرے خلاف اکساتی رہتی ہے۔"

"اچھا پھر یہ بتاؤ کہ میاں بیوی میں ایسا کون سا پردہ ہوتا ہے کہ پچھلے ڈیڑھ گھنٹے میں تم کم ازکم دو بار خود کو مختلف کمروں میں بند کر چکے ہو۔" تھوڑے سے توقف کے بعد وہ جارحانہ لہجے میں پوچھ بیٹھی اور جہانگیر کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ ٹرانسمیٹر پر ڈی ون یا بی فور سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ سلمٰی کی آنکھوں میں دُھول جھونکنے میں کامیاب ہو گیا ہے لیکن وہ اس کی ایک ایک لمحہ نگرانی کر رہی تھی۔

"مجھے ایک پرانی ڈائری کی تلاش ہے۔" جواب دیتے ہوئے اس نے خود اپنے چہرے پر کمزوری غالب آتی محسوس کی۔ "وہی ڈھونڈ رہا تھا۔"

"اندر سے بولٹ چڑھا کر؟" اس نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ "مجھے بتایا ہوتا، میں خود تمھیں اس نابکار ڈائری کی تلاش میں مدد دیتی۔"

"بولٹ نہیں چڑھایا تھا، صرف دروازہ بند کیا تھا۔" جہانگیر نے تھکے ہوئے انداز میں مزاحمت کی کوشش کی۔

"جھوٹ مت بولو جہانگیر!" سلمٰی کی تیوریاں تن گئیں۔ "تم سمجھ رہے تھے کہ میں غافل ہوں مگر میں ایک ایک لمحے تمھاری نگرانی کر رہی تھی۔ میں نے دروازے پر دباؤ ڈال کر دیکھا تھا۔ مگر وہ اندر سے بند کر لیا گیا تھا۔ پرانی ڈائری تلاش کرنے کے لیے آخر اتنی رازداری کی کیا ضرورت تھی؟"

جہانگیر اسے غصیلی نگاہوں سے گھورنے لگا۔ "بڑے شرم کی بات ہے کہ تم اپنے شوہر کا پیچھا کرتی ہو۔ کمرہ بند بھی تھا تو کیا غضب ہو گیا، میں اکیلا ہی تھا نا، یا میرے ساتھ تم نے کسی پری کو اس کمرے میں داخل ہوتے دیکھ لیا تھا جو اس قدر تجسس میں مبتلا ہو گئیں۔"

"میں بس بتائے دیتی ہوں کہ ان حالات میں یہاں رہنا میرے بس سے باہر ہے۔" وہ رُندھی ہوئی آواز میں بولی۔ "اگر تم نے اپنا رویّہ تبدیل نہ کیا تو میں یہاں رہ کر پاگل ہونے کے بجائے لاہور جانا پسند کروں گی۔"

وہ اٹھ کر چلی گئی اور جہانگیر سوچ میں پڑ گیا۔ ان چاروں میں ڈینی اور طارق مجرّد تھے۔ جب کہ نادر خان اور وہ خود شادی شدہ تھا۔ جہاں تک نادر خان کا تعلق تھا، اس کی بیوی برسوں سے جانتی تھی کہ اس کا شوہر الٹے سیدھے دھندوں سے روزی کماتا

ہے۔ لہٰذا اس کے بھڑکنے کا امکان ہی نہیں تھا۔ پھر حکم کا بندہ تھا۔ اس کی ذمے داری صرف اتنی تھی کہ حکم ملے وہ بجالائے اور اپنے آدمیوں کے ذریعے تعمیل کرائے۔ اس سے آگے وہ اپنے وقت کا خود ما لیکن جہانگیر پر بھاری ذمّے داریاں عائد تھیں۔ وہ اپنے آدمیوں کو تقسیم کار اور پھر ان کی کارکردگی کے لیے جوا اسے اپنے شب و روز پر کوئی اختیار نہیں تھا۔ جب کا رابطہ برقرار تھا، ڈی ٹو دن یا رات کے کسی بھی حص سے رجوع کر بیٹھتا تھا اور اب ٹرانسمیٹر مل جانے کے دشواری پیدا ہو گئی تھی کہ وہ اس اپریٹس پر متعلقہ او طرح رابطہ قائم کرے کہ سلمٰی کے شبہات کو مزید تقویت

گھر میں ہر وقت ٹرانسمیٹر اپنے سینے سے لگا کہ کہیں اچانک اس پر کوئی کال نہ آجائے۔ کہیں رکھ اندیشہ تھا کہ کسی وقت اس کی لاعلمی میں سلمٰی نہ تک سن کر اس کی طرف متوجہ نہ ہو جائے۔ اگر کسی وقت سے قریب ہونے کی کوشش کرتی تو لباس میں ٹرانسمیٹر کا راز فاش ہو جانے کے خوف سے اسے مضحکہ خیز رویّہ پر مجبور ہونا پڑتا۔ پھر رات کو سونے سے قبل وہ ٹرانسمیٹر کی نظر سے بچا کر گیراج میں مقفل کرنا نہ بھولتا تھا۔ اس غور کیا تو اسی نتیجے پر پہنچا کہ سلمٰی کی برہمی بلاجواز نہیں وہ خود ہی اسے اپنی طرف سے بدظن کرتا رہا تھا۔ اس میں ڈینی کے ذریعے ملنے والے ٹرانسمیٹر کا بڑا دخل تھا۔

اس نے فیصلہ کر لیا کہ جب بھی کسی سے رابطہ اپنے گلے کی اس گھنٹی کے بارے میں ضرور کوئی فیصلہ اسے دن رات جان سے لگائے پھرنے کے بجائے اگر کے تبادلے کے اوقات مقرر ہو جاتے تو اس کی بیشتر الجھ ہو سکتی تھیں اور وہ سلمٰی کو کسی شبہے کا موقع دیے بغیر مقر میں ٹرانسمیٹر سمیت اپنی کار میں گھر سے باہر جا سکتا تھا

گروہ کے تعلق کے علاوہ ڈینی اس کا پرانا اور گہرا تھا۔ نامعلوم باس نے جہانگیر تک ٹرانسمیٹر بھی اسی کے ذ تھا۔ لہٰذا جہانگیر نے سوچا کہ ڈی ٹو یا بی فور سے اس موض بات کرنے سے قبل ڈینی سے مشورہ کر لے لیکن فوراً ہی کہ ان دنوں ڈینی سے ان سب کو دور رہنے کے احکا ہوئے تھے جس کی خلاف ورزی کا مطلب اوپر والوں غضب کو دعوت دینا تھا۔

سلمٰی جن تیوروں کے ساتھ اٹھ کر گئی تھی، ان کی جہانگیر کو اندازہ تھا کہ وہ خواب گاہ میں مسہری پر تکیے میں

ہو رہی ہوگی۔ وہ اسے دل و جان سے چاہتا تھا اور اس ازدگی میں جہانگیر کے ارادے کا قطعی دخل نہیں تھا۔ لہٰذا اس خیال سے اٹھا کہ خواب گاہ میں جا کر اپنی سلمٰی کو منائے گا ن برآمدے میں دوسرا قدم بڑھاتے ہی اسے اپنی جیب سے لک کی آسیبی آواز سنائی دینے لگی اور وہ بوکھلائے ہوئے زیں اندر داخل ہو کر تیزی سے سیڑھیاں عبور کرتا ہوا اوپر لی چھت پر پہنچ گیا۔

اس نے آپریٹس آن کیا تو اس پر بی۔ فور بھرائی ہوئی ازمیں اسے پکار رہا تھا۔

"تمھاری کارکردگی بہت شاندار جا رہی ہے۔" بی۔ فور نے نگیر کا جوابی سگنل سننے کے بعد کہا۔ "اخبارات کے علاوہ بازار سے نے والی خبریں بھی بہت حوصلہ افزا ہیں بس کچھ دن اور یہی رت حال برقرار رہنی چاہیے۔ مال کی کیا پوزیشن ہے؟ اوور۔"

"اگلی ہدایات تک دباؤ برقرار رہے گا سر!" اس نے ہی آواز میں کہا۔ "آج نئی صورتِ حال کے بارے میں لی مارکیٹ علاقے میں بازار کے سربرآوردہ لوگوں کا ایک اجلاس بھی تھا جو کسی نتیجے پر پہنچے بغیر ختم ہو گیا، دوسری طرف بازار میں رے مال کی فوری مانگ پیدا ہو گئی ہے... اوور۔"

"آج سے ہر روز ایک تازہ کھیپ جیوا ہاؤز پہنچتی رہے ، مال لانے والے دو افراد ہوں گے، وہ اپنا نام بلیک برادرز ائیں گے، رقم بھی ان ہی کو ادا کی جائے گی... عیسٰی خان کا معاملہ کیا رہا؟ اوور۔"

"اسے مقررہ طریقے سے رقم پہنچا دی گئی۔ اوور۔" جہانگیر نے مختصراً بتایا۔

"اسے ادا کی جانے والی رقم تم پہلی ادائیگی میں سے منہا کر لوگے، عیسٰی خان پر کچھ دن نگاہ رکھنی ہوگی کہ وہ دوبارہ چرس فروشی میں ملوّث نہ ہونے پائے... اوور۔"

"طارق کے بارے میں کیا حکم ہے سر؟ اوور۔" اس نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔

"اچھا کیا کہ تم نے یاد دلا دیا، اسے فی الحال الگ ہی رکھو، مقرب خان ضرور راستے سے ہٹا دیا گیا لیکن اس کے کئی ساتھی قتل والی شام طارق کو ہراساں کرتے رہے تھے، وہ واقف ہوں گے کہ مقرب خان اپنے قتل سے پہلے کس کی راہ پر تھا۔ ہمیں کچھ روز تک ان کے ردِّعمل کا انتظار کرنا ہوگا... اوور اینڈ آل۔"

سلسلہ منقطع ہونے کے بعد جہانگیر نے آپریٹس آف نہیں کیا۔ بی فور نے تو اپنی بات مکمل کر لی تھی لیکن اس کی بات شروع ہی نہ ہو سکی تھی۔ لہٰذا اس نے دوبارہ رابطہ قائم کر لیا۔

"اب کیا بات ہے... اوور؟" دوسری طرف سے بی فور نے جواب دیتے ہوئے سوال کیا۔

"میرا ذاتی مسئلہ ہے سر! میری بیوی میری سرگرمیوں سے لاعلم ہے، ٹرانسمیٹر کی وجہ سے مجھے الجھن ہے کہ یہ اس کی نگاہ میں نہ آجائے۔" جہانگیر نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "مجھے گھر میں ہوتے ہوئے بھی محتاط رہنا پڑتا ہے کہ نہ جانے کب آپ کی کال آجائے۔ اوور۔"

"پھر کیا چاہتے ہو؟ اوور۔" بی فور کی آواز سے ناگواری مترشح تھی۔

"سر! اگر کوئی دشواری نہ ہو، میرا مطلب ہے کہ کام کو متاثر کیے بغیر پیغامات کے تبادلے کے لیے کوئی وقت مقرر ہو سکے تو میرے لیے بہت آسانی پیدا ہو جائے گی۔" اس نے کہا۔ "اور میں بہت سی گھریلو دشواریوں سے بچ جاؤں گا۔ اوور۔"

"میں تمھاری الجھن سمجھ رہا ہوں۔" سپاٹ لہجے میں جواب ملا۔ "مجھے کال کرنی ہوگی تو آٹھ اور سوا آٹھ کے درمیان کروں گا، تم اپنی ضرورت کے تحت کسی بھی وقت رجوع کر سکتے ہو، اگر میں نہ ملوں تو بی فور کی کال ریسیو کرنے والی لڑکی کو بلاجھجک پیغام نوٹ کرا سکتے ہو... اوور۔"

"بہت بہت شکریہ سر!" جہانگیر تشکر آمیز لہجے میں بولا۔ "آپ نے میری بہت بڑی دشواری رفع کر دی ہے۔ اوور۔"

"اوور اینڈ آل۔" دوسری طرف سے اختتامی فقرہ ادا کر کے بات ختم کر دی گئی اور جہانگیر ٹرانسمیٹر آف کر کے نیچے اتر آیا۔ وہ خواب گاہ میں پہنچا تو سلمٰی اس کی توقع کے عین مطابق بستر پر اوندھی پڑی سسکیوں کے ساتھ رو رہی تھی۔

جہانگیر نرم قالین پر بے آواز قدموں سے آگے بڑھا اور آپریٹس الماری پر ڈال کر سلمٰی کے قریب پہنچ گیا۔

اس سفر سے قبل مشرقِ بعید کے بارے میں ڈینی کے خیالات کچھ زیادہ اچھے نہیں تھے کیونکہ اس کی دانست میں ستواں ناک اور بڑی بڑی آنکھیں حسن کے دو بنیادی لوازم تھے۔ ان اوصاف کی موجودگی میں ہر رنگ اور نسل کی عورت کو دلکش قرار دیا جا سکتا تھا لیکن جہاں قومی پیمانے پر چپٹی ناکیں پائی جاتی ہوں اور پھولے ہوئے پپوٹوں میں بھنچی ہوئی آنکھیں عام ہوں، وہاں حسن کا تصور ہی بے معنی تھا البتہ سستی خرید و فروخت کے لیے وہ اس علاقے کو جنّت تصور کرتا تھا لیکن ٹوکیو پہنچنے کے بعد اس کے سارے پرانے نظریات درہم برہم ہو کر رہ گئے تھے۔ ٹوکیو کے پُرہجوم راستوں، بازاروں اور تفریح گاہوں میں ایسی بے شمار دراز قد

جاپانی لڑکیاں نظر آئیں جن کے خدوخال اس خطے کی روایات کے برعکس خاصے تیکھے تھے لیکن ڈینی تو بس چپٹی ناکوں اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں پر ہی ریشہ خطمی ہوتا رہا۔ تصویروں کے برعکس نسوانی حسن اپنی تمام تر لطافتوں کے ساتھ ان زندہ پیکروں میں ہی جھلکتا تھا جو اپنے ایک ایک نقش سے مقامی معلوم ہوتے تھے۔ ہوٹل سے اس شخص کو فون کیا، جس کے ذریعے اس نے رہائشی ہوٹل کا انتخاب کرنے کے علاوہ خاصی مقدار میں مقامی کرنسی بھی حاصل کی تھی۔ سوکوموتو ایک جاپانی نژاد خوش مزاج نوجوان تھا۔ جس سے ڈینی ائرپورٹ پر باس کی ہدایت کے مطابق ملا تھا اور وہ فوراً ہی ڈینی کے ساتھ ائرپورٹ سے شہر روانہ ہوگیا تھا۔

"میں بڑی الجھن میں پڑ گیا ہوں دوست!" ڈینی نے فون پر سوکوموتو کی آواز پہچانتے ہی انگریزی میں کہا۔

"کسی سے لڑ تو نہیں بیٹھے؟" سوکوموتو نے گھبرائے ہوئے لہجے میں بلا توقف سوال جڑ دیا۔

"جیب خاصی ہلکی ہوچکی ہے، اس سلسلے میں تم کہاں تک میری مدد کرسکو گے؟ میرا خیال ہے کہ یہاں رہتے ہوئے مجھے اخراجات پر قابو پانا دشوار ثابت ہوگا۔"

"اوہ! تم نے تو مجھے پریشان کر دیا تھا۔" دوسری طرف سے ایک گہری سانس کی آواز کے ساتھ کہا گیا۔ "پیسے کی بالکل فکر نہ کرو، ہوٹل میں ہی ٹھہرے رہو، میں تھوڑی دیر میں پہنچ رہا ہوں۔"

اس کے جواب سے ڈینی کو خاصا اطمینان ہوا اور اس نے انٹرکام پر روم سروس کو فون کرکے ساکی کی بوتل کمرے ہی میں منگوالی اور سوکوموتو کے انتظار میں اپنے حسین تجربات کی یادوں میں کھو گیا۔

کراچی سے روانہ ہوتے ہوئے وہ وہاں کے سارے حساب چکا کر چلا تھا۔ باس کی ہدایت کے مطابق روانگی سے پچھلی رات اس نے دونوں ٹرانسمیٹرز گلشن اقبال والی عورت کو پہنچا دیے تھے۔ جس سے وہ اپنی زولا کے حوالے سے مل چکا تھا لیکن اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی تھی کہ اس دوسری ملاقات میں اس عورت کا رویہ سنجیدہ اور باوقار رہا تھا جس کا مطلب تھا کہ پچھلی بار اس نے باس کی ہدایت پر ڈینی کا امتحان لینے کے لیے دانستہ شوخیوں اور آوارہ مزاجی کا ڈرامہ رچایا تھا۔

اپنے سفر کا پہلا مرحلہ اس نے نہایت خوش اسلوبی سے طے کیا تھا۔ نہ صرف کراچی ائرپورٹ سے ہیروئن نکال لانے میں کامیاب ہوگیا تھا بلکہ وہ پیکٹ دوران پرواز ویرا لائیڈ کے حوالے کرکے اس اہم ترین بار سے سبکدوش ہوگیا تھا۔ خوش قسمتی تھی کہ ایمسٹرڈم کے الیشلے ہاؤز والوں نے و... کو اس مشن کے لیے منتخب کیا تھا جو اپنے فرائض کے... زندگی کے بارے میں بھی بہت حساس تھی۔ ...ہذا... کے محدود کیبن کے بجائے اس نے اپنا بیشتر سفر اکا... کی عقبی نشستوں پر ڈینی کے ساتھ طے کیا تھا۔ ...ر... اوقات کی تبدیلی کے مدنظر ایئر لائن کے عملے نے جہا... کے کوور گرا کر دھندلائی ہوئی روشنیوں میں مسافروں... بندوبست کیا تو وہ دونوں وھسکی سے مستقل شغل کرتے... آخر کار وہ بنکاک ایئر پورٹ پر اس سے بچھڑ گئی... سارے راستے اس سے یہ پوچھنے کی مہلت ...نہیں... کب تک اس سے ٹوکیو میں آکر ملے گی۔

اس سفر میں ڈینی اس ادھیڑ عمر شخص کی ذہنی... بھی خاصا محظوظ ہوا تھا جو کراچی سے اس کے ساتھ ف... میں سوار ہوا تھا اور اسی کے پیچھے بیٹھا تھا۔ ...ن دوا... کیبن سے غائب ہونے پر شاید وہ تجسس میں مبتلا ہ... اور پھر آخر کار اپنی بڑھی ہوئی توند پر پتلون سنبھالتا... کلاس کی راہداری کے اس آخری گوشے میں آ پہنچا تھ... وہ دونوں محض ریڈنگ لائٹس جلائے زندگی کے کچھ... پہلوؤں پر گفتگو کرنے میں مصروف تھے۔

ان پر اچانک نگاہ پڑتے ہی بڈھا راہداری... تھا پھر ڈھٹائی سے مسکراتا ہوا ان کے قریب آ کر... کے چہرے پر ناپسندیدگی کے آثار ابھر آئے تھے اور غصیلے انداز میں اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ مگر وہ معذ... لہجے میں ڈینی سے اردو میں مخاطب ہوا تھا۔ "پان تو... آپ کے پاس؟"

"سپاری ہے، اگر اس سے گزارہ ہوجائے۔" ڈ... جلے بھنے لہجے میں کہا۔

ڈینی کے رویے نے اسے ایک دم پسپائی اختیا... پر مجبور کر دیا اور وہ زیر لب کچھ ناقابل فہم الفاظ بڑبڑ... واپس ہولیا۔

اگر ویرا کے بچھڑنے کے بعد وہ بوڑھا اس کا ہم... تو شاید ڈینی اسے فرسٹ کلاس کیبن میں مزید لعن طعن... غنیمت یہ ہوا کہ وہ بھی بنکاک ہی میں اتر گیا۔ ڈینی کو... تھا کہ طیارہ چھوڑنے کے بعد اگر اس نے ویرا سے بے... ہونے کی کوشش کی تو وہ اسے پیٹ کر رکھ دے گا۔

پھر ٹوکیو ایئر پورٹ پر سوکوموتو جیسا مہربان ملا... توقع سے کہیں زیادہ خوش مزاج ثابت ہوا۔ ڈینی اس کے بارے میں تسلسل کے ساتھ ایک فکر میں مبتلا تھا۔ اس نے جس انداز میں ڈینی کی خبرگیری کی تھی، اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ تنظیم کے ارکان میں سے تھا۔ لیکن اس کی قومیت ڈینی کے نزدیک بے اعتباری کا سب سے بڑا سبب تھی۔ اگر وہ پاکستانی ہوتا، تو ڈینی یہ سمجھ سکتا تھا کہ وہ شروع سے تنظیم کا رکن رہا ہوگا اور یہ وفاداری وطن سے نکلنے کے بعد بھی برقرار رہی لیکن موجودہ صورت حال میں وہ یہ سوچنے پر مجبور تھا کہ آخر اس کے باس کے اثر و رسوخ کا دائرہ کتنا وسیع ہے؟ جس دن سے ڈینی نے باس کے لیے کام شروع کیا تھا، وہ تہہ دل سے اس کی مکاری اور بہترین منصوبہ بندی کا قائل تھا لیکن اسی کے دوران وہ خود کو ایک مقامی تنظیم کا رکن سمجھتا رہا تھا مگر سوکوموتو سے متعارف ہونے کے بعد وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا تھا کہ کیا اس کا باس کسی بین الاقوامی گروہ کا سربراہ تھا؟ وہ ڈینی کے لیے برسوں محض ایک غنودہ آواز بنا رہا جو اپنے ماتحتوں سے ہر کام لینے پر قادر تھی۔ اس کا یہ بھرم شاید ہمیشہ قائم رہتا لیکن ڈینی نے غزالہ کے طفیل اس کے کالج کے ایک مذاکرے میں راجہ سکندر علی کی بھاری اور غنودہ آواز گونجتی سن لی تھی۔ جیسے وہ ہزاروں آوازوں میں الگ پہچان سکتا تھا لیکن حالات نے اسے مزید پیش رفت کی اجازت نہ دی اور وہ ٹوکیو آ پہنچا مگر اب اس نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ کراچی واپس پہنچ کر راجہ سکندر علی کو اس کے نرم اور محبت آمیز خول سے باہر ضرور دیکھے گا۔

شاید وہ دیر تک یہی سب سوچتا رہتا لیکن دروازے پر ہونے والی دستک نے اسے چونکا دیا۔ اس نے دروازہ کھولا۔ تو سوکوموتو کا مسکراتا ہوا صحت مند چہرہ اس کے سامنے موجود تھا۔ اس نے سر کو قدرے خم دے کر ڈینی کو تعظیم دی اور پھر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ ڈینی نے ہاتھ ملاتے ہوئے اسے اندر کھینچ کر دروازہ بند کر لیا۔

"کہاں لٹ گئے آج تم؟" سوکوموتو اپنا بریف کیس میز پر ڈالتے ہوئے ڈینی کے مقابل صوفے پر جم گیا۔

"جیب اجازت دے تو یوں دن میں ہزار بار لٹنے کو تیار ہوں۔" ڈینی گہرا سانس لے کر بولا۔ "میرا تو خیال ہے کہ مشرق میں جس قدر دور سفر کرتے جاؤ، عورت اسی قدر پراسرار ہوتی چلی جاتی ہے۔ ننھی سی، اپنی ذات میں سکڑی سہمی لیکن بڑے سے بڑے شہ زور مرد کو اپنے اشاروں پر نچانے کا فن جانتی ہے۔"

"شاید کسی گیشا سے ٹکرا گئے آج۔" سوکوموتو سگریٹ سلگاتے ہوئے ہنسا۔ "اس کے چسکے میں پڑ کر ہر سال سیکڑوں جاپانی مرد اپنے گھر برباد کر لیتے ہیں اور اب تو گھریلو لڑکیاں بھی اپنے شوہروں کو قابو میں رکھنے کے لیے مساج خانوں میں باقاعدہ تربیت لینے لگی ہیں۔"

"اب آ ہی گیا ہوں تو جی بھر کر ٹوکیو دیکھنا چاہتا ہوں۔" ڈینی نے ندیدے لہجے میں کہا۔ "بظاہر مشینی انداز میں چلتے پھرتے ہجوم میں ایک اجنبی سیاح کے لیے ہزاروں دلکشیاں مچلتی نظر آتی ہیں۔"

"رقم کی فکر نہ کرو لیکن نوسر بازوں سے ذرا ہوشیار رہنا۔" اس نے بے پروائی سے کہا۔ "یہاں ایسے بہتیرے لوگ پڑے ہیں جو موٹی اسامیوں کو تاڑ کر مشہور کمپنیوں کے جعلی شیئرز یا ایک کے چار بنانے کا لالچ دے کر خاصی رقمیں اینٹھ لیتے ہیں اور پھر ان کا کہیں سراغ نہیں ملتا۔"

"برا نہ مانو تو ایک بات پوچھ لوں۔" ڈینی نے دھڑکتے دل کے ساتھ سوال کیا اور جب سوکوموتو نے ساکی کا گلاس بناتے بناتے سر ہلا کر اسے اجازت دی تو وہ بولا۔ "اتنی رقم تم مجھے کس حساب میں دو گے؟"

سوکوموتو نے سر اٹھایا تو وہاں یک بیک سنجیدگی چھا گئی تھی۔ "میرا امتحان لینا چاہ رہے ہو یا واقعی اس معاملے میں لاعلم ہو؟"

ڈینی سٹپٹا گیا۔ اس کے لیے فیصلہ کرنا دشوار ہوگیا کہ کیا کہے پھر فوراً ہی جواب بھی سوجھ گیا۔ "لاعلم نہ ہوتا تو رقم کے بارے میں اتنا فکرمند ہوتا۔"

"تم سیدھے ایمسٹرڈم سے ہی آرہے ہو نا؟" سوکوموتو نے اس قدر پراعتماد لہجے میں سوال کیا تھا کہ غیر ارادی طور پر ڈینی کا سر اثبات میں ہل گیا اور سوکوموتو حیرت سے کہنے لگا۔ "تو تمہیں وہاں نہیں بتایا گیا کہ ہم الیشلے ہاؤز کے پرانے خادم ہیں۔ ان کے مہمانوں کی دیکھ بھال ہمارے ادارے کی ذمے داری ہے، اگر میری اطلاعات درست ہیں تو ان کا ایک اور بھی مہمان صبح شام میں آنے والا ہے جو تمہارے ساتھ قیام کرے گا۔"

ڈینی کے سر سے گویا ایک بڑا بوجھ ہٹ گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ سوکوموتو کا اس کے باس سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ باس نے ٹوکیو میں رہنمائی کے بارے میں اسے وہی کچھ بتایا تھا جو اسے الیشلے ہاؤز سے معاملات طے کرتے ہوئے معلوم ہوا تھا۔ وہ دل ہی دل میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا کہ وہ لوگ کس قدر منظم تھے کہ خود یورپ میں ہوتے ہوئے پاکستان سے ایک سودا کر رہے تھے اور سودے کی آخری تفصیلات طے کرنے کے لیے ٹوکیو جیسے دور افتادہ شہر میں دو نمائندوں کی ملاقات کے جملہ انتظامات کیے ہوئے تھے۔

"میں اب تک مذاق کر رہا تھا تم سے۔" ڈینی نے سنجیدگی سے کہا۔ اسے اچانک ہی یاد آگیا تھا کہ اس غیر ملکی مشن پر روانگی کا حکم دینے سے پہلے باس نے اپنی زولا کے حوالے سے اس کا ایک خاصا کٹھن امتحان لیا تھا جس میں اسے صرف یہی دیکھنا مقصود تھا کہ ڈینی کسی خوبصورت عورت کے ناز و انداز کے مقابلے میں کس حد تک مدافعتی صلاحیتوں کا مالک تھا جس کا مطلب تھا کہ اسے خاص طور پر عورتوں کے بارے میں محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔ ورنہ وہ باس کی نگاہوں میں گر سکتا تھا۔

"حسن کو بس دیکھنے کی حد تک پسند کرتا ہوں۔" وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "اپنے سر پر سوار کرنا پسند نہیں کرتا۔"

"تو پھر وہ دو لڑکیاں؟" سوکوموتو نے حیرت سے سوال کیا۔

ڈینی کی سنجیدگی برقرار رہی تھی۔ "میں تو یہ دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا کہ تم لوگوں نے زمینی رقبے کی کمی کو عمارتوں کی بلندی سے کس طرح پورا کیا ہے۔"

سوکوموتو کی ہنسی میں فخر کا عنصر شامل تھا۔ "جن کارخانوں کے لیے کئی ایکڑ زمین درکار ہوتی ہے۔ انہیں ہم نے چند سو مربع گز زمین پر تعمیر کیا ہے۔ مشینوں کو زمین پر پھیلانے کے بجائے منزل بمنزل اوپر لے گئے ہیں، ایسا نہ کرتے تو آج جاپان میں پیدل چلنے کو جگہ نہ ہوتی۔"

وہ کچھ دیر اور ڈینی کے پاس رکا رہا پھر رقم اس کے حوالے کر کے لوٹ گیا۔ ڈینی یہ سوچ کر دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کرتا رہا کہ اسے بروقت ہوش آگیا تھا۔ ورنہ وہ کسی بڑی بے احتیاطی کا شکار ہو سکتا تھا۔

رات کے کھانے کے لیے وہ نیچے اترا تو ڈائننگ ہال میں کوئی میز خالی نہیں تھی بلکہ متعدد جوڑے راہداریوں وغیرہ میں کھڑے کسی میز کے خالی ہونے کے منتظر تھے۔ ڈینی رنگ و بو کے اس طوفان سے گزرتا بال روم کی طرف بڑھ گیا جدھر سے موسیقی کا شور ابل رہا تھا۔ بال روم میں بھی فلور کے اطراف میں وہی حال تھا۔ ڈینی کسی خالی میز کی تلاش میں وہاں چکراتا پھر رہا تھا کہ اچانک پیچھے سے کسی نے نرمی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ چونک کر پلٹا تو اوہیری کو اپنے سامنے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس لڑکی کے ساتھ وہ اپنے وقت کا کچھ بہترین حصہ گزار چکا تھا۔

"تم یہاں کہاں گھوم رہی ہو؟" ڈینی نے اس کو اپنے ہمراہ ایک گوشے میں لے جاتے ہوئے حیرت سے سوال کیا کیونکہ اوہیری نے اسے بتایا تھا کہ وہ رات کے ایک کالج میں تعلیم حاصل کر رہی ہے۔

"آج کالج میں چھٹی ہے، تم سے خاصی رقم مل گئی تھی۔ لہٰذا سوچا کہ آج کی شام اپنی مرضی کی کسی تفریح میں گزار لوں" پلکیں جھپکاتے ہوئے معصومانہ لہجے میں بولی۔ "ویسے ادھر کا رخ کرتے ہوئے خیال تھا کہ شاید تم بھی مل ہی جاؤ۔ تم نے نام تو بتا دیا تھا لیکن کمرہ نمبر نہیں بتایا تھا۔ ورنہ شاید تمہارے دروازے پر دستک ضرور دیتی۔"

"میرے ملنے کا خیال کیوں تھا تمہارے ذہن میں" اس کی مردانہ انا کو ابھارنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

"شاید تم میری بات کو کاروباری حربہ سمجھو مگر یہ حقیقت ہے کہ تمہاری ذات میں مجھے اپنائیت سی محسوس ہوئی" دھیمے سے بولی۔

"تو پھر آؤ، اوپر ہی چلتے ہیں۔" ڈینی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر مڑتے ہوئے کہا۔ "میں کھانا کھانے کے لیے اترا تھا لیکن ڈائننگ ہال میں بہت بھیڑ ہے، کمرے میں ہی منگوالیں گے۔"

اوہیری بے چون و چرا اس کے ساتھ ہولی۔ ڈینی کمرے میں کچھ دیر اس سے والہانہ انداز میں گفتگو کرتا رہا مگر اس کا ذہن تمام جزئیات کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ جب وہ کھانے کے لیے روم سروس کو ہدایات دینے انٹرکام کی طرف متوجہ ہوا تو اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ اوہیری حقیقتاً وہ نہیں تھی جو خود کو ظاہر کرتی تھی۔ اس کے معصوم چہرے میں ایک مکار اور عیار شکاری عورت پوشیدہ تھی جو بڑے اعتماد کے ساتھ چھوٹے بڑے کو یکساں طور پر شکار کر سکتی تھی۔

کھانے کے دوران ڈینی نے غیر متوقع طور پر اوہیری سے ایک ٹیڑھا سوال کر ڈالا۔ "جھوٹ کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

اوہیری نے چونک کر اس کی طرف دیکھا لیکن دوسرے ہی لمحے کے ساتھ سر جھکائے اپنی پلیٹ کی طرف متوجہ تھا۔ "زیادہ برا فعل کوئی نہیں ہے لیکن تمہیں اچانک اس بارے میں میری رائے جاننے کا خیال کیسے آگیا؟" اس نے الجھے الجھے لہجے میں پوچھا۔

"اس لیے کہ تمہاری باتوں میں تضاد ہے اوہیری۔" ڈینی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا اور وہ نظریں چرا کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ "میں نے اس کمرے میں تمہارے ساتھ اپنا وقت بلاوجہ برباد نہیں کیا تھا۔ تم اس ہوٹل میں اتفاقاً نہیں آئی تھیں بلکہ تمہارا مقصد ہی مجھ سے مل بیٹھنا تھا۔"

"یعنی تمہارا مطلب ہے کہ میں جھوٹ بولتی رہی ہوں؟ کیا یہ کہنا چاہتے ہو تم؟" اس کا دہانے کی طرف بڑھتا ہوا چمچہ درمیان میں ہی رک گیا۔

"مجھے مزید بنانے کی کوشش نہ کرنا۔" ڈینی نے سپاٹ اور سرد لہجے میں کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ میں یہ کہنے پر مجبور ہو جاؤں کہ پہلی بار بھی تم مجھ سے اتفاقاً نہیں بلکہ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ٹکرائی تھیں۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ میری ذات میں تمہاری دلچسپی کس لیے ہے؟"

اوہیری نے کھانے سے ہاتھ روک لیا اور میز پر سے نیپکن اٹھاتے ہوئے آزردہ لہجے میں بولی۔ "اگر تم یہی سمجھتے ہو تو میرا یہاں رکنا بے سود ہے، مجھے فوری طور پر چلے جانا چاہیے۔"

"تم اپنی مرضی سے واپس بھی نہ جا سکو گی۔" ڈینی خطرناک انداز میں مسکرایا۔ "میرے سوال کا جواب ملنا ضروری ہے۔"

"تم مجھے زبردستی نہیں روک سکتے۔" اس نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کرسی چھوڑ دی۔ "میں اب ایک لمحہ بھی تمہارے ساتھ نہیں رک سکتی۔"

ڈینی نے پھرتی سے اس کی کلائی پر ہاتھ ڈال دیا۔ "خاموشی سے بیٹھی رہو، اودھم مچاؤ گی تو باہر بھیڑ جمع ہو جائے گی۔ میں تو یہاں بالکل اجنبی ہوں لیکن ہزاروں کی بھیڑ میں تمہارے دس بیس شناسا نکل ہی آئیں گے اور تم تماشا بن کر رہ جاؤ گی۔ میں پولیس کو یہ بتاؤں گا کہ تم نے میرا بٹوہ لے بھاگنے کی کوشش کی تھی۔"

ڈینی کے الفاظ کے ساتھ اوہیری کے تنے ہوئے عضلات ڈھیلے پڑتے چلے گئے اور جب وہ خاموش ہوا تو اوہیری تھکے ہوئے، شکست خوردہ انداز میں کرسی پر گر گئی۔ ڈینی نے اس کی کلائی اپنی مضبوط گرفت سے آزاد کر دی۔ "تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟ کیسا شبہ کر رہے ہو مجھ پر؟" وہ اس سے نگاہیں چار کیے بغیر بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"بات چھڑی تو اپنے شبہات کے بارے میں، میں خود بھی زیادہ پُریقین نہیں تھا۔" ڈینی نے اس کی طرف توجہ دیے بغیر کہا۔ "لیکن تم نے اپنے ردِعمل سے میرے شبہات کی تصدیق کر دی ہے۔"

"تمہیں موٹی اسامی سمجھ کر تمہارے پیچھے لگی تھی۔" اس نے کہنا چاہا لیکن ڈینی نے سختی سے اس کی بات کاٹ دی۔

"یہ گھسی پٹی کہانیاں میرے ساتھ نہیں چلیں گی اوہیری!" اس بار وہ ترش لہجے میں بولا تھا۔ "سچ بول کر تم مجھے اپنا دوست اور ہمدرد پاؤ گی۔"

اوہیری کی نگاہوں سے خوف جھلکنے لگا۔ "مجھے جانے دو۔" وہ ملتجیانہ لہجے میں بولی تھی۔ "مجھے روک کر میرے ساتھ تم اپنے حق میں بھی کانٹے بو رہے ہو۔"

"اوہ، تو اس کا مطلب ہے کہ تمہیں میرے پیچھے لگانے والے اچھے لوگ نہیں ہیں۔" وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ "پھر تو مجھے ان کے بارے میں ضرور بتاؤ کیونکہ میں خود بھی اتنا نیک نہیں ہوں۔"

وہ بے بسی سے ڈینی کی طرف دیکھتے ہوئے گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ "میں... مجھے کچھ نہیں معلوم، میں بس اسی قدر جانتی ہوں۔ جتنا مجھے بتایا جاتا ہے۔"

"میرے بارے میں کیا ہدایات ملی تھیں؟" ڈینی نے اسے خود سے کچھ اگلنے پر آمادہ نہ پا کر سوالات کے ذریعے کریدنے کا فیصلہ کر لیا۔

"گروپ ٹوورز آرگنائزرز کے غیر ملکی مہمانوں کی نگرانی کی جاتی ہے، تم پرواز سے اترنے کے بعد ان کے پاس پہنچے تو اس وقت میری باری تھی۔" وہ خوفزدہ اور دھیمے لہجے میں بولی۔

"نگرانی لڑکیاں ہی کرتی ہیں؟"

"مردوں کے لیے لڑکیاں اور عورتوں کے لیے مرد مقرر ہیں۔ اس طرح رسائی آسان ہو جاتی ہے۔"

"نگرانی کا مقصد کیا ہوتا ہے؟"

"ان لوگوں کے ذریعے یہاں قیام کرنے والوں کی آمد کا مقصد معلوم کرنا ہوتا ہے، ہو سکتا ہے اسمگلنگ وغیرہ کا کوئی چکر ہو۔"

"یہ سلسلہ کب سے جاری ہے؟"

"شاید زیادہ سے زیادہ دو ہفتے ہوئے ہوں گے، اس دوران میرے لیے تم دوسرے آدمی تھے، پہلی بار ایک سفید فام تھا۔" وہ سرگوشیانہ لہجے میں جواب دیتے ہوئے بار بار خوفزدہ نگاہوں سے یوں بند دروازے کو دیکھے جا رہی تھی، جیسے اسے ڈر ہو کہ کسی بھی لمحے کوئی دروازہ کھول کر اندر نہ گھس آئے۔

"اور وہ کون لوگ ہیں؟" ڈینی نے اہم ترین سوال کیا۔

"مجھے کچھ نہیں معلوم، ہمارا واسطہ ایئرپورٹ کاؤنٹر سے ہے۔ جہاں سے غیر ملکیوں کو معاوضے پر گائیڈ فراہم کیے جاتے ہیں، شہر میں بھی ان کے کئی دفاتر ہیں۔"

"تم کتنے عرصے سے ان کے ساتھ ہو؟"

"دو سال سے کام کر رہی ہوں۔" وہ ڈینی کے سوال کا مقصد سمجھتے ہوئے بولی۔ "مگر اس عرصے میں صرف اسی قدر سنا ہے کہ اس کاروبار کا تعلق فینگ پو سے ہے۔ جاپان کے کئی شہروں میں اس کے جوئے خانے بھی ہیں جہاں ہر روز لاکھوں ین ٹھورے جاتے ہیں۔"

"اور فینگ پو خود کہاں رہتا ہے؟" ڈینی نے سوال کیا۔ "تم مطمئن رہو، یہ معلومات میری ذات تک محدود رہیں گی، ان کی وجہ

سے تم پر کوئی عتاب نازل نہ ہوسکے گا۔"

"وہ مرد نہیں کوئی عورت ہے۔" اوہیری نے گہرا سانس لے کر کہا۔"اس خطے میں اس سے بدتر قانون شکن شاید ہی پیدا ہوا ہو، خود پولیس آج تک اس کے ٹھکانے کا پتا لگانے میں ناکام رہی ہے۔ ورنہ وہ آج تک آزاد نہ ہوتی۔"

وہ اتنی کھل گئی تھی کہ ڈینی کو پھر اس کے ساتھ نرم رویّہ اختیار کرتے ہوئے اسے تسلیاں دینی پڑیں کیونکہ اس کے ذریعے ڈینی کو ایک سنسنی خیز اطلاع ملی تھی اور شاید خود سوکوموتو بھی اس بات سے لاعلم تھا کہ اس کی تنظیم کی سرگرمیوں میں کوئی اور بھی گہری دلچسپی لے رہا تھا۔

اوہیری کے انکشافات کی روشنی میں ڈینی کو اب یہ بات قرینِ قیاس نہیں معلوم ہو رہی تھی کہ گروپ ٹوورآرگنائزرز کا دائرۂ کار صرف اسی قدر تھا، جتنا سوکوموتو نے بتایا تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو ان میں فینگ پو کی خفیہ دلچسپی بے معنی ہو کر رہ جاتی تھی۔ راجہ سکندر علی یا باس کی پُراسرار شخصیت سے شروع ہونے والا یہ سلسلہ الشلے ہاؤز، ایشین سنڈیکیٹ لمیٹڈ اور گروپ ٹوورآرگنائزرز میں الجھ کر رہ گیا تھا۔ ڈینی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ یکایک کس گورکھ دھندے میں پھنس گیا ہے اگر اوہیری اس سے دوبارہ نہ ٹکرائی ہوتی تو یہ بکھیڑا سرے سے پھیلا ہی نہ ہوتا اور وہ ویرلائیڈ سے ملاقات کے بعد اطمینان سے پاکستان روانہ ہو جاتا لیکن اب یہ ضروری ہو گیا تھا کہ وہ فینگ پو کے بارے میں اپنے طور پر معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا۔

فینگ پو کے بارے میں اوہیری کی معلومات سنی سنائی باتوں پر مشتمل تھیں جن میں کچھ افسانوی رنگ بھی نمایاں تھا۔ ان کے مطابق فینگ پو اس خطے کی روایات کے برعکس دراز قامت اور خاصی صحت مند عورت تھی جس کے حسن کے بارے میں اسے دیکھنے والوں کے ذریعے نہایت مبالغہ آرائیاں پھیلتی رہی تھیں۔ کہا جاتا تھا کہ دوسری جنگِ عظیم کے بعد جاپان میں سکونت اختیار کر لینے والے ایک امریکی کارپورل اور اسپتال میں اس کی دیکھ بھال پر مامور ایک جاپانی نرس کی محبت کے نتیجے میں وہ پیدا ہوئی تھی۔ امریکی کارپورل اس کی ولادت کے دوسرے ہی سال ایک حادثے کا شکار ہو کر مر گیا۔ فینگ پو کی ماں اپنے شوہر کی موت کا صدمہ برداشت نہ کر سکی اور ذہنی توازن کھو بیٹھی جس کے نتیجے میں فینگ پو ایک یتیم خانے میں پروان چڑھی۔ ابتدا میں وہ بہت نرم خو اور ملنسار تھی لیکن یتیم خانے کا منتظم اس کے پیچھے لگ گیا۔ وہ کافی عرصے تک اس بوڑھے کے ظلم خاموشی سے سہتی رہی لیکن جب وہ حد سے بڑھنے لگا، تو ایک روز وہ یتیم خانے سے فرار ہو گئی کیونکہ

منتظم اپنی دلچسپی کے باعث فینگ پو کو کسی صنعتی تربیتی ادا[...] داخلہ دلانے کے بجائے اپنے پاس روک کے رکھنے پر تلا ہوا [...]

پھر فینگ پو نے ایک لڑکے سے شادی کر لی جو [...] سے جرائم پیشہ لوگوں کا آلۂ کار تھا۔ کچھ عرصے بعد کسی دوسر[...] کے لوگوں نے اس کے گھر پر حملہ کیا اور فینگ پو کے [...] کے شوہر پر بازپرس کے سلسلے میں ناقابلِ بیان تشدد کر[...] اسے زبان کھولنے پر آمادہ کرنے کے لیے انھوں نے [...] کے ساتھ بھی اس کی نگاہوں کے سامنے سفاکانہ سلوک [...] واقعہ کے دوسرے روز فینگ پو کا شوہر بے ہوشی کی [...] میں چل بسا۔ فینگ پو نے اپنے شوہر کی آخری رسومات [...] زخمی شیرنی کے تیوروں کے ساتھ شرکت کی پھر وہ اچانک [...] ہو گئی۔ چند روز بعد وہ شام ڈھلے یتیم خانے کے منتظم [...] گئی اور ملازمین کے بیان کے مطابق منتظم ہنسی خوشی [...] ساتھ چلا گیا۔ اگلی صبح اس کی مسخ شدہ لاش ایک ساحل[...] سے دریافت ہوئی۔ وہ فینگ پو کے انتقام کا پہلا نشا[نہ تھا] کے بعد وہ اپنے شوہر کے قاتلوں کے پیچھے لگ گئی او[ر] رفتہ زیرِ زمین دنیا میں اس کے نام کی دھاک بیٹھ گئی [...] اس کے پے در پے جرائم کے ارتکاب کا قلع قمع [...] کے لیے پولیس نے بے شمار ٹھکانے کھنگالے لیکن فینگ [پو] کہیں ہاتھ نہ آسکی۔ ایک خیال یہ بھی تھا کہ اس نے اپ[نی] قامت اور جسامت کی وجہ سے خود کو چھپائے رکھنے [...] پلاسٹک سرجری کا سہارا لیا تھا اور یوں مردانہ روپ میں [...] پورے علاقے میں دندناتی پھرتی تھی۔

"تم اچھی لڑکی ہو۔" گفتگو کے اختتام پر ڈینی نے [...] لہجے میں کہا۔"تم اس گفتگو کا کہیں حوالہ نہیں دو گی مجھ[...] تمھاری سلامتی اس نکتے سے وابستہ ہے۔ مجھے افسوس ہے [...] سچ بولنے پر آمادہ کرنے کے لیے مجھے تھوڑا ترش رو[یہ] کرنا پڑا۔"

"لیکن یہ سب جان کر تم نے کیا حاصل کر لیا؟" [...] کے لہجے میں ملال نمایاں تھا۔

"یہ تم نہیں سمجھ سکو گی۔" ڈینی مسکرایا۔"میرا خیال [...] کسی خاص وجہ سے میرے پیچھے لگائی گئی ہو۔"

"اس کا تو مطلب یہ ہوا کہ تمھارے ہاتھ بھی صا[ف نہیں] ہیں۔" اس نے تیکھے لہجے میں کہا۔ وقت گزرنے کے سا[تھ] وہ اپنی ابتدائی دہشت پر غالب آچکی تھی۔

"جو چاہو سمجھ لو۔" ڈینی نے بے پروائی سے کہا۔"فی[الحال] میں عدیم الفرصت ہوں۔ موقع ملا تو تمھیں بتاؤں گا [...]

[...]والی معلومات میرے کس کام آسکتی ہیں۔"

"[...] اپنے بارے میں زیادہ خوش فہمی میں نہ رہنا۔" اس نے کہا۔ [...]ے پہلی ملاقات کے بعد میں نے رپورٹ دے دی تھی [...] تم اپنے ماحول سے اکتا کر تفریح کے لیے آئے ہوئے لاابالی [...] شاہ خرچ سیاح ہو مگر اس کے باوجود مجھے دوبارہ تمھاری [...]ش میں بھیجا گیا۔ ہو سکتا ہے کہ انھیں تمھارے بارے میں کچھ [...]ک مل گئی ہو۔"

"میں اپنی حفاظت کر سکتا ہوں۔" ڈینی نے سگریٹ سلگاتے [ہو]ئے کہا۔"اگر اعتراض نہ ہو تو ذرا اپنا پتا دے دو تاکہ میں [بوق]تِ ضرورت تم سے مل سکوں۔"

اوہیری نے بلا تامل اپنے اپارٹمنٹ کا پتا اس کے [حو]الے کر دیا۔

اس واقعے کو گزرے دو دن ہو چکے تھے لیکن ویرلائیڈ [ا]بھی تک نہیں پہنچی تھی۔ اس دوران میں سوکوموتو روز ہی اس [س]ے ملنے آتا رہا تھا لیکن ڈینی نے اوہیری یا فینگ پو کے بارے [میں] اس سے کوئی بات نہیں کی تھی کیونکہ اس کے بارے میں [ڈی]نی نے اپنے ابتدائی اندازوں میں خاصی ترمیم کر ڈالی تھی۔ اس [...]ے الشلے ہاؤز کا ذکر سننے کے بعد ڈینی اس سے محتاط رہا کرتا [تھ]ا کیونکہ سوکوموتو ان لوگوں میں سے نظر آتا تھا جو اپنی خوش [...]لی اور بذلہ سنجی سے بآسانی لوگوں کا اعتماد جیت لیتے ہیں۔ [لیک]ن ضرورت پیش آنے پر بے دریغ ہر ایک کی گردن کٹوانے [...]ر تل جاتے ہیں۔

اوہیری کے اعترافات کے بعد ڈینی نے اپنے باس کے [با]رے میں خاصا غور کیا تھا۔ وہ ابھی تک سمجھ نہیں سکا تھا کہ [راجہ] سکندر علی اپنے دوسرے روپ میں کراچی کی مقامی مارکیٹ کے [ع]لاوہ منشیات کی بین الاقوامی منڈیوں میں کتنے اثر و رسوخ کا مالک تھا؟

اس سفر پر روانگی سے پہلے اس نے جس طرح ڈینی کو عورتوں سے دور رہنے کا بالواسطہ مشورہ دیا تھا، اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا تو سامنے کی بات تھی کہ عیش و عشرت میں آدمی ایسی بے اعتدالیوں کا مرتکب ہو سکتا ہے جو اسے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا سکتی ہیں لیکن اس کا دوسرا پہلو ذرا معنی خیز تھا۔ اس نے ڈینی کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ کہیں وہ پہلے سے جاپان میں فینگ پو کی ریشہ دوانیوں سے واقف تو نہیں تھا؟

●

حامد اپنی ذمے داریوں اور ضروریات سے پریشان ضرور تھا اور اسی وجہ سے طارق کی تجویز پر عمل کرنے کے لیے تیار ہو گیا تھا لیکن بنیادی طور پر وہ زندگی کی تلخ حقیقتوں سے ناآشنا ایک اناڑی نوجوان تھا۔ وہ طارق کی ہدایت کے مطابق موتی دلوا سے ملا تو وہ بہت مہربان ثابت ہوا۔ اس نے حامد کو مال دینے سے پہلے کام کرنے کے طریقوں اور احتیاطی تدابیر سے آگاہ کیا۔ پھر اسے ہیروئن کی پڑیاں دے دیں۔ پہلے دن حامد گھر میں وہ پڑیاں لے کر داخل ہوا تو دل ہی دل میں خود کو چور محسوس کر رہا تھا۔ مختصر سے گھر میں والدین کے علاوہ چار بہنوں کے ہوتے ہوئے کوئی بھی جگہ اتنی محفوظ نہیں تھی کہ وہ پڑیاں بے فکری کے ساتھ وہاں رکھ سکتا۔ بوسیدہ چوبی الماری سے باورچی خانے میں کسی خالی ڈبّے تک اس نے ہر چیز کا جائزہ لیا لیکن کہیں دِل مطمئن نہیں ہوا۔ اسے بس یہی خوف تھا کہ وہ قیمتی پڑیاں لاعلمی کے باعث گھر کے کسی فرد کے ہاتھوں ضائع نہ ہو جائیں۔ آخر اس نے کپڑوں کے مشترکہ جستی ٹرنک میں وہ پڑیاں ایک اخباری کاغذ میں لپیٹ کر چھپا دیں اور اس کے بعد سارا وقت گھر ہی میں منڈلاتا رہا۔ رات کو وہ سویا تو اسے عجیب عجیب خواب نظر آتے رہے جن میں وہ شاہانہ شان و شوکت سے اعلیٰ حلقوں میں گھومتا رہا، صبح آنکھ کھلی تو سر پر مارٹن کوارٹر کی وہی مہربان چھت سایہ فگن تھی جو برسات میں ٹپکنے کے باوجود برسوں سے ان سب کو اپنی مہربان آغوش میں چھپائے ہوئے تھی۔ وہ بعجلت تیار ہوا اور مال لے کر یونیورسٹی جانے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔

یونیورسٹی میں حامد نے اپنی مہم کا آغاز جبّار سے کیا جس سے اس کے دوستانہ مراسم تھے لیکن اس کی چرس نوشی کی عادت کے باعث حامد اس سے ذرا دور ہی دور رہا کرتا تھا۔ حامد کو موتی دادا نے پہلی کھیپ مفت دی تھی۔ لہٰذا حامد نے اِدھر اُدھر کی گفتگو کے بعد موقع پیدا کر کے ہیروئن کی پانچ پڑیاں اس کے حوالے کر دیں۔

اگلے دن جبّار بڑی بے تابی سے اس سے ملا تھا۔ ہیروئن صحیح معنوں میں ایک ایسا نشہ تھی جس کے بارے میں جبّار صرف سوچا ہی کرتا تھا۔ اس نے حامد سے مزید پڑیوں کا مطالبہ کیا تو حامد نے سادگی سے اسے ٹال دیا۔"وہ تو کسی نے مجھے ذاتی استعمال کے لیے دی تھیں جو میں نے تمھارے حوالے کر دیں۔"

"یار خدا کے لیے۔" جبّار اس کے سامنے گڑگڑایا۔"جب سے چند روز کے لیے چرس کا قحط پڑا تھا، اس کا مزہ بھی جاتا رہا ہے۔ سُنا تو ہم نے بھی تھا کہ شہر میں ہیروئن ملنے لگی ہے لیکن نہ اس کے کمال کا علم تھا، نہ کسی ٹھکانے کا۔ یہ دو سو روپے رکھ لو کسی طرح کل پڑیاں لیتے آنا۔"

حامد نے تھوڑے سے تذبذب کا مظاہرہ کرنے کے بعد اس سے رقم لے لی مگر ساتھ ہی اس سے قسم بھی لے لی کہ وہ اس

کا نام راز میں رکھے گا، کہیں ایسا نہ ہو کہ دوستی ہی دوستی میں وہ منشیات فروش مشہور ہو جائے اور یوں حامد نے جامعہ میں اپنے کام کا آغاز کر دیا تھا۔ دو تین ہی دنوں میں جبار اس سے خاصی مقدار خریدنے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے ہر بار چرس نوشوں کے حلقے کے مزید ارکان نئے نشے کی طرف راغب ہوتے جا رہے تھے۔

موتی دادا سے مفت میں ملنے والی پڑیوں سے حامد نے پندرہ سو روپے کمائے اور جب وہ دوبارہ موتی دادا سے ملا تو اس میں اعتماد کی ایک نئی لہر پیدا ہو چکی تھی۔ موتی دادا نے پھر کچھ نصیحتوں کے ساتھ اسے مال دے دیا جس کی ادائیگی اگلی مرتبہ کرنی تھی۔ اس نے حامد پر واضح کر دیا تھا کہ وہ مال نقد بیچنے کے اصول پر سختی کے ساتھ کاربند تھا لیکن محض اس کی حوصلہ افزائی اور سفارش کی بنیاد پر اسے ادھار مال دے رہا تھا۔

حامد کے لیے نیا کام سنسنی خیز ہونے کے ساتھ ہی مالی اعتبار سے بے حد کشش انگیز تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ چند مہینوں کے ہیر پھیر میں وہ اس قابل ہو سکے گا کہ غربت کی سلگتی ہوئی آگ میں زندہ رہنے کی جدوجہد کرنے والے اپنے گھرانے کو معاشی انقلاب کا مژدہ سنا سکے۔

لیکن اسے کام کا آغاز کیے چند ہی روز گزرے تھے کہ اخباری اطلاعات نے اسے ہلا کر رکھ دیا۔ شہر میں جا بجا بھاری مقدار میں منشیات پکڑی جا رہی تھیں اور اخبارات میں منشیات کے ساتھ اس کا بیوپار کرنے والوں کی تصاویر بھی شائع ہو رہی تھیں لیکن ایک بات اس کے لیے حیران کن تھی کہ منشیات کی لمبی فہرست میں ہیروئن یا اس کے سوداگروں کا کہیں ذکر نہیں تھا۔ اسے خوف آنے لگا کہ کہیں کسی روز بدنامی کا یہی طوق اس کے گلے کی زینت بھی نہ بن جائے۔

اگلے روز وہ موتی دادا کے پاس گیا تو کچھ پریشان تھا۔ "شہر کے حالات خراب ہیں دادا! سوچتا ہوں کچھ دن کے لیے ہاتھ کھینچ ہی لوں۔" اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟" موتی دادا کی تیوریوں پر بل پڑ گئے اور اس کی محبت آمیز نرم آواز میں للکار پیدا ہو گئی۔ "مرد ہو کر عورتوں کی سی باتیں سوچ رہے ہو۔ ارے یہ موقع تو شاید تمہارے ہی مقدر سے پیدا ہوا ہے۔ چرس، شراب، ٹھرا، راکٹ، سب ہی نشے پکڑے جا رہے ہیں مگر ابھی تک اپنے مال کا نام خبروں میں کہیں نہیں آیا، میرا تو خیال ہے کہ اب ہمارے مال کی مانگ بڑھے گی، ایسے میں پانچوں گھی میں اور سر کڑھائی میں ہوتا ہے۔"

موتی دادا کی لگائی ہوئی ضرب خاصی شدید تھی۔ وہ سٹپٹا کر رہ گیا۔ بس سوچ رہا تھا کہ ستارے گردش میں نہ آ جائیں۔

"دیکھو میاں!" موتی دادا اس کی طرف جھک "میں ہوں تو بس جاہل آدمی لیکن تھوڑا بہت اخبار ہوں، یہ بتاؤ کہ تم نے کسی چھوٹے موٹے کی گرفتار بھی پڑھی ہے؟"

حامد کے پاس اس سوال کا جواب نفی کے علا نہیں تھا۔

"بیس برس سے اسی کام کی روٹی کھا رہا ہوں نے فخر آمیز لہجے میں بتایا۔ "یہ سارے چھاپے چھوپے اف دکھانے کے لیے مارے جاتے ہیں، چار چھ مہینے میں نہ ہو تو سرکار اپنے محکمے ہی بند کر دے، اور یہ چھاپے بڑوں کے لیے ہوتے ہیں، پچیس پچاس پڑیوں کو کوئی نہی

"مگر دادا! اخبار میں چرس کی ایک دو گولیاں رکھ گرفتاری کی خبریں آتی رہتی ہیں۔" حامد کو اس خزانے ک میں دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔

موتی دادا نے یوں سر ہلایا جیسے حامد نے کوئی بات کہہ دی ہو۔ "میاں! بچے ہو ابھی... یوں پکڑے جا اکثر بے گناہ ہوتے ہیں، بس دشمنی میں کوئی خود ہی گولیا میں ڈال کر پکڑ لیتا ہے۔ قانون تو قانون ہے نا۔ تمہارے چاہے ایک تولہ ہو یا ایک من، جرم تو برابر سمجھا جائے دفعہ ایک ہی لگتی ہے لیکن تم یہ سب نہ سوچو، تمہاری سب سے محفوظ ہے، پولیس کی کیا مجال کہ یونیورسٹی میں گھ پر ہاتھ ڈال سکے۔"

حامد لاجواب ہو گیا۔ موتی دادا کی بے لاگ باتو اس کے دل سے خوف زائل کر دیا تھا۔ وہ موتی دادا لے کر واپس چلا آیا۔

اگلی صبح یونیورسٹی میں جبار صبح ہی صبح ایڈمنسٹریشن کے پاس مل گیا اور فوراً ہی اسے ایک طرف لیتا چلا گیا۔ ہو گیا، کل وہ خبر سنی تھی تم نے کہ ایرو کلب کے پاس لڑ ایک ٹیکسی ڈرائیور کو ہلاک کر دیا؟"

"ہاں، شہر سے آنے والوں سے سنا تھا۔" حامد نے سے کہا۔ "لیکن واپسی میں وہاں کچھ بھی نہیں تھا، شاید پولیس کے ساتھ ٹیکسی بھی لے گئی تھی۔"

"وہ یہاں کیمپس میں چرس لاتا تھا۔" جبار نے رازدا میں کہا۔ "مطیع اللہ اسے پہچانتا تھا، اس نے راستے میں ا کی لاش دیکھی تھی۔"

"تو تمہیں تشویش کیوں ہے؟" حامد اس کے پرجوش پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

"اب کیمپس میں چرس نہیں ملے گی۔" وہ دائیں بائیں نگاہ ڈالتے ہوئے بولا۔ "موقع غنیمت ہے، اگر تم ساتھ دو تو اپنے پانی کا خرچ مفت میں نکل آئے گا۔"

"وہ کیسے؟" حامد نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے تحیر زدہ لہجے سوال کیا۔

"سارے چرسی اپنے یار ہیں۔" وہ حامد کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "سب کو آہستہ آہستہ ہیروئن پر لگا لوں گا۔"

"کیوں دوسروں کو بھی برباد کرتے ہو اپنے ساتھ؟" حامد نے نیت بنتے ہوئے اوپری دل سے کہا۔ "اس سے تمہیں کیا سل ہو گا؟"

"سنو گے تو اچھل پڑو گے، پہلے یہ بتاؤ کہ تم ہیروئن کہاں سے تے ہو؟"

حامد کو اس کی باتوں میں گہری دلچسپی تھی کیونکہ ہیروئن کی پت بڑھنے سے اس کا مالی مفاد وابستہ تھا لیکن جبار کی حد سے ھی ہوئی دلچسپی دیکھ کر اس نے تھوڑی سی برہمی کا اظہار ضروری ھا اور برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ "دیکھو یار! یہ میرا دھندا ہیں ہے، بس یاری دوستی میں تمہیں پڑیاں لا دیتا ہوں، جیسے اسے قسم لی ہے اسی طرح آگے بھی رازداری کا وعدہ کرنا پڑا تھا۔ ب کہیں تمہاری فرمائشیں پوری ہوتی ہیں۔"

"اچھا خیر، جانے دو۔" جبار جلدی سے بولا۔ "تم مال لاتے ہو، میں آگے بیچوں گا لیکن تین روپے فی پڑیا کمیشن لوں گا۔"

"لاحول ولاقوۃ۔" حامد اس بات پر ہتھے سے اکھڑ گیا۔

"بڑی گندی سوچ ہے تمہاری، میں دام کے دام تمہیں پڑیاں لا کر دیتا ہوں، آنے جانے کا کرایہ تک میرا اپنا خرچ ہوتا ہے۔ تمہیں شرم نہیں آتی مجھ سے کمیشن کا مطالبہ کرتے ہوئے...؟"

"ارے ارے سنو تو۔" جبار اس کی برہمی دیکھ کر بوکھلا گیا تم میری بات کا مطلب نہیں سمجھے یا شاید مجھ سے ہی غلطی ہو گئی... میرا مقصد یہ تھا کہ تم واقعی سستا مال لاتے ہو، جو پڑیا پچیس میں لاتے ہو بازار میں اس کے دام تیس روپے ہیں۔ قیمت خرید نکال کر پانچ روپے بچتے ہیں۔ ان میں سے دو تمہارے تین میں کماؤں گا۔"

حامد کا سارا غصہ بناوٹی تھا جو جبار کے سامنے اپنی پوزیشن صاف رکھنے کے لیے ضروری تھا لیکن اسے جبار کے حساب کتاب پر حیرت ضرور ہوئی تھی۔ "اس کا مطلب ہے کہ تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں تھا، اس لیے دام معلوم کرنے کے واسطے شہر میں دھکے کھاتے پھرے۔"

"او ہو۔" وہ بے بسی سے دونوں ہاتھ فضا میں لہراتے ہوئے بولا۔ "تم تو ہر بات کا غلط مطلب نکالنے پر تلے ہوئے ہو۔ بھائی یہ ہیروئن تو ہر ایک کو مل بھی نہیں رہی ہے۔ بس اتفاقاً ہی اس کے دام میرے علم میں آ گئے، اسی کا نتیجہ ہے کہ اس وقت تم سے بات کر رہا ہوں۔"

"مجھے ایسے پیسوں کی ضرورت نہیں۔" حامد نے نرمی اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "جو بچے تم ہی رکھ لینا، میں منشیات کا سپلائر بننا پسند نہیں کرتا۔"

"نہ اس آدمی کا پتا بتاؤ گے جس سے مال لاتے ہو، نہ خود شریک ہونے کو تیار ہو تو مجھے کیا خاک بچے گا۔" جبار بددل ہو کر بولا۔ "لحاظ مروت میں دو چار روز کچھ مال لاتے رہو گے لیکن طلب بڑھ گئی تو پھر کیا ہو گا، تم پیٹھ دکھا دو گے اور میری ٹھکائی ہو جائے گی۔"

تھوڑی سی بحث کے بعد حامد نے گویا اس کے دباؤ کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اور بے بسی کے ساتھ بولا۔ "تم نے پیسے بنانے کی ترکیب تو خوب سوچی ہے لیکن جو لوگ کل تک پچیس کی پڑیا لیتے رہے ہیں، وہ اتنی آسانی سے تیس دینے پر آمادہ نہیں ہوں گے۔"

جبار داہنی آنکھ دبا کر فتحمندانہ انداز میں ہنسا۔ "میں تمہاری طرح نرا گھامڑ نہیں ہوں، لوگ کہتے ہیں کہ نشے سے دماغ ناکارہ ہو جاتا ہے اور میرا تجربہ ہے کہ نشہ عقل کو تیز کرتا ہے، میری مانو تو تم بھی شروع کر دو، میں پہلے ہی دن سے اٹھائیس روپے فی پڑیا وصول کرتا رہا ہوں، تمہارے حصے کے دو روپے تو اب بڑھاؤں گا جس کو تیس دینے میں اعتراض ہو گا، وہ شہر کی خاک چھان کر خود ہی راہ راست پر آ جائے گا۔"

❁

وہ بظاہر گرد و پیش سے بے پروا، بالکل باؤلا نظر آتا تھا، لیکن اپنے مطلب کا بہت پکا تھا۔ اسے قاسم بھائی سے دو ہزار روپے مہینہ تنخواہ ملتی تھی اور کام صرف اتنا تھا کہ قاسم بھائی کے ٹھکانے سے ہیروئن کے چھوٹے چھوٹے کم بیش قیمت پیکٹ اپنی ہنڈا ففٹی کی باسکٹ میں ڈالے اور اپنے علاقے میں اڈوں پر تقسیم کر دے۔ اس کے علاقے کی حدود بہت واضح تھیں۔ ایک طرف نیپئر روڈ سے شروع ہو کر گارڈن روڈ پر ختم ہوتی تھی اور دوسری طرف نشتر روڈ سے چندریگر روڈ کے چھوٹے بڑے متعدد ٹھکانے اس کے ذمے تھے۔ جہاں چندریگر روڈ ختم ہوتا تھا وہاں سے گارڈن روڈ تک حدود ذرا پیچیدہ تھیں لیکن وہ اپنا علاقہ خوب پہچانتا تھا۔ ڈیڑھ دو گھنٹے میں سارا کام نمٹا کر فارغ ہو جاتا تھا۔

قاسم بھائی نے جب سے ہیروئن کا دھندا شروع کیا تھا وہ بہت خوش تھا حالانکہ اس کی تنخواہ وہی کی وہی رہی تھی لیکن وہ تجربہ کار آدمی تھا۔ شراب اور چرس کا کام بھی کر چکا تھا۔ بلکہ قاسم بھائی کی منوں چرس اسی کے ہاتھ سے گزری تھی لیکن شراب سے وہ ہمیشہ خائف رہا۔ آخری بوتل سے چھٹکارا پانے تک بڑی احتیاط کرنی پڑتی تھی۔ پیکنگ خراب ہو جائے تو بوتلیں آپس میں ٹکرا کر ایسی آوازیں پیدا کرتی تھیں کہ سننے والا خواہ مخواہ متوجہ ہو جائے، پھر جھٹکا لگنے کی صورت میں بوتلیں ٹوٹنے کا خوف الگ سر پر سوار رہتا تھا، ذرا بھی شراب بہہ نکلے تو ہر ایک پر اپنی اصلیت آشکار کر دیتی ہے پھر سب سے بڑی مصیبت وزن کی تھی، چرس نسبتاً آسان جنس تھی، چھوٹی بڑی ٹکیوں کے نہ کھنکنے کا ڈر نہ ٹوٹنے او بہنے کا خوف۔ بس ایک بو ذرا سی تشویش کا باعث بنتی تھی جو مضبوط قوتِ شامہ والا دور ہی سے سونگھ سکتا تھا مگر ہیروئن ہر عیب سے عاری تھی۔ اس بے زبان نشے کی ایک ہتھیلی اتنی مالیت کی ہوتی تھی کہ اگر شراب لی جاتی تو ٹرک درکار ہوتا اور چرس کے لیے منی ٹرک۔

لیکن وہ خوب جانتا تھا کہ اس بساط پر اس کی وقعت پیدل سے زیادہ نہیں ہے جو ہوشیاری سے چلے تو شہ پر شہ دیتا چلا جاتا ہے لیکن ذرا بھی بہکے تو بچنے کی مہلت نہیں ملتی بے رحمی سے پیٹ دیا جاتا ہے۔ اپنے اس مقام کو پہچان لینے کے بعد وہ بہت محتاط تھا۔ قاسم بھائی اس کے سامنے ہمیشہ سیٹھوں جیسے بے مہار روپے کا مظاہرہ کرتا تھا جسے وہ خندہ پیشانی سے برداشت کر جاتا لیکن اسے یقین تھا کہ قاسم بھائی کسی کا غلام ہے اپنے اس یقین کے باوجود اس نے کبھی تجسس میں پڑنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی مگر جب قاسم بھائی نے اسے بتایا کہ وہ دوسری پارٹیوں کے بڑے مال کی صحیح خبر پر پانچ ہزار روپے انعام دے گا تو اس کی کھوپڑی پر بھی تجسس سوار ہو گیا۔

پانچ ہزار روپے کا مطلب تھا اس کی ڈھائی ماہ یعنی پچھتر دنوں کی تنخواہ۔ لہٰذا فاضل وقت میں وہ شہر میں آوارہ گردی کرنے لگا۔ اخباروں میں مال کی پکڑ دھکڑ اور چھاپوں کی خبر کو وہ غور سے پڑھتا تھا کیونکہ اس کی لائن کی خبریں ہوتی تھیں۔ اس نے دیکھا کہ ہیروئن حکام کی دسترس سے قطعی باہر تھی، شاید شہر میں نیا ہونے کی وجہ سے یہ نشہ کسی کے یہاں بھی توجہ کا مستحق قرار نہیں پایا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے نوٹ کیا کہ ولایتی لیبلوں سے بکنے والی دیسی شراب کی کوئی بھٹی بھی زد میں نہیں آئی تھی۔ جب کہ ٹھرے کی کئی بھٹیاں پکڑی جا چکی تھیں۔

بڑا نا پاپی ہونے کی وجہ سے اسے معلوم تھا کہ شہر میں استعمال شدہ خالی بوتلوں کے بیوپاری شہر بھر سے جمع ہونے وا[لی بوتلوں] میں سے ہر میل کی بوتلیں الگ الگ کر کے ہزاروں میں ضرورت مندوں کو مہنگے داموں فروخت کرتے [تھے]۔ [ان] میں ایک دو ایسے تھے جو شراب کی خالی بوتلیں نوادر جمع کرتے تھے۔ لائسنس یافتہ ٹھکانوں، بندرگاہ پر لنگر [انداز ہونے] والے جہازوں، ہوائی اڈے پر بین الاقوامی طیاروں کی [صفائی کرنے] والے عملے اور شہر کے نالوں اور کوڑا گھروں سے بوتلیں اور کاغذ چننے والوں کے ذریعے ان کے پاس غیر ملکی خالی بوتلوں کے انبار جمع ہو جاتے تھے جو لاٹ کی صورت پندرہ سے بیس روپے فی بوتل تک فروخت ہوتی تھیں۔ خالی بوتلوں کے مصرف سے خوب آگاہ تھے اور اپنی ا[شیا] کے بھرپور دام وصول کرتے تھے۔

ان سے غیر ملکی شراب کی خالی بوتلیں خریدنے [والی شہر] بھر میں دو یا تین ہی پارٹیاں تھیں اور ان میں بھی ا[یک] سمجھوتہ تھا کہ ہر ایک کے برانڈ الگ تھے کیونکہ خالی بو[تلوں سے] مال کمانے کے لیے المونیم کے چھپے ہوئے ڈھکنوں سے [بند کرنے] والی مشینیں بھی ضروری تھیں جو باہر سے خاصی مہنگی آتی [تھیں اور] شاید ہر ایک کے پاس ایک ہی تھی۔ ان بوتلوں میں مقا[می طور] پر بنائی ہوئی بہتر قسم کی شراب بھر کر بوتلیں غیر ملکی مشینوں [سے سیل] کی جاتیں، ان پر مقامی طور پر چھپے ہوئے اصل سے مشا[بہ لیبل] لگائے جاتے اور یہ بوتلیں شراب کے رسیاؤں کو غیر ملکی [کے] طور پر مہنگے داموں بیچ دی جاتی تھیں۔ جب سے ملکی قا[نون شراب] کا دشمن ہوا تھا، پینے والوں کے لیے انتخاب کی مہلت ہی [نہیں رہی] تھی۔ ہر با حیثیت شرابی کی کھوپڑی میں ایک ہی سودا [سمایا ہوا] تھا کہ جس برانڈ کی بھی مل جائے لیکن ہو غیر ملکی۔ اس ڈ[گر پر] پڑنے کی وجہ سے اچھے اچھے پینے والے ذائقے کی تمیز [کھو چکے] تھے بس ایک ہی پہچان رہ گئی تھی کہ بوتل اور لیبل وا[یتی ہو] کیونکہ ان کی دانست میں ملک میں ایسی عمدہ بوتلوں کی [تیاری] ناممکن تھی۔ اگر انہیں علم ہو جاتا کہ کوڑا گھروں اور گند[گی] میں پھینکی ہوئی ان ہی کی بوتلیں دوبارہ بھر کر ان کے [حلق] میں اتار دی جاتی ہیں تو شاید ہر شرابی بوتل خالی کرنے [کے بعد] اپنا سر پھوڑتا یا نہ پھوڑتا، بوتل کو ضرور توڑ دیتا۔

اس نے سوچا کہ اسے کسی ایسی فیکٹری کا سراغ لگا[کر قاسم بھائی] سے انعام کی رقم وصول کرنی چاہیے لیکن ساری معلومات [کے] باوجود اس کے پاس کوئی نقطۂ آغاز نہیں تھا۔ یہ معلوم تھا [کہ شہر] میں وہ دھندا کیسے ہو رہا ہے لیکن یہ پتا نہیں تھا کہ اس [میں] کون ملوث ہے۔

اس نے بوتل والی گلی کے کئی چکر لگائے لیکن گہری [نظر سے دیکھنے کے باوجود] ایک اور پُراسرار دکانوں میں کہیں شراب کی پرانی بوتلیں نظر [نہیں آئیں]۔ ہر ایک صاف ستھرا اور کھرا کام کر رہا تھا۔ ایک آدھ جگہ [غیر ملکی لیبل] لگا لیکن غیر ملکی خوشبویات، کریموں یا لوشنوں کی خالی بوتلیں [ر]ہی تھیں۔ آخر وہ اپنی ہنڈا ففٹی ٹیکسی اسٹینڈ پر مقفل [کر کے] لائٹ ہاؤس سنیما کے پہلو میں نالے پر بنی ہوئی پختہ [دکانوں] کی طرف بڑھ گیا جن کے اندرونی رُخ پر پرانے کپڑوں کا [کاروبار] ہوتا ہے اور سڑک کے رُخ پر چھوٹے چھاپہ خانوں سمیت [کئی] کارخانے پھیلے ہوئے ہیں۔

اس روز ان دکانوں کی ایک خرابی اس کی نگاہ میں آئی۔ [وہ اتن]ی بلند تھیں کہ سڑک پر چلتے ہوئے راہ گیر کے لیے سیڑھیاں [چڑھے] بغیر اندر کا جائزہ لینا ناممکن تھا۔ اسے ہمیشہ سے خیال رہا [تھا کہ] ان چھاپہ خانوں میں شاید کرنسی نوٹوں کے علاوہ ضرورت [کی ہر] چیز چھاپی جاتی ہو لیکن وہ پہلے پریس میں گھسا تو اس کی [صورت] دیکھتے ہی اندر سے ایک نوجوان سوالیہ انداز میں اس کی [طرف] دیکھتا سیڑھیوں تک آ گیا پھر کچھ اس انداز میں اسے گھورنے [لگا جیسے] اسے کسی قیمت پر اندر نہ گھسنے دے گا۔

نوجوان کے تیور اتنے درشت تھے کہ اس نے پوچھے [بغیر اپ]نا مدعا ظاہر کرنے میں ہی عافیت سمجھی۔ "مجھے کچھ لیبل [چھپوا]نے ہیں۔"

"ہمیں دو مہینے تک فرصت نہیں ہے۔" نوجوان نے [اس] کے سراپا کا جائزہ لیتے ہوئے تحقیر آمیز لہجے میں کہا۔ "اس [کے ب]عد ڈیزائن لے کر آنا۔" وہ خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔

تیسری دکان میں ایک بزرگ صورت شخص کا رویہ بہت [مناسب] ثابت ہوا۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہی ایک طرف پڑے [ہو]ئے لیبلوں کے وہ بنڈل دیکھ لیے جن پر میڈ اِن جاپان [اور] میڈ اِن یو ایس اے کے ساتھ بعض مشہور مصنوعات کے نام [چھپے] ہوئے تھے۔

"میرا نام مولا بخش ہے، کسی ذریعے سے آپ تک پہنچا [ہو]ں۔" اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "ولایتی پانی کے [کئی] ہزار لیبل چھپوانے ہیں۔"

"بھائی! ہم گھپلے کے کام نہیں کرتے۔" بزرگ صورت شخص [نے] ملائمت سے جواب دیا۔ "ولایتی پانی کے علاوہ جو لیبل ہوں [چھا]پنے کو تیار ہیں۔ ویسے بھیجا کس نے ہے آپ کو؟"

"شیخ صاحب نے بھیجا تھا۔" مولا بخش نے بلا تامل ایک [فرضی] نام لے دیا۔ "آپ نہیں کرتے تو پھر کون کرتا ہے؟"

"کئی ہیں۔" حوصلہ افزا جواب ملا۔ "لیکن سلطان کے پاس تمہارا کام سستا ہو جائے گا، اس کے پاس اپنے بلاک ہیں، وہیں چلے جاؤ۔"

سلطان کے پریس کا پتا معلوم کر کے مولا بخش وہاں سے بھی لوٹ آیا اور تھوڑی دیر میں قریبی گلی میں واقع اس مختصر سے چوبی دفتر میں پہنچ گیا جس کے عقب سے بیک وقت چھپائی کی کئی مشینیں چلنے کی آواز گونج رہی تھی۔

وہاں اس نے ایک زود اثر دوا کے اشتہار چھپوانے کی بات چھیڑتے ہوئے اس مختصر سے دفتر کا جائزہ لے ڈالا لیکن وہاں اسے مطلب کی کوئی چیز نظر نہ آئی۔ اپنے استفسار کا جواب بھی حسبِ توقع نفی میں ملا۔ "نالے پر چلے جاؤ، اشتہار وشتہار وہیں چھپتے ہیں۔"

اگلے دن اس نے دو گھنٹے اس پریس کے قرب و جوار میں ضائع کیے اور جب ایک کار وہاں رُکی تو وہ ذرا چوکنا ہو گیا۔ کار والا چوبی دفتر میں چلا گیا۔ چند منٹ بعد پریس کا مالک کاغذ میں چاروں طرف سے لپٹے ہوئے بنڈل لے کر باہر نکلا جو کار کی عقبی نشست پر رکھ دیے گئے اور جب وہ کار وہاں سے روانہ ہوئی تو مولا بخش ایک موہوم سی امید کے سہارے اس کے پیچھے ہو لیا۔ وہ کار واپس گھوم کر ایم اے جناح روڈ پر نکلی پھر ٹریفک سگنل سے حسن علی آفندی روڈ پر گھوم کر فریئر روڈ پر آ گئی۔ اس تعاقب کا اختتام گلشنِ اقبال میں نیپا چورنگی سے ذرا پہلے بائیں سمت کی صاف ستھری آبادی میں ہوا۔ وہ کار ایک ایسے بنگلے میں داخل ہوئی تھی جس پر کاسمیٹکس بنانے والے کسی ادارے کا بورڈ آویزاں تھا۔

مولا بخش کو کچھ علم نہیں تھا کہ کار میں شہر سے کس قسم کے لیبل لائے گئے تھے اور کاسمیٹکس فیکٹری کے نام پر درحقیقت گلشنِ اقبال کے اس بنگلے میں کیا ہو رہا تھا۔ اس کے ذہن پر تو بس پانچ ہزار روپے سوار تھے جو اسے شہر کی سڑکیں ناپنے پر مجبور کر رہے تھے۔ ایک طویل چکر کاٹ کر وہ دوبارہ بنگلے کے سامنے سے گزرا تو اس کے نتھنوں میں اسپرٹ کی ہلکی سی بُو آئی لیکن اس بنا پر وہ کوئی نتیجہ اخذ نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ کاسمیٹکس کی تیاری میں بھی اسپرٹ بنیادی اہمیت رکھتی تھی۔

اس بنگلے کی احاطے کی دیواریں خاصی بلند اور محفوظ تھیں۔ پھاٹک بھی اس وضع کا تھا کہ اس کے بند ہونے کی صورت میں اندر کی صورتحال کی جھلک دیکھنی بھی ناممکن تھی اور اندر پورچ میں شاید اتنی جگہ تھی کہ مال کی لدائی اور اُتروائی بآسانی ہو سکتی تھی۔

دو دن برباد کرنے کے بعد مولا بخش کو اپنے شبہات پر یقین ہونے لگا کیونکہ اس مکان سے روانہ ہونے والا مال رازدارانہ

طریقے پر نکلتا تھا لیکن ٹیپو سلطان روڈ کے ایک مکان پر گتے کے وزنی کارٹن اترتے دیکھ کر بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ ان میں کاسمیٹکس کے ہلکے پھلکے سامان کے بجائے وزنی مال ہے۔ لہٰذا وہ سیدھا قاسم بھائی کے ٹھکانے کی طرف روانہ ہو گیا۔ تاکہ اس کو خوش خبری سنا کر اپنے انعام کا مطالبہ کر سکے۔

"خبر ٹھیک نکلی تو تیرا انعام پکا۔" قاسم بھائی نے اس کی کتھا سن کر بے پروائی سے کہا اور اس کا سارا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔

"کب تک انتظار کرنا پڑے گا؟" اس نے مایوسانہ لہجے میں سوال کیا۔

"ارے مرتا کیوں ہے، کل تک سب معلوم پڑ جائے گا۔" قاسم بھائی نے جھنجھلا کر کہا۔ "چل اب بھاگ جا یہاں سے۔"

اور وہ وہاں سے واپس چلا آیا۔

ڈینی پانچویں دن لوٹ آیا۔ اس کی دانست میں دورہ زبردست کامیابی سے ہم کنار ہوا تھا۔ باس کے لیے تو اس نے وہی لگا بندھا کام سرانجام دیا تھا جو اس کے سپرد کیا گیا تھا لیکن ذاتی طور پر اس کی معلومات اور روابط میں خاصا اضافہ ہوا تھا۔

ویرا لائیڈ بنکاک میں تین دن گزارنے کے بعد ٹوکیو پہنچی تھی اور سوکوموتو اسے براہِ راست ڈینی کے پاس لے آیا تھا۔ پھر اس نے ڈینی کے کمرے میں بیٹھے بیٹھے انٹرکام پر ویرا کے لیے اسی فلور پر ایک کمرہ بک کرایا تھا۔ کمرے کی چابیاں ملنے کے بعد وہ یہ کہتا ہوا رخصت ہو گیا کہ وہ جاتے ہوئے کاؤنٹر پر ادائیگی کرتا جائے گا، ویرا جب بھی نیچے اترے رجسٹر میں اپنے دستخط ثبت کر دے۔

اس کے جاتے ہی ویرا ڈینی کے ڈبل بیڈ پر دراز ہو کر نشیلی آواز میں بولی تھی: "تھک گئی ہوں، تھوڑی دیر یہیں آرام کروں گی، ذرا دروازہ اندر سے مقفل کر لو اور ڈینی نے راہداری میں کھلنے والے دروازے کے گول دستے میں لگا ہوا بٹن دبا کر دروازہ مقفل کر دیا۔

ویرا کے بارے میں ڈینی بیارسے میں ہی اندازہ لگا چکا تھا کہ وہ خاصی چالاک لڑکی ہے۔ لہٰذا اصل موضوع پر بات کی نوبت ہی نہ آنے دی اور ڈینی نے بھی اپنے ذہن کو آزاد چھوڑ دیا۔

پھر جب گفتگو ہوئی تو پتا چلا کہ بنکاک میں ان لوگوں کی ہیروئن ٹیسٹنگ لیبارٹری میں بجلی کے شارٹ سرکٹ سے آگ لگنے کے باعث کنٹرول سرکٹ ناکارہ ہو کر رہ گئے تھے۔ جن کی مرمت کے انتظار میں ویرا کو بنکاک میں رکے رہنا پڑا۔ ڈینی کے دیے ہوئے نمونے کی ٹیسٹ رپورٹ تسلی بخش تھی۔

انشلے ہاؤز والوں کو ایشین سنڈیکیٹ لمیٹڈ کی
نمونے کے مطابق ایمسٹرڈم میں ہیروئن کی ڈلیوری کے
امریکی ڈالر فی کلوگرام دیے گئے تھے جو انھیں منظور تھے
شیڈول میں وہ تبدیلی چاہتے تھے۔ ابتدا میں پانچ
وہ ایمسٹرڈم، لندن اور اوسلو میں چاہتے تھے۔ یہ نکتہ
خواب و خیال میں بھی نہیں تھا۔ اسے علم تھا کہ دنیا
ہوائی اڈوں پر منشیات کی خفیہ درآمد کی روک تھام
انتظامات تھے جن کے باعث کہیں مال نکال لے جا
تھا اور کہیں تقریباً ناممکن۔ اسی وجہ سے مختلف مقامات
کے داموں میں زمین آسمان کا فرق پایا جاتا تھا لیکن
یورپ کے داموں میں تقریباً دس گنا فرق نے اس کی
کھول دی تھیں۔

ایشین سنڈیکیٹ والوں نے اپنے مال کے جو
تھے، وہ ایمسٹرڈم کے خطرات کو مدنظر رکھتے ہوئے د
وہاں سے ہیروئن لندن اور اوسلو اسمگل کرنی آسان ہوتی
کے مقامات میں تبدیلی پر اصرار نہ کرتی لہٰذا ڈینی نے
داری اپنے سر لینے کے بجائے اسی رات خفیہ اشاروں
سنڈیکیٹ کے لاہور کے پتے پر ٹیلکس روانہ کر دیا۔ اس
تھا کہ گرے کلاتھ اسی دام پر لندن اور اوسلو میں بھی

چند گھنٹوں بعد ویرا میں ڈینی کو جوابی ٹیلکس موصو
میں ہدایت تھی: "لندن اور اوسلو کے لیے دس فیصد پر
کوشش کرو لیکن اس وجہ سے سودا خراب نہ ہونا چا

ڈینی نے ویرا کی لاعلمی میں ہوٹل سے ہی
جب جواب ملنے کے بعد اس نے ویرا سے پریمیم کی بات
وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مسکرا دی: "وہ
پہلے ہی ادا کر چکی ہوں۔"

"لندن اور اوسلو خطرناک مقامات ہیں۔ وہاں اکثر
پکڑ لیا جاتا ہے۔" ڈینی نے سنجیدگی سے کہا تھا۔ "پرائس
کم از کم دس فیصد اضافہ ہو جائے گا۔"

ویرا نے اسے ٹالنے کی بہتیری کوشش کی، یہی
سے ذرا بھی تجاوز نہ کرنے کی مجبوری کا عذر پیش کیا لیکن
سے ہتھیار ڈالنے والا نہیں تھا۔ بات منوانے کی حد تک
مطالبے پر ڈٹا رہا اور آخرکار ساڑھے چھ فیصد پر مان

وہ سارا کام غیر قانونی تھا لیکن انشلے ہاؤز وا
اشاراتی ہیر پھیر کے ذریعے باقاعدہ دستاویزات بنائی
جن پر ویرا نے اپنے قلم سے کچھ ترمیمی اندراجات کیے
ڈینی کے دستخط لے کر دو نقلیں اس کے حوالے کر دیں۔

پلاسٹک کے سیاہ ڈبے میں رکھ دیا اور پھر الماری سے اپنا ذاتی ریوالور نکال کر چیک کرنے لگا۔ کراچی واپس پہنچنے کے بعد اس نے باس سے ملا ہوا پستول دوبارہ بریف کیس میں ڈال دیا تھا اور اس رات اسے استعمال کرنا نہیں چاہتا تھا۔

وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ رات گئے گارڈن ایسٹ کے علاقے میں ایک وسیع احاطے میں واقع اس زرد مکان میں ضرور داخل ہوگا جہاں سکندر علی مقیم تھا۔

سکندر علی کے بارے میں سوچتے ہوئے اس کا ذہن غزالہ کی طرف بھٹک گیا اور وہ مضطرب ہو کر فون پر اس کا نمبر ملانے لگا۔ دوسری گھنٹی پر فون اٹھا لیا گیا اور ڈینی کو اس پر ایک تحکم آمیز مردانہ آواز گونجتی سنائی دی۔

ڈینی کی رگ یک بیک پھڑک اٹھی، شاید بولنے والا غزالہ کا باپ ہی تھا جو اپنی بیٹی کی وجہ سے فون کے بارے میں بہت محتاط تھا۔ "آپ کون صاحبہ بول رہی ہیں؟" وہ شرارت آمیز لہجے میں بولا۔

"میں کرنل زوار زیدی بول رہا ہوں، سمجھے۔" دوسری طرف سے بولنے والا غصیلے لہجے میں بولا۔

"نام مردانہ اور آواز اتنی باریک؟" ڈینی نے اسے سلگانے کے لیے کہا اور انگریزی میں گالیاں سنتے ہوئے ریسیور رکھ دیا۔

اس وقت غزالہ سے بات ہونی ممکن نہیں تھی لہٰذا وہ پھر سکندر علی کے بارے میں سوچنے لگا۔ شکل صورت سے وہ سیدھا سادا آدمی نظر آتا تھا لیکن ڈینی کو یقین تھا کہ اسی صورت میں وہ خوفناک آدمی پوشیدہ تھا جو برسوں سے اسے اپنے اشاروں پر نچاتا چلا آ رہا تھا۔

ہر طرف گہرے سکوت اور سناٹے کی حکمرانی تھی۔ آخری تاریخوں کا تھکا ہارا چاند آسمان کی بیکراں وسعتوں میں کہیں کھویا ہوا تھا، ٹمٹماتے ہوئے تاروں کی چادر میں بھی تسلسل نہیں تھا کیونکہ آسمان پر آوارہ بدلیوں کے ٹکڑے تیرتے پھر رہے تھے۔ ایسے میں گارڈن ایسٹ کے اس علاقے میں اسٹریٹ لائٹس کا قحط سا نظر آ رہا تھا۔ کئی کئی کھمبے چھوڑ کر جزا کا دکا یرقان زدہ بلب روشن تھے، وہ اپنے قرب و جوار میں بھی اندھیرا دور کرنے میں ناکام تھے بلکہ کہیں کہیں موجود وہ روشن دھبے اندھیرے کی اس مہیب چادر کو اور زیادہ ہولناک بنا رہے تھے۔ مکانوں کی بیرونی روشنیاں بچت کے خیال سے یا قومی پیمانے پر توانائی کے بحران کے پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر بند تھیں اور ان مکانوں کے مکین اپنی چار دیواریوں میں گہری نیند کے مزے لے رہے تھے اور ان ہی میں وسیع احاطے میں واقع وہ دو منزلہ عمارت شامل تھی جس کے مکین نے ڈینی کو رات کے اس پہر بستر میں پڑے رہنے کے بجائے سڑک پیمائی پر مجبور کر دیا تھا۔

وہ سکون سے کار ڈرائیو کر رہا تھا کیونکہ گلیوں میں اس وقت دور دور تک میدان صاف تھا، چھوٹی آبادی ہوتی تو شاید ڈینی کا ایک آدھ چوکیدار سے ٹکراؤ ہو گیا ہوتا لیکن وہاں شہر کے باثروت لوگ مقیم تھے اور ہر احاطے میں وہاں کا تنخواہ دار چوکیدار مقیم تھا جو شاید مالکان کی بے فکری کی نیند کے انتظار میں جاگنے کے بعد رات گئے خود بھی سو جاتا ہوگا۔ لہٰذا ڈینی اس وقت خود کو رات کا شہزادہ تصور کر رہا تھا جو اپنی من مانی کرنے کو آزاد ہو۔

اس کی جاپانی کار کا بے آواز انجن اس مہم میں اس کا خاصا مددگار تھا، صرف تاریک سڑک پر دور تک پھیلتی ہوئی ہیڈ لیمپس کی روشنیوں کا انعکاس ہی اس علاقے میں اس کی نقل و حرکت کی چغلی کھا رہا تھا۔ جب اس نے آخری گلی میں کار گھمائی تو روشنیاں گل کر دیں، سڑک کے ساتھ ہی ڈیش بورڈ پر بھی اندھیرا پھیل گیا اور ڈینی کی کار پُراسرار آسیبی انداز میں اس دیکھے بھالے راستے پر بڑھتی رہی۔

دوسرے مکانوں کی طرح زرد رنگ کی دو منزلہ عمارت بھی گھور اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ڈینی اس عمارت کے احاطے کی دیوار کے ساتھ ہی بغلی سڑک پر گھوم گیا۔ ادھر اندھیرا زیادہ گہرا تھا۔ تھوڑی دور نکلنے کے بعد ایک جگہ ڈینی نے ہینڈ بریک کھینچ کر گاڑی روکنی چاہی، کار کی رفتار کم ضرور ہوئی لیکن اس کے سو فٹ سے پہلے رکنے کے آثار نظر نہ آئے تو ڈینی نے دو بریک پیڈل پر رکھ دیا اور کار کے عقب میں سرخ روشنیاں جل اٹھیں، جس کا انعکاس ڈینی کو ونڈ شیلڈ پر لگے ہوئے عقب نما آئینے میں نظر آ رہا تھا، بریک لائٹس کی اس روشنی سے بچنے کے لیے وہ ہینڈ بریک آزما رہا تھا جو کھڑی ہوئی کار کو اپنی جگہ پر روکے رکھنے کے لیے تو بہت موثر تھے لیکن چلتی ہوئی کار کو روکنے میں اتنے کارگر نہیں تھے۔ کار کنارے سے روکتے ہی اس نے اگنیشن آف کیا، اپنی نشست کے نیچے سے اپنا ریوالور اٹھایا اور پھرتی کے ساتھ کار سے باہر آ گیا۔ اس نے محض شور کی وجہ سے دروازہ بہت احتیاط اور آہستگی سے بند کیا اور اسے مقفل کیے بغیر واپس چل دیا۔ وہ پہلی بار چوروں کی طرح کسی مکان میں گھسنے جا رہا تھا کہ اگر اسے ہنگامی طور پر واپس بھاگنا پڑا تو کار کا غیر مقفل دروازہ اس کا کام بہت آسان کر دے گا۔

اس کے بدن پر پوری آستینوں والی سیاہ جیکٹ اور سیاہ پتلون تھی، پیروں میں کریپ سول والے کالے جوتے اور ہاتھوں پر ہاس سے ملتے ہوئے جھلی جیسے باریک دستانے چڑھے ہوئے تھے۔ ریوالور اس نے کار سے اترتے ہی اپنی جیکٹ کی داہنی جیب

میں ڈال لیا تھا۔

وہ تیز قدموں کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے دیواروں کے ساتھ ہولیا اور پھر کہیں بھی روشنی کی زد میں آئے بغیر تاریکی کے ایک جزو کی طرح مطلوبہ عمارت کے احاطے کی بغلی دیوار کے قریب پہنچ گیا جو اس کی دانست میں آخری سرے پر عمارت کے عقبی حصے پر واقع تھی ۔ سکندر علی کا مکان حالانکہ کونے پر واقع تھا لیکن احاطے میں صرف اسی رخ پر پھاٹک بنایا گیا تھا جو نسبتاً کشادہ سڑک پر واقع تھا۔ ڈینی جس سمت میں تھا، وہاں ایک سرے سے دوسرے سرے تک سپاٹ دیوار پھیلتی چلی گئی تھی اور اس میں کئی جگہ اندر لگے ہوئے درختوں کی شاخیں یوں باہر جھکی ہوئی تھیں کہ تھوڑی سی کوشش کے بعد ان میں جھول کر بآسانی اندر کودا جاسکتا تھا۔

ڈینی کے دل میں بس ایک خوف تھا کہ کہیں اندر کودتے ہی رکھوالی کے کتوں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اس نے تھوڑے سے توقف کے بعد اُچک کر ایک مضبوط سی شاخ پکڑی اور پھر وہ کسی بندر کی طرح کلائیوں کے زور پر اپنا بدن اوپر اٹھاتا چلا گیا۔ شاخ پر پہنچنے کے بعد وہ احتیاط سے احاطے کے اندر پھیلے ہوئے اس درخت کے گھنے حصے میں پہنچ کر دو شاخوں کے درمیان بیٹھ گیا مگر اس کے کان اندر سے اُبھرنے والی کسی آہٹ کے منتظر رہے۔

چند ثانیوں بعد اس نے درخت سے ایک خشک ٹہنی توڑ کر لان پر اُچھال دی، شاخ گرنے کی ہلکی سی آواز پیدا ہوئی جو رکھوالی کے کتوں کو ادھر متوجہ کرنے کے لیے کافی تھی لیکن کئی منٹ گزرنے کے ... اندر پھیلا ہوا سناٹا بدستور برقرار رہا

وہ شاخوں کے درمیان سرکتا ہوا درخت کے انتہائی اندرونی حصے کی طرف بڑھنے لگا کیونکہ اس گھنیرے درخت کی کئی شاخیں اس سمت میں نیچے کودنے میں معاون ثابت ہوسکتی تھیں جب کہ ڈینی خود بھی اندر اترنے کے لیے تنا استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا۔

شاخوں کے اندھیرے کنج میں اس نے اپنی جیب سے سیاہ نائیلون کا تھیلی نما ایک نقاب نکالا اور اپنے چہرے پر منڈھ لیا اس طرح وہ سر سے پیر تک سیاہ پوش ہوگیا۔ نقاب میں آنکھوں اور نتھنوں کے مقام پر پہلے سے ایسے سوراخ موجود تھے کہ ڈینی کو دیکھنے یا سانس لینے میں دشواری نہیں ہورہی تھی۔

وہ درخت کی ایک لچکیلی شاخ کے سرے پر آکر ہلکی سی دھمک کے ساتھ نیچے لان پر کود گیا اور احتیاطاً چند ثانیوں تک ... کسی حرکت کیے بغیر اسی جگہ زمین پر ہاتھ جمائے اکڑوں بیٹھا ... پھر اپنی جگہ سے اٹھا اور پھرتی کے ساتھ دوڑتا ہوا عمارت

کی دیوار سے جا لگا اور اسی طرح دیوار کے سہارے عمارت ... عقبی حصے کی طرف بڑھنے لگا۔ راستے میں آنے والی نچلی ... کی تمام کھڑکیاں تاریک تھیں۔ جو کھلی ہوئی تھیں، ان میں ... آہنی گرل لگی ہوئی تھی جس کے باعث ڈینی کو اس راہ سے ... داخلے کے امکانات کو یکسر مسترد کرنا پڑ گیا۔ اس پہلو سے گز... ڈینی نے پورے عقبی حصے کا بھی جائزہ لے ڈالا مگر ادھر بھی ... ساری راہیں مسدود نظر آئیں بس لے دے کر کوڑے دان ... قریب ایک دروازہ تھا جس کا ہینڈل گھماتے ہی اسے اندر ... مقفل ہونے کا اندازہ ہوگیا۔ وہ دروازہ یقینی طور پر کچن و... سے ملحق کسی ایسی راہداری میں کھلتا تھا جہاں مکینوں سے زیا... ان کے ملازمین کا عمل دخل رہتا ہوگا۔

ڈینی نے پھرتی کے ساتھ دوسرے پہلو ... بھی معائنہ ... ڈالا اور ادھر سے ناامید ہوکر کوڑے دان کے قریب وا... عقبی دروازے پر لوٹ آیا۔ اسے قفل شکنی میں کوئی خاص مہا... نہیں تھی لیکن یہ ضرور جانتا تھا کہ دروازوں میں نصب مخ... دوسرے تالوں کے مقابلے میں آسانی سے کھولے جاسکتے ہیں۔

ان امکانات کے لیے وہ گھر سے تیار ہوکر چلا تھا لہذا ... کی جیب میں قفل شکنی کے بنیادی لوازمات موجود تھے۔ یہ شا... اس کی خوش قسمتی ہی تھی کہ چند ہی ثانیوں میں دروازہ کھولے... میں کامیاب ہوگیا۔ دروازے کے عقب میں دور کہیں مدھم م... روشنی ہورہی تھی جو اس مکمل تاریکی میں بہت زیادہ محسوس ... رہی تھی۔ ڈینی سناٹے سے مطمئن ہوکر اندر رینگ گیا ... دروازہ بآہستگی بند کر دیا۔

وہ بمشکل چار فٹ چوڑی راہداری تھی جس میں مصالحوں ... وغیرہ کی بو رچی ہوئی تھی۔ داہنی سمت پر پہلا دروازہ کچن میں ... تھا۔ اس کے برابر میں اسٹور بھی ڈینی کے لیے بے سود تھا لیکن ... بائیں طرف کا اکلوتا دروازہ کھولتے ہی اسے محتاط ہوجانا پڑا کیو... باہر سے آنے والے مدھم سے انعکاس میں کمرے میں ایک چارپا... نظر آرہی تھی۔

ڈینی نے دروازہ بند کرکے جیب سے ریوالور نکالا ا... چارپائی پر سوتے ہوئے شخص کے سرہانے پہنچ گیا۔ اس نے ا... کارروائی کے آغاز کے لیے ایسی جگہ کا انتخاب کیا تھا۔ جہاں ... وہ دروازے پر بھی نگاہ رکھ سکتا تھا۔

سویا ہوا شخص عمر رسیدہ اور کمزور جسم کا مالک نظر آ... تھا۔ ڈینی نے اچانک ہی اس کے منہ پر سختی سے اپنا بایاں ہا... جما دیا۔ سوتے سوتے نازل ہونے والی اس ناگہانی افتاد ... ڈینی کے شکار کو بوکھلا دیا اور وہ چیخنے کی ناکام کوشش کرتا ہ...

...طرح بیدار ہوگیا۔

... میرے ہاتھ میں بھرا ہوا ریوالور ہے۔" ڈینی دھیمی آواز ...زایا۔ "ذرا بھی آواز نکالی تو بھیجے میں گولی اتار دوں گا۔"

ڈینی کے الفاظ کا خاطر خواہ اثر ہوا اور اس کے شکار نے ...ی وحشیانہ گرفت سے اپنا دہانہ آزاد کرانے کے لیے ماہی ...ب کی طرح مچلنا یکلخت موقوف کر دیا۔ "میں ہاتھ ہٹا رہا ...، لیکن میری بات یاد رکھنا۔" ڈینی نے ریوالور اس کے چہرے ...سامنے نچاتے ہوئے کہا اور اس کے دہانے سے اپنا ہاتھ ہٹالیا۔

ڈینی کے پنجۂ ستم سے نجات پاتے ہی وہ پھرتی سے ...پائی سے اتر گیا اور پھر اندھیرے کے باوجود اسے ڈینی کا ...یا سیاہ پوش سراپا نظر آگیا اور اس کی آنکھیں خوف سے پھیلتی ...ئیں۔ "تت... تم کون ہو؟" اس کے لبوں سے سرسراتی ہوئی ...زدہ سی آواز نکلی۔

"گھر میں اس وقت کتنے لوگ موجود ہیں؟" ڈینی نے سرد ...بے رحمانہ لہجے میں سوال کیا۔

"میرے اور مس صاحبہ کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔" وہ خوفزدہ ...زمیں گھگھیایا۔ "آخر تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟"

"تمہاری مس صاحبہ کا عاشق ہوں۔" ڈینی بھیانک لہجے ...غرایا۔ "وہ اس اکیلے گھر میں تمہارے ساتھ کیا کر رہی ہے؟"

"وہ دن رات یہیں رہتی ہے۔" بوڑھا ملازم ہکلایا۔ "رات ...ٹھ صاحب اچانک زمینوں پر چلے گئے۔ ورنہ وہ بھی یہاں ...ود ہوتے۔"

"اور سیٹھ صاحب کے بیوی بچے؟" ڈینی نے سوال کیا۔

...سکندر علی کی غیر موجودگی کی اطلاع پر حیرت ہوئی تھی لیکن ملازم ...وضاحت نے اسے مطمئن کر دیا تھا۔ عمارت میں کسی لڑکی کی ...جودگی کا علم ہوجانے کے بعد اس کی نگاہ میں اس بوڑھے ...زم کی کوئی اہمیت نہیں رہ گئی تھی لیکن وہ پیش قدمی سے ...پہلے اس سے بھی ہر وہ بات اگلوا لینا چاہتا تھا جو اس کے ...لم میں تھی۔

"بیوی بچے تو سب گاؤں میں رہتے ہیں۔" بوڑھے ملازم ...نے بے بسی سے جواب دیا۔ "کبھی کبھار دو چار دن کے لیے ...تے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔"

"مس صاحبہ کون ہے؟" ڈینی نے اگلا سوال کیا۔

"سیٹھ صاحب نے اسے دو مہینے پہلے گھر میں ڈالا ہے، ...ہتی ہے کہ ان کی سیکرٹری ہوں۔" بوڑھے کے لب ولہجے میں ...فرت کی ہلکی سی بُو ابھر آئی تھی۔ "اللہ ہی آگے کا حال جانتا ہے، ...یں تو بس اپنے کام سے کام رکھتا ہوں۔"

"باہر نکلو اور اس کے کمرے کی طرف چلو۔" ڈینی نے بڑھ کر اسے ٹہوکا دیا۔ وہ جسمانی طور پر ڈینی سے اتنا کمزور تھا کہ شور اور ہنگامہ آرائی کے علاوہ کسی طرح ڈینی کے خلاف اپنا بچاؤ نہیں کرسکتا تھا۔

اس راہداری کے اختتام پر وہ بائیں طرف گھومے تو وہاں چھت میں لگا ہوا ایک بلب روشن تھا۔ اس شخص نے روشنی میں آنے کے بعد مڑ کر خوفزدہ نگاہوں سے ایک بار ڈینی کا جائزہ لیا اور پھر جلدی سے سر گھمالیا۔ اسے سیاہ پوش ڈینی کی صورت میں اپنے سر پر موت مسلط نظر آرہی تھی۔

آخر وہ ایک بند دروازے کے سامنے رک گیا۔ ڈینی نے بڑھ کر احتیاط سے ہینڈل پر تھوڑی سی قوت صرف کی۔ لیکن وہ دروازہ بھی مقفل ثابت ہوا۔

"دستک دے کر اسے بتاؤ کہ سیٹھ صاحب اچانک واپس آگئے ہیں اور اس سے ملنا چاہتے ہیں۔" ڈینی نے اس کے کان میں سرگوشی کی اور وہ چھری کے نیچے آئے ہوئے کسی بکرے کی طرح بے بسی سے سر ہلا کر رہ گیا۔

دستک کے جواب میں اندر سے اُبھرنے والی جھلائی ہوئی خوابناک نسوانی آواز ڈینی کے کانوں کو کچھ شناسا محسوس ہوئی۔ ملازم سے اس لڑکی کی اصلیت معلوم ہوجانے کے بعد وہ خود سوچ رہا تھا کہ کہیں یہ وہی لڑکی نہ ہو جو باس کی غیر موجودگی میں ٹرانسیمٹر پر اس کے پیغامات وصول کرتی تھی۔

"دروازہ کھولو مس صاحبہ! میں فقیر محمد ہوں۔" بوڑھے نے نسوانی آواز کے استفسار پر کہا۔ "سیٹھ صاحب واپس لوٹ آئے ہیں اور تمہیں بلا رہے ہیں۔"

بوڑھے کے الفاظ کارگر ثابت ہوئے اور قفل میں چابی گھومنے کی آواز کے بعد خوابگاہ کا دروازہ کھل گیا۔

روشن راہداری میں ریوالور سے مسلح ایک سیاہ پوش کو دیکھتے ہی دروازے میں نمودار ہونے والی خوبصورت عورت کی آنکھیں دہشت سے پھیل گئیں اور چیخنے کے لیے اس کے لب ہلے ہی تھے کہ ڈینی ریوالور کی بھیانک نال کو جنبش دے کر غرایا۔ "خاموش، ذرا بھی آواز نکالی تو یہیں ڈھیر کر دوں گا۔"

عورت نے اپنے ہونٹ یوں سختی سے بھینچ لیے جیسے اسے اپنے اعصاب پر قابو نہ رہا ہو اور وہ اپنے کسی غیر ارادی ردعمل سے خوفزدہ ہو۔

ڈینی نے شب خوابی کے لبادے میں ملبوس اس کے سراپا کو دزدیدہ نگاہوں سے دیکھا پھر اسے اندر دھکیل کر بوڑھے سمیت خود بھی اس کی خوابگاہ میں داخل ہوگیا۔ اندر پہنچتے ہی اس

نے بوڑھے کی کنپٹی پر ایک جچاتلا ہاتھ رسید کیا اور وہ اپنے حلق سے ہچکی کی صورت میں آواز خارج کرتا ہوا فرش پر بچھے ہوئے قالین پر ڈھیر ہو گیا۔

"تت... تم نے اسے... اسے کیوں مار ڈالا؟" عورت پھٹی پھٹی نگاہوں سے ایک ڈھیر کی صورت میں پڑے ہوئے بوڑھے کے بدن کو دیکھتے ہوئے خوفزدہ آواز میں ہکلائی۔

"اپنی اور تمہاری ملاقات کا کوئی چشم دید گواہ نہیں چھوڑنا چاہتا۔" ڈینی کا لہجہ بدستور سخت اور کھردرا رہا۔ "بھکوگی تو تمہارا بھی یہی حشر کرتے ہوئے مجھے ذرا بھی افسوس نہیں ہوگا۔ اس وقت تم بالکل میرے رحم و کرم پر ہو۔"

"تم چاہتے کیا ہو؟" اس کے بدن پر طاری ہونے والی کپکپی ڈینی کی نگاہوں سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔

"گفتگو، نقدی اور زیورات کی نشاندہی پھر عیش۔" ڈینی نے بے پروائی سے اس کے شکن آلود بستر پر بیٹھتے ہوئے کہا پھر اس خوابگاہ میں نگاہیں دوڑاتے ہوئے بولا۔ "پہلے یہ تو بتاؤ کہ تمہارے سیٹھ نے اپنی ایک خوبصورت ملازمہ کو یہ پُرتعیش کمرہ کیوں دیا ہوا ہے؟"

اس نے اپنے خشک ہوتے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیری پھر کمزور آواز میں بولی۔ "میں سیٹھ صاحب کی سیکرٹری ہوں، کوٹھی میں تقریباً سارے ہی کمرے خالی پڑے رہتے ہیں۔ اس لیے میری پسند کا ایک کمرہ مجھے مل گیا۔"

"اور تمہارا کام کیا ہے یہاں؟" ڈینی تنظیم سے متعلق اپنی زبان سے کچھ کہے بغیر اس عورت کی زبان کھلوانا چاہتا تھا کیونکہ وہ باس کو ہوشیار ہونے کا موقع دینے کے بجائے اپنی آمد کو چوری کی واردات کا رنگ دینا چاہتا تھا۔

"سیٹھ صاحب کی کاروباری مصروفیات بہت وسیع ہیں۔" وہ سہمی ہوئی آواز میں بتانے لگی۔ "میں دن رات گھر پر رہتی ہوں اور ان کی غیر موجودگی میں آنے والے پیغامات نوٹ کر کے ان تک پہنچاتی ہوں۔" پھر ایک لمحے کے لیے رُک کر تھوک نگلتے ہوئے بولی۔ "گھر میں شاید تمہیں کہیں بھی رقم یا زیورات نہ مل سکیں کیونکہ آج تک میں نے پورے گھر میں کہیں بھی تجوری نہیں دیکھی جو گھر میں رکھی جانے والی ایسی اشیا کے لیے ضروری ہوتی ہے۔"

ڈینی اس سے گھما پھرا کر کئی منٹ تک سوالات کرتا رہا۔ لیکن اس کی زبان سے کوئی کارآمد بات نہ اُگلوا سکا۔ براہِ راست پوچھ گچھ کرتا تو وہ اعترافات کے نتیجے میں بہت کچھ بتانے پر مجبور ہو جاتی لیکن اس طرح باس چوکنا ہو جاتا۔ اس کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ عزالہ کے کا [illegible] ڈونیئر میں ڈینی کی فیکٹری کا تینیتی

اشتہار دیکھ کر ان لوگوں کے بارے میں چھان بین جو اس فنکشن میں مدعو یا موجود تھے۔

ڈینی شاید اس عورت کے سراپا کو بھی نظ لیکن اس کے ذہن کی کسی تہہ میں یہ بات جم گئی تھ ہونے کے ساتھ ہی باس کی منظورِ نظر بھی تھی اور اس اپنے باس کی بالواسطہ تذلیل کر سکتا تھا۔ باس کے ہاتھ اَنا ہمیشہ ہی ٹھوکرے کھاتی رہی تھی مگر اس وقت اپنی ز کا ایک ذریعہ سامنے تھا جس سے استفادہ اپنی ذمے داری تصور کر اس نے عورت کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جو اس بوڑھے ملازم کے ساتھ کر چکا تھا اور اپنی تلاشی کی مہم کمرے سے کر دیا۔

اس پورے کمرے کی تلاشی میں صرف چند سو ایک قیمتی گھڑی ڈینی کے ہاتھ لگی۔ وہ تلاشی کے دو آنے والی کوئی بھی قیمتی چیز چھوڑنا نہیں چاہتا تھا تا واردات کے بارے میں سکندر علی کا ذہن چوری کے کسی طرف مبذول نہ ہو سکے۔

الماریوں اور ڈریسنگ ٹیبل کے بعد ڈینی نے آ کے سرہانے رکھی ہوئی سائڈ ٹیبل کی اوپری دراز کھولی ا اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا کیونکہ وہاں بالکل ویسا ٹرانسمیٹر موجود تھا، جو ان دنوں ڈینی کے زیرِ استعمال تھ وہ محض آواز کی مشابہت کی بنا پر سکندر علی پر اپنا باس ہونے کا شبہ کرتا رہا تھا لیکن ٹرانسمیٹر اس شبہے کی صداقت تھا جو ڈینی کے سامنے آیا تھا۔

سکندر علی کی غیر موجودگی میں وہ ٹرانسمیٹر اس عورت میں موجود تھا جس کا مطلب تھا کہ اس عورت کی آوا کی جھلک کے بارے میں ڈینی کا شبہ غلط نہیں تھا۔ با موجودگی میں یقینی طور پر وہی سارے پیغامات وصول کر اسے اپنی حماقت پر افسوس ہونے لگا اگر اس نکتے پہ کر لیا ہوتا تو یہ بات سمجھ میں آجاتی کہ سکندر علی کی غیر م ٹرانسمیٹر عورت کی تحویل میں ہونا چاہیے۔ اگر اسے پ سے قبل ڈینی خوابگاہ کی تلاشی لے کر وہ ٹرانسمیٹر برآمد کر کے حوالے سے عورت سے خاصی معلومات حاصل کی جا اس نے ٹرانسمیٹر چھیڑے بغیر سائڈ ٹیبل کی دراز بند کر دی

پھر وہ ان دونوں کو اسی کمرے میں مقفل کر کے کے ایک ایک کمرے میں مارا مارا پھرتا رہا لیکن کہیں کارآمد چیز نہ مل سکی۔ کھڑکی کے شیشوں کے پار سے روشنی کے متوجہ ہو جانے کے اندیشے کے باعث وہ ہر جگہ

دود روشنی سے کام لیتا رہا۔ اس دوران اسے جو بھی چھوٹی قیمتی شے نظر آئی، اسے وہ اپنی جیبوں میں منتقل کرنا نہیں لا تھا۔

نچلی منزل کے ایک کمرے کے مقفل دروازے پر اپنے اروں کے استعمال کے بعد وہ اندر داخل ہوا تو اس پُرتعیش گاہ کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ جہاں وی سی آر، رنگین ٹیلی ویژن اور نڈیشنر کے علاوہ باتھ روم سے ملحق باکس روم میں کئی جدید ورزشی ین بھی موجود تھیں جن کا مطلب تھا کہ اس کمرے کو استعمال کرنے اپنے اصولوں کا بہت پابند اور نپی تلی زندگی گزارنے کا قائل تھا۔ دیگر خوابگاہوں اور کمروں کے مقابلے میں اس خوابگاہ کے زمات سے صاف ظاہر تھا کہ وہ سکندر علی کے زیرِ استعمال رہتی ی۔ اس کمرے کی تلاشی کے دوران ڈینی ہر چیز کو واپس اس کی جگہ نے کے بارے میں بہت محتاط رہا۔ اس کا خیال تھا کہ واپسی پر دروازہ بھی مقفل کر دے گا تاکہ راجہ سکندر علی اپنے کمرے کو م کی چھیڑ چھاڑ سے محفوظ پاکر بدستور خوش فہمی میں مبتلا رہے ر ڈینی بے خبری میں حسبِ مرضی اس پر اپنا وار آزما سکے۔

ایک دراز میں ڈینی کو جیبی ڈائری ملی جس میں جابجا بے تکے ہمل فقرے لکھے ہوئے تھے۔ ان فقروں میں کچھ نام بھی تھے ن ان خفیہ پیغامات کے مفہوم کے بغیر نام بے سود تھے۔ ڈینی کو تو معلوم تھا کہ دنیا کے مختلف ممالک میں خفیہ سرکاری ایجنسیاں ر بعض منظم جرائم پیشہ پیغام رسانی کے لیے عجیب و غریب مہمل ربہم طریقے اور فقرے اختیار کرتے ہیں لیکن وہ کسی بھی ریٹوگرافی سے باخبر نہیں تھا پھر بھی اس نے فرصت کے وقات میں مغز زنی کے خیال سے اس ڈائری میں سے چند سطریں لس سادہ کاغذ پر نقل کر لیں۔

اس ڈائری کی ورق گردانی کرتے ہوئے ڈینی نے آخری صفحات پر ناموں کے ساتھ فون نمبر دیکھے جو حروفِ تہجی کے عتبار سے مقررہ صفحات پر درج تھے لیکن اسے یہ دیکھ کر شدید یرت ہوئی کہ اس کا نام کہیں موجود نہیں تھا لیکن حرف ڈی کے تحت اس کا نمبر درج تھا۔ نمبر سے پہلے ڈیش لگا کر کسی حوالے کے یے ایک نمبر لکھا ہوا تھا پھر اسی صفحے پر جہانگیر کا نمبر بھی نظر یا جس سے پہلے دو کا ہندسہ درج تھا۔

فوری طور پر ڈینی کے ذہن میں ہلچل سی پیدا ہو گئی۔ وہ ڈی ون تھا اس لیے ڈی والے صفحے پر نام کے بجائے ون لکھ کر اس کا نمبر درج کیا گیا تھا، جہانگیر ڈی ٹو تھا۔ لہٰذا اس کے نمبر کی نشاندہی دو کے ہندسے سے کی گئی تھی۔ سکندر علی خود ی فور تھا اس کا مطلب تھا کہ یہ سب اشارے بلا سبب نہیں تھے بلکہ تنظیم میں ہر ایک کا درجہ اور مرتبہ ظاہر کرتے تھے۔ حروفِ تہجی کا ہر پہلا حرف بعد والے سے برتری رکھتا تھا، اسی طرح پہلا نمبر دوسرے نمبروں پر برتر تھا۔

ڈینی اس نکتے پر جتنا غور کرتا رہا، اس کا خیال پختہ ہوتا چلا گیا۔ وہ ڈی ون ہونے کی بنا پر ڈی ٹو سے برتر تھا مگر بی فور کا ماتحت لیکن بی فور یقینی طور پر کسی بی ون، بی ٹو یا بی تھری کا ماتحت ہوگا اور شاید بی اور ڈی کے درمیان کچھ ایسے لوگ بھی ہوں جن کی شناخت کے لیے سی کا حرف مقرر ہوا۔ اسے گلشنِ اقبال والی عورت یاد آئی، سُرخ کرولا والا وہ خطرناک صورت مرد یاد آیا جس نے اسے گلشنِ اقبال لے جا کر اس کے انگوٹھے کا نشان حاصل کیا تھا۔

ایک نئے جوش کے تحت وہ فون نمبر والے صفحات کا دوبارہ جائزہ لینے لگا لیکن اے سے زیڈ تک اسے صرف چار ایسے نمبر مل سکے جو ناموں کے بجائے ہندسوں کے حوالے سے درج تھے۔ ان چار کے علاوہ دو نمبر اس کے اور جہانگیر کے فون کے تھے۔

اس کے لیے ایک اور نکتہ بھی قابلِ غور تھا کہ ڈائری میں نادر اور طارق کے فون نمبر نہیں تھے جس کا مطلب یہ تھا کہ بغیر کوڈ والے افراد گروہ کے عام ارکان تصور کیے جاتے تھے جن کا بس اپنے اوپر والے سے واسطہ ہوتا تھا لیکن تنظیم میں ان کا کوئی باقاعدہ مقام نہیں تھا۔

ڈینی نے وہ چاروں نمبر درج کر لیے اور ڈائری واپس رکھ دی۔ اس وقت پہلی بار اسے احساس ہوا کہ وہ تن تنہا ایک بڑی تنظیم کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ تنظیم کے ایک فرد کے خلاف بغاوت ہر گروہ میں عموماً اسی رنگ میں دیکھی جاتی تھی اور سرکشی اختیار کرنے والوں کے ساتھ بے رحمانہ سلوک کیا جاتا تھا۔ پھر وہ لوگ اس قدر منظم تھے کہ باہمی رابطوں کے لیے فرسودہ طریقوں کے بجائے جدید ذرائع استعمال کر رہے تھے۔ تحفظ اور راز داری کے معاملے میں اس قدر حساس تھے کہ ڈینی کو ضروری کاغذات رکھنے کے لیے ایک ایسا بریف کیس فراہم کیا گیا تھا، جسے صرف وہی اپنے انگوٹھے کے نشان کے سہارے کھول سکتا تھا، کوئی دوسرا زبردستی اس بریف کیس کو کھولنے کی کوشش کرتا تو خوفناک بارودی دھماکے سے کاغذات کے ساتھ خود اس کے بھی چیتھڑے اُڑ جاتے اور کاغذات کا راز فاش نہ ہونے پاتا۔

یہ خیال آتے ہی ڈینی کو خوف محسوس ہونے لگا کہ کہیں سکندر علی کی خوابگاہ میں بھی خفیہ طور پر کوئی ایسا تباہ کن حفاظتی نظام نصب نہ ہو جسے لاعلمی میں چھیڑتے ہی وہ اس کا نشانہ بن جائے۔ فی الوقت اس کے لیے یہی کامیابی کافی تھی کہ اس نے سکندر علی

کے بارے میں اپنے شبہات کو یقین میں بدل لیا تھا اور اسی کے ساتھ تنظیم سے وابستہ چار افراد کے فون نمبر حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔

اگر ڈائری میں درج نمبروں کے بارے میں ڈینی کے اندازے درست تھے تو بی ون، بی ٹو اور سی ون کے ساتھ ہی اسے اے ٹو کا نمبر بھی معلوم ہوچکا تھا اور اے ٹو کو صرف ایک شخص یعنی اے ون کو جوابدہ ہونا چاہیے تھا جو تنظیم کا اصل سربراہ ہوتا۔ اس طرح ڈینی کے لیے صرف دو عہدیدار باقی رہ گئے تھے۔ جن کے سامنے آجانے سے پورا گروہ اس کی نظروں میں آسکتا تھا ان میں ایک اے ون تھا اور دوسرا بی تھری۔

سکندر علی کی خوابگاہ سے باہر نکل کر دروازہ مقفل کرنے میں اسے کئی منٹ صرف ہوگئے پھر وہ ان ہی راستوں سے عمارت سے نکلتا چلا گیا جن سے وہاں تک پہنچا تھا۔ کوڑے دان کے قریب کھلنے والا عقبی دروازہ اس نے مقفل نہیں کیا تھا۔ کیونکہ دروازے کے علاوہ وہ اندر بھی اپنے داخلے کے دو جیتے جاگتے گواہ چھوڑ آیا تھا جو اپنے ساتھ پیش آنے والے سارے واقعات اپنے مالک کے گوش گزار کر دیتے۔

پھولی ہوئی جیبوں کے ساتھ وہ درخت کی جھکی ہوئی شاخوں کے ذریعے باہر کودا تو اس کی رسٹ واچ صبح کے سوا تین بجا رہی تھی۔ اس نے وہیں ٹھہر کر اپنے چہرے سے نائیلون کا سیاہ تھیلی نما نقاب اتارا اور چہرے سے پسینہ صاف کرتا ہوا اپنی کار کی طرف چل دیا جو بدستور اپنی جگہ پر موجود تھی۔

کار اسٹارٹ کر کے وہ روشنیاں جلائے بغیر وہاں سے روانہ ہوا اور دو موڑ گھومنے کے بعد ہیڈ لیمپس آن کر دیے۔

ڈینی کی سرگرمیاں تو ہمیشہ سے مشکوک رہی تھیں لیکن اس کے گھریلو ملازمین کے لیے اس کے سارے معمولات ٹھیک ٹھاک ہی تھے۔ کیونکہ گھر میں اس نے اپنی ذات کو ہر شبہے سے بالا رکھا تھا۔ اس کے ملازمین معقول معاوضہ اور مالک کے بہتر سلوک کے باعث اس کے وفادار تھے لیکن گھر واپس لوٹتے ہوئے ڈینی سوچ رہا تھا کہ وہ پہلی بار پوری رات باہر گزار کر گھر لوٹ رہا تھا کہیں اس کے ملازمین شبہات میں مبتلا نہ ہوجائیں۔

بی فور سے ٹرانسیٹر پر گفتگو کے بعد ہی ڈینی نے ارادہ کر لیا تھا کہ وہ رات کے ڈیڑھ یا دو بجے سکندر علی کے مکان میں گھسے گا لیکن اتنی رات گئے گھر سے روانہ ہونے سے بجائے وہ دس بجے ہی گھر سے نکل گیا تھا۔ یہ غنیمت تھا کہ چلتے ہوئے اس نے بوڑھی خادمہ سے کسی پارٹی میں شرکت کا ذکر کر دیا تھا مگر اس وقت ڈینی کی حالت پارٹی سے واپسی کی نشاندہی نہیں کر رہی تھی۔

اس نے گلو وکمپارٹمنٹ میں کاغذات کے نیچے
اسکاچ کی نصف بوتل نکالی اور کار ڈرائیو کرتے ہوئے
لاوے کو آرام آرام سے اپنے معدے میں انڈیلنے لگا تا
کے علاوہ اگر بوڑھی خادمہ اس کی واپسی کے انتظار میں
ہو تو دور ہی سے شراب کی بدبو کے بھبکے سونگھ کر
بارے میں مطمئن ہوجائے۔

گیٹ پر ڈینی کی گاڑی کے ہیڈ لیمپس کی تیز روشنی
ہی اس کے چوکیدار نے مانوس ہارن کا انتظار کیے بغیر
کھول دیا اور ڈینی دانستہ اونچی آواز میں گنگناتے ہوئے
اندر لیتا چلا گیا۔ اس کے کار سے اترنے تک بوڑھی خاد
ساتھ خانساماں بھی کہیں سے برآمدے میں آگیا تھا۔ ڈ
جھومتے ہوئے وہ تین سیڑھیاں عبور کیں اور لڑکھڑائی
میں بولا "ارے... تم دونوں جاگ رہے ہو ابھی تک
خاموش اور ترحم آمیز نگاہوں سے اپنے شرابی مالک کو
اور وہ سیدھا اپنی خوابگاہ میں داخل ہو کر محبوس ہوگیا۔

لباس تبدیل کرنے سے پہلے وہ سکندر علی کے م
لائی ہوئی قیمتی اشیا کا پیکٹ بنانا چاہتا تھا تاکہ دن میں
گزرتے ہوئے انھیں کسی گٹر یا نالے میں پھینک د

اصولاً مال کی فروخت میں اضافہ ہونے کے سا
کو خوش ہونا چاہیے تھا اور وہ پہلے دو چار روز تک
کو محسوس بھی کرتا رہا تھا۔ اس کی ایماندارانہ رائے تھی کہ
کرتے ہوئے وہ بیس پچیس پڑیاں روز بھی فروخت
اپنی دانست میں اسے بڑی کامیابی تصور کرتا کیونکہ اس
ڈھائی تین ہزار روپے ماہانہ کی آمدنی ہونے لگتی جو اس
خواب دخیال سے بھی زیادہ تھی لیکن جبار نے اس کے ساتھ ملا
کی کایا پلٹ کر رکھ دی تھی۔ دوسرے ہی دن اس نے
اگلے روز کے لیے پچاس پڑیوں کی فرمائش کی تھی۔ وہ
تو کچھ نہ کہہ سکا لیکن اس کے دل میں ایک بے نام سی خل
ہوگئی تھی۔

جبار یونیورسٹی میں ایم اے کے آخری سال میں ز
اور شہر ہی میں رہتا تھا لیکن شام تک اپنا بیشتر وقت
حدود میں ہی گزارتا تھا۔ دوسرے من چلوں کی طرح ا
دوستوں کا حلقہ خاصا وسیع تھا جن میں سے بیشتر ہاسٹلز
تھے۔ اپنی ان مصروفیات کی وجہ سے تعلیمی معاملات میں
سے ذرا ہی بہتر تھا اور اساتذہ اس سے نالاں رہتے
میں موجود ہوتے ہوئے بیشتر کلاسیں گول کر جاتا تھا

جمع کراتا اور وہ بھی عجلت میں کسی اور سے نقل
ما تا خیر سے جمع کراتا اور وہ بھی عجلت میں کسی اور سے نقل
ہوئے ہوتے تھے۔ ابتدا میں اساتذہ نے اسے راہ راست پر
نے کی خاصی کوششیں کیں لیکن اس پتھر میں جونک نہ لگتی
کر انھوں نے جبار کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ ایسا معلوم
ہوتا تھا کہ وہ تعلیم کے حصول کے بجائے محض وقت گزاری
لیے یونیورسٹی آتا ہے اور ساری زندگی طالبعلم ہی بنے رہنے
تلا ہوا ہے۔

اس کی مصروفیات بھی ڈھکی چھپی نہیں تھیں تھوڑے
تھوڑے وقفوں سے نسبتاً محفوظ گوشوں میں چھپ کر اپنے دوستوں
ساتھ چرس نوشی کرتا پھر اس کی ٹولی کسی اسامی کے انتظار میں
بن میں جم جاتی، وہاں کے ہنگامے سے اکتا جاتے تو وہ لوگ
ور گیمز میں کود پڑتے۔ جبار مزاج کے اعتبار سے ذرا رنگیلا
ہوا تھا۔ لہٰذا دوستوں کی آنکھ بچا کر لائبریری میں جا گھستا
وہاں کسی گوشے میں کسی لڑکی کو چھیڑتا ستاتا یا پھر ڈھٹائی
ساتھ کسی کو سیڑھیوں پر ہی گھیر لیتا۔ لڑکیوں کو اپنی افسانوی
گو میں الجھانے کے لیے عموماً وہ نوٹس یا اسائنمنٹس سے بات
وع کرتا اور نہایت مہارت کے ساتھ زندگی کی بے ثباتیوں،
نات میں کھلے ... اور اپنی اداس اور تنہا ذات کا
چھیڑ کر قصیدہ گوئی پر اتر آتا۔

اس کی شناسا تمام لڑکیاں اس کی اس بے ضرر عادت سے
تف تھیں اور آپس میں اسے کمبل کے نام سے یاد کرتی تھیں۔
نظر آجاتا تو دور ہی سے کترا کر نکل جانے کی کوشش کرتیں اگر
منا ہو جاتا تو بعض بہانہ کر کے جان چھڑا لیتیں۔ جو ذرا نرم دل
یں وہ اس کی مسکین صورت اور عاجزانہ لہجے پر ترس کھا کر
سے کچھ وقت دے دیتی تھیں۔

دوپہر کے کھانے پر وہ ہاسٹل میں کسی نہ کسی کا بن بلایا
مان بن جاتا پھر وہیں کسی کمرے میں رمی کی بازی جم جاتی، فلش
ی روز کا معمول تھی اور یوں وہ عموماً اندھیرا پھیلنے کے بعد ہی
واپس لوٹتا تھا۔

ان حالات میں اگر اس کی شناسائی کا حلقہ وسیع تھا، تو
یرت کی بات نہیں تھی لیکن حامد کو تشویش اس بات کی تھی کہ
ہیں وہ اپنے تین روپے پڑیا کے لالچ میں اندھا دھند ایسے خریدار
نہ بنالے جو اس کے ساتھ حامد کی بھی رسوائی کا سبب بن جائیں۔

اس شام حامد پچاس پڑیوں کے مطالبے کے ساتھ موتی دادا
سے ملا تو وہ چونک پڑا "کیا بات ہے میاں؟ ایک دم ہی تیزی
پر آگئے ہو۔ ذرا دیکھ بھال کر کام کرو، ایسا نہ ہو کہ زیادہ آمدنی
کے لالچ میں کسی اندھے کنویں میں جا گرو۔"

وہ ہنس پڑا "دادا! ایسی بات نہیں ہے، بس لڑکوں کو چرس ملنا بند ہوگئی ہے اس لیے ادھر زور ہوگیا ہے۔"

حامد کے جواب نے موتی دادا کو مطمئن کر دیا کیونکہ وہ خود شہر میں یہی رجحان دیکھ رہا تھا مگر اپنے جواب سے حامد خود زیادہ مطمئن نہیں تھا۔ یونیورسٹی میں پہلے دن پانچ پڑیوں کی فروخت سے ابتدا کرنے کے بعد وہ بتدریج دس پندرہ پڑیوں کے اوسط پر آیا تھا۔ جس کے مقابلے میں پچاس کی تعداد چونکانے والی تھی۔

"بس ایک بات کا خیال رکھنا" موتی دادا نے رازدارانہ لہجے میں اسے سمجھایا "جن لوگوں کو مال دیتے ہو انھیں کبھی مایوس نہ کرنا۔ ورنہ ایک تماشا کھڑا ہوجائے گا۔"

"میں سمجھا نہیں دادا!" حامد نے حیرت سے کہا "پڑیاں جیسی لے جاتا ہوں، ویسی ہی آگے بڑھا دیتا ہوں، نہ ملاوٹ کرتا ہوں، نہ دو کی تین بناتا ہوں، پھر بھلا خریداروں کو کس بات سے مایوسی ہوگی؟"

"بہت بھولے ہو میاں!" موتی دادا کے لہجے میں ہلکا سا طنز جھلک رہا تھا "ہیروئن بیچتے ہو اور تماشے کا مطلب نہیں جانتے۔ جو اس کے عادی ہوجاتے ہیں، انھیں وقت پر نشہ ملنا چاہیے۔ ورنہ حالت خراب ہونے لگتی ہے۔ دو چار پڑیاں فالتو ہی رکھا کرو، ایسا نہ ہو کہ کسی دن کوئی محروم رہ جائے اور پھر ادھم شروع کر دے۔"

حامد کو جھرجھری سی آگئی۔ اسے اپنے عسرت زدہ گھرانے کی مالی مجبوریوں نے ہیروئن فروخت کرنے کی راہ پر تو ڈال دیا تھا لیکن اس کے اندر کا انسان ابھی زندہ تھا۔ اسے ایک لمحے کے لیے اپنی ذات سے کراہت سی محسوس ہونے لگی۔ اگر ہیروئن کا نشہ ایسا ہی موذی تھا کہ انسان کو اپنا غلام بنا لیتا تھا، تو وہ اس زہر کو اپنے ساتھیوں میں کیوں پھیلا رہا تھا؟ محض چند سکوں کی خاطر اپنی مادر علمی کی آغوش میں تربیت لینے والے ہونہار ذہنوں کو کیوں برباد کر رہا تھا۔

لیکن اس کے دماغ نے ضمیر کے اس احتجاج کو رد کر دیا جو ہیروئن استعمال کر رہے تھے، وہ حامد کے ملوث ہونے سے پہلے بھی نشہ کرتے تھے۔ یونیورسٹی کی صاف ستھری فضا میں چرس کے دھوئیں کی کثافت اور بدبو وہ بارہا خود محسوس کر چکا تھا۔ اگر وہ ملوث نہ ہوتا تو چرس کے عادی اپنے نشے کی نایابی سے بوکھلا کر خود ہی ان ذرائع سے رجوع کر لیتے جو ہیروئن سمیت انھیں ہر نشہ فراہم کر سکتے تھے اور پھر اس کے اپنے ماحول اور معاشرے نے اسے کیا دیا تھا جو وہ اس کی فکر میں جائز اور ناجائز کے چکر میں پڑتا۔ اس نے تو یونیورسٹی میں بھی یہی دیکھا تھا کہ اپنے لباس اور

وضع قطع سے غریب نظر آنے والے طلبا آئے دن آسودہ حالوں کی تحقیر آمیز نگاہوں کا نشانہ بنتے رہتے ہیں، انھیں کوئی گروپ خود میں ضم کرنے کو تیار نہیں ہوتا تھا۔ وہ تنہا تنہا سے یونیورسٹی آتے اور کتابوں سے سر کھپا کر اپنے گھر لوٹ جاتے۔

صرف اس کے تائب ہونے سے کچھ بھی نہ ہوتا۔ سب کام اپنی ڈگر پر ہوتے رہتے۔ چرسی چرس کے دم لگاتے رہتے اور ہیروئن کے عاشق اسے اپنی جان کا روگ بنائے رہتے۔ بس اسی قدر ہوتا کہ اسے اپنے خوابوں کی تکمیل کا جو موقع ملا تھا، وہ ضائع ہو جاتا اور پھر شاید وہ بھی اپنے باپ کی طرح اپنی چار بہنوں کے لیے کچھ کیے بغیر محض سوچ سوچ کر قبل از وقت بوڑھا ہو جاتا۔ یہ ہیروئن ہی کی مہربانی تھی کہ چند ہی روز میں اس کے گھر میں نئے کپڑے کی بھینی بھینی، سوندھی سوندھی مہک پھیلنے لگی تھی جس سے وہ سب برسوں سے ترسے ہوئے تھے۔ محدود آمدنی میں دو وقت پیٹ بھرنا ہی مشکل تھا تو نئے کپڑے کہاں سے بنتے۔ بس ہر ایک کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ جو جوڑے برسوں سے زیرِ استعمال چلے آ رہے ہیں کہیں سے اُدھڑنے نہ پائیں بلکہ سارا مسئلہ اُدھڑنے ہی کا رہتا تھا کیونکہ خلائی دور کی ترقیوں میں سے مارٹن کوارٹرز کے اس گھرانے کے حصے میں بس نائیلون اور ٹیری ٹرون کے ملبوسات ہی آئے تھے۔ جن کی سلائیاں دُھل دُھل کر جواب دے جاتی تھیں مگر تانا بانا گھسنے کے باوجود اپنی جگہ برقرار رہتا تھا۔

اس نے اپنے ضمیر کی احمقانہ ملامت کو ذہن سے جھٹک کر موتی دادا کو پچھلے مال کے پیسے ادا کیے، نیا مال وصول کیا اور گھر لوٹ آیا۔

اگلی صبح خلافِ معمول جبار اسٹاپ پر ہی اس کا منتظر تھا۔ وہ پڑھائی کے معاملات میں جتنا پیچھے تھا، یونیورسٹی پہنچنے کے معاملے میں اسی قدر آگے تھا۔ بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ محض شب بسری کے لیے گھر جاتا ہو۔ اس کا وہاں دل ہی نہیں لگتا تھا، کلاسوں کے اوقات سے قطع نظر وہ اپنے علاقے سے یونیورسٹی کے لیے چلنے والی پہلی بس سے وہاں پہنچ جاتا تھا۔ اس نے بس سے اترتے ہی حامد کو جا لیا۔

وہ دونوں ٹہلتے ہوئے ایڈمنسٹریشن بلاک کے عقبی حصے کی طرف بڑھ گئے پھر حامد نے اپنے ریکسین کے بیگ کی زپ کھول کر گاؤن اور نوٹس کی موٹی فائل کے درمیان رکھا ہوا پیکٹ نکال کر اسے تھما دیا۔

"اچھا خدا حافظ۔" جبار پیکٹ لیتے ہی بولا۔ "ایک بجے آڈیٹوریم کے دروازے پر ملوں گا۔"

"پیسے؟" حامد نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ایک بجے ساتھ لیتا آؤں گا۔" وہ جاتے جاتے مُڑ کر ا
حامد کو ہکا بکا چھوڑ کر آگے بڑھتا چلا گیا۔

حامد کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے جسم سے
خون نچوڑ لیا ہو۔ کئی سیکنڈ تک اس کا دماغ ماؤف رہا جس
بس سائیں سائیں کی آواز گونجتی رہی پھر بمشکل اس نے خو
پایا اور شکست خوردہ انداز میں فیکلٹی کی طرف چل دیا۔

اس سے پہلے جبار ہمیشہ اسے نقد رقم دے کر پ
پُڑیاں لیتا رہا تھا۔ آج پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ وہ بغیر قیمت
مال لے گیا تھا۔ حامد کو اگر ذرا بھی شبہ ہو جاتا کہ جبار اس
ایسی حرکت کرے گا تو وہ رقم لیے بغیر اپنا بیگ ہی نہ کھو

وہ اس کام میں نو آموز تھا۔ جبار کے جاتے ہی ا
دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ اس کو شبہ ہو رہا تھا کہ جبار نے
مہارت سے اسے بے وقوف بنایا تھا۔ پہلے نقد ادائیگی پ
خریدتا رہا پھر دو روپے فی پڑیا اضافی آمدنی کا لالچ دے
اس کا اعتماد حاصل کر لیا۔ اس واقعہ سے پہلے بھی جبار اسے
روپے فی پُڑیا کے حساب سے نقد پیسے دیتا رہا تھا پھر اس
سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ایک دم پچاس پُڑیوں کا مطا
جس پر حامد کے ساتھ ہی موتی دادا کو بھی حیرت ہوئی تم
وہ پیسے دیے بغیر پچاس پُڑیاں لے بھاگا تھا۔ جن کی مالی
کے حساب سے ساڑھے بارہ سو ہوتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ ج
چرکا دے گیا تھا۔ معاملہ چونکہ ایک نشے کی فروخت سے متعل
لہٰذا اسے پورا اعتماد رہا ہو گا کہ حامد زِک اٹھانے کے باو
کے سامنے زبان کھولنے کی جرأت نہ کر سکے گا۔

پہلے پیریڈ میں حامد کلاس روم میں موجود تھا لیکن
معمول نوٹ لینے کے بجائے خالی الذہنی کے عالم میں خلا م
جا رہا تھا۔ لیکچر اس کی سماعت سے بالا ہی بالا گزر رہا تھا۔ و
یہ سوچ رہا تھا کہ اتنی بڑی رقم کا نقصان کہاں سے پورا کر
بلاشبہ اس نے پچھلے دنوں اس سے کہیں زیادہ رقم کمائی
مستقل آمدنی کی امید پر ساری رقم گھر کی مدتوں سے رُکی
ضروریات پر خرچ کر چکا تھا۔ نہ جانے اس اطلاع پر موتی
کے ساتھ کیا سلوک کرتا، اس کی یہی مہربانی تھی کہ پچھلے پی
نیا مال اُدھار دے دیتا تھا۔ وہ یہی سمجھتا کہ حامد مال بیچ
کھا گیا ہے۔ پھر جس طرح حامد لُٹنے کے باوجود خاموش ر
مجبور تھا، اسی طرح موتی دادا بھی اسے خائن سمجھنے کے باوج
سے رجوع نہ کرتا بلکہ غنڈہ گردی اور تشدد کے ذریعے ا
بولنے پر مجبور کرتا۔

ذرا سی بے پروائی سے صورتِ حال یک بیک اتنی

تھی کہ خوف کے باعث حامد کے پیٹ میں بل اٹھنے لگے اور
ڈھ کی ہڈی میں چیونٹیاں سی رینگتی محسوس ہونے لگیں۔ کلاس
اختتام پر اس کی حالت اس قدر ابتر تھی کہ کئی ہم جماعتوں نے
ک کر اس کی مزاج پرسی کی اور وہ دوسری کلاس اٹینڈ کرنے
بجائے بھیڑ سے الگ ہو کر ایک گوشے میں جا بیٹھا۔

اس کے ذہن میں خیال اُبھرا کہ وہ ذہنی طور پر اس وقت
ھنے پڑھانے کے لیے ناکارہ ہو چکا تھا۔ لہٰذا وقت برباد کرنے
بجائے کیوں نہ فوری طور پر شہر واپس لوٹ جائے اور موتی دلوا
بلا کم و کاست پوری کہانی سنا ڈالے تاکہ خدشوں میں گرفتار ہو کر
خون خشک کرنے کے بجائے وہ فوری طور پر حقائق کا سامنا
کے لیکن پھر ایک موہوم سی اُمید اُبھری کہ لُٹنے کا یقین ہونے
، باوجود کم از کم ایک بجے تک انتظار کرنا چاہیے۔ شاید جبار
، دل میں نیکی آ جائے اور وہ کسی عُذر کے ساتھ تھوڑے
ت پیسے اس کے حوالے کر دے۔ یہ امید بڑی کمزور سی تھی۔
ن دوسری طرف حامد کو موتی دادا کے دن بھر کے معمولات کا
م نہیں تھا۔ وہ اس سے شام ہی میں ملتا رہا تھا۔ اگر اسی وقت
ر لوٹ جاتا تو موتی دادا کے ملنے یا نہ ملنے کے بارے میں کچھ
یں کہا جا سکتا تھا۔

وہ بے کلی کے عالم میں خزاں رسیدہ زرد لان کے ایک
دراُفتادہ گوشے میں جا لیٹا جہاں تنہائی میں شناساؤں کی مداخلت
امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔

ایک بجے تک اس نے ایک ایک لمحہ ناقابلِ بیان کرب
ر اضطراب کی حالت میں گزارا، اسے یوں محسوس ہو رہا تھا،
یسے کسی ہولناک جُرم کی پاداش میں اسے سولی پر لٹکایا جانے والا ہو۔

ایک بجنے کے چند منٹ بعد وہ آڈیٹوریم پہنچا تو خوشی کی
ندت سے اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں کیونکہ جبار اس
سے پہلے وہاں موجود تھا۔ اسے دیکھتے ہی اپنی جگہ چھوڑ کر اس
ی طرف لپکا۔ "تیرہ سو پچاس ہیں اس میں۔" اس نے خاکی رنگ
الفافہ حامد کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا جو اس نے کچھ کہے سُنے
بغیر اپنے بیگ میں ڈال لیا۔

حامد مقررہ وقت پر جبار کو رقم سمیت وہاں موجود پا کر
دل ہی دل میں اپنی خام خیالی پر نادم ہو رہا تھا۔ اچھا ہی ہوا
کہ اس نے ایک بجے تک انتظار کرنے کا فیصلہ کر ڈالا تھا۔ ورنہ
وہ خود کو ناقابلِ تصور دشواریوں میں ڈال چکا ہوتا۔

"کل اسی پڑیاں لانا۔" جبار نے اس کے ساتھ بس اسٹاپ
کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "امید ہے کہ سب نکل جائیں گی، آج
کمال تو مٹھی ہو گیا۔"

"یہ مال تم کہاں کھپائے جا رہے ہو؟" حامد نے حیرت کے ساتھ سرگوشیانہ لہجے میں سوال کیا۔

"یہ میرا ٹریڈ سیکرٹ ہے۔" وہ مکارانہ انداز میں مسکرایا۔ "تمھیں بتا دیا تو کل پتا بھی صاف کر سکتے ہو... تم لکھ کر رکھ لو کہ میں چار چھ ہی دن میں سو سے اوپر چلا جاؤں گا۔"

"چرس کا کیا حال ہے یہاں؟" حامد نے محض اپنی معلومات کی غرض سے سوال کیا۔

"یہاں کیا، شہر تک میں میدان صاف ہے۔" اس نے بُرا سا منہ بنا کر بے پروایانہ انداز میں کہا۔ "سنا ہے کہ ہیروئن نسبتاً آسانی سے ملنے لگی ہے۔ ہم لوگوں نے بڑے موقع سے اس کام میں ہاتھ ڈالا ہے، پڑھنے لکھنے میں اب کوئی خاص چارم نہیں رہا، گریجویشن کے بعد بھی جوتیاں چٹخانے کے بعد مشکل سے ہزار، آٹھ سو کی نوکری ملتی ہے، اس کام میں لیڈی لک ذرا بھی ساتھ دے گئی تو وارے کے نیارے ہو جائیں گے۔"

"بس یہ یاد رکھنا کہ میں غریب ہوں، مال یا رقم میں ذرا بھی گڑبڑ ہوئی تو بے موت مارا جاؤں گا۔" حامد نے موقع پاتے ہی اپنے دل کی خلش الفاظ میں بیان کر دی۔

"فکر نہ کر دیار! ہم بھی کنگلے ہیں۔" وہ حامد کی کمر پر ہاتھ مار کر ہنسا۔ "اب تو دونوں کا نفع نقصان ایک ساتھ ہے، کچھ دن مال کما کر چھٹیوں میں پشاور کا چکر لگائیں گے۔ سنا ہے وہاں آزاد علاقہ قریب ہونے کی وجہ سے منشیات بہت سستی ہیں۔"

حامد سر ہلا کر رہ گیا، وہ تو یہ سوچ رہا تھا کہ جبار اس

معاملے میں اتنا پُرجوش کیوں ہے۔

پھر چند ہی دنوں میں اس کی سوچ بچار دھری کی دھری رہ گئی، جبّار ایک سو دو پڑیاں فروخت کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن اسی کے ساتھ اس نے حامد کو بتا دیا کہ پوری رقم کی ادائیگی اسی دن ہونی دشوار ہے۔ بعض گاہک ادھار بھی کرتے ہیں۔ لہٰذا ادائیگی میں کم ازکم ایک دن کی رعایت ملنی ضروری ہو گئی تھی۔

حامد فکر مند ہو گیا لیکن جب اس نے جبّار کا ذکر کیے بغیر موتی دادا سے اس الجھن کا ذکر کیا تو اس نے چٹکی بجاتے میں مسئلہ حل کر دیا۔ وہ حامد سے ایک دن کا ادھار تو پہلے ہی کرتا تھا۔ اس کی رُوداد سُن کر تین دن پر راضی ہو گیا۔ ”تیسرے دن حساب صاف ہو جانا چاہیے، جتنی رقم نقد مل جائے پہنچا دیا کرو۔ کیونکہ پاس رکھنے میں گر بھی سکتی ہے، جیب کٹ سکتی ہے۔ تمھارا کام بہت اچھا جا رہا ہے، شہر میں اور بھی تو کا... ...ن میں بھی تمھارے یار دوست ہوں گے، وہاں کوشش کیوں نہیں کرتے؟“

”کروں گا دادا!“ وہ پُراعتماد لہجے میں بولا۔ ”پہلے ذرا یونیورسٹی کی مانگ میں ٹھہراؤ آجائے پھر کسی سے بات کروں گا۔“

”جس سے بھی بات کرو، پہلے اس کا آگا پیچھا دیکھ لینا۔“ موتی دادا حسبِ موقع اسے مشورہ دینے سے نہیں چُوکتا تھا۔ ”کیونکہ اس کی ذمّے داری تم پر ہو گی۔“

”فکر نہ کرو، انتخاب سے پہلے تم سے بھی ملا دوں گا۔“

”نہیں بابا!“ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے کان چھوتے ہوئے بوکھلا کر بولا۔ ”کالج کے لونڈوں سے میں ڈرتا ہوں، کہیں آخر عمر میں مٹی پلید نہ ہو جائے، تمھیں بھی یوں ملا لیا کہ سفارش پر آئے تھے۔ مجھے کسی سے ملنے ملانے کی ضرورت نہیں، آدمی کو دیکھنا بھالنا تمھاری ذمّے داری ہو گی۔“

رقم کی ادائیگی میں مہلت مل جانے پر حامد خوشی خوشی واپس لوٹ آیا اور اگلے دن جبّار کو مال دیتے ہوئے اس سہولت سے آگاہ کر دیا۔

جبّار اس کام کے بارے میں بہت زیادہ سنجیدہ تھا۔ حامد کو یوں محسوس ہوتا جیسے ان دنوں جبّار صرف ہیروئن کی فروخت کے لیے ہی یونیورسٹی آتا ہو۔ مال لے جانے کے بعد وہ کچھ رقم واپسی سے پہلے حامد کے حوالے کر دیتا اور بقیہ رقم اگلی صبح مال لیتے ہوئے اسے ادا کر دیتا۔ لین دین کے معاملے میں وہ اتنا کھرا ثابت ہو رہا تھا کہ بعض اوقات حامد دل ہی دل میں یہ سوچ کر شرمندہ ہو جاتا کہ ایک موقع پر اس نے جبّار جیسے آدمی کی نیک نیتی پر شبہ کیا تھا۔

یونیورسٹی کی حدود میں باہمی لین دین کو دوسرے طلبا کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھنے کے لیے جبّار نے بھی حامد جیسا سیاہ بیگ استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ دونوں ملتے تو کبھی خوبصورت طریقے سے اپنے بیگ تبدیل کر لیتے تھے پھر دوسرے کو زبانی اس میں موجود رقم یا پُڑیوں کی تعداد بتا دیتے جس میں ذرا بھی فرق نہیں ہوتا تھا۔

جبّار کے ملنے سے حامد کی آمدنی میں دو روپے تو سیدھا سا اضافہ ہو گیا تھا۔ تعداد بڑھنے سے ہونے والی اس کے علاوہ تھی۔ اس کا جوان چڑھتا ہوا خون تھا، لہٰذا اس خوشحالی کو اپنی ذات تک محدود نہ رکھ سکا۔ ماں باپ بہنوں کے روتے بسورتے اور فکرمند چہروں پر خوشی کی ایک جھلک دیکھنے کی امید میں گھر میں موقع بے موقع فیاضی کا مظاہرہ کرنے لگا۔ گھر میں نئے ٹوان ون کی گونجیلی آواز میں نغمے بھی گونجنے لگے اور پڑوسن سے وقت دریافت کرنے کے بجائے گھر میں صرف سیل سے چلنے والا نیا وال کلاک آگیا بلکہ حامد نے میز... کے سامنے والے بازار سے چاروں بہنوں کو ہندسوں میں ... بتانے والی سنہری اور روپہلی الیکٹرونک گھڑیاں بھی لا دیں۔

ماں باپ اندھے ہوں تو انھیں اپنی ضرورتوں اور ترستی خواہشوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ اولاد رشوت لے، چوری کرے یا جیبیں کاٹتی پھرے۔ وہ اس کی دی ہوئی ہر رقم کو بغیر پوچھے گچھے خون پسینے کی کمائی تصور کر لیتے ہیں اور اپنے نفس کی صلیب پر اکلِ حلال کے بنیادی فلسفے کو اُلٹا لٹکا دیتے ہیں مگر جہاندیدہ باپ تنگ دستی کے باوجود عزت کو عزیز رکھتا تھا اور جانتا تھا کہ حقیق... بے رحم دنیا میں پیسہ اتنی آسانی سے نہیں ملتا جتنی بے پر... سے اس کا اکلوتا بیٹا فیاضیوں کے مظاہرے کرنے لگا تھا۔ ایک دن موقع پا کر اس نے بیٹے کو گھیر لیا۔ چاروں لڑکیاں پڑوس کی کسی تقریب میں گئی ہوئی تھیں اور ماں صحن میں چارپائی پر لیٹی اپنے ٹوان ون پر روح کی غذا نوش کرنے میں مصروف تھی۔

”آج کل کیا کر رہے ہو بیٹے؟“ باپ نے بڑے ڈلار کے ساتھ حوصلہ افزا لب و لہجے میں بات چھیڑی۔ ”ماشاءاللہ بڑھ کر گھر کا بوجھ اٹھانے لگے ہو۔“

حامد نے چونک کر باپ کی طرف دیکھا مگر اس کی بوڑھی آنکھوں میں اپنے لختِ جگر کے لیے اتھاہ پیار کے سوا کچھ نہیں تھا۔ سوال ٹیڑھا تھا مگر حامد اسے مسکراہٹ میں اڑا گیا۔ ”کچھ نہیں، ایک اسٹیٹ ایجنسی میں جا رہا ہوں بابا! مالک اچھا آدمی ہے۔ دفتری کام کے علاوہ تھوڑی سی محنت کرتا ہوں تو جائیداد کے سودے میں تھوڑی بہت دلالی بھی مل جاتی ہے۔“

”ذرا خیال رکھنا بیٹے!“ باپ کے لہجے میں کرب اُمڈ آیا جیسے اپنے بیٹے سے بہت کچھ کہنا چاہتا ہو لیکن کہہ نہ پا رہا ہو۔ ”دلالی کا لالچ بہت برا ہوتا ہے، میں تمھیں زندگی بھر کوئی آسائش فراہم نہ کر سکا، کہیں ایسا نہ ہو کہ اپنی محرومیوں کا حساب چکانے کے لیے تم کوئلوں کی دلالی میں پڑ جاؤ، ہاتھوں کی سیاہی پھر دُھل جاتی ہے مگر چہرے کی کالک ہر ایک کو لے ڈوبتی ہے۔ تم خود سمجھ دار ہو۔“ اس نے لحظے بھر کے لیے خاموش ہو کر تھوک نگلتے ہوئے اپنا گلا تر کیا۔ پھر بولا۔ ”اپنا اچھا بُرا سمجھتے ہو لیکن ابھی تم نے دنیا نہیں دیکھی، بس یہی ایک فکر ذرا پریشان کر دیتی ہے۔“

”آپ بے فکر رہیں بابا!“ حامد نے بڑھ کر بوڑھے باپ کے دونوں شانے تھام لیے۔ ”گھر کے نام کو بٹا نہیں لگاؤں گا! آپ زیادہ نہ سوچا کریں۔ آپ نے کیا نہیں دیا ہمیں؟ یہی کیا کم ہے کہ آج میں کہیں کڑی مزدوری کرنے کے بجائے بے فکری سے تعلیم حاصل کر رہا ہوں۔“

بوڑھے باپ کے ہونٹوں کے گوشے کپکپائے اور آنکھوں سے دو موتی گود میں لڑھک گئے اور وہ رُندھی ہوئی آواز میں بولا۔ ”جب قدرت نے مجھے کچھ نہیں دیا تو میں تمھیں کیا دیتا بیٹے؟ نہ سر چھپانے کو اپنا ٹھکانہ ہے نہ۔ ۔ ۔“

”ہاں ہاں، اب سب ہو جائے گا۔“ حامد کی ماں شاید اپنے شوہر کی آواز سنتے ہوئے صحن سے کمرے میں آئی تھی۔ ”تم سے تو کچھ بھی نہیں ہوا، اب اللہ رکھے میرے حامد کو، دیکھنا تھوڑے ہی دنوں میں۔ ۔“ اپنی روانی میں بولتے بولتے اچانک اس کی نگاہ اپنے شوہر کے چہرے کی جھریوں میں لرزتی ہوئی نمی پر پڑی اور وہ سٹپٹا گئی۔ ”ارے تم رو رہے ہو۔۔ کیا کہہ دیا اس نے تم کو؟“ وہ لپک کر شوہر کی دلجوئی کے لیے آگے بڑھی اور حامد دل گرفتہ ہو کر کمرے سے نکل گیا۔

اس روز اس نے صدقِ دل سے فیصلہ کیا کہ اپنی آمدنی کا ایک ایک پیسہ احتیاط سے جمع کرے گا اور پندرہ بیس ہزار کی پونجی بنانے کے بعد ہیروئن فروشی ترک کر دے گا۔ اس نے جھوٹ بول کر اپنے باپ کو تو مطمئن کر دیا تھا لیکن خود اچھی طرح جانتا کہ وہ ایک غلط کام میں ملوّث ہے۔ باپ... چھیڑنے سے اس کے اندر کی وہ کمزور آواز ذرا زور پکڑ گئی تھی جو اپنی مجبوریوں کی خاطر حامد نے خود گھونٹ رکھا تھا۔ کچھ دن تک جبّار کے ساتھ معاملہ کسی گڑبڑ کے بغیر خوش اسلوبی سے چلتا رہا۔ پھر ایک دن وہ اچانک غائب ہو گیا۔ حامد اس کی نیک نیتی کا دل سے معترف ہو چکا تھا۔ لہٰذا یہ گمان بھی نہیں ہوا کہ جبّار کے دل میں بے ایمانی آگئی ہو گی مگر اسے تشویش ضرور ہو گئی۔ اس کا اندازہ تھا کہ جبّار کو اچانک کوئی مجبوری بھی پیش آگئی ہوتی تو وہ محض حامد کو اطلاع دینے ضرور آتا پھر اس نے سوچا کہ جبّار یونیورسٹی کے کسی دور اُفتادہ حصّے میں نہ پھنس گیا ہو۔ اس نے پہلے دو لیکچرز چھوڑ دیے اور اِدھر اُدھر منڈلاتا رہا۔ اس کی بے چین نگاہیں ہر لحظے جبّار کی منتظر تھیں لیکن وہ کہیں نظر نہ آیا۔ آخر حامد، جبّار کے ساتھ آنے والے لڑکے سے ملا تو پتا چلا کہ اس روز جبّار سرے سے بس میں سوار ہی نہیں ہوا تھا۔

اس نے بے دلی سے صرف ایک لیکچر اٹینڈ کیا مگر اس کا ذہن الجھا رہا۔ پیریڈ ختم ہوا تو وہاں رُک کر وقت ضائع کرنے کے بجائے واپسی کا فیصلہ کر چکا تھا۔

وہ واپسی کے لیے بس اسٹاپ پر کھڑا ہوا تھا کہ اچانک سامنے سے کسی لڑکی نے ہاتھ لہرا کر اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ حامد نے اس کے سراپا پر غور کیا تو اسے پہچان گیا۔ وہ جبّار کی ہم جماعت تھی۔ خوش شکل ہونے کے ساتھ منسوڑ بھی واقع ہوئی تھی، کوشش کے باوجود حامد کو اس کا نام یاد نہ آسکا لیکن وہ اپنی جگہ رُک کر اس کا انتظار کرنے کے بجائے اخلاقاً اس کی طرف بڑھ گیا۔

”آپ حامد ہی ہیں نا؟“ اس نے قریب آتے ہی پُراعتماد لہجے میں سوال کیا۔

”جی ہاں۔“ حامد نے شرافت سے کہا۔ لڑکیوں سے ہمیشہ وہ محتاط اور شائستہ طریقے پر پیش آتا تھا۔

”کمبل آپ سے کوئی کتاب لے گیا تھا جو اسے آج لوٹانی تھی۔“ وہ سنجیدگی سے بتانے لگی۔ ”لیکن آج وہ اچانک بیمار پڑ گیا ہے، آپ کو کسی وقت گھر پر بلایا ہے۔“

”یہ کس کا ذکر کر رہی ہیں آپ؟“ حامد نے حیرت سے پوچھا کیونکہ اس نے اپنی کوئی کتاب کسی کو نہیں دی تھی اور ذہن کے بعید ترین گوشے میں بھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ جبّار پیغام رسانی کے لیے اس لڑکی کو استعمال کر بیٹھا ہو گا۔

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ”تو آپ اپنے دوست کی عُرفیت سے بھی لاعلم ہیں؟ جبّار نے آج صبح سویرے کہیں سے فون کیا تھا میرے گھر، ہم عموماً شہر سے ایک ہی بس میں یونیورسٹی آتے ہیں لیکن آج وہ نہیں آسکا۔“

”اوہ۔“ حامد نے جلدی سے کہا۔ ”میں صبح سے پریشان تھا، وہ کتاب دراصل میں نے بھی کسی سے اُدھار لی ہوئی تھی۔ لیکن مجھے جبّار کے گھر کا پتا نہیں معلوم تھا۔“

”اس کا بھی یہی خیال تھا۔“ لڑکی نے اپنے پرس میں سے ایک مُڑا تُڑا کاغذ نکال کر حامد کو دے دیا۔ ”اسی لیے اس نے مجھے پتا لکھوا دیا تھا۔“

حامد نے اس کا شکریہ ادا کیا اور وہ مسکراتی ہوئی واپس چلی گئی۔

جبّار نے مختصر سی مدت کے لین دین میں حامد پر اپنا اتنا اعتبار قائم کر لیا تھا کہ وہ رقم کی طرف سے زیادہ فکر مند نہیں تھا لیکن حامد کو موتی دادا کی ہدایت کا خوف لاحق تھا۔ اسے ڈر یہ تھا کہ جبّار کی غیر حاضری میں ہیروئن کے کسی رسیا کو اگر وقت پر نشہ نہ ملا تو کہیں کیمپس میں کوئی تماشا نہ کھڑا ہو جائے۔ اس طرح ہیروئن فروشی کا جو سلسلہ رازدارانہ طریقے پر چل رہا تھا، جامعہ کے اساتذہ اور انتظامی ذمّے داروں کی نگاہ میں آسکتا تھا جس کے نتائج خاصے سنگین ہو سکتے تھے لہٰذا حامد نے گھر جا کر اپنا وقت برباد کرنے کے بجائے فوری طور پر جبّار سے ملاقات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

پی ای سی ایچ ایس کے علاقے سے وہ بس طارق روڈ کی حد تک واقف تھا۔ جہاں کبھی کبھار دوستوں کے ساتھ قدرت کی صناعی کے حسین شاہکار دیکھنے چلا جاتا تھا۔ لہٰذا وہ یونیورسٹی سے سیدھا طارق روڈ پہنچا جہاں ایک اسٹیٹ ایجنسی سے رجوع کرنے کے بعد اسے صحیح رہنمائی مل گئی اور وہ سوسائٹی کے قبرستان کے احاطے کی طویل دیوار کے مقابل بنے ہوئے مکانات میں جبّار کا مکان تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

وہ جگہ بھی محلِ وقوع کے اعتبار سے عجیب و غریب تھی۔ سڑک کے پار وسیع احاطے میں ہزاروں انسان زندگی کی حرارت کھو کر منوں مٹّی کے نیچے ابدی نیند سو رہے تھے۔ پہلو بہ پہلو ہر ایک کے حصّے میں وہی دو گز جگہ آئی تھی جو جیتے جاگتے اور لڑتے جھگڑتے انسانوں کا آخری مقدّر ہوتی ہے، شاہ کے پہلو میں گدا کی ابدی آرام گاہ تھی اور گدا کے قدموں میں اپنے وقت کا کوئی فرعون سکون سے ابدی نیند سویا ہوا تھا اور زندوں کی آبادی کو مُردوں سے الگ کرنے والی سڑک کے اس پار پُرشوکت مکانوں میں زندگی اپنے تمام رنگوں کے ساتھ رقص کناں تھی، ہر شخص زندگی کی دوڑ میں دوسروں کو اتنا پیچھے چھوڑ جانا چاہتا تھا کہ انھیں وہ بس ایک سراب کی مانند اپنے سے آگے، اور آگے نظر آتا رہے مگر کوئی اس کے قدموں کی گرد بھی نہ پا سکے اور اس دوڑ میں شاید کسی کو یاد نہیں رہ گیا تھا کہ زندگی اور موت میں کتنا کم فاصلہ ہے۔ درمیان میں حائل ایک سڑک کا یا شاید اس سے بھی کم۔

مکان کا نمبر وہی تھا لیکن مکانیت خاصی پیچیدہ نظر آ رہی تھی، ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اس دو منزلہ مکان میں کئی خاندان مقیم ہوں۔

حامد نے آخر کار کال بیل کا بٹن دبا ہی دیا۔ نچلی [منزل] کے داہنے حصّے میں گھنٹی کا کرخت شور بلند ہوا اور نہایت [...] کے ساتھ دروازہ کھول کر ایک صحت مند آدمی غصیلے تیور [...] کے ساتھ باہر نکلا لیکن حامد پر نگاہ پڑتے ہی خجالت آمیز [...] میں مسکرانے لگا۔ "معاف کیجیے گا، گھنٹی کی آواز سُن کر غصہ [آگیا] تھا، دن بھر محلّے کے بچّے تنگ کرتے رہتے ہیں، باہر نکلا [تو] کوئی نظر نہیں آتا۔"

"جبّار موجود ہیں؟" حامد نے نرم لہجے میں سوال کیا۔

"اسی طرف اوپری منزل پر چلے جائیں۔" صحت مند [آدمی] نے خشک لہجے میں کہا اور حامد کے ردِّ عمل کا انتظار کیے [بغیر] واپس اپنے گھر میں گھس گیا۔ جیسے جبّار کے مکان کی تلاش [کے] سلسلے میں اسے حامد کی غلطی ناگوار گزری ہو۔

اوپری منزل پر پُرانی وضع کی ایک عمر رسیدہ خاتون [نے] حامد سے جبّار کا نام سنتے ہی اسے اندر بلا لیا۔ "آجاؤ بیٹے [وہ] تو بستر پر پڑا ہوا ہے، خدا جانے کہاں جھگڑا کر کے آیا ہے [اور] کہتا ہے کہ بس سے گر گیا ہے۔"

جبّار جس ڈھب سے یونیورسٹی آتا تھا، اس سے حا[مد] نے یہی اندازہ لگایا تھا کہ وہ کسی متوسط گھرانے سے تعلق [رکھتا] ہے لیکن گھر میں پہلا قدم رکھتے ہی اس کے وجود میں کر[ب] کی ایک لہر سی دوڑ گئی کیونکہ گھر میں بے سرو سامانی کے [آثار] نمایاں تھے۔ بوڑھی عورت کی رہنمائی میں حامد ایک کمر[ے] میں داخل ہوا تو جبّار ایک چارپائی پر چادر اوڑھے کسی گٹھ[ڑی] کی طرح بے حس و حرکت پڑا گہری نیند سو رہا تھا۔ دوسر[ی] چارپائی خالی تھی، حامد اسی پر بیٹھ گیا۔

"جبّار!" بوڑھی عورت نے اس کی پیشانی پر ہتھیلی جما[کر] ممتا بھرے لہجے میں اسے پکارا۔ "دیکھ بیٹا! کون آیا ہے [تجھ] سے ملنے۔"

[جبّا]ر نے کراہ کر کروٹ لی اور کراہتے ہوئے کسلمندانہ انداز میں آنکھیں کھول دیں پھر حامد کو پہچانتے ہی اس پر [ایسی] بوکھلاہٹ طاری ہوئی کہ چادر پھینک کر سیدھا ہو بیٹھا۔ اس [کے] رویّے سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کسی نے بھرے مجمع میں [اس] کے کپڑے اتار دیے ہوں۔ وہ ملامت آمیز لہجے میں اپنی ماں سے کہہ رہا تھا۔ "اسے یہاں کہاں بُلا لیا مرغی خانے میں، مجھے اٹھا دیا ہوتا، باہر کسی ہوٹل میں بیٹھ جاتے۔"

"ہوٹل میں بیٹھ جاتے۔" اس کی ماں نے دُکھ بھر[ے] لہجے میں دہرایا۔ "بخار سے پھنک رہا ہے، بستر پر کروٹ بد[لتے] ہوئے ہائے ہائے کرتا ہے اور میں تجھے باہر نکلنے دیتی۔" یہ کہتی ہوئی وہ اس کمرے سے چلی گئی اور جبّار معذرت خواہانہ، خفت آمیز [لہ]جے میں حامد سے مخاطب ہو گیا۔ "یار! خیال نہ کرنا، یہاں تو بیٹھنے کے لیے جگہ بھی نہیں ہے۔ ۔ ۔"

حامد نے نرمی سے اس کی بات کاٹ دی۔ "تم آرام سے لیٹے رہو، میں بھی کسی حویلی میں نہیں رہتا۔ ۔ ۔ یہ بتاؤ کہ یہ حال کیا ہو رہا ہے تمھارا؟" اس کا سوال بجا تھا کیونکہ جبّار کی دونوں آنکھوں کے نیچے نیل پڑے ہوئے تھے، رخساروں پر ورم تھا اور پیشانی کے زخم پر ٹیپ سے پٹی چپکی ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا، جیسے وہ ذرا ہی دیر پہلے باکسنگ کے کسی معرکے میں ناک آؤٹ ہونے کے بعد گھر لوٹا ہو۔

"کل شام ٹھکائی ہو گئی۔" وہ اس کی طرف جھک کر خفت آمیز سرگوشیانہ لہجے میں بولا۔ "وہ تین تھے، اچانک ہی گھیر کر مارنا شروع کر دیا، اگر مجمع میں سے کسی نے پولیس کی ہانک نہ لگائی ہوتی تو شاید حال اور بھی بُرا ہوتا۔"

"کیا ہوا تھا؟" حامد نے آگے سرک کر تجسّس آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"میں حسبِ معمول طارق روڈ پر کھڑا ہوا تھا کہ اچانک ہی وہ تینوں میرے سر پر سوار ہو گئے اور مارنا شروع کر دیا، وہاں بھیڑ لگ گئی لیکن مجمع میں سے کسی نے بھی مداخلت کی ہمت نہیں کی۔ کیونکہ انھوں نے مداخلت کرنے والے کی ہڈیاں توڑ ڈالنے کا اعلان کر دیا تھا۔" وہ دھیمی آواز میں بتاتا رہا۔ "پولیس کا نام سُن کر فرار ہونے سے پہلے ان میں سے ایک نے دھمکی دی کہ اگر میں نے آئندہ وہاں ہیروئن فروخت کرنے کی کوشش کی تو وہ مجھے جان ہی سے مار دیں گے۔ اس وقت مرمت کا سبب میری سمجھ میں آیا تھا۔"

"تو تم ہیروئن بیچ رہے تھے وہاں؟" حامد نے تحیّر آمیز لہجے میں کہا۔ اس کے ذہن میں وہ ہدایات گھوم گئیں جو اسے مال ملنے سے پہلے دی گئی تھیں۔ ان میں اہم ترین شرط یہ تھی کہ وہ جامعہ کی حدود سے باہر ایک پُڑیا بھی نہیں بیچے گا کیونکہ دوسرے لوگ اپنی حدود میں کسی کی مداخلت برداشت نہیں کریں گے۔

"یونیورسٹی میں اتنا مال کہاں نکلتا۔" اس کے ورم آلود ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ تیر گئی۔ "سُنا تھا کہ اس معاملے میں طارق روڈ کا علاقہ بہت زرخیز ہے لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ اس سے زیادہ خطرناک بھی ہے۔"

"تم نے بہت بُرا کیا۔" حامد بڑبڑایا۔ "تمھیں یونیورسٹی سے باہر نہیں نکلنا چاہیے تھا، اگر اس وقت واقعی پولیس پہنچ جاتی تو کیا ہوتا؟ تمھارے ساتھ میری گردن بھی پھنس جاتی۔"

"ضرورتیں اندھی ہوتی ہیں دوست!" وہ سر جھکا کر آہستہ سے بولا۔ "اب تم نے میرا گھر تو دیکھ ہی لیا ہے، میں اتنا لاابالی نہیں ہوں، جتنا خود کو ظاہر کرتا ہوں۔ یونیورسٹی میں زیادہ سے زیادہ پچاس ساٹھ پُڑیاں روز بک جائیں گی۔ طارق روڈ پر پاؤں جم جاتے تو دو سو بھی کم پڑ جاتیں۔" اس کے لہجے میں حسرت اُبھر آئی۔

حامد اس کی بات سن کر حیران رہ گیا۔ وہ شروع سے ہی جبّار کو نشے کا عادی ایک خوشحال اور لاابالی لڑکا سمجھتا رہا تھا لیکن وہ تو خود اپنے دُکھوں کے بوجھ تلے دبا ہوا نظر آ رہا تھا۔

"لیکن تم تو خود نشے کے عادی ہو؟" حامد نے تحیّر آمیز لہجے میں سوال کیا۔ "یہ ضرورتوں کا قصّہ کہاں لے بیٹھے؟"

اس نے متاسفانہ انداز میں اپنے سر کو جنبش دی۔ "شاید تمھیں یہ سن کر حیرت ہو کہ میں نے آج تک اپنا ایک پیسہ بھی کسی نشے پر خرچ نہیں کیا۔ ان لوگوں کے ساتھ چرس کی سگریٹیں ضرور پی لیتا تھا مگر اس کا عادی نہیں ہوں۔ مجھے تاشوں میں ہاتھ کا کمال حاصل ہے، ان لوگوں میں رہ کر روز تیس چالیس روپے کھینچ لیتا تھا۔ پھر تم سے ہیروئن ملی تو انھیں مونڈنے کا ایک اور ذریعہ ہاتھ آ گیا۔ ۔ ۔" اچانک وہ خاموش ہو کر داہنی طرف کی پسلیاں تھام کر گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ حامد نے اس کے چہرے کی حالت سے اندازہ لگایا کہ اتنی دیر بیٹھے رہنے کے باعث اس کی چوٹوں میں درد بڑھ گیا تھا۔ تو اس نے سہارا دے کر جبّار کو واپس لٹا دیا۔

اسی اثنا میں جبّار کی ماں حامد کے لیے چائے لے آئی اور شکایتی لہجے میں بولی۔ "بیٹا! تم ہی کچھ معلوم کرو اس سے۔ گھر آیا تو کپڑے تار تار تھے اور یہ خود خون میں ڈوبا ہوا تھا۔ بھلا بس سے گرنے میں بھی کہیں ایسی چوٹیں لگتی ہیں۔ اللہ کرے اس کے ہاتھ گل جائیں جس نے میرے لال کو اس بُری طرح مارا ہے۔"

جبّار نے کراہتے ہوئے اپنی ماں پر برہمی کا مظاہرہ کیا تو وہ جلدی سے وہاں سے لوٹ گئی اور جبّار دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کربناک انداز میں مسکرا دیا۔ "ماں ہے نا بیچاری۔ دل بہت چھوٹا ہے اس کا، تم ہی بتاؤ میں اس سے اور کیا بہانا کرتا؟ وہ تو مجھے لانے والے پولیس تھانے کے چکر میں ملوّث ہونے کے خوف سے مجھے نیچے چھوڑ کر فوراً ہی بھاگ گئے۔ ورنہ ابا کو ان سے ضرور سچی بات معلوم ہو جاتی۔"

"اب تم چار چھ دن مکمل آرام کرو۔ دوا تو لے رہے ہو نا؟"

حامد نے کہا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مال، و پیسوں کا ذکر کیسے شروع کرے۔

" دوا لے رہا ہوں۔" اس نے دیوار گیر طاق میں رکھی ہوئی دواؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔" وہ تو غنیمت ہوا کہ کپڑے پھٹنے کے باوجود رقم گرنے سے محفوظ رہی۔ ورنہ میں تو تمھیں منہ دکھانے کے قابل بھی نہ رہتا۔" اس نے مطلب کی بات خود ہی اُگل دی اور حامد کے اعصاب پر چھایا ہوا تناؤ یک بیک دور ہو گیا۔

" یہ سوچو کہ تمھاری غیر حاضری میں کیمپس میں کیا بنے گا؟" حامد نے پُرخیال لہجے میں کہا۔" لوگوں کو وقت پر ہیروئن نہ ملی تو وہ ذہنی عدم توازن کا شکار بھی ہو سکتے ہیں۔"

" میں نے تمھیں اسی لیے بلایا ہے۔" وہ آہستہ سے بولا۔ ماں نے فون کرنے کے لیے بمشکل نیچے اُترنے دیا تھا صبح سویرے ... وہ اوپر سے بیگ اتار لو۔"

حامد نے اس کی بتائی ہوئی جگہ سے بیگ اُتار لیا۔" اس میں پچھلے حساب کے بقایا سات سو پندرہ روپے ہیں، بچی ہوئی تین پُڑیاں بھی اسی میں ہیں۔" جبّار نقاہت زدہ آواز میں اسے بتانے لگا۔" کیمپس میں بتیس لگے بندھے گاہک ہیں۔ تم بتیس تھیلیوں کا ایک بند پیکیٹ بنا کر مردان خان کو دے دینا، وہ قابلِ اعتماد لڑکا ہے اور گروپ کے سارے خریداروں کو جانتا ہے۔ اسے یہی بتانا کہ میں بس سے گر کر زخمی ہو گیا ہوں، وہ دوا مریضوں کو پہنچا دے اور پیسے تم ہی کو دے دے۔ یہ ظاہر نہ کرنا کہ تم ہیروئن کے چکر سے واقف ہو۔ وہ خود ہی ساری بات سمجھ کر رقم کے بارے میں بتا دے گا۔ ہو سکے تو میرے حصّے کے پیسے مجھے پہنچا دینا۔ کیونکہ کل رات بھی انجکشن اور دواؤں میں سو سوا سو روپے خرچ ہو گئے تھے۔"

" اس میں سے کچھ پیسے رکھ لو۔" حامد نے رقم والا بیگ کھولتے ہوئے کہا۔ جبّار نے لاکھ انکار کیا مگر حامد نے دو سو روپے زبردستی اس کے سرہانے تکیے کے نیچے رکھ دیے۔ وہ اس بات سے بہت متاثر ہوا تھا کہ جبّار نے اپنی تنگ دستی کے باوجود مار پیٹ کی آڑ لے کر رقم ہضم کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بلکہ پوری احساسِ ذمّے داری کے ساتھ گھر بُلا کر رقم اس کے حوالے کر دی تھی۔

" دو تین روز کی بات ہے۔" جبّار نے کہا۔" بس ذرا بگڑے ہوئے چہرے پر سے نیل اور ورم زائل ہو جائے تو یونیورسٹی آنے لگوں گا۔"

" اگر مردان خان قابلِ اعتماد ہے تو تم بے فکر رہو۔" حامد نے اٹھتے ہوئے کہا۔" ویسے میں روز تمھارے پاس آتا رہوں گا۔"

وہ وہاں سے روانہ ہوا تو اس کا ذہن جبّار کی حما سے پیدا ہونے والی صورتِ حال میں اُلجھا ہوا تھا۔ جبّار علا منشیات فروشوں کی نگاہوں میں آجانے کی وجہ سے مارا گ لیکن ان میں سے کسی کو بھی علم نہیں رہا ہو گا کہ وہ کہاں مال لا کر بیچتا ہے۔ پھر یہ بھی ضروری نہیں تھا کہ شہر کے ہیروئن فروشوں کا موتی دادا سے تعلق ہوتا۔ ان حالات میں جبّار کا قصہ گول کر جاتا تو موتی دادا کو کانوں کان بھی خبر کہ کہیں اس کی ہدایات سے انحراف کیا گیا ہے لیکن مشکل یہ آ تھی کہ طارق روڈ کی مارکیٹ کے سہارے جبّار نے اسے پو لاعلم رکھ کر فروخت ایک سو بیس پُڑیوں کے لگ بھگ بھ تھی۔ اس اضافے کے بعد حامد اچانک تیس چالیس کے اور آجاتا تو موتی دادا اس سے اس کمی کے بارے میں ضرور باز کرتا اور اس کے پاس سچ کے اعتراف کے سوا کوئی چارۂ کار نہ رہتا۔

اس اعتراف کے نتائج خود حامد کے حق میں مضر ہو سکتے تھے۔ موتی دادا اس خلاف ورزی پر ناراض ہو کر اپنی سپا سے حامد کا نام خارج کر سکتا تھا لیکن راستے بھر غور و خوض بعد حامد اس نتیجے پر پہنچا کہ آئندہ کے لیے اپنی راہ سیدھی ر کے لیے یہی بہتر تھا کہ وہ پوری کتھا موتی دادا کے گوش گزا اپنا فیصلہ اسی پر چھوڑ دے۔

موتی دادا سے ملاقات کا مرحلہ تو شام کو پیش آنا تھا کے لیے فوری کام یہ تھا کہ اپنے بیگ میں موجود پُڑیوں میں بتیس کا پیکیٹ تیار کرے تاکہ یونیورسٹی واپس جا کر مردان خا ذریعے ضرورت مندوں کی حاجت روائی کر سکے۔

✱

مکھن خان اپنے پیشے میں بہت بدنام آدمی تھا۔ اس کا ہر شخص کے لیے کھلی کتاب کی مانند تھا کیونکہ موج میں آکر محفل میں فخریہ لہجے میں خود ہی اپنی کہانی لے بیٹھتا تھا جس رُو سے اس کی ولادت باسعادت ہونے کے بجائے فطرت قوانین کے سراسر منافی تھی کیونکہ وہ نیپیئر روڈ پر ایک بائی جی بطن سے پیدا ہوا تھا جو کوشش کے باوجود اپنے اس گناہ کو کسی باقاعدہ کھاتے میں نہ ڈال سکی تھی۔ ہاں باپ بنانے کی دھمکی کر اپنے یہاں آنے والے کئی شرفا سے اس کی ولادت کے اخرا کے نام پر خاصی معقول رقمیں اینٹھنے میں ضرور کامیاب ہو گ لیکن مکھن خان نے طبلے کی تھاپ اور پائل کی جھنکار میں ہو سنبھالا تو اسے اس کے باپ کا نام نہ بتا سکی۔

شروع سے اس کی کمزور ذات کو کسی باپ کے نام کا

سہارا مل جاتا تو شاید اس کی تعلیم و تربیت پر بھی توجہ دی جاتی لیکن اسے ابتدا ہی سے پیسے بٹورنے کے ڈھب پر ڈال گیا۔ بائی جی کے ہر خریدار کو باپ بنا کر وہ جونک کی طرح اس سے چمٹ جاتا اور اس وقت تک خلوت سے سرکنے کا نام نہ لیتا جب تک بن بلائے باپ سے دو چار روپے نہ ہتھیا لیتا۔ اس کی ابتدائی تربیت کے بعد چوری چکاری اور مار دھاڑ میں اس نے ملکہ حاصل کیا۔ پھر اس کے ہاتھوں ایک دو قتل بھی سرزد ہو گئے لیکن گواہوں اور کسی ٹھوس ثبوت کی عدم موجودگی کے باعث وہ قانون کی گرفت سے آزاد ہی رہا اور آخر کار منشیات فروشی اختیار کر لی۔ اس کا اندازہ تھا کہ کم سے کم خطرات مول لے کر مختصر ترین مدت میں پیسہ کمانے کے لیے وہ بہترین پیشہ تھا۔ اس دھندے میں اس نے خاصا مال اور نام کمایا تھا۔ منشیات سے متعلق جملہ امور میں اس کی رائے دھیان سے سُنی جاتی تھی لیکن اسے دکھ تھا کہ مال کی پکڑ دھکڑ کے سلسلے میں ہونے والی میٹنگ میں اس کی آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی تھی۔ جمع ہونے والے سب لوگ اپنی اپنی بولیاں بول کر کسی نتیجے پر پہنچے بغیر منتشر ہو گئے تھے۔

لیکن مکھن خان کا ذہن مسلسل اس مسئلے میں اُلجھا رہا۔ آبکاری اور پولیس کی کارروائیوں کے نتیجے میں اپنی سرگرمیوں سے عارضی طور پر دستبرداری اسے توہین آمیز محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اتنے مالی وسائل کا مالک تھا کہ چند روز کی آمدنی اس کے لیے بے وقعت تھی بس یہ توہین اور شکست کا احساس ہی تھا کہ وہ مصائب کے ناگہانی آغاز کے بارے میں سوچے جا رہا تھا اور پھر اس کے ذہن میں آیا کہ عبداللہ جیسے کروڑپتی سے لے کر بٹھا کر جیسے بے مایہ دلال تک اس اجلاس میں موجود تھے لیکن عیسیٰ خان غیر حاضر تھا جسے مقرّب خان کی موت کی صورت میں سب سے بھاری نقصان اٹھانا پڑا تھا۔

عیسیٰ خان کا شمار شہر کے پردہ نشین منشیات فروشوں میں ہوتا تھا۔ خود سامنے نہ آکر وہ اپنی دانست میں خود کو محفوظ تصور کرتا تھا لیکن بازار میں دھندا کرنے والے باخبر لوگ اچھی طرح جانتے تھے کہ مقرّب خان شہر میں کس کا مال بیچتا ہے اور مقرّب خان کچھ دن پہلے پُراسرار طور پر مار ڈالا گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ عیسیٰ خان اپنے سب سے وفادار آدمی سے محروم ہو گیا تھا اور اس قابل نہیں رہا تھا کہ حالات معمول پر آنے پر بھی مال بازار میں پہنچا سکے۔ اس کی رگوں میں قبائلی خون دوڑ رہا تھا۔ لہٰذا اسے نہ سہی، مقرّب خان کی ہلاکت پر برہم ہونا چاہیے تھا۔ کاروبار کے لیے مقرّب خان کے قاتلوں تک رسائی کی فکر میں اسے اجلاس میں آنا چاہیے تھا لیکن وہ غیر حاضر رہا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ

وہ بذاتِ خود عیسٰی خان سے مل کر یہ نکتہ صاف کرنے کی کوشش کرےگا.

عیسٰی خان نے اپنے دفتر میں اس کا استقبال تحیرآمیز گرمجوشی سے کیا۔ "آج تم کیسے ادھر نکل آئے مکھن خان ؟" اس نے پُرجوش مصافحہ کرتے ہوئے سوال کیا۔

"اکیلے میں کچھ بات کرنا ہے عیسٰی خان !" مکھن خان نے سنجیدگی سے کہا اور عیسٰی خان ہاتھ تھام کر اسے دفتر کے عقبی کمرے میں لے گیا جہاں فرش پر دبیز قالین کے ساتھ کئی گاؤتکیے بھی دیواروں کے ساتھ رکھے ہوئے تھے۔ اندر پہنچ کر عیسٰی خان نے دروازہ بندکر لیا۔

"تم میٹنگ میں نہیں آئے تھے ؟" مکھن خان نے اس کے ہمراہ قالین پر بیٹھتے ہوئے براہِ راست مطلب کی بات چھیڑ دی۔

"ہاں ۔ پیغام تو ملا تھا" اس نے حیرت سے کہا "لیکن میری سمجھ میں نہیں آسکا کہ تمھاری برادری کے اجلاس میں میرا کیا کام تھا ؟"

"برا نہ ماننا عیسٰی خان !" مکھن خان اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا "ہم بازار میں آنکھیں کھول کر رہتے ہیں اور برادری کے اندر باہر والوں کو بہت اچھی طرح جانتے ہیں، تمہیں اپنا سمجھ کر اس اہم اجتماع میں بلایا گیا تھا۔"

"کیوں ؟" عیسٰی خان نے تیوریاں چڑھا کر سوال کیا "یاری دوستی اپنی جگہ ہے لیکن تمھاری لائن سے اپنا کیا واسطہ ؟"

"جاننے والے جانتے ہیں کہ مقرّب خان تمھارا مال بیچتا تھا" مکھن خان نے گہرا سانس لے کر کہا "تم اس سے انکار نہیں کر سکتے۔"

"خدا غارت کرے" عیسٰی خان مٹھیاں بھینچ کر غصیلے لہجے میں بولا "بدنام کر دیا مجھے اس خدائی خوار نے... وہ اپنے فعل کا خود ذمے دار تھا، مجھے کیا معلوم کہ یہاں سے جانے کے بعد وہ کیا کرتا ہے. بُرے کام کا انجام ہی بُرا ہوتا ہے، میں اس کا شریک کیوں ہونے لگا۔"

وہ کسی طرح پکڑائی دینے کے لیے تیار نہیں تھا، اس کا رویّہ دیکھ کر مکھن خان حیران رہ گیا اور براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا "اچھی طرح سوچ لو عیسٰی خان ! اگر یہی بات ہے تو اب بازار میں تمھارے نام سے دھندا کرنے والے بے دریغ مار دیے جائیں گے۔"

عیسٰی خان کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے تشویش کے سائے دوڑ گئے۔ مکھن خان کو امید ہوئی کہ شاید اس کا وار کارگر ہو گیا ہے لیکن عیسٰی خان نے فوراً ہی سنبھالا لے لیا اور پُرسکون لہجے میں بولا "دھندا کرنے والے موم کے پُتلے نہیں ہوتے مکھن خان ! لیکن میری طرف سے تمہیں پوری اجازت ہے، میں نے نہ کبھی غلط دھندا کیا ہے اور نہ کروں گا۔ کل کو اگر تم خود کو میرا آدمی کہنا شروع کر دو تو مجھے کیا علم ہوگا۔ مجھے تو مقرّب خان کے مرنے کے بعد پتا چلا ہے کہ وہ بازار میں چرس سپلائی کرتا تھ

"میرا یہاں آنا بے سود ثابت ہوا ہے عیسٰی خا نے اٹھتے ہوئے متاسفانہ لہجے میں کہا "میرا خیال تھا کہ تمھارا پرانا نمک خوار تھا، اور کچھ نہیں تو تم اس کے خو کے لیے ہی مجھ سے تعاون کرو گے۔"

"وہ میرا وفادار تھا اور مجھے اس کی موت کا غم مکھن خان ! لیکن میں اس کی موت سے لاتعلق ہوں وہ میں نہ مارا گیا ہوتا تو پھر میں دیکھتا کہ اس کی لاش گرا روئے زمین پر کہاں امان ملتی ہے۔"

ان دونوں نے مسکراتے ہوئے الوداعی مصافحہ کیا میں لڑاکا مرغوں کی سی چمک لیے ایک دوسرے کو گھور

مکھن خان نے بھیڑ بھاڑ کی وجہ سے اپنی کار کے دفتر سے خاصی دور چھوڑی تھی۔ وہ بوجھل قدمو طرف چل دیا لیکن راستے ہی میں مستریوں جیسے لباس ایک دراز قامت شخص نے اسے آلیا "صاب ! مجھے بات کرنی ہے، ادھر اگلے نکڑ پر آجاؤ" تیز سرگوشیانہ یہ کہتے ہوئے وہ شخص سُرعت کے ساتھ آگے بڑھتا

اس کے حلیے سے مکھن خان نے اندازہ لگا لیا تھا کہ کے ٹرکوں پر کام کرنے والا کوئی مستری یا کلینر تھا لیکن پُراسرار رویّے کا سبب فوری طور پر اس کی سمجھ میں نہ مکھن خان کار اسٹارٹ کر کے آگے روانہ ہوا تو وہ شخص نکڑ پر کھڑا تجسّس آمیز انداز میں عقب سے آ کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ مکھن خان نے دو بار گاڑ بجایا تو وہ چونکا اور اس کا اشارہ پاتے ہی لپک کر کار کی

"بیٹھ جاؤ" مکھن خان نے کہا اور وہ پھرتی سے د کر اس کے برابر والی نشست پر بیٹھ گیا۔ مکھن خان گیئر میں ڈال کر گاڑی آگے بڑھا دی۔

دراز قامت اجنبی چند ثانیوں تک بے چینی سے پہلو بدلتا رہا پھر ٹریفک صاف دیکھ کر بھرّائی ہوئی آواز میں عیسٰی خان اوّل درجے کا جھوٹا آدمی ہے، وہ ساری باتیں تم ہے، مقرّب خان اسی کے کام میں مارا گیا ہے۔"

مکھن خان نے سر گھما کر تیکھی نظروں سے اس کا جائزہ خشک لہجے میں بولا "بہتر ہوگا کہ پہلے اپنا تعارف کرا دو۔"

"مقرّب خان میرا بھائی تھا، اسی نے مجھے عیسٰی خان کلینر بھرتی کرایا تھا" وہ بتانے لگا "میرا نام عقرب خان ہے سے ایک ڈیڑھ گھنٹے پہلے مقرّب خان، میرے اور سلطان شاہ

ہم تینوں اندھیرے میں ایک آدمی کے بنگلے میں اترے تھے۔ وہ ہم سے ڈر کر بھاگ نکلا اور مقرّب خان ہمیں واپسی کا حکم دے کر اس کے پیچھے چلا گیا۔ رات کو وہ ڈیرے پر واپس نہیں لوٹا اگلی صبح اپنی کار میں اس کی لاش ملی۔

اس کے انکشاف پر مکھن خان چونکا مگر لہجے میں عدم دلچسپی برقرار رکھتے ہوئے بولا "تمہیں یہ سب پولیس کو بتانا چاہیے تھا، میرے پاس کیوں چلے آئے ؟"

"عیسٰی خان نے ہم دونوں کو زبانیں بند رکھنے کا حکم دیا ہے" عقرب خان نفرت آمیز لہجے میں بولا "وہ مقرّب خان کے قاتلوں سے مل گیا ہے یا پولیس سے ڈرتا ہے۔ مگر صاب ! مقرّب خان میرا بڑا بھائی تھا، میرا خون اُبل رہا ہے، عیسٰی خان کا ڈر نہ ہوتا تو کم از کم اسی آدمی کو مار ڈالتا جس کے بنگلے میں ہم گئے ہوئے تھے۔ میں تمھیں جانتا ہوں، میں نے چھپ کر تمھاری اور عیسٰی خان کی باتیں سُنی ہیں۔ تم مقرّب خان کے ہمدرد معلوم ہوتے ہو لیکن عیسٰی خان نے تمھارے سامنے اپنی ساری ذمّے داری اس مرنے والے پر ڈال دی۔ شاید میری بات سے تمھیں کچھ مدد مل جائے۔ یقین کرو کہ تم مقرّب خان کے انتقام کے لیے اٹھے تو اس کے دشمنوں پر وار کرنے میں مجھے پیش پیش پاؤ گے۔"

"لیکن عیسٰی خان تمھیں اس کی اجازت کب دے گا ؟"

مکھن خان نے لوہا گرم دیکھ کر اس کی اَنا پر وار کیا۔

"میں اس کا زرخرید نہیں ہوں مکھن خان !" وہ تلملا کر بولا۔ "تم بازار کے بڑے ضرور ہو مگر آدمی کی پہچان نہیں کر سکتے، زیادہ تاؤ دلایا تو قسم رب العزت کی۔ ابھی عیسٰی خان کے سینے میں گولی اتار دوں گا پھر پوچھوں گا کہ تم میری کیا مدد کر سکتے ہو ؟"

"کوئی ہتھیار بھی ہے تمھارے پاس ؟" مکھن خان نے نرم لہجے میں سوال کیا۔ اناڑی نہایت آسانی کے ساتھ کھلاڑی کے جال میں پھنستا جا رہا تھا۔ عقرب خان نے اندرونی جیب سے ریوالور نکال کر اس کی گود میں ڈال دیا۔

"رکھ لو اسے" مکھن خان نے کہا "مجھے یقین آگیا کہ تم سچے ہو۔ عیسٰی خان بہت کمینہ اور احسان فراموش آدمی ہے، وہ میرا پروگرام ناکام بنانے کے لیے اپنے کسی آدمی کو بھی میرے پیچھے لگا سکتا تھا" وہ چند ثانیوں کے لیے خاموش ہوا پھر بولا "اچھا اس آدمی کا نام بتاؤ جس کے مکان میں تم تینوں کودے تھے۔"

"نام نہیں معلوم، ہمیں مقرّب خان نے بس اسی روز تھوڑی دیر کے لیے ساتھ لیا تھا ورنہ وہ شہر بھر میں کسی غلام قادر کو ڈھونڈتا پھر رہا تھا جس نے عیسٰی خان کو کوئی بڑی چوٹ دی تھی" عقرب خان بتا رہا تھا "مقرّب خان کا خیال تھا کہ وہ آدمی ضرور غلام قادر کی نشاندہی کر سکے گا کیونکہ کسی زمانے میں دونوں گہرے دوست تھے۔"

غلام قادر کا نام آتے ہی مکھن خان چونک پڑا۔ شہر کے مضافاتی علاقوں کا وہ بدنام ترین شورہ پشت تھا "تو پھر ابھی کام شروع کر دیتے ہیں ؟" اس نے استفسار طلب لہجے میں کہا۔

"ہاں ہاں" عقرب خان پُرجوش لہجے میں بولا "ابھی اور اسی وقت چلو۔"

اور تھوڑی دیر بعد اس کی کار عقرب خان کی نشاندہی پر طارق کے مکان کے سامنے رک گئی۔ مکھن خان نے انجن بند کر دیا۔ نام کی تختی پڑھ کر مکھن خان کی پیشانی پر تشویش آمیز لکیریں ابھر آئیں۔ پورا شہر واقف ہو یا نہ ہو لیکن وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ طارق کا تعلق کسی بہت طاقتور گروپ سے تھا اور شہر میں چرس سپلائی کرتے کرتے اس نے اچانک اپنی لائن بدل لی تھی. وہ خود تو پسِ پردہ رہ کر ایک اسٹیٹ ایجنسی اور کچھ چھوٹا موٹا کاروبار چلاتا تھا لیکن بعض وفادار اور بعض پرانے دلالوں کے ذریعے ہیروئن شہر میں پھیلانے لگا تھا۔

پھر اچانک ہی اس کے ذہن کی ساری گرہیں کھُلتی چلی گئیں۔

چھاپوں اور مال کی پکڑ دھکڑ کے سلسلے میں اہم ترین نکتہ جسے سارے پرانے پاپی مسلسل نظرانداز کیے جا رہے تھے، یہ تھا کہ چھاپوں میں چرس، افیم اور راکٹ سے لے کر ولایتی شراب تک ہر نشہ پکڑا جا رہا تھا لیکن ہیروئن کی سپلائی کسی خلل کے بغیر برقرار تھی۔

خواہش کے باوجود وہ فوری طور پر طارق کے مکان میں گھسنے کی ہمت نہ کر سکا۔

"کس سوچ میں پڑ گئے ؟ اترو گاڑی سے" اسے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر عقرب خان نے کہا۔

"ابھی نہیں... ذرا سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا ہوگا" مکھن خان نے کہا "اس وقت یہی کافی ہے کہ تم نے مجھے گھر دکھا دیا، اب میں مقرّب خان کے قاتلوں کو گریبان سے پکڑ سکوں گا۔"

"مگر یہ فرض تو میں خود انجام دینا چاہتا ہوں، تم بس اشارہ کر کے دیکھو" نوجوان عقرب خان نے احتجاج کیا۔

مکھن خان نے اگنیشن کی طرف بڑھتا ہوا ہاتھ واپس کھینچ لیا اور عقرب خان کے دفورِ جوش سے تمتماتے ہوئے چہرے پر نظریں جما کر بولا "تم مُصر ہو تو ابھی ابتدا کیے دیتے ہیں۔ تم اندر چلو، میں چند منٹ بعد آتا ہوں۔ کوئی بھی سامنے آئے اور مزاحمت پر آمادہ ہو تو بے دریغ گولی مار دینا۔"

عقرب خان کچھ سمجھے بوجھے بغیر اس مکار کی چال میں آگیا اور سینہ پھلائے ہوئے کار سے اتر گیا۔

مکھن خان زیرِ لب مسکراتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اب وہ بیک وقت عیسٰی خان اور طارق کو بوکھلا کر رکھ دے گا۔ کیونکہ کسی نے بھی عقرب خان کو اس کے ساتھ آتے نا دیکھا ہوگا۔

طارق کے مکان کے قریب سفید کار سے ایک آدمی کو اترتے دیکھ کر خطرناک صورت والے کے ہونٹوں پر سفاکانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

کئی روز سے وہ اپنے نمبر دو کے ساتھ بارہ بارہ گھنٹے بعد ڈیوٹی بدل کر طارق کی لاعلمی میں اس کی نگرانی کر رہا تھا۔ چوبیس گھنٹے ان دونوں میں سے ایک نہ ایک سائے کی طرح طارق کے تعاقب میں لگا رہتا تھا لیکن ابھی تک کوئی قابلِ ذکر بات نوٹ نہیں کی جاسکی تھی۔ بی فور کا خیال تھا کہ طارق بعض حریفوں کی نگاہ میں آجانے کے باعث تنظیم کے لیے خطرناک ہوگیا تھا۔ اس کی جگہ کوئی عام رُکن ہوتا تو کبھی کا راستے سے ہٹا دیا گیا ہوتا۔ کیونکہ دوسروں کی نگاہوں میں آکر مخدوش ہو جانے والے اراکین زخمی اور بیمار گھوڑوں کی طرح گولی مار کر ختم کر دیے جاتے تھے مگر طارق برسوں پُرانا ایک تجربہ کار رُکن تھا۔ اس کی ذات سے پیدا ہونے والے خطرات کی واضح نشاندہی کے بغیر بی فور اس سے محروم ہونا نہیں چاہتا تھا۔ اسی لیے اس کی کُل وقتی نگرانی کا بکھیڑا پھیلایا گیا تھا اور اس وقت خطرناک صورت والا اپنی سُرخ کرولا کے تاریک شیشے چڑھائے، ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ بی فور کے خدشات کبھی بے بنیاد نہیں ہوتے۔

تاریک ونڈ شیلڈ کے اس پار کار سے اترنے والا دراز قامت سایہ لمبے لمبے قدم اٹھاتا پھاٹک کی طرف بڑھ رہا تھا کہ سفید کار کی باڈی میں ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوا اور پھاٹک کی طرف بڑھنے والے نے چونک کر اپنا سر پیچھے گھمایا، شاید سفید کار کا انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز نے اسے بھڑکایا تھا، ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص کا ہاتھ اپنی سمت کی کُھلی ہوئی کھڑکی سے باہر نکلا اور ایک ہولناک دھماکے کے ساتھ گولی دراز قامت کے سر میں پیوست ہوگئی۔ وہ جس انداز میں تیورا کر فٹ پاتھ پر ڈھیر ہوا اسی سے خطرناک صورت والے نے اندازہ لگا لیا کہ فائر کرنے والے کا نشانہ قابلِ رشک تھا۔

اس نے اضطراری طور پر اپنی کار کا انجن اسٹارٹ کیا اور سفید کار کے آگے بڑھ جانے کے بعد خود بھی اس کے پیچھے ہولیا۔ وہ خود بھی کسی پیشہ ور قاتل سے کم نہیں تھا لیکن اپنی نگاہوں کے سامنے کسی دوسرے کے ہاتھوں ایک ... سفاکانہ قتل پر اس کے بدن میں سنسنی سی ... دوڑ گئی تھی ... والے کے ابتدائی پُراعتماد رویے کے بعد سفید کار کے ... ہونے پر اس کا چونکنا اس امر کی دلیل تھا کہ مرنے والا ... شکار ہوا تھا۔ جسے وہ اپنا دوست سمجھ رہا تھا، اس نے ... میں اس پر وار کر ڈالا تھا مگر خطرناک صورت والا ... کہ قاتل نے اس سفاکی کے مظاہرے کے لیے طارق ... مکان کا انتخاب کیوں کیا تھا؟

اگر وہ طارق کو کسی چکر میں پھنسوانا چاہتا تھا تو ... گھر کے قریب دن دہاڑے کسی کو گولی مارنے سے ... کہ رات کی تاریکی اور سناٹے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ... لاش ڈال دی جاتی لیکن سفید کار والے نے اس آسان ... خطرناک طریقے کے بجائے ایسی راہ منتخب کی تھی جس ... کی نشاندہی کے زیادہ امکانات موجود تھے۔ خطرناک صورت ... کافی دیر تک سوچنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ سفید ... نے محض طارق کو دہشت زدہ کرنے کے لیے وہ طریقہ ... اختیار کیا تھا۔ شاید وہ اسے جتانا چاہتا تھا کہ جس آسانی ... نے ایک آدمی کو وہاں گولی مار دی تھی، اسی طرح کسی ... بے خبری میں طارق کے سر کا نشانہ بھی لے سکتا تھا۔

وہ خیالات کی رو میں کھویا رہا، ہوش اس وقت ... بڑی سڑک سے ذیلی گلیوں میں کئی موڑ گھومنے کے ... نے خود کو پھر بڑی سڑک پر پایا۔ مین روڈ پر گھومتے ... کار کی رفتار یک بیک تیز ہوگئی۔ خطرناک صورت والے ... اپنی کار کی رفتار بڑھا دی۔ شاید قاتل کو اپنے تعاقب ... گیا تھا اور اسی کی تصدیق کے لیے تیز رفتاری اختیار کر ... پہلے اس نے بے مقصد کئی گلیوں میں چکر کاٹے تھے۔

شہر کی بھری پُری سڑکوں پر سفید کار کی رفتار ... حد تک تیز تھی اور قاتل بریک اور اسٹیئرنگ ڈھیل ... کا مظاہرہ کرنے پر تُلا ہوا تھا، اس کی پوری کوشش یہی ... تھی کہ تعاقب کرنے والے کو کہیں ٹریفک کے ہجوم ... ہوا چھوڑ کر خود اس مشینی سیلاب میں روپوش ہو جائے لیکن ... کرولا والا بھی دُھن کا پکّا تھا۔ وہ مسلسل سفید کار کے پیچھے ... ایک دو مقامات پر اسے خدشہ ہوا کہ کہیں اس کا شکار ... نگاہوں سے اوجھل نہ ہو جائے تو اس نے سُرخ بتی جلنے ... کے باوجود سگنل پر رُکنے سے گریز کیا اور اگلی کار کے ... ہی رہا۔

اگر سفید کار والا محض ایک مشکوک شخص ہوتا تو خط... والا شاید اس کے تعاقب میں اتنی سرگرمی کا مظاہرہ نہ کرتا ... وہ طے شدہ قاتل تھا اور اپنے جرم کا ثبوت طارق کے بنگلے ... قریب چھوڑ آیا تھا۔ اس کا سراغ کھو دینے کی صورت میں ... کی کڑی باز پُرس سے جان بچنی محال تھی۔

... آخر اگلی کار شہر کے پسماندہ علاقوں کی طرف گھوم گئی۔ بسم اللہ ... اور منگھوپیر کے بعد پُل عبور کر کے وہ پٹھان کالونی کی ... بڑھنے لگی۔ رفتار بڑھانے کا کوئی فائدہ نہ ہونے کے ... اس نے اعتدال کے ساتھ ڈرائیونگ شروع کر دی تھی۔ ... بار خطرناک صورت والے کا دل چاہا کہ اس کے پہلو میں جا کر ... دباتے ہوئے اسے روکنے کی کوشش کرے لیکن وہ اس کے ... میں جانے کی ہمت نہ کر سکا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ مسلح ہے ... اپنے نشانے پر پوری طرح قادر ہے، اگر خود کو گھِرا ہوا محسوس ... خونریزی پر اتر آیا تو وہ اس کی زد میں آنے سے نہ بچ ... سکے گا۔

قصبہ کالونی کے بعد ویران سڑک شروع ہوگئی، اس وقت ... اس بات میں کوئی شبہ نہیں رہا تھا کہ دونوں حریف ایک ... دوسرے کی موجودگی سے باخبر تھے اور اچھی طرح سمجھ چکے تھے کہ ... میں سے جس کا ہاتھ بھاری پڑ گیا، وہ دوسرے کے ساتھ ذرا ... رعایت سے کام نہیں لے گا۔

خطرناک صورت والے کو احساس ہوا کہ قاتل کہیں اسے ... نے کی کوشش نہ کر رہا ہو۔ وہ خود اس قدر کُھل کر سامنے آ... نے کے بعد چوہے بلی کے اس کھیل میں وقت برباد کرنا ... خود سمجھ رہا تھا۔ اسے بی فور کی طرف سے ہر قیمت پر طارق ... حفاظت اور اس کے ممکنہ دشمنوں کی نشاندہی کا حکم ملا تھا۔ اس ... لیے ہر قیمت کا اشارہ معنی خیز تھا اور وہ اچھی طرح جانتا تھا ... اس ہدایت کی روشنی میں وہ اپنے طور پر کیا کچھ کر سکتا ہے۔

اس نے سیٹ کے نیچے سے اپنا بھرا ہوا پستول نکال کر ... گود میں رکھ لیا، دوسری بار وہ نیچے جُھکا تو اس کے ہاتھ میں ... مہلک ہتھیار آگیا جو بھاگنے والے قاتل کا قصہ ہی تمام کر سکتا ... منگھوپیر کے تھانے کے سامنے سے دونوں گاڑیاں آگے ... گزر گئیں اور جب وہ دوسری بار ویرانے میں کچھ دور نکل آئے ... خطرناک صورت والے نے اپنی پوزیشن سے فائدہ اٹھانے کا ... فیصلہ کرتے ہوئے اپنی کار کی رفتار بڑھا دی۔

دونوں کاروں کا درمیانی فاصلہ تیزی سے کم ہونے لگا ... خطرناک صورت والے نے بائیں ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھال کر ... اپنے دائیں میں بھرا ہوا پستول تھام کر ہاتھ کھڑکی سے باہر نکال لیا۔ ... اگلی کار کے اچانک رُکنے کی صورت میں وہ اپنی کار کچے میں اتار لے جانے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔

ضروری حد تک قریب آجانے کے بعد اس نے لحظہ بھر کے لیے رفتار ذرا سست کی اور اگلی کار کے داہنے عقبی ٹائر پر فائر کر دیا۔ پہلی بار نشانہ خطا گیا، اگلی کار کے ڈرائیور نے صورتحال بھانپتے ہی اپنی کار کو سڑک پر لہرانے کے لیے داہنی طرف اسٹیئرنگ کاٹا تو ایک قلیل سے وقفے کے لیے عقبی ٹائر کا زیادہ حصّہ خطرناک صورت والے کے پستول کی زد میں آگیا اور اس بار بارودی دھماکے کے ساتھ فضا ٹائر پھٹنے کی آواز سے گونج اٹھی۔

خطرناک صورت والے نے جلدی سے پستول برابر والی نشست پر ڈال کر دستی بم اٹھایا اور دانتوں سے پن کھینچ کر اگلی کار پر اگلے وار کے لیے تیار ہوگیا۔

اگلی کار کا ایک ٹائر ناکارہ ہوچکا تھا لیکن وہ بدستور سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ خطرناک صورت والا رفتار بڑھا کر اس حد تک اگلی کار کے قریب پہنچ گیا کہ رفتاروں میں ذرا سی بھی تبدیلی کسی بدترین حادثے کا بہانا بن سکتی تھی۔ اگلی کار والے نے عقب نما آئینے میں اسے سر پر سوار دیکھا تو کھڑکی سے بے مقصد دو فائر پیچھے جھونک مارے جو رائیگاں گئے اور خطرناک صورت والے نے اپنی کار پھرتی سے بائیں طرف کچے میں اتارتے ہوئے دستی بم سفید کار پر اچھال دیا۔

خوفناک دھماکے سے لحظہ بھر پہلے ہی وہ اسٹیئرنگ بائیں طرف گھما چکا تھا۔ ورنہ اس کی سُرخ کرولا اس ڈھانچے میں جا گھسی ہوتی جو بم پھٹنے کے بعد وجود میں آیا تھا اور تھوڑی دور گھسٹنے کے بعد بیچ سڑک میں رُک گیا تھا۔

سفید کار پر پھینکا جانے والا بم طاقتور اور شاید آتش گیر تھا کیونکہ آناً فاناً میں سفید کار شعلوں میں گھر گئی تھی۔

خطرناک صورت والا ناہموار کچے میدان میں خاصی دور جا کر اپنی کار پر قابو پانے میں کامیاب ہوسکا۔ وہ احتیاط اور سُست روی سے سڑک کی طرف واپس آیا تو دھڑا دھڑ جلتی ہوئی کار میں شعلوں اور کثیف دھوئیں کے درمیان ایک انسانی ہیولا جانکنی کی جدوجہد میں مبتلا نظر آیا۔ شاید دھماکے سے زخمی ہونے کے باعث قاتل بروقت کار سے نکلنے میں کامیاب نہیں ہوسکا تھا۔

وہ انجن بند کر کے نیچے اتر آیا۔ اس کی نگاہوں میں سفاکانہ سی لاتعلقی رچی ہوئی تھی اور ہونٹوں پر تضحیک آمیز مسکراہٹ تھی۔ اس نے پستول والا ہاتھ بلند کیا اور پھر ایک شعلہ سفید کار میں پھنسے ہوئے بدنصیب قاتل کے سر میں پیوست ہوگیا۔

اگر قاتل نشانے کا پکّا تھا تو وہ خود بھی اناڑی نہیں تھا۔

اپنے شکار کی لاش کو قیمتی چتا میں جلتا چھوڑ کر وہ تیز رفتاری کے ساتھ شہر کی طرف واپس روانہ ہو گیا۔

وہ طارق کے مکان سے خاصی دور ایک محفوظ گلی میں اپنی کار پارک کرنے کے بعد جائے واردات پر پہنچا تو وہاں پولیس کے عملے کے ساتھ تماشائیوں کا ایک جمِ غفیر موجود تھا۔ طارق کے مکان کا پھاٹک کھلا ہوا تھا اور اندر موجود سرکاری گاڑیوں اور وردیوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ طارق کو پولیس افسران نے فوری طور پر شاملِ تفتیش کر لیا تھا۔

فائر کی آواز اور پھر ایک دلدوز چیخ سن کر طارق بے چین ہو گیا۔ آوازیں بہت قریب کی تھیں۔ وہ مٹھیاں بھینچے بے بسی کے عالم میں خوابگاہ میں ٹہلنے لگا۔ ٹہلتے ٹہلتے تکیے کے نیچے سے ریوالور نکال کر اس کے راؤنڈز چیک کیے اور سیفٹی کیچ ہٹا کر ریوالور تھامے پھر اسی انداز میں ٹہلنے لگا۔

اوپر والوں سے اس کا کوئی رابطہ نہیں تھا۔ سارے احکام جہانگیر سے ملتے تھے اور آخری حکم یہ تھا کہ وہ ان تینوں سے دور رہے گا، حتیٰ کہ فون پر بھی ان سے رابطہ قائم نہیں کرے گا، خواہ دنیا ہی اِدھر کی اُدھر کیوں نہ ہو جائے پھر یہ عجیب اتفاق تھا یا اوپر والوں کی کوئی سازش کہ تین دن سے اس کا فون بالکل بے جان پڑا ہوا تھا۔

جہانگیر نے گوشہ نشینی کا حکم دیتے ہوئے اسے یہ ضرور بتایا تھا کہ اس کی دن رات حفاظت کی جائے گی لیکن طارق جب بھی کسی ضرورت کے تحت گھر سے نکلا، اپنے قرب و جوار میں کسی ایسے آدمی کی نشاندہی میں کامیاب نہ ہو سکا جسے اپنا محافظ یا نگراں سمجھ سکتا۔ ویسے مقرب خان والے واقعہ کے بعد سے وہ خود اتنا شر مسار اور خوفزدہ تھا کہ کبھی کبھی گھر کی تنہائی سے بھی اسے ہول آنے لگتے تھے۔ وہ جہانگیر سے اس کے حکم کا سبب دریافت کرنے کی جرأت تو نہ کر سکا لیکن یہ اندازہ ضرور لگا لیا تھا کہ مقرب خان کے بعد بھی معاملہ صاف نہیں ہوا تھا اور باس مقرب خان کے ہمدردوں کو اس کی ذات کے سہارے دوسروں تک رسائی کا ذرا بھی موقع نہیں دینا چاہتا تھا اور طارق خود بھی نادانستگی میں مخالفین کا آلۂ کار نہیں بننا چاہ رہا تھا۔

لیکن وہ فائر کس نے کیا؟ چیخ کس کی تھی؟ کہیں اس کے نادیدہ محافظوں نے تو کسی دشمن کو موت کے گھاٹ نہیں اتار دیا تھا؟ وہ سوچتے سوچتے مضطرب ہو کر خوابگاہ سے باہر نکل آیا اور پھر ڈرائنگ روم کی کھڑکی کا پردہ ہٹاتے ہی اسے اپنے احاطے کی نیچی دیوار کے قریب سرہی سر نظر آئے۔ اس نے فوراً ہی پردہ چھوڑ دیا۔ خوابگاہ میں واپس آ کر ریوالور کا سیفٹی کیچ چڑھایا اور اسے چھپا کر باہر نکلنے کے لیے تیار ہو گیا۔

مرنے والا اس کے پھاٹک سے چند گز دور پختہ فٹ پاتھ پر منہ کے بل پڑا ہوا تھا، اس کے سر سے بہنے والا خون کچھ مقدار میں دور تک پھیل گیا تھا۔ اس نے غور سے متوفی کا جائزہ لیا لیکن اسے پہچاننے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کے کپڑوں پر جا بجا تیل اور گریس کے دھبوں سے ظاہر ہو رہا کہ وہ متمول لوگوں کی اس بستی کا رہنے والا نہیں تھا بلکہ کہیں اور سے وہاں پہنچا تھا۔

وہ لاش کا جائزہ لینے کے بعد سوچ میں ڈوبا اندر لوٹ آیا تھا کہ ہجوم میں پولیس پولیس کا شور بلند ہوا اور وہ برآمدے میں رک کر پولیس کی آمد کا منظر دیکھنے لگا لیکن وہ زیادہ دیر تک تماشائی نہ رہ سکا کیونکہ لاش کا اس کے پھاٹک کے قریب پایا جانا اسے اس واردات میں گواہ بنانے کے لیے کافی تھا۔

لاش اس کے لیے اجنبی تھی اور دوسروں کی طرح اس نے بھی کچھ نہیں دیکھا تھا مگر پھر بھی لاش اٹھائے جانے تک پولیس افسران نے اسی کے مکان میں اپنا عارضی دفتر جما لیا۔ یہ سنسنی خیز خبر ملی کہ مرنے والے کے پاس سے ایک بھرا ہوا ریوالور بھی برآمد ہوا اور تفتیشی افسران کچھ اور اُلجھ گئے۔

مرنے والا یقینی طور پر اس علاقے کا باشندہ نہیں تھا۔ اور میلے ہاتھوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کہیں سے کام کرتے کرتے آیا تھا لیکن وہ کس سواری سے وہاں پہنچا؟ اس کے پاس بھرا ہوا ریوالور کیوں تھا؟ وہ کس کی گولی کا نشانہ بنا؟ قاتل کیسے فرار ہوا؟ اس نے مقتول کے خاتمے کے لیے اسی جگہ کا انتخاب کیوں کیا؟ یہ سوالات ایسے تھے جن کے جوابات کی تلاش... رضا کارانہ پیش قدمی کرنے والوں سے بار بار سوالات کیے گئے... بھی اس بازپرس کی زد میں آتا رہا لیکن اس پُراسرار واردات کے سلسلے میں کسی سے کوئی مدد نہ مل سکی اور لاش اٹھائے جانے کے بعد تیسرے پہر پولیس کا عملہ بھی بے نیل و مرام واپس لوٹ گیا۔

طارق کا ارادہ وہ شام کلب میں گزارنے کا تھا لیکن قتل کی اس دلیرانہ واردات نے اسے اندر سے مضمحل کر دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس کے ستارے ہی گردش میں آ گئے تھے جو اس پر لاشوں کی برسات شروع ہو گئی تھی۔ مقرب خان کی لاش سے پیچھا چھڑائے پورا ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا کہ مقدر نے دوسری لاش چوکھٹ پر لا ڈالی تھی۔ ویسے متوفی کے پاس سے بھرے ہوئے ریوالور کی برآمدگی کی اطلاع ملنے کے بعد اسے خاصی حد تک یقین ہو چلا تھا کہ مقتول کا تعلق مخالفین کے کسی کیمپ...

...ر وہ اسی کے مکان میں گھسنے کی نیت سے آیا تھا کہ باس ...ف سے مامور کیے ہوئے کسی نادیدہ محافظ کی گولی اسے ...گئی۔

ذہنی طور پر وہ اس قدر پراگندہ تھا کہ رات کو خاصی ...ل کوششوں کے بعد سونے میں کامیاب ہو سکا لیکن اسے پوری ...بھرنے کا موقع نہ مل سکا۔ کمرے میں کسی کی موجودگی کا احساس ...اسے جھنجھوڑ اگیا تھا، یہ اسے یاد نہ آ سکا، البتہ آنکھ کھلی تو کمرے ...پر واٹ کے بلب کی مدھم سی روشنی میں ایک جسیم انسانی ...اس کی مسہری کے قریب موجود تھا۔ اچانک طارق کے دل کی ...کنیں تیز ہو گئیں اور خوف کے باعث جسم کے سارے مساموں ...ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ بہہ نکلا۔

"گھبراؤ نہیں، میں تمہارا دوست ہوں۔" اجنبی نے بھاری ...جیسی آواز میں کہا۔ "بستر چھوڑ کر اپنے اوسان درست کرو، ...تم سے کچھ اہم گفتگو کرنی ہے۔" اس کے لب و لہجے اور اطوار ...گہرا اطمینان جھلک رہا تھا جیسے طارق کے کمرے میں گھسنے سے ...اس نے پوری عمارت کا جائزہ لے کر اس کی تنہائی کا اندازہ ...لیا ہو اور اب کسی کی جانب سے دخل اندازی کا کوئی خوف نہ ہو۔

طارق نے بستر سے اٹھتے ہوئے متجسس نگاہوں سے اس کا ...زہ لیا تو یہ دیکھ کر اسے خاصا سکون حاصل ہوا کہ اجنبی کے دونوں ...ہاتھ اس کے پہلوؤں میں جھول رہے تھے۔ اگر وہ کسی بُری ...ت سے اس کی خوابگاہ میں داخل ہوا ہوتا تو اس کے کسی اضطراری ...عمل سے اپنے بچاؤ کے لیے کوئی ہتھیار ضرور سنبھالے ہوتا۔ ...نے مسہری کے سرہانے جھولتا ہوا سوئچ دبا کر خوابگاہ روشن کر دی۔

وہ دراز قامت اور صحتمند آدمی تھا جس کی آنکھوں میں اس ...ت خوابناک اُداسی نے ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ اس کا چہرہ ...درجہ خوفناک اور کئی جگہ سے کٹا پھٹا ہوا تھا۔ بدن پر خاکی پتلون ...اسی رنگ کی ستی سی جیکٹ چڑھی ہوئی تھی۔ مجموعی طور پر ...طارق کو کوئی اچھا آدمی نظر نہیں آیا۔ اس کا ذہن فوری طور پر ...اپنے پھاٹک سے باہر پیش آنے والی قتل کی دلیرانہ واردات کی ...طرف بھٹک گیا۔ اس نے سوچا کہ اگر اس کی حفاظت کے لیے کسی ...ایک آدمی کو مامور کیا گیا ہوتا تو شاید وہ اتنی بے خوفی سے مشتبہ ...آدمی کو گولی کا نشانہ نہ بنا پاتا اور وہ فٹ پاتھ پر دم توڑنے کے ...بجائے ریوالور بدست طارق تک پہنچ گیا ہوتا۔ اسے بے اختیار ...اس بدمعاش نما آدمی کی ذات میں اپنائیت سی محسوس ہونے لگی۔

"تم بیٹھو، میں ذرا منہ پر پانی کے دو چھینٹے مار کر آتا ہوں۔" طارق ...نے بستر سے اترتے ہوئے کہا اور خود ملحقہ باتھ روم میں گھس گیا۔ چند لمحوں بعد وہ تولیے سے منہ پونچھتا ہوا باتھ روم سے باہر نکلا تو یہ دیکھتے ہی ٹھٹک کر رہ گیا کہ اجنبی آرام سے ایک کرسی پر بیٹھا اس کا پستول اپنے ہاتھوں میں نچا رہا تھا۔ طارق کو اپنی حماقت پر افسوس ہونے لگا کہ وہ تکیے کے نیچے سے پستول نکالے بغیر کیوں وہاں سے ہلا لیکن اگلے ہی لمحے اجنبی نے اس کے ذہن سے تفکرات صاف کر دیے۔ "یہ بُری بات ہے کہ تم نے میری بات پر آنکھیں بند کر کے اعتماد کر لیا، میری جگہ کوئی دشمن ہوتا تو اس وقت آسانی کے ساتھ تمہیں تمہارے ہی پستول کا نشانہ بنا سکتا تھا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے بیٹھے بیٹھے پستول طارق کی طرف بڑھا دیا۔

طارق نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے پستول اس سے لے لیا اور مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "دوستی اور دشمنی چہرے پر نظر آ جاتی ہے لیکن میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ تم کس حوالے سے میرے دوست کہے جا سکتے ہو؟"

"جسے تم جوابدہ ہو، وہی میرا بھی باس ہے۔" خطرناک صورت والے کے خدوخال میں گمبھیر سی سنجیدگی رچی ہوئی تھی جیسے وہ برسوں سے ہنسنے کی صلاحیت سے محروم ہو۔

"جہانگیر نے بھیجا ہے تمہیں؟" طارق نے متجسس لہجے میں سوال کیا۔

"تم اسے کسی نام سے بھی پکارو، باس صرف باس ہوتا ہے۔" خطرناک صورت والے نے سپاٹ لہجے میں مبہم سا جواب دیا۔ "فی الحال اعتماد کی فضا قائم کرنے کے لیے یہی کافی ہے کہ میں نے تمہاری غفلت کے نتیجے میں ہاتھ آیا ہوا بھرا ہوا پستول تمہیں لوٹا دیا ہے۔ بیٹھ جاؤ اور سوچ کر میرے سوالات کے جواب دو۔" طارق کرسی کھینچ کر اس کے مقابل بیٹھ گیا تو اس نے کام کی بات چھیڑ دی۔ "قتل کی واردات کے بارے میں تمہارے ساتھ پولیس کا رویہ کیسا تھا؟"

"سرسری انداز میں پوچھ گچھ کی گئی تھی۔ بس ایک سوال ذرا ٹیڑھا تھا کہ قاتل نے مقتول کو مارنے کے لیے اسی جگہ کا انتخاب کیوں کیا؟ لیکن کسی کے بھی پاس اس کا جواب نہیں تھا۔ وہ کہیں بھی مارا جاتا، یہ سوال ضرور پیدا ہوتا۔ اسی لیے میں نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی۔"

"لاش تو دیکھی ہو گی تم نے؟ مرنے والا کون تھا؟" اجنبی کی سرد اور اُداس آنکھیں مسلسل طارق کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

"میرے لیے اجنبی تھا۔" طارق نے اپنی کرسی میں پہلو بدلتے ہوئے جواب دیا۔ "لیکن تمہاری نگاہوں کی داد نہ دینا زیادتی ہو گی کہ تم نے اس کے اندر داخل ہونے سے پہلے ہی اس کے عزائم بھانپ کر اس کا پتا صاف کر دیا، اس کے پاس سے بھرا ہوا ریوالور برآمد ہوا تھا۔"

"عیسیٰ خان کے آدمی تمہارے پیچھے کیوں لگے تھے؟" وہ کسی سانپ کی طرح پلکیں جھپکائے بغیر اسے دیکھے جا رہا تھا۔

"شاید غلام قادر پر ہاتھ ڈالنے کے چکر میں میری طرف متوجہ ہوئے ہوں۔" تھوڑے سے تذبذب کے بعد طارق نے جواب دیا۔" میں بازار سے ملنے والی خبروں پر غور کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں۔ سُنا ہے کہ غلام قادر سے عیسیٰ خان کی کچھ ٹھن گئی ہے۔"

"غلام قادر سے تمھارا کیا تعلق ہے؟" اجنبی نے سوال کیا۔

"وہ میرا پُرانا دوست ہے۔" طارق نے کہا۔" کبھی کبھار ہم کارڈز کھیلنے کے لیے جمع ہوتے رہتے تھے۔"

"غلام قادر آج کل کیا کر رہا ہے؟" اجنبی نے ایک گہرا سانس لے کر سوال کیا۔

"یہ نہیں معلوم۔" طارق نے صاف دلی سے اعتراف کر لیا۔" ایک دوسرے کے کام کاج کے بارے میں ہم زیادہ بات نہیں کرتے، ویسے ان دنوں وہ خاصا خوشحال نظر آتا ہے۔"

"تم جو کچھ کر رہے ہو، اس کے پیشِ نظر یہ لاعلمی عجیب سی معلوم ہوتی ہے۔" اجنبی کرسی سے اٹھ گیا۔" غلام قادر آج کل ہیروئن بیچ رہا ہے۔"

"نہیں۔" تحیّر اور بے یقینی کے عالم میں طارق اُچھل پڑا۔ کون سا علاقہ تھا اس کے پاس؟"

"ضروری نہیں کہ شہر کا ہر شخص کسی نہ کسی علاقے میں محدود ہو۔" اجنبی نے ٹہلتے ہوئے کہا۔" میں بس اتنا جانتا ہوں کہ وہ ہماری سیلز فورس کا آدمی ہے، تم سے نہ سہی کسی اور بڑے سے اس کا رابطہ ہوگا۔ میرا تعلق تنظیم کے انتظامی شعبے سے ہے، ہم سیلز فورس کو پسِ پردہ تحفظ فراہم کرنے کے ذمّے دار ہیں۔ مختلف مواقع پر بارہا تمھاری نگرانی کی گئی۔ محض یہ دیکھنے کے لیے کہ کوئی تمھاری راہ پر نہ لگا ہوا ہو۔ یہ بدقسمتی رہی کہ ایسے کسی بھی موقع پر تمھیں اور غلام قادر کو یکجا نہیں دیکھا گیا ورنہ بروقت تمھیں اس سے دور رہنے کی ہدایت مل جاتی۔"

اجنبی کی گفتگو سن کر طارق کو اپنی اہمیت کا احساس ہونے لگا۔ جب سے اس نے جہانگیر، ڈینی اور نادر کے ساتھ مل کر کسی پُراسرار شخص کے لیے کام شروع کیا تھا، اس کا واسطہ ابتدا میں ڈینی اور پھر جہانگیر تک محدود رہا تھا۔ انھیں کس سے اور کس طرح ہدایات ملتی تھیں، یہ اسے معلوم نہیں تھا لیکن اب پہلی بار تنظیم کا ایک اہم آدمی کُھل کر اس کے سامنے آیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ پُراسرار باس اپنے لیے کام کرنے والوں سے کبھی بھی غافل نہیں رہا تھا۔ اپنے ہر آدمی کی انفرادی کارگزاری سے بھی باخبر رہتا تھا۔ عیسیٰ خان کے آدمیوں سے چپقلش کے اس نازک دور میں اجنبی کا لیول ا... ک اس سے آملنا اسے بے حد اہم محسوس ہو رہا تھا۔

اس کے ذہن میں ایک موہوم سا خیال یہ بھی اُبھرا تھا ک[illegible] کی ذمّے داریوں میں کچھ اضافہ کیا جانے والا ہے۔ ورنہ ا[illegible] باتوں سے اسے باخبر کرنا کیا معنی رکھتا تھا۔

"میں خود ہمیشہ محتاط رہا ہوں۔" طارق نے متاسفانہ کہا۔" سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا ہو گیا؟"

"صرف ذرا سی بے احتیاطی۔" اس نے ٹہلتے ٹہلتے [illegible] رواروی میں طارق کی گود میں پڑا ہوا پستول اٹھا لیا اور ا[illegible] کھیلتے ہوئے بولا۔" جب آدمی کسی بڑے چکر میں پڑتا [illegible] اصول یہ ہوتا ہے کہ قانون شکن دھندے کرنے والے مو[illegible] لوگوں سے دور رہے، صرف ان ہی سے رابطہ برقرار رکھ[illegible] جن کے بغیر اپنا کام چلنا دشوار ہو۔" وہ ٹہلتے ٹہلتے رُک کر [illegible] طرف مُڑ گیا اور زندگی سے عاری سپاٹ لہجے میں بولا۔" [illegible] شاید یہ بنیادی اصول یاد نہیں رہا، پہلے مقرب خان مارا [illegible] آج کا ہنگامہ کھڑا ہو گیا، نجانے اس کا کیا انجام ہو کیونکہ [illegible] کے سامنے تمھاری ذات موجود ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ تمھارے [illegible] کسی نہ کسی پر ہاتھ ڈالنے میں کامیابی ضرور حاصل ہو جائے [illegible]

طارق کے وجود میں سنسنی خیز بے چینی انگڑائیاں لینے لگی۔ [illegible] گفتگو معنی خیز رُخ اختیار کرتی جا رہی تھی۔ اس کے اخذ ک[illegible] نتائج صاف اور سادہ تھے جن کا مقصد تھا کہ فی الوقت [illegible] کی ذات تنظیم کے رازدارانہ وجود کے لیے خطرہ بن گئی تھی۔

"مجھے احساس ہے۔" وہ اپنے لبوں پر زبان پھیرتے بولا۔" اس صورتحال کے ازالے کے لیے میں سب کچھ کر[illegible] تیار ہوں۔"

"گڈ۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔" ہم سب ایک [illegible] کل پرزے ہیں، تنظیم کا وجود ہمارے ذاتی وقار اور پسند نا[illegible] سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ عام حالات ہوتے تو میں اپنی تجاویز [illegible] کو باخبر کرتا اور تمھیں اسی ذریعے سے ہدایات ملتیں جے [illegible] جوابدہ ہو لیکن موجودہ صورتحال بہت نازک ہے لہٰذا میں [illegible] اگلے احکام ملنے تک روپوشی اختیار کرنے کا حکم دیتا ہوں، [illegible] منظرِ عام سے غائب ہو جانے پر شاید تصادم تھم جائے [illegible]

"میں فوراً اس پر عمل کرنے کے لیے تیار ہوں۔" طا[رق] نے اس کے خاموش ہوتے ہی کہا۔

"دشمنوں کے اپنے وسائل بھی خاصے مضبوط معلوم ہو[تے ہیں] شہر میں رہتے ہوئے شاید تم خود کو ان سے محفوظ نہ رکھ سکو [illegible] نے کہا۔" بہتر یہی ہوگا کہ تم کچھ عرصے کے لیے یہ شہر ہی چھو[ڑ دو] اور اندرونِ ملک کسی غیر معروف مقام پر روپوش ہو جاؤ [illegible]

"یہ طریقہ سب سے بہتر رہے گا۔" اپنے انجام سے [illegible]

[ط]ارق نے اس کی رائے سے تائید کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن تمھارا امکان ان کی نگاہ میں ہے، تمھاری عدم موجودگی [میں] وہ یہاں کا چپّہ چپّہ چھان ماریں گے اس لیے بہتر ہوگا کہ تم [ایس]ا ہر سراغ ضائع کر دو جو تنظیم کے کسی رُکن سے تمھارے تعلق [پ]ر ذرا بھی روشنی ڈال سکے۔" خطرناک صورت والے نے تجویز [پی]ش کی۔

"تم بے فکر رہو، میں ہر سراغ مٹا دوں گا۔"

"ابھی، فوراً کام شروع کر دو، میں چاہتا ہوں کہ رات کے [ا]ن حصّے سے فائدہ اٹھایا جائے، تم جہاں چاہو گے، میں تمھیں [پ]ہنچا دوں گا۔"

طارق اٹھ گیا۔ خطرناک صورت والا درست ہی کہہ رہا تھا۔ [ا]پنی گاڑی میں وہ کہیں بھی پہچانا جا سکتا تھا۔ بہتر ہوتا کہ وہ [فو]ری طور پر خطرناک صورت والے کی پیشکش قبول کرتے ہوئے [ا]پنا مکان چھوڑ دیتا۔

طارق کے پاس کوئی بہت زیادہ بکھیڑا نہیں تھا۔ چند [ر]قعے، رقم اور مال کے لین دین کا حساب اور ٹیلی فون ڈائری میں [ل]کھے ہوئے اہم نمبروں کے علاوہ وہاں کچھ اور نہ مل سکا۔ طارق نے سارے کاغذات یکجا کر کے نذرِ آتش کیے اور راکھ نالی میں بہا [د]ی۔ اس کام سے نمٹ کر طارق لباس تبدیل کرنے کی نیّت سے [خ]وابگاہ میں کپڑوں کی الماری کی طرف مُڑا تو اچانک خطرناک صورت والے نے طارق کے بھرے ہوئے پستول کی نال اس کی داہنی کنپٹی سے لگا دی۔

"واپس مسہری پر چلو۔" اس کی آواز سرد اور سپاٹ تھی۔

طارق نے بوکھلائے ہوئے انداز میں اس کی طرف دیکھا اور پھنسی پھنسی آواز میں بولا۔" مذاق میں وقت ضائع نہ کرو... م... مجھے تیار ہونے دو۔" لیکن خطرناک صورت والے کی ویران اور بے رحم آنکھوں میں تیرتی ہوئی سفاکی سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ پوری طرح سنجیدہ تھا۔

"جو کہہ رہا ہوں، وہ کرو۔" اس نے طارق کی کنپٹی پر پستول کی نال کا دباؤ بڑھاتے ہوئے کہا۔" تنظیم کافی دن تک تمھارا مذاق برداشت کرتی رہی لیکن تم نے اپنی مسلسل غیر ذمّے داریوں سے اس کی بقا داؤ پر لگا دی... اب حساب کا وقت آگیا ہے۔"

"تم کیا چاہ رہے ہو؟" طارق بُری طرح بوکھلا گیا۔ اب اسے اپنی حماقتوں پر افسوس ہو رہا تھا۔ خطرناک صورت والا نہایت مکّار آدمی تھا اور شروع سے اس نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہر قدم اٹھایا تھا۔ پہلے طارق کا بھرا ہوا پستول اسے لوٹا کر اس کا اعتماد حاصل کیا اور جب صورتحال اس کی مرضی کے مطابق ڈھل گئی تو اس نے سرسری انداز میں ایک بار پھر طارق کو نہتا کر دیا اور اب ہر سراغ مٹوانے کے بعد وہ طارق کی جان کے درپے ہو گیا تھا۔

"بستر پر چلو، پھر بتاتا ہوں۔" اجنبی نے بھیانک لہجے میں کہا۔ شاید طارق کی مزاحمت اسے بُری طرح کِھل رہی تھی۔

موت کے چُنگل میں آتے ہوئے کسی بے بس انسان کی طرح طارق کا ذہن تیزی سے کام کرنے لگا تھا۔ اجنبی نے اس سے جو کچھ کہا وہ درست ہی تھا۔ طارق کے ذریعے تنظیم ایک بڑے خطرے سے دوچار ہو سکتی تھی جس کا علاج طارق کی روپوشی میں مضمر تھا لیکن اجنبی کچے کاموں کا عادی نہیں معلوم ہوتا تھا۔ وہ طارق کو ہمیشہ کے لیے راستے سے ہٹانے پر تُلا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں طارق کا بھرا ہوا پستول تھا اور طارق اپنی خوابگاہ میں موجود تھا اگر اجنبی اس کی کنپٹی میں گولی مار کر پستول اس کے ہاتھ میں تھما دیتا تو اس کے قتل کو بآسانی خودکشی کا رنگ دیا جا سکتا تھا۔

ہر حلقے میں یہی سمجھا جاتا کہ طارق مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث تھا اور اپنے پھاٹک پر ایک قتل کے بعد اسے پولیس کے متوجہ ہونے کا خوف لاحق ہوا تو ضمیر کی خلش یا انجام کی دہشت سے بوکھلا کر اس نے خودکشی کر لی پھر اگر مرنا ہی تھا تو وہ کسی خوفزدہ چوہے کی طرح اپنے قاتل کے اشاروں پر کیوں چلے؟ وہ اس سے توانا ضرور تھا لیکن ستارے یاوری کر جاتے تو بازی اس کے حق میں بھی پلٹ سکتی تھی۔

مایوسانہ انداز میں مسہری کی طرف چھوٹے چھوٹے دو قدم اٹھاتے ہی طارق بجلی کی سی سُرعت سے پلٹا اور کسی جونک کی طرح اجنبی سے لپٹ کر اس کے بھیانک چہرے پر وحشیانہ انداز میں ٹکریں مارنے کی کوشش کرنے لگا۔ اجنبی طارق کے مقابلے میں کسی بھینسے کی طرح مضبوط اور طاقتور ضرور تھا لیکن اس کے شدید ردِعمل کے لیے تیار نہیں تھا لہٰذا طارق اپنی پہلی کوشش میں اسے دھکیلتا ہوا دیوار تک لیتا چلا گیا۔ اس اثنا میں طارق کی کئی ٹکریں اس کے چہرے پر بھی پڑیں اور وہ کسی مغلوب الغضب بھیڑیے کی طرح غرّا کر رہ گیا۔ اس نے اپنا پستول والا داہنا ہاتھ سر سے اوپر اٹھایا ہوا تھا تاکہ طارق کو پستول پر ہاتھ ڈالنے کا موقع نہ مل سکے۔

اجنبی کے قدم اکھاڑ دینے میں کامیابی پر طارق کا دل شیر ہو گیا تھا۔ لہٰذا جب اس کے شکار کی پشت دیوار سے ٹکرائی تو طارق نے اس کے بدن کو اپنی گرفت سے آزاد کر کے پھرتی کے ساتھ اس کی پنڈلیاں تھامنے کی کوشش کی تاکہ ٹانگیں گھسیٹ کر اپنے حریف کو سر کے بل فرش پر گرا سکے لیکن نیچے جھکتے ہی اس کے سر پر قیامت سی ٹوٹ پڑی۔ اجنبی نے خاصی قوّت کے ساتھ پستول کا آہنی دستہ اس کے سر پر رسید کیا اور وہ اس کی ٹانگیں پکڑنے

کی حسرت دل میں لیے خود ہی فرش پر اوندھا ہوگیا پھر اس کی پیشانی پر وزنی جوتے کی شدید ٹھوکر نے طارق کا دماغ ہلا کر رکھ دیا۔ اس کے حریف نے بے رحمی کے ساتھ ایک ٹانگ پکڑ کر اسے واپس مسہری کی طرف گھسیٹا اور خود کو بے بس پا کر طارق نے اچانک ہی پوری قوت سے مدد کے لیے چلانا شروع کر دیا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ اب بیرونی مداخلت کے بغیر وہ اجنبی دشمن کے چنگل سے آزاد نہ ہو سکے گا۔

طارق کی چیخوں کا خطرناک صورت والے پر فوری ردِعمل ہوا اور طارق کی تیسری چیخ بلند ہونے سے پہلے اس نے طارق کی داہنی کنپٹی میں اسی کے پستول سے پگھلا ہوا سیسہ اتار دیا اور پھر پستول وہیں لاش کے قریب پھینک کر تیزی سے نکاسی کے راستے کی طرف ہو لیا۔

جہانگیر جب تک اکیلا تھا، بہت بے خوف اور چالاک آدمی تھا لیکن وہ محسوس کر رہا تھا کہ شادی کے بعد اس نے اپنی ذات کو ایک نادیدہ خول میں سمیٹ لیا تھا جس سے باہر کی دنیا اسے بھیانک اور ڈراؤنی نظر آنے لگی تھی۔ حالانکہ وہ برسوں اسی ماحول میں ڈنکے کی چوٹ پر پیسہ کماتا رہا تھا۔

پچھلے چند دنوں سے شہر میں پے در پے رونما ہونے والے واقعات نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے نادانستگی میں وہ ایسی آگ لگا بیٹھا ہو جس کے شعلوں سے اپنا دامن بچانا بھی مشکل ہوتا نظر آ رہا تھا۔

مخبری پر انعامات کی اسکیم توقع سے بڑھ کر کامیاب رہی تھی۔ شہر میں ایک ہفتے کے دوران اتنے بڑے پیمانے پر منشیات پکڑی گئی تھیں کہ پچھلی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی تھی۔ شہر کے بدنام حلقوں میں ہر طرف صفِ ماتم بچھی ہوئی تھی پھر جب اسے منشیات فروشوں کے اجتماع کی خبر ملی تو وہ فکر مند ہو گیا۔ اس کے دل میں چور تھا اور اسے شبہ تھا کہ وہ لوگ مل بیٹھتے ہی اس نتیجے پر پہنچ جائیں گے کہ شہر میں ہر نشہ آور چیز کی بڑی بڑی کھیپیں پکڑی جا رہی تھیں لیکن ہیروئن کا کوئی کیس سامنے نہیں آیا تھا۔

ان میں ایک سے ایک بدنام مجرم شامل تھا۔ مکھن خان سے عبداللہ تک کئی ایسے بڑے منشیات فروش تھے جن کے ہاتھ کئی کئی انسانوں کے خون سے آلودہ تھے لیکن کسی نہ کسی وجہ سے وہ آزادی سے دندناتے پھر رہے تھے۔ اگر ان کو شبہ ہو جاتا کہ جرائم کی دنیا میں رائج اخلاقیات سے انحراف کرتے ہوئے ہیروئن فروش اپنے مال کی مارکیٹ بڑھانے کے لیے دوسروں کے خلاف مخبری جیسا اوچھا اور گھٹیا ہتھیار استعمال کر [رہا ہے] تو وہ اس کے خون کے پیاسے ہو جاتے۔

شہر کے ہیروئن فروشوں کا سرغنہ وہ خود تھا کم [لوگوں کو] معلوم تھا کہ وہ کس کو جواب دہ ہے۔ دوسروں کا تو ذکر [کیا] خود بھی بی فور اور ڈی ون سے لاعلم تھا۔ محض ان کے [احکامات] بجا لانے پر مامور تھا۔ یہ درست تھا کہ وہ خود پس [پردہ] تھا لیکن مال لانے، لے جانے والے کارندوں کو اچھی طرح [معلوم تھا] کہ وہ جہانگیر سیٹھ کے لیے کام کر رہے ہیں۔ پھر جس طرح [وہ] اُن پر اعتماد کرتا تھا اسی طرح ان چھوٹے بڑے دلالوں [کے] اپنے حلقے تھے، جہاں وہ اپنے دل کا بہت سا بوجھ ہلکا [کرتے تھے]۔ یوں ہیروئن فروشی میں جہانگیر کی سربراہی شہر کے باخبر افراد کے لیے ایک کھلا راز تھی۔

جب تک جہانگیر نے اپنے آدمیوں اور سرکا[ری اہلکاروں] کی ملی بھگت سے دوسروں کے گریبانوں پر ہاتھ نہیں [ڈالا تھا، وہ] پوری طرح مطمئن تھا کہ شہر میں کوئی اس کے خلاف سر نہیں [اٹھائے] گا لیکن بی فور کی طرف سے دوسروں کی مخبری کے حکم [کے بعد] حالات بہت تیزی سے بدلے تھے اور جہانگیر کو دن ر[ات یہ] امکان نظر آنے لگا تھا کہ چھاپوں کی لہر میں لاکھوں گنوا[نے والے] معاملے کی تہ تک پہنچے بغیر چین سے نہیں بیٹھیں گے او[ر ان میں] سے کوئی دِل جلا اچانک ہی اسے آ دبوچے گا۔

ان وسوسوں کا توڑ کرنے کے لیے پہلے جہانگیر [نے] دو مسلح پہرے داروں کا اضافہ کیا جو صرف رات میں اپ[نی ڈیوٹی] دیتے تھے پھر ان کی سہولت کے لیے احاطے کی دیوار[وں پر لگی] ہوئی ناکارہ روشنیوں کے بوسیدہ تار بدلوائے گئے اور عما[رت کے] چاروں طرف، رات بھر روشنیاں جگمگانے لگیں۔ اس پر ب[ھی تسلی نہ] ہوئی تو اس نے ایک تجربہ کار ٹرینر کی خدمات کے ساتھ [اعلیٰ] نسل کے دو خونخوار کتے گھر کی رکھوالی کے لیے خرید لیے۔

اس کی بیوی سلمٰی اپنے شوہر کی ان حرکات پر خا[صی الجھن] میں مبتلا ہو گئی تھی۔ اس کی شکایات کے نتیجے میں جہانگ[یر کے] معمولات میں توازن پیدا ہو گیا تھا۔ وہ باقاعدہ خاصا وقت [اپنی] بیوی کے ساتھ گزارنے لگا تھا۔ وقت ناوقت آنے والی فون کالز کا سلسلہ بھی یکلخت موقوف ہو گیا تھا لیکن د[و دن] بعد ہی جہانگیر اچانک حفاظتی انتظامات میں اضافے کے [خبط میں] مبتلا ہو گیا۔

جب تک معاملہ مسلح پہرے داروں اور احاطے کی [روشنیوں] تک محدود رہا، وہ خاموشی سے اپنے شوہر کی حرکات کو [برداشت] کرتی رہی مگر اس نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ جہانگیر خاصا فکر[مند] [تھا] پھر جب گھر میں خوفناک جرمن شیفرڈ کتے لائے گئے [اور] شام ہی لان پر ان کا راج ہو گیا تو وہ خاموش نہ رہ سکی۔

"[آخر] یہ کیا ہو رہا ہے؟ کس سے خطرہ ہے تمھیں، جواب یہ [خونخوار] کتے لے آئے ہو؟" اس نے چڑچڑے لہجے میں پوچھا تھا۔

"[ک]چھ لوگ میرے دشمن ہو گئے ہیں۔" جہانگیر نے گلاس سے [مشروب] کا ایک لمبا گھونٹ لیتے ہوئے فکر مندانہ لہجے میں کہا۔ "میں [ان پ]ر واضح کرنا چاہتا ہوں کہ میں بھی چوکنا ہوں۔"

"تم پولیس سے مدد کیوں نہیں لیتے؟ گھر کو تماشا بنانے [ک]ی ضرورت ہے؟ احاطے میں رات بھر چراغاں دیکھ کر پاس [پڑوس] کے لوگ کیا سوچتے ہوں گے؟"

سلمٰی کی بات معقول تھی، اس سے فوراً کوئی جواب نہ بن [پڑا] مگر وہ خاموش رہ کر سلمٰی کی حوصلہ افزائی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ [اس نے] پھر گلاس منہ سے لگا لیا۔ آتش بداماں لاوے نے معدے [میں] پہنچتے ہی اس کا دماغ منوّر کر دیا اور اسے ایک معقول جواب [سو]جھ گیا۔ "یہ میں بھی جانتا ہوں ڈارلنگ! لیکن پولیس بے نام [دشمنو]ں کا پیچھا نہیں کرتی۔ انھیں میں کس کا نام دوں گا۔ جب کہ [میں] خود اپنے دشمنوں سے لاعلم ہوں۔"

"تو تمھیں ان کے وجود کا علم کیسے ہوا؟" سلمٰی کی باز پرس [بڑی] منطقی ہوا کرتی تھی۔

"گمنام فون کالز پر گالیاں اور قتل کی دھمکیاں دی جاتی [ہیں]۔" وہ شراب کے سہارے ہمیشہ بہت خوبصورت جھوٹ بول [لیتا] تھا۔ "یہاں تک کہا گیا ہے کہ میں نے پولیس سے مدد لینے کی [کوش]ش کی تو وہ میری زندگی کا آخری دن ثابت ہو گا۔"

"ان دھمکیوں کی بنیاد پر پولیس کارروائی کر سکتی ہے۔" سلمٰی [نے] اصرار کیا۔

جہانگیر یوں ہنس دیا جیسے سلمٰی نے کوئی احمقانہ بات کہہ [دی] ہو۔ "تم اپنے ننھے سے ذہن کو ہلکان نہ کرو، اپنے معاملات میں [خود] سنبھالوں گا۔ پولیس زیادہ سے زیادہ ایک آدھ سنتری لگا دے [گی جو] رات بھر گیٹ پر بیٹھا اونگھتا رہے گا اور آنے والا کوئی [بھی دیو]ار پھاند کر اندر گھس آئے گا۔ میں انھیں اشتعال دلانے کے [بج]ائے صرف یہ احساس دلانا چاہتا ہوں کہ میں اپنے طور پر بھی [ان ک]ے مقابلے کا اہل ہوں۔ یہ خوف ہی انھیں مجھ سے دور [رک]ھ سکتا ہے۔"

جہانگیر کی کھینچی ہوئی تصویر اتنی خوف آور تھی کہ سلمٰی نے [سہ]م کر بحث ترک کر دی۔

بیوی کی طرف سے اسے زیادہ الجھن نہیں تھی۔ پریشانی [تو اس] بات کی تھی کہ ان گمبھیر حالات میں وہ بالکل تنہا رہ گیا تھا۔ بی فور یا ڈی ون پر اپنے خدشات ظاہر کر کے بزدلی کا خطاب نہیں لینا چاہتا تھا۔ طارق پہلے ہی کچھ لوگوں کی نگاہوں میں آیا ہوا تھا۔ اس سے میل جول میں اس قدر احتیاط برتی جا رہی تھی کہ کھمبے سے اس کے گھر جانے والے ٹیلیفون کے تار کٹوا دیے گئے تھے۔ تاکہ اضطرار کے عالم میں کہیں وہ اسے فون ہی نہ کر بیٹھے۔ ڈینی ایسے موقع پر اپنی سدابہار کھوپڑی سے کئی اچھی تجاویز برآمد کر سکتا تھا لیکن اس سے رابطے کی بھی ممانعت تھی۔ لے دے کر بس نادر خان رہ گیا تھا جو مال ٹھکانے لگانے میں ماہر تھا لیکن ذہنی مشقت سے جی چراتا تھا۔

پھر جب جہانگیر کو منشیات فروشوں کے اجتماع کی ناکامی کی خبر ملی تو ذرا اس کی جان میں جان آئی۔ اسی دوران نادر خان سے یہ شکایت بھی موصول ہوئی کہ طارق روڈ پر اس کے آدمیوں کے علاقے میں ایک پڑھا لکھا لڑکا ہیروئن بیچنے لگا تھا۔ جسے مار پیٹ کر وہاں سے بھگا دیا گیا تھا۔ اس کا ذہن فوری طور پر طارق کی طرف مبذول ہوا جس نے یونیورسٹی میں کوئی شکار پھانسا تھا لیکن اس سے رابطے کی پابندی کی وجہ سے باز پرس ناممکن ہو کر رہ گئی تھی۔

واقعات کا تسلسل دن بدن بدترین رُخ اختیار کرتا جا رہا تھا۔ پچھلے دن اخبارات میں عقرب خان کی موت کی خبر آئی۔ اسے طارق کے گھر کے عین سامنے فٹ پاتھ پر گولی ماری گئی تھی۔ وہ عیسٰی خان کے یہاں کلینر کے طور پر ملازم تھا اور اخبارات کے مطابق اس کے بڑے بھائی مقرب خان کی لاش چند روز قبل گلبائی کے علاقے میں اس کی اپنی کار کے عقبی پائیدان سے ملی تھی مگر جہانگیر اچھی طرح واقف تھا کہ عقرب خان اگر طارق کے گھر سے باہر مارا گیا تھا تو مقرب خان کو طارق کے گھر کے احاطے میں ہلاک کیا گیا تھا۔ وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکا کہ عقرب خان اپنے بھائی کا انتقام لینے کے لیے بھرے ہوئے ریوالور سمیت وہاں پہنچا تھا یا عیسٰی خان اپنے معتمدِ خاص کے قتل کے انتقام پر تُلا ہوا تھا۔ صورتحال جو بھی رہی ہو، اس کے نتیجے میں باس کی ہدایت کا جواز خاصا مضبوط نظر آتا تھا کہ طارق کی ذات ان دنوں مخدوش ہو گئی تھی اور اس سے رابطہ رکھنے کی صورت میں بقیہ لوگوں کی بھی گردن پھنسنے کے خاصے قوی امکانات موجود تھے۔

اخبار کے آخری صفحے پر تین کالمی سُرخی میں منشیات کی دنیا کی بے تاج بادشاہ مکھن خان کی موت کی سنسنی خیز خبر تھی۔ اس کی موت سر میں پیوست ہونے والی، بڑے بور کے پستول کی گولی سے واقع ہوئی تھی لیکن نامعلوم قاتل یا قاتلوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا تھا بلکہ مکھن خان کی کار پر طاقتور آتش گیر بم مار کر،

اسے لاش سمیت نذرِ آتش کر دیا تھا۔ اخباری قیاسات میں مکھن خان کے قتل کی واردات کو منشیات کے ناجائز کاروبار میں جنم لینے والی رقابتوں کا شاخسانہ قرار دیا گیا تھا۔ ایک رائے یہ بھی تھی کہ منشیات کے خلاف آبکاری اور پولیس کے محکموں کی مہم کے نتیجے میں منشیات فروشوں میں باہمی تصادم کا آغاز ہو گیا تھا۔

منشیات کے خلاف جہانگیر کے آدمیوں کی پے در پے مخبری نے حکام کو اپنے تازہ چھاپوں کو مہم کا روپ دینے پر مجبور کر دیا تھا۔ ان ذرائع نے مہم کے حوالے سے جرائم پیشہ افراد میں مستقبل میں مزید خونریزیوں کی بھی نشاندہی کی تھی۔

اس پس منظر میں جب جہانگیر نے تازہ اخبار کے پہلے صفحے پر طارق کے سفاکانہ قتل کی خبر دیکھی تو لرز کر رہ گیا۔ پچھلی تین وارداتوں کی طرح اس بار بھی قاتل لاپتا تھا۔ رات گئے اس علاقے کے بعض رہنے والوں نے کسی کو دو مرتبہ کربناک آواز میں مدد کے لیے چلاتے سنا تھا لیکن پھر وہ آوازیں معدوم ہو گئیں۔ چوکیداروں کی مدد سے طارق کے مکان کا تعین کر کے پولیس کو اطلاع دی گئی تو اندر خوابگاہ میں طارق کی خون آلود لاش دریافت ہوئی۔ آلۂ قتل لاش کے قریب ہی پڑا ہوا پایا گیا تھا جس پر مقتول کی انگلیوں کے نشانات تھے۔

کنپٹی کے زخم کے گرد جمے ہوئے بارود کے ذرّات بہت قریب سے فائر کی کہانی سنا رہے تھے۔ وہ خودکشی بھی ہو سکتی تھی لیکن مدد کے لیے رات کے سناٹے میں اُبھرنے والی دو دلدوز چیخیں اور کمرے میں پائے جانے والے مزاحمت کے آثار واضح طور پر قتل کی نشاندہی کر رہے تھے۔

جہانگیر سکتے کے عالم میں کئی منٹ تک خالی خالی نظروں سے طارق کی لاش کی تصویر دیکھتا رہا پھر آہستہ آہستہ اسے اپنے اعصاب میں اینٹھن سی محسوس ہونے لگی۔

مکھن خان کے قتل کے بارے میں وہ زیادہ پُریقین نہیں تھا لیکن یہ ضرور جانتا تھا کہ مقرب خان اور عقرب خان کے بعد اس کا پرانا دوست اور رفیقِ کار طارق بھی آخر کار ہیروئن کی بھینٹ چڑھ گیا تھا۔

اس نے دل گرفتہ انداز میں لباس تبدیل کیا اور کار میں تیز رفتاری کے ساتھ جیوا ہاؤز کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس وقت اس کے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں اور وہ طارق کے قتل کے حوالے سے نہایت جذباتی انداز میں اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

باس سے طے ہو چکا تھا کہ اسے کوئی پیغام دینا ہو گا تو وہ رات کے آٹھ اور سوا آٹھ بجے کے درمیان اس سے ٹرانسمیٹر پر رابطہ قائم کیا کرے گا لیکن جہانگیر کو حسبِ ضرورت کسی بھ[ی] وقت رابطہ قائم کرنے کی کھلی چھوٹ تھی اور وہ فوری طور [پر] باس سے کچھ بے لاگ باتیں کرنا چاہتا تھا۔ بی فور نہ ملتا [تو] اس نے ڈی ون ہی سے بھڑ جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

جیوا ہاؤز کے مستقل مکینوں کے لیے جہانگیر کی یوں [بے] صبح آمد تعجب خیز تھی لیکن ان میں کسی نے اس کا اظہار نہیں [کیا] اور وہ ان مشینی انسانوں کی رسمی تعظیم قبول کرتا ہوا سیدھا [اوپر] چلا گیا۔

تیسری کوشش میں ریسیور پر وہ بھاری اور خوابناک [آواز] سُنائی دی جو دن رات جہانگیر کے اعصاب پر سوار رہتی تھی: "[بی فور] ریسیونگ۔ کیا بات ہے؟ آج اس وقت کیسے کال کر رہے [ہو؟] اوور۔" باس کی آواز سنتے ہی اس کا سارا حوصلہ جواب دے گ[یا]

"بس... سر! آپ نے اخبار دیکھا ہے آج کا؟ او[ور]" اس نے سوال کرتے ہوئے اپنی آواز میں ہلکی سی لرزش محسوس [کی]

"کیا ہے اس میں؟ وقت خراب کیے بغیر جلدی بات پو[ری] کرو۔ اوور۔" باس نے خشک لہجے میں اسے ڈانٹ دیا اور [وہ] اپنی بے بسی پر دل مسوس کر رہ گیا۔

"طارق رات گئے مار دیا گیا۔ اوور۔" لہجے پر قابو پا[نے] کے باوجود جہانگیر کی آواز بھرّا گئی۔

"افسوس کے سوا کچھ نہیں کیا جا سکتا۔" بی فور کا لہجہ غیر ہمد[ردانہ] تھا۔ "اپنے مصائب کا وہ خود ذمّے دار تھا... ہم کوشش کے با[وجود] اسے نہ بچا سکے... اوور۔" وہ پہلے سے باخبر تھا۔

جہانگیر چند ثانیے تک خاموش رہا پھر خود پر قابو پا[تے] ہوئے بولا۔ "وہ مر گیا سر! مرنے والے واپس نہیں آیا کر[تے]۔ اس کی لاوارث لاش سرکاری مُردہ خانے میں پڑی ہوئی [ہے]۔ میں اسے وصول کر کے تدفین کرانا چاہتا ہوں... مرنے کے [بعد] تو شاید لاتعلقی کے احکام باقی نہیں رہے ہوں گے؟ اوور۔"

"احمق بننے کی ضرورت نہیں۔" بی فور کی آواز بدستو[ر غیر] ہمدردانہ رہی۔ "اخبارات نے اس کا ماضی خاصا اُچھالا ہے۔ [وہ اس کی] آخری سرگرمیوں کے بھی کھوج میں ہوں گے... بدستور تماشائی بنے رہو... اس کے دشمن اس وقت زیادہ چوکنے ہوں [گے] اور جو مرنے والے سے قُرب جتائے گا، اسی کے پاس پہنچا[یا] جائے گا۔ اگر اتفاق سے پولیس بھی رجوع کر بیٹھے تو زیادہ [جوش] دکھلانے کی کوشش نہ کرنا کیونکہ تمہارے لیے یہی سودمند [رہے] گا... اوور۔"

"تو کیا میں اس لاوارث جنازے کو کندھا بھی نہ د[ے] سکوں گا سر؟ اوور۔" وہ جذباتی لہجے میں بولا۔

[...] ضرور دو۔" اس بار باس غصیلے لہجے میں غرّایا تھا۔ "لیکن اس [...] ان چار آدمیوں کا بندوبست کر لینا جو تمہاری تدفین کرا [...] ... اوور۔"

[...] باس کے تند لہجے سے جہانگیر کو شدید ذہنی جھٹکا لگا اور [...] ہوش میں آ گیا اور سارا جذباتی اُبال پانی کے بلبلے کی طرح [...] "میں معذرت خواہ ہوں سر!" وہ تھکی ہوئی آواز میں بولا۔ [...] اور میرا برسوں کا ساتھ تھا۔ اس کی موت نے میرا دماغ [...] کر دیا تھا... اوور۔"

"[...] میں تمہاری کیفیت محسوس کر رہا ہوں۔" آپریٹس پر باس کی [...] اور خوابناک آواز سنائی دی۔ "لیکن جب آدمی کی ذہنی حالت [...] پر نہ ہو تو اس کے لیے بہتر یہی ہوتا ہے کہ کچھ دیر کے [لیے گو]شہ نشین ہو کر نارمل ہونے کی کوشش کرے... آج تم خود کو [...] محدود کر لو... اوور۔"

باس کا لہجہ نرم تھا لیکن طارق اس کے الفاظ کی چبھن محسوس [کیے ب]غیر نہ رہ سکا۔ "میں ہدایت پر عمل کروں گا سر!... اوور۔"

"اس وقت تم کہاں ہو؟ اوور۔"

"جیوا ہاؤز میں سر! اوور۔" وہ پژمُردہ لہجے میں بولا۔ طارق [کی مو]ت پر باس کا ردِعمل منطقی ضرور تھا لیکن جہانگیر کو اس سے [...] سرد مہری کی امید نہیں تھی۔ برسوں پرانے کارکن کی موت کو [...] غلطیوں کا خمیازہ قرار دے کر کنارہ کشی اختیار کر لینا اس کے [...] سراسر درندگی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ بس جیتے جاگتے [...] چاق و چوبند غلاموں کا خریدار تھا۔ جو رازداری برقرار رکھتے [ہوئ]ے اس کے ہر حکم کی بے چون و چرا تعمیل کر سکیں۔

"گڈ۔" باس کا لہجہ سپاٹ ہی رہا۔ "آج اور کل جیوا ہاؤز کی [عمار]ت ویران رہے گی۔ واپسی سے پہلے ملازمین کو دو دن کی [رخص]ت دے کر فوراً روانہ کر دو، وہ پرسوں صبح واپس لوٹیں گے [...] کے جانے کے بعد عمارت مقفل کر دو، گاڑی باہر نکال کر پھاٹک [...] بھی تالا لگا دو اور ذیلی دروازے سے اندر جا کر چابیوں کا گچھا [...] لگ کے ساتھ اندر لان کے داہنے گوشے میں رکھے ہوئے [...] س کے گملے میں دبا کر تم بھی چلے جاؤ۔ ذیلی کھڑکی کو باہر سے [...] کُنڈی لگا دینا... اوور۔"

"[اوک]ے سر!" جہانگیر نے مؤدبانہ لہجے میں کہا اور باس نے [گفت]گو کے اختتام کا اعلان کرتے ہوئے شاید رابطہ منقطع کر دیا۔

جہانگیر آپریٹس واپس رکھتے ہوئے سوچ میں پڑ گیا۔ اسے [...] حیرت تھی کہ بی فور کو اپنی مصروفیات کے باوجود جیوا ہاؤز سے [...] گہری واقفیت تھی کہ اس نے احاطے میں اندر کی طرف رکھے [ہو]ئے ایک مخصوص گملے کی نشاندہی تک کر دی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ جہانگیر کی لاعلمی میں نہ صرف جیوا ہاؤز میں داخل ہو چکا تھا بلکہ وہاں کا تفصیلی جائزہ بھی لے چکا تھا۔ پھر اسے یاد آیا کہ ڈی۔ ٹو نے اسے جیوا ہاؤز میں جابجا خفیہ ٹرانسمیٹرز کی موجودگی کی اطلاع دی تھی جن پر وہ وہاں ہونے والی گفتگو کا ایک ایک لفظ سنتا تھا۔ کئی مواقع پر اس نے ان کی میٹنگز میں کہی گئی باتیں لفظ بلفظ دُہرائی تھیں۔ جب کہ جیوا ہاؤز حاصل کرنے کے بعد جہانگیر کی دانست میں وہاں کوئی کام نہیں ہوا تھا۔

جو لوگ اس عمارت کے چپّے چپّے کو بگ کر سکتے تھے ان کے لیے کسی گملے کی صحیح پوزیشن سے واقف ہونا ایسا دشوار نہیں تھا لیکن وہ حکم جہانگیر کے لیے پریشان کُن تھا۔ اس کا قیاس تھا کہ دو دن کے لیے عمارت خالی کرانے کے بعد بی فور شاید وہاں مخبری کے کچھ اور آلات نصب کرانا چاہتا تھا۔

جہانگیر کی دانست میں جیوا ہاؤز میں کی جانے والی کوئی بھی گفتگو اوپر والوں سے محفوظ نہیں تھی۔ لے دے کر اس بندوبست میں ایک ہی اضافہ کیا جا سکتا تھا کہ مخصوص مقامات پر متحرک فلمیں بنانے والے خودکار کیمرے نصب کیے جائیں جو ہر نقل و حرکت کو سلولائیڈ کے فیتے یا وڈیو ٹیپ پر محفوظ کر لیں۔

آخر وہ سر جھٹک کر باہر برآمدے میں آ گیا۔ وہ پوری طرح تنظیم اور اپنے بڑوں کا وفادار تھا۔ لہٰذا اسے کسی بھی قسم کی نگرانی سے خائف ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔

اس نے جیوا ہاؤز کے تینوں ملازمین کو وہیں طلب کیا اور انھیں پورے دو دن کی مکمل چھٹی کی خوش خبری سنانے لگا۔

ٹرانسمیٹر پر کال کا اشارہ موصول ہوتے ہی ڈینی نے اپنی میز کے نچلے حصّے میں لگا ہوا سوئچ دبا کر دروازے کے باہر لگا ہوا سرخ بلب روشن کر دیا جس کا مطلب تھا کہ وہ اس وقت تخلیے میں تھا اور اس کا کوئی ماتحت یا ملاقاتی انٹرکام پر سیکرٹری کی معرفت اجازت لیے بغیر اندر نہیں آ سکتا تھا۔

اس احتیاطی تدبیر کے بعد ڈینی نے آپریٹس آن کر کے والیوم اس حد تک بڑھا دیا کہ اسے آواز سننے میں کوئی دشواری نہ ہو۔ ریڈیائی لہروں کے مختصر سے خلل کے بعد ریسیور پر ایک آواز اُبھری اور وہ چونک پڑا۔ ڈی ٹو کو نجانے اتنی صبح بی فور سے کیا کام پیش آ گیا تھا۔

وہ سگریٹ سلگا کر اپنی آرام دہ کرسی کی پشت گاہ سے ٹک گیا۔ آپریٹس بدستور آن تھا اور ڈینی سکندر علی کی آواز کا منتظر تھا۔

گارڈن ایسٹ کے زرد، دو منزلہ مکان میں اپنا وقت

گزارے اسے دو دن ہو چکے تھے۔ اس دوران میں اس نے سکندر علی کے مکان سے اٹھائی ہوئی قیمتی اشیا ایک نالے میں پھینک دی تھیں پھر وہ اخبارات میں ایک ممتاز سماجی کارکن اور مخیر انسان کے گھر میں ایک نقاب پوش کی ڈکیتی کی خبروں کا منتظر رہا لیکن اس واردات کا کہیں بھی ذکر نہ آیا، اس نے بی فور سے رابطے کی کوشش کی تو دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔ دوسری فری کوئنسی پر بھی اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے بی فور کے ساتھ اس کی سیکرٹری بھی شہر چھوڑ گئی ہو۔

شہر میں عقرب خان اور مکھن خان کے بہیمانہ قتل کا اودھم ہوا تو اس نے ایک بار پھر باس سے رابطہ قائم کرنا چاہا لیکن دوسری طرف بدستور سکوت چھایا رہا اور ڈینی کی یہ آرزو دل ہی دل میں رہی کہ وہ باس کے مسکن پر اپنے چھاپے کے بعد باس کی آواز میں رونما ہونے والی تبدیلیاں خود سن سکے۔

ڈینی کے لیے سکندر علی کے مکان میں گزارے ہوئے چند گھنٹے اس کی زندگی کے اہم ترین لمحات میں سے تھے بعض اہم راز معلوم کرنے کے ساتھ اس نے جس بے فکری اور بالادستی کے ساتھ سکندر علی کی تذلیل کی تھی، وہ اس کے لیے یادگار تھی، وہ بارہا محض یہ سوچ سوچ کر لذت اندوز ہوتا رہا کہ جب باس کی خوبرو سیکرٹری نے سیاہ پوش لٹیرے کے ہاتھوں قیمتی اشیا سے محرومی کے ساتھ اپنی درگت بننے کا حال سنایا ہوگا تو سکندر علی نے خود کو اپنی بوٹیاں نوچنے پر مجبور پایا ہوگا۔

وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ بڑے بڑے مجرم عموماً انا کے پجاری ہوتے ہیں۔ تنہائی میں سرانجام دیے ہوئے کارناموں پر اندر ہی اندر پھولتے رہتے ہیں اور اسی طرح جب ان کی انا پر کوئی کاری ضرب لگ جائے تو اس کا کوئی گواہ موجود ہو یا نہ ہو، وہ پھن کچلے ہوئے کسی سانپ کی طرح تلملا جاتے ہیں اور اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھتے جب تک اپنا انتقام نہ لے لیں یا پھر حریف کے مقابلے میں خود کو کسی کیچوے کی طرح حقیر پا کر صبر کرنے پر مجبور نہ ہو جائیں۔

سکندر علی بظاہر معاشرے کا ایک معزز اور مخیر رکن سہی لیکن وہ بنیادی طور پر ایک گروہ بند تھا اور اس کی سبکی کے دو گواہ بھی موجود تھے لیکن پھر بھی وہ خاموش تھا، یہ بات ڈینی کو کچھ عجیب سی محسوس ہو رہی تھی۔

ٹرانسمیٹر پر وقفے وقفے سے جہانگیر کی آواز ابھرتی رہی پھر تیسری کوشش میں دوسری طرف سے باس کی آواز ابھری اور ڈینی بے اختیار میز کی طرف جھک آیا۔

باس کی آواز میں وہی پہلے جیسا دم خم تھا لہجے
تھا، نہ جھلاہٹ۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اس کے سا
غیر معمولی واقعہ پیش نہ آیا ہو۔ جہانگیر نے طارق کے قتل
تو ڈینی یوں اچھلا جیسے اس پر اچانک بجلی کا ننگا تار

طارق سے اس کی دوستی بہت پرانی ہو چلی تھ
سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ چاروں برے دنوں کے سا
اور تنگی ترشی کے حالات میں پروان چڑھنے والی دوستی
گہری اور دیرپا ہوتی ہیں۔ جہانگیر کی زبان سے طارق ک
خبر سنتے ہی ڈینی کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے
پوری قوت سے گھونسہ رسید کیا ہو۔

وہ گھر سے نکلا تو ناشتے کی میز پر تازہ اخبارات
لیکن ناشتے کے دوران وہ مسلسل مقرب خان، عقرب خا
عیسیٰ خان کی مثلث میں الجھا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ب
تھا اور حالات عیسیٰ خان کی شرارتوں کی نشاندہی کر رہے تھے لہٰذا کیو
اپنے طور پر عیسیٰ خان کو سرزنش کرنے کی کوشش کرے۔ اسی لائحہ عمل
ہوئے اس نے خلافِ معمول اخبارات پر کوئی توجہ نہیں
لیکن اب جہانگیر کے ذریعے اسے وہ بدترین خبر ملی تھی،

وہ حیرت اور صدمے کے عالم میں بت بنا جہانگ
سکندر علی کی گفتگو سنتا رہا۔ وہ سب کچھ سن اور سمجھ رہا
اسے ایئر پیس سے ابھرنے والی آوازیں کسی گہرے کنویں کی
ابھرتی محسوس ہو رہی تھیں۔

ان دونوں کی گفتگو ختم ہو جانے کے بعد بھی د
کہنیاں ٹکائے دونوں ہاتھوں میں اپنا سر تھامے بے حس
بیٹھا رہا پھر انٹرکام کی گھنٹی نے اسے چونکایا۔ اس کی سیکرٹ
لیبر انسپکٹر کی آمد کی اطلاع دے رہی تھی۔

”اسے ظفر سے ملوا دو۔“ ڈینی نے خشک لہجے میں
دے کر ریسیور رکھ دیا۔

پھر اسے کھلی ہوئی اوپری دراز میں رکھا ہوا
نظر آیا اور اس نے اسے آف کر کے ایریل اندر دبا
دراز بند کر دی۔

طارق قتل کر دیا گیا... اسے کسی نے مار دیا
کے ذہن میں بس مسلسل یہی ایک خبر نئے نئے الفاظ میں گو
رہی تھی اور اس کی آنکھوں کے گوشوں میں غمناک نمی تیر
تھی۔ بصارت دھندلانے لگی تو ڈینی نے جیب سے رومال
کر آنکھیں صاف کیں اور دل شکستہ انداز میں اپنی کرسی میں
زندگی تو یوں بھی بے ثبات اور غیر یقینی تھی لیکن ا
نے اپنی سرگرمیوں کے باعث اسے اور بھی مشکل بنا لیا تھ

ق مارا گیا تھا۔ کل ان میں سے کسی کی بھی باری آسکتی تھی پھر
ونک پڑا۔ اسے سکندر علی کے کہے ہوئے الفاظ یاد آنے لگے تھے۔
اس کی گفتگو سے ظاہر تھا کہ وہ طارق کے قتل سے باخبر
لیکن جب جہانگیر نے جذباتی صدمے کے زیرِ اثر اس سے
رات کے مطالعے کے بارے میں سوال کیا تو اس نے اپنی روایتی
مہری کا مظاہرہ کیا تھا جیسے طارق کا مار دیا جانا اس کے نزدیک
بڑی خبر نہ رہی ہو اور پھر اظہارِ افسوس بھی شرمناک حد
خودغرضانہ تھا۔ ہو سکتا ہے کہ طارق اپنی ہی کسی غلطی کے
میں اس افسوسناک انجام سے دوچار ہوا ہو لیکن یہ تصور ہی
انہ تھا کہ کوئی ذی ہوش شخص جانتے بوجھتے ہوئے خود کو موت
منہ میں جھونک بیٹھے۔ مرنے والا تو مر ہی چکا تھا اگر اس کے
ذرا نرم الفاظ استعمال کر لیے جاتے تو اس کے دوبارہ زندہ ہونے
امکانات نہیں تھے پھر سکندر علی نے کیوں ایسا سفاکانہ رویّہ
یار کیا؟ شاید وہ اس طرح جہانگیر کو بالواسطہ طور پر محتاط روی کی
بت سے آگاہ کر رہا ہو۔

ڈینی کو افسوس ہونے لگا کہ اس نے ان دونوں کی گفتگو
وں سنی؟ طارق سے کنارہ کشی کے احکام تو سب کے لیے تھے لیکن
اس کی موت کے بعد کم از کم کندھا تو دیا ہی جا سکتا تھا۔ اس نے طارق
جنازے کے بارے میں سکندر علی کی ہدایت سن لی تھی اور اس
یت کا جواز اسے وزنی محسوس ہوا تھا۔

بے خبر رہتا تو دوست کو کم از کم اپنے ہاتھوں مٹی تو
ے آتا لیکن اب وہ تذبذب کا شکار ہو گیا تھا۔

اسے یاد آیا کہ دروازے کے باہر سرخ بتی ابھی تک روشن
۔ اس نے فوراً سوئچ آف کر دیا پھر سیکرٹری سے اخبارات
والیے۔

اخبارات کے لیے مقرب خان کا قتل ایک پراسرار معمہ
ا ہوا تھا۔ لہٰذا انھوں نے عقرب خان اور طارق کی ہلاکت کے
انڈے مقرب خان سے ملانے کی کوشش کی تھی۔ تقریباً ہر اخبار
نے ایک ہی کہانی دہرائی تھی جو ان حالات میں نہایت آسانی سے
سامنے آجاتی تھی۔

مقرب خان کی لاش طارق کے مکان سے میلوں دور
ن کی کار میں ملی تھی لیکن اس کی حالت سے ظاہر تھا کہ کسی اور
مقام پر قتل کرنے کے بعد سفید فاکسی کو لاش ٹھکانے لگانے کے
لیے استعمال کیا گیا تھا۔ لاش کے لباس اور خون کے سوکھے ہوئے
لوتھڑوں سے چپکی ہوئی مٹی اور گھاس پھوس کی بنا پر ابتدا ہی سے
شبہ کیا جا رہا تھا کہ مقرب خان کا قتل کسی ایسے مقام پر ہوا ہوگا
جہاں سوکھی گھاس بکثرت موجود رہی ہوگی پھر عقرب خان مارا گیا

تو معاملہ مزید الجھ گیا لیکن طارق کے قتل ہوتے ہی پولیس کی توجہ اس کے مکان کے گرد احاطے میں پھیلے ہوئے خزاں رسیدہ لان پر مرکوز ہو گئی تھی۔

قیاس کیا جا رہا تھا کہ طارق خود مقرب خان کا قاتل تھا یا وہ قتل اس کے اشارے پر کیا گیا تھا۔ اس جرم کا کوئی محرک سامنے نہ ہونے کے باوجود کہانی کی بنیاد اسی مفروضے پر رکھی گئی تھی۔ عقرب خان کو کسی طرح علم ہو گیا کہ اس کے بڑے بھائی کے قتل میں طارق پوری طرح ملوث ہے لیکن طارق انتقامی کارروائی کے ممکنہ خطرے سے واقف تھا جس وقت عقرب خان بھرا ہوا پستول لے کر اس کے گھر کے قریب پہنچا اس نے تقریباً عقرب کو دیکھا اور پہچانتے ہی اس پر گولی چلا دی اور آلۂ قتل تلف کر دیا۔ طارق کے مکان کے اونچے برآمدے سے احاطے کی قدرے نیچی دیوار کی طرف آتے ہوئے کسی شخص کی کھوپڑی کا نشانہ لینا ماہرین کے نزدیک ہر اعتبار سے ممکن تھا۔ متبادل صورت یہ ہو سکتی تھی کہ طارق کا کوئی ہمدرد باہر سے مکان کی نگرانی کر رہا ہو اور اس نے عقرب کو مار ڈالا ہو۔ ادھر عقرب اور مقرب کا کوئی تیسرا رازداں بھی تھا جو ان سے اس قدر قریب تھا کہ دوہرے قتل پر مشتعل ہو کر کسی خطرے کی پروا کیے بغیر طارق کے گھر میں گھسا اور اسے ہلاک کر کے رات کے اندھیرے میں آسانی سے فرار ہو گیا۔

تیسرے آدمی کا ذکر آتے ہی ڈینی کے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور اسے یاد آیا کہ جس رات مکان کی بجلی منقطع ہونے کے بعد طارق بوکھلا کر جہانگیر کے گھر پہنچا اس رات اس کے احاطے میں بی فور یا اس کے کسی آدمی نے مقرب خان کو ٹھکانے لگایا تھا جب کہ طارق نے اندھیرے مکان سے فرار ہوتے ہوئے اپنے احاطے میں کم از کم تین سایوں کو اچھل کر جھاڑیوں میں روپوش ہوتے دیکھا تھا۔

مقرب خان اور اس کے بعد عقرب خان جہنم واصل ہو چکا تھا لیکن تیسرا ابھی باقی تھا۔

غیرارادی طور پر ڈینی کی مٹھیاں بھنچ گئیں، اس کی دانست میں وہی تیسرا آدمی طارق کا قاتل تھا اور اس نے یہ حرکت عیسیٰ خان کے ایما پر کی تھی۔

اس نے اپنے طور پر عیسیٰ خان کی گوشمالی کا مصمم ارادہ کر لیا۔

اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اس بارے میں وہ باس سے کوئی مشورہ نہیں لے گا، کہیں وہ اس اقدام کو طارق کی حمایت میں کی جانے والی کارروائی قرار دے کر سرے سے مسترد ہی نہ کر دے۔ اگر بعد میں بازپرس کی نوبت آتی تو وہ بآسانی یہ کہہ کر اپنی گلوخلاصی کرا سکتا تھا کہ دو روز سے اس سے یا اس کی سیکرٹری کی طرف سے جواب نہ ملنے کے باعث اس نے مجبوراً رابطہ قائم کرنے

کی کوششیں ترک کر دی تھیں اور طارق کے قتل کے معاملے کو اپنے طور پر دیکھنے کی کوشش کی تھی۔

عیسٰی خان سے رابطے کے لیے وہ اپنا دفتری ٹیلیفون استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا لہٰذا سارے اخبارات کا سرسری مطالعہ کرنے کے بعد وہاں سے اُٹھ گیا۔

راستے میں اس کی ذہنی رو ایک مرتبہ پھر سکندر علی کی طرف بھٹک گئی اور وہ سوچنے لگا کہ اس نے دو روز کے لیے جیوا ہاؤز کو کیوں خالی کرایا ہے جب کہ اس عمارت سے بی فور کا براہِ راست کبھی بھی کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔ ان چاروں نے ہی اس عمارت کا بندوبست کیا تھا۔ یہ ضرور تھا کہ اس کے حصول کا مشورہ اسی کی جانب سے ملا تھا۔ نجانے عمارت خالی کرانے سے وہ کیا مقصد حاصل کرنا چاہتا تھا۔

ڈینی کو مُبہم سا خیال پیدا ہوا کہ کہیں سکندر علی اس عمارت کو واقعی بگ نہ کرانا چاہتا ہو تاکہ اپنے ماتحتوں کے خیالات سے واقفیت حاصل کر سکے مگر ڈینی نے کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔ اسے باس کی جگہ سنبھالنے کا خواب دیکھتے ہوئے ایک طویل مدّت گزر گئی تھی۔ لیکن اس نے کبھی اپنے دل کی بات کسی پر ظاہر نہیں کی تھی اور ظاہر بھی کیا کرتا، وہ خود باس کی شخصیت سے لاعلم تھا۔ وہ تو غزالہ ایک بہانہ بن کر اس کی فیکٹری میں نہ پہنچی ہوتی تو شاید وہ ابھی تک باس کے راز سے بے خبر ہوتا۔ اصل بات یہ تھی کہ غزالہ خوش شکل اور خوش گفتار تھی۔ ڈینی اس کی ذات کے سحر سے متاثر ہوا اور اس کے کالج کے سووینیر کے لیے اشتہار دے دیا اور اس کی دعوت پر کالج کے فنکشن میں بھی جا پہنچا جہاں لاؤڈ اسپیکر پر مہمانِ خصوصی کی آواز نے اچانک اس پر ایک راز ظاہر کر دیا جو برسوں سے معمہ بنا چلا آ رہا تھا اور طریقۂ کار کی روشنی میں ڈینی کو امید تھی کہ وہ کبھی بھی باس سے واقف نہ ہو سکے گا مگر اس دن محض آواز کی شناخت کی بنا پر اسے سکندر علی پر شبہ ہوا اور پھر نقاب پوش چور کے روپ میں اس کے مکان میں داخل ہو کر ڈینی نے ایسی بہت سی معلومات حاصل کر لیں جن کی بنا پر اس کا شبہ یقین میں بدل گیا۔

اسے سکندر علی کے مکان سے چار اہم فون نمبر بھی ملے تھے جو اس کی دانست میں تنظیم کے اہم ذمّے داروں کے تھے۔ ان ہی سے ڈینی نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ بی فور اپنی جگہ مطلق العنان سربراہ نہیں تھا بلکہ اس سے اوپر بھی کچھ لوگ موجود تھے۔

ڈینی کا اندازہ تھا کہ جس طرح بی فور کی شخصیت اس کے ماتحتوں کے لیے گمنام تھی اور سارا کام برسوں سے محض آوازوں کی شناخت اور شناختی اشاروں کی بنیاد پر چل رہا تھا۔ اسی طرح اوپر والوں سے بی فور بھی لاعلم ہوگا لیکن سکندر علی کی ڈائری میں ان فون نمبروں کی موجودگی اس خیال کی نفی کر رہی تھی۔ فون نمبر تھوڑی سی محنت کے بعد یہ سراغ لگایا جا سکتا تھا کہ وہاں خفیہ نام سے کالز کرتا ہے۔

ڈینی دو روز سے مسلسل اسی سوچ بچار میں مبتلا کے مکان سے ملنے والے نمبروں پر کال کرنے سے پہلے وہ کو لائے قائم کرنا چاہتا تھا ورنہ کسی کو ذرا بھی شبہ ہو جاتا راز فاش ہو گئے ہیں تو فوری طور پر طریقۂ کار اور ٹھکانے دیے جاتے اور برسوں بعد ہاتھ آنے والے سراغ ناکار رہ جاتے۔ اس کے پاس ان فون نمبروں کے علاوہ ایشین سنڈیکیٹ لمیٹڈ کا نام بھی تھا جہاں سے اپنی مہ کیا جا سکتا تھا لیکن ڈینی اوپر سے ابتدا کے بجائے نیچے سے کرنا چاہتا تھا۔ اس کی کامیابی کا پہلا زینہ سکندر علی تھا۔ سے چھلانگ لگانے کی کوشش میں وہ منہ کے بل گر سکتا تھا۔

اس نے پختہ ارادہ کر لیا کہ طارق کے قاتل کا معاملہ کے بعد وہ اس اہم کام پر اپنی ساری توجہ مرکوز کر دے

عیسٰی خان سخت پریشان تھا۔ خوف اور تشویش باعث اس کی راتوں کی نیندیں اُڑ گئی تھیں جس کا اظہار ورم آلود سُرخ آنکھوں سے ہو رہا تھا۔ آمدنی میں اضافے لالچ میں اس نے جس کام کا آغاز بہت سہل اور محفوظ سمجھ اس کے انجام نے اس کا سُکھ چین برباد کر دیا تھا کیونکہ کی قلیل مدّت میں کم از کم پانچ انسانی جانیں اس گورکھ دھندے بھینٹ چڑھ چکی تھیں۔

اپنے ٹرکوں کے ذریعے آزاد قبائلی علاقوں سے گاہے چرس منگوا کر معقول نفع پر مقامی بازار میں فروخت کر ہوئے عیسٰی خان نے کبھی ایسی بہیمانہ خونریزی کے بارے سوچا بھی نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ کبھی ستارے گردش ہی گئے تو زیادہ سے زیادہ مال کی کھیپ پکڑی جائے گی اس کی ذمّے داری متعلقہ ٹرک پر مامور اپنے ملازمین کے کر خود بری الذمّہ ہو جائے گا۔

پھر اسے بازار میں چرس کے تھوک اور خوردہ دا درمیان نمایاں فرق نے کسی ایک اڈّے سے کاروباری را کرنے پر اُکسایا تو اس نے مقرب خان کے ذریعے راجو کو ا ملا لیا لیکن وہاں چند دن بھی سکون سے نہ گزرے تھے کہ مسلح نے راجو کا اڈّہ تباہ کر کے وہاں دل کھول کر فائرنگ کی خوف و ہراس پھیلایا جس کے نتیجے میں کئی افراد کے زخمی کے ساتھ راجو کا بھائی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

راجو نے اس حملے کے ذمّے داروں کو غلام قادر کے ساتھیوں کے طور پر پہچانا تھا لیکن اس نے پولیس کو ان کی نشاندہی کر کے اپنی جرائم پیشہ برادری کے مروّجہ اصول توڑنے اور پھر تفتیش کا نشانہ بننے کے بجائے پوری صورتحال عیسٰی خان کے گوش گزار کر کے اسے انتقامی کارروائی میں اپنا ساتھ دینے پر مجبور کیا اور عیسٰی خان کا قبائلی خون جوش میں آ گیا۔ اس وقت اسے ذرا بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ مہم اس کے وفاداروں کے حق میں کس قدر خونریز ثابت ہوگی۔

اپنے آدمیوں میں مقرب خان اس کا معتمدِ خاص تھا اور عیسٰی خان کو پوری امید تھی کہ وہ اپنی ذہانت اور بے خوفی کے سہارے جلد ہی روپوش غلام قادر کا سراغ لگا لے گا۔ مقرب خان کئی دن شہر میں دھکّے کھاتا رہا پھر ایک روز عیسٰی خان سے اجازت لے کر اس کے پاس ملازم اپنے چھوٹے بھائی عقرب خان اور ایک دوست سلطان شاہ کو ساتھ لے گیا۔ عیسٰی خان کے استفسار پر اس نے نہایت اعتماد سے بس اسی قدر بتایا کہ وہ اگلے چوبیس گھنٹوں میں غلام قادر کو اس کے بل سے گھسیٹ کر اس کے قدموں میں لا ڈالے گا۔ پھر اس کے انجام کا انحصار عیسٰی خان کی مرضی پر ہوگا۔

لیکن غلام قادر کی تلاش میں اس رات مقرب خان واپس نہ لوٹ سکا اور صبح اس کی لاش ملنے کی اطلاع آ گئی۔ عیسٰی خان کو اس سانحہ کے بعد عقرب خان سے پتا چلا کہ پچھلی شام وہ دونوں مقرب خان کے ساتھ ایک مکان کی بجلی منقطع کر کے ایک مکان کے احاطے میں داخل ہوئے تھے۔ مقرب خان کا ارادہ تھا کہ اندر گھس کر وہاں رہنے والے سے کچھ باز پُرس کرے گا مگر وہ نوبت آنے سے پہلے ہی اس کا شکار خطرہ بھانپ کر گھر سے بھاگ نکلا اور مقرب خان نے اس کے تعاقب میں روانہ ہوتے ہوئے ان دونوں کو واپسی کا حکم دے دیا۔ اس کے بعد مقرب خان پر کیا گزری؟ اس سے ہر ایک لاعلم تھا۔

بڑے بھائی کے اس وحشیانہ قتل پر عقرب خان تڑپ اٹھا۔ وہ اس شخص کے لہو سے اپنی انتقام کی پیاس بجھانا چاہتا تھا جس کے تعاقب سے اس کے بھائی کو زندہ لوٹنا نصیب نہ ہو سکا۔ مگر عیسٰی خان جہاندیدہ آدمی تھا۔ راجو کے بھائی کے بعد مقرب خان جیسے چالاک اور دلیر آدمی کے قتل نے اسے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ کہیں وہ نادانستگی میں شہر کے کسی طاقتور گروہ سے نہ اُلجھ بیٹھا ہو، لہٰذا اس نے عقرب خان کو سختی سے روک دیا اور اس حد تک محتاط رہا کہ نہ پولیس سے کوئی تعاون کیا اور نہ ہی وہ مکان دیکھنے کی کوشش کی جہاں قتل سے پہلے مقرب خان اپنے ساتھیوں سے علیحدہ ہوا تھا۔

بات یہ نہیں تھی کہ اسے مقرب خان کی ہلاکت پر افسوس نہیں تھا۔ اس کے قتل پر اسے یوں محسوس ہوا تھا، جیسے وہ اندر سے یک بیک کھوکھلا ہو گیا ہو اور اس کی عزیز ترین ہستی اس سے چھین لی گئی ہو مگر اس صدماتی کیفیت میں بھی وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کی کوئی بھی کوشش مقرب خان جیسے قابلِ اعتماد ملازم کے اتلاف کا ازالہ نہیں کر سکے گی بلکہ انتقام کے جذبے میں سرزد ہونے والی کوئی بھی بے احتیاطی خود اسے بھی لے ڈوبے گی۔

اگر قتل کے بارے میں اس شخص پر شبہ ظاہر کیا جاتا جس کے تعاقب سے مقرب خان واپس نہ لوٹ سکا تھا تو تفتیشی افسران اس شبہے کے محرکات جاننے کے سلسلے میں تیکھے سوالات کرتے اور اپنی پوزیشن کو بچانا عیسٰی خان کے لیے دشوار ہو جاتا مگر یہ زبان بندی بھی قتل و خونریزی کا سلسلہ دراز ہونے سے نہ روک سکی۔

مکھن خان نے اپنے طور پر صحیح اندازہ لگایا تھا مگر عیسٰی خان کے دوٹوک رویّے نے اسے مایوس ہو کر لوٹنے پر مجبور کر دیا تھا مگر اسی روز مکھن خان بے رحمی سے مار ڈالا گیا پھر عقرب خان کی خبر آئی تو عیسٰی خان پر دہشت طاری ہونے لگی۔ اسے یقین ہونے لگا کہ ان پے در پے واقعات کی پشت پر شہر کا کوئی مضبوط اور منظم گروہ کام کر رہا ہے اور راجو کے اڈّے پر ہونے والے خونریز تصادم سے ایک ایسی کہانی کا آغاز ہوا تھا کہ جس نے بھی اس کے بارے میں کچھ جاننے کی کوشش کی اسے فوری طور پر راستے سے ہٹا دیا گیا۔

اس حوالے سے اس کے ذہن میں وہ لوگ اُبھر آئے جنھوں نے چرس فروشی سے دستبردار ہونے کے عوض اسے ایک خطیر رقم وظیفے کے طور پر دینے کا وعدہ کیا تھا اور پھر خود سامنے آئے بغیر انھوں نے ایک لیٹر بکس کے ذریعے اسے پہلی قسط ادا کر دی تھی۔ شاید وہ ہر قیمت پر اپنے دھندے میں دخل انداز ہونے والوں کو دور رکھنے پر تُلے ہوئے تھے۔ خواہ اس مقصد کے لیے رقم صرف کرنی پڑے یا دو چار کا خون بہانا پڑ جائے۔

اس کا خیال تھا کہ وہ شخص اس گروہ کا کوئی خاص رُکن تھا جس کے پھاٹک کے قریب عقرب خان مارا گیا تھا لیکن وہ اہم شخص بھی نہ بچ سکا۔ اسے اس کے مکان میں مار دیا گیا تھا۔ اس نے اپنے سامنے میز پر پھیلے اخبار کو یوں خوفزدہ نگاہوں سے دیکھا جیسے وہ اس کی موت کا پروانہ ہو۔

اس کے دو ملازمین مارے جا چکے تھے۔ لہٰذا پولیس افسران تفتیش کے سلسلے میں اسے خاصی اہمیت دے رہے تھے۔ دوسری طرف اخبار والے ان وارداتوں کے پورے پس منظر سے لاعلم ہونے کے باوجود کسی ایسے تیسرے شخص کی موجودگی کے امکانات ظاہر کر رہے

تھے جو نہ صرف طارق کا قاتل تھا بلکہ ان واقعات پر پوری طرح روشنی بھی ڈال سکتا تھا۔

عیسٰی خان کے نزدیک یہ قیاس آرائیاں بے بنیاد تھیں۔ لیکن تیسرے آدمی کے تذکرے پر اس کا ذہن سلطان شاہ کی طرف مبذول ہوگیا تھا۔ سلطان شاہ، مقرب خان کا گہرا دوست ضرور تھا لیکن دوستی کی خاطر قتل جیسے جرم کا ارتکاب نہیں کرسکتا تھا۔ عیسٰی خان کو خوف تھا کہ کہانی کے کرداروں میں صرف سلطان شاہ ہی زندہ بچا تھا اور مجرم خاصے باخبر معلوم ہوتے تھے اگر انھیں بھنک بھی مل جاتی کہ طارق والے معاملے میں سلطان شاہ بھی مقرب خان کا شریکِ کار تھا تو وہ ہر قیمت پر اسے بھی ہلاک کرنے پر تُل جاتے۔

اپنے دو ملازموں کی ہلاکت پر وہ بہت دل برداشتہ تھا۔ سلطان شاہ بھی نامعلوم قاتلوں کا نشانہ بن جاتا تو شاید اس کی ساری ذہنی صلاحیتیں بھی جواب دے جاتیں اور وہ آسانی سے پولیس کی بے رحمانہ پوچھ گچھ میں پھنس جاتا۔

اس نے اخبار سمیٹتے ہوئے فیصلہ کیا کہ وہ سلطان شاہ کو سرحدی علاقوں کی طرف جانے والے پہلے ٹرک سے روانہ کر دے گا تاکہ وہ اپنے قبیلے میں کچھ عرصہ گزار کر قاتلوں کی دستبرد سے بچا رہ سکے۔

اس نے سلطان شاہ کی طلبی کے لیے کسی کو پکارا ہی تھا کہ اچانک فون کی گھنٹی چیخ اٹھی اور عیسٰی خان نے ریسیور اٹھا لیا۔

دوسری طرف سے بولنے والے نے شاید عیسٰی خان کی آواز پہچان لی کیونکہ اس کے ہیلو کہتے ہی دوسری طرف سے ایک اجنبی آواز ابھری تھی۔ "مجھے ہر قیمت پر تیسرا آدمی درکار ہے۔ عیسٰی خان! اگر آج رات اسے میرے حوالے نہ کیا گیا تو میں تمھاری اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔"

"کک... کون تیسرا آدمی؟" اس بے لاگ اور دھمکی آمیز طرزِ تخاطب پر عیسٰی خان جیسا مضبوط آدمی بھی بوکھلا کر رہ گیا۔

"انجان بننے کی کوشش نہ کرو۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں کس تیسرے آدمی کی بات کر رہا ہوں۔" لہجے میں درشتگی پیدا ہوگئی۔

"وہ سب اخباری ہرزہ سرائی ہے۔" عیسٰی خان نے آخری کوشش کے طور پر سنبھالا لیا۔ اس اثنا میں وہ آدمی دفتر میں گھس آیا تھا جسے عیسٰی خان نے فون ریسیو کرنے سے پہلے آواز دی تھی۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے لوٹا دیا۔ "ایسے کسی آدمی سے میں واقف نہیں ہوں۔"

"بکواس مت کرو۔" اجنبی آواز نے اہانت آمیز لہجے میں اسے ڈانٹ دیا۔ "اخبار کے حوالے سے مجھے بہلانے کی کوشش نہ کرو، مجھے وہ آدمی چاہیے جو مقرب اور عقرب کے ساتھ اند[ھیرے] مکان میں دیکھا گیا تھا۔"

عیسٰی خان کی پیشانی سے ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ پھوٹ [پڑا] اور وہ گہرا سانس لے کر بولا۔ "وہ ہر معاملے سے لاتعلق ہے تم [یقین] کرو کہ ان دونوں کے ساتھ ایک بار وہاں جانے کے علاو[ہ اس] کا کوئی کردار نہیں تھا، اس کے ہاتھ صاف ہیں۔"

"یہ سب میں خود معلوم کرلوں گا، تمھیں وکالت کر[نے] کی ضرورت نہیں۔"

"لیکن وہ یہاں موجود نہیں ہے۔ کل رات پشاور ر[وانہ ہونے] لے جانے والے ٹرک کے ساتھ چلا گیا۔" عیسٰی خان نے دھڑ[کتے] ہوئے دل کے ساتھ جھوٹ بولا۔

"اوہ۔" فون پر اجنبی کی غضبناک غراہٹ ابھری۔ "[میں] اسے پاتال میں بھی نہ چھوڑوں گا، نام کیا ہے اس کا؟"

"سلطان شاہ۔" عیسٰی خان شکست خوردہ لہجے میں بو[لا]۔

"وہ میرے یہاں کلینر ہے۔"

"پشاور میں وہ کہاں مل سکے گا؟"

"پارٹی کا مال اُتروا کر وہ اپنے گاؤں چلا جائے گا، پشا[ور] میں اس کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔"

"گاؤں کا نام کیا ہے؟"

"یہ مجھے نہیں معلوم۔" اس بار عیسٰی خان کے لہجے میں سچا[ئی] کا اعتماد جھلک رہا تھا۔ "میں نے اسے کسی کی سفارش پر ملازم ر[کھا] تھا، بس اتنا معلوم ہے کہ اس کا تعلق سدوزئی قبیلے سے ہے شا[ید] اسی حوالے سے اس کا پتا چل سکے گا۔"

دوسری طرف سے مزید کچھ کہے بغیر سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔ عیسٰی خان ریسیور کریڈل پر پٹخ کر گالیاں دیتے ہوئے اپنے اردلی کو پکارنے لگا۔

"سلطان شاہ کو بُلاؤ۔" اردلی کی صورت دیکھتے ہی وہ دہاڑا اور پھر کرسی سے اٹھ کر کمرے میں بے چینی سے ٹہلنے لگا۔

چند منٹ بعد سلطان شاہ کاٹن ویسٹ سے اپنے ہاتھوں کی سیاہی پونچھتا ہوا دفتر میں داخل ہوا تو اس کے چہرے پر تحیّر کے آثار دور سے پڑھے جاسکتے تھے۔ عیسٰی خان اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے عقبی بیٹھک میں داخل ہوا۔

سلطان شاہ چپلیں چوکھٹ سے باہر اتار کر اندر داخل ہوا تو عیسٰی خان دونوں ہاتھ کمر پر باندھے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"کک... کیا بات ہے خان بابا؟" اس نے بوکھلا کر تحیّر زدہ لہجے میں سوال کیا۔ "تم کچھ پریشان نظر آرہے ہو۔"

"میری بات سن کر تمھاری بھی نیند اُڑ جائے گی سلطان شاہ!" عیسٰی خان دھیمے مگر طنزیہ لہجے میں بولا۔ "پہلے دروازہ بند کردو پھر میں بتاتا ہوں کہ تم نے مجھے کس مشکل میں پھنسا دیا ہے۔"

سلطان شاہ دروازہ بند کرکے پلٹا تو عیسٰی خان نے کہنا شروع کیا۔ "اپنی غلطی کے نتیجے میں مقرب خان خود تو مارا ہی گیا لیکن اپنے ساتھ ہم سب کو بھی جیتے جی ایک عذاب میں مبتلا کرگیا۔ اپنی ہوشیاری کے زعم میں اس نے آخر تک مجھے ہوا نہ لگنے دی کہ وہ شہر میں کیا کرتا پھر رہا ہے۔ اس رات تم تینوں اس اندھیرے مکان میں اکٹھے دیکھ لیے گئے تھے جس کے نتیجے میں پہلے مقرب اور پھر عقرب مارا گیا، اب وہ تمھاری تلاش میں ہیں۔"

"بڑی خبر سنائی تم نے خان بابا!" سلطان شاہ خوفزدہ ہوئے بغیر سپاٹ لہجے میں بولا۔ "تمھارے ہی حکم پر میں مقرب خان کے ساتھ گیا تھا، اب جو حکم دو گے اسی پر عمل کروں گا۔ ویسے موت کا ایک وقت مقرر ہے۔ جس وقت اور جیسے لکھی ہوئی ہے آکر رہتی ہے... میں بزدل نہیں ہوں۔"

"بزدلی اور مصلحت میں بڑا فرق ہوتا ہے سلطان شاہ!" عیسٰی خان نے نرم لہجے میں اسے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "دشمن پردے میں ہے اور ہم اس کے کھلے نشانے پر ہیں۔ کچھ پتا نہیں وہ کب وار کر جائے۔ تمھارے بارے میں میرا مشورہ یہ ہے کہ تم ابھی تیار ہوکر فوراً اسٹیشن چلے جاؤ اور جو گاڑی ملے یہ شہر چھوڑ دو، اسی طرح تم ان کی گرفت میں آنے سے محفوظ رہ سکو گے۔"

"مگر خان بابا! میں کرایہ کہاں سے لاؤں گا؟"

"یہ لو۔" عیسٰی خان نے جیب سے سو سو کے پانچ نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "ہمارے دشمن درندگی پر اتر آئے ہیں، انسانی خون کی یہ ارزانی اب میری برداشت سے باہر ہے، تم ان سے بچ گئے تو میں اسے اپنی جیت سمجھوں گا۔"

سلطان شاہ نے نوٹ خاموشی سے جیب میں ڈال لیے۔ "گزارے کے لیے کچھ اور مل جائے تو میں احسان مند رہوں گا خان بابا! ادھر نوکری ذرا مشکل ہی سے ملتی ہے۔"

عیسٰی خان نے مزید پانچ سو روپے اس کے حوالے کر دیے۔

ایک موہوم سا امکان ڈینی کے ذہن میں بھی تھا کہ تیسرا شہر سے ہی نہ نکل گیا ہو لیکن عیسٰی خان نے جس لب و لہجے میں سلطان شاہ کی شہر سے روانگی کی اطلاع دی، اس نے ڈینی کو مشکوک کر دیا۔ عیسٰی خان نے اس کی پچھلی رات روانگی کا ذکر کرکے یہ تاثر دینے کی کوشش کی تھی کہ سلطان شاہ، طارق کے قتل کی واردات رونما ہونے سے پہلے شہر سے بہت دور نکل چکا تھا لیکن ڈینی کو یہ بات بالکل غلط محسوس ہوئی تھی۔

اس نے عیسٰی خان کو مختصر ترین مہلت دینے کے ارادے سے اس کے دفتر کے قریبی بوتھ سے اسے فون کیا تھا اور کال ختم کرتے ہی اس کے قریب ایک ایسی جگہ اپنی کار پارک کی تھی جہاں سے وہ دفتر اور اس سے ملحقہ نیم پختہ ورکشاپ پر نظر رکھ سکے۔ اس کا اندازہ تھا کہ اگر سلطان شاہ اس وقت تک وہیں مقیم تھا تو عیسٰی خان اسے فوری طور پر دفتر بلکہ شہر سے نکال دینے کی کوشش کرے گا۔

وہ وہاں بیٹھا خاصی دیر تک سوچتا رہا کہ سلطان شاہ کے بارے میں کس طرح اپنی کارروائی کا آغاز کرے کیونکہ وہ تو اس کی شکل تک سے واقف نہیں تھا۔ اگر اس کا مطلوبہ آدمی اس کے سامنے سے بھی گزر جاتا تو وہ اسے پہچاننے کے قابل نہیں تھا۔

آخر کار اسے ایک انوکھی تدبیر سوجھ ہی گئی اور وہ کار کا انجن اسٹارٹ کرکے وہاں سے روانہ ہوگیا۔

چند منٹ بعد وہ ایک مرتبہ پھر پبلک بوتھ سے عیسٰی خان کے دفتر کا نمبر ملا رہا تھا۔

"عیسٰی خان گڈز ٹرانسپورٹ کمپنی؟" سلسلہ مل جانے پر اس نے بھاری لہجے میں سوال کیا اور اثبات میں جواب ملتے ہی عیسٰی خان سے بات کرنے کی خواہش کا اظہار کر بیٹھا حالانکہ عیسٰی خان کی آواز وہ پہچان گیا تھا۔

"میں عیسٰی خان ہی بول رہا ہوں بابا!" اس کی آواز سے اکتاہٹ عیاں تھی۔

"میں کرائمز برانچ کا انسپکٹر یوسف بول رہا ہوں۔ ابھی ابھی کسی نے تمھارے آدمی سلطان شاہ کو گولی مار دی ہے۔ اس کی جیب سے ملنے والے ایک کاغذ پر اس کا نام اور تمھارا پتا ملا ہے تم فوراً پہنچو تاکہ لاش کی شناخت کے بعد اگلی کارروائی کی جاسکے۔"

"مم... مگر سلطان شاہ تو یہاں موجود ہے۔" عیسٰی خان کا تحیّر آمیز اضطراری جواب سنائی دیا اور ڈینی کے لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"تو پھر مرنے والا اس کا کوئی شناسا ہوگا۔" ڈینی نے بے پروایانہ لہجے میں عجلت سے کہا۔ "موجود ہے تو اسے بھی ساتھ لیتے آؤ، لاش ککری گراؤنڈ کے نکڑ پر پڑی ہے۔"

"میری طبیعت خراب ہے۔" عیسٰی خان کی آواز میں اضمحلال سمٹ آیا۔ "مگر میں آرہا ہوں۔"

پھر جب عیسٰی خان کی کار دو مسافروں کو لے کر ککری گراؤنڈ

کی طرف روانہ ہوئی تو ٹریفک کے ہجوم میں ڈینی کی کار اس کے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ عیسٰی خان ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان تھا۔ اس کے پہلو میں ایک صحتمند نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔

لکری گراؤنڈ کے نزدیک پہنچ کر عیسٰی خان کی کار کی رفتار سست ہوگئی۔ شاید وہ انسپکٹر یوسف کی بتائی ہوئی جائے واردات تلاش کر رہا تھا پھر میدان صاف دیکھ کر شاید یک بیک اس کی عقل ٹھکانے آئی اور اس نے اپنی کار تیز کر دی۔

اس کی ڈرائیونگ میں رونما ہونے والی تبدیلی سے صاف ظاہر تھا کہ وہ دھوکے کا احساس ہوتے ہی خوفزدہ ہوگیا تھا۔

لی مارکیٹ پر ایک جگہ عیسٰی خان کی کار رکی اور دوسرے مسافر کو اتار کر آگے بڑھ گئی لیکن اب ڈینی کی توجہ کار کے بجائے اس سے اتارے جانے والے صحت مند نوجوان پر مرکوز تھی جس کے ہاتھ میں ایک پوٹلی بھی موجود تھی جسے لٹکائے وہ آہستہ آہستہ بس اسٹاپ کی طرف جا رہا تھا۔

عیسٰی خان نے دھوکے کا احساس ہوتے ہی جس طرح اپنے نوجوان ساتھی سے پیچھا چھڑایا تھا' اس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ نوجوان اپنی ذات کو درپیش سنگین خطرے سے پوری طرح باخبر نہیں تھا۔ ورنہ یوں آسانی سے کھلی فضا میں اپنے دشمن کے مہلک وار کا نشانہ بننے کے لیے نہ اتر پڑتا۔ بس اسٹاپ کی طرف بھی وہ سر جھکائے' اپنی دھن میں مگن بڑھا چلا جا رہا تھا جیسے اسے اپنے گرد و پیش سے کوئی خطرہ لاحق نہ ہو۔

ڈینی نے سست رفتاری سے کار آگے بڑھاتے ہوئے نوجوان کے پہلو میں روک دی پھر اسے سلطان شاہ کہہ کر پکارا تو وہ چونک پڑا۔

ڈینی نے مسکراتے ہوئے جھک کر اپنے برابر والی نشست کا دروازہ کھول دیا اور نوجوان کی حیرت کو نظر انداز کرتے ہوئے آہستہ سے بولا۔ "بیٹھ جاؤ' میں عیسٰی خان کی طرح قدر ناشناس نہیں ہوں' ہیرے اور پتھر کا فرق جانتا ہوں۔"

"مگر بھائی صاب! میں آپ کو نہیں جانتا۔" نوجوان متذبذب تھا۔

"دوست ہوں اور تمھاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔" ڈینی مسکرایا اور ناتجربہ کار نوجوان اپنی جسمانی برتری کے گھمنڈ میں بے پروایانہ انداز میں سر جھٹک کر کار میں سوار ہوگیا۔ اس نے پُرشور انداز میں دروازہ بند کر کے گویا ڈینی پر اپنی قوت کا اظہار کیا تھا۔

"کیسے دوست ہو اور کیا مدد کرنا چاہتے ہو؟" کار حرکت میں آنے کے کئی منٹ بعد بھی جب ڈینی خاموش رہا تو سلطان شاہ نے خود ہی سکوت توڑ دیا۔

"عیسٰی خان تم سے پیچھا کیوں چھڑانا چاہتا تھا؟" ڈینی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"اس کا خیال ہے کہ کوئی مجھے مارنا چاہتا ہے۔ مگر تم اسے کیسے جانتے ہو؟" نوجوان نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

"کبھی دوستی ہوا کرتی تھی ہماری۔" ڈینی نے گول مول سا جواب دیا۔ "تمھیں مارنے کی کوئی وجہ بھی رہی ہوگی؟"

"وجہ؟" سلطان خان نے غور سے اس کی طرف دیکھا پھر بولا۔ "تمھارے کپڑے قاعدے کے ہیں' دیکھنے میں شریف آدمی لگتے ہو لیکن جس طرح مرنے مارنے کی باتیں کر رہے ہو' اس سے پتا چلتا ہے کہ اتنے شریف نہیں ہو۔"

"کیا مطلب؟" ڈینی نے چونک کر سوال کیا۔ "میں نے وجہ پوچھی تھی' اپنی شرافت کے بارے میں تمھاری رائے نہیں پوچھی تھی۔"

"اگر شریف آدمی ہو تو مجھے یہیں اتار دو۔" سلطان شاہ نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں اپنی وجہ سے تمھیں کسی مصیبت میں ڈالنا نہیں چاہتا اور اگر دوسری لائن کے آدمی ہو تو میں خوشی سے تمھیں ہر بات بتاتا چلا جاؤں گا۔"

"دوسری لائن کا آدمی سمجھو مجھے۔" ڈینی نے کار کی رفتار برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ اسے سلطان شاہ کا دوٹوک انداز بہت پسند آیا تھا۔

"میں سات جماعت پڑھا ہوا ہوں۔" سلطان شاہ بتانے لگا۔ "دل میں امیر بننے کی خواہش لے کر کراچی آیا تھا مگر یہاں مرضی کا کوئی کام نہیں ملا تو عیسٰی خان کے پاس نوکری کر لی۔ ایک دن مقرب خان مجھے اور عقرب خان کو ساتھ لے کر کسی کے گھر میں جا گھسا تھا۔ پھر وہ دونوں بھائی مارے گئے اور خان بابا کہتا ہے کہ قاتل مجھے بھی مار دے گا کیونکہ اس رات میں نے مقرب خان کا ساتھ دیا تھا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ مقرب خان کے مرنے کے بعد خان بابا مجھ پر بھروسا کرنے لگے گا مگر وہ ڈرتا ہے۔ اب میں شہر چھوڑ کر واپس جا رہا ہوں۔"

"امیر بننے کی آرزو نہیں رہی اب؟"

"آرزو تو ہے مگر کوئی گھاس ڈالنے کو تیار نہیں۔" وہ افسردہ لہجے میں بولا۔ "مقرب خان نے بھی اپنے کاموں کی ہوا نہ لگنے دی۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس طرح خان بابا کی نظروں میں اس کی اہمیت کم ہو جائے گی۔"

"پھر تم نے مقرب خان کے قاتل کو کیوں مارا؟" ڈینی اچانک سوال کر بیٹھا۔ "تمھیں تو اس سے ہمدردی ہونی چاہیے تھی۔"

سلطان شاہ پھیکے انداز میں ہنسا۔ "دکھ تو یہی ہے کہ یہاں پیونٹی کا بھی خون کرنے کا موقع نہیں ملا اور اب ناکام واپس جا رہا ہوں۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ مقرب خان کو مارنے والا

[کو]ن تھا۔"

ڈینی کو یقین آگیا کہ وہ سچ بول رہا تھا۔ اس کے بارے [می]ں قائم کیے ہوئے نظریات اسے بے بنیاد نظر آنے لگے تھے اور [اس]ے افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے بلاوجہ ہی اس کے پیچھے لگ کر [وق]ت کے ساتھ ہی اپنی توانائی بھی برباد کی۔

"مقرب خان مجھے ساتھ ملا لیتا تو دونوں بہت فائدے [م]یں رہتے۔" سلطان شاہ کہہ رہا تھا۔ "وہ پشاور کا رہنے والا تھا۔ [م]یرا گاؤں قبائلی علاقے میں ہے۔ وہاں میرے چچا کا لڑکا لیبارٹری [چ]لا رہا ہے۔ اس سے گورے مال لے جاتے ہیں۔ ہم لوگ بھی ہیروئن لا کر یہاں بیچتے تو بہت نفع ملتا۔"

ڈینی چونک پڑا۔ "تم ہیروئن بنانے والوں سے واقف ہو؟"

"بس چچا کے لڑکے کو جانتا ہوں۔" سلطان شاہ نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "سنا ہے یہ بہت ٹیڑھا کام ہے۔ مومن خان آفریدی نے پہلی فیکٹری لگائی تو بہت مال برباد کیا پھر تیس ہزار تنخواہ پر جرمنی سے ایک آدمی کو بلایا تو کام قابو میں آیا۔ سنا ہے کہ اب تو کئی لیبارٹریاں کھل گئی ہیں۔"

"شہر میں کوئی ٹھکانا ہے تمھارے پاس؟" ڈینی نے سوال کیا۔ اپنے اوصاف کی بنا پر سلطان شاہ اسے کام کا آدمی نظر آ رہا تھا۔

"پٹھان کالونی میں ایک رشتے دار رہتا ہے مگر تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟" اس نے تجسس آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"میں تم سے کام لینا چاہتا ہوں... عیسٰی خان سے تمھارا کیا فیصلہ ہوا؟"

"نوکری ختم کر کے ملک جا رہا ہوں... اس نے مجھے ہزار روپے دیے ہیں۔"

"اور تنخواہ کیا ملتی تھی اس سے؟"

"روٹی اور سونے کی جگہ کے ساتھ سات سو ملتے تھے۔" سلطان شاہ نے بتایا۔

"تو پھر آج سے خود کو ہزار روپے پر ملازم سمجھو۔" ڈینی نے اس کے بائیں شانے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"کام کیا ہوگا؟" سلطان شاہ نے مسرت آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"وقت آنے پر بتا دیا جائے گا۔" ڈینی نے کار ایک طرف روک دی اور جیب سے ہزار روپے کے نوٹ نکال کر اسے تھما دیے۔ "یہ تمھاری پیشگی تنخواہ ہے۔ اب تمھیں شہر سے بھاگنے کی ضرورت نہیں' تمھارے دشمنوں سے میں خود نمٹ لوں گا۔"

"مگر میں تم سے کیسے مل سکوں گا؟" سلطان شاہ نے نوٹ اپنی جیب میں منتقل کرتے ہوئے سوال کیا۔

"اس کی ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی۔" ڈینی نے کہا۔ "پرسوں دوپہر کے بارہ بجے سول اسپتال کے گیٹ پر مل کر اپنا پتا دے دینا' اگلا پروگرام وہیں بتاؤں گا۔"

سلطان شاہ نے گرمجوشی کے ساتھ ڈینی سے ہاتھ ملایا اور کار سے اتر گیا۔ ڈینی سوچ رہا تھا کہ وہ جس کے قتل کا منصوبہ بنا کر دفتر سے اٹھا تھا' اسے اپنے نمک خواروں میں شامل کر کے گھر لوٹ رہا تھا۔ دراصل اس نے سلطان شاہ میں دلیری اور وفا کی خوبیاں محسوس کر لی تھیں اور اندازہ لگایا تھا کہ باہر کا وہ آدمی سکندر علی کے خلاف مہم میں اس کا جانثار ساتھی ثابت ہو سکے گا جب کہ مقامی طور پر وہ کسی کو اعتماد میں نہیں لینا چاہتا تھا کیونکہ کچھ پتا نہیں تھا' کون کس کے لیے کام کر رہا تھا۔

✱

سکندر علی اس وقت شکست کی تصویر بنا اپنی خوابگاہ میں مسہری پر نیم دراز تھا اور اس کی خوبصورت سیکرٹری بستر کے قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھی اس کے لیے اسکاچ کا گلاس تیار کر رہی تھی۔

"اس قدر اداس کیوں ہو ڈارلنگ؟" سیکرٹری نے گلاس ایک ادا سے اس کی طرف بڑھاتے ہوئے محبت آمیز لہجے میں کہا۔

"میں بکھر رہا ہوں رخشی!" بوجھل فضا میں اس کی اداس اور خوابناک آواز ابھری۔ "ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے میری ذات میں ٹوٹ پھوٹ کے عمل کا آغاز ہو چکا ہو۔ دو دن گزر گئے ہیں بے خواب راتیں میں نے بستر پر پہلو بدل بدل کر گزاری ہیں لیکن چند گھڑی کے لیے سکون کی نیند نہیں سو سکا۔"

"تم اسے ذاتی توہین سمجھ رہے ہو' چوریاں تو بڑے بڑے سورماؤں کے یہاں ہو جاتی ہیں اور وہ کچھ نہیں کر پاتے۔ پھر اس رات تم گھر پر بھی تو نہیں تھے۔ یہی غنیمت ہے کہ یہ کمرہ اس کی دست برد سے محفوظ رہا...."

"چور کسی کی آبرو پر ہاتھ نہیں ڈالتے۔" وہ اندر سے دکھی معلوم ہو رہا تھا۔ اس کا ایک ایک لفظ اندرونی کرب میں ڈوبا ہوا تھا۔ "اس نے میری چھت کے نیچے تم پر ہاتھ ڈالا' یہ میرے لیے بدترین گالی ہے... شاید تم اسے نہ سمجھ سکو کیونکہ تم ملکیت کے تصور سے ناآشنا ہو' پھر وہ تمھارے کمرے سے ہر قیمتی چیز لے گیا مگر تمھاری سائڈ ٹیبل کی دراز میں پڑا ہوا ٹرانسمیٹر چھوڑ گیا۔ جاہل اور بے خبر تھا تو اسے کوئی قیمتی چیز سمجھ کر لے جاتا' سمجھ دار تھا تو اسے چھوڑنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ وہ اسے کیوں چھوڑ

گیا۔ آپریٹس غائب ہوتا تو شاید میں اتنا پریشان نہ ہوتا جتنا اب ہوں۔"

"ہوسکتا ہے کہ اس نے اسے بے وقعت جیبی ریڈیو سمجھ کر نظر انداز کر دیا ہو۔" وہ نرم اور تشفی آمیز لہجے میں بولی پھر ہچکچاتے ہوئے بات جاری رکھی۔ "شاید میں نے اپنے بارے میں تمھیں بتا کر بلاوجہ پریشان کیا۔ تم میرے ماضی سے اچھی طرح واقف ہو۔ نہ میں پہلے عزت دار تھی نہ اب تمھاری بیوی ہوں۔ یہی سوچ کر تمھیں صبر کر لینا چاہیے۔"

"بکواس مت کرو رخشی!" وہ اتنے تیز لہجے میں غرّایا کہ وہ کانپ اٹھی۔ "تمھارا ماضی ضرور تمھارا اپنا تھا مگر اب میں تمھارے ایک ایک لمحے کا مالک ہوں۔ ماضی کے حوالے سے نہ تمھاری غلطی معاف کروں گا نہ کسی کا تصرف برداشت کر سکتا ہوں۔"

رخشی درست کہہ رہی تھی۔ وہ کبھی بھی آبرومند نہیں رہی تھی مگر سکندر علی نے اسے دیکھا تو پسند کر بیٹھا پھر اتفاق کہ اوپر والوں نے بھی اسے رخشی کو اپنے ساتھ رکھنے کا مشورہ دیا اور وہ اس کے گھر میں منتقل ہوگئی۔ وہ سکندر علی کے ہر روپ سے واقف تھی۔ لہٰذا اس نے اپنی آسانی کے لیے اسے سیکرٹری مقرر کر لیا مگر اس کا مزاج آمرانہ تھا۔ وہ اپنے تصرف میں آئی ہوئی ہر جاندار اور بے جان چیز کے بارے میں بہت حساس تھا اور اس بارے میں ذرا بھی نرمی نہیں دکھاتا تھا۔ چوری کی پُراسرار واردات نے اسے بری طرح ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اگر اسے اپنے اور تنظیم کے غیر قانونی مفادات کا پاس نہ ہوتا تو وہ سارے وسائل داؤ پر لگا کر بھی چور کا سراغ لگانے سے منہ نہ موڑتا لیکن یہ چوٹ اسے خاموشی سے برداشت کرنی پڑی۔ چور کی تلاش تو کجا وہ پولیس سے رجوع کرنے کی ہمت بھی نہ کر سکا۔ برسوں کی بنی بنائی ساکھ اسے خطرے میں نظر آرہی تھی اور تابوت کی آخری کیل کسی بھی لمحے بڑی جا سکتی تھی۔

اس نے رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی جو شام کے ساڑھے پانچ بجا رہی تھی اور نو بجے سے پہلے اسے ایک اہم پیغام ملنے والا تھا جس کے انتظار میں وہ کھڑکیوں پر دبیز پردے کھینچے قمقموں کی دھیمی روشنی میں شراب سے دل بہلا رہا تھا۔

اس نے سوچا کہ ڈی ون گھر پہنچ چکا ہوگا۔ لہٰذا اس کے حصّے کا کام نمٹا ہی لیا جائے اس نے اشارہ کیا اور رخشی نے ڈبل فری کوئنسی ٹرانسمیٹر اس کی طرف بڑھا دیا۔

سکندر علی نے ایریل باہر نکال کر آپریٹس آن کیا اور بٹن دبا کر آپریٹس کا سبز بلب آن کر دیا۔ اب وہ اسی فری کوئنسی پر ڈی ون سے بات کر سکتا تھا کہ کوئی تیسرا ان کی گفتگو نہ سن سکے۔

"اِٹ از بی فور کالنگ ڈی ون... اوور" اس ... ہوئی خوابناک آواز میں کہا اور چند ہی ثانیوں میں دوسر... سے جواب مل گیا۔

"تمھیں ٹھیک ساڑھے نو بجے جیوا ہاؤز پہنچنا ہے ڈی..."

"او۔کے باس!" دوسری طرف سے مستعدانہ جواب ملا ... دن سے کوشش کے باوجود رابطہ قائم نہ کر سکا سر! پتا نہیں ... کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہے۔ شاید آپ کے تو علم میں ہو..."

"بے خبر رہ کر ہم زندہ نہیں رہ سکتے۔" سکندر علی خوابناک لہجے میں کہا۔ "وہ تمھارا اچھا کارکن تھا، اپنی غلطیو... پر مارا گیا۔ اب اسے بھول کر اس کا بدل تلاش کرنے کی ... کرو... سب لوگ اسی کو روتے رہیں گے تو خود بھی ... جا ملیں گے... اوور۔"

"میں صرف یہ جاننا چاہ رہا تھا سر! کہ اس کی مو... سلسلے میں ہمیں تو کوئی قدم نہیں اٹھانا۔ اوور۔"

"کچھ نہیں۔" وہ بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے اپنی پیشا... ہوئے بولا۔ "جو کچھ ہوا، اچھی طرح میرے علم میں ہے۔ ی... یہیں ختم سمجھو۔ تمھیں ٹھیک ساڑھے نو بجے جیوا ہاؤز پہنچنا... عمارت ویران اور مقفل ہے۔ پھاٹک کے ذیلی دروازے ... سے کنڈی لگی ہوئی ہے، اسے کھول کر تم اندر جاؤ گے تو ا... کے داہنے گوشے میں رکھے ہوئے کیکٹس کے گملے میں چابی... گچھا دبا ہوا ملے گا۔ پھاٹک کا قفل کھول کر تم گاڑی اندر ل... گے اور روشنیاں جلانے کے بعد برآمدے ہی میں رکو گے..."

"عمارت کے دروازے بدستور مقفل رہیں گے سر؟" ا... دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

"احمق ہو۔" وہ قدرے جھلا گیا۔ "چابیاں ملنے کا مط... کہ ہر قفل کھول دیا جائے۔ اوور اینڈ آل۔"

سلسلہ منقطع کر کے اس نے ٹرانسمیٹر مسہری پر ایک ڈال دیا۔ رخشی نے اسے اٹھا کر آف کر دیا۔

"اسے جیوا ہاؤز میں کیوں بلایا ہے؟" رخشی نے آ... سے سوال کیا۔

وہ گلاس سے ایک لمبا گھونٹ لے کر ہونٹوں پ... پھیرتے ہوئے پھیکے انداز میں مسکرا دیا۔ "بس دیکھتی جاؤ۔ میر... حس بتا رہی ہے کہ آج کی رات فیصلہ کُن ثابت ہونے وال..."

رخشی جھرجھری لے کر رہ گئی کیونکہ وہ سکندر علی کے لب و لہجے سے خوب واقف تھی جو وہ عموماً خطرناک مو... اختیار کرتا تھا۔

باس

کی اس کال نے مجھے بوکھلا کر رکھ دیا۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ جیوا ہاؤز کی عمارت خالی کرانے کے بعد میری وہاں طلبی کا کیا جواز تھا؟ اگر وہاں بلائے جانے کا تعلق تنظیم کے عام امور سے تھا تو محافظوں کو رخصت کرنے کی سرے سے ضرورت ہی نہیں تھی۔ اس سے پہلے بھی جیوا ہاؤز میں کسی غیر معمولی تبدیلی کے بغیر اہم ترین کام سرانجام دیے جا چکے تھے مگر اس بار انداز ہی کچھ بدلا ہوا تھا۔ میرے دل میں چور تھا کیونکہ میں رات کی سیاہی سے فائدہ اٹھا کر سکندر علی کے مکان میں واردات کا ارتکاب کر چکا تھا اور اس راز سے بھی آگاہ ہو چکا تھا کہ باس، بی فور اور سکندر علی ایک ہی شخصیت کے تین نام تھے۔ "تو کیا چوری کے سلسلے میں سکندر علی کو میری ذات پر شبہ ہو گیا تھا؟" میں نے سوچا اور میرے بدن میں سنسنی کی لہر سرایت کر گئی۔

اگر میرا یہ خدشہ درست تھا تو جیوا ہاؤز میں میرے لیے چوہے دان تیار کیا گیا تھا۔ وہاں رہنے والوں کو ہٹا دیا گیا تھا۔ جہانگیر کو بھی اس عمارت سے دور رہنے کا حکم دیا جا چکا تھا جس کا واضح مطلب تھا کہ ان دو دنوں میں اس عمارت میں جو کچھ ہوتا اس کا کوئی گواہ نہ ہوتا۔ اگر سکندر علی میری طرف سے شکوک میں مبتلا ہو ہی گیا تھا تو یقینی طور پر مجھے جیوا ہاؤز بلا کر خاموشی سے اپنا قیدی بنانا چاہتا تھا تاکہ کسی کی مداخلت کے خطرے کے بغیر مجھ سے تشدد آمیز باز پُرس کا آغاز کر سکے اور میرے اعترافات کی روشنی میں میرے مستقبل کا فیصلہ صادر کر سکے جو میری دانست میں فوری سزائے موت سے ہرگز کم نہ ہوتا کیونکہ سکندر علی شہر کے معاشرتی اور سماجی حلقوں میں مقبول شخصیت کا مالک تھا۔ وہ ہرگز یہ گوارا نہ کرتا کہ اس کی دوہری شخصیت کے راز سے واقف ہونے والا کوئی شخص زندہ رہ سکے۔

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کروں؟ جیوا ہاؤز کا رخ کرتا تو تشدد اور پھر ہلاکت کا روح فرسا خطرہ ذہن میں منڈلا رہا تھا اور نہ جانے کی صورت میں بھی گلو خلاصی کی کوئی راہ نظر نہیں آرہی تھی۔ سب سے پہلے تو حکم سے انحراف کرنے پر میں بغاوت کا مرتکب قرار پاتا پھر مقررہ وقت پر میری غیر حاضری اعترافِ جرم کے مترادف ہوتی اور مفاہمت کے موہوم ترین امکانات بھی معدوم ہو کر رہ جاتے۔

کافی سوچ بچار کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے مسلح ہو کر مقابلے کی تیاریوں کے ساتھ مقررہ وقت سے ذرا پہلے جیوا ہاؤز پہنچ جانا چاہیے تاکہ اپنے طور پر وہاں پائی جانے والی صورت حال کا جائزہ لے سکوں۔ اس فیصلے میں یہ عنصر بہت اہم ثابت ہوا تھا کہ اگر میری طلبی کسی اہم تنظیمی معاملے سے ہی متعلق تھی تو جیوا ہاؤز نہ جا کر میں خود کو بلاوجہ مشتبہ بنا لیتا اور اگر سکندر علی کی نیّت میں کوئی فتور آگیا تھا تو وہاں نہ جانے کے باوجود میں خود کو انتقامی کارروائیوں کا نشانہ بننے سے نہیں بچا سکتا تھا۔ سارا انحصار بس اس بات پر تھا کہ میں کس حد تک مدافعت اور جوابی کارروائی کا اہل تھا۔

جب سے میں ہیروئن کے برآمدی معاملات میں ملوث ہوا تھا، مجھے جہانگیر، طارق اور نادر سے الگ رہنے کا حکم ملا ہوا تھا اور میں نے فون پر بھی ان میں سے کسی سے رابطہ قائم نہیں کیا البتہ ڈی ون کے طور پر باس کی غیر حاضری میں جہانگیر سے رپورٹ لیتا اور ہدایات جاری کرتا رہا تھا۔

نادر سے کبھی بھی میں نے ذہنی ہم آہنگی محسوس نہیں کی تھی۔ اس سے مراسم بڑھنے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ جہانگیر اور طارق کا گہرا دوست تھا اور ان کے ساتھ ہر کام میں شریک ہوتا تھا۔ طارق بے چارا مارا جا چکا تھا۔ اب لے دے کر جہانگیر ہی میرا ایسا قابلِ اعتماد ساتھی تھا جس سے میں ذرا کھل کر بات کر سکتا تھا اور اب تو طارق کے قتل نے ایک ایسی غیر معمولی صورت حال پیدا کر دی تھی کہ ہمارا باہمی رابطہ شاید ہدایات کی خلاف ورزی نہ سمجھا جاتا۔

میں نے فون پر نمبر ملایا تو دوسری طرف سے جہانگیر کی بیوی سلمٰی کی آواز سنائی دی۔ "ڈینی بول رہا ہوں بھابی! کیا حال ہیں آپ کے؟" میں نے جہانگیر کو بلانے سے پہلے رسمی طور پر اس کی مزاج پُرسی کر ڈالی۔

"حال خراب ہیں تنویر بھائی!" وہ شروع ہی سے ڈینی کے بجائے مجھے اصل نام سے پکارتی تھی۔ "آپ کے دوست آج کل حفاظت کے خبط میں مبتلا ہیں اور آپ بھی مرے سے غائب ہیں ورنہ شاید آپ کی بات ان کی سمجھ میں آجاتی۔"

"او ہو۔" اپنے ذہن میں موجود خدشات کی بنا پر میں چونک پڑا۔ طارق مارا جا چکا تھا۔ میں خود خطرہ سر پر منڈلاتا محسوس کر رہا تھا اور اب جہانگیر کے بارے میں ایسی ہی خبر مل رہی تھی۔ "کیا ہوا؟ کس سے حفاظت کے بارے میں پریشان ہے جہانگیر؟"

"مجھے تو کچھ بتاتے ہی نہیں۔" ایک گہرے سانس کے بعد اس کی آواز ابھری۔ "کچھ گمنام دشمن پیدا ہو گئے ہیں جن کی وجہ سے گھر کو قلعہ میں تبدیل کر دیا ہے۔ پہلے مسلح محافظ رکھے اور اب دو منحوس صورت کتّوں کا بھی اضافہ ہو گیا ہے جن کی وجہ سے میرا تو لان پر ٹہلنا تک بند ہو گیا ہے، ذرا فرصت ہو تو آپ خود یہاں آکر تماشا دیکھیں۔ اس وقت بھی کتّوں کے رکھوالے سے باتیں کر رہے ہوں گے۔"

"یہ تو عجیب بات بتا رہی ہیں آپ۔" میں فکر مندانہ لہجے میں

بولا۔" موقع ملا تو ابھی آتا ہوں' پہلے آپ ذرا جہانگیر سے میری بات کرا دیں۔"

" آپ ہولڈ کریں' میں دیکھتی ہوں کہ وہ کہاں ہیں۔"

لائن پر سکوت چھا گیا اور میرے ذہن میں شیطانی چرخہ چل پڑا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کہیں نادر بھی ایسے ہی حالات سے دوچار نہ ہو۔ شاید سکندر علی کو ہم چاروں سے کوئی خطرہ لاحق ہو گیا تھا اور وہ ہمیں ایک دوسرے سے الگ کر کے ٹھکانے لگانے پر تل گیا تھا۔ طارق کے قتل کے حالات سامنے نہیں آئے تھے مگر چند روز قبل اس کے احاطے میں مقرب خان کے پُراسرار قتل سے یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ بی فور بذات خود یا اس کا کوئی آدمی طارق کے پیچھے لگا ہوا تھا اور اس حد تک با اختیار تھا کہ اس کے مکان کی چار دیواری میں اسے شبہے کا موقع دیے بغیر قتل کی واردات کا ارتکاب کرنے پر قادر تھا۔ عین ممکن تھا کہ اسی شخص نے بی فور کے ایما پر طارق کو اس کی خواب گاہ میں قتل کیا ہو اور خود صاف نکل گیا ہو۔

" ہیلو... کہاں مرے ہوئے ہو تم؟" ریسیور پر جہانگیر کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

" میں تو جہاں ہوں سو ہوں' تم سے اتنا بھی نہ ہوا کہ فون کر کے خیریت ہی معلوم کر لیتے۔" میں نے خشک لہجے میں کہا۔

" میں بہت پریشان ہوں یار!" جہانگیر کا لہجہ یک لخت دھیما اور رازدارانہ ہو گیا۔" ہو سکے تو ادھر چلے آؤ' کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ طارق کا انجام تو تم نے آج کے اخبارات میں پڑھ ہی لیا ہو گا۔ اس سالے باس نے تو ہمیں توپ کے دہانے سے باندھ دیا ہے۔"

" اسی لیے کتوں کے پلّوں کا سہارا لیا ہوا ہے؟" میں نے معنی خیز لہجے میں طنز کیا۔

" فون پر بات نہیں ہو سکتی۔" اس نے جلدی سے اسی رازدارانہ لہجے میں کہا۔" سلمیٰ سُن گُن لینے کے چکر میں آس پاس ہی منڈلا رہی ہے۔ بس جلدی سے آ جاؤ' میرے پاس رائل سیلوٹ آئی ہوئی ہے۔ مزہ آ جائے گا۔"

" میں آ رہا ہوں' لیکن اپنے کتوں کو ذرا باندھ کر رکھنا۔"

" فکر مت کرو' سالے دو ہی دن میں میرے اشاروں پر چلنے لگے ہیں' ٹرینر بہت زبردست ملا ہے۔" جہانگیر کا جواب سن کر میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ میں نے برسوں بعد جہانگیر کو اس پرانے لب و لہجے میں بے تکلفی سے بات کرتے سنا تھا۔ ورنہ جب سے گروہ کی سربراہی اسے سونپی گئی تھی۔ وہ مجھے اپنا ماتحت سمجھ کر اکثر اپنی برتری کے اظہار پر تلا رہتا تھا یہ اور بات تھی کہ میں باس کے نمائندے کے طور پر اسے ڈانٹ پھٹکار کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتا تھا مگر ہمیشہ ہی مجھے یہ خلش رہتی تھی کہ کاش میں جہانگیر کو یہ جتا سکوں کہ بظاہر گروپ کی سربراہی مل جانے کے باوجود وہ ... ہی کو جواب دہ ہے۔

جہانگیر کے اس بدلے ہوئے رویّے سے ظاہر ہو رہا ... بُرے حالات سے دوچار تھا اور اپنی مشکلات سے نجات ... تلاش کرنے کے لیے مجھ سے پرانے جگری مراسم کی تجدید پر آمادہ ... میرے لیے جہانگیر کے تفکرات سے زیادہ اہم بات یہ تھی ... خود پریشان تھا اور اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے مجھے ... ہمراز کی ضرورت تھی۔ لہٰذا میں بھرا ہوا پستول ساتھ لے کر فوراً ... کی طرف روانہ ہو گیا۔ میرا ارادہ تھا کہ جہانگیر کے گھر سے سیدھا ... کی طرف روانہ ہو جاؤں گا۔

جہانگیر کے مکان کے احاطے میں دور ہی سے چراغاں ... میرا ماتھا ٹھنکا پھر پھاٹک پر ہیڈ لیمپس کی روشنیاں پڑتے ہی ... کے برابر والے چھوٹے دروازے سے ایک رائفل بردار شخص با... آیا۔ میں نے ہیڈ لیمپس گل کر دیے۔ رائفل بردار محافظ نے دو... سے عقابی نظروں سے کار کے اندرونی حصے کا جائزہ لیا اور پھر ... غائب ہو گیا۔ اگلے ہی لمحے میری کار کے لیے پھاٹک کھول دیا گیا ... میں کار اندر پورچ تک لیتا چلا گیا۔

احاطے کی دیوار کے ساتھ آہنی کھمبوں پر لگے ہوئے ... سارے ہی بلب روشن تھے اور اس روشنی میں سرسبز لان پر ... شاید میرا منتظر تھا۔ وہ جیسے ہی میری کار کی طرف لپکا اس کے ... کھڑے ہوئے دو خونخوار کتے بھی اس کے ساتھ آگے بڑھے او... دروازہ کھولتے کھولتے ٹھٹک گیا۔ بڑے بالوں والی دُموں اور ... جیسی تھوتھنی والے وہ کتے اپنے چوکنے انداز سے بہت خطرناک ... آ رہے تھے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کسی بھی لمحے کسی پر جھ... پڑیں گے۔

" اتر آؤ۔ میری موجودگی میں کچھ نہیں کہیں گے۔" جہانگیر ... یہ کہتے ہوئے میری سمت کا دروازہ کھول دیا اور میں جھکتے ہو... کار سے نیچے اتر آیا۔ ان میں سے ایک کتے نے سرخ آنکھیں ... پر مرکوز کر کے خونخوار دھیمی آواز میں غرّانا شروع کیا' میں درو... کھلے ہوئے دروازے سے کار میں چھلانگ لگانے کے بارے ... سوچ ہی رہا تھا کہ جہانگیر کے ڈانٹنے پر اس کتے نے غرّانا بند کر ... دم ہلاتے ہوئے اس کے پیر سونگھنے شروع کر دیے۔

" دیکھا تماشا تنویر بھائی!" ڈرائنگ روم میں داخل ہو... ہی مجھے سلمیٰ کی کھنکتی ہوئی آواز سنائی دی۔ شاید وہ کسی کھڑکی کا پرد... ہٹائے سارا منظر دیکھ رہی تھی۔

" پتا نہیں تمھیں تاک جھانک میں کیا مزہ ملتا ہے۔" جہانگیر ... لہجے میں بولا۔" دنیا جہان میں گھر کی حفاظت کے لیے کتے پالے ... ... لے آیا تو بس تمھیں ان کا وجود ہی ناگوار گزر رہا ہے ہر بات ... ایک تماشا نظر آنے لگا ہے تمھیں۔"

وہ شوخ انداز میں ہنستے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔ میں نے ... محسوس کیا کہ وہ جہانگیر کو چڑا کر لطف اندوز ہو رہی تھی۔" اپنی توجو ... بیٹھیں ہیں سو ہیں' اس عورت نے الگ دماغ خراب کیا ہوا ہے۔" ... کے چلے جانے پر جہانگیر صوفے پر بیٹھتے ہوئے بڑبڑایا۔

" بھابی ذہین عورت ہیں۔" میں نے آہستہ سے کہا۔" ان حرکتوں کا کوئی منطقی جواز بتائے بغیر تم انھیں مطمئن نہیں کر سکو گے۔"

" میں اسے کیا بتاؤں؟" جہانگیر جھلّا گیا۔" میری خود عقل ماؤف ہو کر رہ گئی ہے' باہر نکلتے ہوئے بھی اب خوف آنے لگا ہے۔" پھر میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے تجسس آمیز لہجے میں بولا۔" تم خوف زدہ نہیں ہو طارق کے انجام سے؟"

" لازمی بات ہے۔" میں نے اس کی تائید کی۔" یہی معلوم نہیں کہ وہ اپنوں کا نشانہ بنا یا دشمنوں کی زد میں آیا... بے خبری میں اسی کی طرح ہم بھی مارے جا سکتے ہیں۔"

جہانگیر چونک پڑا۔" اپنوں کا نشانہ؟ یہ کس بنا پر کہہ رہے ہو تم؟"

" وہ کچھ لوگوں کی نگاہوں میں آ گیا تھا' ہو سکتا ہے کہ اس کی وجہ سے خطرہ محسوس کرتے ہوئے حفظِ ماتقدم کے طور پر اس کو راستے سے ہٹا دیا گیا ہو۔"

" مگر میری بی فور سے بات ہوئی ہے۔" وہ بولا۔" اگر طارق کو سزا ہی دی گئی ہوتی تو وہ ضرور تذکرہ کرتا۔"

" بی فور کون ہے؟" میں نے معصومانہ لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا اور جہانگیر سٹپٹا گیا۔ سب لوگ اس بات سے تو واقف تھے کہ اسے کسی اور سے ہدایات ملتی ہیں لیکن بعد کے دوسرے انتظامات جہانگیر نے اپنی ذات تک محدود رکھے تھے۔ اسے افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے بے خیالی میں میرے سامنے بی فور کا نام کیوں لیا۔ اب وہ فوری طور پر کوئی قلابازی بھی نہیں کھا سکتا تھا۔ ورنہ میں اس کی طرف سے بدظن ہو جاتا۔

" پہلے جس سے ہدایات ملتی تھیں' وہ ڈی ون تھا۔" جہانگیر نے تھوک نگلتے ہوئے رازدارانہ لہجے میں کہا۔" بی فور اس سے اوپر ہے۔ اب وہ بھی براہِ راست مجھ سے بات کرنے لگا ہے لیکن یہ راز تم اپنی ہی ذات تک محدود رکھنا۔"

" تو یوں کہو کہ آج کل اونچے اُڑ رہے ہو۔" میں معنی خیز لہجے میں بولا۔

" مجھے تو لگتا ہے کہ یہ سب شامت کے آثار ہیں۔" وہ بے بسی سے بولا۔" مخبری کی مہم چلا کر ہم نے اپنے پیروں پر خود کلہاڑی ماری ہے۔ شہر میں باخبر لوگ جانتے ہیں کہ ہیروئن کا کاروبار میں چلا رہا ہوں۔ بی فور اور ڈی ون تو محض دو آوازیں ہیں جن کے وجود سے بس میں ہی واقف تھا یا اب تمھیں اس راز میں شریک کیا ہے۔ یہ بتاؤ کہ لاکھوں کا نقصان اٹھانے والوں کو اگر ہم پر مخبری کا شبہہ ہو جائے تو ہم کہاں ہوں گے؟"

" سوچ تو درست ہی ہے تمھاری۔" میں فکرمندانہ لہجے میں بولا۔" لیکن ہم کر ہی کیا سکتے ہیں؟ جس دن کسی ہدایت سے انحراف کیا' ہمارے خلاف کارروائی ہو سکتی ہے۔ ڈی ون ہو یا بی فور' وہ دونوں پردہ نشین ہیں' لاکھوں کی آبادی میں محض آوازوں کی بنا پر ان کو تلاش کرنا ناممکنات میں سے ہے۔"

" بس اسی فکر نے جان آدھی کی ہوئی ہے... ورنہ مال کی نکاسی زوروں پر ہے اور روز بروز کھپت بڑھتی ہی جا رہی ہے۔"

" تم نے اچھا کیا کہ حفاظتی انتظامات کر لیے۔" میں نے مکّارانہ لہجے میں کہا۔" جیوا ہاؤز کی طرح اب یہاں پرندہ بھی پر نہ مار سکے گا۔"

" اور جیوا ہاؤز کی بھی سن لو۔" میری توقع کے مطابق گفتگو کا رُخ میری منزل کی طرف تبدیل ہو گیا۔" آج سے دو دن کے لیے اسے خالی کرا لیا گیا ہے۔ عملے کو چھٹی دے کر تالے ڈلوا دیے گئے ہیں۔ پرسوں صبح سے پہلے تم بھی ادھر کا رخ نہ کرنا۔"

" اس کی کیا ضرورت پیش آ گئی؟" میں نے پوچھا۔

" اللہ ہی جانتا ہے یا پھر بی فور کو معلوم ہو گا۔" جہانگیر اٹھتے ہوئے بڑبڑایا۔" اب تو مجھے اس تصور ہی سے ہول آنے لگے ہیں کہ میں برسوں سے ایک ایسے آدمی کے لیے کام کر رہا ہوں جس سے ذرا بھی واقفیت نہیں ہے' کوئی بھی گڑبڑ ہوئی تو بس اپنی ہی گردن پھندے کی زد میں آئے گی۔"

جہانگیر دیوار گیر الماری سے رائل سیلوٹ کی بوتل اور اس کے لوازمات لے کر لوٹا تو میں نے ایک نازک سوال کر ڈالا۔" کنارہ کشی کے بارے میں غور کر رہے ہو آج کل؟"

" ابھی یہ نوبت نہیں آئی۔" وہ پھیکی ہنسی کے ساتھ بولا۔" کام دھندا سب چوپٹ پڑا ہوا ہے۔ آمدنی کا سارا انحصار اسی لائن پر ہے۔ اوّل تو اتنی آسانی سے گلوخلاصی نہیں ہو سکے گی اور ہو بھی گئی تو تھوڑے ہی دنوں میں وہ سارے اثاثے بک جائیں گے جو برسوں کی محنت میں جمع کیے ہیں۔"

مجھے یہ اندازہ لگا کر خاصی تسلی ہوئی کہ جہانگیر کو تنظیم کے بڑوں کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا جس کا مطلب تھا کہ طارق کے بعد ہم تینوں کی باری آنے کے سلسلے میں میرے خدشات سرے سے بے بنیاد نہیں تو مبالغہ آمیز ضرور تھے اور میری جیوا ہاؤز میں طلبی فی الوقت بہت زیادہ سنگین مضمرات کی حامل نہیں ہو سکتی تھی۔

پھر ہم اسکاچ وھسکی کے سرور سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اعتماد کی فضا میں گفتگو کرتے رہے۔ مجھ کو اس سے معلوم ہوا کہ نادر خان ان دنوں بہت تیز جا رہا تھا۔ اس کے بعض کارندے اس قدر پُرجوش تھے کہ طبقاتی نفرت اور ذاتی دشمنی کی بنیاد پر اپنے ناپسندیدہ افراد کے بچّوں کو بھی ہیروئن کی لت میں مبتلا کرنے پر تُل گئے تھے اور اس مشن میں خاطر خواہ کامیابی حاصل کر رہے تھے۔ ان سرگرمیوں پر نہ جہانگیر کو کوئی اعتراض تھا اور نہ ہی میں نے ندامت محسوس کی۔ ہم دونوں ہیروئن کے بیوپاری تھے۔ ہماری روزی اور خوشحالی ہیروئن کی فروخت سے وابستہ تھی اور ہم ہر اس حربے کے حق میں تھے جو ہمارے مال کی کھپت میں فروغ کا باعث بن سکے۔ ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ اس مہم کی زد میں آنے والے کون لوگ تھے اور معاشرے کے کن طبقات سے وابستہ تھے۔

مجھ سے گفتگو کے دوران جہانگیر بار بار اپنی رسٹ واچ دیکھتا رہا۔ ایک بار میں نے اسے ٹوکتے ہوئے خود واپسی کا ارادہ ظاہر کیا لیکن جہانگیر نے زبردستی مجھے روک لیا۔ اس نے بتایا کہ آٹھ بجے اسے چند منٹ کے لیے ایک اہم کال کرنا تھی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ آٹھ اور سوا آٹھ کے درمیان بی فور یا ڈی ون کے پیغام کا انتظار کرنے کے لیے تخلیے میں جانے کا جواز پیدا کر رہا تھا۔

پھر آٹھ بجنے میں پانچ منٹ پر جہانگیر معذرت کرتے ہوئے اٹھ گیا۔ اس کے جاتے ہی میں نے بھی اٹھنے کا ارادہ کیا۔ میرا آپریٹس میری جیب میں موجود تھا اور میں پیٹ کی خرابی کے بہانے قریبی باتھ روم میں بند ہو کر بی فور اور جہانگیر کی متوقع گفتگو سننا چاہتا تھا لیکن اچانک ہی سلمیٰ کی آمد نے مجھے بیٹھے رہنے پر مجبور کر دیا۔ شاید وہ آس پاس ہی منڈلا رہی تھی اور جہانگیر کو جاتے ہوئے دیکھ کر موقع غنیمت سمجھ کر مجھ سے بات کرنے کے لیے اندر آ گئی تھی۔

"کچھ بتایا انھوں نے آپ کو؟" سلمیٰ نے اندر داخل ہوتے ہی بلاکسی تمہید کے پُرتجسّس لہجے میں سوال کیا۔

"کچھ نہیں۔" میں نے مایوسانہ لہجے میں کہا پھر سلمیٰ سے فون پر سنی ہوئی بات دہراتے ہوئے بولا۔ "وہی گمنام دشمنوں والا قصّہ ہے۔ بہت پریشان ہے بے چارا، کوئی سامنے ہو تو کچھ کارروائی بھی کی جائے، اب اپنا گھر مضبوط کرنے کے علاوہ اور کیا کیا جا سکتا ہے؟"

"آپ کو کچھ نہیں معلوم۔" سلمیٰ جوشیلے لہجے میں بولی۔ "جہانگیر کو سب معلوم ہے مگر وہ کسی کو کچھ نہیں بتاتے۔ پہلے کسی کریہہ آواز والے کے فون آتے رہتے تھے، وہ مجھ سے بھی بدتمیزی سے اور غراتے ہوئے لہجے میں بات کرتا تھا۔ مگر جہانگیر اس سے بات کرتے ہوئے اُدھر ہو جاتے تھے، سر سر کرتے ہوئے منہ سوکھتا تھا۔ مجھے کبھی اس کا نام نہیں بتایا بس یہ کہہ کر ٹال دیتے تھے کہ وہ ایک بڑا افسر ہے۔ جب سے اس کا فون آنا بند ہوا ہے، یہ پریشان رہنے لگے ہیں... تو پورا یقین ہے کہ وہی بھیڑیا ان کی پریشانیوں کا ذمے دار ہے۔"

سلمیٰ کی گفتگو میرے لیے چونکا دینے والی تھی۔ بظاہر ایک سیدھی سادی گھریلو خاتون تھی لیکن اپنے شوہر کے معاملات پر اس کی نظر بہت گہری تھی۔ جب تک باس خود جہانگیر سے رابطہ کرتا تھا، سارے معاملات فون پر ہی طے پاتے تھے اور میں آواز بدل کر جہانگیر کو احکامات جاری کرتا تھا۔ اس دوران میں کئی بار ایسا ہوا کہ نمبر ملنے پر میں نے سلمیٰ کی آواز سنی، ایسے مواقع پر گفتگو محدود رکھنے کے لیے میں درشت لہجہ ہی اختیار کرتا تھا، اگر اس بنا پر وہ مجھے بھیڑیے کے لقب سے یاد کر رہی تھی تو میری دانست میں پوری طرح حق بجانب تھی لیکن اسے یہ علم نہیں تھا کہ فون کا استعمال ترک کرنے کے بعد ٹرانسمیٹر ریسیور کا استعمال شروع ہو گیا تھا اور اس کا شوہر ایک کے بجائے دو تُند خو افسران کے چنگل میں پھنس گیا تھا۔

"اس وقت تک کچھ نہیں کیا جا سکتا جب تک جہانگیر زبان نہ کھولے۔" یہ کہتے ہوئے میں صوفے سے اٹھ گیا، سلمیٰ بھی دو قدم پیچھے سرکی، اس کی نگاہوں میں لحظہ بھر کے لیے عجیب سی امید بھری چمک ابھر کر معدوم ہو گئی تھی۔

"ب، بیٹھیے نا، آپ کیوں اٹھ گئے؟" وہ دوپٹہ درست کرتے ہوئے بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولی۔

"ذرا باتھ روم میں جاؤں گا۔" میں خفت آمیز لہجے میں بولا۔ "پیٹ میں کچھ گڑبڑ سی محسوس ہو رہی ہے۔" یہ درحقیقت ایک بہانا تھا۔ اصل بات یہ تھی کہ سلمیٰ کے تیز مشاہدے کا علم ہو جانے کے بعد میں اس وقت ایک لمحہ کے لیے بھی وہاں نہیں ٹھہرنا چاہتا تھا۔ اگر اس وقت آپریٹس پر کال موصول ہونے کا اشارہ ملتا تو اس آواز پر سلمیٰ میرے بارے میں بھی شبہات میں مبتلا ہو سکتی تھی۔ اس آپریٹس میں یہ ایک اچھائی یا خرابی تھی کہ اگر بی فور یا جہانگیر میں سے کوئی ایک دوسرے کے لیے پیغام نشر کرتا تو اس صورت میں بھی مجھے اشارہ موصول ہوتا اور میں سرخ بتی والی فری کوئنسی پر آپریٹس آن کر کے ان کی گفتگو سن سکتا تھا۔

سلمیٰ میرے راستے سے ہٹ گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے چہرے پر مایوسی کی ایک لہر سی دوڑ گئی تھی۔ شاید میرا رویّہ یا جواب اس کی توقع کے مطابق نہیں تھا۔ میں تقریباً دس منٹ تک باتھ روم میں بند رہا لیکن میرا آپریٹس بالکل بے جان رہا اور میں باہر آ گیا۔ ڈرائنگ روم میں رائل سیلوٹ کی بوتل دو خالی گلاسوں سمیت موجود تھی اور سلمیٰ شاید میرے انتظار سے اکتا کر واپس جا چکی تھی۔

میں شراب کے معاملے میں بلانوش تھا، پھر سامنے رائل سیلوٹ جیسی دھیمی آنچ موجود ہو تو میں پے در پے کئی جام پی کر بھی اپنے حواس

سے پوری طرح کام لے سکتا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ خطرناک مواقع پر حواس بحال ہونا ہی کافی نہیں ہوتا بلکہ جسمانی پھرتی بھی ضروری ہوتی ہے لہٰذا میں نے جہانگیر کی غیر حاضری میں ایک چھوٹا پیگ لینے پر ہی اکتفا کیا تا کہ ساڑھے نو بجے جب میں جیوا ہاؤز پہنچوں تو اپنی ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کو بھرپور طریقے پر بروئے کار لانے کے قابل ہوں۔

میں سگریٹ کے کش لیتے ہوئے گلاس سے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتا رہا۔ جہانگیر سے ملنے کے بعد اور کچھ ہوا یا نہ ہوا مگر میں ایک نمایاں تبدیلی ضرور محسوس کر رہا تھا کہ گھٹن کے احساس میں نمایاں کمی آ چکی تھی اور میں اپنی مہم کو بھول کر یہ سوچ رہا تھا کہ سلمیٰ جیسی ہوشیار اور ذہین عورت سے جہانگیر اپنی سرگرمیاں کب تک پوشیدہ رکھ سکے گا؟ اور وہ سب کچھ جان گئی تو جہانگیر کے ساتھ کیا رویّہ اختیار کرے گی؟

جہانگیر سوا آٹھ تک کا مقررہ وقت بی فور کی کال کے انتظار میں گزار کر لوٹا تو مجھے معلوم تھا کہ ان دونوں کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی کیونکہ مجھے اپنے آپریٹس پر کوئی اشارہ نہیں ملا تھا لیکن جہانگیر کو دیکھتے ہی میں اس پر فقرہ کسنے سے باز نہ رہ سکا۔ "کیا راز و نیاز ہو رہے ہیں؟ معلوم ہوتا ہے باس کی کال کا وقت تھا؟"

"جھک مار کر آیا ہوں۔" جہانگیر نے جھینپے ہوئے انداز میں بات اڑا دی۔ "تم گلاس خالی کرو تا کہ دوسرا تیار کروں۔"

"میں صرف ایک ڈبل اور لے سکوں گا۔" میں نے اپنا گلاس خالی کرتے ہوئے اعلان کیا۔ "تمھیں آٹھ بجے فون کرنا تھا۔ مجھے ساڑھے نو بجے کسی سے ملنا ہے۔"

"کس سے؟" جہانگیر تجسّس آمیز لہجے میں اضطراری طور پر سوال کر بیٹھا لیکن میں نے مسکرا کر سر کی جنبش سے انکار کر دیا۔ "میرا ذاتی معاملہ ہے اس سے تمھیں کوئی دلچسپی نہ ہونی چاہیے۔۔ ویسے بے فکر رہو کسی خاتون سے وقت طے نہیں ہے۔"

خاصا وقت ہم نے باتوں میں گزارا پھر ٹھیک نو بجے میں اٹھ گیا۔ میں جہانگیر کو اپنی مصروفیت کے بارے میں بتا چکا تھا۔ لہٰذا اس نے مجھے روکنے پر اصرار نہیں کیا بلکہ خود مجھے چھوڑنے باہر کار تک آیا جہاں دونوں کتے میری کار سے ذرا دور لان پر چوکنے انداز میں بیٹھے ہوئے تھے۔

جہانگیر کے مکان سے نکلتے ہی میرے ذہن پر پھر تازہ مہم سوار ہو گئی لیکن اس بار میں زیادہ پریشان نہیں تھا۔ خاصے غور و خوض کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر مجھے سرزنش کے لیے جیوا ہاؤز کی ویران عمارت میں نہیں بلایا گیا ہے تو یقینی طور پر مجھ سے تنظیم کا کوئی اہم رکن ملنے والا تھا جو غیر متعلقہ افراد کی نگاہوں میں آئے بغیر اپنا کام کرنا چاہتا تھا لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ ملاقات کے لیے اتنا بکھیڑا پھیلانے کی کیا ضرورت تھی کہ محافظوں کو ہٹانے کے ساتھ ہی جہانگیر کو بھی جیوا ہاؤز سے دور رہنے کی ہدایت دے کر چوکنا کیا جاتا۔ اس کی آسان سی ترکیب یہ ہوتی کہ شہر کے کسی بھی محفوظ علاقے میں مقررہ شناخت کے ذریعے مل بیٹھنے کے بعد دونوں فریق کسی کوڈ کے ذریعے ایک دوسرے کو پہچان لیتے۔ یوں ملاقات بھی ہو جاتی اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوتی کہ وہ کہاں اور کس لیے یکجا ہوئے تھے۔

آرام سے کار چلاتے ہوئے سوا نو بجے میں جیوا ہاؤز کے قریب پہنچ گیا۔ جہانگیر کا مکان روشنیوں میں نہایا ہوا تھا مگر جیوا ہاؤز کی عمارت تاریکی کی گہری چادر میں پوشیدہ تھی۔ دل میں ایک لمحہ کے لیے خیال پیدا ہوا کہ کہیں اندر قدم رکھتے ہی تاریکی میں کہیں سے کوئی ان دیکھی مصیبت نازل نہ ہو جائے لیکن میں ہر قیمت پر باس کی ہدایت پر عمل کر کے اس کے نتائج کا سامنا کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

جیوا ہاؤز کے مضبوط آہنی پھاٹک پر خلافِ معمول قفل پڑا ہوا تھا لیکن چھوٹے پھاٹک پر باہر سے کنڈی لگی ہوئی تھی۔ میں نے کنڈی سرکا کر اندر قدم رکھا تو گھور اندھیرے میں جھینگروں کا تیز شور گونج رہا تھا۔ میں نے جیب سے پینسل ٹارچ نکال کر روشن کی اور کیکٹس کا وہ گملا تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا جس میں جیوا ہاؤز کی چابیاں دبی ہوئی تھیں۔ میں نے مٹی کرید کر چابیاں حاصل کیں اور پھر باہر نکل آیا۔

پھاٹک کا قفل کھول کر میں نے آہنی پٹ اندر کی طرف دھکیلے اور پھر اپنی کار اندر پورچ تک لیتا چلا گیا۔ برآمدے کے سوئچ بورڈ پر موجود تمام بٹن میں نے آن کر دیے اور برآمدے کے ساتھ ہی پورچ بھی روشن ہو گیا۔ پھاٹک کے سنگین ستونوں پر لگے ہوئے برقی قمقمے بھی جل اٹھے تھے۔ میں نے واپس آ کر پھاٹک بند کیا اور دوبارہ اندر کی طرف لوٹتے ہوئے اپنے پستول کا جائزہ لینے لگا تا کہ کسی مشکل وقت میں اسے بلا تردّد استعمال کر سکوں۔

عمارت میں داخلے کے دروازے کا قفل کھول کر اندر کی روشنیاں جلاتا ہوا میں احتیاط سے آگے بڑھا تو مجھے کسی بھی چیز میں کوئی تبدیلی نظر نہ آئی۔ فرنیچر سے آرائشی اشیا تک سب کچھ جوں کا توں موجود تھا۔ فریج چل رہا تھا اور اس میں ولایتی بیئر کی چند بوتلیں اور ڈبے خورد و نوش کی دیگر اشیا کے ساتھ موجود تھے۔ میں پوری عمارت کا جائزہ لے کر برآمدے میں لوٹ آیا۔

میں نے اضطراری طور پر اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی اور سات منٹ کا وقفہ دے کر سگریٹ سلگا لی۔ اس دوران میں مسلسل اپنی حفاظتی تدابیر کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ میں نے برآمدے سے پختہ فرش پر اتر کر اپنی کار کے اگنیشن میں سے چابی نکال کر

ڈرائیونگ سیٹ کے علاوہ باقی دروازے مقفل کیے اور پھر برآمدے اور پورچ کی روشنیاں گل کر دیں تاکہ باہر سے کوئی میری پوزیشن کا اندازہ نہ لگا سکے۔ روشنیاں بجھانے کے ساتھ ہی میں نے ادھ جلی سگریٹ بھی فرش پر پھینک کر جوتے سے مسل دی۔ اندھیرے کی پناہ میں مَیں خود کو نسبتاً پُرسکون اور پہلے سے زیادہ محفوظ محسوس کر رہا تھا اور میری نگاہیں آہنی پھاٹک کی طرف جمی ہوئی تھیں جہاں روشنی کے باعث ہر چیز صاف نظر آ رہی تھی۔

احاطے میں میری کار کے انجن کے ارتعاش کے باعث جھینگروں کی جھائیں جھائیں تھم گئی تھی جو تھوڑے سے وقفہ کے بعد دوبارہ گونجنے لگی تھی۔

اچانک مجھے اپنے آپریٹس پر کال سگنل موصول ہوا اور میں نے ستون کی آڑ لے کر آپریٹس آن کر دیا اور جالی پر لگا ہوا ننھا سا سرخ بلب جل اٹھا لیکن آواز بڑھانے کے باوجود مجھے کوئی پیغام نہ سنائی دیا مگر کال سگنل کی ٹک ٹک بدستور سنائی دے رہی تھی، میں ایک لحظے کے لیے الجھ گیا مگر پھر مجھے خیال آیا کہ شاید وہ کال باس سے رابطے والی فری کوئنسی پر موصول ہو رہی تھی میں نے فری کوئنسی سلیکٹر بٹن دبایا۔ سرخ روشنی معدوم ہوگئی اور ننھا سا سبز نقطہ روشن ہوتے ہی ریسیور پر باس کی بھاری، خوابناک آواز گونجنے لگی۔

"ڈی وی ریسیونگ باس... اوور!" باس کا پیغام ختم ہوتے ہی میں نے آپریٹس منہ کے قریب لا کر سرگوشیانہ لہجے میں کہا تو اچانک ہی میرے دل کی دھڑکنیں کافی ہو چکی تھیں اور میں اپنے وجود میں سنسنی کی لہریں سرایت ہوتی محسوس کر رہا تھا۔

"تم اس وقت کہاں ہو؟ اوور!" باس نے سوال کیا تو میں نے پہلی بار اس کی آواز میں نشے کا بوجھل پن محسوس کیا۔ میں نے باس کو اپنی جیوا ہاؤز میں موجودگی سے آگاہ کیا تو چند ثانیوں کے لیے لائن پر صرف ریڈیائی لہروں کا دھیما دھیما شور باقی رہ گیا۔

"سرخ کرولا میں ایک شخص تم تک پہنچ رہا ہے۔ اس کا کوڈ سی ون ہے۔ تمھیں اس کی ہدایات پر عمل کرنا ہے... اوور اینڈ آل۔" بوجھل اور خوابناک آواز میں ہدایت دینے کے ساتھ ہی دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔ میں اندھیرے میں روشن سبز نقطے کو یوں گھورنے لگا جیسے وہ کسی بھی لمحے بھیڑیے کی کھوپڑی میں تبدیل ہونے والا ہو۔ باس کے آخری پیغام نے متوقع خطرے کے بارے میں میرے بیشتر شبہات زائل کر دیے تھے لیکن میں تشویش کا شکار ہو گیا تھا۔ نہ جانے آنے والا کس مقصد کے تحت آ رہا تھا؟ اس ملاقات میں ایسی کیا خاص مصلحت تھی کہ شہر کے کسی محفوظ علاقے کے بجائے جیوا ہاؤز کو خالی کرانے کے بعد اس ملاقات کے لیے استعمال کیا جا رہا تھا۔ پھر آنے والا سی ون تھا۔ یہ میرے لیے اچنبھے کی بات تھی میرے اندازے کے مطابق سی ون تنظیم کی کسی اہم شخصیت کا کوڈ ہونا چاہیے مجھے سکندر علی کے مکان سے جو چار اہم فون نمبر ملے تھے، میرے اندازے کے مطابق سی ون کا نمبر بھی شامل تھا لیکن میں یہ پہلا موقع تھا کہ رقم یا مال لانے لے جانے والے فرا کے علاوہ کوئی ذمّے دار شخص مجھ سے براہ راست ملنے والا تھا اور خفیہ تنظیموں کے بارے میں ایک کلیے سے میں اچھی طرح تھا کہ غیر ضروری طور پر کسی کو رازوں میں شریک نہیں کیا کسی پر کوئی راز ظاہر کیا جاتا ہے تو اس سے قبل فیصلہ ہو چکا کہ اعتماد میں لیے جانے والے کو جہنم واصل کرنا ہے یا اسے ذمے داریاں سونپنی ہیں۔

سی ون اپنے ساتھ کیا خبر لا رہا تھا، وہ میرے لیے تھی لیکن میں نے سمجھ لیا تھا کہ ہر دو صورتوں میں مَیں ایک اہم کھڑا ہوا تھا۔ اگر سی ون موت کا ہرکارہ بن کر آ رہا تھا تو میں مدافعت کے لیے پوری طرح تیار تھا اور اگر میرے منصب پر ہونے والا تھا تو یہ میری خوش نصیبی تھی کہ ترقی کے پہلے ہی مجھے سی ون سے واقفیت حاصل ہو رہی تھی جس کے لیے دو دنوں میں یہی فون نمبر کے حوالے سے نہ جانے کتنے منصو اور بگاڑ چکا تھا۔

سکندر علی نے مجھے سرخ کرولا کے ذریعے سی ون کی اطلاع دی تھی۔ میں اس سرخ کرولا کو ابھی تک نہیں بھ جو مجھے گلشنِ اقبال میں حسن اسکوائر کے چوراہے سے ذرا آگے اس روز بھی میں باس کی ہدایت پر حسن اسکوائر پہنچا تھا اور د کرولا میں ایک خطرناک صورت والا مجھے یول کراسنگ سے آگے آبادی میں اس مکان میں لے گیا تھا جہاں بعد میں بھی میں کے حوالے سے ایک عورت سے مل چکا تھا۔ مجھے وہ آدمی اچھی تھا جس کا چہرہ اپنے خدوخال اور پرانے زخموں کے نشانات کی قاتل کی نشاندہی کرتا تھا۔ اس آدمی نے گلشنِ اقبال میں میر انگوٹھے کے نشان لیے تھے جن کی مدد سے وہ خوفناک ہلا کیس مکمل کیا گیا تھا جس کا قفل میرے داہنے انگوٹھے کے نشانات بغیر کسی طرح نہیں کھل سکتا تھا۔ تو کیا وہی سی ون تھا؟

میں نے ایک مرتبہ پھر برآمدے اور پورچ کی روشنیا دیں۔ اس بار میرا خیال تھا کہ سی ون اگر کسی بُری نیت سے آ تو برآمدے میں اندھیرا دیکھ کر باہر ہی چوکنا ہو جاتا لہٰذا روش جلانے کے بعد میں آہنی پھاٹک کے قریب ہی لان پر ٹہلنے مجھ پر انتظار کا ایک ایک لمحہ بھاری گزر رہا تھا۔ اگر میرے اللہ پہ جہانگیر کے گھر پہ پی ہوئی رائل سیلوٹ کا سکون بخش سرور نہ ہوتا تو میرے لیے یہ اضطراب برداشت کرنا محال ہو جاتا۔

آخر پھاٹک کے نچلے حصے سے روشنی کی چادر پختہ روش کے خاصے حصے پر پھیل گئی، اسی کے ساتھ کسی کار کا ہارن بھی بجایا گیا تھا۔

میں نے پھرتی کے ساتھ داہنے ہاتھ میں اپنا پستول سنبھالا اور کنڈی کھول کر پھاٹک کے ایک پٹ کو زور سے دوسری طرف دھکیلا اور دوسرے پٹ کو آڑ کے طور پر اپنے ساتھ پیچھے لیتا آیا۔ سرخ کرولا کا انجن غرایا اور تیزی سے روش طے کر کے اس کی کار میری کار کے پیچھے جا رکی۔

میں نے پھاٹک بند کیا اور پستول جیب میں ڈال کر روش پر چلتا ہوا برآمدے کی طرف بڑھنے لگا۔ پورچ میں روشنی ہونے کے باعث میں نے دور ہی سے دیکھ لیا تھا کہ کار سے اترنے والا وہی میرا دیکھا بھالا خطرناک صورت والا آدمی تھا اور اس کے دونوں ہاتھ خالی تھے۔

"ہیلو!" اس نے دور ہی سے مجھ کو مخاطب کیا تو اس کے لہجے سے برتری کا احساس نمایاں تھا۔ میں قریب پہنچا تو خطرناک صورت والے نے اپنا داہنا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔ ہاتھ ملاتے ہوئے اس نے گرمجوشی کی آڑ لے کر طاقت کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی تو میں نے بھی اس کی انگلیوں پر دباؤ ڈالا اور وہ گرفت نرم کرتے ہوئے بے اختیار مسکرا دیا۔

"مزاج کے غصیلے معلوم ہوتے ہو۔" اس نے ہلکے سے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"شاید تمھارا ہاتھ زیادہ دب گیا۔" میں نے اپنی اندرونی کیفیت کے برعکس قہقہہ لگا کر کہا۔ "میں آسانی کے ساتھ اجنبیوں کی برتری قبول کرنے کا عادی نہیں ہوں۔"

خطرناک صورت والے نے بُرا سا منہ بنایا جیسے میری بے تکلفی اسے کھل گئی ہو پھر خشک لہجے میں بولا۔ "کیا ہم یہیں کھڑے رہیں گے؟"

"کون ہو اور یہاں کیوں آئے ہو؟" میں نے براہ راست اس کی آنکھوں میں گھورتے ہوئے گمبھیر لہجے میں سوال کیا اور خطرناک صورت والے کو فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ اگر وہ آتے ہی اپنا تعارف کرا دیتا تو شاید میں اس کا یوں مضحکہ نہ اڑاتا۔

"میں سی ون ہوں۔" وہ دانت پیستے ہوئے بولا۔

"اوہ۔ میں شرمندہ ہوں۔" میں نے فوراً ہی معذرت کر لی۔ "تم پہلے ہی بتا دیتے تو بہتر ہوتا... آؤ، اندر چلے آؤ۔"

میرا دل بے یقینی اور اندیشوں کا شکار تھا لیکن میں سی ون پر اپنی کوئی کمزوری ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لہٰذا دل پر جبر کر کے اس سے آگے سیڑھیاں چڑھ کر برآمدے میں پہنچا اور اس کے لیے داخلی دروازہ کھول دیا۔ وہ میرے قریب سے گزرتے ہوئے اندر داخل ہوا تو اچانک ہی مجھ کو احساس ہوا کہ میری کوئی جیب ہلکی ہو گئی ہے۔ میں نے بوکھلا کر اپنی جیبیں ٹٹولیں تو پستول غائب تھا۔

"میرے پاس ہے۔" سی ون کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ "یہ بھرا ہوا پستول کیوں ساتھ لائے تھے؟"

"ہر وقت ساتھ رہتا ہے۔" میں نے دروازہ بند کر کے اس کے پیچھے بڑھتے ہوئے کہا۔ میں سوچ رہا تھا کہ سی۔ ون نہ صرف ہاتھ کی صفائی میں ماہر تھا بلکہ اس کی نگاہیں بھی بہت تیز تھیں۔ اسی وجہ سے میری وزنی جیب سی ون کی عقابی نظروں سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔

اس نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے میرا پستول بے پروائی سے تپائی پر رکھ دیا پھر کہنیاں ٹانگوں پر جما کر آگے جھکتے ہوئے بولا۔ "تم سے میری یہ دوسری ملاقات ہے مگر مجھے خوشی ہے کہ تم نے رسمی شناخت کے بغیر مجھ پر بھروسا نہیں کیا، شاید اسی محتاط روی کی بنا پر تمھیں آگے لانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اب کراچی کی حد تک سارے معاملات تمھاری صوابدید پر منحصر ہوں گے اور تم اپنی مرضی کے مطابق تنظیم نو کر سکو گے۔"

"یہ منصب پہلے شاید بی فور کے پاس تھا؟" میں نے صوفے پر پہلو بدلتے ہوئے سوال کیا۔ الجھن اور اندیشوں کے بعد سی ون سے ملاقات مجھے ایک نعمت معلوم ہو رہی تھی۔ چار میں سے ایک آدمی خود بخود میرے سامنے آگیا تھا اور تنظیم کی جانب سے مجھے اعتماد کا اہل سمجھا گیا تھا۔

"تمھارا سوال غیر ضروری ہے۔" وہ خشک لہجے میں بولا۔ "اب بی فور سے تمھارا کوئی رابطہ نہیں رہے گا، پندرہ روز کی آزمائشی مدّت میں تم مجھ کو جواب دہ ہو گے، مستقل انتظامات سے اس کے بعد آگاہ کیا جائے گا۔ میرا تعلق تنظیم کے انتظامی اور حفاظتی شعبے سے ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے جیب سے ایک کاغذ نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔ "اس میں ان لوگوں کے نام اور پتے ہیں، جنھیں تم اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر سکتے ہو۔ پولیس کے محکموں میں ان میں سے کسی کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے۔ یہ معاوضہ پر کام کرنے والے لوگ ہیں۔ اگر ان میں سے کسی کو تم باقاعدہ اپنی ٹیم میں شامل کرنا چاہو تو مجھ سے مشورہ ضرور کر لینا۔"

اس کاغذ پر سترہ افراد کے نام اور پتوں کے ساتھ ان مقامات کے نام بھی ٹائپ کیے ہوئے تھے جہاں ان سے آسانی سے رابطہ قائم کیا جا سکتا تھا۔ "طارق کے بعد میرے پاس صرف دو آدمی رہ گئے ہیں فوری طور پر مزید ایک دو کا بندوبست بھی کرنا ہو گا۔" میں نے کاغذ پر سرسری نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔

"اس کا مجھے بھی اندازہ تھا۔" اس کے ہونٹوں پر خفیف سی

مسکراہٹ تیر گئی۔" اس میں تین نام خط کشیدہ ہیں، میرے آدمیوں نے مسلسل ان کی نگرانی کی ہے، تم ان سے فی الفور رابطہ قائم کر سکتے ہو لیکن یہ خیال رہے کہ تمہاری نئی حیثیت کا راز رہنا بہت ضروری ہے۔"

اس کی زبان سے نگرانی کا لفظ سنتے ہی میرے ذہن میں شبہات سر ابھارنے لگے۔ سی ون کا تعلق تنظیم کے انتظامی اور حفاظتی شعبے سے تھا اپنے کوڈ اور حاکمانہ اندازِ گفتگو سے وہ ذمے دار آدمی معلوم ہو رہا تھا، اگر اس کے آدمی تنظیم کے لیے متوقع کارندوں کی تلاش میں لوگوں کا تعاقب کرتے تھے تو طارق کے کچھ لوگوں کی نگاہوں میں آجانے کے بعد اس کی نگرانی بھی لازماً سی ون کے آدمیوں نے کی ہوگی اور اگر طارق کو تنظیم کے لیے خطرناک سمجھ لیا گیا تھا تو شاید اس کے قتل کے ذمے دار بھی سی ون کے آدمی ہوں گے۔ مجھے یہ سوچ کر جھرجھری آگئی کہ اس وقت میں طارق کے قاتل کے سامنے موجود تھا۔

"باہر کے لیے مال کی روانگی میں کچھ تاخیر ہو گئی ہے۔" سی ون کہہ رہا تھا۔ "لیکن تم اگلے ہفتے میں کیریئرز کا بندوبست ضرور کر لو۔ لڑکے ہوشیار ہونے چاہئیں۔ ان کے ذریعے زیادہ سے زیادہ ایک کلو فی کس مال بھیجا جائے گا۔ تاکہ کسی کے پکڑے جانے کی صورت میں ساری رقم نہ ڈوب سکے۔"

میں خطرناک صورت والے کے مرتبے سے واقف ہونے کے بعد محتاط ہو گیا تھا۔ لہٰذا زیادہ بولے بغیر اس کی ہدایات سنتا رہا جو بیشتر طریقۂ کار کے بارے میں تھیں پھر جب مجھے پتا چلا کہ سی ون کی کار میں کچھ سامان بھی موجود ہے جو مجھے اپنی تحویل میں لینا ہے تو میرے ذہن سے وہ الجھن بھی دور ہو گئی جو اس ملاقات کے لیے جیوا ہاؤز کے انتخاب کے سلسلے میں میرے ذہن میں موجود تھی معاملہ گفتگو کا ہوتا تو یہ ملاقات شہر میں کہیں بھی ہو سکتی تھی لیکن ایسی صورت میں سامان کی تحویل ممکن نہ ہو پاتی۔ اس سامان میں مخصوص فری کوئنسی پر تین میل کے دائرے میں کام کرنے والے چھ جیبی ٹرانسمیٹرز، دوہری فریکوئنسی پر کام کرنے والے تین ایئر پیس، ایک خودکار کال ریکارڈر، چھوٹے سیل کے ذریعے کام کرنے والے بارہ ٹائم بموں کی پیٹی، فوٹو سیل اور اس سے منسلک حفاظتی نظام اور دیگر مواصلاتی آلات کے علاوہ ایک چھوٹی ایکسرے مشین بھی شامل تھی۔ ان میں سے ایکسرے مشین اور ٹائم بموں کی پیٹی میں سکندر علی کی خواب گاہ میں دیکھ چکا تھا۔

عہدے میں اضافے کے ساتھ اس بیش قیمت اور تحیّر انگیز سامان کی وصولیابی میرے لیے مسرت انگیز ہونے کے ساتھ فکر کا باعث بھی بن گئی کیونکہ میرے پاس ایسی کسی جگہ کا بندوبست نہیں تھا جہاں کسی کو اپنی ذات پر شبہے کا موقع دیے بغیر وہ سامان چھپایا جا سکے مگر سی ون کے پاس اس دشواری کا حل موجود تھا۔ اس کے مشورے پر وہ سارا سامان جیوا ہاؤز کے ایک ایسے کمرے میں منتقل کر دیا گیا جو شروع سے ہی زیر استعمال نہیں تھا اور اس میں رسائی کے لیے ایک دروازے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں تھا۔ سی ون کی رائے تھی اس کمرے کی چابی میں اپنی تحویل میں رکھوں اور جہانگیر کے ذریعے کمرے کو ممنوعہ علاقہ قرار دلوا دوں تاکہ خود میرے سوا کوئی وہاں قدم رکھنے کی جرأت نہ کر سکے۔ کمرے کی کل وقتی حفاظت کے لیے سی ون میری مدد سے اس کمرے میں دروازے کی چوکھٹ کے اندرونی کھانچے میں فوٹو سیل نصب کرنے میں مصروف ہو گیا۔ اس کی کار میں موجود اوزاروں کی پیٹی سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے اس کے بارے میں اس کے ذہن میں پہلے ہی سے واضح خاکہ موجود تھا اور وہ جملہ امکانات پر غور کرنے کے بعد پوری تیاری کے ساتھ وہاں آیا تھا۔ اس نے چوکھٹ میں سوراخ کر کے قبضوں والی سمت میں ایک ایسا سوئچ لگایا جو عموماً کاروں میں دروازہ کھلتے ہی اندر کی بتی روشن ہونے کے لیے دروازوں کے ساتھ لگا ہوا ہوتا ہے۔ اس سوئچ کا تعلق اوپر لگے ہوئے عدسے کے پیچھے چلنے والے بلب سے تھا اور اس کے عین نیچے فرش میں سوراخ کر کے فوٹو سیل لگایا گیا جس کا تعلق ایک سوئچ بورڈ کے ذریعے خودکار کیمرے اور ٹیپ ریکارڈر سے تھا۔ تنصیب سے فارغ ہو کر سی ون کسی ماہر [illegible] ان سب چیزوں کو نہایت عرق ریزی سے مربوط کرنے میں مصروف ہو گیا اور جب وہ اس نظام کی آزمائش کے لیے تیار ہوا [illegible] رسٹ واچ پونے تین بجا رہی تھی۔

سی ون نے کیمرے کے ویو فائنڈر سے [illegible] بار دروازے کا جائزہ لیتے ہوئے ٹرائی بورڈ کو صحیح جگہ جمایا اور اندر [illegible] کا سوئچ آن کر کے بہت احتیاط سے باہر نکل آیا۔ دروازہ بند ہونے کے بعد یہ اندازہ لگانا دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن تھا کہ اس [illegible] شعبدہ پوشیدہ ہوگا۔ میں نے سی ون کی ہدایت پر احتیاط سے [illegible] کر دروازے پر زور دیا، پٹ کوئی آواز پیدا کیے بغیر اندر کی طرف کھل گیا پھر میں اندر بڑھا۔ جوں ہی میں نے چوکھٹ عبور کرنا چاہی اندر سے کیمرے کی فلیش گن کا طاقتور جھماکا ہوا اور پھر ایک گونجیلی آواز سنائی دی۔

"ہینڈز اپ!... گھیر لو اس بدمعاش کو، یہاں سے زندہ نہ نکلنے پائے۔" میں اچھل کر باہر آ گیا، میرے سانسوں کی رفتار تیز ہو گئی تھی اور تحیر زدہ آنکھیں سی ون کی طرف اٹھ گئیں جو میری بوکھلاہٹ سے محظوظ ہوتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔

تھوڑے سے وقفے کے بعد اندر سے ایک سرگوشی سی ابھری۔

"باہر نکلو، شاید وہ ابھی یہیں موجود ہے... راہداری سے نکل گیا تو پھر ہاتھ نہ آ سکے گا۔" اس کے فوری بعد چند قدموں کی آہٹیں ابھریں جو مدھم ہونے کے باوجود اتنی واضح تھیں کہ باہر سنائی دے رہی تھیں اس کے

فضا پر سناٹا چھا گیا۔

"یہ آوازیں کیسی تھیں؟" میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں سوال کیا تو سی ون پہلی بار فراخ دلی کے ساتھ ہنس پڑا۔

"سادہ سا شعبدہ ہے لیکن کسی کو مداخلت سے روکنے کے لیے کافی ہے۔" اس نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ "کسی خودکار لفٹ کا دروازہ بند ہوتے ہوئے اچانک کوئی دروازے کے درمیان آجائے تو دروازہ خود بخود دوبارہ کھل جاتا ہے۔ اس نظام کو یہاں میں نے کیمرے اور ٹیپ سے منسلک کر دیا ہے۔ اندر قدم رکھتے ہی کیمرہ گھسنے والے مجرم کی تصویر لے لے گا اور ٹیپ چل پڑے گا جس میں وہ آوازیں پہلے سے بھری ہوئی ہیں۔ چند فٹ کے بعد ٹیپ خالی ہے جو پورا چلنے کے بعد ہی رکے گا۔ تمہیں بس یہ خیال رکھنا ہے کہ کیمرے میں فلم موجود رہے۔ تصویر کا نمبر اور جن حصوں پر ٹیپ کی پوزیشن دیکھ کر پتا چل جائے گا کہ کمرے میں گھسنے کی کوئی ناکام کوشش کی گئی ہے، ٹیپ ری وائنڈ کر دو گے تو یہ نظام دوبارہ اسی طرح کام کرے گا نہ آوازیں غائب رہیں گی، کیمرے کی تصویر کے ذریعے مداخلت کار ہماری گرفت سے نہ بچ سکے گا۔"

میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ سی ون اپنے کام میں بہت ماہر معلوم ہوتا تھا۔ اس نے چند گھنٹوں کی قلیل مدت میں اس ساز و سامان کے لیے وہ مضبوط حفاظتی نظام نصب کر دیا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ سکندر علی کی خواب گاہ میں ایسی کوئی تنصیب میری نگاہ سے نہیں گزری تھی۔ وہاں نہ کوئی کیمرہ چلا تھا اور نہ ٹیپ ریکارڈر لیکن مجھے خوف محسوس ہونے لگا تھا کہ وہاں ایسا ہی کوئی متبادل حفاظتی نظام نہ رہا ہو جس نے خواب گاہ میں میرے داخلے کی نشاندہی کر دی ہو۔ غنیمت تھا کہ میں چہرے پر نائیلون کا تھیلی نما نقاب منڈھ کر سکندر علی کے مکان میں گھسا تھا۔ ورنہ دوسری صورت میں اس وقت سی ون مجھے مزید ذمے داریاں سونپنے کے بجائے مجھ سے تشدد آمیز جرح کر رہا ہوتا۔

پھر سی ون نے مجھے جملہ ساز و سامان کے استعمال اور افادیت کے بارے میں سمجھایا اور دوہری فری کوئنسی کا ایک ٹرانسمیٹر لے کر وہاں سے رخصت ہو گیا۔ جاتے جاتے اس نے مجھ کو بتا دیا تھا کہ ٹرانسمیٹر پر اس سے رابطے کے لیے سی ون کے بجائے سی کنگ کا نام استعمال کیا جائے کیونکہ عہدے تنظیم کے اندرونی رازوں میں شمار ہوتے تھے اور میں جس کسی کو بھی دوہری فری کوئنسی والا ٹرانسمیٹر دیتا وہ ہماری گفتگو سن کر اس راز سے واقف ہو سکتا تھا۔

اس کے چلے جانے کے بعد میں نے سامان والے کمرے کی چابی گچھے سے نکال کر اپنی تحویل میں لی اور نشست گاہ سے پستول اٹھا کر، بتیاں بجھاتا ہوا عمارت سے باہر آ گیا۔ واپسی پر میں نے عمارت کو پہلے کی طرح مقفل کر کے چابیاں دوبارہ کیکٹس کے گملے میں دبا دی تھیں لیکن میں جیوا ہاؤز کو جہانگیر کے حوالے کرنے کے بجائے اپنے ٹھکانے میں تبدیل کرنے کے امکانات پر غور کر رہا تھا۔

❋

ماہرین کے لیے ہیروئن کوئی نئی چیز نہیں تھی۔ امریکہ کے مشرقی علاقوں میں منشیات زدہ افراد میں ستر فی صد سے زائد اس موذی نشے کی عادت میں مبتلا پائے گئے تھے۔ برطانیہ میں برسوں پہلے یہ خطرہ بھانپ لیا گیا تھا کہ طبی مقاصد کے لیے کیمیائی طریقوں سے حاصل کیا جانے والا افیم کا وہ الکلائیڈ مغربی معاشرے میں ایک نشے کی حیثیت سے مقبول ہونے لگا ہے لہٰذا انسانی جسم اور اعصاب پر اس کے تباہ کن، منفی اثرات کے پیشِ نظر طبی فوائد قربان کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا اور ۱۹۵۲ء میں برٹش فارماکوپیا سے اسے خارج کر کے کسی بھی مقصد کے لیے اس کی تیاری ممنوع قرار دے دی گئی۔ اقوام متحدہ کے کمیشن کے جاری کردہ اعداد و شمار کے مطابق ۱۹۶۴ء میں امریکہ میں ہیروئن کے عادی افراد کی تعداد نصف لاکھ سے متجاوز تھی اور برطانیہ میں ایسے افراد کی تعداد ڈیڑھ ہزار سے بھی کم تھی جبکہ اس معاملے میں مشرقِ بعید کے بعض علاقے، مثلاً جاپان اور ہانگ کانگ برطانیہ سے کہیں آگے تھے لیکن برصغیر میں افیم کی ٹنوں سالانہ پیداوار کے باوجود نشے باز ہیروئن سے واقف نہیں تھے اور نہ ہی ان علاقوں میں ہیروئن کے استعمال کا کوئی بگڑا ہوا کیس سامنے آیا تھا۔

دنیا کے مختلف علاقوں میں افیم کی پیداوار ہمیشہ سے عالمی اداروں کے لیے تشویش کا باعث رہی تھی اور وہ بھارت کے علاوہ دنیا کے بیشتر ممالک میں متعلقہ حکومتوں کی محدود اجازت کے بغیر افیم کی آزادانہ کاشت کو خلافِ قانون قرار دلوا چکے تھے لیکن یہ جانتے تھے کہ پاک افغان سرحد پر آزاد قبائلی علاقے اس فصل کی پورے زور و شور سے کاشت کر رہے تھے اور ہر طرف تشویش پھیلی ہوئی تھی کہ اگر ان علاقوں میں ہیروئن تیار کرنے میں کامیابی حاصل کر لی گئی تو پھر اس جنس کی پیداوار اور غیر قانونی تجارت پر قابو پانا دشوار ہو جائے گا۔

چرس کے انسداد میں ادھوری کامیابیوں کا خمار اترنے سے پہلے پاکستان کے خفیہ بازاروں میں ہیروئن متعارف ہونے کی اطلاعات نے ہر ایک کو بوکھلا دیا۔ جاننے والے جانتے تھے کہ یہ ایک بڑی مہم کی ابتدا تھی اور تجرباتی مرحلوں سے حاصل ہونے والا مال آزمائش کے لیے مقامی منڈی میں پھینکا جا رہا تھا۔ پاکستان جیسے غریب اور ترقی پذیر ملک میں ہیروئن پر بھاری نفع کمانا مشکل تھا لہٰذا تجارتی پیمانے پر ہیروئن کی تیاری میں کامیابی ہوتے ہی طالع آزما اس جنس کو برطانیہ، یورپ اور امریکہ کے بازاروں میں لے آتے جہاں مادی ترقیوں کے تضادات سے الجھے اور اکتائے ہوئے نوجوان منہ مانگے داموں پر اس تیز

نشے کے خریدار تھے۔

یہ نشے اس قدر ہولناک تھے کہ یونیسکو کے تحت انٹرنیشنل نارکوٹکس کنٹرول بورڈ نے ڈاکٹر ولیسلر کی رپورٹ ملتے ہی ایک اعلیٰ سطحی اجلاس طلب کر لیا تھا جس میں امریکہ کے بیورو آف نارکوٹکس اینڈ ڈینجرس ڈرگس سے لے کر اہم پاکستانی افسران تک شریک تھے اور اس اجلاس کے انعقاد کے لیے کراچی کو منتخب کیا گیا تھا تاکہ علاقے میں سر اٹھانے والے فتنے کے بارے میں تمام تر تفصیلات بلاکسی دشواری کے کانفرنس کے شرکا کو فراہم کی جاسکیں بصورتِ دیگر اطلاعات اور ان پر کی جانے والی کارروائیوں پر بننے والی ضخیم سرکاری فائلوں کا مختلف سرکاری محکموں سے یکجا کر کے بیرونِ ملک لے جایا جانا ناممکنات میں سے تھا۔

اس تفصیلی بریفنگ کے بعد سی ون نے کانفرنس کا ایک دعوت نامہ میرے حوالے کیا تھا۔ جو اس نے اپنے ذرائع سے انسداد منشیات کے ایک سرگرم قومی ادارے کے نام پر حاصل کیا تھا۔ میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا تھا کہ شاید سکندر علی کسی موثر حیثیت میں اس ادارے سے وابستہ تھا اور اسی وابستگی کی بنا پر اسے دعوت نامہ جاری کیا گیا ہو گا جو سی ون نے میرے لیے حاصل کر لیا کیونکہ بدلے ہوئے انتظامات کے تحت سکندر علی یا بی فور کے خاصے اختیارات مجھے سونپ دیے گئے تھے۔ ایسی صورت میں میرے لیے رفتہ رفتہ متعلقہ اہم حلقوں میں رسائی حاصل کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ اس سلسلے میں تنظیم کے مفادات سے سی ون بخوبی واقف تھا۔ اور اس معاملے میں فی الوقت حتی الامکان میری مدد پر تُلا ہوا تھا۔

غزالہ کے کالج کے فنکشن میں سکندر علی کی آواز پہچاننے کے بعد مجھے اس کی زبان سے منشیات کے خلاف دھواں دھار تقریر سن کر حیرت ہوئی تھی اور میں یہ سمجھا تھا کہ اس نے اپنی سماج دشمن شخصیت پر پردہ ڈالے رکھنے کے لیے سماجی بہبود کی تنظیموں اور فلاحی کاموں میں دلچسپی کا کامیاب ڈھونگ رچایا ہوا تھا۔ مگر سی ون سے کانفرنس کا پس منظر معلوم ہونے اور شرکت کا دعوت نامہ موصول ہونے کے بعد میں تنظیم کے پسِ پشت کام کرنے والوں کی منصوبہ بندی کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ ایسے اداروں سے وابستگی کے ذریعے تنظیم کے اہم اراکین نہ صرف اپنی ذات کو ہر قسم کے شبہات سے بالاتر کر کے معاشرے میں ہر دل عزیز ہو جاتے تھے بلکہ بعض اہم اجتماعات میں بھی رسائی حاصل کر لیتے تھے۔ جہاں سے حاصل ہونے والی معلومات ان کے غیر قانونی کاروبار میں زبردست معاون ثابت ہو سکتی تھیں۔

سی ون سے ملنے والا دعوت نامہ اس امر کی دلیل تھا کہ میرے لیے کاروباری کامیابیوں کے ساتھ اپنے گرد و پیش کے ماحول میں نیک نامی پیدا کرنا لازمی ہو گیا تھا تاکہ اوپر والوں کی مدد کے بغیر میں خود بھی اپنے آپ کو ایسے اجتماعات میں مدعو کیے جانے کا اہل ثابت کر سکوں۔

اس افتتاحی اجتماع میں مختلف ممالک سے آئے ہوئے تقریباً پندرہ غیر ملکی مندوبین کے علاوہ مقامی حکام کی بھی خاصی تعداد شریک تھی اور حکام کے علاوہ سماجی بہبود سے دلچسپی رکھنے والے ممتاز شہریوں اور اداروں کے ارکان کی محدود تعداد کو بطورِ مبصر مدعو کیا گیا تھا تاکہ منشیات کے سلسلے میں کیے جانے والے اقدامات سے وہ لوگ براہِ راست باخبر رہ سکیں۔ اس بارے میں بہت سے نکات ایسے بھی ہو سکتے تھے جو مصلحت یا مفادِ عامّہ کے تقاضوں کے تحت اخبارات میں شائع نہ ہوتے لیکن مبصرین کی موجودگی میں متعلقہ حکام کو یہ یقین تھا کہ انھیں رائے عامّہ کے طاقتور اور موثر حلقوں کی حمایت حاصل رہے گی۔

میں دیگر مبصرین کے ساتھ مخصوص گیلری میں اپنی نشست پر موجود تھا اور اپنے گرد و پیش ہونے والی گفتگو سے اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اس اجلاس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ دنیا کے مختلف علاقوں میں انسداد منشیات کے لیے کیے جانے والے اقدامات اور ان کے نتیجے میں حاصل ہونے والی معلومات کے باہمی تبادلے کے بعد پاکستان میں ہیروئن کے متعارف ہونے کے بعد کے حالات سے نمٹنے کے لیے ایک مرکزی لائحہ عمل تیار کیا جائے کیونکہ یہاں تیار ہونے والی ہیروئن آخر کار دنیا کے مختلف علاقوں ہی میں فروخت ہوتی تھی۔ اس اعتبار سے یہ مسئلہ بہت سنگین تھا۔

"ہیروئن آج کی ایجاد نہیں ہے۔" ڈاکٹر ولیسلر کہہ رہا تھا۔ اس کی پیشانی پر گہری، تفکر آمیز لکیریں نمایاں تھیں اور بھوری چمکدار آنکھوں میں تشویش کے سائے لہرا رہے تھے۔ "مغرب اور مشرقِ بعید میں یہ لعنت مدت سے موجود ہے لیکن برصغیر میں تجارتی پیمانے پر اس کی تیاری اور فروخت پہلی بار منظرِ عام پر آئی ہے۔ حالات سے ظاہر ہو رہا ہے کہ اسے ایک بھرپور اور منظم کوشش کے تحت بازار میں لایا گیا ہے۔ ہماری معلومات کے مطابق یہ علاقہ افیم کی پیداوار میں ہمیشہ پیش پیش رہا ہے لیکن پہلے کوئی ہیروئن کی تیاری کی طرف متوجہ نہیں ہوا۔ آخر اس وقت وہ کیا حالات ہیں جن کے تحت ہیروئن کی تیاری کی ترغیب ملی ہے؟"

"یہاں بھی کبھی کبھار ہیروئن کی چھوٹی موٹی مقدار پکڑی جاتی رہی ہے۔" ایک مقامی افسر نے کھنکھار کر زبان کھولی۔ "لیکن ہر بار تفتیش کے نتیجے میں یہی ثابت ہوا کہ ہیروئن باہر سے یہاں لائی گئی تھی۔ سن اناسی میں کنار وبلی کے افغان قبائلی علاقے میں ملک زید اللہ خان نامی ایک بااثر سردار نے اپنے طور پر افیم سے ہیروئن بنانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ پھر افغانستان میں بیرونی مداخلت پر قومی پیمانے پر مزاحمت کے باعث ہر طرف جنگ کے بادل چھیل گئے اور اس کو اپنا منصوبہ ترک کرنا پڑا کیونکہ اس کا پورا قبیلہ حکومت اور اس کے حامیوں کے خلاف ہتھیار لے کر اٹھ کھڑا ہوا

ر بستیاں خالی کر کے پہاڑوں میں چلا گیا تھا۔ پھر غیر مصدقہ خبروں ابق ہمارے قبائلی علاقے میں ایک جرمن کیمسٹ دیکھا گیا۔ اس کے وتے ہی ہمارے یہاں ہیروئن کا غلغلہ کھڑا ہوا ہے۔"

"ڈاکٹر ہلی جے ڈالٹن!" جرمنی کے انسداد منشیات کے محکمے ب سربراہ نے عینک درست کر کے اپنی فائل سے ایک نام ہوئے زبان کھولی۔ "اسے دو ماہ پہلے پاکستان سے واپسی پر ٹ کے ہوائی اڈے پر ایک کلو سات سو گرام ہیروئن سمیت رکیا گیا تھا۔ اس نے اعتراف کیا ہے کہ وہ ہیروئن کی تیاری مدد دینے کے لیے پاکستان گیا تھا۔ اسے ایک لاکھ جرمن مارک ضے کے طور پر دیے گئے تھے لیکن وہ اس شہر یا مقام کی نشاندہی کر سکا جہاں اسے لے جایا گیا تھا۔ پشاور سے آنکھوں پر باندھ کر اسے پہاڑوں میں واقع ایک دیہی آبادی میں لے یا تھا۔ جہاں وہ ستائیس دن تک مومن خان نامی کسی شخص کا ن رہا تھا۔ پھر اسی طرح اسے رات کی تاریکی میں آنکھوں پر پٹیاں و کر واپس پہنچا دیا گیا۔" اس کی گفتگو نے مجھے چونکا دیا۔ اس کا ب تھا کہ معاوضے کے علاوہ سلطان شاہ نے سچ ہی کہا تھا۔

"مومن خان ان علاقوں میں ایک عام سا نام ہے۔" جرمن وب نے فائل کے مندرجات پڑھنے کے بعد سر اٹھایا تو ایک پاکستانی افسر نے مدافعانہ لہجے میں احتجاج کیا۔ "مجرم بہت چالاک ان کے طریقے محفوظ اور ناقابل گرفت ہیں لیکن ان علاقوں خواندگی کا اوسط بہت کم ہے۔ افیم سے ہیروئن کی تیاری ان کے ب و خیال میں بھی نہ آسکتی تھی لیکن ڈاکٹر ڈالٹن نے مومن خان کو پڑھ سکھایا ہے، وہ راز نہیں رہے گا۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں مومن خان لیبارٹری سے سیکھنے والے اپنا کام نہ شروع کر دیں۔ اس سیلاب سے لیے ہمیں ان لوگوں تک رسائی حاصل کرنا ہو گی جنھوں نے ڈالٹن ے رابطہ قائم کیا تھا۔

"میں جانتا ہوں مسٹر اصغر!" نوجوان برطانوی افسر سگار کا دھواں لیے ہوئے مسکرایا۔ "میں ان قبائلی علاقوں کے بارے میں بہت کچھ نتا رہا ہوں۔ میرے ماموں وہاں پولیٹیکل ایجنٹ رہے تھے۔ وہاں غلط ہاتھ ڈالا گیا تو دردِ سر کھڑا ہو جائے گا۔ ہمیں باہر سے ہی ابتدا کرنا ہو گی۔"

جرمن مندوب کا چہرہ گمبھیر ہو گیا۔ "پوری آبادی میں صرف ومن خان انگریزی کے چند الفاظ سے واقف تھا اس نے ڈاکٹر ڈالٹن واس کی تحریر کے مطابق ضرورت کی ہر چیز مہیا کی اور اس کی توقع سے پہلے پورے طریقے پر عبور حاصل کر لیا۔" اس نے ایک لمحے کے لیے خاموش ہو کر کانفرنس کے شرکا کا جائزہ لیا پھر دھیمی آواز میں بولا۔ "لیکن آپ لوگوں کو یہ جان کر حیرت ہو گی کہ اس ناخواندہ آدمی کے لیے ڈاکٹر ڈالٹن کی خدمات حاصل کرنے والی ایک برطانوی عورت تھی جو اس سے ویرا لائیڈ کے نام سے ملی تھی۔"

مومن خان کے بعد ویرا لائیڈ کا نام میرے لیے ایک دھماکے سے کم نہیں تھا۔ اس کانفرنس میں یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے دنیا یک بیک سکڑ کر محدود ہو گئی ہو۔ عیسیٰ خان کے نکالے ہوئے آدمی سلطان شاہ سے میں مومن خان اور اس کی تجربہ گاہ میں ہیروئن کی تیاری کے لیے آنے والے جرمن ماہر کی کہانی سن چکا تھا اور اب وہ ویرا لائیڈ کے بارے میں بتا رہا تھا جو کراچی سے ٹوکیو کے سفر کے دوران مجھے ایشلے ہاؤز کے نمائندے کے طور پر ملی تھی۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین کرنا دشوار ہو گیا کہ ویرا جیسی لاابالی اور زندہ دل لڑکی اس بکھیڑے میں اس حد تک ملوث ہو سکتی ہے کہ ایک طرف اس نے جرمنی میں ڈاکٹر ہلی جے ڈالٹن کو مومن خان کی ہیروئن تیار کرنے والی لیبارٹری میں کام کرنے پر آمادہ کیا اور دوسری طرف ایشلے ہاؤز کی نمائندگی کرتے ہوئے مجھ سے ہیروئن کی خریداری کا معاملہ طے کرنے کے لیے لندن سے بنکاک ہوتی ہوئی ٹوکیو پہنچی تھی۔ اس نیلی آنکھوں والی ساحرہ نے دورانِ پرواز ہی مجھے اس طرح اپنی ذات کی دلچسپیوں میں الجھایا تھا کہ ٹوکیو میں اس سے رخصت ہوتے ہوئے آخری لمحے تک میں اسے ایک نرم و نازک لڑکی تصور کرتا رہا جو زندگی کے بارے میں نہایت بے باکانہ نظریات پر یقین رکھتی تھی۔ اس دوران ویرا کی ذات میں مجھے کوئی ایسی ہلکی سی جھلک بھی نظر نہیں آئی تھی جس کی بنا پر میں اس کی ذات کو زیادہ اہم یا پُراسرار سمجھتا لیکن جرمن مندوب کے انکشاف سے ظاہر ہو رہا تھا کہ ویرا اپنی تنظیم میں بہت زیادہ سرگرم تھی۔

لیکن بات پھر بھی الجھی ہوئی تھی۔ ویرا نے جرمن کیمسٹ کو مومن خان کی معاونت پر آمادہ کیا تھا جس کا مطلب تھا کہ وہ خود یا اس کی تنظیم ہیروئن کی تیاری کے سلسلے میں مومن خان کی کوششوں میں دلچسپی لے رہی تھی اور یقینی طور پر اس سے رابطہ قائم کیا ہوا تھا۔ اس کی خواہش پر جرمن کیمسٹ کو خطیر رقم کا لالچ دے کر پاکستان بھیجا گیا اور مومن خان کے آدمی کسی بندوبست کے تحت اسے پہچان کر اپنی تحویل میں قبائلی علاقے میں لے گئے اور کام پورا ہو جانے کے بعد اسے واپس کر دیا۔ اس حد تک میری اپنی معلومات کی تصدیق جرمن مندوب کے بیان سے ہوتی تھی لیکن یہ سمجھنا دشوار تھا کہ ہیروئن کے ایک تیار کنندہ سے اتنے گہرے روابط ہوتے ہوئے ویرا لائیڈ یا اس کی فرم ایشلے ہاؤز نے ہیروئن کی خریداری کے لیے ایشین سنڈیکیٹ لمیٹڈ سے کیوں رابطہ قائم کیا؟

"ویرا کا کیا ہوا؟" نوجوان برطانوی افسر اضطراری لہجے میں جرمن مندوب سے سوال کر رہا تھا۔

جرمن مندوب نے مایوسانہ انداز میں اپنے سر کو جنبش دی۔

اس کا کہیں سراغ نہ مل سکا جبکہ امیگریشن کے ریکارڈ سے اس نام کی کسی برطانوی عورت کی آمد یا روانگی کا کوئی اندراج نہیں ملا۔ غالباً اس کی سفری دستاویزات کسی دوسرے نام پر رہی ہوں گی۔ ہوسکتا ہے کہ ویرا لائیڈ بھی اس کا کوئی مفروضہ نام ہو لیکن ڈاکٹر ڈالٹن اس کے لب و لہجے کی بنا پر پُریقین ہے کہ وہ برطانوی نژاد تھی۔"

"یہ نام میرے لیے نیا ہے۔" برطانوی افسر سگار کا دھواں اگلتے ہوئے بولا۔ "منشیات کا کام کرنے والوں میں شاید اس نام کی کوئی عورت کبھی ہمارے ریکارڈ پر نہیں رہی... مجھے حیرت ہے کہ..."

"اس قدر اضطراب مناسب نہیں مسٹر جوناس!" اطالوی مندوب نے درمیان ہی میں اس کی بات اُچک لی۔ "اتفاق ہے کہ وہ انگریز تھی... ہمیں اس وقت اپنی قومی انا سے ذرا آگے بڑھ کر بین الاقوامی سطح پر بات کرنی چاہیے۔ بُرے لوگ ہر قوم میں اور ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ جو زیادہ گھاگ ہوں، وہ اہم معاملات طے کرنے کے لیے معروف ناموں کے بجائے اجنبی چہرے سامنے لاتے ہیں۔ کیا فی الحال اتنا کافی نہیں ہے کہ ایک نیا نام تمہارے علم میں آگیا ہے؟"

"یقیناً یقیناً۔" جوناس نے کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ پھر اس کی آواز میں تحقیر کے جذبات امڈ آئے۔ "میں جو کچھ کہہ رہا تھا مسٹر برونو! اس کا تعلق قومی افتخار سے نہیں تھا۔ وہ جرمن کیمسٹ ایک اقبالی مجرم ہے۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ خود جال میں پھنس جانے کے باوجود اس نے اپنے ساتھیوں کو بچانے کے لیے لڑکی کے بارے میں حکام کو گمراہ کرنے کی کوشش کی ہو؟"

"اور ہم گمراہ ہوگئے۔" جرمن مندوب نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔ غصّے سے اس کا چہرہ تمتما اٹھا تھا۔ "تمہارا تبصرہ توہین آمیز تھا مسٹر جوناس! برسوں کے تجربے اور انسانی نفسیات کے مطالعے سے ہر پرانا تفتیشی افسر جھوٹ اور سچ میں تمیز کرسکتا ہے۔ میری پختہ رائے ہے کہ ڈاکٹر ڈالٹن نے ویرا لائیڈ کے بارے میں جو کچھ کہا وہ سچ پر مبنی تھا۔"

ان دونوں میں بحث چھڑ گئی۔ انگریز افسر کا رویّہ تکبر پر مبنی تھا۔ لیکن میرے لیے وہ بحث غیر اہم تھی۔ جرمن مندوب نے ویرا لائیڈ کے فرضی نام کا امکان ظاہر کرکے مجھے ایک ناقابلِ یقین اتفاق کی طرف بھی توجہ دلا دی تھی۔ ہوسکتا ہے کہ ڈاکٹر ڈالٹن کو آمادہ کرنے والی نے اتفاقاً ہی وہ نام استعمال کر ڈالا ہو اور مجھ سے ملنے والی پورے معاملے سے لاتعلق ہو لیکن پھر بھی میرے لیے وہ سب حیرت انگیز تھا۔ کیونکہ دونوں صورتوں میں عورتیں برطانوی نژاد تھیں۔ مجھے خیال آیا کہ کاش میں کارروائی میں مخل ہوکر ویرا کا حُلیہ دریافت کرسکتا لیکن میری وہ جسارت نہ صرف آداب کے خلاف ہوتی بلکہ میں اپنی ذات کو بلاوجہ ہر ایک کی توجہ کا مرکز بنالیتا۔

میرے لیے اہم نکتہ یہ تھا کہ ویرا مجھ سے ملنے والی کا ذاتی نام تھا اور انگریزی قاعدے کے مطابق لائیڈ باپ سے ورثے میں ملا ہوا خاندانی نام تھا۔ اگر ڈاکٹر ڈالٹن نے صرف ویرا کا نام بتایا ہوتا تو شاید میری دلچسپی اتنی نہ بڑھتی لیکن وہاں تو نام کے دونوں حصّے مشترک تھے۔

اجلاس میں تھوڑی سی گرمی کے بعد جوناس کی معذرت پر بحث ختم ہوگئی تھی اور امریکی مندوب نے موضوع کو ایک نیا موڑ دے دیا۔

"میرے لیے معزز جرمن دوست مسٹر شولز کا بیان خیال انگیز ثابت ہوا ہے۔" امریکی نمائندہ کہہ رہا تھا۔ "افغانستان کے سرحدی علاقے ان دنوں ہمارے لیے شدید سیاسی اہمیت اختیار کرگئے ہیں کیونکہ اس سرزمین کے آزاد باشندوں پر باہر سے کھلی جارحیت کا ارتکاب کیا گیا ہے..."

"میں مداخلت کے لیے معذرت خواہ ہوں۔" بھارتی نمائندہ شرمسار لہجے میں منمنایا۔ "لیکن میں مسٹر آرتھر کو یاد دلاؤں کہ یہ کوئی سیاسی نہیں، خالص معاشرتی اور انتظامی نوعیت کا اجلاس ہے۔ افغان مسئلے پر امریکی موقف کا پوری طرح علم ہے لیکن میں درخواست کروں گا کہ اس افتتاحی اجلاس میں نرم لب و لہجہ اپنایا جائے تاکہ [illegible] پیمانہ ہو۔"

آرتھر کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ بعض دوسرے شرکا بھی زیرِ لب مسکرا رہے تھے اور بھارتی نمائندہ ان سے نظریں چرانے کی کوشش میں اپنے سامنے میز پر رکھے ہوئے کاغذات کی بے مقصد ورق گردانی میں مصروف ہوگیا تھا۔ میں نے سوچا کہ بھارتی نمائندہ آرتھر کو روکنے کے بجائے محض رسمی طور پر اپنا احتجاج ریکارڈ پر لاکر اپنی حکومت کی جانب سے اس عظیم پڑوسی کا حقِ نمک ادا کرنا چاہ رہا تھا، جو معاہدۂ دوستی کی آڑ میں اس کے ملک کو ایسی ہر مداخلت پر اخلاقی اور مالی مدد فراہم کرتا رہا تھا۔

"مجھے مسٹر پانڈے کے احساسات کا خیال ہے مگر سیاہ کو سیاہ اور سفید کو سفید کے علاوہ کچھ اور نہیں کہا جاسکتا۔" آرتھر نے کہا اور پانڈے بدستور سر جھکائے کاغذات میں الجھا رہا اور یوں اس نے اپنے رویے سے میرے خیال کی تائید کردی۔

"افغانستان کی صورتِ حال پر ہماری کڑی نظر ہے۔" آرتھر کہہ رہا تھا۔ "سولہ ماہ گزر چکے ہیں مگر کٹھ پتلی حکومت بیرونی اسلحے اور افرادی قوت کے بے دریغ استعمال کے باوجود بغاوت پر قابو پانے میں ناکام رہی ہے۔ تباہ حال اور بے سروسامان عورتوں، بچّوں اور بوڑھوں کے قافلے بھاری تعداد میں سرحد پار کررہے ہیں۔ سرحدی علاقے آئے دن کی گولہ باری کے باعث مخدوش ہوچکے ہیں۔ باغیوں کی سرکوبی کے جواز میں روسی ہوا باز ان پہاڑوں میں نیچی پرواز کرکے اندھا دھند گولیاں اور بم برساتے ہیں۔ ان حالات میں ہجرت کرنے والوں میں اندر [illegible] [illegible] ٹولے کے مخبر بھی ہوتے ہیں..."

[illegible] میرے لیے اعلیٰ پیمانے پر منعقد ہونے والے کسی اہم اجلاس [illegible]ت کا وہ پہلا موقع تھا مگر میں سُن رہا تھا کہ آرتھر موقع نکال کر [illegible] مسئلے پر اپنی حکومت کے موقف کے اظہار میں ضرورت سے [illegible]دہ ہی بول رہا تھا۔ ورنہ اس اجلاس میں افغان مظلوموں کی تصویر کشی کے بجائے محض ابتدائی فقرے ہی کافی تھے۔ مجھے [illegible]تھی کہ بڑے ملکوں کے نمائندے بغض و عناد کے اظہار میں اس [illegible] تھے، اگر ان کی چپقلش کا یہی عالم تھا تو اس پلیٹ فارم پر لایا [illegible]والا ہر مسئلہ اس کی زد میں آتا ہوگا۔ وہ تو غنیمت ہی تھا کہ اس [illegible] میں کوئی روسی نمائندہ نہیں تھا۔ ورنہ الزامات اور جوابی الزامات [illegible] میں انسدادِ منشیات کا مقصد ہی پسِ پشت چلا جاتا۔

"افغان قبائل میں چھپے ہوئے منشیات تیار کرنے کے ٹھکانے [illegible]ہو چکے ہیں یا ویران پڑے ہوئے ہیں اور ایسے لوگوں کی سرگرمیاں سرحد کی دوسری جانب پھیلنے لگی ہیں۔" آرتھر کانفرنس کے شرکا کو [illegible] رہا تھا۔ "ہمیں مصدقہ اطلاعات ملی ہیں کہ سرحد پار آنے والوں میں [illegible]ت بنانے والے ٹولے کے مخبر ایسی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں۔ اگر مومن خان کی تعلیمی لیاقت کے بارے میں ڈاکٹر ڈالٹن کے بیان کو درست مان لیا جائے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ باہر کی [illegible] سے تقریباً ناآشنا اور انگریزی سے نابلد اس شخص کے لیے ویرا لائیڈ [illegible] کرنے پر کیسے آمادہ کیا گیا ہوگا؟"

آرتھر نے رک کر ہال میں موجود کانفرنس کے شرکا کا جائزہ لیا۔ [illegible] اٹھائے ہوئے [illegible] نے ہر ایک [illegible] دیا تھا، ہال میں [illegible] طاری تھا اور ہر ایک آرتھر کی زبان سے اس کے اٹھائے ہوئے [illegible] کا جواب سننے کا منتظر تھا۔

"مومن خان جیسے لوگ اپنے بازوؤں پر اعتماد کرتے ہیں۔" آخر [illegible] آواز میں بولا۔ "ہیروئن تیار کرنے کی کوششوں میں مومن خان [illegible] کی خبر یقیناً ان مخبروں [illegible] ہوگی۔ ان کے [illegible] یہ اطلاع روسی آقاؤں کو بھی ملی ہوگی [illegible] ان کے بیرونی ذرائع [illegible] مومن خان کے لیے ڈاکٹر ڈالٹن کی خدمات حاصل کرنے کا منصوبہ [illegible] کامیاب رہا۔ ہوسکتا ہے کہ ڈاکٹر ڈالٹن کی خدمات کا بھاری [illegible] بھی ان ہی نے ادا کیا ہو۔"

[illegible] کئی تحیر آمیز آوازیں ابھریں لیکن برونو آرتھر کے [illegible] سے متفق نہیں تھا۔ "آخر روسیوں کو منشیات کی سرپرستی کی کیا [illegible] ہے؟ پھر ہم یہاں دستیاب حقائق کے تبادلے اور اس [illegible] کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ کانفرنس کا ایجنڈا ابھی یہی [illegible] اگر مفروضات پر بحث چھیڑ دی گئی تو کانفرنس لامتناہی ثابت ہوگی۔ [illegible] ہوگا کہ ہم ایجنڈے کا خیال رکھیں۔ شاید اگلے اجلاس میں ہم اپنے مفروضات کو حقائق کی صورت میں سامنے لاسکیں۔"

"مسٹر برونو ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" ڈاکٹر ویسلر نے اپنا سرمایانہ فیصلہ صادر کیا۔ "ہم حقائق تک محدود نہ رہے تو الجھ جائیں گے۔"

آرتھر کی پیشانی پر شکن تک نہ آئی، وہ بدستور مسکراتا رہا۔ ڈاکٹر ویسلر خاموش ہوا تو سنجیدہ لہجے میں بولا۔ "ڈاکٹر ڈالٹن اور ویرا لائیڈ کے بارے میں، سامنے آنے والے حقائق سے کچھ مفروضات سامنے آگئے تھے لیکن میرے پاس جو مستند معلومات ہیں، وہ ان مفروضوں کی تصدیق کے ساتھ ہی مسٹر برونو کے اس سوال کا جواب بھی فراہم کریں گی کہ روسیوں کو منشیات کی سرپرستی کی کیا ضرورت ہے؟"

"یہ پہلو ہمارے لیے حیرت انگیز ہے۔" جوناس نے تجسس آمیز لہجے میں کہا۔ شاید اسے خوشی ہوئی تھی کہ آرتھر نے روسیوں پر ملامت کا آغاز کرکے ویرا لائیڈ کا معاملہ دبا دیا تھا اور یوں وہ ایک مجرمہ کی قومیت کے حوالے سے ندامت اٹھانے سے بچ گیا تھا۔

"مسئلہ بظاہر خالص معاشرتی نوعیت کا ہے۔" آرتھر نے قلم سے کھیلتے ہوئے کہنا شروع کیا لیکن بدقسمتی سے اس میں سیاسی رنگ غالب ہے۔ افغانستان میں ننگی جارحیت کے ارتکاب پر روس کو عالمی پیمانے پر رسوائی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ [illegible] عامہ کھل کر ان حریت پسندوں کی حمایت کررہی ہے جنھیں ان کے اپنے ملک میں باغی قرار دیا جارہا ہے۔ روسی قیادت کا خیال تھا کہ افغانستان میں پیش قدمی کا انجام بھی چیکوسلواکیہ جیسا ہوگا۔ چند روز ادھم ہوگا پھر لوگ بدلی ہوئی صورتحال کو جوں کا توں تسلیم کرلیں گے لیکن یہ طالع آزمائی انھیں مہنگی پڑی ہے۔ دن بدن حریت پسندوں کی حمایت میں اضافہ ہورہا ہے اور اب ان کے سر پر یہی سودا سوار ہے کہ ان جنگجو جانبازوں کو بدنام کیا جائے۔ جنھیں اپنی جدوجہد جاری رکھنے کے لیے ہر لمحے اسلحے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے ابتدا تیار کی ہوئی ہیروئن کی سستے داموں فراہمی سے کی تھی۔ جنگ آزما ٹولوں کے لیے اس وقت آزادی سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ وہ روسی اور مقامی فوجی قافلوں پر حملے کرکے ان کا اسلحہ اپنی مہمات میں استعمال کرتے ہیں مگر وہ ان کے لیے ناکافی ہوتا ہے۔ وہ جائز اور ناجائز، ہر طریقے سے اسلحہ حاصل کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ وہ سادہ لوح افراد روسی ففتھ کالم کی ریشہ دوانیوں سے لاعلم ہیں۔ ان کے بعض گروپ سستی ہیروئن مہنگے داموں فروخت کرکے اپنی جنگ کے لیے مالی وسائل فراہم کررہے ہیں۔ سازش کے پہلے مرحلے کی کامیابی کے بعد پناہ گزینوں کے بھیس میں چھپے ہوئے مخبروں کے ذریعے ہیروئن تیار کرنے کی لیبارٹریاں قائم کرنے پر اکسایا گیا ہے۔ ہماری معلومات کے مطابق پائندہ گل کے گروپ کی لیبارٹری کسی بھی وقت کام شروع کرسکتی ہے۔ اسی کے ساتھ پاکستان کے آزاد قبائل بھی ان کی سازشی لہر کی زد میں آئے ہوئے ہیں۔ کیونکہ وہ پاکستان کو اپنا مجرم سمجھتے

ہیں جو ان کے باغیوں کو جائے پناہ فراہم کر رہا ہے۔ حالانکہ لاکھوں تباہ حال افغان مہاجرین کی ان خیمہ بستیوں میں حکومت پاکستان اور عالمی اداروں کی بھرپور کوششوں کے باوجود انسانی مجبوری اور بے بسی کے دلدوز مناظر نظر آتے ہیں۔ ہیروئن کی سرپرستی کی اس مہم سے روسی کئی محاذوں پر فائدہ اٹھانے کی فکر میں ہیں۔ ان کی سب سے کاری ضرب کا نشانہ افغان حریت پسند ہیں۔ وہ پروپیگنڈے کے ذریعے ان کی منشیات فروشی کو اچھال کر عالمی پیمانے پر ان کے کردار کو مسخ کرنا چاہتے ہیں۔ تاکہ وہ ہر قسم کی ہمدردیوں سے محروم ہو کر تنہا رہ جائیں پھر ہیروئن کے غیر قانونی ٹریفک کی بڑی گزرگاہ کے طور پر پاکستان کا نام سامنے آئے گا تو ہیروئن کی فراہمی سے متاثر ہونے والے ممالک پاکستان کے بارے میں سخت رویّہ اختیار کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ ان کا تیسرا مفاد لمبی مدت کی منصوبہ بندی سے وابستہ ہے۔ جب عالمی منڈی میں سونے سے تقریباً پانچ گنی قیمت پانے والا یہ سفوف پاکستان میں کوڑیوں کے مول پھینکا گیا تو روسیوں کا کام مقامی مجرموں اور مفاد پرستوں نے آسان کر دیا۔ پشاور سے کراچی تک کے سفر میں ماہرانہ اسمگل کیا جانے والا یہ نشہ مقامی بازاروں میں بھی پھیل گیا اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ قلیل سی مدت میں ہیروئن یہاں حیرتناک سُرعت کے ساتھ مقبول ہوئی ہے اور اس وقت پاکستان میں اس کے ہزاروں عادی موجود ہیں۔ چند برسوں میں یہ تعداد لاکھوں سے تجاوز کر جائے گی۔ وہ ہیروئن کی لت ڈال کر پاکستانی معاشرے کو کھوکھلا اور تباہ کر دینا چاہتے ہیں کیونکہ افغانستان کی سرزمین ان کی آخری منزل نہیں ہے۔ ان کی نگاہ بحیرۂ عرب کے گرم پانیوں پر مرکوز ہے جہاں بندرگاہیں سال بھر کھلی رہتی ہیں اور ان کے ذریعے تیل کی دولت سے مالامال مشرقِ وسطیٰ کے ریگزار ان کی دسترس میں آجائیں گے۔ افغانستان خشکی سے گھرا ہوا ایک چھوٹا سا ملک ہے۔ اسے ٹھکانا بنا کر وہ آنے والے سالوں میں موقع ملتے ہی ایران یا پاکستان میں گھس کر سمندر کا رخ کریں گے۔ حالات اور قرائن سے ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ سمندر تک گزرگاہ کے لیے پاکستان کا انتخاب کر چکے ہیں اور چاہتے ہیں کہ جب وہ پیش قدمی کریں تو اس ملک کا معاشرہ اور معیشت مقابلے کے قابل ہی نہ ہو لیکن اس میں ذرا دیر ہے۔ افغانستان کے حالات پر پوری طرح قابو پائے بغیر وہ کسی دوسری بین الاقوامی سرحد کو عبور کرنے کی حماقت نہیں کریں گے کیونکہ پیش قدمی کرنے والوں کی سپلائی لائن میں افغان علاقے کی کلیدی اہمیت ہے یہ لائن کٹ گئی تو بڑھنے والے چوہوں کی طرح گھیر کر مار دیے جائیں گے اور پھر سال بھر کھلی رہنے والی بندرگاہوں پر قبضے کا روسی خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا۔"

امریکی نمائندہ آرتھر خاموش ہوا تو اجلاس میں تحیّر آمیز سرگوشیاں پھیلتی چلی گئیں۔ اس کے انکشافات میرے لیے سنسنی خیز تھے... نہیں کر پا رہا تھا کہ آرتھر نے جو کچھ کہا وہ واقعی سچ تھا یا... میں اپنی تمام صلاحیتیں صرف کر کے اس نے ہیروئن کی... تجارت کے ڈانڈے زبردستی روسی سازشوں سے ملا دیے...

میرے لیے کانفرنس میں شرکت کا تجربہ لمحہ بہ لمحہ... ہو رہا تھا۔ مجھ جیسے درمیانی آدمی کے لیے باہر رہتے ہوئے بھی ناممکن تھا کہ شہر کے غلیظ اور گنجان علاقوں میں پھیر... میں ہیروئن کی پڑیاں بیچنے والے کسی بڑی سازش کے آلۂ... لیکن آرتھر نے جو کچھ کہا، پورے اعتماد سے کہا تھا، کانفرنس... پُرجوش بحث کا آغاز ہو گیا تھا۔

دو گھنٹے بعد بارہ بجے افتتاحی اجلاس کی پہلی نشست... تو میں سوچوں کے ہجوم میں کھویا ہوا باہر نکل آیا۔ باقی دو... میری معلومات میں مزید اضافہ نہیں ہوا تھا اور مجھے افسوس... کہ منتظمین نے مبصرین کا دعوت نامہ دو گھنٹے کی افتتاحی نشست... کیوں محدود رکھا تھا۔

اپنے پیشے کے اعتبار سے میرے لیے وہ دو گھنٹے بہ... تھے۔ اس کانفرنس میں کہا جانے والا ایک ایک لفظ ٹریڈ... بہت اہم تھا۔ شاید شرکا کے پاس بہت سا مواد تھا لیکن... معلوم تھا کہ پہلی نشست میں مبصرین بھی موجود تھے لہٰذا ا... صرف وہی کچھ کہا تھا جسے وہ کانفرنس کے حوالے سے ابلا... کے ذرائع تک پہنچانا چاہتے تھے۔ کھانے کے وقفے کے بعد... نشست اور اگلے اجلاسوں میں یقیناً کھل کر انکشافات کیے... بے فکری سے تبادلۂ خیال ہوتا، بولنے والے اپنی فراہم کر... اطلاعات کے تصدیقی ذرائع سے شرکا کو آگاہ کرتے اور پھر... کی تیاری اور فروخت کو پوری قوت سے کچلنے کے لیے تجا... کی جاتیں مگر میرے لیے اس تمام کارروائی سے واقف ہو... کوئی ذریعہ نہیں تھا۔

دوپہر کا کھانا میں عموماً فیکٹری ہی میں کھاتا تھا لیکن... اجلاس کے بارے میں سی ون کو رپورٹ دینا تھی۔ لہٰذا میں... کار اپنے گھر کے راستے پر ڈال دی۔

میں خواب گاہ میں جوتے اتار کر کھانے سے قبل ابھا... ایک جام پینے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ ٹرانسمیٹر پر کال سگنل... ہونا شروع ہو گیا۔ شاید سی ون میری رپورٹ جاننے کے... بے چین تھا۔

آپریٹس آن کرتے ہی مجھے ریسیور پر خطرناک صورت... کی درشت آواز سنائی دی "سی ون کالنگ فار ڈی ون... اوور"

"ڈی ون رسیونگ... اوور" میں نے اپنی اصل...

...ں کہا کیونکہ اس وقت گفتگو اس فریکوئنسی پر ہو رہی تھی جو ...مجھ کے آپریٹس کے دائرہ کار سے باہر تھی۔

"تو میرا قیاس درست ہی نکلا۔ تم لوٹ آئے کانفرنس سے؟ ...اوور" ایک گہرے سانس کے بعد اس کی آواز سنائی دی۔

"میرا جانا بہت کارآمد رہا!" میں نے کہا "جرمنی میں ڈاکٹر ڈالٹی ...ی ایک کیسٹ پکڑا گیا ہے۔ اس نے اعتراف کیا ہے کہ وہ ویرا لائیڈ ...ی ایک انگریز لڑکی کے ایما پر اس نے ہمارے آزاد قبائلی علاقے ...ں مومن خان نامی کسی شخص کو ہیروئن کی تیاری کا طریقہ سکھایا ہے۔ ...یبارٹری پائندہ گل نامی افغان نے قائم کی ہے۔ ان کوششوں ...امریکی نمائندے نے روسی سازش قرار دیا ہے... اوور۔"

"روسی سازش!" اس کی تلخ ہنسی سنائی دی "شاید کوئی روسی ...نہیں تھا وہاں، ورنہ وہ امریکی سازش کی کہانی سناتا اور پھر آپس میں ...تلخ کلامی پر سارا قصہ ختم ہو جاتا۔ خیر تم تفصیل سناؤ امریکی نمائندے کی تقریر کی۔ اوور!"

میں نے اختصار کے ساتھ آرتھر کے انکشافات سنانے شروع کر دیے۔

"گڈ" اس کی آواز سے خوشی کا اظہار ہو رہا تھا "یہ لوگ ناک کے نیچے دیکھنے کے بجائے دوربین لگا کر دور کی کوڑی لانے کے عادی ہو گئے ہیں۔ انھیں چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ آج مال آنے والا ہے۔ اسے جیوا ہاؤز میں کون وصول کرے گا؟ اوور۔"

میں سوچ میں پڑ گیا۔ جیوا ہاؤز کی عمارت بدستور ویران تھی وہاں کے ملازمین اگلی صبح نو بجے لوٹنے والے تھے۔ فوری بندوبست یہی ہو سکتا تھا کہ میں خود وہاں پہنچ جاتا لیکن سی ون نے میری تجویز سے اتفاق نہیں کیا۔ اس کا خیال تھا کہ ذمے داریوں میں اضافے کے بعد معمولی کاموں میں میرا یوں ملوث ہونا مناسب نہیں تھا۔ مال کی وصولیابی کسی اور ہی کو کرنا چاہیے۔

"لیکن میں جیوا ہاؤز کو ممنوعہ قرار دینے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ اوور۔" میں نے کہا۔ مجھے یہ تو معلوم تھا کہ سی ون اختیارات کے سلسلے میں مجھ سے اوپر تھا اور کچھ دن کے لیے میں اسی کو جوابدہ تھا لیکن میری ذات پر اس کی گرفت نہیں تھی۔ اس سے متعارف ہونے کے بعد میں گفتگو میں بہت آسانی محسوس کر رہا تھا۔ جب کہ بی فور سے برسوں کے صوتی رابطے کے باوجود بات کرتے ہوئے ذہن پر خوف طاری رہتا تھا کہ کہیں کسی بات پر بھڑک کر وہ مجھے ہی نہ اکھاڑ جائے۔ اس خوف کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ بی فور کی شخصیت ہمیشہ پردے میں رہی تھی جبکہ سی ون سے میں مل چکا تھا۔

"تمھیں اپنے فیصلوں کی آزادی ہے لیکن یہ سمجھ لو کہ تم جہانگیر سے بدستور کام لیتے رہو گے تو جیوا ہاؤز پر تمھارا تصرف اس سے پوشیدہ نہ رہ سکے گا اور وہ تم پر شبہ کرنے لگے گا۔ اسے راستے سے ہٹانا ہے تو اور بات ہے۔ اوور"

سرسری لہجے میں دیا گیا مشورہ سن کر میں جھرجھری لے کر رہ گیا۔

"تو کیا مجھے جہانگیر کے خاتمے کا اختیار بھی ہے؟ اوور۔"

"خود مختاری کا مطلب ہر طرح کی آزادی ہوتا ہے۔" اس کی طرف سے جواب آیا "اب تم اوپر آ گئے تو بتانے میں کوئی حرج نہیں... طارق کا قتل یاد ہے تمھیں؟ اوور۔"

"ہاں... اوور۔" میں نے سکتے کے عالم میں غیر ارادی طور پر کہا۔

"اپنی بے احتیاطی کی وجہ سے خطرہ بن جانے پر اسے راستے سے ہٹایا گیا تھا۔" سی ون کے انکشاف نے میرے ذہن میں چنگاریاں سی بھر دیں "تمھیں بس نشاندہی کرنا ہو گی۔ باقی کام میرے آدمی کر لیں گے۔ اسی لیے ہم انتظامی اور حفاظتی امور سے متعلق سمجھے جاتے ہیں... اوور۔"

"جہانگیر میرے لیے کارآمد ہے!" میں نے بولتے ہوئے اپنے وجود پر نقاہت سی طاری ہوتی محسوس کی۔ اس سے پہلے میں خود ان امکانات پر سوچ چکا تھا کہ کہیں طارق اپنوں ہی کی سنگدلی کا نشانہ نہ بنا ہو لیکن سی ون کی زبان سے وہ انکشاف سن کر مجھے گہرا صدمہ ہوا تھا۔ طارق نے برسوں جس کے لیے اپنے شب و روز ایک کیے، اسی کے ایما پر اپنے عبرتناک انجام کو پہنچا تھا۔ میرے دل میں سکندر علی کے لیے نفرت کے جذبات اور گہرے ہو گئے۔ اس کا قاتل سی ون رہا ہو یا اس کا کوئی آدمی، لیکن ایک بات طے تھی کہ طارق کا لہو بی فور کے اشارے پر بہایا گیا تھا اور یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی تھی کہ بی فور کے پردے میں اصل شخصیت سکندر علی کی تھی۔

"وہی جیوا ہاؤز میں ڈلیوری لے گا۔ اوور" میں نے اس پر جہانگیر کی اہمیت جتانے کے بعد اپنی بات مکمل کی۔

"آج رات نو بجے... اوور اینڈ آل" سی ون نے سلسلہ منقطع کر دیا اور میں سوچ میں ڈوبا اپنے لیے جام تیار کرنے لگا۔ اس وقت میرے ذہن میں آندھی چل رہی تھی۔ طارق میرا پرانا دوست تھا۔ ہم دونوں برسوں سے اکٹھے رہتے آئے تھے اور ایک دوسرے کے رازوں میں پوری طرح شریک تھے۔ اس رفاقت نے ہمارے درمیان محبت اور اعتماد کو جنم دیا تھا جو آخر تک قائم تھی۔

لیکن اس مخلص اور وفادار دوست کو سکندر علی نے سرد مہری کے ساتھ قتل کرا دیا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ اسی وقت اسلحہ لے کر دندناتا ہوا اس کے مکان میں گھسوں اور اس نابکار کو جہنم واصل کر دوں لیکن میں مجبور تھا۔ اس حد تک مجبور تھا کہ سرکاری مردہ خانے سے اپنے عزیز دوست کی لاش اٹھوا کر اس کی تدفین تک نہ کرا سکا تھا اور مجبوری یہ تھی کہ میں اسی تنظیم کا کارندہ تھا جس نے سکندر علی کے

روپ میں ایک بھیڑیے کو پالا ہوا تھا جو بھوکا ہو تو اپنے ہی کسی کمزور ساتھی کو پھاڑ کھاتا ہے۔

سکندر علی نے جو کچھ کیا، اس کے سلسلے میں اسے تنظیم کا پورا تحفظ حاصل تھا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ ڈی سی سے ڈی ون بنائے جانے کے بعد اب مجھے رفتہ رفتہ بی فور کے اختیارات سونپے جا رہے تھے۔ اسی کے ساتھ سکندر علی کو شاید ترقی مل گئی تھی اور اس سے ٹکرانا ایک اعتبار سے تنظیم کے بڑوں کے قہر کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔

میں نے یخ بستہ کندن رنگ سیال کے بڑے حصے کو گلاس سے معدے میں منتقل کیا اور پھر سکندر علی کا نمبر ملانے لگا۔ میرے لیے اس کی ذات اس قدر اہم تھی کہ ڈائرکٹری سے تلاش کیا ہوا اس کا فون نمبر میرے ذہن میں محفوظ تھا۔

دوسری گھنٹی پر ریسیور اٹھا لیا گیا تھا۔ بولنے والے کی آواز سن کر میرے ذہن میں سکندر علی کے اس ملازم کا چہرہ گھوم گیا جو اس کے مکان میں سب سے پہلے میرے ہاتھ آیا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کا سیٹھ گھر پر موجود نہیں تھا۔ خاصا کرید نے کے بعد اس سے میں بمشکل اگلوا سکا کہ سکندر علی چند دنوں کے آرام کے لیے اپنے باغات میں گیا ہوا تھا۔ اس کی سیکریٹری بھی موجود نہیں تھی۔ ملازم سے پتا چلا کہ اس کا نام زنشی تھا اور سکندر علی کی روانگی سے پہلے ہی وہ اپنا سامان سمیٹ کر کہیں چلی گئی تھی۔

***

کھانے کے بعد طبیعت پر مایوسی کے ساتھ ہی کسلمندی بھی غالب آگئی اور میں بستر پر دراز ہو گیا لیکن نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ رہ رہ کر طارق کے بھیانک قتل کی واردات ذہن میں ابھر رہی تھی۔ مشکل یہ تھی کہ میں کسی سے دل کا بوجھ بھی ہلکا نہیں کر سکتا تھا۔

میں اسی ادھیڑبن میں مبتلا بستر پر پہلو بدل رہا تھا کہ اچانک فون کی گھنٹی نے مجھے چونکا دیا۔

ریسیور اٹھایا تو غزالہ کی زندگی سے بھرپور آواز سن کر میرے ذہن میں تازگی کی لہر دوڑ گئی۔ "میں تنویر ہی بول رہا ہوں غزالہ!" اس کے استفسار پر میں نے مسرت آمیز لہجے میں کہا۔

"کہاں غائب ہیں آپ؟" اس کی سنجیدہ آواز میں شوخی عود کر آئی۔ "بے چاری عابدہ تو اس انتظار میں گھلی جا رہی ہے کہ اس کی کتاب کب شائع ہو سکے گی؟"

"اوہ۔" میں بے اختیار ہنس پڑا۔ "اخراجات کا تخمینہ بتاؤ اور کتاب چھاپ ڈالو۔ دراصل میں نے دو مرتبہ تم سے بات کرنے کی کوشش کی تھی اور دونوں بار تمہارے والد صاحب کی آواز سنتے ہی فون بند کرنا پڑا۔ آواز ہی سے ریٹائرڈ کرنل معلوم ہوتے ہیں۔" میں نے اس کا دل رکھنے کے لیے جھوٹ بولا۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ جاپان جانے سے پہلے میں نے صرف ایک بار اس کے گھر فون کر کے کرنل زد کو چڑایا تھا اور غزالہ پر عائد گھریلو پابندیوں کی وجہ سے دوسری کرنے کی ہمت ہی نہیں کر سکا تھا۔

میری وضاحت سن کر وہ اپنی مترنم آواز میں کھلکھلا کر ہ "میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ گھر پر فون کرنا بے سود ہوگا۔"

"یہ بتاؤ کہ اس وقت کہاں ہو تم؟" میں اس کی بات در سے اچک کر بولا۔ "میں فوراً پہنچتا ہوں۔"

"نہ نہ۔" وہ بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولی۔ "ابھی میری د باقی ہیں..."

لیکن میری ضد کے آگے اسے ہتھیار ڈالنے پڑے اور وہ لہجے میں اپنے کالج سے ذرا دور کتابوں کی ایک مشہور دکان میں رضا مند ہو گئی۔ میں پھرتی سے تیار ہو کر اس سے ملنے کے لیے ر گیا۔ نجانے اس لڑکی میں کیا خاص بات تھی کہ اس کی طرف میرا مائل ہوتا جا رہا تھا جب کہ دوسری عورتوں کی طرح سستی کسی پہلو نظر نہیں آتی تھی۔

کتابوں کی دکان میں وہ اکیلی اور قدرے خوفزدہ سی تھی۔ داخل ہوا تو اس نے خریدی ہوئی اشیا کے دام ادا کیے اور میرے باہر نکل آئی۔ مجھے اس کی گھبراہٹ میں لطف آ رہا تھا لیکن وہ جلد وہاں سے نکل جانا چاہتی تھی تاکہ اپنی سہیلیوں میں سے اتفاقاً کس نگاہ میں نہ آسکے۔ میں نے بڑھ کر دروازہ کھولا اور وہ بلاتکلف نشست پر بیٹھ گئی۔

فون پر تو میں پہلے بھی غزالہ سے اشاروں کنایوں میں بہت کچھ کہہ گیا تھا اور اسی موقع پر آپ کا تکلف ختم کر کے اسے تم سے مخاطب کیا تھا۔ جس پر اس نے احتجاج نہیں کیا تھا۔ اس حوصلہ افزائی نے آتشِ شوق کو اور بھڑکا دیا تھا۔

اس روز کلفٹن کے پُرسکون ساحل پر سسکتی دم توڑتی موجوں کے دھیمے دھیمے شور میں ہم بہت دیر تک باتیں کرتے رہے اور گزرتے ہوئے لمحے کے ساتھ میرے دل پر غزالہ کے حسن اور سادگی کا نقش گہرا ہوتا چلا گیا۔

اس کا تعلق ایک متوسط گھرانے سے تھا۔ ماں اور باپ کے علاوہ ایک بڑا بھائی تھا جو دس سال کی عمر سے کسی ایسے پیچیدہ عارضے میں مبتلا ہوا تھا کہ اسے اپنا ہوش ہی نہیں رہا تھا۔ کبھی اس کی حالت اتنی بگڑ جاتی کہ وہ گھر میں توڑ پھوڑ مچانے لگتا اور ہر والے پر جنون کے عالم میں جھپٹنے کی کوشش کرتا تھا۔ ایسے مواقع پر زبردستی کسی کمرے میں مقفل کر دیا جاتا تھا۔ اسے کئی ماہرین کو دکھایا لیکن کوئی بھی اس کی نارمل حالت واپس لانے میں کامیاب نہ ہو دو ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ کسی نشہ آور دوا کی بھاری مقدار نے اس کے خلیوں کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا تھا لیکن غزالہ کی ماں نے ان کو سختی سے مسترد کر دیا تھا۔

لیکن غزالہ کو شبہ تھا کہ ان دو ڈاکٹروں کی رائے صحیح تھی۔ میرے پر غزالہ اپنے شبہے کے اسباب پر روشنی نہ ڈال سکی لیکن اتنا کہ اسے اپنے گھر کے ماحول میں پیار اور محبت کے باوجود کبھی کبھی کا سا احساس ہوتا ہے جیسے گھر میں کوئی ایسی بات ہو رہی ہو جسے دانستہ لاعلم رکھا جا رہا ہو۔

ان باتوں کو سامنے لا کر وہ پوری سنجیدگی کے ساتھ مجھے یہ جتانا چاہتی تھی کہ مجھے اس سے دور ہی رہنا چاہیے لیکن میرے لیے اپنے دامن بچانا مشکل نظر آ رہا تھا جو اس کی ذات میں رہ تھی۔

اس سے ہلکی پھلکی باتیں کرتے ہوئے میں نے ایمانداری سے کو ٹٹولا لیکن کہیں بھی نفس کی وحشیانہ طلب کو موجود نہ پایا۔ ت میں نے پہلی بار سوچا کہ میں کس راستے پر بڑھ رہا تھا۔ چاری شریف لڑکی میرے ظاہر سے متاثر تھی لیکن اسامی مجھے اپنے جال میں پھانسنے کے بجائے بلاکم و کاست ہر پہلو لا کر میرے راستے میں دیوار حائل کرنا چاہ رہی تھی مگر مجھے سراپا مجسم پیار نظر آ رہا تھا۔ اس کی باتوں میں زندگی کے معصوم بھلے ہوئے تھے، تعلیم اور ذہانت کے امتزاج نے اس کے حسن چاند لگا دیے تھے۔ اس سے چھیڑ چھاڑ کر کے مجھے ناقابلِ بیان مل رہی تھی۔ اس کے وجود میں ایسی محبت آمیز رعنائیاں رچی ہیں کہ مجھے اس کے ساتھ بیٹھ کر لطف آ رہا تھا۔

لیکن اس کا انجام؟

یہ سوچتے ہی مجھے جھرجھری سی آگئی۔ وہ اتنی صاف گو تھی کہ نے اپنی ذات سے اپنے گھر تک، ہر بات مجھے بتا دی تھی لیکن بطلے ظاہر کی آڑ میں پیش قدمی کر رہا تھا۔ میرا گندا باطن اس سے رہ تھا۔ اگر اسے شبہ بھی ہو جاتا کہ وہ ماضی کے ایک مجرم اور حال نشیات فروش کے ساتھ بیٹھی ہوئی ہے تو شاید دہشت سے چیخ کار سے کود کر ویران ریتیلے ساحل پر کسی بھی طرف بھاگ نکلتی۔

واپسی میں میں نسبتاً خاموش تھا۔ میں نے اپنا گھر بار چھوڑ کر تنہا زندگی کا طویل سفر طے کیا تھا۔ مردوں اور عورتوں سے دوستی ذریعے میں اپنا فاضل وقت محفلوں میں گزارتا تھا لیکن پھر بھی کبھی ذہن پر بے نام سی اداسی چھا جاتی تھی۔ ایسے لمحات میں میں ذہن کو ٹٹولتا لیکن کبھی بھی اس اداسی کا سبب نہ جان سکا۔ مال و دولت اور حسن و جمال کی نعمتیں ہر وقت میری دسترس میں رہتی تھیں۔ ان کے ہوتے ہوئے وہ اداسی میرے لیے ناقابلِ فہم ثابت ہوتی تھی لیکن اس روز ویران ساحل پر غزالہ سے باتیں کرتے ہوئے اچانک ہی اس اداسی کا سبب دریافت ہو گیا تھا۔

اس کا تعلق میرے اندر کی تنہائی سے تھا۔ ہر قسم کے وسائل پر تصرف کے باوجود میں تنہا تھا، حسینوں کے ہجوم میں میرا ذہن تنہائی کے کربناک ویرانے میں بھٹک جاتا تھا اور جب اس ادھورے پن کا احساس شدید ہو جاتا تو مزاج میں قنوطیت امڈ آتی۔

اپنی ادھوری ذات کے لیے مجھے کسی سہارے کی ضرورت تھی۔ کوئی ایسی ذات جو بھرپور اپنائیت کے ساتھ اپنا سب کچھ مجھے سونپ سکے، ایک ایک لمحے میری خبرگیری کرے اور میں پورے اعتماد کے ساتھ اسے اپنے دکھ سکھ کے مسائل میں شریک کر سکوں۔ زندگی کے پُرپیچ راستوں پر لاتعداد حسین چہرے اور کشش انگیز پیکر میری راہ میں آئے تھے لیکن ان کے بارے میں میں لمحوں کی سوداگری کے علاوہ کوئی لطیف بات نہ سوچ سکا۔ غزالہ میری زندگی میں پہلی عورت تھی جس نے مجھے اپنا باطن ٹٹولنے پر مجبور کر دیا تھا۔

میں نے اسے راستے میں کار سے اتارا تو میں فیصلہ کر چکا تھا کہ زندگی کے سفر میں میسر آنے والے اس سائے کا ساتھ میں کبھی نہ چھوڑوں گا۔ انجام کچھ بھی ہو لیکن میری پیش قدمی جاری رہنی چاہیے تھی اور اس نے بھی خاموشی سے سر جھکا کر اگلے روز مجھ سے دوبارہ ملنے کا اقرار کر لیا۔

***

رات نو بجے جہانگیر کو جیوا ہاؤز میں مال وصول کرنا تھا لیکن اس سے رابطے کا وقت آٹھ اور سوا آٹھ کے درمیان تھا۔

وقت کے اس تعین کا خیال آتے ہی میرا ذہن سلمٰی کی طرف بھٹک گیا۔ مجھے اس کا وہ رویّہ یاد آیا جو اس نے پچھلی رات میرے ساتھ اختیار کیا تھا۔ جہانگیر کی موجودگی میں وہ ہمیشہ مجھے تنویر بھائی کہتی تھی اور اس کا رویّہ بھی مدافعانہ سا ہوتا تھا لیکن اس کی غیر حاضری میں وہ ہمیشہ کھل کر نگاہیں چار کر کے بات کرتی تھی۔ مجھے اس کا پچھلی رات کا رویّہ یاد آیا جب میں پیٹ میں درد کا بہانہ کر کے صوفے سے اٹھا تو لحظہ بھر کے لیے اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک پیدا ہوئی تھی۔ شاید اسے خیال ہوا تھا کہ میں اس کی طرف پیش قدمی کروں گا لیکن مجھے فرار پر آمادہ پا کر اس کے چہرے پر مایوسی پھیل گئی تھی۔

وہاں مسئلہ یہ تھا کہ ان دونوں کے درمیان اعتماد کا فقدان تھا۔ جہانگیر نے اپنا اصل روپ سلمٰی اور اس کے گھر والوں سے پوشیدہ رکھ کر اسے اپنایا تھا۔ سلمٰی صرف اسی قدر جانتی تھی کہ جہانگیر ایک اوسط درجے کی ٹیکسٹائل فیکٹری کا مالک ہے اور وہ اپنی اصل سرگرمیوں کا راز برقرار رکھنے کی کوششوں میں اپنے اور سلمٰی کے درمیان اجنبیت کی ایک خلیج کو پروان چڑھا رہا تھا۔ ان حالات میں اگر سلمٰی کے ذہن میں اپنی نسوانی انا کی تسکین کی خاطر کوئی گرہ پیدا ہو رہی تھی تو وہ اتنی قصوروار

نہیں تھی۔ اس کی کج روی بھی جہانگیر برابر کا ذمے دار ہوتا۔

لیکن میں اپنی اور غزالہ کی دوستی کا وہ انجام ہوتے نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ کافی سوچ بچار کے بعد میں نے فی الحال حالات کو اپنے دھارے میں بہتا چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اسی کے ساتھ میں مناسب وقت آنے پر غزالہ کو اپنی ذات کے پوشیدہ گوشوں سے بھی آگاہ کرنا چاہتا تھا تاکہ ہمارے درمیان کبھی کوئی غلط فہمی جنم نہ لے سکے۔

وال کلاک نے بلند آہنگ میں آٹھ بجنے کا اعلان کیا تو میں نے آپریٹس آن کر کے اسے سرخ روشنی والی فریکوئنسی پر سیٹ کیا اور ڈی ٹو کے لیے پیغام نشر کرنے لگا۔ جہانگیر کی طرف سے فوراً ہی جواب مل گیا لیکن اس کی آواز کے ساتھ ہی پس منظر میں کسی کار کے انجن کا دھیما شور بھی ریسیور پر سنائی دے رہا تھا جس کا مطلب تھا کہ اس وقت وہ شہر کے کسی ویران علاقے میں ڈرائیونگ کر رہا تھا۔

"تمھاری کار اس وقت جہاں بھی ہے۔ اس کا رخ جیوا ہاؤز کی طرف موڑ لو۔" میں نے بھاری آواز میں کہا۔ "ٹھیک نو بجے وہاں مال پہنچنے والا ہے۔ اس کی وصولی کے بعد تم فوراً واپس لوٹ آؤ گے... اوور۔"

"شاید آپ کو علم نہ ہو سر!" جہانگیر کی آواز سے ہچکچاہٹ کا اظہار ہو رہا تھا۔ "بی فور نے کل صبح نو بجے تک ہر ایک کو جیوا ہاؤز سے دور رہنے کا حکم دیا ہوا ہے... ویسے میں آپ کے حکم کی تعمیل کے لیے تیار ہوں... اوور۔"

ٹرانسمیٹر پر اس کی بات درمیان سے کاٹنا ناممکن تھی، ورنہ میں اسے فقرہ مکمل بھی نہ کرنے دیتا۔ "مجھے سب معلوم ہے" میں درشت لہجے میں غرایا۔ "تم وہی کرو گے جو میں کہہ رہا ہوں لیکن جیوا ہاؤز میں تین نمبر کمرہ اب شجرِ ممنوعہ ہے۔ ہر ایک اس سے دور رہے گا۔ گچھے سے اس کمرے کی چابی نکال لی گئی ہے۔ اس ہدایت سے انحراف کی سزا بہت بھیانک ہوگی... اوور۔"

"او کے سر! اوور۔" جہانگیر کی آواز سے تکان کا اظہار ہونے لگا تھا۔

"ڈینی کے بارے میں پرانی ہدایت اب برقرار نہیں رہی۔ اس سے حسبِ ضرورت رابطہ قائم کیا جا سکتا ہے لیکن جو کام اسے ملوث کیے بغیر ہو سکتا ہو، اس میں ڈینی کو الجھانے کی ضرورت نہیں۔ میں اسے ایک اہم کام میں استعمال کرنا چاہتا ہوں۔ جس میں خاصے خطرات ہوں گے۔ خالی الذہن رہ کر وہ میرے لیے مفید ثابت ہوگا۔ بصورتِ دیگر اس کی ذراسی لغزش نہ صرف اسے لے ڈوبے گی بلکہ ہمیں بھاری نقصان اٹھانا پڑے گا۔ اوور۔"

"اس کے آدمی فی الحال میں نے نادر کو سونپے ہوئے ہیں، ان کا کیا کرنا ہوگا؟ اوور۔"

"احمد یار اور ٹائیگر کو سنبھالنا نادر کے لیے دشوار نہیں ہو معاملات خوش اسلوبی سے چل رہے ہیں تو اسی طرح چلنے دو ڈینی کو یہ اندازہ نہیں ہونا چاہیے کہ اسے کسی خطرناک موقع کے پالا جا رہا ہے۔ اوور اینڈ آل۔"

سلسلہ منقطع کرتے ہی میں خود بخود مسکرا دیا۔ اپنے بار میں ایسی ہدایات جاری کرنے کا مقصد یہ تھا کہ جہانگیر کو بے بار میں کوئی شبہ نہ ہو سکے لیکن مجھے اندیشہ تھا کہ طارق کے قتل اپنے خوف کے باعث میری ہدایات اسے بہت سنگین محسوس ہوئی گی۔ وہ سمجھ رہا ہوگا کہ طارق کے بعد اب میری باری آنے والی تھ

حالات تیزی سے بدل رہے تھے۔ سی ون کے روئیے ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے مجھ پر بھرپور اختیار حاصل نہیں تھا۔ بلکہ کے قتل کے بارے میں اپنی زبان کھول کر اس نے ایک طرح میرے ساتھ دوستانہ رویّے کا اظہار کیا تھا۔ پھر میرے اپنے انداز مطابق اگر مجھے بی فور کے اختیارات سونپے جانے والے تھے تو کو میرا ماتحت ہی ہونا تھا۔ اس اعتبار سے بی فور کے اختیارات منتقلی کے اس عارضی دور میں میں تنظیم کے کسی ذمّے دار آدمی براہ راست جواب دہ نہیں تھا۔ سی ون کا کام صرف اتنا تھا ک رپورٹ اوپر پہنچا دیتا اور اوپر سے آنے والے احکام سے مجھے کر دیتا۔ اس عارضی دور میں میں کوئی بڑا قدم اٹھا کر تنظیم کے شکنجے نکلنے میں کامیاب ہو سکتا تھا۔

اب مجھے یہ دیکھنا تھا کہ سی ون کے انتظامی اور حفاظتی کے افراد کس حد تک میری طرف متوجہ تھے۔ غزالہ کے ساتھ کلفٹن ہوئے میں اس کی ذات کے سحر میں ایسا کھویا کہ تعاقب وغیرہ دینے کا خیال ہی نہیں رہا۔ اس طرف سے بے فکر ہونے کے میں بڑی کارروائی کا آغاز کر سکتا تھا۔ جس کے لیے سکندر علی کی ڈا میری راہ کا پہلا پتھر تھی۔

سب سے پہلی بات تو یہ تھی کہ سی ون کے بیان کی رو میں وہ طارق کے قتل کا مجرم قرار پاتا تھا، پھر بظاہر تنظیم میں وہ آدمی تھا جو میرے جہانگیر اور نادر کے بارے میں ہر اونچ نیچ باخبر تھا۔ اگر اس کا پتا صاف ہو جاتا تو کام خاصا آسان ہو جا

میں نے ایک بار پھر ان فون نمبروں کا جائزہ لیا جو سکندر علی کی خوابگاہ میں ڈائری میں سے ملے تھے۔ ان میں ایک نمبر کراچی کا تھا۔ جب کہ بقیہ دو نمبر صرف چار ہندسوں پر تھے۔ ان کے بارے میں یہ اندازہ لگانا دشوار تھا کہ کس شہر کے ہوں جب کہ اے ٹو کا نمبر پانچ ہندسوں پر مشتمل تھا۔ مجھے شبہ تھا کہ لاہور کا رہا ہوگا۔ میں اپنے شناخت نامے پر موجود ایسٹین سنڈیکیٹ لمیٹڈ کے نمبروں سے اس کا موازنہ کر چکا تھا لیکن وہ اس فرم کے فون نمبروں سے مختلف تھا۔

جس کام کا آغاز کرنا تھا اس میں تاخیر مناسب نہیں تھی۔ میرے کراچی کا جو نمبر موجود تھا وہ میں نے سکندر علی کی ڈائری میں سی کے آنے والے صفحات سے نوٹ کیا تھا اور اس نمبر سے پہلے ایک ہندسہ درج تھا یعنی میرے حساب سے وہ نمبر سی ون کا ہونا چاہیے تھا۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ وہ نمبر ملایا تو دوسری طرف ایک سیکنڈ تک گھنٹی بجتی رہی اور آخر کار ریسیور اٹھا لیا گیا لیکن ریسیور نسوانی آواز سن کر میری امیدوں پر اوس پڑ گئی۔

اگر میں کوئی بات کیے بغیر سلسلہ منقطع کر دیتا تو بولنے والی شبہ میں پڑ جاتی۔ لہٰذا میں نے آواز بدل کر نرمی سے سوال کیا۔ "شہلا صاحبہ موجود ہیں؟"

"جی نہیں۔ یہاں کوئی شہلا نہیں رہتی۔" دوسری طرف سے کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا گیا اور میں نے بھی ایک گہرا سانس لے کر ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔ اب میرے لیے ایک ہی راستہ باقی رہ گیا تھا کہ نمبروں کی ترتیب سے شائع ہونے والی ٹیلی فون ڈائرکٹری سے مشکوک نمبر کا پتا دیکھ کر مکان کی نگرانی کروں تاکہ اس کے بارے میں اپنے شبہات کی تصدیق یا تردید کے بعد یہ فیصلہ کر سکوں کہ دوسرے نمبروں پر کھپانا سودمند ثابت ہوگا یا محض وقت کی بربادی ثابت ہوگا۔

***

میں گھر سے دفتر کے لیے روانہ ہوا تو کشمیر روڈ پر گھومتے ہی ایک گلی سے سبز رنگ کی ڈاٹسن نمودار ہوئی اور میرے پیچھے ہو لی۔ عقب نما آئینے میں اس کے عکس کو میں نے خاص اہمیت نہیں دی۔ کیونکہ میرے اور اس کے درمیان تین گاڑیاں حائل تھیں اور صبح کے ان اوقات میں اس سڑک پر ہر لمحے خاصا ٹریفک رواں رہتا تھا لیکن میں اس دن گھر سے کچھ اہم فیصلے کر کے نکلا تھا لہٰذا اپنی منزل کا رخ کرنے سے پہلے یہ یقین کرنا چاہتا تھا کہ کوئی میرا تعاقب نہ کر رہا ہو۔ چوراہے پر آ کر میں نے داہنے ہاتھ پر گھومنے کے بجائے اپنی کار سیدھے راستے پر رکھی۔ دو گاڑیاں داہنی طرف مڑ گئیں لیکن سیاہ کار اور سبز ڈاٹسن بدستور میرے پیچھے لگی رہی۔ شاہراہِ قائدین کے چوراہے سے سیاہ کار داہنی طرف گھوم گئی مگر میں نے بائیں موڑ کا انتخاب کیا اور شاہراہ قائدین پر ڈرگ روڈ کی طرف ہو لیا۔ سبز کار کی رفتار دھیمی ہوئی پھر سیدھی آنے والی چند گاڑیوں کو راستہ دینے کے بعد وہ بھی اسی طرف ہو لی اور میں زیرِ لب مسکرا دیا۔

سبز ڈاٹسن میری نگاہوں میں آ چکی تھی مگر میں تعاقب کرنے والے کو ہوشیار کرنا نہیں چاہتا تھا۔ لہٰذا میں نے اگلے چوراہے سے کار دوبارہ بائیں طرف اپنے گھر جانے والے راستے پر گھما لی تاکہ تعاقب کرنے والا اس غلط فہمی میں مبتلا رہے کہ میں راستے میں کوئی بھولی ہوئی چیز لینے یا کام نمٹانے کے لیے گھر واپس جا رہا ہوں۔ چوراہے سے گھومنے کے بعد سبز ڈاٹسن چند لمحوں تک عقب نما آئینے میں نظر آتی رہی اور پھر اچانک داہنی سمت کی کسی گلی میں غائب ہو گئی۔ اس کا ڈرائیور میری توقع کے مطابق عمل کر رہا تھا۔ مگر اس وقت میں اسے ڈاج دے کر نکلنے کے بجائے صرف یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ کس کار میں میرا تعاقب کیا جا رہا تھا۔ تاکہ وقتِ ضرورت میں اس پر اپنی توجہ مرکوز کر سکوں۔

گھر پہنچ کر میں نے بلا کسی ضرورت چند منٹ اپنے کمرے میں گزارے تاکہ تعاقب کرنے والے کے ساتھ ہی ملازمین کے پُرتجسس ذہنوں میں میری خلافِ توقع واپسی کا کوئی جواز سما سکے پھر پُرسکون انداز میں کشمیر روڈ کے راستے اپنی فیکٹری کی طرف روانہ ہو گیا۔ سبز ڈاٹسن اس بار بھی ٹریفک کے ہجوم کی آڑ میں پیچھے لگی ہوئی تھی۔

مجھے آخری موڑ گھومتے دیکھ کر جب سبز ڈاٹسن والے کو یقین ہو گیا کہ میں دفتر ہی جا رہا تھا تو وہ اپنی کار تیز رفتار سے سیدھی لیتا چلا گیا۔

دفتر میں روزمرہ کے معمول کی مصروفیات میں بمشکل ایک گھنٹہ صرف ہوا اور میں فون پر اس روز کے لیے طے شدہ دو تین کاروباری ملاقاتوں کے بارے میں معذرت کر کے دفتر سے روانہ ہو گیا۔

اس بار میری نگاہیں مستقل عقب نما آئینے پر جمی رہیں لیکن سبز ڈاٹسن کا کہیں پتا نہیں تھا۔ میں نسبتاً غیر معروف راستوں سے گزرتے ہوئے کافی دیر تک شہر میں ڈرائیونگ کرتا رہا لیکن کسی بھی ایسی گاڑی کو نوٹ کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا جس پر تعاقب کا شبہ کیا جا سکتا۔

اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں برق رفتاری سے ملیر کی طرف روانہ ہو گیا جہاں گیراج کی آڑ میں میرا ایک پرانا دوست چوری کی گاڑیوں کو اونے پونے خرید کر پورے داموں پر فروخت کرنے کا دھندا کرتا تھا۔

صادق کا کام بظاہر بہت خطرناک تھا لیکن اپنی چالاکیوں کے سہارے اس نے اسے ایک فن میں تبدیل کر لیا تھا۔ شیر شاہ میں جہاں کباڑی از کار رفتہ گاڑیاں کھول کر پرزوں کی شکل میں فروخت کرتے تھے وہیں حادثوں میں تباہ ہونے والی کاریں اپنی آخری رسومات کے لیے آتی تھیں اور صادق اعتماد کے آدمیوں سے ایسی گاڑیوں کی کتاب، رجسٹریشن پلیٹیں اور کار کے ڈھانچے وغیرہ پر نصب دوسری شناختی پلیٹیں بھاری داموں پر خرید لیتا تھا۔ دوسری طرف چور بازار میں بھی اس کے گہرے روابط تھے، وہ تقریباً اسی ماڈل کی کوئی چوری کی کار خریدتا اور ورکشاپ کے عقبی شیڈ میں کار کی نمبر پلیٹیں اتار کر رنگ تبدیل کیا جاتا اور شیر شاہ سے خریدی ہوئی نمبر پلیٹوں کے سہارے باقی کام اطمینان سے پورا کیا جاتا، چیسز کی نمبر پلیٹ مہارت سے بدل دی جاتی۔ اگر انجن پر بھی نمبر پلیٹ ہوتی تو بڑی آسانی سے

اصل کی جگہ دوسری لگا دی جاتی ورنہ بلاک کے ساتھ ڈھلا ہوا نمبر گرائنڈر سے اڑا کر شیر شاہ سے خریدی ہوئی کتاب کے مطابق دوسرا نمبر ڈھالا جاتا اور انجن کو اعلیٰ قسم کے اسپرے پینٹ کا غسل دینے کے بعد کار ڈنکے کی چوٹ پر بازار کے داموں فروخت کے لیے تیار ہو جاتی۔

صادق چونکہ بنیادی طور پر جرائم کی دنیا کا آدمی تھا۔ لہٰذا دوسروں کے کام بھی آتا تھا۔ چوری کی کاروں کی نمبر پلیٹیں وہ بڑی حفاظت سے سنبھال کر رکھتا تھا اور پھر کسی ضرورت مند کو دو چار ہزار میں بیچ دیتا تھا۔ شہر میں کئی وارداتیں ایسی ہوئیں کہ عینی شاہدوں نے پولیس کو مجرموں کی کار کے نمبر بتائے جو تفتیش کے بعد کسی مسروقہ کار کے ثابت ہوئے لیکن مجرموں کی کار کے رنگ اور ماڈل سے لے کر ساخت تک جو بھی کوائف چشم دید گواہوں سے ملے۔ وہ مسروقہ کار سے بالکل مختلف تھے اور میں بھی اپنی مہم میں یہی ترکیب آزمانا چاہتا تھا۔

مجھے دیکھ کر صادق بہت تپاک سے ملا۔ اس سے میری دوستی نئی نہیں تھی۔ وہ میرا پرانا لاہوری یار تھا اور دوسرے ہم پیشہ لوگوں کے مقابلے میں میرا زیادہ ہی لحاظ کرتا تھا اسے دکھ تھا تو بس اس بات کا کہ میں نے پلاسٹک فیکٹری لگانے کے بعد غلط قسم کے دھندوں سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ جسے ایک بار ہو ان کی آمدنی کا چسکا لگ جائے وہ مرتے دم تک برقرار رہتا ہے۔ نہ ہی میں نے کبھی اس کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کی کیونکہ نیک نامی کی نقاب اوڑھ کر قانون شکنی میں لطف ہی کچھ اور تھا۔

کسی مسروقہ کار کی نمبر پلیٹوں کے بارے میں میرا استفسار سن کر وہ چونکا تھا "خیر تو ہے راجہ جی؟ کیا ارادے ہیں؟" وہ لاڈ میں ہمیشہ مجھے راجہ جی ہی کہا کرتا تھا لیکن اس وقت صادق کی زبان سے وہ الفاظ سن کر بے اختیار میرے ذہن میں راجہ سکندر علی کا متین اور سنجیدہ چہرہ ابھر آیا۔

"ذرا ٹیڑھا معاملہ ہے۔" میں نے رازدارانہ لہجے میں اسے بتایا۔ "یوں سمجھ لو کہ بڑھ کر وار نہ کیا تو خود مارا جاؤں گا۔" اس حد تک اسے اعتماد میں لینا ضروری تھا کیونکہ کسی واردات کے حوالے سے مسروقہ کار کے نمبر منظرِ عام پر آتے تو وہ معاملے کی تہ تک پہنچ جاتا اور پھر میری طرف سے اس کے دل میں ایسا میل آتا کہ میرے لیے اس کی تلافی دشوار ہو جاتی۔

"خون خرابے کی بات ہے۔" وہ آنکھیں سکوڑ کر سوچ میں پڑ گیا پھر چند ثانیوں کی خاموشی کے بعد بولا "پشاور کی فورڈ فالکن کی نمبر پلیٹیں ہیں۔ دو سال پرانا قصہ ہے، وہ پلیٹیں شاید میں نے تمہارے ہی لیے رکھی ہوئی تھیں۔"

"چلیں گی، نکالو جلدی سے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم بیٹھو۔ میں ابھی پندرہ منٹ میں لاتا ہوں۔" وہ بائیں آنکھ دبا کر بولا "ایسی گھپلے کی چیزیں میں یہاں نہیں رکھتا۔ ذرا بھی اُنیس بیس ہو گئی تو پورے شہر کی چوریوں کا حساب دینا پڑ جائے گا۔"

وہ پندرہ منٹ سے پہلے ہی اپنی ولیسپا پر لوٹ آیا تھا۔ گتا لگا کر اس طرح کاغذ میں لپیٹی گئی تھیں کہ پیکٹ مربع شکل کا ہو اسے دیکھ کر یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ اس میں کسی کار کی ہوں گی۔ وہ مجھ سے ایک پیسہ بھی لینے کے لیے تیار نہیں تھا ایسے معاملات میں لین دین کی اہمیت سے خوب واقف تھا پر کے بعد وہ اصولی طور پر اس معاملے میں پوری طرح ملوث ہو کبھی بھول کر بھی اس لین دین کو زبان پر نہ لاتا جب کہ دوسرے میں اس سے کہیں نہ کہیں بے احتیاطی سرزد ہو سکتی تھی۔ جب میں اصرار کیا تو یک بیک تین ہزار روپے سے محروم ہونا پڑ گیا۔

واپس لوٹتے ہوئے میں نے گتا اور کاغذ کھول کر راستے پھینک دیا اور دونوں نمبر پلیٹیں اپنے اس بریف کیس میں محفوظ جو میں نے بی فور کی ہدایت پر گلشن اقبال والی عورت سے تھا۔ اس بریف کیس میں میرے بھرے ہوئے پستول کے ساتھ سرجیکل دستانے بھی موجود تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ جب سکندر سے سامنا ہوگا تو اسے یہ ضرور جتاؤں گا کہ اس کا دیا ہوا بریف اس مہم میں میرے لیے کتنا کارآمد ثابت ہوا۔

میرے پاس خاصا وقت تھا لیکن میں ایک بار تعاقب کرنے والے کی دسترس سے نکلنے کے بعد گھر یا فیکٹری جا کر دوبارہ اس الجھن سے دوچار نہیں ہونا چاہتا تھا۔ لہٰذا فوری طور پر کرائے کی کار کی تلاش میں شہر جا پہنچا اور تھوڑی ہی دیر بعد میں اپنی کار ایک مشہور ہوٹل کی پارکنگ لاٹ میں چھوڑ کر بریف کیس سمیت سفید کرولا میں سفر کر رہا تھا۔

کمپری ہینسو انشورنس کی سہولت کے باعث کاریں کرائے پر دینے والے ان دنوں محض شناختی کارڈ اور ڈرائیونگ لائسنس کی بنیاد پر کاریں کرائے پر دے دیتے تھے جب کہ میں نے کرائے کی مد میں پیشگی ایک ہزار روپے بھی جمع کرا دیے تھے۔

پیٹرول کی ٹنکی بھروانے کے بعد میں نے ڈیش بورڈ کے حصے میں مائیلو میٹر سے منسلک چین الگ کر دی تاکہ میٹر سے یہ پتا نہ چل سکے کہ میری تحویل میں اس کار نے کتنی مسافت طے کی ہے۔

اس ابتدائی تیاری کے بعد میں نے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں دل کھول کر اپنے معدے کی تواضع کی اور تین بجے سے ذرا پہلے سستی کے ساتھ شہر سے ٹھٹھہ کے لیے روانہ ہو گیا۔

* * *

ہیڈ لیمپس کی تیز روشنی میں سکندر فارمز کا بورڈ نمایاں طور پر چمک رہا تھا۔

نیشنل ہائی وے پر سفر کرتے ہوئے میں نے اپنی مہم کی تیاریاں مکمل کر لی تھیں۔ کرائے کی کار کی اصلی نمبر پلیٹیں میری سیٹ کے نیچے پڑی ہوئی تھیں اور کار پر پشاور کی مسروقہ فورڈ فالکن کی پلیٹیں لگے ہوئے تھے۔ میرے سر پر بنی ہوئی سوتی ٹوپی منڈھی ہوئی تھی۔ آنکھوں پر بڑے فریم والی تاریک شیشوں کی عینک جمی ہوئی تھی اور نتھنوں میں مڑے ہوئے تاروں کے ذریعے گھنی مونچھیں پھنسی ہوئی تھیں جن کا لمس مجھے اپنے اوپری ہونٹ پر گراں گزر رہا تھا لیکن حفظِ ماتقدم کے لیے اسے برداشت کرنا ضروری تھا۔ سرجیکل دستانے میں نے پہلے ہی ہاتھوں پر چڑھا لیے تھے اور پستول بریف کیس سے اپنی جیب میں منتقل کر چکا تھا۔

سکندر فارمز میری توقع کے عین مطابق کسی باقاعدہ حد بندی سے محروم ایک کھلا فروٹ فارم تھا جہاں کناروں پر قطاروں میں لگے ہوئے پرانے درختوں سے احاطے کا کام لیا گیا تھا اور کچے راستے کے اختتام پر کسی پھاٹک یا رکاوٹ سے محروم کشادہ راستہ نظر آ رہا تھا جو درختوں کے درمیان سے ہوتا ہوا اندر تک چلا گیا تھا۔

قرب و جوار میں کوئی آبادی نہ ہونے کی وجہ سے اس علاقے میں پھلوں کے باغات ہر اعتبار سے محفوظ تھے۔ لہٰذا وہاں حفاظتی عملے کی بھی زیادہ ضرورت نہیں سمجھی گئی تھی۔ میں نے کار باغ میں جانے والے راستے پر گھمائی تو ہیڈ لیمپس گل کر دیے لیکن درختوں کے گھنے سائے میں راج کرتی ہوئی تاریکی میں پارکنگ لائٹس کی روشنی میں سست روی سے کار چلانے میں مجھے کوئی دقت پیش نہیں آئی اور میں کسی بھی قسم کی مداخلت سے دوچار ہوئے بغیر اندرونی حصے میں بنے ہوئے اس نیم پختہ کاٹیج تک پہنچ گیا جہاں برقی قمقموں کی روشنی نظر آ رہی تھی اور فضا میں کسی جنریٹر کا کرخت شور گونج رہا تھا۔

میں کار سے اتر کر دروازہ لاک کر رہا تھا کہ بوسیدہ کپڑوں میں ایک جواں سال آدمی عمارت کے قریب ہی کسی کنج سے نمودار ہوا اور میرے قریب آ کر ٹھہر گیا۔ کار کی موجودگی کے باعث وہ مجھ سے مرعوب نظر آ رہا تھا اور اس توقع پر خاموش کھڑا تھا کہ میں خود ہی بلا استفسار اسے اپنی آمد کے مقصد سے آگاہ کروں گا۔

"سکندر صاحب کہاں ہیں؟" دروازہ لاک کر کے چابی جیب میں ڈالتے ہوئے میں نے پُرسکون لہجے میں اس سے سوال کیا۔

"اندر آرام کر رہا ہے سائیں!" اس نے سندھی لب و لہجے میں اردو بولنے کی کوشش کرتے ہوئے خوشامدانہ انداز میں کہا۔ "نام بتاؤ تو ابھی اندر خبر کر دیتا ہوں۔"

"تم ٹھہرو۔ میں خود ہی اندر جا رہا ہوں۔" میں نے اسے ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تو اس کے بشرے پر تذبذب کے آثار ابھر آئے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کچھ کہنا چاہ رہا ہو لیکن شاید بات کی ابتدا کرنے کے لیے اسے مناسب الفاظ نہ مل رہے ہوں۔ اس کے کچھ بولنے سے پہلے میں بے پروایانہ انداز میں کاٹیج کی طرف بڑھ گیا اور وہ بے چارگی کے ساتھ وہیں کھڑا رہ گیا۔

کاٹیج کی ساخت بالکل سادہ تھی۔ مختصر سے برآمدے میں پہنچ کر میں نے دروازہ کھولا تو خود کو ایک مکلف اور آراستہ نشست گاہ کی چوکھٹ پر پایا۔ اس سے نکلتے ہی ایک پتلا سا راستہ تھا۔ جس میں تین دروازے تھے۔

میں اس راہداری میں پہنچا ہی تھا کہ الکحل کی تیز بُو میرے نتھنوں سے ٹکرائی اور میں داہنا ہاتھ جیب میں ڈال کر اس بند دروازے کی طرف بڑھ گیا جس کی جھریوں سے روشن لکیریں پھوٹ رہی تھیں۔

دروازہ پرانے طرز کا تھا۔ میں نے احتیاط سے اس پر دباؤ ڈالا لیکن اندر سے شاید کنڈی لگی ہوئی تھی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو میدان صاف تھا۔ باہر ملنے والا ملازم میرے پیچھے اندر داخل ہونے کی ہمت نہیں کر سکا تھا۔ میں نے جیب سے پستول نکال لیا اور دیوار سے چپک کر آہستہ سے دروازے پر دستک دے ڈالی۔ جواب میں اندر سے لڑکھڑائی ہوئی خوابناک آواز ابھری جس میں غصے کا عنصر غالب تھا۔ وہ گالیوں کے ساتھ دستک دینے والے کا نام دریافت کر رہا تھا۔

میں نے جواب دینے کے بجائے پھر دروازہ بجایا فوراً ہی اندر کھٹکے کی آواز پیدا ہوئی پھر میرے کانوں میں تحیّر زدہ نسوانی آواز گونجی "ارے۔ یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے سیٹھ جی!" بولنے والی کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ نہ مقامی تھی اور نہ سکندر علی کی سیکرٹری جس سے میں ایک رات گارڈن ایسٹ کے مکان میں نہایت تفصیل سے ملاقات کر چکا تھا۔

اندر سے سکندر علی کی غضبناک غراہٹ ابھری اور میں اچھل کر کھلے ہوئے دروازے کے سامنے آ گیا۔

میرے سامنے ایک دبلی پتلی، خوبصورت سی عورت دونوں ہاتھوں سے دروازہ کھولے کھڑی تھی۔ اپنی طرف اٹھے ہوئے پستول کی مہیب نال دیکھ کر اس کی آنکھیں خوف سے پھیلتی چلی گئیں لیکن اس سے قبل کہ اس کے حلق سے چیخ برآمد ہوتی، میں نے سفاکانہ لہجے میں اسے خاموش رہنے کا حکم دیا اور پستول کی نال سے اسے اندر دھکا دے کر کمرے میں گھس گیا۔

عورت سے مجھے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ میں سکندر علی کو مہلت دیے بغیر بے بس کرنا چاہتا تھا، شاید اس نے میری آواز سن لی تھی مگر میں نے دیکھ لیا کہ وہ سندھی طرز کی مسہری سے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے وحشیانہ پھرتی کے ساتھ عورت کی گردن کے گرد ہاتھ ڈال کر بایاں ہاتھ مضبوطی سے اس کے دہانے پر جمایا اور پستول سے اس کی داہنی کنپٹی بجا دی۔

میری گرفت میں لحظہ بھر کے لیے اس کا جسم تڑپا پھر اس کا سارا وزن مجھ پر آ رہا۔ میں نے پھرتی کے ساتھ اسے قالین پر ڈال دیا، میں سیدھا ہوا تو سکندر علی بستر سے نیچے آ چکا تھا۔

"ہاتھ اوپر اٹھالو، ورنہ بھیجا اڑادوں گا۔" میں نے پستول کو اضطراری طور پر جنبش دیتے ہوئے کہا اور اس کی خمار میں ڈوبی ہوئی سرخ سرخ آنکھوں میں حیرت تیرنے لگی۔

"تم کون ہو؟" اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں میرے چہرے پر مرکوز کر کے سوال کیا۔ "اور یہاں کیا لینے آئے ہو؟" اپنی ہیئت میں اس وقت وہ نہایت مضحکہ خیز نظر آرہا تھا لیکن اس کے ہاتھ بدستور پہلوؤں میں جھول رہے تھے۔

"ہاتھ اٹھاؤ۔" میں الٹے قدموں دروازے کی طرف سرکتے ہوئے ہذیانی مگر دھیمی آواز میں غرایا۔ اس وقت میرے اعصاب پر یک بیک ناقابلِ برداشت تناؤ پیدا ہوگیا تھا اور میں اس سے الجھنے سے پہلے دروازہ بند کر کے کسی مداخلت کا امکان ختم کرنا چاہتا تھا۔ ویسے مجھے پورا یقین تھا کہ وہ آوازیں باہر تک نہیں پہنچی ہوں گی۔

سکندر علی نے آہستہ آہستہ اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لیے۔

"تمھاری مونچھیں... یہ تو نقلی معلوم ہوتی ہیں۔" سنگین خطرے کو سر پر منڈلاتا دیکھ کر اس کا نشہ ہرن ہو رہا تھا۔

"یہ مونچھیں باہر والوں کے لیے تھیں۔" دروازے کی کنڈی لگا کر میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "غور کرو گے تو مجھے اچھی طرح پہچان لوگے، بی فور!"

وہ چونک پڑا۔ پھر بے یقینی کے ساتھ ساتھ بڑبڑایا۔ "ڈینی؟ نہیں نہیں — یہ نہیں ہوسکتا، میں بی فور نہیں ہوں۔"

"بازی الٹ چکی ہے۔ سکندر علی صاحب!" میں اس کی طرف بڑھتے ہوئے سرد، سفاکانہ لہجے میں بولا۔ "برسوں تم ایک آواز... بے نام آواز بن کر دن رات میرے اعصاب پر سوار رہے لیکن اب اگر تمھاری آواز اونچی ہوئی یا تم نے گڑبڑ کی تو بے دریغ گولی مار دوں گا... ورنہ ہوسکتا ہے کہ اپنے سوالوں کے جواب لے کر میں تمھیں زندہ چھوڑ دوں۔"

"تمھیں بہکایا گیا ہے۔" وہ بولا تو اس کی آواز پر کمزوری غالب آگئی تھی۔ "پتا نہیں، تم کس بی فور کی بات کر رہے ہو۔"

"سنو!" میں نے اس کی پیشانی پر پستول کی نال سے ٹھوکا دیتے ہوئے کہا۔ "شاید تم آج بھی میرے لیے ایک پُراسرار آواز ہی بنے رہتے لیکن میں نے ایک کالج کے مذاکرے میں تمھاری لچھے دار تقریر سن کر آواز پہچان لی تھی پھر تمھارے مکان میں، میں خود گھسا تھا۔ تمھاری حسین سیکرٹری کو بے ہوش کر کے تلاشی کے دوران اس کے کمرے میں آپریٹس دیکھا تھا، تمھاری خوابگاہ کی تلاشی لی تھی... وہاں تمھاری ڈائری سے کچھ نمبر بھی نوٹ کیے تھے..."

"اوہ خدا!" وہ بے اختیار بول پڑا، اس کا چہرہ تاریک پڑ گیا تھا۔ "تو میری تباہی کے ذمے دار تم ہی ہو، تم نے میری زندگی برباد کر ڈالی، مجھے کسی قابل نہ چھوڑا، اب یہاں مجھ سے کیا لینے آئے ہو؟"

"چند سوالوں کے جواب۔" میں نے اس کے شکستہ چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "طارق کو کس نے قتل کرا[یا]"

"وہ... وہ زندہ رہتا تو اپنے ساتھ مجھے اور تم سب کو لے ڈوبتا۔" وہ جلدی سے بولا۔ "اور مجھے تو تم سب ہی لے ڈو[بے]، وہ نگاہوں میں آیا تو راستے سے ہٹا دیا گیا لیکن تم نے میرے گھر گھس کر میرا بھرم تباہ کر دیا۔ شاید میرا بھی وہی حشر ہوتا لیکن غنیمت یہ ہوا کہ تمھاری مداخلت کو چوری سمجھا گیا لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا اب میں معزول ہو چکا ہوں اور دو مہینے تک اسی بیابان میں محدود رہوں گا۔"

"جہاں تمھیں کوئی تکلیف نہیں، ہر آسائش میسر ہے۔" [میں] نے قالین پر بے ہوش پڑی ہوئی عورت کی طرف اشارہ کر[تے] ہوئے تحقیر آمیز لہجے میں کہا لیکن اس کی زبان سے معزولی کا ذ[کر] سن کر مجھے اپنے اختیارات میں اضافے کا جواز مل گیا تھا۔ اس معزولی کے بعد مجھ سے کام لینے کا فیصلہ کیا جا چکا تھا۔

"بات الجھانے کی ضرورت نہیں۔" میں نے لحظہ بھر توقف کے بعد کہا۔ "مجھے دو ٹوک جواب چاہیے، طارق کس کے حکم [پر] مارا گیا ہے؟"

وہ یوں میری طرف دیکھتا رہا جیسے میرے چہرے [سے] میرے عزائم کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر بھرائی ہو[ئی] آواز میں بولا۔ "تم سمجھ دار آدمی ہو۔ میری پوزیشن سمجھنے کی کوشش [کرو]۔ میں اس کی بے احتیاطی کو نظر انداز کرتا تو اس کی نگرانی کرنے وال[ے] مجھ سے بدظن ہو جاتے، ہوسکتا تھا کہ اوپر سے میرے بارے میں کوئی بھیانک فیصلہ صادر کر دیا جاتا، پورا پورا اکٹ تھرو ٹ بزنس تھا یہ، وہ نہ مرتا تو میں مارا جاتا۔"

"تم کس کو جواب دہ تھے؟" میں نے سرد لہجے میں سوال کیا۔

اس کی آنکھوں میں خوف سمٹ آیا اور وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ "تم کیا چاہتے ہو؟ اگر یہ سمجھتے ہو کہ ان سے ٹکرا کر کامیاب ہوسکو گے تو یہ تمھاری خام خیالی ہے۔ کسی بھی لمحے ایک بکرے کی طرح ذبح کر دیے جاؤ گے اور کوئی قاتل کا سراغ تک نہ پاسکے گا۔"

"کان کھول کر سن لو کہ میں نے اپنے راستے کا انتخاب کر لیا ہے۔" میں نے اسے خوف زدہ کرنے کی نیت سے کہا۔ "تمھاری تنظیم سے اب مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ لہٰذا مجھے سمجھانے کے بجائے میرے سوالات کے جواب دو۔ ورنہ ذبح کر دیے جاؤ گے۔"

"میں اس سے ناواقف ہوں۔" وہ تھوک نگلنے کی کوشش کرتے [ہوئے] بولا۔ "ساری ہدایات ایم ٹی تھری ہنڈرڈ پر ملتی تھیں۔"

"ایم ٹی تھری ہنڈرڈ کیا ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"ایم ٹی تھری ہنڈرڈ ایک طاقتور ٹرانسمیٹر ریسیور ہے جس کی [رینج] تین سو میل تک ہے، معزول ہونے سے قبل وہ میری تحویل [میں] تھا۔" اس نے کہا اور مجھے وہ بھاری مواصلاتی سامان یاد آگیا [جو سی] ون نے جیوا ہاؤز میں میری تحویل میں دیا تھا۔

"اس کا کوڈ کیا ہے؟ سی ون کی حیثیت کیا ہے؟ گلشن اقبال [کی] اپنی زولا کون ہے؟ مجھے ان سب سوالات کے جواب [چاہی]یں لہٰذا جو کچھ معلوم ہے، رُکے بغیر دہراتے چلے جاؤ کیونکہ میرے [پاس] وقت کم ہے۔"

"وہ بی ون کہلاتا ہے۔" اس نے جھجکتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "[م]یں اسی کو جواب دہ تھا لیکن میں اس سے واقف نہیں ہوں۔ سی ون [میرے] ماتحت ہے۔ وہ براہ راست مجھ سے ملتا رہتا ہے۔ وہ میرے [لیے] کام کرنے والوں کی وقتاً فوقتاً نگرانی کراتا رہتا تھا، اسی سے مجھے [پتا] چلا کہ مقرب خان، طارق کے پیچھے لگ گیا تھا۔ حالات بگڑ جانے [پر م]یری ہدایت پر اس نے مقرب خان کو مار ڈالا پھر عقرب خان [اور] پھمن خان بھی اسی کے ہاتھوں مارے گئے لیکن امکان تھا کہ [ان کے] بعد مرنے والوں نے کچھ اور لوگوں کو بھی اعتماد میں لے رکھا ہو [اس لیے] معاملے کو طول دینے کے بجائے میں نے طارق کو مروانے کا [فیص]لہ کر لیا لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرے ستارے گردش میں آ[گئے] ہیں۔ میرا بس چلتا تو میں اپنے گھر میں چوری کی خبر اپنی ذات تک [محدو]د رکھتا لیکن زخشی پہلے ہی وہ خبر آگے بڑھا چکی تھی..."

"زخشی کون ہے؟" میں نے اس کی بات کاٹ کر سوال کیا۔

"بی ون کے ایما پر میں نے اسے سیکرٹری رکھا تھا۔" وہ [کہ]نے لگا۔ "وہ کال گرل کے روپ میں مجھ سے ٹکرائی تھی لیکن [بعد] میں جب خفیہ پیغامات کے سلسلے میں اسے اعتماد میں لینے کا حکم [ملا] تو عقدہ کھلا کہ رات دن اسے میری نگرانی کے لیے میرے سر پر [مس]لط کیا گیا تھا۔ میرے معزول ہوتے ہی وہ میرا ساتھ چھوڑ کر چلی گئی [اگر] اسے شبہ ہو جاتا کہ تم صرف چور نہیں تھے بلکہ معلومات حاصل [ک]رنے کے لیے میرے گھر میں گھسے تھے اور میری خواب گاہ بھی [تم]ھاری دسترس سے محفوظ نہیں رہی تھی تو اس کی رپورٹ پر میرا [حش]ر بھی وہی ہوتا جو طارق کا ہوا۔"

"اور اپنی زولا کیا بلا ہے؟"

"بظاہر وہ ایک پیشہ ور عورت ہے لیکن دراصل سی ون [ک]ے لیے کام کرتی ہے۔ کبھی کبھار میں بھی فون پر اس سے کام لے[تا] رہتا تھا۔ شہر میں بی فور کے طور پر میرا صرف پانچ افراد سے رابطہ تھا۔

تم، جہانگیر، سی ون، زخشی اور پروین۔ ان میں صرف زخشی اور سی ون کو میری اصلیت کا پتا تھا۔ ورنہ پروین کے لیے بھی میں صرف ایک آواز تھا۔ میرے لیے اس کا کوڈ اپنی زولا مقرر تھا۔"

"مال کی آمدورفت کا کیا ذریعہ ہے؟" اسے خوف زدہ دیکھ کر میں حتی الامکان زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنا چاہ رہا تھا۔

"مجھے ایم ٹی تھری ہنڈرڈ پر مال پہنچنے کی پیشگی اطلاع مل جاتی تھی۔ باہر سے آنے والوں سے سی ون کا کوئی آدمی مال وصول کرتا تھا اور میری ہدایت کے مطابق سی ون مال جیوا ہاؤز بھجوا دیتا تھا۔ رقم کا سربمہر پیکٹ سی ون میرے سپرد کرتا تھا اور میں ایک مقامی بینک کی برانچ میں نمبر ٹریڈ اکاؤنٹ کے حوالے سے ایک شخص کو رقم دے کر سادے کاغذ پر رسید لے لیتا تھا۔ بی ون کی طرف سے ایم ٹی تھری ہنڈرڈ پر رقم کی وصولیابی کی اطلاع ملنے پر میں وہ رسید تلف کر دیتا تھا۔"

"مال کہاں سے آتا ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"یہ مجھے آج تک معلوم نہ ہوسکا۔" اس نے بے بسی سے سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔ "سارا طریقۂ کار اس قدر پیچیدہ ہے کہ اپنی ذمے داریوں سے آگے کسی کو کچھ معلوم نہیں ہوسکتا۔"

"اگر سارا طریقۂ کار اسی قدر پیچیدہ تھا اور تم بی ون سے واقف نہیں تو پھر تمھاری خواب گاہ میں موجود ڈائری میں اس کا نمبر کیسے موجود تھا؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ایک ایک لفظ پر زور دے کر سوال کیا۔

"نہیں... اس میں تو کوئی نمبر نہیں تھا اس کا۔" راجہ سکندر علی نے جلدی سے تردید کی۔

"مجھ سے اڑنے کی کوشش نہ کرو راجہ جی!" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "ورنہ میں تمھارے حق میں ان سے کہیں زیادہ بُرا ثابت ہوں گا۔ میں نے تمھاری ڈائری میں چالاکی سے لکھے ہوئے چار فون نمبر دیکھے تھے، اگر میں تمھارے کوڈ سسٹم سے لاعلم ہوتا تو ان نمبروں کو نظر انداز کر دیتا لیکن وہ میرے پاس محفوظ ہیں۔ اے۔ ٹو سے سی۔ ون تک مجھے ان چاروں کی تفصیل چاہیے۔"

اسے خوف زدہ اور بے بس دیکھ کر شاید میں اس کی طرف سے غافل ہوگیا تھا کیونکہ وہ غیر متوقع طور پر اپنی جگہ سے یوں اچانک اُچھلا تھا، جیسے فرش سے اسپرنگوں نے اسے میری طرف پھینکا ہو۔ وہ دراز قامت ہونے کے ساتھ خاصا صحت مند بھی تھا۔ لہٰذا جوں ہی وہ مجھ سے ٹکرایا میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور پھر اس کے بھاری وجود تلے قالین پر گرتے ہوئے میں نے پستول دور اچھال دیا کیوں کہ کلائیوں پر اس کی بے رحمانہ گرفت کے نتیجے میں مجھے خدشہ ہوگیا تھا کہ وہ جھٹکا دے کر مجھ سے پستول چھین لینے میں

کامیاب نہ ہو جائے۔

میری پشت قالین سے ٹکتے ہی سکندر علی نے غراتے ہوئے وحشیانہ قوت سے میری پیشانی پر ٹکر رسید کرنے کی کوشش کی لیکن میں تڑپ کر اس کا وار بچا گیا اور اسی کے ساتھ اس کی اٹھی ہوئی پشت پر پوری قوت سے دونوں گھٹنوں کی ضرب لگا کر اسے سر کے بل الٹ دیا۔ وہ میرے شانے کے قریب سے قلابازی کھاتا ہوا گزرا تو اس کی ایک ٹانگ میرے ہاتھ میں آ گئی۔ میں نے قالین چھوڑ کر پھرتی سے اس کی ٹانگ مروڑنا چاہی لیکن اس نے میرے سینے پر لاتیں رسید کر کے مجھے پیچھے اچھال دیا۔

میں سنبھلا تو وہ بھی قالین سے اٹھ چکا تھا۔ میرا خیال تھا کہ مہلت دیے بغیر مجھے دبوچنے کے لیے وہ میری طرف جھپٹے گا اور اس کا انداز بھی کچھ ایسا ہی خونخوار تھا مگر اچانک ہی اس نے میرے پستول کی طرف چھلانگ لگا دی۔

لمحے بھر کے لیے میں بوکھلا کر رہ گیا۔ میں پورے اعتماد کے ساتھ اس کی کچھار میں داخل ہوا تھا اور میرا اندازہ تھا کہ میں بآسانی اسے اپنے اشاروں پر نچا سکوں گا لیکن اس مردود نے مکاری سے کام لے کر میری بازی الٹ دی تھی، ویسے مجھے اس بات پر حیرت تھی کہ ہاتھا پائی کی نوبت آ جانے کے باوجود اس نے اونچی آواز میں اپنے کسی آدمی کو ادھر متوجہ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ شاید اس کی وجہ نفسیاتی تھی۔ وہ بظاہر ایک معزز اور بُردبار آدمی تھا اور اس انداز میں مار دھاڑ کرتے ہوئے اپنے ملازمین کے سامنے تماشا نہیں بننا چاہتا تھا۔

میں اسے پستول پر قبضہ کرنے سے روکنے کے لیے تیزی سے اس کی طرف لپکا، اس کی پیشانی پر پڑنے والی میری بھرپور ٹھوکر نے اسے بلبلا کر رکھ دیا اور وہ اپنی غیر ارادی چیخ کو بمشکل ایک غضبناک غراہٹ میں دبا سکا لیکن پستول اس کے قبضے میں چلا گیا تھا۔ ٹھوکر کھا کر اس نے لہولہان چہرے کے ساتھ قالین پر پڑے پڑے پینترا بدلا اور پھر کھڑے ہو کر کسی زخمی درندے کے سے تیوروں کے ساتھ مجھ پر پستول تان لیا۔

"شاید اب مجھے دوبارہ کھویا ہوا مقام مل جائے۔" وہ بائیں ہاتھ سے پیشانی کے زخم سے بہہ کر آنکھوں میں آنے والے خون کو صاف کرتے ہوئے فاتحانہ لہجے میں بولا۔ "کاش مجھے پہلے ہی اندازہ ہو گیا ہوتا کہ میں اپنی آستین میں ایک سانپ پال رہا ہوں۔"

پستول کی مہیب نال کو سامنے پا کر میرے اوسان خطا ہو گئے تھے لیکن ذہن پھر بھی کام کر رہا تھا۔ "پستول پھینک دو یا فوراً تم امتحان میں کامیاب رہے ہو۔" میں نے بولتے ہوئے اپنا لہجہ پُرسکون رکھنے کی کوشش کی لیکن اپنی آواز کا کھوکھلا پن خود مجھ سے

پوشیدہ نہ رہ سکا۔

اس کے خون آلود چہرے پر ایک لمحے کے لیے حیر[ت کے] آثار غالب آئے مگر پھر وہ فوراً ہی سنبھل گیا۔ "اب کوئی فر[یب نہیں] چل سکے گا، ہاتھ اوپر اٹھاؤ اپنے۔ میں دیکھوں گا کہ سی ون [تم سے] کیا اگلواتا ہے۔ وہ تشدد میں بے مثال مہارت رکھتا ہے[۔"]

"میرا کام صرف یہ دیکھنا تھا کہ تم رازوں کی حفاظت م[یں کس] حد تک جا سکتے ہو۔" میں نے دونوں ہاتھوں کو سینے پر باندھ[کر] پُرسکون لہجے میں کہا کیونکہ وہ روانی میں کہہ گیا تھا کہ مار[نے کے] بجائے وہ مجھے اپنا قیدی بنانا چاہتا تھا تاکہ اوپر والوں کو میری ذ[ات] سے آگاہ کر کے ان کی نگاہوں میں سرخروئی حاصل کر سکے۔ "اس [وقت] میری حیثیت تنظیم کے نمائندے کی ہے، اگر تم نے میری وضاحت [کے] باوجود کسی حماقت کا ارتکاب کیا تو جواب دہی کے خود ہی ذمے[دار] ہو گے۔ سی ون میری یہاں آمد سے پوری طرح باخبر ہے اور ا[گر] رپورٹ ملنے میں تاخیر ہوئی تو وہ خود یہاں چڑھ دوڑے گا۔"

"تمھیں میری جوابدہی کے لیے فکرمند ہونے کی ضرور[ت] نہیں۔" وہ تلخ لہجے میں بولا۔ "تم بھول رہے ہو کہ میں برسوں تم[ہارا] سربراہ رہا ہوں۔ مجھے خوشی ہو گی اگر سی ون تمھاری تلاش میں یہ[اں] دوڑا آئے اور تمھیں میری قید میں دیکھے۔ اب پیچھے ہٹو اور دیوا[ر سے] منہ لگا کر کھڑے ہو جاؤ۔ چلو، جلدی کرو۔"

میں نے بظاہر بے پروایانہ انداز میں دائیں بائیں نگاہیں د[وڑائیں] اور پھر الٹے قدموں یوں پیچھے ہٹنے لگا کہ مسہری کے قریب رکھی ہ[وئی] اونچی ٹیبل سے میرا فاصلہ بتدریج کم ہونے لگا۔ وہ میری اس چالا[کی کو] نہ بھانپ سکا اور پھر ڈمبل اسکاچ کی زیرِ استعمال بوتل فضا میں [اڑتی] دیکھ کر اسے ہوش آیا تو تاخیر ہو چکی تھی، جھکائی دینے کے باوجود [وہ] پوری شدت سے اس کے داہنے شانے سے ٹکرائی اور اس کا پست[ول] والا ہاتھ نیچے جھول گیا۔

دردناک آواز میں اس کے حلق سے میرے لیے مغلظات کا طوفان اُبل پڑا اور میں نے تھوڑی سی محنت کے بعد پستول دو[بارہ] حاصل کر لیا۔ اس بار سکندر علی کی اضطراری آوازیں اتنی بلند تھیں ک[ہ] مداخلت کا خوف ستانے لگا۔

"جلدی بتاؤ کہ وہ فون نمبر کس کس کے ہیں؟" میں نے پستو[ل] کی نال اس کی کنپٹی میں اڑا کر سفاکانہ سرگوشی میں سوال کیا۔ وہ قہ[ر آلود] بے بسی کے ساتھ مجھے گھورنے لگا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا [ورنہ] وہ مجھے کچا ہی چبا جاتا۔

میں نے اندازہ لگایا کہ میرے سوال کا جواب اس کی بسا[ط] سے باہر تھا۔ ہیروئن فروشی کی اس بساط پر نیچے سے اوپر تک ہر ایک بے بساط مہرہ تھا جسے کچھ علم نہیں تھا کہ وہ کس کے لیے

اور کب پٹوا دیا جائے گا اور اگر سکندر علی ان نمبروں کے بارے میں کوئی اہم بات جانتا بھی تھا تو اس وقت اس سے کچھ اگلوانا محال نظر آ رہا تھا۔

میں نے اس کی کنپٹی سے پستول کی نال ہٹائی اور اگلے ہی لمحے پستول کے وزنی دستے کی ضرب نے اسے کسی شہتیر کی طرح نیچے ڈھیر کر دیا۔ میں نے پستول جیب میں رکھا اور میرے دونوں ہاتھ بے رحمی کے ساتھ اس کے نرخرے پر جم گئے۔

اس وقت تک میرا مقدر یاوری کر رہا تھا کہ باہر سے کسی نے مداخلت نہیں کی تھی لیکن پستول چلنے کی صورت میں معاملہ یک بیک بگڑ جاتا پھر میرے ہاتھوں پر باریک دستانے چڑھے ہوئے تھے لہٰذا میں اس وقت تک سکندر علی کے سینے پر چڑھ کر پوری قوت سے اس کا گلا دبائے رہا جب تک اس کا بدن میرے بوجھ تلے پھڑک پھڑک کر ساکت نہ ہو گیا۔

میں نے سندھی طرز کی مسہری کے سرھانے لگے ہوئے آئینے میں اپنا عکس دیکھا تو مونچھیں غائب تھیں جو وہیں قالین پر پڑی ہوئی مل گئیں۔ میں نے عجلت سے مونچھیں دوبارہ جمائیں اور کمرے کا آخری بار ناقدانہ جائزہ لے کر باہر نکل آیا۔ مجھے امید تھی کہ باہر کی ناکافی روشنی میں میرے لباس پر خون کے دھبے نہیں دیکھے جا سکیں گے۔

کاٹج سے باہر آیا تو سکندر علی کا نوجوان ملازم اندر کے ہنگامے سے بے خبر میری گاڑی کے قریب ایک پتھر پر بیٹھا کیسٹ پر نذیرے اونچی آواز میں گانے سننے میں مگن تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے کیسٹ پلیئر کی آواز کم کر دی اور خود بوکھلائے ہوئے انداز میں کھڑا ہو گیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ رہا ہو گا کہ یوں بے دریغ راجہ فارم میں گھس آنے والا اس کے مالک کا قاتل بھی ہو سکتا ہے۔

واپسی کے سفر میں صادق سے خریدی ہوئی جعلی نمبر پلیٹیں میں نے ایک محفوظ مقام پر گنجان جھاڑیوں میں پھینک دیں اور کرائے کی کار کی اصل نمبر پلیٹیں سیٹ کے نیچے سے نکال کر ان کی جگہوں پر لگا دیں۔ مونچھوں اور ٹوپی کو جیب میں منتقل کر لیا تھا تاکہ گھر پہنچ کر انھیں اطمینان سے نذرِ آتش کر سکوں۔

تنظیم کے خلاف میری باقاعدہ سازش کا آغاز بہت کامیاب رہا تھا۔ گاڑی کے نمبر کے حوالے سے زندگی بھر میرا سراغ نہیں لگایا جا سکتا تھا اور پولیس بڑی مونچھوں کی وجہ سے بھٹکتی رہ جاتی۔

سکندر علی کے ناپاک خون کے چھینٹوں نے مجھے تھوڑی سی پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا لیکن غنیمت یہ ہوا کہ سارے راستے میں کہیں بھی مجھے رکنا نہیں پڑا۔ اب صرف اسی قدر کام باقی رہ گیا تھا کہ فی الحال کرائے کی کار ہوٹل کے پارکنگ لاٹ میں مقفل کر کے اپنی کار میں گھر لوٹ جاؤں اور اگلی صبح میٹر چین مائیلو میٹر سے

منسلک کر کے کرائے کی کار واپس کر دوں۔ اس طرح میٹر سے یہی ظاہر ہوتا کہ میری تحویل میں وہ کار بہت کم چلی ہے اور کسی کو گمان تک نہ ہوتا کہ اس کار میں ایک طویل سفر طے کر کے کسی کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔

ہوٹل کے پارکنگ لاٹ میں داخلے کے دو راستے تھے۔ جن میں سے ایک نسبتاً نیم تاریک تھا۔ شاید ہوٹل کے مالکان نے اپنے اقامتی حصے میں آنے والے معزز گاہکوں کی عمومی نفسیات کو مدِنظر رکھتے ہوئے وہ اہتمام کیا تھا کیونکہ ان کی بہتیری سرگرمیاں رازداری کی متقاضی ہوتی تھیں۔ کون کس کے ساتھ وہاں آیا اور کب نشاط کے چند لمحے گزار کر واپس لوٹا، اس کا شمار شاید گاہکوں اور سرپرستوں کے ذاتی رازوں میں ہوتا تھا جن کی رازداری انتظامیہ کے اخلاقی فرائض میں شامل تھی مگر اس وقت میرے لیے وہ نیم روشن راستہ ایک نعمت سے کم نہیں تھا۔

* * *

گھر کی طرف لوٹتے ہوئے مجھے راستے ہی میں تکان کا احساس ہونے لگا۔ جب تک میں خطرات میں گھرا ہوا تھا۔ ذہن پر بس ایک ہی دُھن سوار تھی کہ کسی طرح اپنا مشن پورا کر کے بحفاظت گھر واپس پہنچ جاؤں۔ مشن پورا ہو چکا تھا، طارق کے قتل کے ذمے دار کو میں نے آسانی کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار دیا تھا اور ایک ایسے آدمی کو راہ سے ہٹا دیا تھا جو برسوں کے رابطے کے نتیجے میں شاید مجھ سے بہت زیادہ واقف ہو چکا تھا۔ جب میں اس کی طرف روانہ ہوا تو مجھے خیال تھا کہ اس کے منصب میں اضافہ ہو چکا ہے لیکن اس سے سامنا ہونے کے بعد جب اس کی زبانی مجھے یہ معلوم ہوا کہ میری نقب زنی کے باعث وہ معزول کیا جا چکا تھا تو مجھے دلی مسرت ہوئی کہ اسے زک پہنچانے کی کوششوں میں مجھے خاطر خواہ کامیابی ہوئی تھی۔

میں جلد از جلد گھر پہنچ کر تازہ پانی سے غسل کر کے تکان سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا تاکہ سکون سے اپنی اس وقت تک کی کارروائیوں کا جائزہ لے کر آئندہ کے لیے اپنا لائحہ عمل تیار کر سکوں پھر میں اپنے لباس پر لگے ہوئے خون کے چند چھوٹے چھوٹے دھبے ملازمین کی نگاہوں میں نہیں لانا چاہتا تھا۔ لہٰذا گھر میں کار سے اترتے ہی بریف کیس لے کر سیدھا اندر گھس گیا۔

غسل خانے میں سب سے پہلے میں نے نقلی مونچھوں اور سوتی ٹوپی کو آگ لگا کر ان کی راکھ نالی میں بہائی پھر کپڑوں سے خون کے داغ دھو ڈالے۔ زندگی میں سکندر علی برسوں ایک روگ کی طرح میری جان سے چمٹا رہا لیکن مرنے کے بعد اس کا خون تک اس قدر پھیکا ثابت ہوا کہ صابن کا پہلا ہاتھ لگتے ہی صاف

ہوگیا اور میں ان شہادتوں سے چھٹکارے کے بعد غسل میں مصروف ہوگیا۔

لباس تبدیل کرکے میں باہر آیا تو خواب گاہ کے دروازے پر بوڑھی خادمہ میری منتظر تھی۔ اس نے کھانے کے بارے میں دریافت کرنے کے بعد بتایا کہ میری غیر حاضری میں تین مرتبہ جہانگیر کا فون آیا تھا۔ میرے لیے یہ سمجھنا دشوار نہیں تھا کہ جہانگیر پابندی ہٹنے کے بارے میں مجھے اطلاع دینے کے لیے بے چین تھا۔ لہٰذا خادمہ کو کھانا لگانے کی ہدایت دے کر رخصت کرنے کے بعد میں فون پر اس کا نمبر ملانے لگا۔

"تم کہاں غائب تھے سارا دن؟" میری آواز سنتے ہی اس نے پُرخلوص لہجے میں سوال کیا۔ "نہ دفتر میں تمہارا پتا تھا، نہ گھر میں کسی کو کچھ معلوم تھا، مجھے تو تشویش ہوگئی تھی تمہارے بارے میں۔"

میں ہنس پڑا۔ "میں خاصا سخت جان ہوں، یوں چپ چپاتے نہیں جاؤں گا۔"

"کچھ دنوں سے خوف آنے لگا ہے۔" ریسیور پر اس کی آواز دھیمی ہوگئی۔ "ویسے ایک خوش خبری تھی تمہارے لیے، تم پر سے پابندیاں ہٹالی گئی ہیں لیکن تم ذرا ہوشیار ہی رہنا کہیں کسی خطرناک چکر میں نہ پھنس جاؤ۔"

"کیسا چکر؟" میں نے انجان بن کر سوال کیا۔ "اپنی تو زندگی ہی چکر میں گزر رہی ہے۔"

"ملاقات ہوگی تو بتاؤں گا۔ فی الحال تم اسٹینڈ بائی رہو گے۔" اس نے اسی رازدارانہ لہجے میں کہا۔

"معلوم ہوتا ہے بھابی گھر پر نہیں ہیں جو اس قدر کھل کر بول رہے ہو۔" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"کل ایک پارٹی میں جانا ہے۔ وارڈ روب کھولے کپڑوں کا ڈھیر لگائے بیٹھی ہے۔ تم ذرا محتاط ہی رہنا، میرے بارے میں تمہارے منہ سے کوئی الٹی سیدھی بات نکل گئی تو مجھے سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔ اُس وقت کیا کہہ رہی تھی تم سے؟"

"تمہارے گمنام دشمنوں کی ہی بات ہو رہی تھی..."

"خیر خیر۔" وہ میری بات کاٹ کر جلدی سے بولا۔ "وہ تم سے ضرور بات کرے گی، اس کا خیال ہے کہ گہری دوستی کے ناتے سے تم مجھے راہِ راست پر لانے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔ میں اسے کیسے بتاؤں کہ میری الجھنیں کیا ہیں۔ ہوسکے تو کل دن میں کچھ وقت نکال کر مجھ سے مل لو۔"

"دوپہر کا کھانا تمہارے ہی ساتھ کھاؤں گا۔"

میری تجویز اسے پسند آئی۔ اگلی شام میرا غزالہ سے ملنے کا پروگرام تھا اور اسے کسی پارٹی میں شرکت کرنا تھی۔ لہٰذا اس پروگرام کے ساتھ ہماری گفتگو ختم ہوگئی اور میں کھانے کے کمرے کی طرف چل دیا۔

روزمرہ کے معمولات سے فارغ ہو کر میں بستر پر دراز ہو[...] میرے ذہن پر سکندر علی کا خون سوار تھا۔ اس سے بیشتر مجرمانہ [...] رقابتوں میں بار ہا خونریزی سے دوچار ہو چکا تھا۔ ان میں [...] بہتیرے اپنے جسموں پر میرے زخموں کی نشانیاں سجائے زندہ [...] لیکن اپنی تمام تر بے خوفی اور قانون شکنی کے باوجود میرے ہاتھ [...] کبھی کسی قتل کا ارتکاب نہیں ہوا تھا۔

لیکن عجیب بات یہ تھی کہ اس سوچے سمجھے قتل کا میرے دل پر ذرا بھی بوجھ نہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ میں ذہنی طور پر ہمیشہ قتل و غارت گری پر آمادہ رہا ہوں یا [...] سکندر علی کے معاملے میں کچھ دوسرے اسباب بھی کارفرما تھے۔

جن دنوں ہم چاروں اپنی چھوٹی موٹی مجرمانہ سرگرمیوں [...] باوجود تنگ دستی کے دور سے گزر رہے تھے، اس وقت سکندر [...] نے بذاتِ خود سامنے آئے بغیر ہمیں ایک مستقل کام کی پیش کش [...] تھی اور پھر نہایت پُراسرار طور پر ہمارے گرد اس کا جال [...] مضبوط ہوتا چلا گیا کہ ہم اس کی ذات سے واقف ہوئے بغیر [...] کی آواز کے قیدی بنتے چلے گئے۔

اس دوران میں ہمیشہ ہی اس کا براہِ راست مجھ سے رابطہ رہا لیکن میں کوشش کے باوجود یہ بات نظرانداز نہ کر سکا کہ اس کا رویّہ اہانت آمیز ہوا کرتا تھا۔ جیسے اس کی نگاہوں میں میری ذات کی کوئی وقعت نہ ہو اور شاید انا کے اس زخم ہی نے ابتدا میں مجھے باغیانہ خطوط پر سوچنے پر اکسایا اور میں اسے ختم کرکے اس کے غیر قانونی دھندے پر قابض ہونے کے سنہرے خواب دیکھنے لگا۔ میرا یہ خواب جس قدر دلکش تھا، اسی قدر دشوار بھی تھا لیکن میں [...] نے اسے دوہرے انتظام پر آمادہ کر لیا۔

وہ مجھے احکام جاری کرتا اور میں بدلی ہوئی آواز میں دہرا [...] جہانگیر تک پہنچا دیتا۔ جہانگیر بے چارہ ہمیشہ اس غلط فہمی میں مبتلا رہا کہ ہم چاروں میں اسے بڑا مقرر کر دیا گیا ہے اور میں نے بھی بارہا اشتعال انگیز لمحات آجانے کے باوجود کبھی اسے یہ جتانے کی کوشش نہیں کی کہ اس کا سارا بھرم میری وجہ سے قائم ہے۔ ورنہ درحقیقت وہ مجھ [...] جوابدہ ہے۔

سکندر علی کے کام کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ مسلسل ایک ہی لائن پر چل رہا تھا۔ نہ جانے وہ کب سے شہر میں منشیات فراہم کر رہا تھا لیکن جب سے ہم چاروں اس کے چنگل میں پھنسے مسلسل سات برس تک شہر میں چرس ہی بانٹتے رہے۔ اسی دوران میں لطف الرحمٰن نامی ایک دلال نے ہمارا مال بیچ کر پونے دو لاکھ کی رقم اڑانے کی کوشش کی۔ حالانکہ جہانگیر نے وہ رقم اپنی گرہ سے ادا [...]

[...] کر دی لیکن سکندر علی نے اس معاملے کو نظرانداز نہیں کیا اور لطف الرحمٰن بے دردی کے ساتھ مار ڈالا گیا۔ اس واقعے نے جہاں بازار میں لوگوں پر دھاک بٹھا دی، وہاں ہم چاروں پر بھی اپنے نادیدہ باس کی دہشت میں اضافہ ہوگیا۔

پھر ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت بازار میں چرس کا بحران پیدا کرکے ہیروئن متعارف کرائی گئی۔ فون کے روایتی رابطے کے بجائے ٹرانسمیٹر زیرِ استعمال آگئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے منصوبہ بندی کے تحت کام کو اچانک ہی بڑھانے کا فیصلہ کر لیا گیا ہو۔ مجھے ڈی ون کا منصب مل گیا۔ جہانگیر ڈی ٹو ہوگیا لیکن یہ ترقیاں بی فور کو راس نہ آسکیں۔

غزالہ کے کالج کے فنکشن میں مَیں نے سکندر علی کی مائیکروفون پر گونجتی ہوئی خوابناک آواز پہچان لی اور ایک ذرا سے اتفاق نے اس کا برسوں کا طلسم پل بھر میں تباہ کرکے رکھ دیا۔

اس پر ہاتھ ڈالنے کے لیے شاید میں کچھ دن انتظار کرتا کیونکہ اس کے مکان سے ملنے والے اشاروں سے یہ ظاہر ہوگیا تھا کہ ہمیں مطلق العنان نظر آنے کے باوجود سکندر علی آزاد نہیں تھا بلکہ اپنی کارکردگی کے لیے کسی اور کو جواب دہ تھا لیکن اسی اثنا میں طارق کے بہیمانہ قتل نے مجھے مشتعل کر دیا۔ پہلے مجھے موہوم سا خیال تھا لیکن سی ون نے اس کی تصدیق کر دی کہ طارق، سکندر علی کے ایما پر ہی مارا گیا تھا۔

میں نے اسے کیفرِ کردار کو پہنچا دیا تھا لیکن بہت سی گتھیاں ابھی تک الجھی ہوئی تھیں۔

بی فور سے اوپر جو لوگ بھی گروہ کے سربراہ تھے، بہت زیادہ محتاط معلوم ہوتے تھے۔ سکندر علی کے بے نقاب ہونے کا خطرہ محسوس کرتے ہی اسے معزول کرکے گوشہ نشینی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا اور اس کے اختیارات عارضی طور پر مجھے اور سی ون کو مشترکہ طور پر سونپ دیے تھے لیکن مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ میں کس کے لیے کام کروں گا۔

سی ون میرے سامنے تھا لیکن اس سے بھی زیادہ معلومات حاصل ہونے کی امید نہیں تھی کیونکہ وہ بہرحال سکندر علی کا ماتحت تھا اور اس نے اپنے کاٹیج میں میرے روبرو جو کچھ بتایا، وہ بڑی حد تک ناکافی تھا۔ نمبر ٹریڈ اکاؤنٹ کے حوالے پر رقمیں وصول کرنے والے بینکار پر ہاتھ ڈالا جاتا تو شاید وہ بھی کچھ نہ بتا سکتا۔ اپنی نزلا کے حوالے سے ملنے والی پیشہ ور عورت پروین سی ون کی معمولی آلۂ کار تھی۔ اے ٹو، بی ون، اور بی ٹو کے فون نمبروں سے واقف ہونے کے باوجود میں سکندر علی سے کچھ بھی نہیں اگلوا سکا تھا۔ مجھے یہ تک علم نہیں تھا کہ ان نمبروں پر کس سے اور کس کوڈ کے تحت گفتگو کی جا سکتی تھی۔ اگر یوں ہی نمبر ملا بیٹھتا تو معلومات میں اضافے کے بجائے انھیں ہوشیار کرکے اس سراغ سے بھی ہمیشہ کے لیے ہاتھ دھو بیٹھتا۔

لے دے کر بس ایک ہی نیا نام میرے سامنے آیا تھا۔

سکندر علی کی سیکریٹری کو میں نے غیر معمولی اہمیت نہیں دی تھی۔ ٹرانسمیٹر پر اس کی آواز سن کر یہی سمجھتا رہا تھا کہ وہ بی فور کی سیکریٹری یا زیادہ سے زیادہ ایک حسین دوست ہوگی۔ کیونکہ اس وقت تک یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ سکندر علی اقتدار کا سرچشمہ ہونے کے بجائے بساط کا ایک مہرہ ہوگا۔ اس نے مرنے سے پہلے اعتراف کیا تھا کہ وہ لڑکی تنظیم ہی سے تعلق رکھتی تھی اور اسے مددگار بنا کر سکندر علی کی نگرانی پر مامور کیا گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ رخشی نامی وہ کال گرل کسی ایسے اہم آدمی سے واقف تھی جو اپنی سلامتی کے لیے سکندر علی جیسے ماتحت کی سرگرمیوں سے باخبر رہنا ضروری سمجھتا تھا اور شاید دوسروں کی بھی نشاندہی کر سکتا تھا۔

سکندر علی کا کانٹا دور ہو چکا تھا۔ اخبارات میں شائع ہونے والی خبروں سے اندازہ ہو سکتا تھا کہ پولیس اس واردات پر کس نہج پر سوچتی ہے۔ اس دوران میں مَیں رخشی کا سراغ لگانے کی کوشش کر سکتا تھا اور اس کام کے لیے میرے پاس سلطان شاہ جیسا پُرجوش آدمی موجود تھا جو عیسٰی خان کی ملازمت سے ٹھکرائے جانے کے بعد میرے لیے ہر کام کو تیار تھا۔ اس کے بشرے سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ بے خوف ہونے کے ساتھ ہی آخری سانس تک وفاداری کا دم بھرتے رہنے والوں میں سے تھا۔

تنظیم کے اس پُرپیچ طریقۂ کار نے مجھے الجھا کر رکھ دیا تھا۔ سکندر علی کے خلاف منصوبے سوچتے ہوئے میرے ذہن میں یہ مفروضہ موجود رہا تھا کہ وہ تنظیم کا اصل سربراہ ہے لیکن حقائق اس کی سراسر نفی کر رہے تھے۔ میں خود مدت سے جرائم کی دنیا سے وابستہ تھا اور میں نے شہر میں کئی طاقتور گروہوں کی بالادستی کا دور دیکھا تھا۔ ان میں کوئی بھی اس قدر پیچیدہ، موثر اور محفوظ تنظیم بنانے کا اہل نہیں تھا۔ مجھے بے اختیار کھلے اجلاس میں امریکی نمائندے آرتھر کے کہے ہوئے الفاظ یاد آگئے

روسی مداخلت کاروں کی آخری منزل افغانستان نہیں بلکہ بحیرۂ عرب کی سال بھر کھلی رہنے والی گرم پانی کی بندرگاہیں تھیں۔ جہاں سے وہ صنعتی دنیا کی شہ رگ پر اپنا تسلط جما سکیں، اس مقصد کے لیے وہ افغانستان کی سرزمین پر اپنا قبضہ مستحکم کرکے پیش قدمی کرنا چاہتے تھے تاکہ دوسروں کی شہ رگ پر قبضے کے چکر میں ان کی اپنی بڑھتی ہوئی سپاہ کی سپلائی لائن کی شہ رگ نہ کاٹی جا سکے۔ انھوں نے افغان حریت پسندوں کو عالمی رائے عامہ کی حمایت سے

محروم کرنے کے لیے انھیں منشیات فروشی میں الجھانا شروع کر دیا تھا۔ ایک بار وہ ہیروئن بیچ کر ہتھیار خریدنے کی راہ پر چل پڑتے تو ان میں سے ہزاروں خود اس نشے کی لت میں پڑ سکتے تھے۔ ہلکی پھلکی، رنگین فضاؤں میں دھند کی طرح تیرتے اور بکھرتے ہوئے ذہن آزادی اور غلامی کے فلسفے کو بھلا کر امن کی باتیں سوچنے لگتے تاکہ بارود کا دھواں ان کا نشہ نہ خراب کرے، بموں کے دھماکے ان کے مخمور ذہنوں کو بار بار نہ چونکا سکیں۔

مزاحمت پر اس دوطرفہ ضرب کے ساتھ تیسرا وار پاکستانی معاشرے پر ہوتا۔ ہیروئن جس راستے سے گزرتی وہاں ہزاروں کو گھائل کرتی جاتی۔ زردار ایک کے دس بنانے کے چکر میں اس کی تجارت کرنے لگتے اور مفلس چھوٹی چھوٹی پڑیوں میں اپنے خوابوں کی جنّت کے خریدار بن جاتے اور چند برسوں میں یہ زوال پذیر معاشرہ کسی یلغار کو سہنے کے قابل نہ رہتا۔ اسی کے ساتھ پاکستان کی رسوائی کا آغاز ہو جاتا کیونکہ اس سرزمین پر بننے اور یہاں سے گزرنے والی ہیروئن آخر کار مغرب کے ان معاشروں میں پہنچی جاتی جہاں مشینی ماحول اور جنسی آزادیوں سے اکتائے ہوئے ذہن تفریح اور اپنے ماحول سے فرار کے لیے نت نئے نشوں کے متلاشی رہتے ہیں اور وہاں کے ذمے دار لوگ اس لعنت کی افزائش پر بوکھلا جاتے۔

مجھے گمان ہونے لگا کہ کہیں اس تنظیم کے پس پشت وہی ذہن کار فرما نہ ہوں جن کی نشان دہی آرتھر کر چکا تھا اور یہ گمان بالکل ہی بے بنیاد نہیں تھا۔ تنظیم کی طرف سے مجھے ایشین سنڈیکیٹ لمیٹڈ کا اسسٹنٹ سیلز منیجر بنا کر ٹوکیو بھیجا گیا تھا۔ جہاز پر مغرب سے آنے والی ویرا لائیڈ نے ہالینڈ کی فرم ایشلے ہاؤز کے نمائندے کے طور پر مجھ سے ہیروئن کا نمونہ وصول کیا تھا اور پھر اس کانفرنس میں انکشاف ہوا کہ جرمن کیمسٹ، ڈاکٹر ڈالٹن کو مومن خان کی مدد کے لیے آمادہ کرنے والی ویرا لائیڈ نامی ایک انگریز لڑکی تھی۔ جو ڈاکٹر ڈالٹن کی گرفتاری کے بعد لاپتا ہو گئی۔ یہ سب کڑیاں ایک خاص سمت کی نشان دہی کر رہی تھیں۔

میں جس قدر سوچتا رہا اسی قدر پریشان ہوتا چلا گیا۔

میں حالات کے بے رحم دھارے میں خود ایک قانون شکن تھا۔ بچپن میں بلیڈ سے اپنے ایک ہم جماعت کا پیٹ کاٹا، دوسرے کو چاقو سے لہولہان کیا اور پھر ضمانت ہوتے ہی گھر سے رقم چرا کر کراچی بھاگ آیا۔ چوری، رہزنی اور غنڈہ ٹیکس کی وصولیابی پر میری روزی کا دارومدار رہا۔ مجھے یاد نہیں تھا کہ میں نے کبھی محنت مزدوری سے ایک پیسہ بھی کمانے میں کامیابی حاصل کی ہو۔ پھر سکندر علی نے چرس فروشی اور اس کے بعد ہیروئن فروشی کی راہ دکھائی اور میں ایک پلاسٹک فیکٹری کا مالک ہونے کے باوجود روزی کمانے کے اس جائز ذریعے پر کبھی بھرپور توجہ نہ دے سکا کیونکہ سکندر علی کے چنگل سے فرار کی کوئی بھی کوشش خودکشی کے مترادف ہوتی۔

لیکن مجھے یہ گوارا نہیں تھا کہ قانون شکن ہونے کے باوجود میں کسی ملک دشمن سازش کا آلۂ کار بنوں۔ جرائم پیشہ ہونے کے باوجود حب الوطنی کے بارے میں میرا اپنا ایک معیار تھا۔ شاید سوچا جائے کہ میں خود غرض تھا اور میری سوچ یہ تھی کہ ہم اس ملک کے باشندے ہیں تو اسے بنانے کے ساتھ ہی بگاڑنا بھی ہمارا حق ہے۔ ہمارے ہوتے ہوئے دوسروں کو اس کی بیخ کنی پر توجہ دینے کی کیا ضرورت ہے لیکن یہ میرے ساتھ زیادتی ہو گی میں ہی نہیں، نہ جانے کتنے لوگ حالات کے تحت مجبور ہو کر جرائم کی راہ اختیار کرتے ہیں لیکن یہ نہیں ہوتا کہ قانون شکنی کرتے کرتے وہ وطن دشمن ہو جائیں۔ میں نے خود دیکھا اور پرانے پاپیوں سے سنا کہ ہندوستان سے ہونے والی جنگوں میں ہر شخص جرائم سے کنارہ کش ہو کر ملک کی سلامتی اور فتح کے لیے دست بہ دعا تھا۔ چوروں اور لٹیروں نے شہریوں کے ساتھ مل کر خندقیں کھودیں اور ریت کی دیواریں اٹھائی تھیں۔

رات کی اس تنہائی میں میرے نزدیک ایک بار پھر وہی موڑ آگیا تھا۔ آرتھر اور شولز نے جو کچھ بتایا، اگر وہ درست تھا تو معاملہ بہت سنگین ہو گیا تھا۔ ان کے پاس مشاہدے اور تجربے تھے لیکن میرے پاس ایسی کڑیاں تھیں جو ان کے تجزیے کی تصدیق کرتی تھیں۔ بے اختیار میرا دل چاہا کہ اسی وقت بستر چھوڑ دوں اور کسی ذمّے دار افسر کے سامنے سب کچھ اُگلتا چلا جاؤں۔ جب قانون کا نفاذ کرنے والے ادارے پوری قوت کے ساتھ حرکت میں آئیں گے تو تنظیم کے معمولی کارندوں سے اس کے بڑوں تک کسی کو کہیں امان نہ مل سکے گی۔

میرے اعصاب پر اس خیال کے زیر اثر کافی دیر تک نشہ سا چھایا رہا۔ میں دل ہی دل میں امکانی کارروائیوں اور ان کے نتائج کے بارے میں سوچتا رہا مگر پھر اچانک مجھے ان دو سماجی کارکنوں کا عبرتناک حشر یاد آگیا جو گل باز خان کا نام لیے بغیر ہمیشہ اس کے اڈے کے خلاف مہم چلاتے رہے تھے اور پھر اپنے علاقے کے تھانے کے انچارج کی شہ پر خم ٹھونک کر چھاپے کی کارروائی میں شریک ہونے کی حماقت کر بیٹھے تھے۔

انچارج بھتّے میں کمی کے معاملے میں گل باز خان کو رگیدنا چاہتا تھا۔ لہٰذا اچانک ہی اس کے ذہن میں قانون کی بالادستی کا تصوّر بیدار ہو گیا پھر جب ڈیڑھ لاکھ کی بات ختم کر کے علاقے میں اس کی بالادستی تسلیم کر لی گئی تو دفعات میں ردوبدل ہوئی ...ں گل باز خان ضمانت پر رہا ہو گیا اور اس کے رہا ہوتے ہی ...ں کے حواریوں نے ایک سماجی کارکن کو اس بری طرح مارا کہ ...ں کی ایک ٹانگ توڑ ڈالی، دوسرے کی موٹر سائیکل کو ایک ...علوم تیز رفتار کار نے اس بری طرح ٹکر ماری کہ وہ خود لہولہان ...ڈ کر اسپتال جا پہنچا اور علاقہ پولیس نے نقصِ امن کے خطرے کے ...ت ان دونوں کو اسپتال ہی میں حراست میں لے لیا کیونکہ پولیس ...و خدشہ تھا کہ وہ ان اتفاقی حادثات کو اپنے پرانے دشمن گل باز خان ...ے خلاف مہم کا بہانہ بنا کر امن عامّہ میں خلل ڈالنے کی کوشش کریں گے۔

میرا سارا جوش ٹھنڈا ہو گیا۔ میں جس کسی کو اپنی کتھا سناتا وہ ...ی دن کی طرح ہیروئن فروشی میں کسی بڑی سازش کے امکان کو ...ظر انداز کر کے مجھے سکندر علی جیسے معزز اور ہر دل عزیز شہری کے ...تل کے الزام میں اندر کرا دیتا اور پھر تفتیش کے روایتی انداز میں ...یری وہ درگت بنائی جاتی کہ حب الوطنی کا سارا خمار ہرن ہو جاتا۔

قانون سے مدد لینے کی راہ مسدود تھی مگر میرے ہاتھ کھلے ...ہوئے تھے۔ میں نے کسی کی مدد کے بغیر سکندر علی کو ٹھکانے لگا دیا ...تھا۔ اب تک میری مہم ذاتی اقتدار کے لیے تھی جس میں طارق کے ...قتل کے انتقام کا جذبہ بھی شامل ہو گیا تھا مگر اب میں نے عہد کر ...لیا کہ تنظیم میں رہتے ہوئے اپنی ذات کو ہر شبہے سے بالا رکھ کر اس ...کی جڑیں کاٹتا رہوں گا اور اپنی زد میں آتے ہوئے کسی شخص کو معاف نہیں کروں گا۔

سکندر علی کو معزول کر کے تنظیم کے بڑے اپنے گھروں میں ...مطمئن تھے۔ اس نے طارق کے لہو سے اپنے حفاظتی حصار کی بنیادیں ...مضبوط کرنے کی کوشش کی تھی لیکن میرے ہاتھوں کسمپرسی کے عالم میں ...مارا جا چکا تھا۔ یہ خبر جلد یا بدیر ان بڑوں کو مل ہی جاتی لیکن مجھے ...خیال آیا کہ آوازوں سے کام چلانے والے ان سفاک بھیڑیوں کو ...ہوں نہ ایک آواز ہی کے سہارے ہیں مبتلا کر کے خوف زدہ کیا جائے ...خوف زدہ ہونے کے بعد ان سے ایسی حماقتوں کا ارتکاب یقینی ...تھا جو میرے لیے مددگار ثابت ہوتیں۔

...اس وقت تک میرے پاس جو کچھ معلومات تھیں، ان کے ...مطابق سب سے بڑی شخصیت اے لوٹی ہو سکتی تھی۔ مجھے یقین تھا ...کہ کسی گمنام شخص کی طرف سے بی فور کے قتل کی خبر سن کر اس کی ...نیند ضرور اڑ جائے گی۔

مجھے سکندر علی کے مکان سے ملے ہوئے چاروں نمبر زبانی یاد ...تھے لیکن پھر بھی میں نے احتیاطاً وہ کاغذ دیکھ ہی لیا جس پر نمبر لکھے ...ہوئے تھے اور پھر فون پر لاہور کا وہ نمبر ملانے لگا۔

لاہور کی ایشین سنڈیکیٹ لمیٹڈ کے حوالے سے نجانے کیوں

مجھے پورا یقین تھا کہ پانچ ہندسوں پر مشتمل وہ نمبر لاہور ہی کا ہوگا۔

اس سے پیشتر میں ان نمبروں پر اس لیے کسی سے بات کرنے سے گریز کرتا رہا کہ میرے پاس کوئی موضوع نہیں تھا اور نہ میں یہ جانتا تھا کہ ان نمبروں پر کسی مخصوص آدمی سے بات کرنے کے لیے کون سا کوڈ مقرر تھا لیکن سکندر علی کے قتل کے بعد میں بآسانی ایک دشمن کے طور پر بات کر سکتا تھا۔ اس میں زیادہ سے زیادہ ایک ہی خطرہ تھا کہ آئندہ کے لیے اس فون نمبر کا استعمال ترک کیا جا سکتا تھا لیکن کوئی خطرہ مول لیے بغیر پیش قدمی بھی ممکن نہیں تھی۔

دوسری گھنٹی پر نیند کے خمار سے بوجھل ایک نسوانی آواز نے فون ریسیو کیا۔ بے اختیار میری نگاہ ٹائم پیس پر گئی تو وہاں گیارہ بجنے والے تھے جس کا مطلب تھا کہ لاہور میں واقعی سونے کا وقت ہو گیا تھا۔

"صاحب موجود ہیں؟" میں نے شائستہ لہجے میں سوال کرتے ہوئے دانستہ وہ نام استعمال کیا کیونکہ پنجاب میں یہ لفظ ناموں کے ساتھ بکثرت استعمال ہوتا تھا اور پھر میرے مقصد کے لیے وہ نام ذومعنی بھی تھا لیکن فون پر خلافِ توقع عورت کی آواز سن کر میں الجھن میں پڑ گیا تھا۔ اگر محض آواز کی بنیاد پر کوئی رائے قائم کرنا ہوتی تو میں بولنے والی کو سو فیصدی خانہ دار خاتون قرار دیتا۔

"یہاں اس نام کا کوئی بندہ نہیں رہتا۔" پنجابی لب ولہجے میں اردو بولتے ہوئے جواب دیا گیا۔ "آپ نے کس نمبر پر فون کیا ہے؟" نیند خراب کیے جانے کے باوجود اس کے لہجے میں ناگواری پیدا نہیں ہوئی تھی۔

میں نے نمبر دہرا دیا۔ "سکندر صاحب نے کل ہی مجھے یہ نمبر دیا تھا، ان سے ایک خاص بات کرنا تھی۔"

"نمبر تو یہی ہے۔" نسوانی آواز میں تشویش پیدا ہو گئی۔ "شاید کوئی غلط فہمی ہوئی ہے، اس نمبر پر سکندر نام کا کوئی بندہ نہیں ہے۔"

"شاید آپ کے شوہر۔۔"

میں نے بات بڑھانا چاہی لیکن اس نے سخت لہجے میں میری بات کاٹ دی۔ "ایک بار میں نے کہہ دیا کہ یہاں کوئی نہیں ہے، اس گھر میں کوئی مرد نہیں رہتا۔ مہربانی کرو اور اب تنگ نہ کرنا۔۔۔ میں بوڑھی اور بلڈ پریشر کی مریضہ ہوں۔"

شاید وہ ریسیور ہاتھ میں تھامے میری طرف سے سلسلہ منقطع ہونے کا انتظار کر رہی تھی اور جب میں نے مایوسانہ انداز میں گہرا سانس لے کر ریسیور رکھا تو میرا ذہن اس ناکامی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

عورت نے جو کچھ کہا، شاید سچ ہی تھا۔ وہ بوڑھی بلڈ پریشر کی مریضہ اور ایک گھریلو عورت تھی۔ بقول اس کے وہاں کوئی مرد نہیں رہتا تھا۔ پھر وہ کون تھا جو اس نمبر پر اسے ٹو کے طور پر بات کرتا ہوگا؟

سکندر علی کی ڈائری میں خفیہ طور پر لکھا ہوا وہ نمبر یقینی طور پر اہم تھا لیکن میں اس کی اہمیت دریافت کرنے میں ناکام رہا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ کہیں وہ نمبر کسی اور شہر کا نہ ہو اور میں فوراً ہی پنڈی کا کوڈ ڈائل کر کے وہ نمبر ملانے لگا۔

رات کا وقت تھا، اس لیے کاروباری رابطوں کا رش نہ ہونے کی وجہ سے لائن بآسانی مل گئی لیکن دوسری طرف سے انگیج ٹون آتی رہی۔ یک بیک میرے خون کا دوران تیز ہو گیا۔ جو شخص رات کے گیارہ بجے بھی فون استعمال کر رہا ہو، اس کے بارے میں لازمی طور پر پہلی بار کوئی اچھا تاثر نہیں ابھرتا۔ میں نے وقت گزارنے کے لیے سگریٹ سلگالی۔

چند منٹ کے بعد دوبارہ کوشش کی تو پھر وہی انگیج ٹون سننا پڑی پھر میں تھوڑے تھوڑے وقفے سے بار بار وہی نمبر ملانے لگا لیکن دوسری طرف سے ہر بار وہی ایک ٹون گونجتی رہی۔

اس کے دو ہی اسباب ہو سکتے تھے کہ وہ نمبر خراب تھا یا پھر راولپنڈی میں سرے سے اس نمبر کا کوئی وجود نہیں تھا۔

میں نے اپنی کوششیں ترک کر دیں اور خیالات میں ڈوبا بستر پر دراز ہو گیا۔

* * *

اگلی صبح میرے لیے اس اعتبار سے انتہائی مایوس کن تھی کہ اخبارات میں میرے کارنامے کا سرے سے کوئی ذکر ہی موجود نہیں تھا۔

یہ امکان تو سراسر احمقانہ تھا کہ سکندر علی کی لاش دریافت نہ ہوئی ہو۔ وہ خود مارا گیا تھا لیکن باہر اس کے نہ جانے کتنے ملازم موجود رہے ہوں گے جن میں سے صرف ایک سے میرا سامنا ہوا تھا۔ پھر سکندر علی کے ساتھ بند کمرے میں ساقی گری کرنے والی عورت کو میں وہیں بے ہوش چھوڑ کر آیا تھا۔ اس نے ہوش میں آتے ہی یقیناً سب سے پہلے اپنے رنگین مزاج ساتھی کی لاش دیکھی ہوگی اور پھر اودھم مچا کر ہر ایک کو وہاں سمیٹ لیا ہوگا۔ بات صرف اتنی معلوم ہوتی تھی کہ قتل کی وہ واردات ٹھٹھہ کے ایک دور افتادہ علاقے میں شہری سہولتوں سے محروم زرعی جاگیر پر پیش آئی تھی لہٰذا وہاں سے خبر پہنچنے میں کافی سے زیادہ تاخیر ہوئی ہوگی اور یوں وہ خبر صبح کے اخبارات میں جگہ نہ پا سکی۔

میں روانگی کے لیے تیاری کر ہی رہا تھا کہ اچانک خلافِ معمول مجھے اپنے ٹرانسمیٹر پر کال کا اشارہ موصول ہونے لگا۔ اس سے پہلے کبھی صبح صبح یوں کوئی پیغام نہیں آیا تھا لہٰذا میرے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں اور میں نے اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے بولٹ کر کے ٹرانسمیٹر آن کر دیا۔

کال اس فریکوئنسی پر آ رہی تھی جو پہلے میرے اور بی فور کے رابطے کے لیے مخصوص تھی اور سکندر علی کے بعد سی ون نے بھی مجھ سے گفتگو کے لیے اسی کا انتخاب کیا تھا۔

"سی کنگ کالنگ ڈی ون۔ اوور!" آپریٹس آن ہونے کے بعد ریڈیائی شور میں چند لمحوں کے بعد آواز ابھری اور میں نے فوری طور پر سی ون کے لیے اس پیغام کا جواب نشر کر دیا۔

"کل تم کہاں تھے؟" سی ون کی قدرے تلخ آواز سن کر میری آنکھوں کے سامنے اچانک اندھیرا سا آ گیا۔ "شام کو میں نے تین بار تم سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی لیکن تمہاری طرف سے مجھے کوئی جواب نہیں ملا۔ اوور۔"

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی غیر مرئی قوت نے میرے جسم سے ساری توانائی نچوڑ لی ہو — سکندر علی کے قتل کی مہم پر روانہ ہوتے ہوئے میں نے اپنے منصوبے کے ہر پہلو پر بھرپور توجہ دی تھی اور مجھے یقین تھا کہ اپنی احتیاطی تدابیر کی وجہ سے میری ذات کسی بھی شبہے کی زد میں نہ آ سکے گی۔ کراچی سے سکندر فارمز تک کے سفر میں آپریٹس میرے ساتھ رہا تھا لیکن میں اس کے بارے میں ایک بہت بڑی بھول کا شکار رہا تھا۔ مجھے یہ یاد ہی نہیں رہا تھا کہ ایسے ہر مواصلاتی آلے کی کارکردگی کا ایک محدود دائرہ ہوتا ہے جس سے باہر نہ کوئی سگنل وصول کیا جا سکتا ہے اور نہ کوئی پیغام کسی دوسرے کے لیے نشر کیا جا سکتا ہے۔ وہ آپریٹس چونکہ شہری حدود میں باہمی رابطے کے لیے مخصوص تھا لہٰذا جیبی ساخت کی بنا پر اس کا دائرۂ کار بمشکل دس پندرہ میل پر مشتمل رہا ہوگا۔ جبکہ سکندر علی کے گناہوں کا حساب چکانے کے لیے میں اس سے کہیں دور نکل گیا تھا اور اس ذرا سی بے احتیاطی کی بنا پر سی ون کو یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ میں کہیں دور گیا ہوا تھا۔

"کل مجھ سے غلطی ہو گئی۔" میں نے سنسناتے ہوئے ذہن کے ساتھ اعتراف کیا۔ "آپریٹس میں گھر پر چھوڑ گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس کی ضرورت شام ہی کو پیش آئے گی لیکن واپسی میں مجھے نو بج گئے۔۔۔ اوور۔"

"کہاں رک گئے تھے؟" اس بار سی ون کا لہجہ جارحانہ تھا۔ "مجھے تفصیل چاہیے تمہاری مصروفیات کی۔ اوور۔"

میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ بات بالکل تل گئی تھی، شاید سی ون میری طرف سے شکوک کا شکار ہو گیا تھا۔ بے فکری اور تحفظ کے بھرپور احساس پر چھا جانے والا وہ خطرہ اس موڑ پر میرے لیے بہت مہیب تھا، میں نے لحظہ بھر میں سوچ لیا کہ اگر بات بگڑ ہی گئی تھی تو مدافعانہ رویہ میری تباہی پر منتج ہو سکتا تھا لہٰذا میں نے ندامت کے اظہار کے بجائے اچٹنے کا فیصلہ کر لیا۔

"کل ایک ڈیٹ تھی میری۔" میں نے قدرے تیز لہجے میں کہا۔ "اس کی کیا تفصیل جاننا چاہتے ہو تم؟ میں خود محتاط رہتا ہوں، میں نے اپنا ایک ایک لمحہ اپنی ذمے داریوں کے لیے وقف کیا ہوا ہے، کیا مجھے اتنا بھی حق نہیں کہ میں اپنے ذہن کو تازہ کرنے کے لیے کسی تفریح میں دلچسپی لے سکوں؟ میں ایک مشین بن کر تو زندہ نہیں رہ سکتا نا۔ اوور۔"

"تم بہک رہے ہو۔" اس کا لہجہ سپاٹ ہو گیا۔ "مجھے الہام نہیں ہوا تھا کہ تم کسی نجی مصروفیت میں الجھے ہوئے تھے۔ یہ نہ بھولو کہ فی الحال تم آزمائشی مرحلے سے گزر رہے ہو اور مجھ کو جوابدہ ہو۔ تمہیں محتاط رہنا چاہیے۔ اوور۔"

"احتیاط ہی نے تمہیں شکایت کا موقع دیا ہے۔" اس بار میں نے اپنے لہجے میں نرمی پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "گھر سے نکلتے ہوئے مجھے علم تھا کہ میری کیا مصروفیات ہوں گی، میں ہر لمحے آپریٹس اپنے ساتھ رکھتا ہوں، صبح بھی ساتھ ہی لے کر چلا تھا لیکن راستے میں خیال آیا کہ ایسی ملاقاتوں میں فاصلے ختم ہو جاتے ہیں۔ وہ آپریٹس کی موجودگی سے واقف ہو سکتی تھی۔ لہٰذا میں خاص طور پر راستے سے گھر لوٹا اور آپریٹس ایک الماری میں مقفل کر کے دوبارہ دفتر کے لیے روانہ ہوا۔ اوور۔"

میں نے وہ فی البدیہہ قلابازی اس خیال سے کھائی تھی کہ سی ون کو بنز ڈالٹن والے سے ضرور علم ہوا ہوگا کہ دفتر جاتے جاتے میں اچانک شاہراہِ قائدین سے گھر کی طرف مڑ گیا تھا۔ اگر میری اس خلافِ معمول حرکت پر اس کو کوئی شبہ ہوتا تو میری بتائی ہوئی کہانی کی روشنی میں وہ دور ہو جانا چاہیے تھا۔ غنیمت یہ تھا بات بگڑتے بگڑتے سنبھلنے کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔

"تو صبح تم اس لیے دوبارہ گھر کی طرف لوٹے تھے؟" اس نے خود ہی مجھ پر اپنی واقفیت کا اظہار کر دیا۔ "شاید تمہیں علم نہ ہوا ہو لیکن تمہاری حفاظت کی جا رہی تھی۔ میرے آدمیوں سے بس یہ چوک ہوئی کہ وہ دفتر سے تمہاری روانگی کے وقت غائب تھے ورنہ ان ہی سے مجھے تمہاری مصروفیات کا علم ہو جاتا۔ تمہیں اپنا دل بہلانے کی پوری آزادی ہے لیکن اس کے لیے تم مجھے پیشگی اطلاع دے سکتے ہو تاکہ مجھے کوئی تشویش نہ ہو۔ ہمارا کام خطرناک ہے۔ جب ہر طرف دوستوں کے ساتھ دشمن بھی موجود ہوں تو حالات کسی بھی لمحے بدل سکتے ہیں۔ مجھے خوشی ہوئی کہ ایسے موقع پر تم نے آپریٹس گھر پر چھوڑ دیا تھا، بہرحال آئندہ اس طرح رابطہ نہیں ٹوٹنا چاہیے۔ اوور۔"

"میں محتاط رہوں گا۔" میں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔"ویسے حفاظت یا نگرانی کی اطلاع میرے لیے حیران کُن ہے لیکن مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے، تم اپنے طریقۂ کار پر عمل کر رہے ہو۔ اب مجھے یہ تسلی رہے گی کہ میں کہیں بھی تنہا نہ ہوں گا۔ اوور۔"

"اس کا غلط مطلب نہ لو۔" اس نے لائن اوور ہوتے ہی بلاتوقف میری تصحیح کی "ضروری نہیں کہ وہ ہر وقت ہی موجود ہوں۔ تمہیں ان پر انحصار کیے بغیر اپنی راہ اختیار کرنا ہے۔"

اس کی وضاحت سن کر میرے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ یہ میری خوش قسمتی اور حاضر دماغی تھی کہ اس کا ہر وار میں نے اسی پر لوٹا دیا تھا اور وہ جارحانہ لہجے سے گفتگو کی ابتدا کرنے کے بعد مدافعت پر اتر آیا تھا۔

"آج نیا مال آیا ہے۔" وہ کہہ رہا تھا۔"اس کے لیے تمہیں کوئی بندوبست کرنا ہوگا کیونکہ آدمی سات بجے جیوا ہاؤز پہنچے گا کل شام میں اسی لیے تم سے بات کرنا چاہ رہا تھا تاکہ تم جہانگیر کو اطلاع دے سکو۔ کیونکہ اب اس سے تمہاری گفتگو رات کے آٹھ بجے سے پہلے ہونا ناممکن ہے۔ اوور۔"

"میں اس کا بندوبست کرلوں گا۔" میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔"میرا سامنے آنا مناسب نہیں، نادر کو براہِ راست ہدایت دی گئی تو اس کا دماغ خراب ہو سکتا ہے۔ سات بجے جہانگیر ہی مال وصول کرے گا۔ اوور۔"

"لیکن کیسے؟" میرا معاملہ نیا ہونے کے باعث سی ون ہر بات کی جزئیات میں دلچسپی لینے پر مجبور تھا۔"اس سے رابطے کے لیے تو آٹھ اور سوا آٹھ کے درمیان وقت مقرر ہے، پھر تم کیا کرو گے؟ اوور۔"

"ہم سب آوازوں کے وفادار ہیں۔ وہ میری بدلی ہوئی آواز اچھی طرح جانتا ہے، میں اس ہنگامی ضرورت کے تحت فون پر اسے حکم دوں گا کہ وہ آٹھ کے بجائے بارہ بجے دن میری کال کا انتظار کرے۔ پھر سب کچھ طے ہو جائے گا۔ اوور۔"

"تم واقعی ذہین ہو۔" سی ون کا لہجہ تحسین آمیز تھا۔"اب تک جو مال آتا رہا، وہ بڑی پُڑیوں میں تھا۔ قیمت کی وجہ سے بہت سے لوگ ادھر مائل نہ ہو سکے ہوں گے۔ اس کھیپ میں کم مقدار کی پُڑیاں ہیں جو ایک سے چار مرتبہ تک استعمال کی جا سکتی ہیں۔ یہ چھ روپے میں فروخت کی جائیں گی۔ تاکہ ہر ایک کی دسترس میں آجائیں۔ اوور۔"

"یہ بہت اچھا ہوا۔ گاہکوں کے لیے زیادہ مقدار کا احتیاط سے رکھنا بھی ایک مسئلہ تھا۔ اوور۔"

"اوپر والے ہر بات پر نگاہ رکھتے ہیں۔ جن لوگوں کے لیے کوئی چیز پیش کی جاتی ہے، ان کی سہولتوں کا بھی خیال رکھنا ... پچیس اور تیس سے ایک دم چھ روپے کی پیکنگ آنے سے ... تیزی آجائے گی، بازار میں پہلے ہی بہتیرے لوگ ایک کی ... پُڑیاں بنا کر پانچ پانچ روپے میں بیچ رہے ہیں۔ ان کا مسئلہ ... ہو جائے گا۔ اوور اینڈ آل۔"

اس کی آواز معدوم ہو گئی اور آپریٹس پر ریڈیائی لہروں کا ... باقی رہ گیا۔

* * *

سی ون سے طے شدہ پروگرام کے مطابق میں نے گھر سے نکلنے سے پہلے ڈی ون کے طور پر جہانگیر کو بارہ بجے اپنی کال ... انتظار کا حکم دیا تو وہ فون پر فوری طور پر میری آواز پہچان گیا اور میرے مزید کچھ کہے بغیر اس نے سمجھ لیا کہ میری اگلی کال ... آپریٹس پر ہوگی۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں گھر سے روانہ ہوا کشمیر روڈ پر سست رفتاری سے کار چلاتا رہا۔ اس دوران میری نگاہیں مسلسل عقب نما آئینے میں پیچھے آنے والی کاروں کا جائزہ لے رہی تھیں اور مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہو رہی تھی کہ اس وقت کوئی ایسی کار پیچھے نہیں تھی جس پر تعاقب کرنے کا شبہ کیا جا سکتا ... پھر بھی میں اپنے لگے بندھے راستے کے بجائے مزارِ قائد کے قریب والے چوراہے سے داؤد کالج جانے والے راستے پر ہو لیا۔ جیل روڈ سے اس سڑک پر ٹریفک کا ہجوم چلا آرہا تھا لیکن شہر سے اس طرف جانے والی سڑک تقریباً ویران ہی پڑی ہوئی تھی۔ میں بدستور سست رفتاری سے اپنی کار چلاتا رہا اور پیچھے سے آنے والی اکا دکا گاڑیاں تیز رفتاری سے آگے نکلتی رہیں۔ جب مجھے پوری طرح یقین ہو گیا کہ اس وقت میرا تعاقب نہیں کیا جا رہا ہے تو میں نے اپنی کار واپس گھمالی۔ شاید میرے ستارے یاوری کر رہے تھے کہ مجھے ... کی کار واپس لوٹانے کا سنہری موقع میسر آگیا تھا۔

اپنی کار میں نے دکانوں کے قریب سڑک کے کنارے پارک کی اور پھر ٹہلتا ہوا ہوٹل کی طویل راہداری سے گزر کر پارکنگ لاٹ کی طرف نکل گیا۔ وہاں میری چھوڑی ہوئی کرائے کی کار جوں کی توں موجود تھی۔ میں نے اطمینان سے گاڑی اسٹارٹ کی اور اس دفتر کی طرف روانہ ہو گیا جہاں سے وہ کار کرائے پر حاصل کی تھی۔ کار واپس لیتے ہوئے ان لوگوں نے خاصی باریک بینی سے ہر حصے کا جائزہ لیا۔ تاکہ کسی نقصان کی مد میں من مانا ہرجانہ وصول کر سکیں۔ میں خود ان سے الجھنے کے بجائے رسمی سی تکرار کے بعد ایسا ہر نقصان بھگتنے کے لیے تیار تھا لیکن وہ لوگ میری توقع کے برعکس خاصے شریف ثابت ہوئے اور محض کرائے کی رقم منہا کر کے باقی پیسے لوٹا دیے اور میں ٹیکسی کے ذریعے اسی طرف ... گیا جہاں میں نے اپنی کار چھوڑی تھی۔

... روز دفتری مصروفیات میں میرا دل نہ لگ سکا۔ رہ ... ایک خیال ذہن پر سوار ہوا جا رہا تھا کہ میرے ہاتھوں ایک ... سرزد ہو چکا تھا لیکن ہر بار اندر کی آواز مجھے سہارا دیتی تھی کہ ... مصدقہ طور پر کم از کم دو آدمیوں کا قاتل تھا۔ سالوں پہلے ... کے معاملے میں لطف الرحمٰن غبن کرنے کے جرم میں ... تھا اور پھر طارق اس کے سفاکانہ فیصلے کا نشانہ بنا تھا۔ ان ... علاوہ اس نے مزید جن لوگوں کا لہو بہایا ہو، ان سے میں ... تھا۔ سکندر علی نے اپنے جرائم کے باوجود معاشرے میں ... سخاوت، ہمدردی اور مہربانی کا جو دلکش خول چڑھایا ... اس کی بنا پر مجھے پورا یقین تھا کہ تنظیم سے معزولی کے بعد ... کی ذات پر کوئی شبہ نہیں کیا جاتا اور وہ اپنی طبعی موت ... آزادی کے ساتھ دندناتا پھرتا۔ وہ انسانوں کے بنائے قانون کی نگاہوں میں دھول جھونکنے میں پوری طرح ... ہو گیا تھا لیکن قدرت کا خاموش اور اٹل قانون اس کے ... فیصلہ صادر کر چکا تھا اور اسے کیفرِ کردار کو پہنچانے کے لیے میرا ... کیا گیا تھا۔

میں بار بار اپنی میز پر موجود فائلوں کو دیکھتا لیکن ہر بار ... دھندلانے لگتے اور عبارت مفہوم سے عاری محسوس ہوتی۔ ... کشمکش میں بارہ بج گئے۔ میں نے اپنی میز کے نیچے لگا ہوا ... کر دیا۔ جو باہر چوکھٹ پر لگے ہوئے سرخ بلب سے منسلک ... روشنی کی موجودگی میں انٹر کام پر اجازت لیے بغیر کوئی ... کمرے میں داخل نہیں ہو سکتا تھا لیکن پھر بھی میں نے ... کے گول ہینڈل کے وسط میں لگا ہوا بٹن دبا کر دروازہ ... مقفل کر لیا تاکہ بے دھیانی میں بھی کسی کے اندر داخلے کا ... باقی نہ رہے۔

پھر آپریٹس آن کر کے میں نے جہانگیر سے رابطہ قائم کیا۔ وہ ... توقع میری کال کا منتظر تھا۔ پہلے ہی پیغام پر اس کی طرف ... جواب مل گیا اور میں نے مختصر الفاظ میں اسے شام سات بجے ... ہاؤز میں مال وصول کرنے کی ہدایت دے کر سلسلہ منقطع کر ... پُڑیوں میں مال کی مقدار میں کمی اور نئے داموں کے بارے ... اسے بعد میں بھی بتایا جا سکتا تھا۔

دو بجے میں جہانگیر کے دفتر پہنچا تو وہ بے چینی سے میرا ... منتظر تھا۔

"میں تو سمجھا تھا کہ تم آج کا پروگرام بھول ہی گئے۔" اس نے ... بکھرے ہوئے اخبارات سمیٹتے ہوئے کہا اور میں جواباً کچھ کہتے ... ایک دم چونک پڑا اور میں نے ہاتھ بڑھا کر اس سے اخبارات لے لیے۔

ایک اخبار میں ماتمی حاشیے کے ساتھ شہر کی مشہور اور معزز سماجی شخصیت کے دلدوز قتل کی خبر موجود تھی۔ بقیہ دو اخبارات میں وہ خبر پہلے صفحے پر نمایاں طور پر موجود تھی۔

"خس کم جہاں پاک۔" جہانگیر مجھے اس خبر کے مطالعے میں منہمک پاکر دھیمے سے بولا۔ میں نے سر اٹھایا تو اس کے لبوں پر مسکراہٹ رقصاں تھی۔"بہت بولتا رہتا تھا ہم لوگوں کے خلاف کسی دل جلے نے گردن ہی ناپ لی سالے کی۔"

"لیکن یہ بُرا ہوا۔" میں کوشش کے باوجود اپنے لہجے میں افسوس کا تاثر پیدا نہ کر سکا۔"کتوں کے بھونکنے سے گاڑی نہیں رکتی لیکن گاڑی چلانے والے کتوں کو مارنے لگ جائیں تو خود مارے جاتے ہیں۔ جلی سرخیوں میں اس قتل کی ذمے داری منشیات فروشوں کے کسی منظم گروہ پر ڈالی گئی ہے۔ اس وقت تک نہ جانے کتنے افراد اندر ہو چکے ہوں گے۔"

وہ کرسی پر جھولتے ہوئے بے نیازی سے مسکرا دیا۔"پوری خبر پڑھو گے تو دل کھول کر ہنسو گے، قسمت بھی ہمارے ساتھ ہے۔ ... قتل کی کڑیاں پچھلے دنوں ہماری مخبری پر ہونے والی پکڑ دھکڑ سے ملائی گئی ہیں۔ اخبار کا خیال ہے کہ منشیات فروشوں کے خلاف

اس موثر ترین مہم میں سکندر علی کا ہاتھ رہا ہوگا لہٰذا وہ اس کی جان کے درپے ہوگئے۔ ایک کالج کے طالب علم لیڈر نے بھی بیان دیا ہے کہ اس کے کالج میں انسداد منشیات پر ہونے والے مذاکرے میں مہمان خصوصی کے طور پر تقریر کے بعد سکندر علی کو گمنام دھمکیاں ملی تھیں۔"

حالات کی اس ستم ظریفی پر میرا دل خوش ہوگیا۔ درحقیقت سکندر علی ہی بی فور کے طور پر منشیات فروشوں کے خلاف مہم کا روح رواں تھا اور یہ بات گھوم پھر کر اخبارات میں آ ہی گئی تھی۔ اب یہ اور بات تھی کہ اخبارات نے مقتول کے اس فعل کو سماج دوستی کا نام دیا تھا جبکہ بی فور کے روپ میں اس کی مہم شروع سے آخر تک بدنیتی پر مبنی تھی۔ پھر اس نے غزالہ کے کالج کے مذاکرے میں میری موجودگی کا کھوج لگانے کے لیے اپنے اعتماد کے طلبا سے جو فرضی عذر تراشا تھا، وہ اس کے قتل کا ایک جواز بن گیا تھا۔ گمنام دھمکیوں کے بعد قتل کے نتیجے میں پولیس اس طالب علم رہنما کو خصوصی حیثیت دیتی اور پھر فنکشن میں موجود بیرونی مہمانوں کی وہ فہرست بھی تفتیش کا حصہ بن جاتی جو سکندر علی کے ایما پر مرتب کی گئی تھی لیکن غزالہ کی چھٹی حس یا ذہانت کے باعث میرا نام اس میں شامل نہیں ہوا تھا۔

"پڑھ لوں گا پھر۔" میں نے اخبارات بے پروائی سے ایک طرف ڈال دیے۔ "یہ بتاؤ کہ آج بلانے کا کیا مقصد تھا؟"

"اِدھر آجاؤ، کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا۔" جہانگیر نے ملحقہ کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "کھانے کے ساتھ باتیں بھی ہوتی رہیں گی۔"

اندر جہانگیر کا ایک ملازم کھانا لگا چکا تھا۔ وہ مجھے پہچانتا تھا۔ اور شاید مجھے دیکھتے ہی اپنے کام میں مصروف ہوگیا تھا۔ کھانوں کی خوشبو اشتہا انگیز تھی۔ میں نے بیٹھتے بیٹھتے ایک شامی کباب کھانا شروع کر دیا۔

"تم باہر جاؤ۔" جہانگیر نے ملازم سے کہا۔ "ضرورت ہوگی تو بلالیں گے۔" اور وہ سر جھکائے باہر نکل گیا۔

"یہ حالات کب تک یوں ہی چلتے رہیں گے؟" چند ثانیوں کے توقف کے بعد اس نے گہری سنجیدگی کے ساتھ سوال کیا۔

"سب کچھ تم پر منحصر ہے۔" میں نے لقمہ نگل کر کہا۔ "میں تو تمھارے حکم کا پابند ہوں۔"

"بکواس مت کرو۔" وہ محبت آمیز لہجے میں بولا۔ "دوستوں میں صرف تم اس قابل ہو کہ کوئی مشورہ دے سکو۔ مجھے تو اب وحشت ہونے لگی ہے، آخر وہ ہمارے سامنے کیوں نہیں آتا؟"

"جب سامنے آئے بغیر سارا کام چل رہا ہے تو وہ یہ خطرہ کیوں مول لے گا؟" میں نے معنی خیز لہجے میں سوال کیا۔

وہ تشویش آمیز نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ "اگر کام میں رخنہ اندازی ہوئی تو بھی وہ سامنے نہیں آئے گا۔ آخر اسے اعتماد کیوں نہیں ہے ہم پر؟"

میں دھیمے سے ہنس دیا۔ "وہ انسانی نفسیات سے اچھی طرح واقف ہے . . ."

"میری تو آنکھیں کھل گئی ہیں طارق کے انجام سے۔" وہ میری بات کاٹ کر بولا۔ "تمھاری بات مسلسل میرے دماغ پر ہتھوڑے برسا رہی ہے۔ جتنا سوچتا ہوں یہی نتیجہ اخذ کرتا ہوں کہ وہ اپنوں کے ہاتھوں مارا گیا ہے۔" وہ ایک لحظے کے لیے ٹھٹکا پھر نیچی آواز میں بولا۔ "اور مجھے شبہ ہے کہ اب تمھاری باری آنے والی ہے۔"

اس کے الفاظ سن کر میں بری طرح چونک پڑا۔ "یہ کس بنا پر کہہ رہے ہو تم؟"

"پابندیاں ہٹالی گئی ہیں لیکن تم اسٹینڈ بائی رہو گے۔" وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر رازدارانہ لہجے میں بولا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے سر سے ایک بوجھ ہٹ گیا ہو۔ اس نے میری باری آنے کے امکان کا ذکر اپنی نجی معلومات کی بنیاد پر نہیں بلکہ میری کہی ہوئی بات کے حوالے سے کیا تھا۔

"ڈی ون تمھیں کسی بُرے موقع کے لیے پال رہا ہے۔ احمد یار اور ٹائیگر بدستور نادر سے اٹیچ رہیں گے اور وقت پڑنے پر تم قربانی کے بکرے کے طور پر کسی خطرے میں جھونک دیے جاؤ گے۔" وہ کہے جا رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ بغاوت کی تیاریوں میں ایک اور مرحلہ خوش اسلوبی سے طے ہوگیا تھا۔

جہانگیر کے ذہن میں عدم تحفظ کا خطرہ جنم لے چکا تھا اور اس نے میرا اعتماد حاصل کرنے کے لیے بظاہر اندر کی ایک بات میرے سامنے اگل دی تھی لیکن میں اتنا احمق نہیں تھا کہ اپنے دل کی بات اس پر ظاہر کر دیتا۔

بی فور کی برسوں کی رفاقت میں میں نے بنیادی گُر یہی سیکھا تھا کہ کامیابی کے لیے اپنی ذات کو پسِ پردہ رکھنا ضروری ہے۔ آدمی قانون شکن بن کر پیسہ تو کما لیتا ہے لیکن ہر وقت اپنے حریفوں کی کھلی زد پر رہتا ہے۔ گمنام رہے تو خطروں سے بچ کر معاشرے میں عزت اور نیک شہرت بھی کمانے لگتا ہے۔ جہانگیر میری چال میں آگیا تھا اور میں بآسانی اسے اپنے اشاروں پر چلا سکتا تھا۔

جہانگیر

سے گفتگو کے بعد میں ذہنی طور پر خود کو بہت ہلکا محسوس کر رہا تھا۔ طارق کو مروانے [...]اجہ سکندر علی تھا جسے میں نے اپنے ہاتھوں اس کے انجام کو پہنچا [...]ھاوریوں طارق کے لہو کا انتقام لے لیا تھا۔ جہانگیر بے چارے [...]علم نہیں تھا کہ طارق کیسے مارا گیا لیکن اس کے ذہن میں بھی [...]ات سر اُبھارنے لگے تھے اور اس نے اس موضوع پر مجھ سے [...] کر کے میرے لیے ایک راہ پیدا کر دی تھی۔

اس سے پہلے میں بالکل تنہا تھا لیکن اب مجھے یقین تھا کہ [...]گیر کے ذہن میں بھی باغیانہ خیالات پرورش پانے لگے تھے۔ [...]ھی مرحلے پر میں اپنی کارروائیوں کا آغاز کرتا تو شاید جہانگیر کو [...]اد میں لے کر اس سے کام لے سکتا تھا۔

سکون اور آسودگی کی اس لہر میں میرے ذہن میں غزالہ کا [...]ن سراپا اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ در آیا اور میرا دل بے اختیار [...]سے ملنے کے لیے مچل اُٹھا۔ وہ خوب صورت شعر یاد آنے لگے [...]یں نے محض اُسے سُنانے کے لیے یاد کیے ہوئے تھے۔

کاش ایسا ہو کہ اب کے بے وفائی میں کروں
تو پھرے قریہ بہ قریہ، کوبہ کو میرے لیے
میں تو لامحدود ہو جاؤں سمندر کی طرح
تو بہے دریا بہ دریا، جو بہ جو میرے لیے

میں نے جھجکتے ہوئے اس کے گھر کا نمبر ملا ہی لیا اور اس [...]ت مجھے یقین آگیا کہ طلب صادق ہو تو ہر مشکل خود بخود آسان [...]ہو جاتی ہے۔ فون پر غزالہ خود موجود تھی۔ باپ کہیں گیا ہوا تھا، [...]ل آرام کر رہی تھی۔ میں نے اسے مدعو کیا تو وہ خود ہی مل بیٹھنے کو [...]لی ہوئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد میں مقررہ اسٹور کے قریب پہنچا تو وہ فٹ پاتھ [...]ہراساں سے انداز میں میری منتظر تھی۔ اسے لے کر میں فوراً ہی ایک [...]یک نام ہوٹل کی طرف روانہ ہوگیا۔ وہ اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے [...]کی کوشش کرتی رہی اور میں راستے بھر اسے لطیف پیرائے میں [...]چھیڑتا رہا۔

ہوٹل پہنچنے تک اس کے مزاج کی شوخی بحال ہو چکی تھی اور [...]ں اس کے تیکھے فقروں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

ہوٹل کے فیملی کیبن میں تھوڑی سی تمہید کے بعد میں نے دفا [...]کا ذکر چھیڑا اور اس کا تجسس بیدار کرنے کے بعد وہ دونوں ہی [...]شعار اُسے سُنا ڈالے۔

"قطعی پسند نہیں آئے۔" خاموشی سے اشعار سُننے کے بعد غزالہ نے شریر مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور میں مسکراہٹ کے ساتھ [...]س کے رخساروں پر نمایاں ہونے والے دلکش گڑھوں کے حسن میں کھو گیا۔ "اندر کے کرب اور حسرت کے اظہار کی بات ہو تو شعر بہت خوب صورت ہیں۔ چار مصرعوں میں محرومیوں کی ایک لمبی داستان سمیٹ کر رکھ دی گئی ہے لیکن ان شعروں کو کسی مخصوص حوالے سے ہٹ کر دیکھا جائے تو عورتوں کے لیے توہین آمیز ہیں۔"

"توہین آمیز ہیں؟" میں نے حیرت سے دُہرایا۔ "سادہ لفظوں اور چھوٹے چھوٹے خوب صورت شعروں میں شاعر نے اپنی زندگی کا نچوڑ پیش کیا اور تم اسے توہین آمیز کہہ رہی ہو؟"

"توبہ۔" وہ پھریری لے کر دونوں کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولی۔ "کس قدر خوف ناک بددُعا ہے دوسرے مصرعے میں۔ وہ قریہ بہ قریہ، کوبہ کو پھرے گی تو کیا شاعر کی آبرو ان کوچوں میں رسوا نہ ہوگی؟ اور پہلے مصرعے سے تو یوں لگتا ہے جیسے ازل سے بے وفائی عورت کے خمیر میں ہے اور مرد بے چارہ پیدائشی معصوم، جسے حسرت ہی ہے کہ کاش اسے بھی بے وفائی کا موقع نصیب ہو سکے۔ تنویر صاحب! وفا تو عورت ہی کا حصہ ہے . . . . شوہر مجرم اور بدکردار بھی ہو تو، بیوی وفا کا عہد نباہتی رہتی ہے لیکن بیوی بدکردار ہو جائے تو شوہر کبھی برداشت نہیں کرتا۔ انکشاف ہوتے ہی تشدد، طلاق یا پھر قتل کی ایک سنسنی خیز واردات وجود میں آجاتی ہے . . . . اسے کیا نام دیں گے آپ؟"

"ہر شعر کو شاعر کی آپ بیتی کیوں سمجھا جاتا ہے؟" میں نے کہنیاں میز پر ٹِکا کر سنجیدگی کے ساتھ سوال کیا۔ "شعر تو ایک آفاقی حقیقت ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی کے کرب کو محسوس کر کے شاعر کو الہام ہوا ہو۔ شعر اچھا ہوتا ہے یا خراب۔ حوالوں سے اس کی حیثیت نہیں بدلتی۔ تم اسے مرد کی آواز کیوں سمجھ رہی ہو؟ ہو سکتا ہے کہ شاعر نے کسی وفا گزیدہ نازنین کا دُکھ ان اشعار میں ڈھالا ہو۔"

وہ چونکی اور پھر شرمسار سی ہوگئی۔ "بحث میں آپ سے جیتنا تو مشکل ہے لیکن مجھے حیرت ہے کہ آپ شعروں کا ذوق بھی رکھتے ہیں۔ بظاہر تو آپ حقائق کی دنیا کے آدمی معلوم ہوتے ہیں جو خوابوں سے دُور بھاگتے ہیں جب کہ شعر تو سراسر ایک خواب ہی ہوتا ہے۔ وصال پر شاید پورے ادب میں ایک بھی اچھا شعر نہ مل سکے۔ ہاں ہجر اور فراق کے موضوع پر ہزاروں خوب صورت اشعار مل جائیں گے۔"

"جو دِل حسن سے گھائل ہو جائے اس میں گداز آجاتا ہے اور اچھے شعروں کو ایک نیا مسکن مل جاتا ہے۔" میں نے شوخ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "وصال ہوتے ہی اشعار بے دخل کر دیے جاتے ہیں۔ اب یہ تم پر منحصر ہے کہ کب تک اشعار یاد کراتی ہو۔"

اس نے نگاہیں چُرالیں اور کولڈ کافی کے گلاس کی طرف متوجہ ہوگئی جس کی بیرونی سطح پر نمی کے قطرے موتیوں کی طرح جھلملا

رہے تھے"۔ میں آپ کو سب کچھ بتا چکی ہوں، شاید میں آپ کے معیار پر پوری نہ اُتر سکوں"۔ اس کا لہجہ اداس اور کھویا کھویا سا تھا۔

"میری شخصیت اُلجھی اُلجھی سی ہے۔ گھر میں ہمیشہ سے میں نے اپنے اور والدین کے درمیان ایک غیر مرئی سی دیوار محسوس کی ہے، اجنبیت اور شبہات کی اس فضا میں مَیں نے اپنی شناخت برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے لیکن پھر بھی میں اُلجھ سی گئی ہوں۔ ایسا لگتا ہے جیسے ایک چھت کے نیچے چار افراد کے کنبے کے بجائے چار اجنبی رہ رہے ہوں۔ تنہا اکائیوں کی طرح۔ بھائی پاگل ہے، ماں باپ اپنے خول میں مگن ہیں۔ ڈیڈی نے اپنی بیشتر عمر گھر سے باہر گزاری اور کبھی میری تربیت میں حصّہ نہ لے سکے لیکن اب ریٹائرمنٹ کے بعد اچانک ہی وہ توقع کرتے ہیں کہ میں ان کے اصولوں پر چلوں گی میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں؟ ہمارے درمیان بس ایسا واجبی سا تعلق ہے جو بس میں برسوں سے ہر روز ساتھ سفر کرنے والوں میں پیدا ہو جاتا ہے، رشتوں کی گرمجوشی بالکل نہیں ہے۔ میں آپ کو ایک اچھا دوست سمجھ کر کچھ خوشگوار لمحوں کی تلاش میں آپ کی طرف بڑھی تھی۔ میرا ذہن بالکل صاف تھا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ آپ سنجیدگی اختیار کرلیں گے"۔ اس نے سر جھٹک کر نظریں اُٹھائیں اور مجھے اپنی طرف متوجہ پاکر بوجھل انداز میں مسکرا دی"۔ میرا خیال ہے کہ ہم آپس میں ملنا ترک کردیں، کچھ دن شاید خلش ہوگی پھر ہم ایک دوسرے کو بھول کر اپنے اپنے راستوں میں کھو جائیں گے"۔

"اپنے بارے میں مَیں تم سے زیادہ جانتا ہوں"۔ میں نے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے مضبوط لہجے میں کہا۔ "سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی اگر میں تعلق برقرار رکھنے پر تُلا رہوں تو تمہارا رویّہ کیا ہوگا؟"

"یہ آپ کی غلطی ہوگی"۔ اس کی دھیمی آواز اُبھری۔

"پھر وہی میری بات"۔ میں قدرے تیز لہجے میں بولا"۔ میں تمہارے خیالات جاننا چاہتا ہوں"۔

"اعتماد نہ ہوتا تو اس ہوٹل کے فیملی کیبن میں یوں تنہا آپ کے ساتھ موجود نہ ہوتی"۔ وہ میز کی سطح پر نظریں جمائے دھیمی اور سرسراتی ہوئی آواز میں بولی۔ "لیکن مَیں آپ کو اُلجھانا نہیں چاہتی۔ بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جو کُھل کر نہیں کہی جاسکتیں"۔

میں چونک پڑا۔

اس نے بڑی عجیب سی بات کہہ ڈالی تھی۔ نہ جانے وہ کونسی باتیں تھیں جن کا وہ کُھل کر ذکر نہیں کرنا چاہتی تھی؟ مجھے گمان ہوا کہ کہیں اسے میری اصلیت کا علم نہ ہوگیا ہو۔ وہ بے حد ذہین لڑکی تھی اور سکندر علی کے معاملے میں اپنی خداداد ذہانت اور مضبوط قوتِ فیصلہ سے کام لے کر مجھے ایک بہت بڑی اُلجھن سے بچا چکی تھی۔ اگر اس نے سکندر علی کے ایما پر تیار کی جانے والی فہرست میں شرکت کرنے والے بیرونی مہمانوں کی فہرست میں میرا نام درج کرا دیا ہوتا تو وہ خبیث لازماً میری طرف سے چوکنا ہو جاتا کہ میں نے مذاکرے میں اس کی تقریر سُن کر آواز کے سہارے اسے شناخت نہ کرلیا ہو۔ وہ اپنے شبے کی تصدیق یا تردید کے لیے سی۔ دِن کو اشارہ کرتا اور اس کے شکاری کتے کسی سائے کی طرح ہر لمحے میرے تعاقب میں ہو لیتے پھر میں سکندر علی کے مکان کا رُخ کرتے ہی رنگے ہاتھوں پکڑ لیا جاتا اور یوں شاید طارق سے پہلے میرے قتل کا فیصلہ صادر کر دیا جاتا لیکن غزالہ کی ذہانت سے میں بے خبری میں اس دردناک انجام سے دوچار ہونے سے نہ صرف بچ گیا تھا بلکہ میں نے بھیڑ کے روپ میں پوشیدہ اس بھیڑیے کو بآسانی جہنم واصل بھی کر دیا تھا۔

اس روز صبح کے اخبارات میں سکندر علی کے قتل کی خبر نہیں چھپ سکی تھی لیکن شام کے اخبارات نے اس واردات کو اس کی سماجی خدمات کے حوالے سے خاصا اُچھالا تھا لہٰذا غزالہ سے ملنے سے قبل میں نفسیاتی طور پر خاصے دباؤ کا شکار تھا کہ اس معاملے پر غزالہ کے ردِعمل کے جواب میں میرا رویّہ کیا ہونا چاہیے لیکن ہمیں اس ہوٹل میں بیٹھے ایک گھنٹے سے زائد وقت گزر چکا تھا مگر اس نے ایک بار بھی اس بارے میں کوئی ذکر نہیں چھیڑا تھا جس کا مطلب تھا کہ شام کے اخبارات اس کی نگاہ سے نہیں گزرے تھے۔ اس معاملے میں مجھے اس بات سے بے حد اطمینان تھا کہ میں نے فہرست سے اپنا نام حذف رکھنے کے سلسلے میں بہت محتاط رویّہ اختیار کیا تھا اور غزالہ پر یہی ظاہر کیا تھا کہ اس نے میرا نام چھپا کر غلطی کی تھی اور جب اس نے اپنی غلطی کے ازالے کے طور پر میرے نام کے اظہار کا ارادہ ظاہر کیا تو میں نے پولیس کی امکانی مداخلت اور بعد اس کے اپنے مشتبہ ہو جانے کا ذکر چھیڑ کر اسے خاموش رہنے کا مشورہ دیا۔ اس طرح نہ صرف وہ مطمئن ہوگئی بلکہ میں بھی ناگہانی مصائب سے محفوظ رہا۔

فوراً ہی میرے دل سے یہ شبہ دُور ہوگیا کہ غزالہ میری خفیہ مصروفیات کے جملہ یا کسی پہلو سے واقف ہوچکی تھی۔ اس وقت وہ اپنی ذات کے حوالے سے بات کر رہی تھی لہٰذا جو کچھ بھی ناگفتہ باتیں رہی ہوں، اسی سے متعلق تھیں۔

لیکن میں اس کو پسند کر چکا تھا، سوچے سمجھے انداز میں اس کی طرف پیش قدمی جاری تھی لہٰذا اس کی اُلجھنوں سے دلچسپی پیدا ہونی لازمی تھی اس لیے میں پوچھ ہی بیٹھا۔ "اجنبیت کی دیواروں میں تم اپنائیت کے خلوص کو شاید بالکل ہی بھول چکی ہو۔ میں تمہارا دوست، ہمدرد اور بہی خواہ ہوں۔ مجھ سے کُھل کر بات کرو..... ہم جیتے جاگتے انسان ہیں، ہر ایک میں خوبیوں کے ساتھ بہت سی خامیاں بھی ہوتی ہیں۔ جب دو انسان مِل کر بیٹھتے ہیں تو ایک دوسرے کے صرف ایک ہی پہلو پر غور نہیں کرتے، ان خوبیوں اور خامیوں کا اجتماعی توازن ہی کسی کی ذات کا مجموعی تاثر ہوتا ہے"۔

"آپ سنجیدہ اور بُردبار آدمی ہیں تنویر صاحب! میری ذات میں کچھ بھی تو نہیں ہے۔ آپ کو زندگی کے ہر موڑ پر بہتیری لڑکیاں ملیں گی، اس وقت شاید آپ کو خوشی ہو کہ آپ فیصلے کے لیے آزاد ہیں۔ میری اُلجھنوں کی دلدل میں دھنسنے کے بجائے آپ میرا مشورہ قبول کیوں نہیں کرتے؟"

"تو کیا تم نے زندگی کا سفر اکیلے ہی طے کرنے کا فیصلہ کیا ہُوا ہے؟" میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ سوال کیا۔

"فی الحال تو شاید ایسا ہی نظر آتا ہے کبھی تنہائی عذاب بن ہی گئی تو اپنے جیسا کوئی ہم سفر تلاش کرلوں گی"۔

میرے دل سے ایک بوجھ سا ہٹ گیا۔ اس کی پہیلیوں نے میرے ذہن میں اچانک ہی جس شبہے کو جنم دیا تھا وہ کسی ہم سفر کا ذکر سنتے ہی دور ہوگیا"۔ تو کیا میں تم جیسا نہیں ہوں؟" میرے لہجے میں ملامت آمیز شکایت پوشیدہ تھی۔

"آپ فرشتے ہیں تنویر صاحب!" اس کی آواز بھرّا گئی"۔ مجھے شبہ ہوا تھا، میرے ذہن میں فتور آیا تھا کہ شاید آپ کی عنایات خود غرضانہ ہیں۔ میں ڈرتے ڈرتے لیکن محض ایک تجربے کی خاطر آپ کی دعوت قبول کرنے کی ہمت کرسکی۔ میرا خیال تھا کہ شاید ایک دو ملاقاتوں کے بعد آپ کچھ کہیں گے اور میں اپنا راستہ بدل لوں گی لیکن آپ کی آنکھوں میں ہمیشہ معصوم سی چمک برقرار رہی اور مجھے اپنی پراگندہ خیالی مُنہ چڑاتی رہی۔ آپ پارسا ہیں"۔

وہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ شاید اس کی آنکھوں میں نمی اُمڈ آئی تھی کیوں کہ بولتے بولتے وہ اچانک خاموش ہوگئی۔ میں نے اسے رومال دیا تو اس نے اپنی آنکھیں خشک کیں اور ہم دونوں اپنے اپنے خیالات کی پُرہجوم وادیوں میں کھوئے خاموشی کے ساتھ کولڈ کافی کے گلاس خالی کرنے لگے۔

اس چھوٹے سے محدود کیبن میں مَیں اسے مزید چھیڑ کر آزردہ نہیں کرنا چاہتا تھا لہٰذا میں نے بل ادا کر کے کسی ویران شاہراہ پر نکل جانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

میرے لیے اس کا رویّہ بے حد حیرت انگیز اور ناقابلِ فہم تھا۔ میں تہیہ کر چکا تھا کہ اس کی مایوسی اور اداسی کا سبب جانے بغیر اسے واپس نہ جانے دوں گا، خواہ سڑکوں کی خاک چھانتے پوری رات ہی کیوں نہ گزر جائے۔

بڑی عجیب تھی وہ لڑکی میرے لیے۔ نہ جانے اس کی ذات میں وہ کون سا سحر پوشیدہ تھا کہ اس نے مجھ جیسے شکاری کو بھی بے بس کر کے دماغ و دل میں ایک طوفان برپا کر دیا تھا۔

ان گنت نام تھے جو میری تنہا راتوں میں خوابوں کے جزیروں کی طرح آتے جاتے رہے لیکن نفس کی حیوانی سطح سے اوپر کسی لطیف انسانی جذبے کو بیدار نہ کر سکے اور ایک وہ تھی کہ اس سے ملتے ہی نفس کا بے رحم درندہ دُم دبا کر میرے لاشعور کے کسی نہاں خانے میں دبک جاتا تھا اور شعور پر ایک ایسی مخمور سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی کہ بس اسے سامنے بٹھائے باتیں کرتے چلے جانے کو جی چاہتا تھا۔

ہوٹل سے بل ادا کر کے ہم روانہ ہوئے تو وہ میرے برابر والی نشست پر خاموش اور کھوئی کھوئی سی بیٹھی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کس طرح اس سکوت کے خاتمے میں پہل کروں.... ہوٹل کی سیڑھیاں اترتے ہوئے اس کی گفتگو کے حوالے سے میرے ذہن میں ایک ہولناک سا خیال پیدا ہوا تھا اور اب اسی خیال نے میری زبان پر مہر لگائی ہوئی تھی۔

شاید میں آپ کے معیار پر پوری نہ اتر سکوں۔ بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جو کُھل کر نہیں کہی جاسکتیں۔ میری ذات میں کچھ بھی تو نہیں ہے۔ میری اُلجھنوں کی دلدل میں دھنسنے کے بجائے آپ میرا مشورہ قبول کیوں نہیں کرتے؟ کبھی تنہائی عذاب بن ہی گئی تو اپنے جیسا کوئی ہم سفر تلاش کرلوں گی اور ان مبہم لیکن معنی خیز اشاروں کے بعد میری پارسائی کا ذکر کرتے ہوئے دل گرفتہ ہوگئی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ چاہتے ہوئے بھی مجھے اپنے ماضی کا کوئی ناخوشگوار تجربہ سُنانے کی جرأت سے محروم ہو۔ شاید مجھ سے ملنے سے پہلے اس نے کسی سے محبت کی ہو اور وفا کے نام پر اپنا دامن لہولہان کرلیا ہو۔ میرے دل کی دھڑکنیں اس خوف سے تیز تر ہوگئی تھیں کہ میری ہمت افزائی پر کہیں وہ اعتراف ہی نہ کر بیٹھے اور جب وہ بولنے پر آمادہ ہو جائے تو میں سننے کو تیار نہ ہوں۔

میرے سُنائے ہوئے دو شعروں پر بات کرتے ہوئے وہ کہہ ہی چکی تھی کہ عورت اپنے پسندیدہ مرد کی بدکرداری کے باوجود اس سے وفادار رہتی ہے لیکن مرد کبھی عورت کی بے وفائی کو نظرانداز نہیں کرسکتا۔ میں عجیب سے کرب میں مبتلا ہوگیا تھا، اس کی زبان کھلوانا چاہتا تھا لیکن آرزو یہی تھی کہ میں اس سے اصرار کرتا رہوں اور وہ انکار کرتی رہے۔ اگر وہ میرے سامنے اپنے ماضی کی کسی بھول کا اعتراف کر بیٹھتی تو میری نگاہوں میں مقام کھو بیٹھتی۔ میں اسے چاہتا تھا، شدّت سے چاہنے لگا تھا۔ میری خواہش تھی کہ اس سے کوئی بھول سرزد بھی ہوئی ہو تو یہ راز وہ اپنے دل میں دفن رکھے کیوں کہ اس قدر گہرا تعلق پیدا ہو جانے کے بعد اس کا کوئی بھی اعترافِ گناہ

میری اُنا پر گہرے گھاؤ کے مترادف ہوتا جس سے سنبھلنا شاید میرے بس سے باہر تھا۔ میں نے کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ سر جُھکائے اپنے دامن سے اُلجھ رہی تھی۔

مَیں کسی زخمی پرندے کی طرح مضطرب تھا۔ ہوٹل سے نکلنے سے قبل ہر قیمت پر اس کی مایوسی اور اُداسی کا سبب جاننے کا تہیہ کر چکا تھا لیکن سیڑھیاں طے کرنے کے بعد زبان کھولتے ہوئے خوف محسوس ہو رہا تھا کس قدر عجیب اور متضاد تھے میرے جذبے' اس کی زبان سے ہر بات سُننے کا متمنی تھا لیکن اس کے آلودہ ہونے کے باوجود پارسائی کے فریب میں مبتلا رہنا چاہتا تھا۔

لیکن کیوں؟ رفتہ رفتہ ذہنی رو کے بدلنے کے ساتھ ہی سوال اُبھرا۔ وہ ایک لغزش پر اندر ہی اندر گھلی جا رہی تھی اور میں اَن گنت لغزشوں کے باوجود کسی قسم کی ندامت قبول کرنے کو تیار نہیں تھا۔ جب دونوں طرف یہی ہو تو کون کس کو پہلا پتھر مارے؟ پھر ماضی اس کا اپنا تھا جس سے مجھے کوئی تعلق نہ ہونا چاہیے تھا۔ ہاں، مجھ سے تعلق کے بعد وہ اپنے ایک ایک لمحے کے لیے مجھے جوابدہ ہوتی۔ پھر اگر خیانت کا ارتکاب ہوتا تو وہ ہر سزا کے قابل قرار پاتی اور دہی تو ایک نہیں تھی، اگر اس کی ندامت کا پس منظر جاننے کے بعد میرے دل میں اس کی طرف سے کراہت پیدا ہو جاتی تو میں آزاد تھا۔ وہ خود کہہ چکی تھی کہ مجھے زندگی کے ہر موڑ پر اپنے انتخاب کے بہتیرے مواقع ملیں گے۔ شاید میرے رویّے کی تبدیلی اسے بھی گراں نہ گزرتی کیوں کہ ذہنی طور پر وہ پہلے ہی "اپنے جیسے" کسی ہم سفر کی تلاش پر آمادہ تھی۔

"کہاں جا رہے ہیں آپ؟" اس کی دھیمی اور دلکش آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"ساحل کی طرف۔" میں نے اس سے نگاہیں چار کیے بغیر سنجیدگی سے کہا۔ "گرداب پیدا ہونے لگے تو ساحل ہی محفوظ رہتا ہے۔ تمھاری ادھوری اور پُر پیچ گفتگو نے میرے ذہن میں آگ سی لگا دی ہے، جب تک کُھل کر بات نہیں کرو گی، واپس نہیں لوٹوں گا۔"

"آپ کو ساحل مل جائے گا مگر مجھے گرداب سے نجات نہ مل سکے گی۔" وہ بولی۔ "آپ مجھے اچھے لگتے ہیں، میں چاہتی ہوں کہ ہم ایک دوسرے کے بارے میں خوشگوار یادیں سمیٹے ایک دوسرے سے رُخصت ہوں تا کہ کبھی کبھی آپ مجھے یاد کر لیا کریں۔ میری کتھا سُن کر آپ مجھ سے بدظن ہو گئے تو یہ دُکھ مجھے زندگی بھر تڑپاتا رہے گا۔"

میرے وجود میں سنسنی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ وہ جو کچھ رہی تھی، میرے نزدیک اس کا مفہوم بہت واضح تھا لیکن بات چھیڑنے کے بعد پیچھے ہٹنا بزدلی کے مترادف تھا لہٰذا مجھے [illegible] پڑا۔ "تمھیں میری ذات سے اگر کوئی خوشی نہ مل سکی تو دُکھ بھی [illegible] گا۔ تم جو کچھ دل میں چھپائے بیٹھی ہو، وہ بلا تردد مجھے بتا ڈالو۔"

"آپ اصرار کر ہی رہے ہیں تو سُنیں کہ میں طوائف [illegible] ہوں۔" اُس نے کہا۔

"یہ تمھارا نہیں تمھاری ماں کا قصور ہے۔ اپنی بات [illegible] مجھے اپنی آواز کسی گہرے کنویں کی تہ سے اُبھرتی ہوئی محسوس [illegible] کیوں کہ اس وقت میرا ذہن خلا میں معلق، اس کے کسی بدترین کا منتظر تھا۔"

ڈیڈی نے انھیں دیکھا، پسند کیا، ٹوٹ کر چاہا اور پھر [illegible] کر لی۔ شارق دوسرے سال اور میں چوتھے سال پیدا ہوئی۔" [illegible] کھوئے لہجے میں بول رہی تھی اور میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ [illegible] بندھن کے سائے میں ولادت کے باوجود وہ طوائف زادی ہو سکتی تھی۔ "امّی نے شادی کے بعد اپنے ماضی سے ہر [illegible] توڑ لیا لیکن وہ کوکین کی عادت ترک نہ کر سکیں . . . ."

اس کا یہ انکشاف میرے اعصاب کے لیے کسی بم [illegible] ہولناک دھماکے سے کم نہیں تھا۔ بے اختیار میرے ذہن میں [illegible] کا تصوّر اُبھر آیا جو کوکین خریدنے کے لیے شراب بیچتی تھی۔ [illegible] نے میری روزی چرس اور پھر ہیروئن کے دھندے میں لکھ دی [illegible] نفس کی شہ زوریوں کے بعد محبت کا سایہ نصیب ہوا تو اس [illegible] بنیادوں میں کوکین رچی ہوئی تھی۔

"ان کے اس شوق نے ہمارے گھر کو تباہ کر دیا۔ کامران [illegible] کے پاندان سے کوکین کھا کر بے ہوش ہوا تھا اور آج تک ہوش [illegible] میں نہ آ سکا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کامران نے میرے سا[illegible] سفوف کی وہ شیشی خالی کی تھی۔ میں آٹھ برس کی تھی لیکن [illegible] اس سفوف کی ہلاکت خیزی کا علم نہیں تھا۔ اسے ڈاکٹروں کو دکھایا [illegible] دو نے کسی نشہ آور چیز کا خیال ظاہر کیا مگر اپنا جھوٹا بھرم رکھنے [illegible] لیے میری سنگدل ماں نے کامران کی حالت کو اچانک دورہ ظاہر [illegible] اس جھوٹ نے ڈاکٹروں کو اُلجھا دیا۔" اس کی دھیمی آواز میں نفرت [illegible] کی تلخی سمٹ آئی جیسے اس کے ذہن میں ماضی کا ہر منظر پھر تا[زہ] ہو گیا ہو۔ "کامران کا معدہ صاف نہ کیا جا سکا اور وہ ہمیشہ کے [لیے] پاگل ہو گیا۔ مجھے برسوں بعد علم ہوا کہ وہ سفوف کیا تھا۔ میر[ی] ماں آج بھی ہر وقت مُنہ میں کوکین کا پان دبائے رکھتی ہیں۔ کام[ران] سہما سکڑا بندروں کی سی حرکتیں کرتا ہے، شور مچاتا ہے تو [illegible] بے رحمی سے مارا جاتا ہے اور چند روز کے لیے ایک کمرے [میں] قید کر دیا جاتا ہے۔ میں امی اور ڈیڈی، دونوں کو کامران کی بربادی کا ذمہ دار سمجھتی ہوں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ان میں [illegible] بھی کے ضمیر پر کامران کے بارے میں کوئی بوجھ نہیں ہے۔"

"تمھارے ڈیڈی تو اصل قصّے سے بے خبر ہی رہے ہوں گے؟" میں نے پُر خیال لہجے میں کہا۔ اس کی کہانی نے مجھے بے حد متاثر کیا تھا۔ میں منشیات فروش تھا اور اس کا ماضی بھی نشے کی دُھند میں ڈوبا ہوا تھا۔ ماں کوکین کی عادی تھی اور بڑا بھائی حادثاتی طور پر اس نشے کے زیرِ اثر ہمیشہ کے لیے اپنا ذہنی توازن کھو چکا تھا۔ اگر جھوٹے بھرم پر غزالہ کی ماں کی ممتا حاوی ہو جاتی اور وہ اپنی بدنامی کی پروا کیے بغیر ڈاکٹروں کو کامران کے بارے میں حقیقت سے آگاہ کر دیتی تو شاید بروقت اس مظلوم کے معدے کی صفائی ہو جاتی اور وہ پاگل ہونے سے بچ جاتا لیکن اس عورت نے اپنی جھوٹی انا پر اپنی کوکھ سے جنم دیے بیٹے کی زندگی نہایت بے رحمی سے قربان کر دی تھی۔

"یہ گرہ برسوں میرے ذہن میں پروان چڑھتی رہی۔" وہ اسی تلخ لہجے میں بولی۔ "میرے ذہن میں روز بروز اس سفوف کے بارے میں تجسّس بڑھتا رہا جو میری ماں کے استعمال میں رہتا تھا اور جسے کھا کر کامران پاگل ہوا تھا۔ اس واقعے کے بعد مجھے پورے گھر میں کہیں وہ سفوف نظر نہ آیا۔ شاید کامران کے ساتھ پیش آنے والے حادثے کے بعد وہ محتاط ہو گئی تھیں۔ کئی برس بعد جب مجھ میں ذرا سا حوصلہ پیدا ہوا تو میں نے علیحدگی میں ڈیڈی سے بات کی اور وہ میرے خدشات سُن کر اُداس ہو گئے۔ میرے اصرار پر انھوں نے بتایا کہ امی کوکین کی عادی ہیں — کامران کو جو نقصان پہنچنا تھا، وہ پہنچ چکا۔ اس معاملے میں گزرے ہوئے وقت کو واپس لانا ناممکن تھا اور نہ ہی کامران کا کامیاب علاج ہو سکتا تھا۔ اس سے پتا چلا کہ وہ پہلے سے واقف تھے لیکن امّی کے سامنے کچھ نہ کہہ سکے۔ جب ماں نے ہی اپنی ممتا کو قربان کر دیا تو باپ سے کیا شکوہ۔ باپ کے دل میں ویسے بھی اولاد کے لیے محبت کا جذبہ ذرا کمزور ہی ہوتا ہے۔"

"بہت عجیب کہانی ہے تمھاری۔" میں جھرجھری لے کر بولا۔ "گھر کے ماحول میں اجنبیت اور لاتعلقی اسی لیے ہے کہ تم اپنی ماں کو مجرم سمجھتی رہی ہو لیکن میرے نزدیک نہ تمھاری ماں کا طوائف ہونا جُرم ہے اور نہ کامران کا پاگل پن میرے دل میں لگی ہوئی چنگاری کو سرد کر سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا علاج ممکن نہ ہو لیکن محبت اور ہمدردی کے ساتھ شاید اس کی زندگی میں بہتر تبدیلی آ سکے۔ ہم شادی کے بعد اسے اپنے ساتھ رکھیں گے، تم یقین کرو کہ میں اسے بوجھ نہیں سمجھوں گا۔"

اس نے حیرت اور بے اعتباری سے میری طرف دیکھا۔ "یعنی آپ کے نزدیک میری کہانی . . . . میرا ماضی . . . میرا ماحول ناقابلِ قبول ہے؟"

میں نے کلفٹن کے ساحل پر برسوں سے ویران عمارت سے ذرا دور پختہ سڑک پر ایک ویران گوشے میں کار روک دی اور اس آسیبی عمارت پر لگی ہوئی اِکا دُکا سرچ لائٹس کے ہلکے انعکاس میں اس کے چہرے پر نگاہیں جما کر بولا۔ "تمھارا ماضی صاف اور بے داغ ہے غزالہ! تم نے جو کچھ بتایا وہ تمھاری ماں کا ماضی ہے جس کے لیے تمھیں ذمّے دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔" پھر لحظہ بھر توقف کے بعد دوبارہ بولا۔ "میں تو سمجھ رہا تھا کہ تم اپنے ماضی کی کسی بھول کے عذاب میں مبتلا ہو . . . میں تو شاید اسے بھی خاطر میں نہ لاتا۔ تم نے سچ بول کر میرے دل میں آگ سی بھڑکا دی ہے۔ میں اس بہانے تمھیں اجنبیت اور عدم اعتماد کے اس ماحول سے نکال کر خوشی محسوس کروں گا۔"

وہ خاموش بیٹھی رہی۔ دوبارہ وہ میری طرف متوجہ ہوئی لیکن مجھے مسلسل اپنی طرف نگراں دیکھ کر خاموشی سے سر جھکا لیا۔ "میں تمھارے جواب کا منتظر ہوں غزالہ!" میں نے اسے ٹوکا۔

"آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں، وہ آج کی باتیں ہیں تنویر صاحب!" وہ کمزور اور شکست خوردہ لہجے میں بولی۔ "لیکن یہ پرچھائیاں ہر جگہ میرا تعاقب کریں گی۔ میں اپنے دامن سے اپنی ماں کے ماضی کا داغ نہیں دھو سکتی۔ اور یہ بات چھپنے والی نہیں ہے . . . . کسی دوست یا رشتے دار کی کہی ہوئی کوئی بات آپ کے دل میں نشتر بن کر چبھ سکتی ہے . . . . آپ معزز آدمی ہیں، اپنے حلقے میں کس کس کی باتوں اور نگاہوں کو کب تک برداشت کر سکیں گے؟ مجھ میں بہت حوصلہ ہے' اس لیے آج بھی زندہ ہوں۔ بہتر یہی ہو گا کہ مجھے تنہا چھوڑ دیں۔ کسی چور، بدمعاش، قاتل یا شرابی کے ساتھ میری گزر ہو سکے گی کیوں کہ اس میں پہلے سے دوسروں کے طعنے سُننے کا حوصلہ ہو گا لیکن وہ مجھے کبھی طعنہ نہ دے سکے گا۔"

چند ثانیوں کے لیے مَیں گُنگ ہو کر رہ گیا پھر رُک رُک کر بولا۔ "اگر میں کہوں کہ میں اس قدر معزز نہیں ہوں، جتنا نظر آتا ہوں تو تمھارا جواب کیا ہو گا؟"

اس کے ہونٹوں پر طنزیہ سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ "مجھے بہلانے کی کوشش نہ کریں تنویر صاحب! میری خاطر اپنی ذات کی نفی اور تضحیک نہ کریں۔ میں امی اور ڈیڈی کی گفتگو سُن چکی ہوں۔ ڈیڈی ریٹائرڈ ہو چکے ہیں۔ کامران پاگل ہے اور امی کا شوق بہت مہنگا ہے۔ وہ میرے لیے کسی موٹی اسامی کی تلاش میں ہیں جو ان کے لیے بھی سہارا بن سکے . . . . کیا کیا سننا چاہتے ہیں آپ میری زبان سے؟ میں کسی ہشت پا بلا کی طرح ہوں لیکن آپ کو اپنے جنگل میں نہیں پھانسنا چاہتی۔"

میں نے پہلی بار نرمی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"میرے اسامی بننے یا نہ بننے کا دارو مدار تمھاری مرضی پر منحصر ہوگا۔ میں نے دُنیا دیکھی ہے پھر تم میرا ساتھ دو تو میں ہر ایک سے ٹکرا جانے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔ مجھے مایوس کرو گی تو وہ نہ جانے کس کے ساتھ تمھارا پلو باندھ دیں اور تم زندگی بھر دُہرے جہنم میں سلگتی رہو۔"

"یہ ناممکن ہے۔" اس کا لہجہ پُرعزم تھا۔ "ان کی گفتگو سننے کے بعد میں نے دو ٹوک الفاظ میں انھیں بتا دیا ہے کہ اس بارے میں میری مرضی کے خلاف وہ مجھ پر کوئی فیصلہ نہ تھوپ سکیں گے، اسی لیے میرے فون وصول کرنے پر پابندیاں عائد کر دی گئی ہیں۔ کوئی کال کرتی ہوں تو امی یا ڈیڈی میں سے کوئی آس پاس منڈلاتا ہی رہتا ہے۔ کبھی کبھی تو میں قنوطی ہو کر اس حد تک سوچنے پر مجبور ہو جاتی ہوں کہ کہیں کامران کی تباہی میں امی کی کوئی سازش نہ رہی ہو۔ انھوں نے سوچا ہو کہ کامران کو راستے سے ہٹا کر مجھے اپنے اشاروں پر چلا سکیں گی کیوں کہ وہ جن لوگوں میں اپنا ماضی بسر کرتی رہیں، ان کے نزدیک بیٹیاں سونے کا انڈہ دینے والی مرغیاں ہوتی ہیں۔"

"تم کو کس نے بتایا تمھاری ماں کے ماضی کے بارے میں؟" میں نے قدرے تیز لہجے میں سوال کیا۔

میرے مزید کچھ کہنے سے پہلے وہ بول پڑی۔ "میں اس عمر سے یہ سب سنتی آئی ہوں جب مجھے اس کا مفہوم بھی معلوم نہیں تھا۔ ڈیڈی کے دوستوں کے بچے تک یہی سب کہتے تھے۔ بعض گھروں میں میرا داخلہ تک ممنوع تھا پھر اس تحقیر آمیز رویے کی بنا پر ڈیڈی دوستوں سے کنارہ کش ہوتے چلے گئے اور آج وہ بالکل تنہا ہیں۔ اچھی باتیں چھپی رہ جاتی ہیں تنویر صاحب! گندگی اچھل کر اُوپر آتی ہے۔" اس نے آہستگی سے اپنے شانے پر سے میرا ہاتھ ہٹا دیا۔ "آپ نے مجھے جو عزت دی، اس کے لیے میں ممنون ہوں لیکن ہم دو متوازی راستوں کے مسافر ہیں جو کبھی نہیں مل سکتے۔ آپ معزز اور نیک آدمی ہیں۔ ہاں آپ قانون یا معاشرے کے مجرم ہوتے تو شاید میں آپ کو اپنا سہارا بنا کر خوشی محسوس کرتی۔"

میں بے چینی سے اپنی نشست میں پہلو بدل کر رہ گیا اور پھر اضطراری طور پر سگریٹ سلگا لی۔

"میں شراب پیتا ہوں غزالہ!" طویل سکوت کے بعد میں نے گہرا سانس لے کر کہا۔ "اتنا پارسا نہیں ہوں، جتنا تم نے سمجھ لیا ہے۔"

اس بار پھر اس نے میری بات کاٹ دی۔ "پیتے ہوں گے۔" اس کا لہجہ ٹھوس لیکن لاپروایانہ تھا۔ "آپ جیسے مصروف کاروباری لوگوں کے لیے اپنی بے شمار اُلجھنوں سے فرار کے لیے شاید اس کی ضرورت رہتی ہے۔ آپ کو کوئی شرابی نہیں کہہ سکتا۔ شرابی تو صحیح معنوں میں وہ ہوتا ہے جو بیوی کا زیور بیچ کر بوتل خریدتا ہے۔ پی کر آپے سے باہر ہو جاتا ہے اور گھر پہنچنے کے بجائے کسی کوڑا [illegible] کو اپنا بستر سمجھ کر وہیں دراز ہو جاتا ہے۔ میں کسی ایسے آدمی کو [illegible] خوشی سے اپنا لوں کیوں کہ میں امی اور ڈیڈی کی سازشیں ناکام [illegible] ان سے کامران کی دیوانگی کا انتقام لینا چاہتی ہوں۔ ایسے بدتر اور بے مایہ داماد سے بھلا وہ کیا لے سکیں گے؟"

میں لاجواب ہو گیا۔ بظاہر سیدھی سادی اور معصوم نظر آنے والی اس لڑکی کے خیالات بہت پختہ تھے۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اسے کس موقع پر کیا کہنا چاہیے، زندگی کے پُرپیچ راستوں کے بارے میں اسے خاصی معلومات حاصل تھیں۔ تکلف کی دیوار گرنے کے بعد وہ ہر موضوع پر بلاتکلف بول رہی تھی۔ اس کے اس نئے روپ سے مجھے ایک انوکھی سی راحت بھی ملی تھی کہ وہ بالکل ہی نوخیز ذہن کی مالک نہیں تھی بلکہ اپنے گرد و پیش پر گہری نظر رکھتی تھی۔ پختہ ذہن، ٹھوس ارادوں، دلکش چہرے اور پُرکشش سراپا پر مشتمل اس لڑکی کو اپنانے کی خواہش میرے دل میں شدید تر ہونے لگی لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اس کو کیسے اقرار پر آمادہ کر دوں۔

"مجبوریاں اور کمزوریاں ہر آدمی کے ساتھ ہوتی ہیں غزالہ!" میں نے سگریٹ کے کئی گہرے گہرے کش لینے کے بعد قدرے جذباتی لہجے میں کہا۔ "تم نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے مجھے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا، وہ باتیں بھی بتا دیں جو شاید کبھی میرے علم میں نہ آتیں لیکن تم نے میرے ظاہر سے دھوکا کھایا ہے۔ شاید تقدیر کو کچھ یوں ہی منظور تھا کہ ہم دونوں اپنے ضمیر کے مجرموں کی طرح یکجا ہوں اور پھر ایک دوسرے کو اپنی ان کہی کہانیاں سنائیں اور ایک دوسرے کی پناہ میں آ جائیں . . . میں قانون اور اس کے ساتھ شاید معاشرے کا بھی مجرم ہوں. . . . ."

"خدا کے لیے۔" وہ میری بات کاٹ کر اچانک ہی کرب آلود آواز میں بول پڑی۔ "مجھے بہلانے کے لیے کہانیاں نہ تراشیں . . . ."

"میں تنہا ہوں غزالہ!" میں اس کا ہاتھ تھام کر تیز لہجے میں بولا۔ "بالکل ادھورا . . . . ہجوم میں بھی خود کو اکیلا محسوس کرتا ہوں کیوں کہ اپنی اصلیت صرف مجھے معلوم ہے، کسی سے دل کی بات نہیں کر سکتا۔ مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میری ذات کی تکمیل صرف تمھارے ساتھ ہو سکے گی۔ میں تمھیں بہلا نہیں رہا۔ جو کچھ بتا رہا ہوں، حقیقت ہی حقیقت ہے۔"

"میں بہت دُکھی ہوں تنویر صاحب!" وہ اداس لہجے میں بولی۔ "کامران کے المیے نے میری زندگی سے سب کچھ نچوڑ لیا ہے۔ اب تو بس ایک ہی حسرت ہے کہ کبھی موقع مل جائے تو ان لوگوں کو چُن چُن کر بے نقاب کروں جو ہمارے معاشرے کی جڑوں میں زہر دے رہے ہیں۔"

"ہاں ہاں۔ بولتی رہو، رُک کیوں گئیں؟" اسے خاموش پا کر میں نے اضطراری لہجے میں ٹوکا۔ اتنی دیر کی گفتگو میں پہلی بار وہ ایک ایسے موضوع کی طرف آئی تھی جو میرے لیے دلچسپی سے بھرپور تھا۔

"کامران میرے سامنے ہے۔ اس لیے میں اس کے حوالے سے سوچتی ہوں۔" وہ پُرخیال لہجے میں بولنے لگی۔ "لیکن اس جیسے نجانے کتنے ہوں گے جو بھول میں یا دانستہ نشے کے ہاتھوں برباد ہو گئے۔ میرا بس چلے تو ان سب کو سنگسار کرا دوں جو دولت کی ہوس میں نشہ آور چیزوں کا گھناؤنا دھندا کرتے ہیں۔ کالج کے فنکشن میں میں نے پہلی بار سرگرمی سے حصہ لیا تھا کیوں کہ اس میں انسدادِ منشیات کے مذاکرے کا پروگرام بھی شامل تھا۔ اگر ایسے حریص لوگوں کا پتہ عام ہو جائے تو پھر کیسے چرس، افیم اور کوکین مل سکے گی۔ اپنی زندگی میں اگر کسی ایک آدمی کو بھی اس جرم میں پکڑوا سکی تو میں سمجھوں گی کہ میں نے اپنا مقصد پا لیا۔"

میں ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ "پھر سب سے پہلے مجھے سزایاب کراؤ۔"

اس بار وہ بُری طرح چونکی تھی۔ "کیوں؟"

"اس لیے کہ میں قانون اور معاشرے کا مجرم ہوں۔" میں نے لبھی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "یہ اعتراف میں کسی کے سامنے نہیں کر سکتا لیکن تمھیں یہ جان کر حیرت نہیں ہونی چاہیے کہ میں بھی منشیات فروش ہوں۔"

"آپ جھوٹے ہیں، میں نہیں مان سکتی۔" وہ بے یقینی کے انداز میں بڑبڑائی۔ "آپ اس وقت جذبات کی رو میں بہکے ہوئے ہیں اور ہر قیمت پر مجھے اپنانے پر تُل گئے ہیں اسی لیے ناکردہ گناہوں کا بوجھ اپنے سر تھوپنے پر آمادہ ہیں لیکن آپ بھول گئے ورنہ شاید کسی قتل کا اعتراف کرتے۔ میں کسی چور، قاتل، بدمعاش یا شرابی کے ساتھ تو گزارا کر سکتی ہوں لیکن کسی منشیات فروش کے ساتھ ہرگز نہیں۔ میری خاطر آپ اپنی ذات کو اتنا آلودہ نہ کریں۔"

"میں کماتا بھی ہوں. . . لُٹاتا بھی ہوں۔" میں نے اگنیشن آن کرتے ہوئے بوجھل لہجے میں کہا۔ "لیکن اپنی تنہائی میں کسی کو شریکِ سفر بنانے کے بارے میں کبھی نہ سوچ سکا کیوں کہ میں دوہری زندگی گزار رہا ہوں۔ میرا ظاہر کسی آئینے کی طرح شفاف ہے لیکن باطن دھندلایا ہوا ہے۔ یہ نہ جھوٹ ہے اور نہ جذبات کی رو میں کہی ہوئی کوئی سرسری بات۔"

وہ حیرت سے میری طرف دیکھتی رہی جیسے میں اس کے لیے کوئی عجوبہ رہا ہوں پھر اُداس لیکن تحیرزدہ لہجے میں بولی۔ "میرے لیے یہ بات ناقابلِ یقین ہے لیکن آپ سنجیدہ ہیں۔ اگر مناسب سمجھیں تو دل کا بوجھ ہلکا کر لیں، میں یقین دلاتی ہوں کہ آپ کی یہ گفتگو ہمیشہ ایک راز بن کر میرے سینے میں دفن رہے گی۔"

میں نے اگنیشن آف کر دیا۔ میرے ذہن میں اپنے ماضی کا ایک ایک لمحہ یوں مجسم ہونے لگا جیسے کسی اسکرین پر ان واقعات کی فلم چلا دی گئی ہو۔ عسرت زدہ گھرانے میں بڑی ماں اور دو سوتیلے بھائیوں کے ظالمانہ سلوک سے ماں کی خودکشی تک میں نے اختصار کے ساتھ سارے واقعات اسے سُنا دیے۔ وہ حیرت، صدمے اور بے یقینی کے عالم میں میری کہانی سُنتی رہی اور جب میں لاہور سے روانگی کا ذکر کر کے خاموش ہوا تو وہ جھرجھری لے کر چونک پڑی۔

"یقین نہیں آتا۔" وہ غور سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "میں تو سمجھتی تھی کہ میری زندگی صدموں اور عدم تحفظ کا شکار رہی ہے۔ دوسروں کا ماضی ایسا نہیں ہو سکتا لیکن آپ مرد ہوتے ہوئے بدترین امتحانات سے گزرے ہیں۔ سچ ہے کہ جب تک انسان دوسروں کے دُکھوں کی راکھ نہ کریدے، اپنی یادوں کی چنگاریوں ہی میں سلگتا رہتا ہے۔"

"وہ میری زندگی کا پہلا باب تھا۔" میں نے بھاری لہجے میں کہا۔ "جو مکمل شکست پر ختم ہو گیا اور میں انسانیت کی اعلیٰ قدروں کو فراموش کر کے محض زندہ رہنے کی حیوانی خواہش دل میں لیے کراچی چلا آیا اور جرائم کے راستے پر پڑ گیا۔ بے یقینی کے اس دور میں ایک شخص نے معقول مستقل آمدنی کا سُنہرا خواب دکھا کر مجھے اپنے چنگل میں لے لیا اور آج تک میں اسی کے لیے کام کرتا چلا آ رہا ہوں، فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے میں چرس بیچتا تھا، اب ہیروئن کا کاروبار چلاتا ہوں۔"

"تو وہ پلاسٹک فیکٹری؟" وہ مجسم سوال بن گئی۔

"ناجائز آمدنی کے لیے بس ایک جائز آڑ سمجھ لو اُسے۔" میں نے بوجھل مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "اس کی داغ بیل بھی کالے دھن ہی سے ڈالی گئی تھی اور آج وہ ایک بااعتبار ادارہ ہے۔"

"آپ تنہا ہیں۔ جب ایک آبرومند بنیاد قائم ہو گئی ہے تو منشیات فروشی سے کنارہ کش کیوں نہیں ہو جاتے؟ یہ تو سب سے بڑی لعنت ہے۔ اس کے شکار سسکتے ہوئے ڈھانچوں کی طرح زندگی گزارتے ہیں۔ کیا ان کے بارے میں کبھی سوچا ہے، آپ نے؟"

"اتنی شدت کے ساتھ تو نہیں۔ لیکن سوچا ضرور ہے۔" میں نے کہا۔ "میں خود اُکتا گیا ہوں۔ الگ ہونا چاہتا ہوں لیکن الگ نہیں ہو سکتا۔ جس دن اس ارادے کا اظہار کر بیٹھا، شاید وہ میری زندگی کا آخری دن ثابت ہو۔"

"اوہ . . ." وہ گہرا سانس لے کر بولی۔ "تو کسی بڑے گروہ کے چکر میں پھنسے ہوئے ہیں آپ؟"

"مجھے آج تک یہی پتا نہیں چل سکا کہ میں کن لوگوں کے لیے کام کرتا ہوں۔ وہ بس ایک آواز ہے جس کی میں برسوں سے تعمیل کرتا چلا آرہا ہوں۔ نیچے والوں کو اچھی طرح جانتا ہوں، اوپر والوں سے لاعلم ہوں۔"

وہ پھر چونک پڑی۔ چند ثانیوں تک بے اعتباری سے میری طرف دیکھتی رہی پھر بولی۔ "وہ ایک آواز ہے۔ اور آپ اس دن کالج کے فنکشن میں ایک آواز ہی سُن کر چونکے تھے بلکہ میں خوفزدہ کہوں تو شاید غلط نہ ہوگا .... تو کیا آپ کو سکندر علی کی آواز کی بنا پر شُبہ ہوا تھا کہ وہی آپ سے کام لیتا رہا ہے؟"

"اب ہمارے راز مشترک ہیں۔ تمھارا اندازہ دُرست ہے۔" میں نے آہستگی سے کہا۔ "تمھارے کالج کے سووینئر میں میری فیکٹری کا تہنیتی اشتہار دیکھ کر وہ خائف ہوگیا تھا کہ کہیں میں نے اس کی تقریر سُن کر اُسے پہچان نہ لیا ہو۔ اسی شبہے کی تصدیق یا تردید کے لیے اس نے ایک بہانہ تراش کر فنکشن کے بیرونی شرکا کی فہرست مرتب کرائی تھی اور تم نے فہرست سے میرا نام حذف کر کے مجھے ایک بہت بڑی دشواری سے بچالیا ورنہ وہ میرے پیچھے لگ گیا ہوتا۔"

"مم... مگر آپ نے تو حوصلہ افزائی کے بجائے اسے میری غلطی قرار دیا تھا۔" میرے پے در پے انکشافات نے اسے پریشان کر دیا تھا۔ "مجھ سے یہاں تک کہا تھا کہ میں فہرست میں تصیح کرا دوں۔"

مَیں دھیمے سے مسکرا دیا۔ "وہ ابتدا تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس مرحلے پر تمھارے ذہن میں میری طرف سے کوئی شُبہ پیدا ہو۔ تصیح کا مشورہ دینے کے بعد دوسرے ہی سانس میں مَیں نے تمھیں اس کے مضمرات سے آگاہ کر کے روک بھی دیا تھا۔"

"اوہ خدا! تو اس کا مطلب ہے کہ سکندر علی بھیڑ کے روپ میں بھیڑیا ہے ...؟"

"شش ...؟" میں نے اسے درمیان ہی میں ٹوک دیا۔ "مُردہ لوگوں کو بُرا نہیں کہتے۔"

"ہائیں؟ وہ مر گیا؟" وہ غیر ارادی طور پر تقریباً چیخ ہی پڑی۔ غنیمت یہ تھا کہ اس وقت اس ساحلی گوشے کی ویرانی میں کچھ اور اضافہ ہوگیا تھا ورنہ آس پاس سے کوئی بھی اس کی آواز سُن کر ہماری طرف متوجہ ہو سکتا تھا۔

"آج شام کے اخبارات میں اس کے قتل کی خبر موجود ہے۔" میں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

"کس نے قتل کیا اسے؟" غزالہ کی سرسراتی ہوئی، تجسس آمیز آواز میں خوف کا عنصر پیدا ہوگیا۔

"کوئی اور نہ وار کرتا تو شاید یہ کام میرے ہاتھوں سرانجام پاتا۔" غزالہ کا ردِعمل دیکھتے ہوئے میں نے اس مرحلے پر سچ سے گریز کرتے ہوئے بے پروایانہ لہجے میں کہا۔ "اگر میرے لیے ان لوگوں سے نجات دشوار ہے تو میں ان میں شامل رہتے ہوئے ان کی بیخ کنی تو کر سکتا ہوں۔"

"اب تو اس کی ضرورت نہیں رہی ہوگی۔" اس نے استفسارانہ لہجے میں کہا۔

میں اس کی خام خیالی پر ہنس دیا۔ "سکندر علی میرا سربراہ ہونے کے باوجود اس بساط کا ایک مہرہ تھا۔ اس کی باگ ڈور کسی اور کے ہاتھ میں تھی۔ اب وہی میری توجہ کا مرکز بنے گا۔"

"مجھے اب تک یقین نہیں آرہا ہے کہ ... میں کوئی خواب نہیں دیکھ رہی۔" وہ تھکے ہوئے لہجے میں بولی۔ "آپ کی تو کہانی عجیب و غریب ہے، میرے لیے یہ بہت سنسنی خیز تجربہ ہوگا کہ آپ کے ساتھ کسی گروہ میں شامل ہو کر اس کے مفادات کے خلاف کام کیا جائے۔"

میرے دل میں مسرت کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ اس نے بالواسطہ الفاظ میں اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا تھا۔ میں نے انجن اسٹارٹ کیا اور کار واپسی کی راہ پر ڈالتے ہوئے بولا۔ "یہ لوگ بے حد منظم ہیں خود اندھیرے میں رہ کر سارا کام چلا رہے ہیں۔ کوئی افتاد آتی ہے تو نیچے والے اس کا شکار ہوتے ہیں۔ قانون ان کے سامنے بے بس ہے۔ انھیں بے دست و پا کر کے مجھے بہت خوشی ہوگی لیکن یہ کام بہت صبر آزما ہے۔ فی الحال ان کی صفوں میں اپنی جگہ برقرار رکھنے کے لیے مجھے ان کی ہدایات پر چلنا ہوگا ...؟"

"مجھے گھر کے قریب ہی اُتاریں۔ آج بہت دیر ہوگئی ہے۔" اس نے کہا۔ "لیکن کل شام میں گھر پر آپ کا انتظار کروں گی۔"

"تمھارے والدین کو اعتراض نہیں ہوگا؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"میں آج ہی اُنھیں اپنے فیصلے سے آگاہ کر دوں گی۔" اس کا لہجہ قدرے تلخ ہوگیا۔ "اس کے بعد اعتراض کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جائے گی۔ ان کا خوف اس وقت تک تھا جب میں سنجیدہ نہیں تھی۔"

تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد اس نے پھر میری مصروفیات کے بارے میں گفتگو چھیڑ دی اور میں اس کے سارے سوالات کے دُرست جوابات دیتا رہا۔ پُوری گفتگو میں مَیں نے اس سے صرف ایک ہی بات چھپائی تھی کہ سکندر علی کا قاتل مَیں خود تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس مرحلے پر اتنا بڑا انکشاف کہیں اس کا سارا جوش ہی ٹھنڈا نہ کر دے۔

○

غزالہ سے اس دوٹوک گفتگو نے میری کائنات ہی بدل کر رکھ دی۔ یوں تو جب سے میں نے اسے پہلی بار اپنے دفتر میں [illegible]ابدہ کے ساتھ دیکھا تھا، وہ میری نگاہوں میں سما گئی تھی اور میں اکثر [illegible]ں کے بارے میں سوچتا رہا تھا لیکن اس کی خوشنودی حاصل ہو جانے کے بعد مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میری بے کیف زندگی میں چانک رنگ ہی رنگ کھل اُٹھے ہوں۔

اس سے پہلے میری زندگی میں صنفِ نازک کی کوئی وقعت نہیں رہی تھی۔ ہمیشہ سے اسے ایک کھلونا سمجھتا آیا تھا پھر جن کو میں نے جانا تھا، ان کا کردار بھی کراہیت آمیز تھا۔ ظاہری چمک دمک اور سکوں کی کھنک کہیں بھی ان کے قدموں کی زنجیر بن جاتی تھی۔ ان سے وقتی بہلاوے کے علاوہ میں کبھی کوئی آسودگی حاصل نہیں کر سکا تھا لیکن غزالہ نے پہلی بار مجھے چاہنے اور چاہے جانے کی لذت سے روشناس کیا تھا۔ اسے گھر کے قریب چھوڑنے کے بعد مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اس سے پہلے میں بالکل ہی بے مقصد زندگی گزار رہا تھا۔ دنیا میں کوئی ایسا نہیں تھا جس کے جذبوں اور تمناؤں کا مرکز صرف اور صرف میری ذات ہوتی لیکن اب زندگی کے یہ تیور بدلنے والے تھے۔

خوشی کی بات یہ تھی کہ ہمارے درمیان کوئی دیوار باقی نہیں رہی تھی اور شاید وہ گھر سے باہر بھی میری سرگرمیوں میں ہاتھ بٹانے کے لیے پُوری طرح تیار تھی۔

میں اس حسین شام کی یادوں میں کھویا ہوا بستر پر دراز تھا کہ اچانک ٹرانسمیٹر ریسیور پر کال سگنل موصول ہونے لگا۔ میں نے آپریٹس آن کر دیا۔ دوسری طرف سے سی۔ ون اپنے سی۔ کنگ کے نفرہ کوڈ سے مجھے پکار رہا تھا۔

"ڈی۔ ٹو ریسیونگ .... اوور۔" میں نے دو بار اس کی کال سُننے کے بعد جواب دیا۔

"تمھیں ان چیزوں کا طریقۂ استعمال یاد ہے نا، جو جیوا ہاؤز میں تمھاری تحویل میں دی گئی تھیں؟ اوور۔" اس نے سوال کیا۔

"یاد ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "لیکن میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ ایکسرے مشین کا کیا مصرف ہوگا؟ اوور۔"

"وقت آنے پر سب معلوم ہو جائے گا۔ فی الحال تمھیں جیوا ہاؤز پہنچنا ہے۔ دس بجے ایم۔ ٹی تھری ہنڈرڈ پر کوئی اہم کال آئے گی۔ اوور۔"

"ایم۔ ٹی تھری ہنڈرڈ؟" میں نے حیرت سے دہرایا۔ "یہ کس چیز کا ذکر کر رہے ہو تم؟ اوور۔" مجھے سکندر علی سے معلوم ہو چکا تھا کہ ایم۔ ٹی تھری ہنڈرڈ ایک وسیع حیطۂ عمل کا مواصلاتی آپریٹس تھا لیکن سی۔ ون نے وہ سامان میرے حوالے کرتے ہوئے اس مخصوص نام کے بجائے اس کے لیے ٹرانسمیٹر کا نام استعمال کیا تھا۔ لہٰذا میں نے اس نام پر حیرت کا اظہار ضروری سمجھا تھا کیونکہ وہ چالاک لوگ تھے اور ان سے کچھ بعید نہیں تھا کہ کب اور کس طرح میرا امتحان لے بیٹھتے۔

"ایم۔ ٹی تھری ہنڈرڈ وہ ٹرانسمیٹر ریسیور کہلاتا ہے جو میں نے جیوا ہاؤز پہنچایا تھا۔ دس بجے تم اسے آن کر کے کال کے منتظر رہو گے۔ اوور۔"

"اور اس کا انٹینا؟ اوور۔" میں نے سوال کیا۔

"اس کا مائکرو اسکوپک انٹینا بہت طاقت ور ہے، اس کے لیے تمھیں کچھ نہیں کرنا ہوگا .... اوور۔"

"لیکن وہ کال کس کی ہوگی؟ میں اسے کس طرح پہچانوں گا؟ اوور ...؟"

"تمھارے لیے صرف اتنا کافی ہے کہ وہ کال ایم۔ ٹی تھری ہنڈرڈ پر آئے گی۔" اس نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ "مجھ سے جو کچھ کہا گیا وہ میں نے تم تک پہنچا دیا ہے ... اوور اینڈ آل۔" آپریٹس پر صرف ریڈیائی شور باقی رہ گیا تھا لہٰذا میں نے اسے آف کر دیا۔

میں نے رسٹ واچ دیکھی تو میرے پاس بہت کم وقت رہ گیا تھا لہٰذا میں نے لباس تبدیل کیا اور جیوا ہاؤز کے لیے روانہ ہوگیا۔

اس عمارت کے محافظ اس وقت بھی اپنی جگہوں پر مستعد تھے۔ ان میں خوبی یہی تھی کہ کسی کی موجودگی یا غیر حاضری کی پروا کیے بغیر فرض شناسی کے ساتھ اپنا کام سرانجام دیتے رہتے تھے، لہٰذا پہلے ہی ہارن پر عمارت کا پھاٹک کھول دیا گیا۔

کار پورچ میں چھوڑ کر میں عمارت میں داخل ہُوا اور کمرہ نمبر تین کا قفل کھول کر بدقت تمام فوٹو سیل کی زد سے بچ کر اندر داخل ہوگیا۔ مجھے اس حفاظتی آلے کی تنصیب کا علم تھا لہٰذا میں تو اس کی زد سے بچنے میں کامیاب ہوگیا تھا لیکن مجھے پورا یقین تھا کہ بے خبری میں اندر داخل ہونے کی کوشش کرنے والا کوئی بھی شخص اس سے نہیں بچ سکتا تھا۔

اس کمرے میں ہر چیز جوں کی توں موجود تھی۔ نہ کیسٹ پلیئر چلا تھا اور نہ خود کار کیمرے کی فلم کا نمبر تبدیل ہوا تھا جس کا مطلب تھا کہ اس کمرے میں حسبِ توقع کسی قسم کی مداخلت نہیں کی گئی تھی۔

میں سگریٹ سلگا کر کمرے میں موجود سامان کا جائزہ لینے میں مصروف ہوگیا۔ خود کار کال ریکارڈر سی۔ ون اپنے ہاتھوں سے ایم۔ ٹی تھری ہنڈرڈ سے منسلک کر گیا تھا لیکن اس طاقت ور آپریٹس پر کسی رابطے کے آغاز سے پہلے اسے آن نہیں کیا گیا تھا۔ اس آلے میں یہ خوبی تھی کہ اگر اسے آپریٹس کے ساتھ آن کر دیا جاتا تو ایم۔ ٹی تھری ہنڈرڈ پر پیغام وصول ہوتے ہی ریکارڈر چل پڑتا اور تین منٹ بعد

خود بخود رُک جاتا۔ اس طرح میری غیر موجودگی میں بھی ان آلات پر میرے لیے ہدایات چھوڑی جا سکتی تھیں۔

ٹھیک دس بجے میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ آپریٹس آن کر دیا۔ وزنی، آہنی آلے پر مختلف علامتی روشنیاں نمودار ہوتے ہی بند کمرے کی محدود فضا میں ریڈیائی لہروں کا دھیما دھیما شور گونجنے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ اس بار تنظیم کے بڑوں میں سے کوئی مجھ سے مخاطب ہونے والا تھا اور یہ میرے لیے ایک نیک شگون تھا۔

"بی۔ ون کالنگ فار ڈی۔ ون۔۔۔۔ اوور۔" کچھ ہی دیر بعد ریڈیائی شور میں ایک دھیمی اور سپاٹ مردانہ آواز ابھری جس کا ایک ایک لفظ واضح تھا۔

"ڈی۔ ون ریسیونگ سر! اوور۔" میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ بٹن دبا کر اپنا جواب نشر کیا پھر فوراً ہی مجھے اپنی غلطی کا بھی احساس ہوا کہ مراتب کا تعین میں نے اپنے اندازے سے کیا تھا جس کی تصدیق سکندر علی سے ہوئی تھی جب کہ تنظیم کی طرف سے مجھے کچھ نہیں بتایا گیا تھا کہ آپس میں بڑے چھوٹے کی کیا شناخت ہوگی۔ بس اس رویّے کا ایک ہی جواز ہو سکتا تھا کہ ڈی۔ ون کے طور پر میں پہلے بی۔ فور کو جواب دہ تھا لہٰذا بی۔ ون بھی مجھ سے افضل ہو سکتا تھا۔

لیکن دوسری طرف سے میرے اس انداز پر توجہ نہیں دی گئی۔ "حالات ایک دم بگڑ گئے ہیں۔" ریسیور پر وہی دھیمی اور سپاٹ آواز گونج رہی تھی۔ "بی۔ فور کو ہلاک کر دیا گیا ہے۔ کچھ لوگ ہمارے پیچھے لگ گئے ہیں، اب سب کو محتاط رہنا ہوگا۔ کل نیشنل ہائی وے سے ٹرک نمبر پی آر صفر تین نو کے ذریعے ایک بڑی کھیپ آ رہی ہے۔ تمھارے آدمیوں کو ٹھیک پانچ بجے اٹھارہویں سنگ میل پر سیاہ رومال لہرا کر اسے روکنا ہے۔ ڈرائیور مرغ زریں کا حوالہ دینے والے کی ہدایات پر عمل کرے گا۔ اس مال کی فوری تقسیم کے بعد تم لوگوں کو کنارہ کش ہو جانا ہے۔ بقیہ ہدایات بعد میں ملیں گی۔ اس دوران میں تم ایم۔ ٹی۔ تھری ہنڈرڈ پر ہر شام سات بجے سے ساڑھے سات تک موجود رہو گے۔۔۔۔ اوور۔"

"میں سمجھ گیا سر!" میں نے سعادت مندانہ لہجے میں جواب دیا۔ "لیکن یہ نہیں سمجھ سکا کہ بی۔ فور کے دشمن کون ہو سکتے ہیں۔ ویسے آج شام کے اخبارات میں سکندر علی کے قتل کی خبر شائع ہوئی ہے۔۔۔ اس سے تو بی۔ فور کا کوئی تعلق نہیں تھا؟ اوور۔"

"شاید تمھیں یہ سن کر حیرت ہو کہ وہی تمھارا بی۔ فور تھا۔"

بی۔ ون کا جواب سنتے ہی میرے لبوں پر آسودہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ "اس نے اپنی ایک بڑی غلطی کی سزا بھگتی ہے۔ اگر اس کا فیصلہ التوا میں نہ ڈالا جاتا تو شاید قاتل کبھی اس تک نہ پہنچ پاتا۔ اب فکر اس بات کی ہے کہ قتل سے پہلے اس نے بی۔ فور سے نجانے کیا کچھ اگلوا لیا ہو۔۔۔۔ اوور۔"

میرے لیے یہ سمجھنا دشوار نہیں تھا کہ فیصلہ التوا میں ڈالنے کا کیا مطلب تھا۔ بی۔ ون کو خلش تھی کہ اس نے یا اس سے اوپر والوں نے فوری سزا کے بجائے سکندر علی کو زندہ کیوں رکھا۔ اگر طارق کی طرح اسے بھی مار دیا گیا ہوتا تو کم از کم باہر کا کوئی آدمی اس پر ہاتھ ڈالنے میں کامیاب نہ ہو سکتا۔

"ہم محتاط رہیں گے سر!" میں نے جواب دیا۔ "طارق کے بعد ہم کو دوسرا صدمہ پہنچا ہے یہ۔ اوور۔"

"طارق معمولی آدمی تھا۔" لہجہ قدرے بگڑ گیا۔ "اس کا صحیح وقت پر صحیح فیصلہ کر لیا گیا تھا۔ بی۔ فور کی اہمیت کسی فوری فیصلے میں مانع رہی۔ بہر حال ان باتوں سے تمھارا کوئی تعلق نہیں۔ تم اپنے کام سے کام رکھو۔ حالات کی نزاکت کے پیشِ نظر تمھیں فوری طور پر اختیارات دیے جا رہے ہیں۔ اب تم براہِ راست میرے تابع ہو گے۔ سی۔ ون تمھاری ہدایات اور مشوروں کے مطابق تم سے تعاون کرتا رہے گا۔ نچلے درجے پر مال کی تقسیم کا کام ڈی۔ ٹو کے سپرد کر دو۔ اب تم بی۔ فور اور وہ ڈی۔ ون کہلائے گا لیکن اسے اپنا نمبر ٹو منتخب کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ بدستور دوسرے لوگوں سے براہِ راست کام لیتا رہے گا۔۔۔۔ اوور۔"

"لیکن فی الحال توکل کی کھیپ کے بعد کوئی کام ہی نہیں رہے گا۔۔۔۔ اوور۔"

"ڈی۔ ٹو کے نیچے والوں کو اس صورتِ حال کا اندازہ نہ ہونا چاہیے۔ انھیں خوب صورتی سے اُلجھائے رکھنا ہوگا۔ یہ معاملہ میں تمھاری صوابدید پر چھوڑتا ہوں۔ اس وقت شہر میں سکون ہے لیکن اینڈکشن کیور سوسائٹی ہمیشہ انسدادی سرگرمیوں میں پیش پیش رہی ہے۔ سرکاری لیول پر بھی اسے تسلیم کیا جاتا ہے، تمھیں عطیات دے کر اس میں رسوخ حاصل کرنا ہے۔ سکندر علی اس کا تاحیات رکن بنا ہوا تھا۔ فرصت کے اوقات میں تم اس طرف توجہ دینے کے ساتھ ایشلے ہاؤز کے لیے آدمی تیار کرو کیوں کہ اگلے ہفتے مال روانہ ہونا ہے۔ اوور۔"

"بہتر سر!" میں نے جلدی سے کہا۔ "شاید آپ کو ماہرین کے اجلاس کی رپورٹ مل گئی ہوگی۔ وہاں جرمن نمائندے نے انکشاف کیا تھا کہ ڈاکٹر پی۔ جے۔ ڈالٹن کو مومن خان کے لیے کام کرنے پر آمادہ کرنے والی برطانوی نژاد لڑکی کا نام ویرا لائیڈ تھا جب کہ ٹوکیو میں مجھ سے معاملات طے کرنے والی کا بھی یہی نام تھا۔ یہ نکتہ مسلسل میرے ذہن میں چبھ رہا ہے۔ اوور۔"

"سوچنا اچھی بات ہے لیکن تم فضول بات پر سر کھپا رہے ہو۔ ویرا لائیڈ کے نام سے ملنے والی فرضی نام سے سفر کر رہی تھی۔ اگر ایشلے ہاؤز والوں کی رسائی مومن خان جیسے لوگوں تک ہوتی تو وہ ہم سے کاروبار کر رہے ہوتے۔"

اس کا جواب منطقی تھا لیکن میرا ذہن اس عجیب و غریب یکسانیت کو اتفاق تسلیم کرنے پر پھر بھی آمادہ نہ ہو سکا۔ اس کے لہجے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اس بات کو اہمیت دینے کو تیار نہیں لہٰذا میں نے مزید کسی سوال کا ارادہ ترک کر دیا۔

"شاید تم نے غور نہیں کیا کہ اس اجلاس میں شروع سے آخر تک بے سروپا گفتگو ہوتی رہی۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "بڑی طاقتوں کا بس چلے تو وہ دنیا میں رونما ہونے والی قدرتی آفات کا الزام بھی ایک دوسرے پر عائد کرنے لگیں۔ اب تم ایک نمبر نوٹ کر لو۔ یہ لاہور کا نمبر ہے۔"

اس کے الفاظ سنتے ہی میرا دل کھوپڑی میں دھمکنے لگا۔ اور جب اس نے نمبر بتایا تو میں حیران رہ گیا کیوں کہ اس نمبر پر میں ایک بیمار اور عمر رسیدہ عورت سے بذاتِ خود گفتگو کر چکا تھا۔ "اس پر انتہائی ہنگامی ضرورت کے تحت تم رات ایک سے تین بجے تک اپنے کوڈ کے تحت کوئی بھی پیغام دے کر ہدایات لے سکتے ہو۔۔۔۔ یہ خیال رہے کہ یہ نمبر بدترین حالات میں رہنمائی کے لیے ہے۔ بلاوجہ رابطے کی کوشش کرو گے تو عتاب کو دعوت دو گے۔ عام حالات میں ایم۔ ٹی۔ تھری ہنڈرڈ پر مجھ سے بات کر سکتے ہو۔"

ان ہی موضوعات پر مختصر سی وضاحتی گفتگو کے بعد بی۔ ون نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

میرے لیے وہ کال بہت اہم ثابت ہوئی تھی۔ سب سے پہلی بات یہ تھی کہ سکندر علی کے قتل نے انھیں بوکھلا کر رکھ دیا تھا اور وہ حفظ ماتقدم کے طور پر کاروبار سے عارضی طور پر دستبردار ہونے کے لیے تیار ہو گئے تھے لیکن ان کے عزائم بدستور بلند تھے۔ دوسری طرف ویرا لائیڈ کے نام کی دو جگہ موجودگی نے مجھے جس اُلجھن میں ڈالا ہوا تھا وہ اوپر والوں کو بھی ہونی چاہیے تھی لیکن بی۔ ون نے اس نکتے کو جس سرسری انداز میں بھگتانے کی کوشش کی تھی اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ عقل سے بالکل عاری ہے مگر وہ تنظیم کا ایک ذمے دار رکن تھا۔ اپنے نازک فرائض کی بنا پر اس کی ذہانت ہر شبہے سے بالاتر تھی۔ اس سے ایک ہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا کہ وہ مجھے اس راز میں شریک کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ ویرا لائیڈ اور اس کی سرگرمیاں اس وقت میرے لیے ثانوی نوعیت کی تھیں، فوری اہمیت اس بات کی تھی کہ ان لوگوں کا طریقۂ کار بتدریج سامنے آتا جا رہا تھا۔ شہر میں باہر سے مال کی ترسیل براہِ راست بی۔ ون کی ذمے داری تھی۔ شہر پہنچنے تک ڈرائیور کو بھی علم نہ ہوتا کہ دوسرے مال میں چھپائی ہوئی ہیروئن کہاں پہنچانی ہے بلکہ مجھے تو یہ بھی شبہ ہونے لگا تھا کہ ڈرائیور کو کچھ خاص تھیلوں کا علم تو ہو سکتا تھا، لیکن یہ معلوم نہ رہا ہو کہ وہ بالائی علاقے سے ان تھیلوں میں کیا لے کر چلا ہے پھر شہر سے اٹھارا میل پرے سی۔ ون کے آدمی ڈرائیور سے مل کر کسی محفوظ مقام پر مال کے تھیلے حاصل کر لیتے اور ان ہی میں سے کوئی وہ مال جیوا ہاؤز میں جہانگیر کے حوالے کر دیتا۔ ایک طرف پولیس، آبکاری اور دوسرے سرکاری محکموں کی زد سے محفوظ رہتے ہوئے یہ غیر قانونی مشاغل جاری تھے اور دوسری طرف اینڈکشن کیور سوسائٹی جیسے نیک نام اداروں میں گھس کر سرکاری اور نجی رجحانات پر کڑی نگاہ رکھی جا رہی تھی۔

مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ غزالہ میرے ساتھ مل کر اس صورتِ حال سے لطف اندوز ہوگی اور اس کے ساتھ مل کر میں اس تنظیم میں آخرکار ایسے منصب تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاؤں گا جہاں میرے ایک اشارے پر سارا نظام درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔

اے۔ ٹو کے بارے میں بھی معاملہ صاف ہو گیا تھا۔ شاید سکندر علی کو بھی وہ نمبر کسی آڑے وقت کے لیے دیا گیا تھا لیکن میں اس کی ڈائری سے وہ نمبر لے اُڑا۔ نمبر لاہور ہی کا تھا۔ اس کا مقصد تھا کہ خود کو مریض اور تنہا ظاہر کرنے والی عورت کا دامن صاف نہیں تھا۔ اس نے مجھ سے خود کہا تھا کہ وہ کسی مرد کے بغیر اس نمبر والے مکان میں رہتی ہے اور میں اس کے التجا آمیز لب و لہجے سے دھوکا کھا گیا تھا۔ رات کے ایک سے تین بجے کے دوران یا تو وہ خود اے۔ ٹو کے روپ میں پیغامات وصول کرتی تھی یا پھر رات کی تاریکی میں اس کا کوئی شناسا وہاں پہنچ کر اپنے معمولات نمٹاتا تھا۔ صورتِ حال جو بھی رہی ہو، سی۔ ون کے علاوہ ایک اور چہرہ میرے سامنے بے نقاب ہو چکا تھا۔ اب یہ میری سہولت پر منحصر تھا کہ میں اس پر کب ضرب لگانے کا فیصلہ کروں۔ جہاں تک الشین سنڈیکیٹ لمیٹڈ نامی کاروباری ادارے کا تعلق تھا، میں نے اسے بھلا دیا تھا۔ اس کے بارے میں لاہور پہنچے بغیر چھان بین آسان نہیں تھی۔

ایم۔ ٹی۔ تھری ہنڈرڈ سے منسلک کال ریکارڈر آن کر کے میں نے وہیں سے اپنے آپریٹس پر سی۔ ون سے رابطہ قائم کیا اور اسے اگلے دن آنے والے مال کے بارے میں بتاتے ہوئے یہ واضح کر دیا کہ مال دس بجے جیوا ہاؤز پہنچایا جائے کیوں کہ جہانگیر سے اگلی رات آٹھ بجے سے پہلے معمول کے مطابق رابطہ پیدا کرنا ممکن نہیں تھا۔

سی۔ ون نے میری ہدایات بہت سکون سے سنیں، اس کا کوئی جواب ایسا نہیں تھا جس میں بالادستی کے خاتمے کی جھلاہٹ پوشیدہ ہوتی۔ نہ ہی اس نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ مقررہ وقت پر کال وصول کر سکا تھا یا نہیں اور اگر بات ہوئی

تھی تو اس کا موضوع کیا رہا تھا۔ اس سے بات کرنے کے بعد میں تین نمبر کمرے سے نکل آیا۔

میں اپنے خیالات کی رو میں کھویا ڈرائنگ روم میں پہنچا تو میرے قدم زمین میں گڑ کر رہ گئے کیوں کہ کمرے کے وسط میں جیوا ہاؤز کا ایک محافظ مجھ پر پستول تانے کھڑا تھا۔

"تین نمبر ممنوعہ علاقہ ہے ڈپٹی صاحب! تم ادھر کیوں گئے تھے؟" اس نے سرد اور لاتعلقانہ لہجے میں سوال کیا۔

اسے پستول بدست دیکھ کر پہلے تو میری کھوپڑی ہی بھڑک اٹھی تھی لیکن اس کا سوال سنتے ہی میرا غصہ اُبلنے سے پہلے ٹھنڈا پڑ گیا۔ "اگر وہ ممنوعہ ہے تو تم نے اندر داخل ہوتے ہوئے مجھے روکنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟"

"احکام سب کے لیے ہیں۔" وہ اسی لہجے میں بولا۔ "ہمیں علم نہیں تھا کہ تم خلاف ورزی کی نیت لے کر آئے تھے۔ مجھے افسوس ہے کہ اب تمھیں باس کی آمد تک یہیں ہماری قید میں رہنا ہوگا۔"

"میں پورے اختیار کے ساتھ تین نمبر میں گیا تھا۔" اپنی غلطی کا احساس کرتے ہوئے میں نے نرم لہجے میں کہا۔ "جہانگیر سے بات کر لو تمھیں خود ہی غلط فہمی کا اندازہ ہو جائے گا۔"

"ہمیں ان کے گھر فون کرنے کی اجازت نہیں ہے۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولا، دوسرا اس کے قریب مشینی انداز میں خاموش اور ساکت کھڑا ہوا تھا۔ مجھے اپنی حماقت پر تاؤ آنے لگا۔ اگر میں سی۔ ون کا پیغام ملتے ہی جیوا ہاؤز کی طرف دوڑ لگانے سے پہلے جہانگیر سے بات کر لیتا تو وہ محافظوں کو باخبر کر دیتا اور یوں سبکی کی نوبت نہ آتی۔

"میں بات کرتا ہوں اس سے۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور فون کی طرف بڑھ گیا۔

نمبر ملتے ہی دوسری طرف سے ریسیور اُٹھا لیا گیا۔ بولنے والا جہانگیر خود تھا۔ میں نے بِلا کسی تمہید اسے بتا دیا کہ میں اس وقت جیوا ہاؤز کے کمرہ نمبر تین میں داخلے کے جرم میں محافظوں کی حراست میں ہوں۔

"تم وہاں کیوں گھسے؟" جہانگیر کی آواز میں تشویش اُمڈ آئی۔ "وہ ممنوعہ علاقہ ہے۔ غنیمت ہے کہ سلمیٰ اس وقت لاہور سے آئے ہوئے کچھ مہمانوں کے ساتھ فلم دیکھنے گئی ہوئی ہے ورنہ میں تم سے کھل کر بات بھی نہ کر پاتا۔"

"حکم کی تعمیل کی ہے میں نے۔" میں نے کنکھیوں سے چند قدم دور کھڑے ہوئے محافظوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا پھر آواز دھیمی کر کے بولا۔ "تم چاہو تو تصدیق بھی کر سکتے ہو... شاید میرے لیے کسی خطرناک کام کا آغاز ہو ہی چکا ہے۔"

"یہ یاد رکھنا کہ غلط بیانی ثابت ہو گئی تو میں خود تمھیں [illegible] لوں گا۔" اس کا لہجہ تنبیہہ آمیز ہو گیا۔ "میں تمھاری کسی حماقت [illegible] سے اپنی گردن نہیں پھنسواؤں گا۔"

"تم بے فکر رہو۔ غلط بیانی ثابت ہو تو گولی ہی مار دینا۔" [illegible] نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

ریسیور پر جہانگیر کا ایک گہرا سانس اُبھرا پھر آواز آئی۔ "[illegible] ریسیور نورے کو دے دو۔"

نورا ریسیور کان سے لگائے چند سیکنڈ تک دوسری طرف سے ہدایات سنتا رہا پھر ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر اس کے ساتھی نے اپنا پستول جھکا لیا اور میں تیزی سے باہر نکلتا چلا گیا۔

جہانگیر نے میری ہمدردی میں مجھ سے کسی خطرناک مہم کا [illegible] کر کے میرے لیے ایک ایسا بہانہ فراہم کر دیا تھا جو اس وقت [illegible] نمبر میں میرے داخلے کا مؤثر جواز بن گیا تھا ورنہ دوسری صورت میں جہانگیر میری طرف سے کھٹک سکتا تھا۔ یہ سوچتے ہوئے میں کار چلاتے ہوئے پہلے موڑ سے گھوما تو ایک اسٹریٹ لائٹ کے نیچے ویران سڑک پر ایک عورت کو کھڑے دیکھ کر چونک پڑا اور اگلے ہی لمحے میرے دل کی دھڑکنیں تیز تر ہو گئیں کیوں کہ وہ چہرہ نہ صرف میرا شناسا تھا بلکہ وہ ہاتھ ہلا کر گاڑی رکوانے کی کوشش کر رہی تھی۔

وہ علاقہ اتنا مصروف اور محفوظ نہیں تھا کہ اتنی رات گئے کوئی جوان عورت ویران سڑک پر یوں تنہا نکل پڑنے کی ہمت کرتی۔ اگر وہ کسی سے مل کر لوٹ رہی تھی تو اس کے میزبانوں کو عورت ہونے کے ناتے اس کے ساتھ کم از کم اتنی اخلاقی مروت برتنا چاہیے تھی کہ اسے کچھ دُور مصروف شاہراہ تک چھوڑ دیتے جہاں سے باآسانی کوئی سواری مل سکتی تھی۔ میرے لیے یہ فرض کرنا محال تھا کہ کار نشینوں کی اس آبادی میں اس کے ملاقاتی اس وقت اپنے اخلاق کے مظاہرے کے لیے کسی کار سے محروم رہے ہوں گے۔

جیوا ہاؤز سے یوں تو شہر جانے والی مصروف شاہراہ پر نکلنے کے کئی راستے تھے لیکن وہاں سڑکیں خراب تھیں یا راستہ طویل تھا۔ اس وجہ سے جیوا ہاؤز میں آمد و رفت کے لیے مجھ سمیت ہر ایک وہی راستہ اختیار کرتا تھا۔ مجھے فوری طور پر یہی خیال ہوا کہ وہ میری واپسی کے انتظار میں وہاں کھڑی تھی اور اس نے میری گاڑی پہچان کر ہی روکنے کا اشارہ کیا تھا۔

اس کا مقصد جو کچھ بھی ہو، اسے پہچانتے ہی میرے ذہن میں تجسس بیدار ہو چکا تھا۔ میں نے اس کے قریب گاڑی روک کر پسنجر سیٹ کی کھڑکی کا شیشہ اُتار دیا۔

[illegible] آپ شہر جا رہے ہوں تو مجھے بھی راستے میں اُتار دیں۔" اس [illegible] کھڑکی تک جھک آیا اور کار میں دھیمی دھیمی خوشبو کی آنچ گردش [illegible] لگی۔ مقدر کی عجیب ستم ظریفی تھی کہ چند ہی دن میں میں اس [illegible] طرح واقف ہو چکا تھا لیکن اس کے لیے میرا چہرہ تک ناآشنا [illegible] میں نے مسکراتے ہوئے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور وہ پھرتی [illegible] دروازہ کھول کر میرے برابر والی نشست پر جم گئی — میں نے [illegible] سے کار آگے بڑھا دی۔

"بڑا عجیب علاقہ ہے یہ۔" وہ زیادہ وقت ضائع کیے بغیر [illegible] بعد ہی بول پڑی۔ "کافی دور سے چلی آ رہی ہوں لیکن دور تک [illegible] سواری کا پتا نہیں ہے۔ اکیلی عورت کو دیکھ کر تو ہر کوئی شیر ہو [illegible] ہے۔" اس نے بڑی معصومیت کے ساتھ اپنی تشویش کا [illegible] کرتے ہوئے میرے ذہن میں منفی خیالات اُبھارنے کی [illegible] کوشش کی۔

"اکیلی عورت اور پھر آپ جیسی۔" میں نے اس کے خوبصورت [illegible] پر نگاہ ڈالتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"میرا نام رخشی ہے۔" مجھے خوشی ہوئی کہ اس نے مجھے اصل نام [illegible] بتایا تھا۔ سکندر علی کے مکان میں میں چہرے پر نقاب منڈھ کر [illegible] چور کے روپ میں داخل ہوا تو وہ بھی میری زد میں آئی تھی۔ اس [illegible] میں نے اسے سکندر علی کی سکریٹری سمجھ کر انتقامی سلوک کیا [illegible] اور محض ہیرا پھیری کے بجائے بھرپور ڈکیتی کا ارتکاب کر بیٹھا [illegible] لیکن سکندر علی نے مرنے سے قبل مجھ پر اس کی اصلیت کا راز [illegible] فاش کر دیا تھا کہ سکریٹری یا مالک کے روپ میں وہ اوپر والوں کی طرف [illegible] سے مسلط کی گئی ایک نگراں تھی اور اسی نے چوری کی اطلاع اُوپر [illegible] پہنچا کر سکندر علی کی تباہی کی داغ بیل ڈالی تھی جس کے نتیجے میں وہ [illegible] ہو کر سکندر فارمز کے ویرانے میں پناہ لینے پر مجبور ہو گیا لیکن وہاں [illegible] میری زد میں آ کر اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ اس اعتبار سے وہ میرے [illegible] اہم تھی کہ سکندر علی سے اوپر والوں کی معتمدِ خاص تھی اور بی۔ فور [illegible] بارے میں اپنی رپورٹ انھیں پہنچاتی رہی تھی۔

وہ سکندر علی کو نگل چکی تھی۔ اس کے بعد بی۔ فور کا منصب [illegible] مل چکا تھا۔ شاید اسی وجہ سے وہ پورے ہتھیاروں سے لیس [illegible] میرے سامنے آئی تھی کہ میں اس کی اداؤں کا شکار ہو جاؤں اور [illegible] تنظیم کا کوئی بڑا مجھے اس آشنائی پر ملامت کرنے کے بعد مجھے [illegible] ناک کھونٹے ڈالنے کا حکم صادر کر دے۔ اس طرح میرا ایک ایک لمحہ اور [illegible] ہر مصروفیت تنظیم کے تابع ہو کر رہ جاتی۔

میں جانتے ہوئے بھی انجان بن کر اس سے نمٹنا چاہ رہا تھا اور [illegible] ان چند لمحوں کو امر بنانے کے لیے ذاتی تعارف پر اُتر آئی تھی جیسے [illegible] واقعی اس سے ناواقف ہوں۔ میں اسے ذرا بھی شبہے کا موقع دیے بغیر اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہتا تھا۔

"ایک سہیلی سے ملنے آئی تھی۔ وہ بے چاری خود شہر چھوڑتی لیکن اس کی کار کا سلف خراب ہو گیا۔ دھکا لگا کر کار اسٹارٹ کرنا چاہی تو کلچ میں گڑبڑ ہو گئی اور میں فاصلے کا اندازہ کیے بغیر اپنے زعم میں ٹیکسی کی تلاش میں چل پڑی۔" بولتے بولتے وہ دلربایانہ انداز میں ہنس پڑی۔ "یہ سب تو بس بہانے تھے ورنہ مقدر میں آپ سے ملنا تھا... ویسے آپ کیا کرتے ہیں؟"

"جو کرنا پڑے، کر لیتا ہوں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"آپ تو خاصے دلچسپ آدمی ہیں۔" وہ بے تکلف ہونے کی نیت سے بلاوجہ قہقہہ مار کر بولی۔ "بڑی ذومعنی باتیں کرتے ہیں۔"

"اس کا ایک ہی مطلب ہے رخشی صاحبہ!" میں سڑک کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "ملازمت کرتا ہوں، جو سیٹھ چاہتا ہے، کرنا پڑتا ہے۔"

"دوستی کے بارے میں کیا خیال ہے آپ کا؟" اس بار وہ ہنسی نہیں تھی لیکن آواز میں مٹھاس تھی۔

"لڑکیوں سے دُور رہتا ہوں، اسلام پسند ہوں۔" میں نے سنجیدگی برقرار رکھی مگر وہ کھل اُٹھی۔

"اسلام پسند تو میں بھی ہوں بلکہ مسلمان ہوں لیکن کیا سارے اسلام پسند آپ ہی جیسے ہوتے ہیں؟"

"بحث نہیں۔" میں نے سختی سے اسے ٹوک دیا۔ "آپ یہ فرمائیں کہ کہاں اترنا پسند کریں گی؟"

"جہاں آپ چاہیں۔" اس نے دلآویز لہجے میں کہا اور میں خاموشی سے سر ہلا کر رہ گیا۔

وہ اطمینان سے بیٹھی رہی اور میں نے کار کی رفتار بڑھا دی۔ چند منٹ بعد میں نے کلفٹن سے شہر جانے والی بارونق شاہراہ پر سُپر مارکیٹوں سے گھرا ہوا چوراہا گھوم کر کار روکی تو وہ چونک پڑی اور استفہامیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

"میرا خیال ہے کہ یہاں سے آپ کو سواری مل جائے گی۔" میں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

"آپ دلآزاری کر رہے ہیں میری۔" وہ غصیلے لہجے میں بولی۔

"دوبارہ ملاقات ہوئی تو دلجوئی بھی کر لوں گا۔ اس وقت میں پریشان ہوں اور تنہائی چاہتا ہوں۔" میں نے اس سے پیچھا چھڑانے کی نیت سے عاجزانہ لہجے میں کہا اور وہ مجھے پھاڑ کھانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے کار سے اُتر گئی۔ غصے میں اس نے کار کا دروازہ پوری طاقت سے بند کیا تھا جیسے اسے میرے منہ پر مارا ہو۔

میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے اپنی کار کا انجن بند کر دیا۔ میں اس سے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت رکھائی سے پیش آنا

رہا تھا کیوں کہ مجھے پورا یقین تھا کہ وہ جس انداز میں مجھ سے ٹکرائی تھی اس کے پیشِ نظر اسے آسانی سے میرا پیچھا نہیں چھوڑنا چاہیے تھا اور میں خود بھی اس موقع کو گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ میرے نزدیک اس کی ذات سی۔ ون سے زیادہ اہم تھی۔ اگر وہ میرے داؤ میں آ جاتی تو میں اس سے بہت کچھ اگلوا سکتا تھا۔

انجن بند ہوتے ہی وہ تیر کی طرح دوبارہ کار کی کھڑکی پر آ گئی تھی "کیا اب یہاں تماشا بنانے کا ارادہ ہے؟" اس کا چبھتا ہوا لہجہ ملامت آمیز تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ میری پرانی شناسا رہی ہو۔

"یہ پوچھنا بھول گیا تھا کہ دوبارہ ملاقات کہاں ہو سکے گی؟" میں نے ڈھٹائی سے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اس وقت میں پراگندہ ذہنی کا شکار نہ ہوتا تو تم مجھے بہت دلچسپ آدمی پاتیں۔"

اس نے بے پروایانہ انداز میں اپنا سر جھٹکا اور دروازہ کھول کر دوبارہ کار میں بیٹھ گئی۔ میرے خشک رویے میں رونما ہونے والی تبدیلی سے اس کی خود اعتمادی بحال ہو گئی تھی۔ "غنیمت ہے کہ تمھیں جلدی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ اب سیدھے نکل چلو، مجھے صدر میں کسی مناسب جگہ پر اُتار دینا۔" میرا اندازِ تخاطب بدلتے ہی وہ بھی آپ سے تم پر آ گئی۔

"پہلے ہی بتا دیا ہوتا تو کیا بگڑ جاتا۔" میں نے انجن اسٹارٹ کر کے کار آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال تھا کہ تم عقل مند آدمی ہو۔" اس کا بگڑا ہوا موڈ تیزی سے بحال ہو چکا تھا۔ "اپنی منزل تمھاری مرضی پر چھوڑنے کا مقصد یہ تھا کہ فی الحال میرا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔"

"یہ ماننا ذرا مشکل ہے۔" میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "بے گھروں کا ایسا حلیہ نہیں ہوتا۔"

"تمھارے نہ ماننے سے میری صحت پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا۔" وہ بے پروایانہ لہجے میں بولی۔ "حقیقت یہ ہے کہ ان دنوں میں اپنے ایک دوست کے ساتھ رہ رہی ہوں۔ آج چابی اسی کے پاس ہے اور وہ بارہ ایک بجے سے پہلے گھر نہیں لوٹتا۔ مجھے یہ وقت تو کہیں نہ کہیں گزارنا ہی پڑے گا۔"

"اوہ" میں نے پُرخیال انداز میں ہونٹ سکوڑ کر سیٹی بجاتے ہوئے کہا۔ "تالا کھولنا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے لیکن اس وقت مجھے واپسی کی عجلت ہے، پتا بتا دو تو دلجوئی کے لیے کل کسی وقت خود تمھارے گھر پہنچ جاؤں گا۔" میں باتوں ہی باتوں میں اس کا ٹھکانہ معلوم کرنا چاہ رہا تھا۔

"ایسی غلطی بھی نہ کر بیٹھنا۔" وہ جلدی سے بولی۔ "میرا دوست یہ بات بالکل بھی برداشت نہیں کرے گا کہ مجھ سے کسی اور کے اتنے قریبی مراسم ہوں کہ وہ میرے ساتھ گھر تک لگا چلا آئے۔"

"پھر بھی رات کے بارہ ایک بجے گھر آتا ہے۔" میں نے ... لہجے میں کہا۔

"اس کا اپنا فعل ہے۔ میں اس کی بیوی تو ہوں نہیں جو اس کی بے اعتدالیوں پر روک ٹوک کر سکوں۔" اس نے بے پروایانہ لہجے میں کہا۔ "یہی کافی ہے کہ اس نے مجھے اپنے یہاں پناہ دی ہوئی ہے۔"

"پھر تمھارا گزارا کیسے ہوتا ہے؟" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"بڑے احمق ہی ہو۔" وہ قدرے جھینپتے ہوئے لہجے میں بولی۔ "اتنی گفتگو کے بعد بھی اس سوال کی ضرورت باقی رہ گئی تھی؟" وہ بلا کی چالاک عورت تھی۔ اس نے پہلی ہی ملاقات میں بے تکلف ہونے کے ساتھ یہ بھی ظاہر کر دیا تھا کہ وہ بے گھر ہے۔ اس کا کھلا مطلب یہی تھا کہ وہ مجھے دعوت دے رہی تھی کہ مجھ میں ہمت ہو تو میں اسے اپنے ساتھ رکھ لوں۔

اپنا موجودہ پتا وہ نہایت ہوشیاری کے ساتھ گول کر گئی تھی لیکن اس وقت اچانک ہی مجھے خیال پیدا ہوا کہ کہیں وہ سی۔ ون کے ساتھ نہ رہ رہی ہو۔ سکندر علی کی مخبری پر زخشی ... تھی اور اسے معزول کر کے گوشہ نشینی پر مجبور کرنے کے ذرائع ... سی۔ ون نے سرانجام دیے تھے۔ خود سکندر علی نے مجھے بتایا تھا کہ بی۔ فور کے طور پر جن لوگوں سے اس کا رابطہ تھا ان میں سے سی۔ ون اور زخشی کے علاوہ کسی کو اس کی دوہری شخصیت کا علم نہیں تھا اس طرح سی۔ ون اور زخشی کے مابین مفاہمت کے واضح امکانات موجود تھے۔

مجھے یاد آیا کہ جب میں نے سکندر علی کی خواب گاہ سے ملنے والے سی۔ ون کے نمبر پر فون کیا تھا تو دوسری طرف سے ایک نسوانی آواز سنائی دی تھی۔ مجھے یقین ہونے لگا کہ وہ آواز زخشی ہی کی رہی ہو گی۔ اس وقت میرا ذہن اس امکان کی طرف متوجہ نہیں تھا لہٰذا میں اس کی آواز پہچان ہی نہ سکا۔

پھر میں نے دانستہ خاموشی اختیار کر لی۔ یہ بات یقینی تھی کہ وہ کسی کی ہدایت پر میرے پیچھے لگی تھی، ایسی صورت میں میں گریز بھی کرتا تو وہ خود ہی دوبارہ مل بیٹھنے کی راہ نکالنے کی کوشش ضرور کرتی۔

"تو پھر کل مل رہے ہو؟" پل سے گزرتے ہوئے وہ میری توقع کے عین مطابق سوال کر ہی بیٹھی۔

"کل میں مصروف ہوں۔" میں نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔ "اسی لیے پتا معلوم کر رہا تھا تاکہ جیسے ہی فرصت ملے، خود ہی تمھارے پاس پہنچ جاؤں۔"

"اور پرسوں کے بارے میں کیا خیال ہے؟" اس نے پوچھنے

لہجے میں پوچھا۔

"پھر وہی کٹ حجتی۔" میں نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔ "میں تمھیں بتا ...ں کہ سیٹھ کی نوکری کرتا ہوں۔ اگر پرسوں سیٹھ نے کسی بیگار ...ت دیا تو تم میرے انتظار میں اپنا سر پیٹتی رہ جاؤ گی۔"

...ہ سوچ میں پڑ گئی۔ کار تیزی کے ساتھ فریئر ہال کے سامنے ...رتی چلی گئی۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ پنچھی کو اپنے جال میں ...نے کے لیے اس کے پاس وقت بہت کم رہ گیا ہے۔ اگلے دو ...ڑنے کے بعد کار الفنسٹن اسٹریٹ پر جا نکلتی اور اسے بادلِ ... کہیں نہ کہیں اُترنا ہی پڑتا۔

بڑی عجیب صورتِ حال تھی وہ بھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے ...شکار سمجھ رہے تھے اور دامن بچاتے ہوئے اپنی اپنی گھاتوں ...روف تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ میرے عزائم سے بے خبر ...ب کہ میں اس کے ارادوں سے بخوبی واقف تھا لہٰذا میں ...کون تھا لیکن اس کا اضطراب لمحہ بہ لمحہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

میٹروپول کے چوراہے سے گزرتے ہوئے وہ بول ہی پڑی۔ ...نے ایک فون نمبر بتایا تھا۔ نمبر میرے قیاسات کی سو فی صد ...ر رہا تھا کیوں کہ سکندر علی کی ڈائری سے ملے ہوئے چاروں ...مجھے زبانی یاد تھے۔ اس نے جو نمبر بتایا وہ بلا مبالغہ سی۔ ون ...تھا۔

"جب فرصت ہو تو اس نمبر پر رِنگ کر لینا۔" وہ کہہ رہی ...اسی وقت کوئی پروگرام طے کر لیں گے۔ تم بھی عجیب آدمی ہو، ...شان دار کار میں گھوم رہے ہو اور نوکری ایسے سیٹھ کی کرتے ...ن کے مزاج کا پتا نہیں ہوتا۔"

"حکم کی تعمیل کے بجائے مزاج شناسی شروع کر دوں تو شاید ...ی کے ساتھ اسی لمحے کار بھی چھن جائے۔ سیٹھ لوگ اکثر سنکی ...خود پسند ہوتے ہیں۔ اپنا اُلّو سیدھا کرنے کے لیے ان کی ہاں ...ہاں ملانا ہی پڑتی ہے۔"

"تو یوں کہو کہ درباری ملازمت ہے تمھاری۔" اگلی ملاقات کا ...پروگرام طے ہو جانے کے بعد وہ مطمئن نظر آنے لگی تھی لہٰذا اس کا ...لہجہ خاصا جان دار تھا۔ میں خاموشی کے ساتھ اس کی طرف دیکھ ...رہ گیا۔

وہ ایلفی کی اس گلی کے نکڑ پر اُتر گئی جہاں ایک ہوٹل واقع ہے ...میں سیدھا نکلتا چلا گیا۔ اس نے فون نمبر دے کر میری مشکل آسان ...تھی ورنہ میں فیصلہ کر چکا تھا کہ اتارنے کے بعد اس کے ...ٹھکانے کا سراغ لگانے کے لیے اس کا پیچھا کروں گا۔

ایم اے جناح روڈ سے شاہراہِ قائدین ہوتا ہوا میں گھر ...پہنچا تو باہر جہانگیر کی سیاہ سیلون دیکھ کر بے اختیار میرے حلق سے ایک گہری سانس آزاد ہو گئی۔ دن میں وہ اپنے دفتر میں مجھ سے خاصی بے تکلفانہ گفتگو کر چکا تھا۔ برسوں پرانے اعتماد کی تجدید کے بعد شاید اسے توقع ہو چلی تھی کہ میں تنظیم کے معاملات میں عام طریقۂ کار سے ہٹ کر اسے سب کچھ بتا دوں گا۔ اس کی بیوی اپنے ہی رشتے داروں کے ساتھ فلم دیکھنے گئی ہوئی تھی اور اسے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ میں جیوا ہاؤز کے تین نمبر میں داخل ہوا تھا لہٰذا وہ اپنے تجسس پر قابو نہ رکھ سکا اور مجھ سے پہلے ہی میرے گھر آ کر جم گیا تھا تاکہ مجھ سے تین نمبر کے اسرار دریافت کر سکے۔

وہ ڈرائنگ روم میں جوتوں سمیت سینٹر ٹیبل پر پاؤں پسارے اطمینان سے بیٹھا تھا۔ کار کے انجن کی آواز سن کر بھی اس نے اٹھنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی شکایتی لہجے میں بول پڑا۔ "کہاں چلے گئے تھے وہاں سے؟ خاصی دیر کر دی گھر پہنچنے میں۔"

"مزے مزے سے ڈرائیونگ کرتے ہوئے آیا ہوں۔" میں نے صوفے میں گرتے ہوئے کہا۔ "یہ بتاؤ کہ تم اس وقت یہاں کیسے نظر آ رہے ہو؟"

"تم تین نمبر میں کیا لینے گئے تھے؟" اس نے تجسس آمیز سرگوشیانہ لہجے میں سوال کیا۔

"دوستی اپنی جگہ ہے لیکن ان معاملات میں کوئی بے احتیاطی کر کے میں اپنی گردن نہیں پھنسوانا چاہتا۔" میں نے کم و بیش اسی کے الفاظ اسے لوٹا دیے۔ "یہ غنیمت ہوا کہ تم نے جیوا ہاؤز والوں سے میری گلوخلاصی کرا دی ورنہ صورتِ حال خاصی اُلجھ جاتی۔"

میرا جواب سن کر وہ سٹپٹا گیا۔ "یہ نہ بھولو کہ میں دوست کے علاوہ تمھارا باس بھی ہوں۔ تمھیں مجھ سے اتنی راز داری برتنے کی کیا ضرورت ہے۔ اسٹینڈ بائی ہونے کے باوجود تم مجھ ہی کو جواب دہ ہو۔"

"میں خود حیران ہوں کہ تین نمبر میں میرا کیا کام تھا۔" میں نے اٹکنے کے بجائے سادگی سے کہا۔ "گیا اور آدھے گھنٹے رُک کر باہر آ گیا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ صرف یہ دیکھنا چاہتا ہو کہ میں اپنے اس عجیب تجربے کا ذکر کس کس سے کرتا ہوں۔"

"کس کی ہدایت پر گئے تھے وہاں؟" اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اُلجھن آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"ڈی۔ ون نے فون پر حکم دیا تھا۔" میں نے بلا توقف کہہ ڈالا اور اس کا چہرہ اُتر گیا۔

"آج نیا مال آیا ہے۔" اس نے تھوڑے سے توقف کے بعد کہا۔ "پڑیاں اس بار چھوٹی ہیں۔ چھ چھ روپے میں سب بٹتی ہو جائیں گی لیکن کام بڑھنے کے ساتھ میری تشویش میں بھی دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔"

"غنیمت ہے کہ تمھیں کتوں اور مسلح محافظوں کا تو سہارا ہے۔

میں تو ہر وقت ہی کھلے نشانے پر ہوں۔ تم بتا ہی چکے ہو کہ ڈی۔ ون مجھے کسی خطرے میں جھونکنے کا فیصلہ کر چکا ہے۔"

"وہ اور بات ہے۔" اس کی آواز پھر رازدارانہ ہو گئی۔ "طارق کے بعد ہم ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ مجھے ڈر پولیس کی طرف سے ہے۔ کسی وقت زد میں آگیا تو میری پوزیشن کیا ہو گی؟ تمہارا اندازہ بالکل دُرست نکلا۔ سکندر علی کے قتل پر پولیس پوری قوت کے ساتھ حرکت میں آئی ہے۔ شہر کے سات بڑے منشیات فروش اندر کر دیے گئے ہیں۔ چھوٹے موٹے کسی گنتی ہی میں نہیں ہیں۔ یوں سمجھو کہ اسے کسی ڈی آئی جی کا قتل سمجھا جا رہا ہے اور اعلیٰ حکام بذاتِ خود تفتیش میں دلچسپی لے رہے ہیں۔"

"اوپر والے غافل تو نہ ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ ان سنگین حالات میں وہ خود بھی چند روز کے لیے اپنی سرگرمیاں ترک کر دیں۔ ایسے حالات میں معمولی اہلکار بھی عموماً کوئی بڑا کارنامہ کر گزرتے ہیں۔"

اس موضوع پر کچھ دیر تک تبادلۂ خیال کرنے کے بعد وہ واپس چلا گیا اور میں اگلی صبح کے بارے میں غور کرنے لگا۔

سکندر علی کو قتل کرنے تک مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کا عہدہ مجھے ملنے والا تھا لیکن حالات نے اتنی تیزی سے پلٹا کھایا تھا کہ میں اپنی ترجیحات کا تعین بھی نہیں کر سکا تھا۔ فی الوقت تنظیم کی طرف سے میرے ذمے ایک کام تھا کہ ہیروئن کی برآمد کے لیے آدمی تیار کر دوں، اس کے علاوہ ساری الجھنوں کا تعلق میرے منصوبے سے تھا۔

سی ون میرے سامنے تھا۔ زخشی اس کے ساتھ رہ رہی تھی۔ اس کے دیے ہوئے فون نمبر اور سکندر علی کے مکان سے ملنے والے نمبر میں ذرا بھی فرق نہیں تھا۔ اس نمبر کے ذریعے ان کا پتا بآسانی معلوم کیا جا سکتا تھا اور ان پر ہاتھ ڈال کر کارروائی آگے بڑھائی جا سکتی تھی۔ دوسری طرف ایشین سنڈیکیٹ لمیٹڈ کے بارے میں خاصے کوائف موجود تھے لیکن مجھے وہاں کامیابی کی موہوم سی اُمید تھی۔ بظاہر وہ ایک کاروباری فرم معلوم ہوتی تھی۔ اگر اس کے مالکان میں سے کوئی بالا ہی بالا ہیروئن کی تجارت کا مرتکب ہو رہا تھا تو اس پر ہاتھ ڈالے بغیر نیچے والوں سے کچھ معلوم کرنا ناممکن تھا۔ بی۔ ون اور بی۔ ٹو کے فون نمبرز کو میں نے فی الوقت نظر انداز کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن اے۔ ٹو کا نمبر میرے لیے اہمیت اختیار کر گیا تھا۔ جب تک بی۔ ون نے وہ نمبر مجھے نہیں بتایا تھا میں اس بارے میں ہر شبہے سے بالا تھا۔ میں بے دھڑک اس نمبر پر ایک بوڑھی سے بات بھی کر چکا تھا لیکن بدلے ہوئے حالات میں ایسی کوشش مخدوش بھی ہو سکتی تھی۔

تنظیم کے خلاف کارروائی کے سلسلے میں تین سمتیں کھلی ہوئی تھیں۔ سی۔ ون اور زخشی، ایشین سنڈیکیٹ لمیٹڈ اور اے۔ ٹو۔۔۔ جب کہ میرے پاس صرف دو قابلِ اعتماد آدمی تھے۔ سلطان شاہ تو خیر تنخواہ دار جاں نثار بن چکا تھا لیکن آخری ملاقات کے بعد میں غزالہ کو بھی اپنا مددگار سمجھنے لگا تھا۔

میں خواب گاہ کی روشنیاں گل کیے کافی دیر تک اس بارے میں غور کرتا رہا لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔۔۔ میں نے اپنی پوزیشن بچائے رکھنے کے لیے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ جب تک میرا ہاتھ سب سے اوپر والے آدمی کے گریبان تک نہیں پہنچ جاتا، میں اپنی ذمے داریوں کو پوری مستعدی سے سرانجام دیتا رہوں گا۔

✻

اگلی صبح میرے ذہن میں سارے دن کی مصروفیات کا تانا بانا تیار ہو چکا تھا۔

سب سے پہلے میں نے ناشتے سے قبل ڈی۔ ون کی حیثیت سے جہانگیر کو فون کیا اور اسے ہدایت کی کہ حامد کے بارے میں تمام ممکنہ تفصیلات حاصل کر کے دس بجے ٹرانسمیٹر پر مجھ سے رابطہ قائم کرے۔

مجھے یہ تو معلوم تھا کہ طارق نے یونیورسٹی کی حدود میں ہیروئن کو متعارف کرانے کے لیے حامد نامی کسی طالب علم کو اپنے جال میں پھانسا تھا جس نے چند ہی روز میں قابلِ تعریف کارکردگی دکھائی تھی لیکن اس سے آگے اس کے بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ میرا خیال تھا کہ باہر مال بھیجنے کے سلسلے میں اِدھر اُدھر بھٹکنے کے بجائے حامد کارآمد ثابت ہو سکتا تھا لیکن اس پر بھرپور طریقے سے ہاتھ ڈالنے کے لیے اس کے بارے میں تفصیلی معلومات ہونی ضروری تھیں۔

دس بجے میں نے اپنے دفتر کی تنہائی میں جہانگیر کی کال ریسیو کی اور اس کی لمبی چوڑی کہانی سنتا رہا۔ حامد موتی دادا سے ہر شام سات بجے مال لینے آتا تھا۔ اس نے یونیورسٹی میں جبّار نامی ایک لڑکے کو اپنے ساتھ ملایا ہوا تھا جو حامد کی لاعلمی میں یونیورسٹی سے باہر بھی ہیروئن بیچنے لگا اور آخرکار اس علاقے کے ایجنٹوں کے ہاتھوں بری طرح مار کھا کر لالچ سے توبہ کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اس کے بعد وہ دونوں یونیورسٹی سے باہر شہر کے دوسرے کالجوں میں بھی پیر جمانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ شام کو چلنے والے ان مشہور کالجوں میں ان دونوں کی غیر متوقع پذیرائی ہوئی تھی کیونکہ وہاں تعلیم حاصل کرنے والے بیشتر طلبا زبردست معاشی دباؤ سے مجبور ہو کر دن میں کہیں ملازمت کرتے تھے اور دفتر سے واپسی پر اپنا تعلیم کا شوق

تھے۔ اس تھکا دینے والی دوہری مشقت کے باعث
پنے نامساعد ماحول سے بغاوت اور فرار کے رجحانات
نے لازمی تھے۔ یہی وجہ تھی کہ دوسرے کالجوں کے مقابلے
منشیات کے عادیوں کی تعداد قابلِ ذکر تھی اور وہ صرف
استعمال کرتے تھے جو انھیں باہر سے خریدنا پڑتی تھی۔
جبار سے پہلے ہیروئن کے اثرات کی کہانیاں ان کالجوں
چکی تھیں لہٰذا جب طلبا نے اس بالا نشیں نشے کو اپنی
موجود پایا تو فوری طور پر اس کی طرف راغب ہو گئے جس
ہیں ان دنوں حامد موتی دادا کے کارندوں میں اہمیت
رنے لگا تھا۔
بہت محنتی اور قابلِ اعتماد لڑکا ہے سر! موتی دادا اس
نیتوں سے بہت متاثر ہے۔ اس میں آگے بڑھنے کی
زہ لگن موجود ہے۔ اوور۔" جہانگیر نے اپنے اختتامی
ے کے ساتھ مجھے بولنے کا موقع فراہم کر دیا۔
گڈ۔" میں نے اس کی کوششوں کو سراہتے ہوئے کہا۔
بل کر یہ لڑکا ہمارے لیے کارآمد ثابت ہو سکتا ہے لیکن
اسے بھول جاؤ کیونکہ شہر میں حالات مخدوش ہو گئے
ج رات دس بجے جیوا ہاؤز میں ایک اور بڑی کھیپ
ڑیوں کی صورت میں پہنچ رہی ہے۔ اس کی تقسیم کے
لے احکام تک تم کنارہ کش رہو گے۔۔۔ اوور۔"
او۔ کے سر!" جہانگیر کی آواز ابھری جس میں ہلکی سی
یا ابھر آئی تھی۔ "کیا یہ حکم صرف میرے لیے ہے سر؟"

میں دل ہی دل میں اس کی حالت کے بارے میں سوچ
نا پڑا۔ مخدوش حالات کے حوالے سے میری ہدایت اس
واقعی تشویش کا باعث بن سکتی تھی کیونکہ طارق کو
رات کے باعث سب سے پہلے الگ تھلگ کیا گیا تھا پھر
پتہ ہی صاف کر دیا گیا تھا۔ جہانگیر یہ سوچنے میں قطعی
ب تھا کہ کہیں اپنی کسی لغزش کی بنا پر وہ کسی کی نگاہ
آگیا ہو اور اسی بنیاد پر فی الحال اسے جملہ سرگرمیوں سے
یا جا رہا ہو۔
تم سے متعلق سب لوگ اس ہدایت پر عمل کریں گے۔" میں
ٹن بٹن دبا کر ڈی۔ ون کی سنجیدہ آواز میں بولا۔ "اسی
تو تمہارے منصب میں اضافہ کیا جا رہا ہے۔ اب تم
ون کہلاؤ گے۔ آج سے میرا کوڈ بی۔ فور ہو گا۔ اس
تم اپنی ذات تک محدود رکھو گے اور اب میرے سوا کسی
کسی حیثیت میں تمہارا رابطہ نہیں رہے گا۔ اوور۔"

"میں سمجھ گیا سر!" جہانگیر کی آواز میں یک بیک مسرت آمیز ارتعاش پیدا ہو گیا۔ "اس اعتماد اور عزت افزائی کے لیے میں شکرگزار ہوں۔ میں کوشش کروں گا کہ میری وجہ سے کہیں کوئی دشواری پیدا نہ ہو۔ اوور۔"

"لیکن میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ تم نے آخر اپنے گھر پر حفاظتی انتظامات میں اچانک اضافہ کیوں کیا ہے؟ تمہارے احاطے میں رات بھر چراغاں کی سی کیفیت رہتی ہے۔ تم کس سے خوفزدہ ہو؟ اوور۔"

جہانگیر کا جواب فوراً نہیں آیا۔ لائن پر چند ثانیوں کے لیے سکوت چھا گیا پھر اس کی بوکھلائی ہوئی آواز ابھری۔ "مم۔۔۔ میں کسی سے خوف زدہ نہیں ہوں سر! بس ایسے ہی خیال آگیا تھا کہ بڑھتے ہوئے کاروبار کی بنا پر بازار میں کچھ نادیدہ دشمن بھی پیدا ہو سکتے ہیں جن سے تحفظ کا بندوبست ہونا چاہیے۔ ہیروئن سے بہت سے لوگوں کا دھندا بری طرح متاثر ہوا ہے۔ چرس کی مارکیٹ گر گئی ہے۔۔۔ بعض لوگوں نے تو یہ کھوج لگانے کی کوششیں شروع کر دی ہیں کہ تھوک داموں پر ہیروئن کہاں سے مل سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تھوڑے ہی عرصے میں کچھ اور لوگ بھی میدان میں آجائیں۔ اوور۔"

"یہ سب درست ہے لیکن اس طرح حفاظتی انتظامات کر کے تم نے اپنے گمنام دشمنوں پر اپنا خوف ظاہر کر دیا ہے۔ گھر کو قلعہ میں تبدیل کر کے تم خطرات کا سدِباب نہیں کر سکتے، وہ گھر سے باہر تم پر وار کر سکتے ہیں۔ اوور۔"

"میں اس بارے میں بھی سوچتا رہا ہوں سر!" اس کی آواز میں تکان کا عنصر پیدا ہو گیا۔ "میں چند روز میں اپنی کار بھی تبدیل کرنے والا ہوں۔ بلٹ پروف شیشوں والی ایک کار کا سودا ہو گیا ہے۔ دو چار روز میں بندرگاہ سے کلیئرنس ہوتے ہی مجھے ڈلیوری مل جائے گی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھے یہ فکر کیوں دامن گیر ہو گئی ہے؟ اوور۔"

"شاید طارق کی موت نے تمہارے اعصاب پر اثر ڈالا ہے۔ رفتہ رفتہ اعتدال پر آجاؤ گے۔ بلٹ پروف کار میں کوئی ہرج نہیں۔ وہ تمہارے وقار میں اضافہ کرے گی لیکن میرا مشورہ ہے کہ مسلح محافظوں کو ہٹا دو۔ چراغاں کی بھی ضرورت نہیں، کتے اندھیرے میں بھی اجنبی کی بو پر حملہ کر بیٹھتے ہیں۔ میں ہرگز یہ پسند نہیں کروں گا کہ میرا کوئی آدمی اپنی کسی بے اعتدالی کی وجہ سے دوسروں کی توجہ کا نشانہ بنے۔ کبھی کبھار میرے آدمی بھی صرف اسی لیے تمہارا تعاقب کرتے ہیں کہ تمہاری نقل و حرکت کی آزادی کا یقین برقرار رہے جس دن کوئی تمہاری طرف متوجہ

ہوا اسی دن تم دشواریوں میں پڑ جاؤ گے۔ اوور اینڈ آل۔“

میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ میں نے اسے جو مشورہ دیا وہ حقیقت پر مبنی تھا۔ دوستی کی وجہ سے اس کی سلامتی مجھے عزیز تھی اگر کسی دن اس کی احمقانہ احتیاطی تدابیر سے بھڑک جاتا تو شاید جہانگیر پر ہر وقت کوئی نہ کوئی مسلط کر دیا جاتا اور اس کل وقتی نگرانی کے نتیجے میں اس کی کوئی بھی کوتاہی اسے زیرِ عتاب لانے کا سبب بن سکتی تھی۔

جہانگیر کا تحفظ میرے لیے اس اعتبار سے بھی اہم تھا کہ تنظیم میں وہ میرے لیے سہارا ثابت ہو سکتا تھا۔ اکیلا رہ جانے کی صورت میں شاید میرا اعتماد کم ہو جاتا۔ ہم دونوں پر شہر کی مارکیٹ کا سارا دارومدار تھا۔ اس منفعت بخش منڈی کو برقرار رکھنے کے لیے اوپر والوں کو ہم دونوں میں سے ایک نہ ایک کی لازمی ضرورت تھی اور میں اس کمزوری سے اپنے مفادات کے لیے خاصا فائدہ اٹھا سکتا تھا۔

جہانگیر نے حامد کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا اس کی روشنی میں میرا پہلا فیصلہ یہ تھا کہ اس سے گھر پر ملاقات بے سود رہے گی۔ وہ تنظیم کا پوری طرح وفادار تھا۔ میں تنظیم کو درمیان میں لائے بغیر اسے کسی کام پہ آمادہ نہیں کر سکتا تھا، اس سے یونیورسٹی میں ملنے میں بھی خاصی قباحتیں تھیں جن میں سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہاں بہت سے دوسرے طلبا بھی یہ محسوس کیے بغیر نہ رہتے کہ جب حامد شہر میں رہتا ہے تو ایک اجنبی کو اس سے ملاقات کے لیے جامعہ کی دور افتادہ حدود میں آنے کی کیا ضرورت تھی۔

کراچی سے تین یورپی شہروں تک ہیروئن پہنچانے کے لیے میرا منصوبہ یہ تھا کہ حامد پر اپنی حیثیت ظاہر کیے بغیر اس وقت ہاتھ ڈالوں جب وہ موتی دادا سے مال لے کر لوٹ رہا ہو۔ ثبوت کی موجودگی میں اسے ذرا بھی دم مارنے کی جرأت نہ ہو گی اور وہ میری بلیک میلنگ کے دباؤ میں آکر میرے لیے کام کرنے پر مجبور ہو جاتا۔

اس سے ملنے کے لیے سات بجے کا وقت ہی مناسب تھا جب کہ اسی شام میں نے غزالہ کے گھر پہنچنے کا بھی وعدہ کیا ہوا تھا لہٰذا میں نے تین بجے اسے فون کیا۔ اتفاقاً دوسری طرف وہ خود موجود تھی۔ جب میں نے اسے بتایا کہ شام کے بجائے میں اسی وقت اس کے گھر پہنچ رہا ہوں تو وہ بخوشی میرے استقبال کے لیے رضامند ہو گئی۔

میں دفتر سے غزالہ کے گھر کے لیے روانہ ہوا تو میرے دل و دماغ میں عجیب سی ہلچل مچی ہوئی تھی۔ میں ماضی سے اپنا رشتہ توڑ چکا تھا۔ لاہور سے نکلنے کے بعد مجھے احساس رہا کہ جیسے میں جنم جنم سے تنہا ہوں۔ باپ کے قتل اور ماں کی خودکشی کے بعد دنیا میں کوئی ایسا نہیں رہ گیا تھا جسے میں اپنا سمجھتا یا اس پر ناز کرتا۔

نہ سوتیلے بھائی مجھے اپنانے کو تیار ہوئے تھے نہ ماں نے اپنی سوکن کے اکلوتے بیٹے کو قبول کیا تھا۔ میں رہا تھا کہ غزالہ میرے بارے میں اپنے والدین کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر چکی ہو گی۔ وہ لاکھ برے اور خود غرض سہی لیکن غزالہ ان کی بیٹی تھی۔ بیٹی کو بغاوت پر آمادہ دیکھ کر شاید انھوں نے خاموشی اختیار کر لی ہو لیکن مجھے پورا یقین تھا کہ وہ میرے ماضی کے بارے میں بہت کچھ جاننا چاہیں گے جب کہ خود میرے لیے اپنا ماضی ایک بہت بڑا سوالیہ نشان تھا۔

ریٹائرڈ اور تندخو باپ، کوکین خور ماں، اور پاگل بھائی پر مشتمل وہ گھرانا مجھے خوف آور سا محسوس ہو رہا تھا۔ ان کی کمزوریاں اپنی جگہ تھیں لیکن سوالی وہ نہیں تھے، میں ان کی بیٹی کا طلب گار تھا۔ ان کو پورا حق تھا کہ وہ اپنے ہونے والے داماد کے بارے میں ہر بات جاننے کی کوشش کرتے۔ میرے لیے کسی گھریلو امتحان سے دوچار ہونے کا وہ پہلا موقع تھا۔ عموماً سارے ہی شادی شدہ لوگ زندگی میں ایک بار اس مرحلے سے ضرور گزرتے ہیں اور بیشتر افراد کے لیے وہ زندگی کا پہلا اور آخری تجربہ ثابت ہوتا ہے لیکن میرا معاملہ مختلف تھا۔ میں کسی کو دھوکا نہیں دینا چاہتا تھا۔ میں نے اپنے بارے میں غزالہ کو سب کچھ بتا دیا تھا بجز قتل کی ایک واردات کے لیکن غزالہ اس بات کو ہرگز پسند نہ کرتی کہ میری زندگی کے منفی پہلو اس کے والدین کے سامنے بے نقاب ہوں اور انہیں سود و زیاں کے فلسفے کے تحت غزالہ کی بھرپور مخالفت کا موقع مل جائے۔

خیالات کے اس بے ربط اور گمبھیر ہجوم میں کھویا ہوا میں غزالہ کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچ گیا۔ مختصر احاطوں میں ایک دوسرے سے الگ تھلگ بنے ہوئے مکانات پر مشتمل وہ آبادی خاصی خوب صورت اور صاف ستھری تھی۔ میں نے سڑک کے کنارے بریک لگا کر ایک مرتبہ نیم پلیٹ پر لکھا ہوا نمبر دیکھا پھر شیشے چڑھا کر نیچے اتر آیا۔

پھاٹک کے ستون میں لگا ہوا کال بیل کا بٹن دباتے ہی اندر پختہ روش پر کسی کے قدموں کی آواز ابھری اور پھر پھاٹک کی ذیلی کھڑکی کھول دی گئی۔ اس خلا میں سے تانبے جیسی دمکتی ہوئی رنگت کی کھوپڑی والا ایک متوسط قامت لیکن ادھیڑ

عمر شخص نمودار ہوا جس کی آنکھوں میں شکوک و شبہات کی پرچھائیاں لرزاں تھیں۔

”کرنل زوار زیدی صاحب؟“ میں نے اس کی چبھتی ہوئی استفہامیہ نگاہوں کے جواب میں بوکھلا کر کہا۔ اس کے تیور دیکھتے ہوئے میں غزالہ کا نام بھی زبان پر لانے کی ہمت نہ کر سکا تھا۔

”میں ہی ہوں۔“ وہ مجھے سر سے پیر تک گھورتے ہوئے درشت آواز میں بولا۔ ”کیا بات ہے؟“

میرے دل کی دھڑکنیں یک بیک تیز ہو گئیں۔ آثار ایسے تھے جیسے میرا انٹرویو پھاٹک پر کھڑے کھڑے ہی ہو جائے گا۔ اگر وہی غزالہ کا باپ تھا تو مجھے امید نہیں رہی تھی کہ غزالہ اس سے اپنی بات منوا سکی ہو گی۔

ناامیدی کی اس لہر نے مجھے حوصلہ دیا۔ اگر نامراد واپس لوٹنا ناز میں چوہے کی طرح دم دبا کر کیوں لوٹوں۔ ”غزالہ میری دوست ہے۔ اس نے مجھے چائے پر بلایا ہے۔“

”ہوں۔“ اس کے حلق سے ایسی ذومعنی غراہٹ ابھری جیسے میں نے اس کے روبرو اپنے کسی سنگین جرم کا اعتراف کیا ہو۔ اسی لمحے میری نگاہوں میں تازگی کی لہر دوڑ گئی کیونکہ غزالہ تیزی سے دوڑتی ہوئی آئی تھی اور بے پروائی سے اپنے باپ کے برابر میں آکھڑی ہوئی تھی۔ اس نے زیرِ لب مسکرا کر مجھے سلام کیا پھر اپنے باپ سے مخاطب ہو گئی ”یہ تنویر ہیں ڈیڈی! جن کا میں نے آپ سے ذکر کیا تھا۔“ پھر باپ کی خشمناک نگاہیں دیکھ کر میری طرف گھوم گئی ”اندر آئیے نا۔ آپ باہر کیوں کھڑے ہیں؟“

”لڑکی!“ کرنل زوار زیدی غصیلے لہجے میں غرایا ”تم اندر جاؤ اپنی ماں کے پاس۔ یہ میرے ساتھ آ رہے ہیں۔“

غزالہ نے بے بسی سے میری طرف دیکھا پھر سر جھکا کر مایوسانہ انداز میں اندر چلی گئی۔

وہ خاموشی سے کھڑا رہا، شاید غزالہ کے اندر روپوش ہونے کا منتظر تھا۔ اس کی پشت مکان کی طرف تھی لیکن میں کھلی ہوئی ذیلی کھڑکی سے اندر تک دیکھ سکتا تھا۔ غزالہ نے برآمدے میں رک کر پلٹ کر میری طرف دیکھا اور نگاہیں چار ہوتے ہی ہاتھ لہرا کر مجھے اندر چلے آنے کا اشارہ کیا۔ کرنل زیدی میری آنکھوں میں پیدا ہونے والی چمک بھانپتے ہی پشت پر کسی گڑبڑ کا احساس کر کے تیزی سے پیچھے پلٹا تھا لیکن اس اثنا میں غزالہ ایک دروازے میں غائب ہو چکی تھی۔

”آؤ۔“ اس نے مڑ کر میری طرف دیکھے بغیر کہا اور اندر داخل ہو گیا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی۔ غزالہ کو دیکھ لینے کے بعد میری گھبراہٹ زائل ہو چکی تھی اور میں یک بیک اس صورتِ حال سے لطف اندوز ہونے لگا تھا۔

ڈرائنگ روم سادگی لیکن قرینے سے سجا ہوا تھا۔ غزالہ کا باپ اندر جا کر شاہانہ انداز میں ایک صوفے میں دھنس گیا۔ جب چند ثانیوں تک اس نے مجھے بیٹھنے کی پیش کش نہیں کی تو میں بھی ڈھٹائی کے ساتھ اس کے مقابل جم گیا۔

وہ مجھے پُرخیال انداز میں گھورتے ہوئے ناخن سے نئے سگار کا گوشہ کریدتا رہا پھر سر جھکا کر سگار سلگانے کے بعد پہلی مرتبہ نرم لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوا ”کل مجھے غزالہ سے معلوم ہوا لیکن تم نے اچھا نہیں کیا۔ وہ میری اکلوتی بچی ہے، ہمیں آرزو تھی کہ اپنی پسند سے دیکھ بھال کر اس کی شادی کرتے، لیکن کل میں اس کی زبان سے اس کا فیصلہ سن کر بھونچکا رہ گیا۔ وہ تم سے بہت زیادہ متاثر معلوم ہوتی ہے ورنہ اختلاف کے باوجود آج تک کبھی میرے سامنے زبان کھولنے کی جرأت نہیں کر سکی تھی۔“

میرے دل میں خیال آیا کہ اولاد کے ساتھ آمرانہ سلوک کے بارے میں اسے ایک ہلکا سا لیکچر دے ڈالوں۔ اسے بتاؤں کہ ناپختہ ذہن بچوں کے ساتھ ایسا سلوک کر کے والدین ذہنی طور پر انہیں بالکل تنہا اور لاچار چھوڑ دیتے ہیں جس کا نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ ہمدردی اور محبت کا پہلا بول آوارہ دست بن کر ان کے دلوں میں اتر جاتا ہے لیکن میں خاموش رہا۔ مجھے بڑی شدت سے یہ احساس تھا کہ اس وقت میں ایک ایسی لڑکی کے دل شکستہ باپ سے مخاطب ہوں جو اپنے انتخاب کا فیصلہ صادر کر چکی تھی۔

”تم کرتے کیا ہو؟“ وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا۔

”ایک چھوٹی سی پلاسٹک فیکٹری ہے میری۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

”صورت سے تعلیم یافتہ اور سلجھے ہوئے آدمی معلوم ہوتے ہو۔“ اس کی زبان سے پہلی مرتبہ وہ تعریفی الفاظ سن کر مجھے تسلی ہوئی کہ غزالہ کی محنت بالکل ہی رائیگاں نہیں گئی تھی بلکہ وہ کسی حد تک اپنے ادھیڑ عمر باپ کے دل میں اترنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

”کیا تم نے اپنا فیصلہ سوچ سمجھ کر کیا ہے؟“ تعریف کے بعد وہ پوچھ رہا تھا۔

”سوچ بچار نہ کی ہوتی تو شاید یوں آپ کے روبرو حاضر

ہونے کی جرأت نہ ہوتی مجھ میں۔" میں نے انکسار آمیز لہجے میں کہا۔" پھر غزالہ بھی بہت سمجھ دار ہے۔ اس نے کچھ سوچ سمجھ کر ہی میرے جذبے کو زبان دی ہے۔"

وہ میری طرف دیکھتا رہا۔ سگار کے چند گہرے گہرے کش لے کر کثیف دھواں فضا میں بکھیرتے ہوئے رازدارانہ لہجے میں بولا۔" شاید تم ہمارے گھریلو حالات سے باخبر نہیں ہو۔ چڑھتے ہوئے خون کا جوش آدمی کو اندھا کر دیتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ حقائق سے دوچار ہونے کے بعد تم ہم سے اکتا جاؤ۔ تمھیں کیا بتایا ہے غزالہ نے؟"

"آپ ریٹائرڈ ہیں۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔" کامران دس برس کی عمر سے ذہنی عدم توازن کا شکار ہے۔ بیگم صاحبہ کوکین کی عادت میں مبتلا ہیں۔ اس نے اپنا ذہن میرے سامنے کھول کر رکھ دیا تھا۔ شاید اس کے علاوہ کوئی بات نہیں رہ گئی ہے۔"

اس کا چہرہ اتر گیا اور وہ ایک گہرا سانس لے کر شکست خوردہ انداز میں صوفے کی پشت سے ٹک گیا۔" تو اس نے تمھیں شمع کی لت سے بھی آگاہ کر دیا۔" اس کی آواز کرب انگیز تھی جیسے میری زبان سے اپنی بیوی کی عادت کا سن کر اسے ذہنی طور پر شدید دھچکا لگا ہو۔

"یہ سب کچھ بتا کر وہ مجھے خود سے دور رکھنا چاہ رہی تھی۔" میں نے اسے دلاسا دینے کے لیے مدافعانہ لہجے میں کہا۔" لیکن یہ راز میرے سینے میں دفن رہے گا۔ یہ اچھا ہی ہوا کہ غزالہ نے بتا دیا اور بعد میں کسی بات کا کوئی خطرہ نہیں رہا۔"

"اگر تم دونوں اس حد تک ایک دوسرے کے رازوں میں شریک ہو تو شاید مجھے سوچنا ہی پڑے گا۔" وہ خود کلامی کے سے انداز میں ہولے سے بڑبڑایا۔" مجھے اس لڑکی کی طرف سے ہمیشہ سے خطرہ رہا ہے۔ اب تمہارے سامنے میں کبھی سر نہ اٹھا سکوں گا۔"

"ایسی کوئی بات نہیں کرنل صاحب!" میں نے جلدی سے کہا۔" میں نے کوئی بات طنز کے پیرائے میں نہیں کی۔ غزالہ اپنی نجی زندگی کے ان گوشوں سے خائف تھی ورنہ شاید مجھے کچھ بھی نہ بتاتی۔"

"لیکن تم نہیں تو تمہارا خاندان...!" اس نے کہنا چاہا لیکن میں نے اس کی بات درمیان ہی سے کاٹ دی۔

"میرا کوئی خاندان نہیں ہے کرنل صاحب!... اپنی ذات میں زندگی کے راستے کا تنہا مسافر ہوں۔ اچھا ساتھ مل جائے تو پھیکی اور بے روپ زندگی میں کچھ نکھار آجائے گا ورنہ جیسی تیسی گزر ہی رہی ہے۔"

اس کے لیے اپنی کمزوریاں ہی کافی تھیں لہٰذا اس نے اس انکشاف پر کسی حیرت کا اظہار نہیں کیا۔ غالباً غزالہ اسے پہلے ہر بات بتا چکی تھی لیکن وہ اپنے طور پر تسلی کرنا چاہ رہا ہو۔

"ہم معمولی لوگ ہیں تنویر میاں!" اس کی آواز کا سارا رخصت ہو چکا تھا۔" شمع خود اپنی عادت سے تنگ آچکی ہے۔ کوکین چھوڑنے کی ہر کوشش کے نتیجے میں اس کی حالت اس قدر غیر ہو گئی کہ مجھے خوف آنے لگا کہیں وہ بھی کامران کی طرح اپنا ذہنی توازن نہ کھو بیٹھے۔ وہ کوکین کی غلام ہو کر رہ گئی ہے۔ بدنامی کے خوف سے باقاعدہ علاج سے گھبراتی ہے۔ میں ریٹائرڈ آدمی ہوں، پنشن میں بمشکل گزر ہو پاتی ہے پھر شمع کے لیے کے طور پر سونے کے مول کوکین بھی خریدنا پڑتی ہے۔ ان حالات میں اپنی دلوں کی خواہشوں کے باوجود ہم غزالہ کو کچھ بھی نہ دے سکیں گے۔"

میں بے اختیار جھرجھری لے کر رہ گیا۔ وہ شخص یک بیک مجھے قابلِ رحم نظر آنے لگا تھا۔ جسموں کی منڈی سے ورثے میں ملی ہوئی کوکین کی عادت نے اس کی بیوی کے ذریعے اسے بھی نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔ کرخت آواز جو اپنی ذات کا بھرم قائم رکھنے کے لیے گونجتی تھی، مجبوریوں کا ذکر آتے ہی نقاہت کا شکار ہو گئی تھی۔

کوکین اس کی بیوی کو مسلسل تباہی کے ہولناک غار کی طرف لیے جا رہی تھی۔ بیٹے کا دماغ الٹ چکی تھی اور وہ ان زخموں کو سینے پر سجائے زندہ تھا۔ وہ معاشرے کا محض ایک المیہ تھا جہاں ایک نشے نے پورے گھرانے کی زندگی میں دکھوں اور تلخیوں کا زہر گھولا ہوا تھا۔ ہمارے گرد و پیش میں کتنے اور ایسے افسانے بکھرے ہوئے تھے۔

ہیروئن انسانوں کو اپنا غلام بنانے میں کوکین سے کہیں آگے تھی۔ اس کی ہر پڑیا ایک نئے المیے کی بنیاد بن رہی تھی یا پرانے زخموں کو ناسور میں بدل رہی تھی اور میں اس زہرِ ہلاہل کا تقسیم کنندہ تھا۔

یوں تو میں کئی بار اس غیر قانونی دھندے سے کنارہ کش ہونے کے بارے میں سوچ چکا تھا لیکن ہر بار محرکات ذاتی تحفظ، آزادی اور بے خوفی کے تصورات پر مبنی رہے تھے۔ یونیسکو کے زیرِ اہتمام ہونے والے اجلاس میں امریکی مندوب کے انکشافات سن کر ایک مرتبہ قومی حمیت بھی جوش میں آئی تھی کہ ہم عقل سے محروم کٹھ پتلیوں کی طرح ایک بڑی سازش کے آلۂ کار بن رہے تھے لیکن غزالہ کے مکان میں اس روز میں نے پہلی بار انسانی اخلاقی سطح پر اپنے پیشے سے کراہت محسوس کی۔

ے ذہن میں ہمیشہ سے یہ تصور جاگزیں تھا کہ میں نشے ت میں معاشرے کے ناآسودہ اور کچلے ہوئے طبقوں ں کی مسرت فراہم کرتا تھا۔ چرس اور ہیروئن کے دم لگا ے مارفین" اس جنت میں پہنچ جاتے تھے جہاں وہ ے کی ہر قید اور پابندی سے آزاد ہو کر اپنی ذات کی کائنات ایا سرور بن کر ڈوب جاتے تھے۔ اس روز حقیقی معنوں بار مجھے اندازہ ہوا کہ میں کتنی بڑی تباہی کا پیغام بر بنا ا۔ نہ جانے کتنے کامران اپنی ماؤں کی مجبوریوں کا زہر نگل ہمیشہ کے لیے دیوانگی کی بھیانک وادیوں میں جا تھے۔ نہ جانے کتنی شمعیں اس زہر سے اپنے وجود ہلاک کے سرِشام ہی چراغِ سحری کی طرح ٹمٹما رہی تھیں میں ان ہولناک پڑیوں کی طلب مستقل بڑھ رہی تھی۔ ی مایوسیوں اور محرومیوں کے سائے کس کس رخ سے ے کے ہونہار ذہنوں کو نگلے جا رہے تھے جب کہ بظاہر پھ بہت امید افزا نظر آتا تھا۔ لوگوں میں خوشحالی بھی وزگار کے مواقع بھی میسر تھے، خاندان کے بندھن کمزور پڑ رہے تھے لیکن ایک دوسرے کے دکھ درد میں شرکت بالکل ہی فنا نہیں ہوا تھا۔ ہر شخص برے وقت میں زیزوں یا ہمدرد دوستوں میں گھرا ہوا پاتا تھا، اخلاقی ندہ تھیں۔ دفا ابھی جنسِ نایاب نہیں ہوئی تھی مگر پھر بینا سے شمع تک ہر ایک نشے کا طلب گار تھا جو چرس تے تھے وہ اس میں لاکھوں کما رہے تھے، راکٹ بیچنے والوں دن رات فرصت نہیں تھی، ہیروئن نے آتے ہی جدید ہوا صلاتی اور دیگر ایجادات خریدنے کی قوت عطا کر دی یری عقل چکرانے لگی۔

شاید یہ مشینی عہد کا ایک آفاقی عذاب تھا جو انسانوں دڑ پر مسلط کر لیا تھا۔ مفلس سے سرمایہ دار تک ہر ایک ا طلب گار اور خریدار بنا ہوا تھا۔ کوئی سکون کے لیے چا رہا تھا اور کوئی اپنی محرومیوں کو چرس کے دھوئیں میں رہا تھا۔

مجھے کرنل زولر زیدی کی مسکین صورت پر رحم آنے لگا۔ ت کا نظام کس قدر عجیب اور نا قابلِ فہم تھا کہ اس نے ایک ی چیز کو کھلے بازار سے اٹھا کر اپنی چار دیواری کا تحفظ کیا تو نہ صرف اپنے ہم نفسوں کی ہمدردیاں کھو بیٹھا بلکہ ے کے ایڈکشن کے عذاب میں مبتلا ہو گیا۔

"میرے پاس خدا کا دیا سب کچھ ہے کرنل صاحب! وہ سب آپ کا ہے۔" میں نے جذباتی لہجے میں کہا۔" بیگم صاحبہ یہاں بدنامی سے خوفزدہ ہیں تو تفریح کے بہانے انہیں باہر لے جا کر علاج کرائیے۔"

کرنل کے ہونٹوں کے گوشے لرزنے لگے پھر اس کے حلق سے بھرائی ہوئی آواز برآمد ہوئی۔" تم بہت شریف لڑکے ہو تنویر میاں! شاید قدرت نے تمہیں فرشتہ بنا کر ہماری طرف بھیجا ہے۔"

"فرشتہ نہ کہیں۔" میں جلدی سے بولا۔" میں خود بہت گناہ گار ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ میری یہی خدمت میری ان گنت خطاؤں کے ازالے کا بہانا بن جائے۔"

میری نگاہوں میں ہیروئن کے فراق میں پاگلوں کی طرح اپنے جسموں کو نوچتے اور ہذیانی انداز میں حیوانوں کی طرح چنگھاڑتے ہوئے انسانوں کے غول ناچنے لگے۔ احساس کی بنیادوں میں کچوکے لگ رہے تھے لیکن میں بے بس تھا۔ اس کرب سے نجات کی ایک ہی صورت تھی کہ میں ہیروئن کی تجارت سے کنارہ کش ہو جاؤں لیکن یہ بے سود تھا۔ الگ ہوتا تو شاید وہ مجھے خاموشی سے مروا ہی دیتے اور میری جگہ کوئی نیا مہرہ استعمال کرنے لگتے۔ ان کا منظم کاروبار کسی روک ٹوک کے بغیر اسی طرح چلتا رہتا۔ ان کے ہاتھوں میں کھلونا بن کر میں برسوں سے جو کچھ کرتا چلا آ رہا تھا، اس کا کم از کم کفارہ یہی ہو سکتا تھا کہ ان کی صفوں میں اپنا اعتماد برقرار رکھتے ہوئے مناسب موقع پہ ان پر ایسی کاری ضرب لگاؤں کہ وہ بھیانک تنظیم ہمیشہ کے لیے فنا ہو جائے۔ اس آخری کوشش میں کامیابی کے لیے اگر مجھے جان بھی داؤ پر لگانا پڑتی تو اس وقت میں اس کے لیے تیار تھا لیکن خودکشی میرے بس سے باہر تھی۔

مجھے خوشی ہوئی کہ میرے اندر کا اچھا آدمی زندہ تھا۔ بس اسے بیدار کرنے کے لیے مناسب سی تدبیر کی ضرورت تھی جو غزالہ کی صورت میں تقدیر نے فراہم کر دی تھی۔ اچھی غزالہ بھی تھی لیکن حالات اور ماحول کی قیدی تھی۔ اپنے گھر میں بچپن سے جوانی تک پہاڑ جیسی عمر گزارنے کے باوجود کبھی اپنے والدین کا کرب نہیں سمجھ سکی تھی۔ انہیں کامران کی دیوانگی کا ذمے دار سمجھ کر ہمیشہ ان سے دل ہی دل میں نفرت کرتی رہی اور پھر یہاں تک رائے قائم کر لی کہ اس کی ماں اپنے مہنگے شوق کی خاطر کسی سرمایہ دار سے اس کا سودا کر کے داماد سے زندگی بھر زرِ تاوان وصول کرنا چاہتی ہے اور میں ایک مختلف ماحول میں اس کے باپ سے ذرا سی دیر کی گفتگو میں صحیح نتائج اخذ کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ دونوں بیٹے کے دماغ کو پہنچنے والے ناقابلِ تلافی نقصان پر اپنے ضمیر کے

مجرم بنے ہوئے تھے۔ غزالہ کی ماں کوشش کے باوجود کوکین چھوڑنے میں کامیاب نہیں ہوسکی تھی۔ طوائف ہونے کے طعنے سنتے سنتے وہ سب سے بچھڑ کر اکیلی رہ گئی تھی... شاید اس نے اپنا کوئی نیا معتقد بنالیا تھا اور کوکین خور کہلا کر اس رفاقت سے ہاتھ دھو بیٹھنے سے خوف زدہ تھی اور بے چارہ باپ اپنے تمام وسائل داؤ پر لگا کر اپنے مختصر سے کنبے کی منتشر اور متضاد اکائیوں کو یکجا رکھنے کی دل گداز کوششوں میں مصروف تھا۔

غزالہ چائے کی ٹرالی ڈرائنگ روم میں لائی تو اس کے پیچھے ایک دراز قامت خاتون بھی چلی آرہی تھی۔ بڑھاپا اس کی دہلیز پر دستک دے رہا تھا لیکن اس عمر میں بھی اس کے تیکھے خدوخال غزالہ سے کہیں زیادہ دل کش تھے۔ دودھ سے زیادہ گوری رنگت میں شریانیں اور وریدیں دور ہی سے نظر آرہی تھیں۔ اس کے منہ میں پان دبا ہوا تھا اور بڑی بڑی سیاہ غلافی آنکھوں میں نشے کے سرخ ڈورے تیر رہے تھے۔ میرے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ غزالہ کی ماں ہے۔ میں اسے سلام کرتے ہوئے احتراماً اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ غزالہ نے سر اٹھا کر حیرت سے میری طرف دیکھا پھر ماہرت سے جھلکنے والے نرم دل باپ کے چہرے پر نگاہ دوڑائی اور مفاہمت کی فضا محسوس کرتے ہی اس کا چہرہ مسرت سے گلنار ہوگیا۔ وہ ایک لمحے کے لیے جھجکی اور پھر ٹرالی وہیں چھوڑ کر تیزی کے ساتھ واپس چلی گئی۔ باپ مزاحمت پر تلا ہوا تھا تو وہ پھاٹک سے نکل کر میرے روبرو آکھڑی ہوئی تھی لیکن مفاہمت کے آثار دیکھ کر چند ثانیوں کے لیے بھی اس بند کمرے میں کسی کا سامنا نہ کرسکی تھی۔

مجھے بے اختیار ویرا لائیڈ یاد آگئی جو غزالہ کی سراسر ضد تھی۔ سچ ہی ہے کہ عورت مشرق میں ہو تو عورت ہی رہتی ہے لیکن سربستہ رازوں اور انوکھے جذبوں کی یہی امین جب مغرب کے نفس پرور معاشرے میں آنکھ کھولتی ہے تو حیا اور آبرو کے بوجھ سے اس کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ وہ مرد کے بہلاوے کا ایک جیتا جاگتا کھلونا بن کر رہ جاتی ہے۔

”شمع! یہ غزالہ کے دوست تنویر میاں ہیں۔“ ادھیڑ عمر کرنل کی شفقت آمیز آواز نے مجھے چونکا دیا۔ بیوی کے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہوگیا تھا۔ ”اور بھئی یہ غزالہ کی ماں شمع ہیں۔“

اس کے پتلے پتلے ہونٹوں پر مسکراہٹ رقصاں ہوگئی۔

”بیٹھو بیٹے!“

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی وحشی سانڈ نے میرے سینے پر ٹکر دے ماری ہو۔ اس کی آواز میں نقاہت تھی لیکن الفاظ میں اپنائیت کی مٹھاس رچی ہوئی تھی۔ برسہا برس کے بعد کسی نے مجھے بیٹا کہہ کر مخاطب کیا تھا اور مجھے بے اختیار ماں یاد آگئی تھی جس نے میرے مستقبل سے مایوس ہو کر ایک ویرانے میں خودکشی کرلی تھی۔

پنڈلیوں میں لرزش نمودار ہونے سے پہلے میں اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ غزالہ کی ماں میرے سامنے اپنے شوہر کے پہلو میں بیٹھ گئی۔ اس وقت میں نے پہلی بار دیکھا کہ اس کا رنگ گورا ضرور تھا لیکن جسم میں خون کی کمی کے باعث سفیدی نے پیلاہٹ اختیار کرلی تھی۔ اس کی آواز بھی تھکی تھکی سی تھی جیسے بولنے میں اسے دشواری ہورہی ہو۔ اس کی آنکھوں میں تیرتے ہوئے گلابی ڈوروں کی بنا پر میرے لیے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں تھا کہ وہ اس وقت بھی کوکین کے نشے میں تھی۔

کرنل ٹرالی اپنے آگے گھسیٹ کر چائے بنانے لگا۔

”بیٹی کے بعد تم نے ہمارے میاں پر بھی شاید ڈورے ڈال لیے۔“ غزالہ کی ماں میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولی تو اس کے لہجے میں سرور کی موہوم سے لغزش موجود تھی جسے کوئی تجربہ کار ہی محسوس کرسکتا تھا۔

میرے ساتھ کرنل بھی مسکرا دیا۔ ”تنویر میاں بہت اچھے لڑکے ہیں شمع! مجھے خوشی ہے کہ غزالہ نے زندگی میں پہلی بار ایک صحیح کام کیا ہے۔“ اس نے ہاتھ روکے بغیر بیوی سے کہا۔

”خدا انہیں ہمیشہ اچھا ہی رکھے۔“ اس نے بزرگانہ لہجے میں کہا پھر گردن کو ایک ادا کے ساتھ ہلکا سا خم دے کر ازراہ تفنن بولی۔ ”جسے آپ اچھا سمجھ لیں وہ خوش نصیب ہی ہوگا۔ بُرے تو ہم ہیں جو آپ کے پلّے بندھ گئے۔“

اس نے جو کچھ کہا، مذاق ہی تھا۔ کرنل شاید ایسی گفتگو کا عادی تھا لیکن اس کے مخمور لہجے میں سسکتا ہوا کرب مجھ سے پوشیدہ نہ رہ سکا۔ وہ بے حد حسین اور پُروقار عورت تھی۔ نجانے اسے بُرے دنوں میں کس غلام نے جسموں کی منڈی میں نیلام چڑھایا تھا۔ اگر اس کا ماضی داغ دار نہ ہوتا تو شاید اس کی ذات اور بھی بھرپور ہوتی۔ شوہر نے اسے ایک جہنم سے تو نجات دلا دی تھی لیکن دوسرے روگ سے جان چھڑوانا اس بے چارے کے بس سے باہر تھا۔

معاً اندر سے پے در پے وہ ہذیانی چیخیں ابھریں اور میں چونک پڑا۔ غزالہ کی ماں کے چہرے پر اذیت کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے آنکھیں بند کرکے اتنی مضبوطی سے اپنے دانت بھینچے کہ اس کے جبڑوں کی وریدیں جلد پر ابھر آئیں۔ کرنل ٹرالی چھوڑ کر اندر لپکا تو میں بھی اس کے پیچھے ہولیا۔

غزالہ ایک بند کمرے کی کھڑکی کی آہنی گرل تھامے اندر جھانک رہی تھی۔ قدموں کی آواز سنتے ہی وہ پیچھے مڑی اور اضطراری لہجے میں بولی۔ ”ڈیڈی! اس نے خود کو زخمی کرلیا ہے...“ اس کے چہرے پر وحشت اور تشویش کے سائے لرزاں تھے۔ آنکھوں میں ہلکی سی نمی تھی جیسے چیخیں سن کر وہاں آنے سے پہلے تنہائی میں روتی رہی ہو۔

کمرے کا دروازہ مقفل تھا اور چابی باہر ہی دیوار پر لٹکی ہوئی تھی۔ کرنل نے پھرتی سے دروازہ کھولا اور میں اس کے ساتھ ہی اس کمرے میں گھس گیا۔ ایک خوبصورت اور صحت مند نوجوان گھٹنوں پر کہنیوں میں سر دیے چت پڑا ہوا تھا اور اس کی پیشانی سے تازہ تازہ خون رِس رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت ناک ویرانی چھائی ہوئی تھی جس میں دکھ یا تکلیف کا کوئی احساس نہیں تھا۔ اس کا لباس صاف ستھرا تھا لیکن قمیص کی ایک آستین پھٹی ہوئی تھی۔ کمرے کے ایک گوشے میں اسفنج کا نرم گدا پڑا ہوا تھا لیکن چادر چیتھڑوں میں تبدیل ہوچکی تھی۔ تکیہ پھٹا ہوا تھا، اس کی روئی پورے کمرے میں بکھری ہوئی تھی۔

”کامران... کامران بیٹے!“ بوڑھے کرنل نے نوجوان کے قریب فرش پر اکڑوں بیٹھ کر دردمندانہ لہجے میں اسے پکارا لیکن وہ بدستور اسی لاتعلقانہ انداز میں فرش پر پڑا چھت کو گھورتا رہا جیسے اس کی سماعت کام نہ کررہی ہو۔

کرنل نے بے بسی سے میری طرف دیکھا۔ ”کسی کو نہیں پہچانتا۔ بس کبھی کبھی غزالہ سے باتیں کرلیتا ہے۔“

میں نے ترحم آمیز نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے اس کا بازو چھوا تو وہ اچھل کر فرش سے یوں اٹھتا چلا گیا جیسے بے خیالی میں اس پر بجلی کا ننگا تار آگرا ہو۔ وہ بندر کی سی پھرتی سے میری طرف گھوما تو اس کی آنکھوں میں وحشیانہ چمک کوند رہی تھی۔ میری چھٹی حس نے فوراً ہی خطرے کا اعلان کردیا۔ اگر میں اس کا حملہ روکنے کے لیے بروقت تیار نہ ہوتا تو وہ اپنے بے پناہ زور میں مجھے پچھلی دیوار تک رگیدتا چلا جاتا۔ وہ جیسے ہی مجھ پر جھپٹا، میں نے اپنے بچاؤ کے لیے فرش پر جما کر اسے اپنی بانہوں میں دبوچ لیا۔

میری سخت گرفت میں وہ ایک دو بار تڑپا اور پھر اس کے اعصاب و عضلات ڈھیلے پڑتے چلے گئے۔ اس نے میرے سینے سے لگ کر اپنا سر میرے داہنے شانے پر ٹکا دیا۔ میں اسے سہارا دے کر اس کے گدے کی طرف لایا اور وہ بلا چون وچرا گدے پر لیٹ گیا۔ غزالہ اس اثنا میں فرسٹ ایڈ کا ڈبہ لے آئی تھی جو کامران کی ذہنی حالت کے پیش نظر غالباً ہر وقت گھر میں موجود رہتا تھا۔

میں نے فرسٹ ایڈ بکس میں سے روئی نکال کر اس بدنصیب کی پیشانی کا زخم صاف کرنا شروع کیا تو اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ اس کی ویران آنکھیں لاتعلقانہ انداز میں خلا کے کسی نکتے پر مرکوز تھیں۔ غزالہ اور اس کے بوڑھے باپ کے چہروں پر حیرت کے آثار نمایاں تھے شاید میرے ساتھ کامران کا مفاہمانہ رویہ ان کی توقعات کے برعکس تھا۔

”تم سب پاگل ہو۔“ وہ گدے پر لیٹے لیٹے بڑبڑایا جیسے کسی نادیدہ آسیب سے مخاطب ہو۔ ”میں تمہیں فنا کردوں گا۔ میں تمہارا شہنشاہ ہوں۔“ پھر وہ قلقاری مار کر ہنس پڑا۔ میرا ہاتھ بہک گیا۔ اس کی جنون آمیز ہنسی تھمی تو میں نے اس کی رگ دوبارہ پھڑکنے سے پہلے ہی اس کے زخم کی ڈریسنگ کردی۔

”یہ دے دیں اسے۔“ غزالہ نے ایک گولی میری طرف بڑھاتے ہوئے سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔ ”آپ کی بات مان لے گا۔“

اس نے سر گھما کر غزالہ کو گھور کر دیکھا اور پھر اداس لہجے میں بولا۔ ”تو کہاں چلی جاتی ہے، یہ سب ظالم ہیں، مجھے قید کر رکھا ہے مجھے وہاں کب لے جائے گی؟“

”ابھی چلیں گے۔“ غزالہ اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے دل پر جبر کرکے بولی۔ ”دیکھو یہ کیا دے رہے ہیں؟“

اس نے فرمانبردارانہ انداز میں مجھ سے وہ مسکن گولی لے کر پانی کے ساتھ حلق سے اتار لی۔ غزالہ کے باپ نے خاموشی سے مجھے اشارہ کیا اور ہم دونوں غزالہ کو کامران کے پاس چھوڑ کر باہر آگئے۔

”ذہن بالکل ماؤف ہے۔“ کرنل نے باہر نکل کر دلگیر لہجے میں کہا۔ ”یادداشت کا خانہ بالکل خالی ہے۔ میں نے کمرے سے مسہری سمیت ہر چیز ہٹا دی ہے لیکن پھر بھی دیواروں سے سر مارنے لگتا ہے۔ مجھے کئی مرتبہ مار چکا ہے، اپنی ماں کی تو صورت تک دیکھنا پسند نہیں کرتا۔ غزالہ کے لیے اس کے لاشعور میں شاید کوئی احساس زندہ ہے۔ کیونکہ بدکلامی کے باوجود آج تک کبھی اس کے ساتھ تشدد نہیں کیا۔ مجھے حیرت ہے کہ اس نے تم سے خاموشی سے مرہم پٹی کرالی، مجھ سے تو باقاعدہ ہاتھا پائی پر اتر آتا ہے۔“

میں خاموش رہا۔ میرا طب یا نفسیات کے شعبے سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن زمانے کی ٹھوکریں کھا کھا کر میں نے انسانوں کو پرکھنے کا فن خوب سیکھ لیا تھا۔ غزالہ مجھے بتا چکی تھی کہ دو ماہرین نے کامران کے بارے میں فیصلہ صادر کردیا تھا کہ کسی موذی نشے کی بڑی خوراک نے اس کے دماغ کے حساس خلیوں کو ہمیشہ کے لیے تباہ کردیا ہے لیکن مجھے اندازہ ہوا تھا کہ پاگل ہوجانے کے باوجود اس کے کچھ احساسات زندہ تھے۔ غزالہ کے ساتھ اس کا رویہ حیرت ناک تھا، بالکل ہی پاگل ہوتا تو رشتے کے تقدس کا احترام کیے بغیر کبھی بھی اس کی درگت بنا سکتا تھا، پھر اپنی ماں کے ساتھ اس کا

رویہ شاید ہمیشہ یکساں ہوتا تھا جبھی وہ بیٹے کی کربناک چیخیں سننے کے باوجود اسے دیکھنے نہیں آئی تھی۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اسے لپنے باپ کی کمزوری کا اندازہ تھا لہٰذا اس سے جارحانہ سلوک پہ اتر آتا تھا مگر میری قوت کا اندازہ لگاتے ہی وہ بے چون وچرا میرے اشاروں پہ چلنے لگا تھا۔

کوکین کے ڈسے ہوئے اس خوب صورت جوان کے لیے میرے دل میں ہمدردی اور امید کے جذبات امڈ آئے۔

⁂

غزالہ کے گھر پر گزرا ہوا وقت میرے اعصاب پر آسیب بن کر سوار ہو گیا۔ زندگی میں پہلی بار میں نے کسی شے کے ہاتھوں ایک بہت بڑے گھر کی بربادی کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ وہ گھرانہ میرے لیے معاشرتی بربادی کا ایک مثالی المیہ تھا۔ ان میں سارے ہی کردار قابلِ رحم تھے۔ سمیع سے غزالہ تک کسی پر بھی اس تباہی کی ذمے داری عائد نہیں کی جا سکتی تھی۔ کامران اپنی ماں کے پاندان سے کوکین کھا کر ضرور اس حال کو پہنچا تھا لیکن وہ بے چاری خود اس نشے کی اس حد تک غلام تھی کہ اپنے لہو کی بربادی کے باوجود اپنی طلب کا جہنم سرد کرنے پر مجبور تھی۔ اصل کا مجرم وہ تھا جس نے آبرو کی نیلام گاہ میں پہلی بار غزالہ کی ماں کو اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے کوکین کا پہلا پان کھلایا تھا۔

قانون منشیات کا دشمن تھا۔ اس کی نگاہوں میں اسے بنانے، بیچنے اور استعمال کرنے والے سب یکساں مجرم تھے لیکن ان حالات کو ختم کرنا قانون کے دائرہ کار سے باہر تھا جو منشیات فروشی کے لیے زرخیز ثابت ہوتے تھے۔ ترقی کے ساتھ ساتھ ہر شخص کی سوچ کاروباری ہوتی جا رہی تھی۔ ہیروئن اور کوکین اس لیے استعمال نہیں ہو رہی تھی کہ وہ تیار کی جا رہی تھی بلکہ اس کی منفعت بخش تجارت کا سبب یہ تھا کہ معاشرے میں اس کی طلب موجود تھی۔ ہر شخص اسی کاروبار کا رسیا تھا جس کی طلب ہو اور ہر ایک اپنی چیز کو خریداروں کے رجحانات کے پیشِ نظر بہتر سے بہتر بنا کر بازار میں لا رہا تھا۔ ارتقا کا یہی تدریجی عمل نشوں کی صنعت میں بھی کارفرما تھا۔

چرس اور ہیروئن سے پہلے بھنگ گھوٹ کر پی جاتی تھی یا افیم کھائی جاتی تھی اور ان میں سے کوئی چیز انسانی صناعی کی زد میں نہیں آتی تھی۔ دونوں کا ماخذ دھرتی کا سینہ تھا۔ بیج سے کونپلوں، پودوں، پھول اور پھر پھل تک ہر مرحلہ قدرت کی فیاضیوں کا ایک شاہکار تھا لیکن ان نعمتوں کو ناآسودہ لوگوں نے اپنے درد کا درماں بنا لیا۔ برگ حشیش سے ابتدا ہوئی پھر گانجہ اور بھنگ سے ہوتے ہوتے نوبت چرس تک پہنچ گئی۔ دوسری طرف افیم نے ارتقائی سفر کا آغاز کیا تو مدک اور چانڈو جیسی دیسی چیزوں سے مارفین اور ہیروئن تک وجود میں آتی چلی گئی۔ میرے لیے یہ سمجھنا دشوار تھا کہ جب ہیروئن اور چرس کا نشہ بھی لوگوں کو ان کے تفکرات سے پناہ نہ دے سکے گا تو پھر کہاں سے اور کون سا نشہ آئے گا۔

نشے لوگوں کو برباد کر رہے تھے۔ فرد کی اکائی پر ضرب لگنے کے نتیجے میں معاشرے کی یک جہتی خطرے میں پڑتی نظر آ رہی تھی لیکن اس وبا کے تھمنے کے کوئی آثار نہیں تھے۔ میں خود اس برائی کے دوررس اثرات سے باخبر ہونے کے باوجود، اس کی نشوونما میں بھرپور حصہ لینے پر مجبور تھا۔ ذہن میں اعلیٰ فلسفیانہ خیالات کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا لیکن عملاً میں موتی دادا کے اڈے سے تھوڑی دور حامد کی واپسی کا منتظر تھا جو تھوڑی ہی دیر پہلے ادھر گیا تھا۔

میں اسٹیئرنگ کے پیچھے بیٹھا سگریٹیں پھونکتا اور سوچتا رہا۔ کچھ دیر بعد وہ جواں سال اور خوش پوش لڑکا مجھے اس تنگ سی گلی میں سے نکلتا نظر آیا جہاں گنجان آبادی میں موتی دادا چھوٹی سی عمارت میں اپنا اڈا کامیابی سے چلا رہا تھا۔ حامد کو میں ذاتی طور پر نہیں جانتا تھا، بس جہانگیر سے ملنے والے حلیے کی بنا پر اسے پہچانا تھا۔ اس کے داہنے ہاتھ میں سیاہ رنگ کا ایک بیگ جھول رہا تھا۔ بظاہر وہ بے پروائی کے انداز میں چلا آ رہا تھا لیکن اس کی متجسس نگاہیں کسی خالی سواری کی تلاش میں سڑک پر بھٹک رہی تھیں۔

جوں ہی وہ گلی سے اگلے پول تک پہنچا، میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور پھر اسے آگے بڑھا کر اس کے برابر میں روک دیا۔ کھڑکی میں سے میں نے دیکھا کہ چلتے چلتے وہ ٹھٹک کر رک گیا تھا پھر اس سے قبل کہ وہ میری کار کو نظر انداز کر کے آگے بڑھنے کا فیصلہ کرتا میں نے انجن بند کیے بغیر گیئر نیوٹرل کر کے ہینڈ بریک کا لیور کھینچا اور پھرتی سے کار سے نیچے آ گیا۔

اس نے کار کی چھت پر سے تیکھی نظروں سے میری طرف دیکھا اور میں دوستانہ انداز میں مسکرا دیا۔ ”بیٹھ جاؤ۔ جہاں بھی جانا ہے میں اتار دوں گا۔“

”شکریہ۔“ اس نے خشک لہجے میں کہا۔ ”میں کسی اجنبی کا احسان لینا پسند نہیں کرتا۔“ یہ کہہ کر اس نے آگے بڑھنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ میں نے اس کا نام لیا اور اس کے قدم زمین میں گڑ کر رہ گئے۔

”اجنبی احسان کرنے پر تلا ہوا ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ”پھر جو تمہارے نام سے واقف ہو وہ اتنا بھی اجنبی نہیں ہوتا، جتنا تم سمجھ رہے ہو۔ بےفکر رہو میرا پولیس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”کون ہو تم اور کیا چاہتے ہو؟“ وہ الجھن آمیز لہجے میں بولا۔ ”تمہیں میرا نام کیسے معلوم ہوا؟“

”اتنے سوال؟“ میں ہنس دیا۔ ”گاڑی میں بیٹھ جاؤ مزے سے باتیں کریں گے، موتی دادا کے کسی آدمی نے دیکھ لیا تو کل سے مال نہیں ملے گا، وہ سمجھے گا کہ تم کوئی مخبر پیچھے لگا لائے ہو۔“

موتی دادا کے نام نے اس کے رہے سہے حوصلے پر بھی اوس ڈال دی اور وہ پیشانی پر تفکر آمیز شکنیں لیے گاڑی میں بیٹھنے لگا۔ میں نے بھی اس کے ساتھ ہی اپنی نشست سنبھال لی اور ہینڈ بریک چھوڑ کر کار آگے بڑھا دی۔

میں ونڈ شیلڈ سے باہر ٹوٹی پھوٹی سڑک پر نظریں جمائے ہوئے تھا لیکن بائیں آنکھ کے گوشے سے میں دیکھ رہا تھا کہ وہ مجھے تشویش زدہ انداز میں گھورے جا رہا تھا۔ آخر اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور وہ بول ہی پڑا۔ ”میں تمہارے بولنے کا منتظر ہوں۔“

”تم کافی دنوں سے میری نگاہ میں ہو۔“ میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ تم میرے لیے کام کرو۔“

”کیا کام؟“ بظاہر اس نے اچٹ کر سوال کیا تھا لیکن اس کا لہجہ کھوکھلا تھا۔

”پارسا بننے کی کوشش نہ کرو۔“ میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ”موتی دادا کے پاس لوگ کس لیے آتے ہیں۔ یہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے اور یہ بھی یاد رکھنا کہ تم نے اس ملاقات کا کسی سے بھی ذکر کیا تو وہ تمہاری آزادی کا آخری لمحہ ثابت ہو گا۔ پورے گھر کو بند کروا دوں گا، کوئی ضمانت لینے والا بھی نہیں ملے گا۔“

وہ کچا کھلاڑی تھا، پہلی دھمکی سنتے ہی اس کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں ابھر آئیں۔ ”کام کی نوعیت سمجھے بغیر میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“ اس نے بے چارگی کے ساتھ کہا۔ میرے پے در پے حملوں نے اسے بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔

”موتی دادا کے بجائے تمہیں میرا مال بیچنا ہو گا۔“ میں نے اسے ٹٹولنے کی نیت سے تیر پھینکا۔

”یہ مشکل ہے۔“ اس نے گہرا سانس لے کر کہا۔ ”اگر تم موتی دادا کو جانتے ہو تو تمہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ انحراف کرنے والوں کے ساتھ وہ کیا سلوک کرتا ہے۔“

”میں تمہیں پورا تحفظ فراہم کروں گا۔“ میں نے اسے حوصلہ دلایا۔

”میں نیا ضرور ہوں لیکن اس لائن سے خاصا واقف ہو گیا ہوں۔“ وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ ”کوئی کسی کو تحفظ فراہم نہیں کرتا۔ سب اپنی ساکھ بچاتے ہیں۔ اس نے میرے ہاتھ پیر تڑوا دیے تو شاید تم بھی اس کے ایک دو آدمیوں کو معذور کرا دو لیکن میرا کیا بنے گا۔ میں تو زندگی بھر سسکتا ہی رہوں گا۔“

اس نئے پنچھی نے بہت بڑی بات کہہ دی تھی۔ مجھے بے اختیار طارق یاد آ گیا جسے سکندر علی نے اپنی ساکھ کی بھینٹ چڑھا دیا تھا۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ جرائم کی دنیا میں کوئی کسی کا بچاؤ نہیں کرتا۔ سب اپنے مفادات کے لیے بھیڑیے بن جاتے ہیں اور جب اپنی ذات خطرے میں نظر آئے تو بلاتردد ہر ایک کو داؤ پر لگا دیتے ہیں۔

”تو اسے میں تمہارا انکار سمجھ لوں؟“ میں نے قدرے توقف کے بعد سوال کیا۔

”کوئی قابلِ عمل بات ہو تو میں تیار ہوں۔“ اس نے جلدی سے وضاحت کی۔ ”میں دیدہ و دانستہ کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہیں ہوں۔“

”اور اگر میں تمہیں باہر بھیجنا چاہوں؟“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

وہ چونک پڑا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”شاید تمہیں علم نہ ہو کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں، شوقیہ نہیں بلکہ مجبوری کے تحت کر رہا ہوں۔ میں پوری کے چکر میں آدھی سے ہاتھ نہیں دھونا چاہتا۔ تمہیں بہتیرے ایسے لڑکے مل جائیں گے جو ہر قیمت پر دنیا دیکھنے کے خواہشمند ہیں تمہیں تو کیریئر ہی چاہیے نا؟“

وہ اپنی عمر سے کہیں زیادہ سمجھ دار نظر آ رہا تھا۔ شاید تلخ حالات نے اسے اپنے ماحول سے بہت جلد سیکھ لینے کا عادی بنا دیا تھا۔ اسی وجہ سے وہ اشارا پاتے ہی سمجھ گیا تھا کہ میں اس کے ذریعے 'مال' باہر بھیجنے کے چکر میں تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ شہر میں رہ کر نہایت خوش اسلوبی سے اپنا کام سرانجام دے رہا تھا اور میں اسے اس کی جگہ سے ہٹانا نہیں چاہتا تھا۔ میرا مقصد صرف اتنا تھا کہ باتوں ہی باتوں میں اسے اس قدر مجبور کر دوں کہ وہ خود ہی اپنے دوستوں کو متعارف کرانے پر آمادہ ہو جائے لیکن اس نے اپنی ذہانت سے فوراً ہی میرا مدعا بھانپ کر مجھے پیچیدہ گفتگو سے بچا لیا۔

”یہی سمجھ لو۔“ میں نے تیکھے لہجے میں کہا۔ ”لیکن تمہارے سامنے ہوتے ہوئے میں دوسروں کی تلاش میں شہر میں دھکے کیوں کھاتا پھروں؟ میں تم سے اور تمہارے پس منظر سے

پوری طرح واقف ہوں، تم اس وقت بھی ٹریڈ میں ہو۔ تم سے بہتر آدمی مجھے کہاں ملے گا؟"

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ پھر چند ثانیوں کے توقف کے بعد بولا۔ "موتی دادا کو بھنک بھی مل گئی تو وہ اونچا اڑنے سے پہلے میرے پر کاٹ دے گا۔ میں تمھیں کئی نام دے سکتا ہوں۔ تم انھیں سیاحت کے ساتھ تھوڑا سا مالی مفاد بھی فراہم کرو گے تو وہ پوری رازداری اور اعتماد کے ساتھ تمھارے لیے کام کریں گے۔" آخر کار وہ اسی لائن پر آ گیا۔ جو میں چاہ رہا تھا۔

"ان میں لڑکیاں بھی ہوں گی؟" میں نے مستفسرانہ لہجے میں کہا۔

"دیکھنا پڑے گا۔" وہ پُر خیال لہجے میں بولا۔ "بظاہر تو بہت سی لڑکیاں آزاد خیال نظر آتی ہیں لیکن ملک سے باہر نکلنا شاید کسی کے لیے بھی ممکن نہ ہو۔ ہاں اپنے شہر میں رہتے ہوئے وہ بہت کچھ کر سکتی ہیں۔"

"تمھاری گلو خلاصی کی ایک ہی صورت ہے۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "مجھے کل تک کم از کم تین آدمی فراہم کرو جو میرا مال باہر لے جا سکیں بعد میں بھی تمھیں وقتاً فوقتاً یہ کام کرنا ہوگا۔"

"تاکہ تم میری سرگرمیوں کے بارے میں اپنی زبان بند رکھو۔" اس کا انداز تلخ ہو گیا۔

"میں تمھیں بلیک میل نہیں کر رہا۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "تمھاری سرگرمیوں کا حوالہ نہ دیتا تو تم گفتگو کرنے پر بھی آمادہ نہ ہوتے۔ میں تمھیں ہر آدمی کے ایک ہزار روپے ادا کروں گا۔"

اس کی نگاہوں میں چمک عود کر آئی۔ "پھر مجھے کوئی عذر نہیں لیکن کام شروع کرنے سے پہلے میں تمھارا طریقۂ کار ضرور جاننا چاہوں گا۔"

"جس دن آدمی مال لے کر روانہ ہوں گے، تمھیں تمھارا حصہ..."

میں نے وضاحت کرنا چاہی لیکن اس نے درمیان سے میری بات کاٹ دی۔ "مجھے اپنے حصے کی فکر نہیں۔ میں نے اندازہ لگا لیا ہے کہ تم بات سے پھرنے والوں میں سے نہیں ہو، میں یہ معلوم کرنا چاہ رہا ہوں کہ کیا ان لوگوں کو معلوم ہوگا کہ وہ سیاحت کی آڑ میں کیا کام کر رہے ہیں؟"

میں دل ہی دل میں اس کی ذہانت کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ بات سنتے ہی اس کی تہ تک پہنچ جاتا تھا اور پھر کرید کر خامیوں یا کمزور پہلوؤں کو سامنے لے آتا تھا۔ بات صرف اتنی تھی کہ وہ روشن دماغ اور تعلیمیافتہ تھا اور جب ایسے لوگ جرائم کی طرف راغب ہو جائیں تو پوری طرح سمجھے بوجھے بغیر کسی جرم کا ارتکاب نہیں کرتے۔ اس نے جو سوال کیا، وہ بنیادی اہمیت کا حامل تھا اور سچی بات ہے کہ اس مرحلے پر میں اس کے جواب کے لیے تیار نہیں تھا۔ لہٰذا میں نے سوچا کہ کیوں نہ اسی سے جملہ امکانات کے بارے میں اس کی رائے معلوم کی جائے۔

"اگر فیصلہ تم پر منحصر ہو تو تم کیا کرو گے؟" میں نے اپنے خالی الذہن ہونے کا اعتراف کیے بغیر چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا تاکہ وہ چیخ کر بھرپور انداز میں میری بات کا جواب دے۔

"انھیں مکمل طور پر لاعلم رکھ کر باہر بھیجنے کا تو تصور ہی احمقانہ ہوگا۔" اس نے چند ثانیوں کی پُر خیال خاموشی کے بعد ٹھیرے ہوئے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "کیونکہ کوئی اپنی گرہ سے ہزاروں روپے خرچ کر کے کسی کو بلا وجہ باہر نہیں بھیجتا پھر انھیں کسی خاص منزل پر کسی کو کوئی خاص چیز بھی پہنچانا ہوگی۔ لہٰذا انھیں اندھیرے میں رکھنا بے اعتمادی کے مترادف ہوگا۔ اس کے بعد دو ہی صورتیں رہ جاتی ہیں۔ مال ان کے حوالے کر کے اس کا تحفظ اور ترسیل ان پر چھوڑ دی جائے یا اپنے طور پر مال کسی غیر اہم چیز میں چھپا کر ان کے حوالے کیا جائے اور وہ اسے چھیڑے بغیر مقررہ آدمی تک پہنچا دیں۔"

"آخری صورت اختیار کی جائے گی۔" میں نے کہا۔ "انھیں کسی آرائشی چیز میں چھپا کر مال دیا جائے گا لیکن مال کی اصل نوعیت سے وہ لاعلم رہیں گے تاکہ بڑا لالچ نیت میں فتو[ر] کا سبب نہ بن سکے۔"

"میں سمجھا نہیں۔" وہ الجھن آمیز لہجے میں بولا۔ "کیا وہ یقین کر لیں گے کہ انھیں محض ایک تحفے کی ترسیل کے لیے ہزاروں میل کے سفر پر بھیجا جا رہا ہے۔"

"اوہ۔" میں دھیمے سے ہنس پڑا۔ "یوں سمجھ لو کہ وہ ہیروئن لے جائیں گے لیکن بتایا یہ جائے گا کہ وہ چرس کا سیمپل لے جا رہے ہیں۔ پیکنگ میں یہ اہتمام کر لیا جائے گا کہ وہ مال کی اصلیت سے واقف نہ ہو سکیں لیکن اس سے تمھارے لیے کیا فرق پڑے گا؟"

"اب مجھے خاصی حد تک ملوث ہونا پڑے گا۔" اس کے پاس جواب تیار تھا۔ "مجھے اعتماد کے لوگوں سے بات کرنا ہوگی اور انھیں رازداری کی تاکید کے ساتھ یہ بتانا ہوگا کہ انھیں کوئی اہم چیز باہر لے جانی ہے۔ ورنہ میں سوچ رہا تھا کہ انھیں تم سے متعارف کرا دوں گا بقیہ معاملات تم خود طے کر لو گے۔"

"کل تم انھیں کس وقت لاؤ گے؟" میں نے پوچھا۔

"پانچ بجے۔" وہ سوچتے ہوئے بولا۔ "تمھارا پتا ٹھکانا [کیا] ہے؟"

"پھر پانچ بجے میں انڈس ہوٹل میں تمھارا انتظار کروں [گا۔" م]یں نے یہ سوچتے ہوئے ہوٹل کا نام لے دیا کہ کسی پبلک [مقام] وغیرہ میں ملاقات طے کرنے میں وہ لوگ یہ سوچ کر [بدک] سکتے تھے کہ جو شخص پہلی ملاقات کے لیے ڈھنگ کی جگہ [کا انت]ظام نہ کر سکے، وہ اپنی کنجوسی یا کوتاہ بینی کی وجہ سے انھیں [کچھ] ہی نہ دے۔

"ہوٹل کے بجائے گھر پر زیادہ آسانی سے گفتگو ہو سکتی [ہے]۔" اس نے مشورہ دینے کے انداز میں کہا۔

"تو اپنے گھر پر بلا لو۔"

وہ تلخ انداز میں ہنس پڑا۔ "دو کمروں کے بوسیدہ سے [مکان م]یں رازداری عنقا ہے۔ پھر اس چار دیواری میں لمبی [چوڑ]ی باتیں ان تینوں کو مذاق محسوس ہوں گی۔ تمھارا اپنا گھر [ت]و ہوگا؟"

"میں ڈیرہ غازی خان سے آیا ہوں اور انڈس ہوٹل [میں] ٹھہرا ہوا ہوں۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے[تے ہوئے ک]ہا۔ "میرا موجودہ کمرہ بے آرام ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آج [ہ]ی مجھے دوسرا کمرہ مل جائے۔ تم انکوائری سے میرے [بار]ے میں معلوم کر لینا۔ ٹھیک پانچ بجے میں تمھارا انتظار [کرو]ں گا۔"

"تمھارے بارے میں تو اسی وقت معلوم کر سکوں گا جب [تمھا]را نام معلوم ہوگا۔" وہ طنزیہ انداز میں بولا۔

"اوہ۔" مجھے فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ "میرا [نام] شہباز خان ہے۔ دراصل تم سے باتوں میں یوں محسوس ہو [رہا] ہے جیسے ہم ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہ ہوں۔"

"شہباز خان!" اس نے زیر لب دہرایا پھر قدرے [توق]ف کے بعد بولا۔ "اب، واسطہ پڑ ہی گیا ہے تو تمھیں ایک [مشو]رہ بھی دینا ہوگا۔ اس بارے میں موتی دادا کو اعتماد میں [لینے] میں کوئی ہرج تو نہیں ہوگا۔"

"ایسا غضب بھی نہ کرنا۔" میں نے مصنوعی بوکھلاہٹ ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ "وہ تم کو روکے یا نہ روکے لیکن [رکاوٹ ضرو]ر کھڑی کر دے گا اور میرے آدمی روانگی سے پہلے ہی دھر [لیے] جائیں گے۔"

"اس کا اور تمھارا مقابلہ ہی کیا۔" وہ بولا۔ "موتی دادا مقامی سپلائر ہے اور تم ایک ایکسپورٹر ہو۔ اصولاً تو اسے خاموش ہی رہنا چاہیے۔ دراصل میں کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہتا جو آگے چل کر میرے لیے الجھن کا سبب بن جائے۔"

"تم بے فکر رہو۔ اسے بھنک بھی نہ مل سکے گی کہ تم نے کوئی دوسرا کام کیا ہے۔" میں نے اسے دلاسہ دیتے ہوئے کہا اور گاڑی سڑک کے کنارے روک دی۔

"اتنی بے مروتی مناسب نہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "یہاں تک آ گئے ہو تو مارٹن روڈ پر ہی اتار دینا۔ میں وہیں رہتا ہوں۔ اتنے کم فاصلے کے لیے کوئی سواری نہیں مل سکے گی۔" میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی گاڑی آگے بڑھا دی۔

وہ میری توقع سے کہیں بڑھ کر ہوشیار ثابت ہوا تھا لہٰذا اسے اتار کر میں فوراً ہی شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ انڈس ہوٹل میرے لیے کوئی نئی جگہ نہیں تھی۔ کبھی کبھار ماحول کی تبدیلی کے لیے میں وہاں بھی کمرہ کرائے پر لیتا اور وہاں اصل نام سے نہیں پہچانا جاتا تھا۔ جب بھی وہاں گیا شہباز خان کے ہی نام سے کمرہ حاصل کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انڈس ہوٹل کا نام لینے کے بعد میں نے حامد کو اپنا نام شہباز خان بتایا تھا۔ میں ویسے بھی اپنی اصلیت اس سے پوشیدہ ہی رکھنا چاہتا تھا۔

استقبالیہ کاؤنٹر پر میرا استقبال تپاک سے کیا گیا۔ کلرک خلاف معمول مجھے تنہا دیکھ کر حیران ضرور ہوا تھا لیکن اس بارے میں کوئی سوال کرنے کی ہمت نہیں کر سکا تھا۔ میں نے دو دن کا پیشگی کرایہ ادا کر کے رجسٹر کے اندراجات کے مقابل شہباز خان کے نام سے دستخط کیے اور پھر ایک پورٹر کے ساتھ زینوں کی طرف چل دیا۔ جو کمرہ مجھے دیا گیا وہ پہلے سے صاف تھا، بستر سے غسل خانے میں صابن اور تولیے تک ہر چیز موجود تھی۔ میں نے پورٹر کو ٹپ میں پانچ روپے کا نوٹ دیا اور وہ کھیسیں نکالتا ہوا واپس چلا گیا۔

اس وقت میری رسٹ واچ میں سات بجنے میں دس منٹ باقی تھے۔ میں چند ثانیوں بعد باہر نکلا اور کمرہ مقفل کر کے عقبی زینوں سے نیچے اترتا چلا گیا۔

❋

راستے میں اچانک ہی مجھے خیال آیا کہ جہانگیر سے ٹرانسمیٹر پر میری گفتگو ہوئی تھی لیکن اس نے مجھے یہ نہیں بتایا تھا کہ میں اپنی نجی حیثیت میں جیوا ہاؤز کے کمرہ نمبر تین میں گھسا تھا۔ نجانے اس نے کیا سوچ کر یہ اطلاع اپنی ذات تک محدود رکھی تھی۔

اگر وہ ذکر چھیڑ دیتا تو مجھے بھی وہ چھوٹا سا لیکن اہم معاملہ یاد آ جاتا اور میں بی فور کی حیثیت سے اسے ہدایت جاری کر دیتا کہ آئندہ ڈینی کو نمبر تین میں بلا روک ٹوک جانے دیا جائے اور وہ یہ حکم جیوا ہاؤز کے محافظوں تک پہنچا دیتا۔ پچھلی بار میں نے جہانگیر سے بات کر کے محافظوں سے اپنی گلو خلاصی کرا لی تھی لیکن مجھے یقین تھا کہ نئی ہدایت کی غیر موجودگی میں وہ میرے بارے میں محتاط رہیں گے اور مجھے اس بات کا موقع نہیں دیں گے کہ میں تین نمبر میں گھس سکوں۔

ہوا بھی یہی۔ میں جیوا ہاؤز کے پورچ میں کار سے اتر کر اندر چلا تو دو میں سے ایک محافظ میرے ساتھ ہو لیا۔

"کیا بات ہے نورے؟" میں نے قدموں کی چاپ پر پلٹ کر ناگوار لہجے میں سوال کیا۔ "یہ آج میرے پیچھے کیوں لگے ہوئے ہو؟"

"ہم حکم کے بندے ہیں ڈینی صاحب!" وہ مجھ سے نگاہیں چار کر کے سنجیدگی سے بولا۔ "ہمیں تین نمبر کے بارے میں سخت احکام ملے ہوئے ہیں، کل تم موقع پا کر وہاں گھس گئے اور ہمیں واپسی پر تمھیں روکنا پڑا۔ وہ تو غنیمت ہوا کہ جہانگیر کا پارہ نہیں چڑھا ورنہ وہ ہمیں سولی چڑھا دیتا۔" میری دانست میں وہ قطعی حق بجانب تھا۔

"مجھے تین نمبر ہی میں جانا ہے۔" میں نے رک کر کہا۔ "کل کے تجربے کے باوجود تم میری راہ میں حائل ہو رہے ہو، وہ حکم میرے لیے نہیں تھا۔ باہر جا کر اپنی ڈیوٹی سرانجام دو۔"

میری کوشش تھی کہ وقت ضائع کیے بغیر میں ٹرانسمیٹر تک پہنچ جاؤں لیکن

"نہیں سر۔" وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ "کل جو کچھ ہوا وہ کل ہی کے لیے تھا۔ آگے کے لیے کوئی حکم نہیں ملا تھا، اس کا مطلب ہے کہ تین نمبر سے تم ابھی دور ہی رہو گے۔ ادھر گئے تو میں گستاخی کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔"

"میرے ساتھ آؤ۔" میں غصیلے لہجے میں یہ کہتے ہوئے فون کی طرف بڑھ گیا۔

سلسلہ ملنے پر دوسری طرف سے جہانگیر کی بیوی نے ریسیور اٹھایا تھا۔ میری آواز پہچانتے ہی وہ کھل گئی۔ اس نے بہت شوخ اور جارحانہ لہجے میں میری مزاج پرسی کی تھی لیکن میرے اعصاب پر یہ فکر سوار تھی کہ گھڑی کی سوئیاں سات سے آگے سرک رہی تھیں۔ بی ون وقت پر مجھے ایم ٹی ہنڈرڈ پر موجود نہ پا کر برہم ہو سکتا تھا۔

میری طرف سے عجلت کے اظہار پر اس کا لہجہ خشک ہو گیا۔ چند ثانیوں بعد ہی دوسری طرف جہانگیر لائن پر آ گیا۔

"میں تین نمبر میں جانا چاہتا ہوں لیکن تمھارے آدمی میری راہ میں حائل ہیں۔" میں نے بلا کسی تمہید کے کہہ ڈالا۔

"آج پھر۔ لیکن کیوں؟" اس کا لہجہ تحیر آمیز تھا۔

"حکم۔" میں نے مختصراً کہا۔ "میرے پاس وقت کم ہے۔"

"لیکن مجھے اس بارے میں کوئی ہدایت نہیں ملی۔" اس کی آواز ابھری، لہجہ شکایت آمیز تھا۔ "تم نے اس بارے میں کل بھی مجھے ٹال دیا تھا۔"

"حقیقت بتائی تھی۔" میں بحث میں الجھنے کے بجائے ایسے فقروں سے کام چلا رہا تھا کہ قریب کھڑا ہوا نورا میرے جوابات سے گفتگو کی نوعیت کے بارے میں کوئی اندازہ نہ لگا سکے۔ "تم نے کل والا واقعہ بتایا تو کیا جواب ملا تھا؟"

"میری بات ہی نہیں ہوئی کسی سے۔" اس نے سفید جھوٹ بولا اور میں دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔

"میں ریسیور نورے کو دے رہا ہوں۔" ماؤتھ پیس میں یہ کہہ کر میں نے ریسیور نورے کو تھما دیا اور یوں میری مشکل آسان ہو گئی۔ نورے کا تسلط ختم ہونے کے بعد میں پوری احتیاط کے ساتھ قفل کھول کر تین نمبر میں داخل ہوا تو مجھے مقررہ وقت سے پانچ منٹ کی تاخیر ہو چکی تھی، میں نے اندر سے دروازہ مقفل کیا اور پھر ایم ٹی تھری ہنڈرڈ آن کر دیا اور اس پر ریڈیائی لہروں کا دھیما دھیما شور سن کر میری جان میں جان آ گئی کہ اس وقت تک بی ون لائن پر نہیں آیا تھا۔

میں اطمینان سے سگریٹ سلگا کر کمرے میں ٹہلتا ہوا ٹیپ ریکارڈر کی طرف چلا گیا۔ اس میں کیسٹ جوں کا توں موجود تھا۔ پھر میں نے کیمرے کا جائزہ بھی لے ڈالا۔ اس میں بدستور پہلی فلم لوڈ تھی۔ آخر میں میں ایم ٹی تھری ہنڈرڈ سے منسلک کال ریکارڈر پر جھکا تو یہ دیکھ کر چونک پڑا کہ اس میں کسی پیغام کی ریکارڈنگ ظاہر کرنے والا ننھا سا سرخ بلب روشن تھا۔ جس کا مطلب تھا کہ میری غیر موجودگی میں آپریٹس پر کسی نے مجھ سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔

میں نے ایک بٹن دبا کر ریکارڈنگ کے لیے سیٹ کیے ہوئے سوئچ نارمل کیے پھر ٹیپ کو ری وائنڈ کرنے والا بٹن دبا دیا۔ مختصر سی گردش کے بعد کیسٹ رک گیا اور میں نے آواز کھول کر اسے چلا دیا۔

"بی ون فار بی فور۔" ریڈیائی شور کے پس منظر میں ریکارڈ کی ہوئی بی ون کی آواز بہت واضح تھی۔ "حالات بہت مخدوش ہو گئے ہیں۔ اگلی ہدایات تک ایم ٹی تھری ہنڈرڈ کو ہرگز استعمال نہ کرنا۔ ہدایات کے لیے کوئی اور ذریعہ اختیار کیا جائے گا۔

...ل چند روز کے لیے روپوش ہو جاؤ۔ مجھے شبہ ہے کہ ...تھری ہنڈرڈ کی فریکوئنسی باہر کے کسی آدمی کے علم میں ...ے اور ہمارے پیغامات درمیان میں پکڑے جا رہے ہیں۔ ...ر کو خوف زدہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ پچھلی ہدایات ...رہیں گی۔ اوور اینڈ آل۔" کیسٹ گردش کرتا رہا لیکن آواز ...ہو گئی تھی۔ میں نے بٹن دبا کر کیسٹ آف کر دیا۔

...بی ون کا وہ پیغام میرے لیے ناقابلِ فہم تھا۔ اگر کوئی ...اس فریکوئنسی سے واقف ہو چکا تھا اور اس پر ہونے ...تگو انٹر سیپٹ کر رہا تھا تو بی ون کا آخری پیغام بھی ...نے سنا ہو گا اور یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ بی ون ...اصلاتی نظام میں کسی کی مداخلت سے باخبر ہو چکا ہے، ...نے فوری طور پر کسی فیصلہ کن کارروائی کا آغاز کر دیا ہو گا۔ ...ون وہ پیغام ریکارڈ نہ کراتا تو حریف کو ہوشیار کیے بغیر ...سراغ لگانے کی کوشش کر سکتا تھا لیکن کچھ دیر تک غور ...کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ بی ون کا وہ اقدام ایک ...سے درست ہی تھا۔ وہ مجھے اور دوسروں کو ہوشیار ...تو ہماری طرف سے کسی رابطے میں ایسی باتیں کہی جا سکتی ...جو زیادہ بڑی تباہی کا پیش خیمہ بن جاتیں۔

میں اپنے ذہن میں اس گفتگو کو تازہ کرنے کی کوشش ...نے لگا جو بی ون سے پچھلے روز ایم ٹی تھری ہنڈرڈ پر ...ئی تھی۔ وہ گفتگو یاد آتے ہی میرے بدن کے سارے ...وں کے دہانے کھل گئے کیونکہ پچھلے دن بی۔ ون سے ...بار میری گفتگو ہوئی تھی اور اس میں معاملات کے سارے ...اہم پہلو شامل تھے۔

اس گفتگو میں طارق اور سکندر علی کا نام آیا تھا اور ان ...ثیت بھی زیرِ بحث آئی تھی۔ بی ون نے تو یہاں تک ...دیا تھا کہ سکندر علی ہی تنظیم میں بی فور کے عہدے پر فائز ...اسی حوالے سے ایڈکشن کیور سوسائٹی کا نام بھی آیا تھا اور ...نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ میں مالی اعانت کے ذریعے اس ...سائٹی میں گھسنے کی کوشش کروں۔ ایشلے ہاؤز اور ویرا لائیڈ ...نام بھی لیے گئے تھے۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اسی ...گفتگو میں بی فور نے مجھے لاہور کا وہ فون نمبر بتایا تھا جس پر ...ے ایک سے تین بجے کے درمیان اسے ٹو سے ہنگامی ...کے تحت براہ راست ہدایات لی جا سکتی تھیں۔ اگر وہ گفتگو درمیان میں کہیں سنی گئی تھی تو اسے ٹو ...اری شدید خطرے میں پڑ چکی تھی۔ اسی کے ساتھ ایڈکشن ...سائٹی میرے لیے چوہے دان کی صورت اختیار کر گئی

تھی۔ ادھر کا رخ کرتے ہی میرے لیے اس نامعلوم دشمن کی طرف سے ناقابلِ تصور خطرات پیدا کیے جا سکتے تھے۔

اور ان سارے اندیشوں کی تصدیق کے لیے میرے پاس صرف ایک ہی صورت باقی رہ گئی تھی۔

بی ون نے اسی گفتگو کے دوران مجھے اس ٹرک کے بارے میں اطلاع دی تھی جو مال لے کر آ رہا تھا۔ پروگرام کے مطابق تقریباً دو گھنٹے پہلے، پانچ بجے شام سی ون کے آدمیوں کو نیشنل ہائی وے کے اٹھارہویں سنگِ میل پر مخصوص اشاروں اور علامات کے ذریعے ٹرک نمبر پی آر صفر تین نو کا چارج سنبھالنا تھا۔ وہ گفتگو اگر کسی دشمن نے سنی تھی تو اس کا سب سے پہلا وار اسی ٹرک پر ہونا چاہیے تھا۔ ٹرک لوٹا جا سکتا تھا۔ یا اس پر کامیاب چھاپا پڑ سکتا تھا۔

میں نے فوری طور پر اپنا آپریٹس نکالا اور سی ون سے رابطے کی کوشش کرنے لگا۔ دوسری کوشش میں اس کی طرف سے جواب مل گیا۔ اس کی آواز پوری طرح پُرسکون تھی۔

"مال کا کیا رہا؟" میں نے چھوٹتے ہی سوال کیا۔ "ٹرک کہاں ہے؟ اوور۔"

"ٹرک کا مجھے علم نہیں۔ مال میرے آدمیوں کی تحویل میں ہے۔ اوور۔" اس کا جواب سن کر مجھے خاصی تسلی ہوئی کیونکہ کسی دشمن کے اوچھے وار کے نتیجے میں اس تنظیم کے بڑے میری دسترس سے باہر نکل جاتے تو مجھے زندگی بھر اپنی اس ناکامی کا قلق رہتا۔ ٹرک محفوظ تھا لہٰذا دو ہی صورتیں ممکن تھیں۔ یا تو میری اور بی ون کی گفتگو کسی نے نہیں سنی تھی اور کسی بھی طرف سے مجھے مقامی طور پر کسی فوری خطرے کا سامنا نہیں تھا یا گفتگو سننے والا ٹرک پر آنے والے مال کے ذریعے کسی بڑے پر ہاتھ ڈالنے کے چکر میں تھا۔

ان دونوں میں سے جو بھی صورت حال پیدا ہوئی تھی وہ احتیاط کی متقاضی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں کوئی واضح صورتِ حال سامنے آنے تک دور رہ کر جائزہ لیتا رہوں گا۔ بی ون کی طرف سے مجھ پر سے ہر پابندی ہٹا لی گئی تھی۔ اس طرح مجھے اپنے طور پر پیش قدمی کے لیے مہلت مل گئی تھی۔

"اگلی ہدایات تک ساری سرگرمیاں معطل رہیں گی۔ فی الحال دو چار روز مجھ سے بھی رابطے کی ضرورت نہیں، فضا سازگار ہوتے ہی میں خود رابطہ قائم کروں۔ اوور۔" میں نے بٹن دبا کر سی ون سے کہا۔

"کیا کوئی بُری خبر ہے؟ اوور۔" سی ون کی آواز میں تشویش امڈ آئی۔

اس کا وہ سوال غیر ضروری تھا لیکن وہ میرے لیے اس سے قریب ہونے کا اچھا موقع تھا۔ "بری خبر ضرور ہے لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں تم کو کس حد تک اعتماد میں لے سکتا ہوں۔ اوور۔" میں نے شوشہ چھوڑا۔

"کیا یہ کافی نہیں کہ سکندر علی کے بعد تمہیں عارضی اختیارات میرے توسط سے ملے تھے اور بی ون سے ہدایات بھی میرے ہی ذریعے ملتی تھیں۔ اوور۔" اس نے پہلی بار سکندر کا نام لیا تھا جس کا مطلب تھا کہ وہ اچھی طرح اس بات سے واقف تھا کہ کب کس کو کس حد تک اعتماد میں لینا ہے۔

"مجھے کل ہی پتا چلا کہ سکندر مجھ سے پہلے بی فور تھا۔" میں نے گہرا سانس لے کر کہا۔ "میرے لیے یہ ماننا دشوار ہے کہ وہ نہ مارا جاتا تو مجھے بی ون تمہارے ذریعے ہدایات دیتا۔ کیونکہ ایم ٹی تھری ہنڈرڈ تو میری تحویل میں تھا۔ اوور۔"

"میرا اس سے فون پر رابطہ تھا۔" قدرے توقف کے بعد سی ون کی آواز ابھری۔ "آج میں دو مرتبہ کوشش کر چکا ہوں لیکن ادھر سے کوئی جواب نہیں مل رہا۔ یہ غیر معمولی بات ہے، اسی لیے میں پریشان ہوں۔ اوور۔"

میرے سر سے ایک بڑا بوجھ ہٹ گیا۔ سی ون نے ایک بہت اہم مسئلہ صاف کر دیا تھا، اس کے اس حد تک کھل جانے کے بعد میں نے بھی اسے اعتماد میں لینے کا فیصلہ کر لیا۔ "آج بی ون سے میری بات نہیں ہو سکی لیکن کال ریکارڈر پر اس کا پیغام موجود تھا۔ یہ بات تم اپنی ذات تک محدود رکھو گے۔ اسے شبہ ہے کہ ایم ٹی تھری ہنڈرڈ کسی کے آبزرویشن میں آ گیا ہے۔ اوور۔"

"یعنی فی الحال رابطہ ختم؟ اوور۔" سی ون کی تحیر آمیز آواز ابھری۔

"ہاں۔ حالات سازگار ہونے پر وہ خود رجوع کرے گا۔ اوور اینڈ آل۔"

میں نے ٹرانسمیٹر آف کر دیا۔ ایم ٹی تھری ہنڈرڈ بدستور آن تھا لیکن اس پر ہلکے ہلکے ریڈیائی شور کے علاوہ کوئی آواز نہیں تھی۔ میں نے اسے آف کیا اور پھر تین نمبر سے باہر نکل آیا۔

بی ون نے کسی ہنگامی ضرورت کے لیے مجھے اے ٹو کا لاہور کا نمبر دیا تھا۔ میری دانست میں وقت آ گیا تھا کہ میں رات کے ایک بجے کے بعد اس سے بات کرنے کی کوشش کرتا۔

برسوں میں تنظیم کے ایک غیر اہم کارندے کی طرح محض سکندر علی کے احکامات پر عمل کرتا رہا۔ اس دوران میں میں نے خطیر رقم کمائی مگر تنظیم میں کوئی اہمیت حاصل نہ کر سکا۔

اب حالات بدلنے شروع ہوئے تو اتنی تیزی سے میری مٹھی میں سازگار ہو چلے تھے کہ میں خود بی فور بن چکا تھا، سی ون اور رخشی میرے سامنے تھی، بی ون سے میری گفتگو ہو چکی تھی اور اب اے ٹو سے رابطہ قائم ہونے والا تھا۔ تنظیم کی بکھری بکھری سی کڑیاں بتدریج سامنے آتی جا رہی تھیں اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے تھوڑے ہی عرصے میں ان کڑیوں کو یکجا کر کے میں تنظیم کے اصل سربراہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔

اے ٹو سے گفتگو اور حامد کے دوستوں سے ملاقات کے بعد میں فوری طور پر لاہور روانہ ہونے کا فیصلہ کر چکا تھا تاکہ بے یقینی کے اس ماحول سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کی صفوں میں انتشار پیدا کر سکوں۔

میں اپنے خیالات کی رو میں ڈوبا ہوا جیوا ہاؤز سے روانہ ہوا تو میرے ذہن کے کسی بعید ترین گوشے میں بھی یہ امکان موجود نہیں تھا کہ رخشی ڈھٹائی کے ساتھ دوبارہ مجھ سے آ ٹکرائے گی۔

وہ پوری حشر سامانیوں کے ساتھ اسی موڑ پر میری منتظر تھی جہاں اس سے پچھلی رات ملاقات ہوئی تھی۔ پہلے موڑ سے میری کار گھومی تو اس کا رخ میری ہی طرف تھا۔ اس نے گاڑی پہچان کر مجھے روکنے کے لیے ہاتھ اٹھا دیا تھا۔ میں تو خیر اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ تنظیم کے کسی بڑے کی طرف سے سکندر علی کی نگرانی کے لیے مامور کی گئی تھی اور اس کی معزولی اور پھر موت کے بعد میرے بی۔ فور بنتے ہی اسے میرے پیچھے لگا دیا گیا تھا تاکہ وہ میری پل پل کی مصروفیات پر نگاہ رکھ سکے لیکن اسے ذرا بھی شبہ نہیں تھا کہ میں اس کی اصلیت سے واقف ہو چکا ہوں۔ وہ نادانستگی کا اظہار کرتے ہوئے دانستہ مجھ سے ٹکرائی تھی اور مجھے مختلف حربوں سے گھائل کرنے کی ہر ممکن تدبیریں کر گزری تھی اور آخر کار اگلی ملاقات کا تعین میری مرضی پر چھوڑ کر رخصت ہو گئی تھی۔

پچھلی رات وہ دس بجے کے بعد وہاں ملی تھی اور اس روز ساڑھے سات بجے ہی وہاں کھڑی ہوئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اسے میرے معمولات سے بہت زیادہ آگاہی حاصل تھی۔ پچھلی رات کے بارے میں تو خیر یہ تصور کیا جا سکتا تھا کہ سی۔ ون نے اسے جیوا ہاؤز میں میری طلبی کے وقت سے آگاہ کر دیا ہو گا مگر اس وقت اس کے ظہور کا مطلب تھا کہ بی۔ ون یا کسی اور نے اسے بتا دیا تھا کہ اب میرے لیے روز سات بجے شام جیوا ہاؤز کے تین نمبر میں حاضری لگوانا ضروری ہو گیا ہے اور وہ جب چاہے مقررہ وقت پر اس موڑ پر مجھ کو پکڑ سکتی ہے — میں دل ہی دل میں ہنس دیا۔ اسے سب کچھ علم رہا ہو لیکن یہ نہیں معلوم ہو گا کہ حالات اچانک بدل گئے تھے اور مجھے غیر معینہ مدت کے لیے ایم ٹی تھری ہنڈرڈ کی حاضری سے نجات مل گئی تھی۔

لیکن وہ خوبصورت شکاری، سی۔ ون کے ساتھ رہتی تھی، جسے چند منٹ پہلے بدلے ہوئے حالات سے آگاہ کر چکا تھا۔ وہ گھر لوٹتی تو بھی ان حالات کا علم ہو جاتا۔ یوں وہ میرا سراغ کھو کر میری طرف سے رابطے کے انتظار پر مجبور ہو جاتی۔

وہ نظر آ ہی گئی تھی تو میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ حامد کے ساتھیوں سے اگلے روز ملاقات کے لیے شہباز کے نام سے انڈس ہوٹل میں کمرہ حاصل کر چکا تھا اور ہوٹل والے اچھی طرح جانتے تھے۔ لہٰذا میں بے خوف و خطر ہو کر رخشی کے ساتھ جا سکتا تھا۔

میں نے کار روکی تو وہ بلا تردد مسکراتی ہوئی میرے ساتھ کی نشست پر بیٹھ گئی۔ گاڑی کا انجن نیوٹرل میں دھیمے دھیمے غرا رہا تھا لیکن میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ دروازہ بند کر کے وہ میری طرف متوجہ ہوئی تو نگاہیں چار ہوتے ہی لگاوٹ کے انداز میں مسکرانے لگی۔

"آج کس سے مل کر آ رہی ہو؟" میں نے اسے گھورتے ہوئے سپاٹ لہجے میں سوال کیا۔

"کسی سے بھی نہیں۔" شرمساری کے بجائے وہ دیدہ دلیری کے ساتھ بولی۔ "میں تو ادھر آتی ہی رہتی ہوں۔ یہ بتاؤ کہ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ مجھ سے تو تم نے آج مصروفیت کا عذر کیا تھا۔"

"میرا سیٹھ یہاں رہتا ہے۔" میں نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "لیکن تم یہاں کیوں آتی رہتی ہو؟"

"خوشحال اور بے فکرے لوگوں کی بستی ہے۔" وہ بے پروائی سے بولی۔ "نہ پکڑ دھکڑ کا اندیشہ ہوتا ہے، نہ کسی کو بھتہ دینا پڑتا ہے۔"

"ذلت کی آخری منزل پر پہنچ چکی ہو۔" میں نے کراہت آمیز لہجے میں کہا۔ "کوئی تم سے گھر ملنے آئے تو تمہارا ساتھی برا مانتا ہے۔ تمہاری ان حرکتوں پر مجھے تو تم پر شبہ سا ہونے لگا ہے، کہیں لٹیروں کی کسی ٹولی میں تو شامل نہیں ہو۔"

وہ ہنس پڑی۔ "لوٹا تو ایک ہی مرتبہ تھا۔ چادر کے تحفظ کے خیال کے بعد ایک شام میں چادر اوڑھے کھڑی تھی۔ ایک شریف آدمی کو ٹھٹھولی پھر اسے دھمکایا کہ اس نے پرس خالی نہ کیا تو شور مچا دوں گی۔ بیچارہ کوڑوں کے خوف سے لرز گیا اور مفت میں بائیس سو روپے دے گئے۔ وہ تفریح تھی ورنہ لوگ خوشی سے لٹنے پر آمادہ ہوں تو دل آزار لوٹنے کا کیا فائدہ۔ رہا میرا ساتھی، تو گھر کی حدود میں کسی کا وجود برداشت نہیں کر سکتا۔ اسے میرے طور طریق کا علم ہے، کبھی کبھار مجھ سے حصہ بھی لے لیتا ہے۔ میری وجہ سے اسے عیالدار شرفا کی آبادی میں مکان ملا ہوا ہے، لوگ ہمیں میاں بیوی سمجھتے ہیں۔"

"تمہیں شرم نہیں آتی اپنے وجود پر؟" اس کے بے باکانہ رویے نے مجھے چڑا دیا اور میرا لہجہ تلخ ہو گیا۔

"پہلے آتی تھی اب نہیں آتی۔" اس نے بلا تامل جواب دیا۔ "کئی جگہ ملازمت کی لیکن ہر جگہ حریص لوگوں کی ذلیل نگاہوں نے پیچھا کیا۔ قلیل تنخواہ میں پہن لیا تو بھوکا رہنا پڑا، پیٹ بھر لیا تو پیرہن جواب دینے لگے۔ جب سے ملازمت چھوڑ کر لاابالی کی زندگی اپنائی ہے، خوشحال رہی ہوں۔"

"ملازمت ایک تم ہی نے نہیں کی ہو گی، ہزاروں کرتی ہیں۔" اس کے عزائم سے واقف ہونے کے باوجود میں غصے کی رو میں آ کر بحث میں الجھ گیا۔

"برا لگتا ہے تو میری مدد کرو۔" وہ سرگوشیانہ لہجے میں بولی۔ "سب حرکتیں چھوڑ دوں گی۔ کوئی میری کفالت کرے تو مجھے پاگل کتے نے نہیں کاٹا ہے کہ در بدر خوار پھروں۔"

میں فوراً ہی سنبھل گیا۔ وہ اول درجے کی مکار تھی۔ بنہایت خوبصورتی کے ساتھ گفتگو کو اپنی پسند کا رخ دے دیا تھا۔ میں ہنس پڑا۔ "مجھے کیوں برا لگے گا؟ اگر تم گھناؤنی زندگی بسر کرنا چاہتی ہو تو کوئی بھی تمہیں نہ روک سکے گا۔ بس ملازمت پیشہ لڑکیوں کو کوئی الزام نہ دو کیونکہ ہزاروں لڑکیاں عزت اور آبرو کے ساتھ اپنے گھرانوں کو پال رہی ہیں۔"

"میں مذاق نہیں کر رہی۔" وہ سنجیدگی کے ساتھ بولی۔ "مجھے اپنے ساتھی سے خوف آنے لگا ہے اور میں کسی بہتر ٹھکانے کی تلاش میں ہوں۔ اس کی مصروفیات کچھ مشکوک سی ہیں، کسی دن اپنے ساتھ مجھے بھی لے ڈوبے گا۔"

"اسے چھوڑ کر الگ کوئی مکان لے لو۔" میں نے بے اعتنائی سے کہا۔ میں اس کے ساتھی کے ذکر سے دانستہ گریز کرنا چاہ رہا تھا۔

"نوکری کرنے والی اکیلی عورت ہر جگہ شبہے کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔"

"پھر ایک پتا بتائے دیتا ہوں۔ سوسائٹی میں مسز خان کے نام سے ایک جرمن بیوہ نے فرنچ اور جرمن سکھانے کا ٹیوشن سینٹر کھول رکھا ہے۔ وہاں داخلہ لے لو۔ ہزار بارہ سو میں رہنے کے لیے کوئی کمرہ بھی دے دے گی۔"

وہ شاید مسز خان کے بارے میں جانتی تھی۔ تنک کر بولی۔ "پھر وہی مذاق۔ تم سنجیدہ نہیں ہو سکتے میرے بارے میں؟"

"اس لباس میں مشکل ہے۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بیچارگی سے کہا۔ "آج فرصت ہے تو کیوں نہ تمہیں سیر ہی کرا دوں۔" میری بات سنتے ہی اس کے چہرے پر خوشی کی ایک لہر سی آ کر گزر گئی۔

راستے بھر وہ مسلسل میرے کان کھاتی رہی اور میں اس کے بارے میں اپنی حکمت عملی کے بارے میں سوچتا رہا۔ جب گاڑی انڈس ہوٹل کے قریب رکی تو وہ چونک پڑی۔ "یہ کہاں لے آئے تم مجھے؟"

"اس ہوٹل میں سنکی سیٹھ کا ایک کمرہ مستقل بک رہتا ہے۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "آج اتفاق سے چابی میرے ہی پاس ہے۔"

"اور اگر تمہارا سیٹھ ادھر آنکلا؟" وہ مایوسانہ لہجے میں بولی۔

"اس کی فکر نہ کرو۔ پچپن سال کی عمر میں جینز اور ٹی شرٹ پہن کر چھوکرا بنا پھرتا ہے لیکن بالکل بے ضرر ہے۔ بیس سال کی لڑکی سے دوسری شادی کر کے پھنس گیا ہے، وہ اسے شام کو گھر سے اکیلا نکلنے ہی نہیں دیتی۔ شام میں یہاں اس کی آمد کا کوئی خطرہ نہیں۔"

میں اس کے ہمراہ ہوٹل میں داخل ہوا تو عملے کے شناسا چہروں نے خلیقانہ مسکراہٹ کے ساتھ استقبال کیا۔ میں نے کمرے میں پہنچ کر انٹرکام پر منیجر سے بات کی اور تھوڑی ہی دیر میں وہ بے چارہ پرانے اخباری کاغذ میں لپٹی ہوئی کوئن این اسکاچ کی میگنم سائز بوتل لیے آپہنچا۔

منیجر کے جاتے ہی رخشی بھڑکی تھی۔ سب سے پہلے اس نے اسکاچ کی [illegible] سے نفرت ظاہر کر کے مجھے [illegible] رکھنا چاہا لیکن میں باز آتا نظر نہ آیا تو اس نے طوعاً وکرہاً مجھے تو پینے کی اجازت دے دی لیکن خود دور جا بیٹھی۔

میں نے اس کے انکار کی پروا کیے بغیر دو گلاسوں میں ڈبل پیگ انڈیل کر برف کے ٹکڑے ڈالے تو وہ تشویش زدہ نگاہوں سے مجھے دیکھتی رہی۔ پھر میرے اصرار پر اسے پینی ہی پڑی۔ جس انداز میں اس نے گلاس سے پہلا گھونٹ لے کر اپنے لب تر کیے اس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اناڑی نہیں تھی۔ غالباً وہ پی کر بہکنے کے خوف سے پرہیز کرنا چاہ رہی تھی۔ یہ نکتہ ذہن میں آتے ہی مجھے عقل آگئی۔

چھوٹے چھوٹے گھونٹ اس کے معدے میں اترتے رہے، وہ خاموش بیٹھی رہی، اس کے بشرے سے فکرمندی کے آثار ہویدا تھے۔ یہ مے نوشی کا مسلمہ اصول ہے کہ فکر اور ذہنی دباؤ کی صورت میں نشہ کچھ زیادہ ہی سر چڑھ کر بولتا ہے لہٰذا اس کا پہلا گلاس خالی ہوا تو وہ سرور میں آچکی تھی۔ اس نے فتح مندانہ نگاہوں سے میری طرف دیکھ کر مجھے اپنا گلاس خالی کرنے کے لیے للکارا اور پھر دوسرا گلاس بنانے میں مصروف ہو گئی۔

اس کی آنکھوں میں خمار اترنے لگا، پہلے آواز بھاری ہوئی پھر زبان پر لکنت طاری ہونے لگی۔ تیسرا گلاس اس نے جھومتے ہوئے تیار کیا اور اس میں سے پہلا گھونٹ لیتے ہی اس کا سر بے اختیار میز پر ٹکتا چلا گیا۔ میں نے اس کی ذہنی کیفیت کا اندازہ لگانے کے لیے اس سے چند بے مقصد سی باتیں کیں اور یہ اندازہ ہو جانے کے بعد کہ اس کا ذہن ہر گرفت سے آزاد ہو چکا تھا، میں نے اچانک ہی مطلب کی بات چھیڑ دی۔ میری زبان سے سکندر علی کا نام سن کر اس نے میز پر سے سر اٹھائے بغیر..... اپنا داہنا ہاتھ فضا میں لہرایا اور لڑکھڑاتے ہوئے شکستہ لب و لہجے میں بڑبڑانے لگی۔ میں بمشکل اس کی اس ذہنی رو کو موڑنے میں کامیاب ہو سکا۔ میں نے تیسرے گلاس میں سے مزید کچھ سیال اس کے معدے میں اتارا اور میرے سوال کے جواب میں وہ ہچکی لے [illegible] ہنس پڑی۔ اس کی اکھڑی اکھڑی ہنسی تھمی تو اس نے کسی اندھے [illegible] طرح ٹٹولتے ہوئے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھایا جو میں نے [illegible] پر رکھ دیا۔ مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ اگر اسے مزید پلا دی گئی تو وہ ناکا[illegible] کر رہ جائے گی۔

سی۔ ون کا اصل نام قاسم تھا اور وہ برسوں سے ایک دوسرے سے واقف تھے۔ اسے قاسم ہی نے تنظیم میں شامل کرایا تھا۔ سکندر [illegible] کے علاوہ وہ صرف قاسم اور اس کے کام سے واقف تھی یا پھر اسے بی۔ [illegible] کا نام معلوم تھا۔ سکندر علی کے بارے میں وہ اپنی رپورٹ اس کی لا[illegible] میں ایم۔ ٹی۔ تھری ہنڈرڈ پر بی۔ ون کو دیتی اور اسی سے براہ راست ہدایات حاصل کرتی تھی۔ نچلے درجے پر جدید مواصلاتی آلات [illegible] استعمال ہیروئن کے ساتھ شروع ہوا تھا لیکن ایم۔ ٹی۔ تھری ہنڈر[illegible] [illegible] زیر استعمال چلا آرہا تھا۔ اس لیے اس نے جو کچھ بتایا وہ [illegible] لیے نیا نہیں تھا۔

اس وقت تک بی۔ ون سے میرا رابطہ قائم ہو چکا تھا لہٰذا رخشی میری معلومات میں کوئی اضافہ نہ کر سکی البتہ میرے ذہن سے یہ خیال نکل گیا کہ سکندر علی کی مخبری کے باعث وہ کسی بڑے سے واقف تھی اور اس سے باقاعدہ رابطہ رکھتی تھی۔ سکندر علی، قاسم اور رخشی سے شروع ہونے والی ہر کہانی بی۔ ون کے پراسرار نام پر ختم ہو جاتی تھی۔ اس سے اوپر اے۔ ٹو کا نام میرے سامنے تھا۔ اسی سے رجوع کر کے میں [illegible] معلومات میں اضافہ کر سکتا تھا۔

مجھے یقین تھا کہ ہوش میں آنے کے بعد رخشی کو ذہن پر چھا[illegible] والی دھند کے علاوہ کچھ یاد نہیں رہے گا لیکن میں اسے اس کی بہکی ہوئی گفتگو کے حوالے سے خوفزدہ کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

گیارہ بجے میں نے کافی عرصہ بعد بدلی ہوئی آواز میں جہانگیر کے گھر فون کیا۔ دوسری طرف سے سلمیٰ کی آواز سنائی دی۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ اس درشت اور روکھی آواز سے سخت متنفر تھی جسے سنتے ہی اس کا شوہر اپنی چوکڑی بھول جاتا تھا لیکن اس وقت مجبوری تھی۔ اس نے بتایا کہ جہانگیر گھر پر نہیں تھا اور میں نے مزید کچھ کہے بغیر سلسلہ منقطع کر دیا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر حالات سازگار رہے اور جہانگیر بخیر و عافیت گھر پہنچ گیا تو اس کی بیوی تلخ و ترش لہجے میں اسے میرے فون سے ضرور آگاہ کرے گی اور جہانگیر پہلی فرصت میں موقع نکال کر ٹرانسمیٹر پر مجھ سے رابطہ قائم کرے گا۔

رخشی کو میں انڈس ہوٹل کے کمرے میں بے ہوشی کی حالت میں چھوڑ آیا تھا۔ اس کی حرکات و سکنات سے ظاہر ہو گیا تھا کہ شراب اس کے لیے نئی چیز نہیں تھی لیکن ابتدا میں اس نے مجھے محض اس

وتل کھولنے سے باز رکھنا چاہا تھا کہ خود اس کا تعلق شراب نوشوں س ندیدی قسم سے تھا جو تھنوں میں بو پہنچتے ہی سب کچھ فراموش کے پینے کے لیے بے تاب ہو جاتے ہیں اور اس وقت تک رتے ہیں جب تک بوتل خالی نہ ہو جائے یا ان کے سامنے سے نہ لی جائے۔ تیسرے گلاس کے بعد میں نے بوتل ہٹا دی تھی اور وہ گفتگو میں مصروف ہو گیا تھا۔ مجھ سے باتیں کرتے ہوئے معدے اترتی ہوئی شراب کی گرفت اس کے ذہن پر لحظہ بہ لحظہ بڑھتی ہی اور باتیں کرتے کرتے وہ بری طرح اونگھنے لگی اور یہاں تک کہ ہوش ہو گئی۔

وہ کچھ عرصے پہلے مجھ سے ٹکرائی ہوتی تو شاید اس سے حاصل نے والی معلومات میرے لیے سنسنی خیز ثابت ہوتیں لیکن اس مرحلے شی کی ذات میرے لیے زیادہ سود مند ثابت نہیں ہوئی تھی۔ میں کے گہری نیند سو جانے تک وہاں رکا رہا پھر باہر نکل آیا۔ دروازہ ل کر کے چابی میں نے دروازے اور فرش کی درمیانی خلا سے ے میں سرکا دی تاکہ ہوش میں آنے کے بعد رخشی خود کو اس کمرے میں پا کر دروازے کا رخ کرے تو چابی اس کی نگاہ میں آجائے اور وہ ل میں کوئی غیر معمولی صورتحال پیدا کیے بغیر خاموشی سے واپس لوٹ ے۔ واپس لوٹتے ہوئے میں نے احتیاطاً منیجر کو بتا دیا تھا کہ میری دوست ے میں آرام کر رہی ہے اور اگر وہ میری واپسی سے پہلے لوٹنا چاہے تو یکسی منگوا دی جائے۔ منیجر پر میں نے اپنی واپسی کا ذکر محض اس لحت کے تحت کیا تھا کہ کہیں وہ رخشی کو پریشان نہ کرے۔

اے۔ ٹو سے رابطے کا وقت رات کے ایک سے تین کے درمیان یا گیا تھا مگر اس فون نمبر کے بارے میں میرا ذہن مسلسل الجھن کا شکار ا۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ مقررہ وقت سے پہلے ایک بار پھر اس نمبر کو یا جائے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ ایک بجے سے قبل اس نمبر پر کس کا ف ہوتا ہے۔ میں نے لاہور کا وہ نمبر ملایا جو پہلے سکندر علی کی ڈائری اور پھر بی۔ ون سے ملا تھا تو مجھے خاصی دیر تک انتظار کرنا پڑا۔ چوتھی ٹی کے بعد ریسیور اٹھایا گیا تھا اور اس بار نیند میں ڈوبی ہوئی وہی عمر یدہ آواز ابھری تھی جو میں اس نمبر پر پہلے بھی سن چکا تھا۔

"ذرا منظور صاحب کو بلا دیں۔" میں نے خوابناک نسوانی آواز سنتے ہی کہا۔

"یہاں کوئی منظور صاحب نہیں ہوتے۔" اس عورت کی آواز یں اکتاہٹ عود کر آئی۔

"پھر جو بھی مرد ہو، اسے بلا دیں۔" میں نے اس کی بات مکمل ہوتے ہی کہا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں وہ فوراً ہی سلسلہ منقطع نہ کر دے۔ اس قت میں اس سے قدرے تفصیلی گفتگو کرنا چاہ رہا تھا۔

"یہ غلط نمبر ہے، یہاں کوئی مرد نہیں ہے۔" عورت کی آواز میں اکتاہٹ اور بیزاری بڑھ گئی۔

میں نے نمبر دوہرایا تو اس کی آواز میں بیزاری کے ساتھ ہلکی سی حیرت بھی ابھر آئی۔ "نمبر یہی ہے، شاید سننے یا بتانے میں غلطی ہوئی ہو گی، تم نے اس وقت میری نیند خراب کر کے میرے ساتھ ظلم کیا ہے، مہربانی کر کے اب مجھے تنگ نہ کرنا، میں بیمار ہوں دوبارہ اٹھنا پڑا تو میری حالت بگڑ جائے گی۔"

"لیکن مجھے منظور صاحب سے بہت ضروری کام ہے۔ انارکلی میں ان کی جوتوں......" میں نے احتجاج آمیز لہجے میں کہنا چاہا لیکن چڑچڑے انداز میں میری بات کاٹ دی گئی۔

"منظور و نظور کوئی نہیں رہتا یہاں۔ ایک واری بتا دیا، شریف بندے ہو تو سمجھ جانا چاہیے۔" اور اسی کے ساتھ سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

میں نے بھی پرخیال انداز میں ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ میرے لیے یہ تجربہ حیرتناک تھا۔ عورت کا لب و لہجہ قطعی فطری تھا۔ اس کی بنا پر یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ وہ جھوٹ بولی ہو گی۔ بیماری کے بارے میں بھی اسے جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اگر وہ خود ہی اے۔ ٹو تھی تو اس کی آواز میں بیزاری اور چڑچڑے پن کے بجائے تحکمانہ وقار ہونا چاہیے تھا پھر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ رات کے سوا گیارہ بجے ہی گہری نیند سو رہی تھی جس کی تصدیق اس بات سے ہوتی تھی کہ ریسیور چوتھی گھنٹی کے بعد اٹھایا گیا تھا۔ اس کے بیان کے مطابق فون اس کے بستر سے اتنی دور تھا کہ کال ریسیو کرنے کے لیے اسے بستر چھوڑ کر آنا پڑا تھا۔ اگر وہ خود ہی اے۔ ٹو تھی یا کسی طرح اس سے وابستہ تھی تو اصولی طور پر اسے فون اپنے سرہانے رکھ کر سونا چاہیے تھا تاکہ اہم پیغامات بلاتوقف وصول کر سکے۔ وہ تو ان میں سے معلوم ہو رہی تھی جو رات گئے کال وصول کرنے کے بجائے غنودہ ذہن کے ساتھ اس امید پر بستر میں دبکے رہتے ہیں کہ فون کرنے والا طویل انتظار سے اکتا کر خود ہی سلسلہ منقطع کر دے گا۔

بہرحال اس تازہ تجربے نے میرے پچھلے مشاہدے کی توثیق کر دی تھی اور ایک بجے کے بعد فون کر کے میں اس پراسرار معاملے میں کوئی حتمی رائے قائم کر سکتا تھا لیکن ایک بجنے میں خاصی دیر تھی اور میرے پاس ایک اور کام موجود تھا لہٰذا میں نے اسی کو نمٹانے کا فیصلہ کر لیا۔

سی۔ ون کا فون نمبر ویسے تو مجھے سکندر علی کی ڈائری سے مل ہی گیا تھا لیکن رخشی نے اپنے کسی دوست کی رہائش گاہ کے حوالے سے وہی نمبر مجھے بتایا تھا۔ رخشی کو میں انڈس ہوٹل کے کمرے میں مقفل کر آیا تھا، مجھے امید نہیں تھی کہ وہ چار پانچ گھنٹوں سے پہلے ہوش میں آ کر ہوٹل چھوڑنے کے قابل ہو سکے گی۔ اس اعتبار سے اس گھر میں سی۔ ون کو موجود ہونا چاہیے تھا اور میں رخشی کے ساتھ اسے بھی سبق دینے کا ارادہ

کر چکا تھا لہٰذا میں نے سی ون کا نمبر گھما ڈالا۔

"ہیلو!" دوسری طرف سے فوری طور پر جواب ملا تھا اور آواز یقینی طور پر سی ون کی تھی لیکن میں اس پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ میں نے اسے پہچان لیا ہے۔

"تم قاسم ہی بول رہے ہو نا؟" میں نے اپنی آواز تبدیل کیے بغیر طنزیہ لہجے میں سوال کیا۔ لائن پر لحظہ بھر کے لیے سکوت چھا گیا۔ میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ اس نے بھی میری آواز پہچان لی تھی لیکن مخمصے میں پڑ گیا تھا کہ مجھ پر اس کا اظہار کرے یا نہ کرے۔ میں اپنی جگہ مطمئن تھا کیونکہ اس وقت گفتگو رخشی کے حوالے سے ہونا تھی۔

"تمہیں یہ نمبر کس نے دیا ہے؟" توقف کے بعد سوال کیا گیا۔

"تمہاری ماں نے، اس کے علاوہ اور کون دے سکتا ہے؟" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"اوہ۔" اس کی آواز میں اضطراب کی ایک ہلکی سی لہر تھی۔ "کہاں ہے وہ؟"

"ہونا تو اسے کسی کوڑا گھر میں چاہیے تھا لیکن میں اسے ایک ہوٹل میں بند کر آیا ہوں۔" میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ "شراب کی عادی ضرور ہے لیکن اسے ہضم کرنا اس کے بس سے باہر ہے۔ معلوم ہوتا ہے معدے کے بجائے ساری اس کے دماغ ہی میں پہنچی ہے۔"

"شاید تمہیں اندازہ نہیں کہ اس طرح تم ایک جرم کا ارتکاب کر بیٹھے ہو؟" اس نے کہا۔

"اس کی اپنی زندگی بھی مجرمانہ ہی ہے۔ میں نے اسے بند کر دیا تو کون سا غضب ہو گیا؟"

"تم چاہتے کیا ہو؟" اس کی آواز میں تشویش پیدا ہو گئی۔

"فی الحال مقصد صرف اتنا تھا کہ تمہیں اس کے حشر سے آگاہ کر دوں۔" میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ "تم نے اسے کس مقصد سے میرے پیچھے لگایا تھا؟ کس کے لیے کام کر رہے ہو تم؟"

اس کی آواز الجھن آمیز ہو گئی۔ "تمہیں کوئی بڑی غلط فہمی ہوئی ہے۔ مجھے کیا ضرورت تھی اسے تمہارے پیچھے لگانے کی؟ میں تو تم سے واقف بھی نہیں ہوں۔ یہ سب تم کس بنا پر کہہ رہے ہو؟"

"اپنی طرف سے کچھ نہیں کہہ رہا۔ اس نے نشے کی حالت میں کچھ انکشافات کیے تھے جن سے مجھے معلوم ہوا کہ وہ دانستہ میرے پیچھے لگی ہوئی تھی تاکہ میری جملہ سرگرمیوں سے کسی کو باخبر کر سکے۔"

"پھر تو اس نے یہ بھی بتا دیا ہو گا کہ وہ تمہاری سرگرمیوں کی اطلاع کسے دیتی؟" اس کی آواز میں امید کی ہلکی سی کرن عود کر آئی۔

"وہ تمہارے بارے میں بتا ہی چکی تھی، اس کے بعد یہ سوال میرے لیے بے معنی تھا۔ پھر وہ کسی باز پرس کے قابل بھی نہیں تھی۔ نشے کی رو میں خود ہی بولے جا رہی تھی، عورت ذات نہ ہوتی تو شاید میں تشدد کے ذریعے چند ہی منٹ میں اس کا سارا نشہ ہرن کر دیتا۔"

"اگر وہ بہک گئی تھی تو اس کی گفتگو لایعنی رہی ہو گی، اس کی بنا پر تم اسے حبسِ بے جا میں نہیں رکھ سکتے۔" اس کا لہجہ نرم اور مصالحت آمیز تھا۔ "میرا مشورہ ہے کہ اسے رہا کر دو۔ میں دیکھوں گا کہ اس نے تم سے کیا بکواس کی ہے؟"

"میرا مقصد بھی یہی تھا۔" میں نے مکارانہ لہجے میں کہا۔ "کمرہ مقفل کر کے میں چابی کمرے ہی میں ڈال آیا ہوں۔ ہوش میں آنے کے بعد وہ خود ہی لوٹ آئے گی لیکن دوبارہ اس نے میرا رخ کیا تو میں کوئی رعایت نہیں برتوں گا۔ فون نمبر کے ذریعے تم تک پہنچنا بھی میرے لیے دشوار نہیں ہو گا۔ میں برا آدمی نہیں ہوں لیکن اپنے معمولات میں بیجا مداخلت سے نمٹنا اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"تمہارا غصہ بالکل بجا ہے۔" بالآخر توقف اس کی جاندار آواز ابھری۔ "وہ کس ہوٹل میں ہے؟ مجھے بتا دو تاکہ میں اسے وہاں سے لے آؤں۔ ایسا نہ ہو کہ نشے کی جھونک میں مزید دشواریاں مول لے بیٹھے۔"

"ایسا ہوا تو مجھے خوشی ہو گی۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "تھوڑی بہت سزا تو اسے ویسے بھی ملنی ہی چاہیے۔" یہ کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ میں نے تنظیمی امور سے متعلق کسی اشارے کا ذکر نہیں کیا تھا۔ میں اسے یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ میں نے رخشی کو کسی حریف کی جاسوسہ تصور کیا تھا۔ اس طرح نہ صرف رخشی کی گوشمالی کے امکانات پیدا ہو گئے تھے بلکہ آئندہ کے لیے اس کے مجھ پر مسلط کیے جانے کا امکان بھی ختم ہو کر رہ گیا تھا اور میرا مقصد بھی یہی تھا کہ میں سکندر علی کی طرح اپنی جملہ آزادیوں سے محروم نہ ہو سکوں۔ رخشی سے اور اس کے دوغلے کردار سے میں بخوبی واقف تھا لہٰذا اس کے جال سے صاف بچ نکلا تھا۔ دوسری طرف بی۔ ون کے آخری پیغام کے نتیجے میں جو صورتحال سامنے آئی تھی، اس کی روشنی میں مجھے قوی امید تھی کہ اوپر والے فوری طور پر کسی نئے چہرے کو میرے پیچھے لگانے کے بجائے اپنا وقت نئی صورتحال کے مقابلے میں صرف کریں گے اور میں کچھ عرصے کے لیے سکون سے اپنا وقت گزار سکوں گا۔ اس کے بعد مجھے بس ایک ہی احتیاط کرنا ہوتی کہ کسی اجنبی کو خود سے اس قدر قریب نہ آنے دوں کہ وہ مجھ پر مسلط ہو سکے۔

میری توقع کے عین مطابق بارہ بجے کے بعد ٹرانسمیٹر پر جہانگیر کا پیغام موصول ہوا۔ میں نے آپریشن آن کرتے ہی اس سے بی۔ فور کی حیثیت سے مال کے بارے میں سوال کیا جس پر اس نے بتایا کہ جیوا ہاؤز میں اس نے بحفاظت مال کی ڈلیوری لے لی تھی اور پھر سیلا مال آگے تقسیم کر دیا تھا۔ اس کی آواز دبی دبی اور تشویش ناک سی تھی۔ شاید وہ میری اس غیر معمولی کال کے سلسلے میں پریشان تھا لیکن میں نے مال کے بارے میں اس کی رپورٹ سننے کے بعد فوراً ہی سلسلہ

ع کر دیا۔

جہانگیر کے اس پیغام نے میرے لیے صورتحال کو خاصا سلجھا [...]تھا۔ بی۔ ون کے ریکارڈ کیے ہوئے پیغام میں خدشہ ظاہر کیا گیا تھا [...]یم۔ ٹی تھری ہنڈرڈ کی ٹرانسمیشن فریکوئنسی کسی کے علم میں آ گئی تھی [...]وہ اس پر نشر ہونے والے پیغامات سن رہا تھا لیکن جہانگیر تک [...]کی رسائی سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ پچھلی رات میری اور بی۔ ون [...]کو کسی غیر متعلقہ آدمی نے نہیں سنی تھی اور اگر سنی بھی تھی تو وہ [...]س قدر بے سروسامان اور مجبور تھا کہ نیشنل ہائی وے کے اٹھارہویں [...]میل پر ٹرک نمبر پی آر صفر تین نو کے خلاف بروقت کوئی کارروائی [...]یں کر سکا تھا۔

ایک بج کر تین منٹ پر میں نے انتہائی سنسنی کے احساس [...]ے ساتھ لاہور کا وہ نمبر ملایا جس پر کچھ دیر قبل ایک بیمار عورت سے [...]ذکر چکا تھا۔ آخری ہندسہ ڈائل کرتے ہی دوسری طرف سے [...]ٹیون سنائی دی اور میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ کچھ دیر قبل [...]لاچار اور مجبور ظاہر کرنے والی مقررہ وقت پر اپنی بیماری فراموش [...]ے ہدایات و پیغامات جاری کرنے کے پُراسرار کام میں مصروف [...]ی تھی۔

تھوڑے سے توقف کے بعد میں نے دوبارہ نمبر ملایا تو دوسری [...]ی گھنٹی بجتے ہی ریسور اٹھا لیا گیا اور پھر میرے کانوں میں ایک [...]ری مردانہ آواز گونج اٹھی جس میں تحکم کا انداز نمایاں تھا۔

"مجھے اے۔ ٹو سے بات کرنی ہے۔" میں نے جھجکتے ہوئے اپنے [...]ا کا اظہار کیا۔ اس کے بارے میں میرا پہلا تاثر یہ تھا کہ وہ مرضی کے [...]ن کوئی بات رونما ہونے پر فوراً ہی بھڑک جانے کا عادی رہا ہو گا۔

"بول رہا ہوں۔" وہ آواز درشت ہو گئی۔ "تم کون ہو؟"

"بی فور۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "مجھے بی۔ ون سے ہدایت [...]تھی کہ کسی ہنگامی......"

"وہ سب مجھے معلوم ہے۔" اس نے خشک لہجے میں میری [...]ت کاٹ دی۔ "اس وقت فون کیوں کیا ہے؟ مختصر الفاظ میں اپنا [...]مابیان کر جاؤ، میرے پاس وقت کم ہے۔"

"میری غیر موجودگی میں بی۔ ون کا ایک پیغام ریکارڈ ہوا تھا۔ [...]اس کے مطابق بی۔ ون کو شبہ ہے کہ ایم۔ ٹی تھری ہنڈرڈ کا راز کسی کے [...]ہاتھ لگ گیا ہے اور وہ فریکوئنسی مخدوش ہو گئی ہے۔ مجھے رابطے کی کوشش [...]ترک کر کے چند روز کے لیے روپوش رہنے کی ہدایت دی گئی ہے۔ اس [...]کال نے مجھے الجھا دیا ہے۔"

"الجھنے کی ضرورت نہیں۔" اے۔ ٹو کا لہجہ پُرسکون تھا۔ "جو کہا گیا [...]ہی کرو۔ حالات سازگار ہوتے ہی تم سے رابطہ قائم کر لیا جائے گا۔ [...]اس وقت تک خاموش بیٹھے رہو لیکن آنکھیں کھلی رہنی چاہئیں۔"

"میں پوری طرح محتاط ہوں۔" میں نے کہا۔ "لیکن میرے ساتھ عجیب واقعہ ہوا ہے۔ کل شہر میں لفٹ لینے کے بہانے ایک لڑکی مجھ سے ٹکرائی تھی۔ میں اس کی طرف سے مشکوک ہو گیا تھا لہٰذا اس کے دام میں نہ آیا۔ وہ آج پھر ملی تھی۔ میں نے اس کی اصلیت معلوم کرنے کی نیت سے اسے اسکاچ پلائی تو وہ بہک کر بہت سے سنسنی خیز انکشافات کرتی چلی گئی......"

"کہانی بنانے کی ضرورت نہیں۔" اس نے خشک لہجے میں مجھے ٹوکا۔ "مختصر الفاظ میں اپنی بات کہنے کی عادت ڈالو۔"

"شاید وہ کسی دشمن کی آلۂ کار ہے، اس نے بتایا کہ سکندر علی کی نگرانی کرتی رہی تھی اور اب اسے مجھ پر مامور کیا گیا تھا۔" میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ کہا۔

"نام کیا تھا اس کا؟" اے۔ ٹو کے انداز میں ترشی عود کر آئی۔

"رخشی۔" میں نے کہا۔ "اس نے مجھے ایک نمبر بھی دیا تھا جس پر وہ کسی دوست کے ساتھ رہتی ہے، اسے ہوٹل میں سوتا ہوا چھوڑ کر میں لوٹ آیا پھر میں نے اس کے ساتھی کو فون پر لعن طعن کرتے ہوئے تنبیہ کی کہ اگر رخشی نے دوبارہ میرا پیچھا کیا تو اس کا انجام اچھا نہیں ہو گا۔ وہ آدمی لڑکی کی حرکات سے لاعلم معلوم ہوتا ہے۔"

"تو وہ نشے میں بولنے لگی تھی۔" اے۔ ٹو کی آواز میں غصے کے ساتھ ملال بھی واضح ہو گیا۔ "اسے چھوڑ دو۔"

"وہ آزاد ہی ہے۔" میں نے جلدی سے وضاحت کی۔ "ہوٹل کا کمرہ مقفل کر کے چابی اندر ہی ڈال آیا ہوں، ہوش میں آنے کے بعد وہ اپنی مرضی کی مالک ہو گی۔"

"اب تم اسے بھول جاؤ، سی۔ ون اسے دیکھے گا۔" اس کی آواز سرد اور معنی خیز تھی۔ "پی آر صفر تین نو کا کیا رہا؟"

میں چونک پڑا۔ وہ تنظیم میں اوپر کے درجے پر فائز تھا لیکن تمام سرگرمیوں سے پوری طرح باخبر معلوم ہوتا تھا۔ مال لانے والے ٹرک کا نمبر اسے زبانی یاد تھا پھر اس نے جس انداز میں سی۔ ون کا ذکر کیا تھا اس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ ان دونوں میں براہ راست رابطے کا بھی کوئی نہ کوئی ذریعہ موجود تھا جسے اختیار کر کے اے۔ ٹو اس تک اپنے احکام پہنچا سکتا تھا۔

"مال پہنچ گیا۔" میں نے جواب دیا۔ "کل اس بارے میں ایم۔ ٹی تھری ہنڈرڈ پر بی۔ ون نے تفصیلی گفتگو کی تھی، مجھے ڈر تھا کہ گفتگو کسی نے سنی ہو گی تو ٹرک خطرے میں پڑ جائے گا لیکن کہیں کوئی مداخلت نہیں ہوئی، مال وصول کر کے آگے بڑھایا جا چکا ہے۔"

"گڈ" اس کا لہجہ سپاٹ ہی رہا۔ "اگر میری معلومات درست ہیں تو باہر مال بھیجنے کے لیے آدمیوں کا بندوبست تمہارے ہی ذمے تھا؟"

"کچھ لوگ ملے ہیں۔ دو چار روز میں انتخاب کر لوں گا۔" میں

نے تفصیل سے گریز کرتے ہوئے کہا۔

"انتخاب مکمل ہوتے ہی تم مجھے اطلاع دو گے۔ اس کے علاوہ ہر سرگرمی موقوف رہے گی۔ تمہیں کسی اور معاملے میں مجھ سے رابطہ قائم کرنے کی ضرورت نہیں۔"

دوسری طرف سے ریسیور رکھنے کی آواز سن کر میں نے بھی گہرا سانس لیتے ہوئے ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔

فون پر وہ مردانہ آواز میرے لیے غیر متوقع ثابت ہوئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ ایک بجے سے پہلے بات کرنے والی عورت اپنے گھر میں کسی مرد کی موجودگی کے بارے میں مسلسل جھوٹ بولتی رہی تھی۔ یہ امکان بھی تھا کہ وہ کوئی خراب عورت ہو اور اے۔ ٹی سے اس کے مراسم کی نوعیت مشکوک رہی ہو۔ بہرحال یہ طے ہو گیا تھا کہ اے۔ ٹی کا نمبر وہی تھا اور ذرا سی محنت سے نمبر کے سہارے لاہور کے اس پتے کا سراغ لگا کر اس کا کھوج نکالا جا سکتا تھا۔

■

اگلی صبح کے اخبارات میں ایم۔ ٹی تھری ہنڈرڈ کے حوالے سے ایک سنسنی خیز کہانی موجود تھی۔

خودکشی کی اس واردات کا تعلق اندرون سندھ کے ایک زرخیز دیہی علاقے سے تھا جہاں مٹھا خان نامی ایک باحیثیت زمیندار نے فوجی حکام کی کارروائی کا خدشہ محسوس کرتے ہی خود کو خوابگاہ میں محبوس کر کے رائفل کے فائر سے اپنی کھوپڑی چکنا چور کر لی تھی۔ واقعات کچھ یوں تھے کہ مٹھا خان اپنے علاقے کا با اثر اور سخت گیر جاگیردار تھا۔ اس نے شہر میں یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی لیکن اپنے جولانی مزاج کے پیش نظر وہ اپنا بیشتر وقت جاگیر پر گزارتا تھا جہاں اس کی حیثیت کسی مطلق العنان حکمراں سے کم نہیں تھی۔ اس کے ہاتھوں قرب و جوار کے لوگوں کی عزت و آبرو ہر وقت خطرے میں رہتی تھی، جب اور جسے چاہتا اپنی حویلی میں بلوا لیتا اور من مانے سلوک کے بعد اسے واپس بھیج دیتا۔ لوگ اس کے اثر و رسوخ سے زیادہ اس کی قوت سے خائف رہتے تھے کیونکہ وہ لٹیروں اور بدمعاشوں کی سرپرستی کے سلسلے میں خاصا بدنام تھا، جو لوگ اس کا حکم ماننے سے انکار کرتے تو وہ بہت جلد کسی عبرتناک واردات کا نشانہ بن جاتے تھے۔ مال و زر سے محرومی کے ساتھ ہی ان کی عورتوں کو اسلحے کے بل پر سرعام رسوا کیا جاتا اور پھر واردات کرنے والے جنگلوں میں روپوش ہو جاتے جن کا کبھی سراغ نہیں مل سکا تھا۔ چند رپورٹیں پولیس تک بھی پہنچیں لیکن ان کا بھی کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

اپنی طاقت کے گھمنڈ میں مٹھا خان نے ایک غریب شخص کی بیوی کو اپنی حویلی میں بزور طاقت بلوایا۔ اس کا مرد روزی کمانے کے سلسلے میں شہر میں مقیم تھا اور دوسرے تیسرے مہینے گھر آتا رہتا تھا۔

وہ عورت چار دن غائب رہی۔ بظاہر اس کے لواحقین قرب و جوار کے علاقوں میں اسے تلاش کرتے رہے لیکن سینہ بہ سینہ پھیلنے والی اطلاع کے ذریعے بستی کے ہر فرد کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ اسے مٹھا خان کے آدمی زبردستی اٹھا لے گئے تھے۔ پانچویں دن وہ ویران آنکھوں سے ایک ایک کو تکتی ہوئی واپس آئی۔ کچھ دیر گھر میں رکی اور کسی سے ایک لفظ کہے بغیر واپس لوٹ گئی۔ اپنے گاؤں میں کچھ دیر تک کسی اجنبی کی طرح بھٹکتے رہنے کے بعد اس نے تماشائیوں کے سامنے ایک کنویں میں کود کر خودکشی کر لی۔

اس کا شوہر واپس آیا تو کسی کی مجال نہیں تھی کہ وہ اس کی بیوی کی خودکشی کے صحیح پس منظر پر روشنی ڈالتا۔ مٹھا خان کا تو ذکر ہی دور کی بات تھی، اسے یہ تک نہیں بتایا گیا کہ مرنے والی چار روز تک گھر سے غائب رہی تھی لیکن چند ہی روز میں رفتہ رفتہ اسے اندازہ ہو گیا کہ کچھ باتیں اس سے چھپائی جا رہی تھیں۔ وہ مٹھا خان کی شہرت سے بخوبی واقف تھا لہٰذا ایک دن اس کی حویلی میں جا پہنچا۔ اس مکار نے مگرمچھ کے آنسو بہاتے ہوئے اسے اپنے پاس ملازمت کی پیشکش کی جو اس نے قبول کر لی۔

مرنے والی کا شوہر تہیہ کر چکا تھا کہ اس علاقے سے مٹھا خان کا نام ہمیشہ کے لیے مٹا دے گا۔ رفتہ رفتہ اسے اپنی بیوی کے ساتھ پیش آنے والی بدسلوکی کی تفصیلات بھی معلوم ہو گئیں اور وہ دن رات نیفے میں چھری لگائے کسی ایسے موقع کی تلاش میں رہنے لگا کہ ایک ہی دار میں بھیڑیے کا خاتمہ کر سکے لیکن مٹھا خان اپنی حویلی میں ہر وقت خوشامدیوں کے محفوظ حلقے میں گھرا رہتا تھا، خوابگاہ میں جاتا تو اندر سے دروازہ مقفل رکھتا تھا۔ حویلی کے زنانے حصے میں کسی نامحرم مرد کی رسائی کا امکان ہی نہیں تھا کیونکہ دوسروں کی عزت کو کھلونا بنانے والے کو اپنی عزت بہت عزیز تھی۔

اپنی ان ہی کوششوں کے دوران میں چند روز قبل مرنے والی کے شوہر نے ایک روشندان سے عجیب منظر دیکھا کہ مٹھا خان اپنی مضبوط آہنی تجوری کے پٹ کھولے اندر رکھے ہوئے ایک صندوق کے سامنے بیٹھا تھا۔ صندوق میں کئی روشنیاں جل رہی تھیں اور اس میں سے کسی کے بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ آواز تھمتی تو مٹھا خان دھیمی آواز میں بولنے لگتا۔ کچھ دیر تک یہ حیرتناک تماشا جاری رہا پھر مٹھا خان نے اس صندوق کی تمام روشنیاں گل کر کے اسے تجوری میں مقفل کر دیا۔

یہ منظر دیکھ کر وہ ہیجان میں مبتلا ہو گیا۔ شہر میں اس نے کئی فلمیں دیکھی تھیں اور انگریزی فلموں کے طفیل ایسے رازونیاز سے اچھی طرح واقف ہو چکا تھا۔ اس کے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ مٹھا خان اس سرحدی قصبے میں بیٹھ کر کسی دشمن کے لیے جاسوسی کا کام سرانجام دے رہا تھا۔ اپنی آبرو کے دشمن کو وطن کی آبرو پر دانت تیز

تے دیکھ کر اس کا خون کھول اٹھا۔ اس نے سوچا کہ قدرت نے ایک سنہری موقع فراہم کر دیا تھا۔ وہ اس کے ناپاک لہو سے دامن داغدار کیے بغیر اس وحشی بھیڑیے کو کیفر کردار کو پہنچا سکتا تھا۔ سی سے کچھ کہے بغیر خاموشی کے ساتھ گاؤں سے نکلا اور کئی میل کا سفر طے کر کے پولیس چوکی پر جا پہنچا۔ وہاں اس کی کہانی پر توجہ دینے کے بجائے اس کے ساتھ تحقیر آمیز سلوک کیا گیا لیکن اس نے سب کچھ فراموش کر کے قسمیں کھا کھا کر انہیں یقین دلایا تو اسے دیں کر ایک سپاہی کو تفتیش کے لیے سائیکل پر مٹھا خان کی حویلی کی طرف روانہ کر دیا گیا۔

مٹھا خان نے سپاہی کی خاصی خاطر مدارات کیں اور اسے اپنی بے گناہی کا یقین دلا کر واپس لوٹا دیا اور چوکی کے انچارج نے اسے بے حساب گالیاں سناتے ہوئے چوکی سے دھتکار دیا۔

مرنے والی کا شوہر مٹھا خان کے خلاف نفرت اور انتقام کی آگ میں سلگ رہا تھا لیکن یہ جانتا تھا کہ اب اسے اپنے گاؤں میں کہیں امان نہ مل سکے گی۔ مٹھا خان کو سپاہی کے ذریعے مخبری کرنے والے کے نام کا علم ہو گیا ہو گا۔ اس کے خونخوار جانثار چپے چپے پر اسے تلاش کرتے پھر رہے ہوں گے۔ اس نے گاؤں کا رخ کیا تو مٹھا خان کی حویلی کی اونچی دیواروں کے پیچھے سسکا سسکا کر مار دیا جائے گا اور کسی کو کانوں کان اس کے انجام کا علم بھی نہ ہو سکے گا۔

وہ رات اس نے کھیتوں میں چھپ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں گزاری، پھر صبح کا اجالا پھیلتے ہی چھپتا چھپاتا بس اسٹینڈ تک پہنچا اور پھر ضلع کے صدر مقام تک جا پہنچا۔ وہاں خاصی دشواریوں کے بعد وہ فوجی حکام تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکا۔ انہوں نے سنجیدگی کے ساتھ اس کا بیان سنا پھر پولیس چوکی والوں کے غیر ذمہ دارانہ رویے کا ذکر سنتے فوری کارروائی پر تیار ہو گئے۔

اس کی رہنمائی میں فوجی جیپ گاؤں کی طرف روانہ ہوئی، اس سے سوالات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس نے افسروں کو یقین دلایا سب کچھ اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور وہ خود اس تجوری تک ان کی رہنمائی کرے گا۔ اگر اس کا الزام بے بنیاد ثابت ہو تو اسے بے دریغ گولی مار دی جائے۔

لیکن پولیس چوکی کے انچارج کی حماقت کھیل بگاڑ چکی تھی۔ مٹھا خان کو علم ہو چکا تھا کہ گھر کی بات باہر نکل چکی ہے، مخبری کرنے والے کی تلاش کی مہم ناکام رہی تھی لہٰذا جوں ہی اسے گاؤں کی حدود میں مخبر سمیت ایک فوجی گاڑی کے داخلے کی خبر ملی تو اس نے سمجھ لیا اس کی بازی الٹ چکی ہے۔ اپنی دانست میں وہ علاقے کا سب سے عزت دار تھا اور اس کے نزدیک گرفتاری موت سے بڑی رسوائی تھی جس کا سامنا کرنا اسے کسی بھی قیمت پر گوارا نہیں تھا۔

فوجی دستہ حویلی میں داخل ہوا تو وہاں صف ماتم بچھی ہوئی تھی۔ مٹھا خان نے اپنی پیشانی پر رائفل سے فائر کر کے خودکشی کر لی تھی۔ اس کی کھوپڑی اور چہرے کے چیتھڑے اڑ گئے تھے۔ ذاتی خوابگاہ میں اس کی بھیانک لاش کے قریب آہنی تجوری کھلی ہوئی تھی اور فرش پر وہ آہنی صندوق تاروں کی بدبو کے ساتھ سلگ رہا تھا، جس پر اسے کسی سے رازونیاز میں مصروف دیکھا گیا تھا۔

ماہرین کے مطابق وہ ایم۔ ٹی تھری ہنڈرڈ ساخت کا طاقتور ٹرانسمیٹر تھا جو تین سو میل کے حیطۂ عمل میں بخوبی کام کر سکتا تھا۔ اس پوری خبر میں کہیں بھی منشیات کی ناجائز تجارت کا کوئی حوالہ نہیں تھا۔ مٹھا خان کی حویلی کی تفصیلی تلاشی لی جا رہی تھی اور ہر مستند ذریعے نے پڑوسی ملک کے لیے جاسوسی کے امکانات ظاہر کیے تھے۔

فرائض سے غفلت برتنے کے الزام میں متعلقہ پولیس چوکی کا عملہ معطل کر دیا گیا تھا اور پورے معاملے کی تفتیش فوجی حکام کر رہے تھے۔

مجھے پورا یقین تھا کہ وہ اپنی بھرپور صلاحیتیں استعمال کر کے بھی مٹھا خان کے اصلی خدوخال دریافت کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں گے کیونکہ تنظیم کا بنیادی اصول تھا جس کے تحت اس کے ذمے دار کسی قسم کا کوئی تحریری ثبوت اپنی تحویل میں نہیں رکھتے تھے۔ تلاشی لینے والوں کو کہیں سے کوئی سراغ نہ ملتا تو تفتیش کا سارا زور ایک پہلو پر مرکوز رہتا کہ مٹھا خان کسی پڑوسی ملک کا جاسوس تھا۔ اس شبہے کو ایم۔ ٹی تھری ہنڈرڈ کے جلے ہوئے ڈھانچے سے تقویت ملتی کیونکہ اس کا دائرہ کار تین سو میل پر محیط تھا اور یہ فاصلہ سرحد پار کے کئی اہم شہروں تک جا پہنچتا تھا۔

میرے لیے یہ بات ہر شک و شبے سے بالا ہو چکی تھی کہ مٹھا خان ہی بی۔ دان تھا۔ غالباً اس نے آپریشن کے بارے میں پوچھ گچھ کے لیے چوکی سے آنے والے سپاہی کے واپس لوٹتے ہی احتیاط کے طور پر میرے لیے پیغام ریکارڈ کرایا تھا۔ اس وقت اسے شبہ بھی نہیں ہو سکا ہو گا کہ آناً فاناً میں وہ معاملہ اس قدر سنگین ہو جائے گا کہ اسے خودکشی پر مجبور ہونا پڑے گا۔

میرے لیے اپنی نگاہوں پر یقین کرنا دشوار ہو رہا تھا..... بی۔ دان جو اڑتالیس گھنٹے قبل میرے لیے ایک پراسرار نام تھا، اس قدر بیچارگی کے عالم میں اپنے انجام کو پہنچا تھا کہ ذہن لامحالہ انسانی تدبیر سے ماورا، قدرت کی کارفرمائیوں کی طرف مبذول ہو جاتا تھا۔ میرے سامنے تو بی۔ دان کا نام اس وقت آیا تھا جب میں نے سکندر علی کو تنظیم کا مطلق العنان سربراہ سمجھتے ہوئے اس کے مکان میں گھس کر اس کی ڈائری کا جائزہ لیا تھا اور میری اس حرکت کے ساتھ ہی میرے لیے برکتوں کا نزول شروع ہو گیا تھا۔

رخشی جو دراصل بی۔ دان کی مخبر تھی، جال بن کر سکندر علی سے

متعارف ہوئی تھی۔ اور اس کی تباہی کا سبب بن گئی۔ پہلے اس نے سکندر علی کو یوں الجھایا کہ اس کے بچ نکلنے کی کوئی صورت نہ رہی پھر اوپر والوں کے حکم پر سکندر علی کو وہ فتنہ اپنے سر پر مسلط کرنا پڑا۔ اس عورت نے سکندر علی کے مکان میں ایک چور کے گھسنے کی کہانی پہلی فرصت میں آگے بڑھادی اور اسے غفلت کا مجرم قرار دے کر معزول کر دیا گیا۔ اسی کے ساتھ اس کے اختیارات مجھے اور سی۔ ون کو مشترکہ طور پر مل گئے۔ برسوں میں پہلی بار تنظیم کا کوئی اہم کارندہ میرے سامنے آیا تھا لیکن سی۔ ون سے واقفیت میرے لیے کافی ثابت نہ ہوئی۔ میرے نزدیک سکندر علی میرے راستے کی ایک مستقل رکاوٹ تھا لہٰذا میں نے اسے اسی کے فارم کے ویرانے میں موت کے گھاٹ اتار دیا ـــــ اس کے قتل کی خبر نے بی۔ ون کو بوکھلا دیا۔ کسی گمنام دشمن سے محاذ آرائی کے اندیشے کے تحت اس نے براہ راست مجھ سے ایم۔ ٹی تھری ہنڈرڈ پر بات کی اور مجھے بی۔ فور کے مکمل اختیارات سونپ دیے لیکن مجھ سے براہ راست رابطہ اسے راس نہ آسکا۔ دوبارہ گفتگو کی نوبت آنے سے پہلے ہی اس نے خودکشی کر لی۔

تنظیم کے ان دونوں بڑوں کی تباہی کی پشت پر صنف نازک کا ہاتھ تھا۔ سکندر علی کی بربادی کی ابتدا رخشی کی مخبری سے ہوئی تھی اور بی۔ ون اس عورت کے شوہر کے انتقام کا نشانہ بنا تھا جسے اس نے کنویں میں کود جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ جس طرح اس حیادار عورت نے اپنے ہاتھوں اپنی زندگی کا خاتمہ کیا تھا، اسی طرح درندہ صفت مٹھا خان کو اپنے ہاتھوں سے اپنی کھوپڑی کے چیتھڑے اڑانے پڑے تھے۔

حالات میری توقع کے برعکس بہت تیزی سے بدل رہے تھے اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میں بہت جلد اس تنظیم کا شیرازہ بکھیرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ میرے لیے خوشی کی بات یہ تھی کہ ایم۔ ٹی تھری ہنڈرڈ پر ہونے والی کوئی گفتگو کسی غیر متعلقہ آدمی نے نہیں سنی تھی۔ بی۔ ون نے اپنی غفلت اور بے احتیاطی پر پردہ ڈالنے کے لیے گفتگو سنے جانے کا عذر تراشا تھا تاکہ اپنے بے رحم ہرکاروں کے ہاتھوں مخبر کی گرفتاری تک ایم۔ ٹی تھری ہنڈرڈ کا استعمال ترک کرنے کا جواز پیدا کر سکے۔ اس طرح یہ خطرہ ٹل گیا تھا کہ کسی گمنام حریف کے اوچھے وار کے نتیجے میں تنظیم کا ہر وہ سراغ گم ہو جائے جو میرے علم میں آچکا تھا۔

ایشلے ہاؤز اور ایڈکشن کیور سوسائٹی سے اے۔ ٹو تک ہر راز محفوظ اور میری ذات تک محدود تھا۔

میں وہ خبر گھر سے پڑھ کر چلا تھا۔ وہیں میں نے بے یقینی کے عالم میں اس واقعہ کے نتائج و عواقب پر غور کیا تھا پھر دفتر پہنچنے تک اس معاملے میں میرا ذہن بالکل صاف ہو چکا تھا۔

دفتری معمولات میں نے حسب معمول پوری سرگرمی سے سرانجام دیے عملے کے سینئر اراکین کے مختصر سے اجلاس میں آئندہ پندرہ دن کے آرڈرز اور پروڈکشن شیڈول کے بارے میں حکمت عملی طے کی۔ پھر تنہائی میسر آتے ہی غزالہ کے گھر کا نمبر ملانے لگا۔

دوسری طرف سے غزالہ کی ماں نے ریسیور اٹھایا۔ میں نے سلام کر کے اپنا نام بتایا تو اس نے ایک ہی سانس میں بہتیری دعائیں دے ڈالیں پھر مجھے لائن ہولڈ کرا کر غائب ہو گئی۔

چند ثانیوں بعد میرے کانوں میں غزالہ کی مترنم آواز رس گھول رہی تھی۔

"آج کالج نہیں گئیں تم؟" میں نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

"دل نہیں چاہ رہا تھا۔" وہ دھیمے مگر شوخ لہجے میں بولی۔ "کالج چلی جاتی تو اس وقت آپ کا فون کون سنتا؟"

"کامران کا کیا حال ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"اس کی اتنی فکر نہ کریں آپ۔" کامران کے ذکر پر اس کی آواز ایک دم بجھ سی گئی۔ "وہ تو دن بھر دسیوں دفعہ موڈ بدلتا ہے..... رفتہ رفتہ ہم اس کے دوروں کے عادی سے ہو گئے ہیں۔"

مجھے افسوس ہونے لگا کہ میں نے کیوں وہ نازک موضوع چھیڑ کر اس کو دلگیر کیا۔ لحظہ بھر کے سکوت کے بعد میں نے پوچھا۔ "تھوڑی دیر کے لیے باہر چلو گی میرے ساتھ؟"

"میں تو خود آپ سے بات کرنے کے لیے بے چین ہوں۔ پتا نہیں آپ نے امی اور ڈیڈی کو کیا گھول کر پلایا ہے کہ دونوں ہی کل شام سے آپ کے گن گا رہے ہیں۔" وہ ہلکی سی معصومانہ ہنسی کے ساتھ بولی۔

"میں پندرہ منٹ میں آرہا ہوں۔" میں نے یہ کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں دفتر سے روانہ ہوا تو چند ہی منٹ بعد میں نے اپنے پیچھے اس سیاہ کار کی موجودگی محسوس کر لی جو پہلے موڑ سے اچانک نمودار ہوئی تھی اور محفوظ فاصلے سے میرے پیچھے چلی آرہی تھی۔ میں نے بڑی سڑک پر آتے ہی اپنی کار کی رفتار بڑھادی اور اسی لمحے سیاہ کار بھی ہوائی گھوڑے پر اڑنے لگی۔ چند منٹ کی کوشش کے بعد مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ کار میرا تعاقب کر رہی تھی اور شاید اس میں بیٹھا ہوا شخص بھی سمجھ چکا تھا کہ میں نے اسے بھانپ لیا ہے۔

اس سے پیشتر میں سی۔ ون کے آدمیوں کو سبز کار میں اپنا پیچھا کرتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ اس وقت شاید کوئی نیا آدمی میرے تعاقب میں لگایا گیا تھا۔ شہر کے معاملات تنظیم کے بڑوں کے لیے جتنے بھی مخدوش رہے ہوں، مجھے اپنی ذات کے بارے میں فوری طور پر کسی خطرے کا احساس نہیں تھا۔ میرا خیال تھا کہ سیاہ کار والا سی۔ ون ہی کا آدمی

...جو معمول کے مطابق میری دیکھ بھال پر مامور کیا گیا تھا لیکن اس ...میں سی۔ ون کے بارے میں بغض کا شکار ہو چلا تھا۔ ایک اعتبار ...وہ شہر میں میرے اختیارات کے لیے ایک کھلا چیلنج تھا۔ اے۔ ٹو ...فنگ سے قبل میں بی۔ ون کے آخری احکام اسے بتا چکا تھا جن کے ...بق اگلی ہدایات ملنے تک تمام سرگرمیاں موقوف رہنی تھیں۔ جن ...تعاقب وغیرہ کے معمولات ... بھی شامل تھے لیکن میرے پیچھے ...ہوئی سیاہ کار سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ سی۔ ون نے وہ حکم ...انداز کر دیا تھا۔

تنظیم کے بڑے لوگوں کے مطابق ان دنوں حالات یک بیک ...دوش ہو گئے تھے۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ اس مفروضے کا سہارا ...کر سیاہ کار والے کی مرمت کر دی جائے۔ اصولی طور پر کسی کو ...میری اس کارروائی پر اعتراض نہیں ہونا چاہیے تھا۔ آخری احکام ...مطابق ہیروئن کی پہلی کھیپ کی تقسیم کے بعد ساری کارروائیاں ...طل تھیں۔ اس طرح میرے لیے کھلا امکان تھا کہ تعاقب کرنے ...کہیں دشمن کا آدمی نہ ہو۔ اس مفروضے کی آڑ لے کر میں بآسانی ...بت بنا سکتا تھا۔ اس طرح کم از کم سی۔ ون کو سبق ضرور مل ...میرے بارے میں محتاط روی پر مجبور ہو جاتا۔ پھر میں یہ بھی ...ہتا تھا کہ اس مرحلے پر غزالہ کی ذات یا اس کا مکان ان ...نگاہ میں آئے کیونکہ سی۔ ون تنظیم کے حفاظتی اور انتظامی ...مختار نگراں تھا لہٰذا غزالہ سے میرے مراسم کی بھنک ملتے ہی ...ج میں پڑ جاتا کہ کہیں غزالہ کی رفاقت تنظیم کے لیے خطرات ...نہ بن جائے۔ اگر اس کی رپورٹ پر اوپر سے مجھے کوئی منفی ...ہی تازہ حکمت عملی کے تحت مجھے اس کی تعمیل کرنا پڑتی۔ ایسے ...ان سے بہتر یہی تھا کہ سی۔ ون یا اس کے حواریوں کو غزالہ ...ہ نہ ملنے پائے۔

...زالہ کے تحفظ کے بارے میں ایک مبہم لیکن اہم نکتہ اور

...سکندر علی کو اس کی زرعی زمین پر گھیرنے کے سلسلے میں میں ...احتیاط سے منصوبہ بندی کی تھی۔ کرائے کی کار پر فرضی نمبر ...تعمال کرنے کے ساتھ ہی ناتجربہ کاری کے باوجود مصنوعی ...تعمال کر کے حلیہ تک بدلنے کی کوشش کر ڈالی تھی۔ جو اس ...کامیاب رہی کہ ابھی تک میری ذات ہر خطرے سے محفوظ ...اپنی منصوبہ بندی میں میں یہ بھول بیٹھا تھا کہ میرا دوہری ...والا ٹرانسمیٹر راجہ فارمز میں شہر کی کوئی کال موصول نہیں کر ...میری چھوٹی سی بدقسمتی ہی تھی کہ جب میں راجہ فارمز کے کاٹیج ...منٹلی کا قصہ تمام کر رہا تھا تو سی۔ ون کو مجھ سے رابطے کی ...سوس ہوئی اور جواب نہ ملنے پر وہ اس بارے میں فکرمندی

کا شکار ہو گیا۔ بعد میں میں نے اس کے استفسار کو نجی معاملات میں مداخلت قرار دے کر ٹالنا چاہا تو وہ اڑ گیا اور مجھے یہ بہانا کرنا پڑا کہ اپنی ایک دوست کے ساتھ فرصت کے لمحات گزارنے کی نیت سے میں آپریٹس گھر ہی پر چھوڑ گیا تھا تاکہ اس دوست پر آپریٹس کا راز فاش نہ ہو۔ بظاہر سی۔ ون نے میری وہ وضاحت قبول کر لی تھی لیکن مجھے اندیشہ تھا کہ سکندر علی کے قتل کی شام میری عدم دستیابی کو وہ آسانی کے ساتھ فراموش نہ کر سکے گا۔ غزالہ کا نام سامنے آتے ہی وہ اس کے پیچھے لگ سکتا تھا تاکہ اس شام کے بارے میں اس سے میرے بیان کی تصدیق یا تردید کرا سکے۔ گو میں نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ میں نے اپنا وقت کس کے ساتھ گزارا تھا لیکن غزالہ سے میری دلچسپی اسے ایک ہی منطقی نتیجے پر پہنچنے میں مدد دیتی جو میرے لیے قابل قبول نہیں تھا۔

میں مختلف راستوں سے گزرتے ہوئے اپنی کار شہید ملت روڈ پر لے گیا۔ اس کشادہ سڑک پر تعاقب کرنے والے کو فاصلے میں خاصا اضافہ کرنا پڑا۔ میری نگاہیں سڑک کے ساتھ ہی عقب نما آئینے میں اس کار کا بھی جائزہ لے رہی تھیں۔ چڑھائی ختم ہونے کے بعد ڈھلان میں اترتے ہوئے جوں ہی آئینے میں اس کار کا عکس غائب ہوا، میں نے اپنی کار سڑک کے بائیں سرے پر روک دی۔ سیاہ کار بہت برق رفتاری کے ساتھ سڑک کے بلند ترین حصے پر نمودار ہوئی تھی۔ شاید اسے خوف تھا کہ کہیں میں اس کی نگاہوں سے روپوش ہوتے ہی کسی گلی میں نہ گھوم جاؤں۔

میں نے سوچ سمجھ کر اپنی کار روکی تھی لیکن وہ اندھا دھند چلا آرہا تھا۔ ڈھلان سے اترتے ہوئے اس کی کار کی رفتار اتنی تیز تھی کہ وہ گاڑی الٹنے کا خطرہ مول لے کر بھی بریک لگاتا تو اس کے لیے مجھ سے پہلے رکنا ناممکنات میں سے تھا۔ اس کی کار آگے نکلتے ہی میں اس کے پیچھے ہو لیا۔ ذرا سی حاضر دماغی سے صورتحال یک بیک تبدیل ہو چکی تھی۔ کچھ دور نکلنے کے بعد اس نے بتدریج رفتار کم کرتے ہوئے مجھے آگے نکلنے کا موقع فراہم کرنا چاہا لیکن میں نے اس کی کار سے چند گز پیچھے اسی کی رفتار اختیار کر کے اسے جتا دیا کہ میں اس کے دام میں پھنسنے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھا۔

شہید ملت روڈ کے آخری چوراہے سے اس نے اپنی کار واپس گھمائی۔ میں بدستور اس کے پیچھے لگا رہا۔ ہل پارک کے قریب سے گزر کر وہ بائیں طرف مڑا پھر اسے ویران گلیوں کا رخ کرتے دیکھ کر میرے تنفس کی رفتار تیز ہوتی چلی گئی آخر ایک جگہ سڑک ویران دیکھ کر میں نے اپنی کار کی رفتار تیز کر لی۔ ہارن کے جواب میں اس نے داہنی طرف راستہ چھوڑا تو میں نے اپنی کار اس کے برابر میں لے کر تیزی کے ساتھ بائیں طرف دبانا شروع کی اور رفتار کم کرتے ہوئے

اسے گھیر کر رک جانے پر مجبور کر دیا۔

وہ انجن بند کر کے خطرناک تیوروں کے ساتھ نیچے اترا۔ جسمانی اعتبار سے وہ مجھ سے کہیں برتر تھا لیکن یہ غنیمت تھا کہ اس کے دونوں ہاتھ خالی تھے۔ میں نے انجن بند کیے بغیر گیئر نیوٹرل کر کے ہینڈ بریک کھینچا اور دروازہ کھولتے ہی اس پر ٹوٹ پڑا۔ میرا حملہ اس کے لیے بالکل غیر متوقع تھا، شاید وہ تلخ کلامی سے آغاز کی توقع کر رہا تھا اس لیے جسمانی بچاؤ کے لیے تیار نہیں تھا۔ میرے بدن کی وحشیانہ جھونک میں وہ سڑک پر چاروں شانے چت جا گرا۔ میں اسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر اس کے سینے پر سوار ہو گیا۔ اس نے میرے گریبان پر ہاتھ ڈال کر بش شرٹ کی دھجیاں اڑا دیں اور میں نے طیش کے عالم میں دونوں مٹھیوں میں اس کے بال جکڑ کر اس کا سر پوری قوت سے کئی بار سڑک پر دے مارا۔ گریبان چھوڑ کر اس نے بوکھلائے ہوئے انداز میں اپنے مکوں سے میرے جبڑے سہلانے کی کوشش کی لیکن اس وقت تک سر کے عقبی حصے کی چوٹ اس کی بصارت پر اثر انداز ہو چکی تھی لہٰذا صرف دو ادھچے وار میرے چہرے کو کسی حد تک نشانہ بنا سکے اور میں نے برسوں کے بعد اپنے پرانے حربے کو آزماتے ہوئے اس کی پیشانی پر بھرپور ٹکر رسید کر دی۔ اس کے حلق سے بے اختیار ایک چیخ آزاد ہو گئی۔ اسی کے ساتھ میرے بوجھ تلے اس کا جسم یکبارگی فضا میں اچھلا اور وہ مجھے گرا دینے میں کامیاب ہو گیا۔ میری ٹکر کے نتیجے میں اس کی پیشانی پھٹ گئی تھی جس سے گاڑھے گاڑھے خون کی لکیریں چہرے پر بہہ نکلی تھیں۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو خون کی دھاریں اس کی آنکھوں میں اترنے لگیں۔ اس نے بے بسی اور جھلاہٹ کے عالم میں گالیاں دیتے ہوئے بائیں آستین سے خون صاف کرنے کی کوشش کی اور میں نے پوری قوت سے اس کا داہنا جبڑا سہلا دیا۔ اس کے حلق سے غضبناک غراہٹ ابھری لیکن وہ قدرے لڑکھڑاہٹ کے بعد فوراً ہی سیدھا ہو گیا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس نے مدافعت میں ذرا بھی کمزوری دکھائی تو ادھیڑ کر رکھ دیا جائے گا۔ اس بار میں نے سر جھکا کر پوری قوت سے اس کے پیٹ میں ٹکر رسید کی تھی۔ اس نے گرتے گرتے میری گردن دبوچنے کی ناکام کوشش میں شاید میری گردن کی جلد میں اپنے ناخنوں سے خراشیں ڈال دیں کیونکہ مجھے اچانک ہی اس حصے میں مرچیں بھر جانے کا احساس ہوا تھا۔ اٹھتے اٹھتے میں نے اس کی پسلیوں میں آخری ٹھوکر ماری اور اسے گالیوں کے درمیان کراہتا ہوا چھوڑ کر تیزی سے اس کی کار کی طرف لپکا۔ میری توقع کے مطابق چابی اگنیشن میں موجود تھی ۔۔۔ میں چابی لے کر اپنی کار میں بیٹھا تو وہ قریب المرگ سانڈ کی طرح چاروں ہاتھ پیروں کے سہارے سڑک سے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس وقت میں خاصی خطرناک صورتحال سے دوچار تھا۔ میرے حریف کی حالت اتنی خراب تھی کہ کوئی متوجہ ہو جاتا تو میری گلوخلاصی دشوار ہو جاتی۔ لہٰذا میں فوراً ہی وہاں سے روانہ ہو گیا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ گاڑی کی چابی سے محرومی کے بعد وہ فوری طور پر کسی سے رجوع نہ کر سکے گا۔

میں پھٹی ہوئی بش شرٹ پر خون کے دھبوں اور گلے پر لمبی لمبی رستی ہوئی خراشوں کے ساتھ گھر پہنچا تو ملازموں میں تشویش اور افراتفری پھیل گئی لیکن جب میں نے مسکراتے ہوئے انہیں ایک لفنگے ڈرائیور سے ہلکے پھلکے تصادم کی مفروضہ کہانی سنائی تو انہوں نے مجھے تنہا چھوڑ دیا۔

میں نے فوری طور پر آئینے میں اپنے سراپا کا جائزہ لیا تو اپنی ہیئت پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ میرے بائیں ابرو کے قریب ورم آیا ہوا تھا اور گلے کی خراشیں سینے تک اتری ہوئی تھیں۔ غنیمت یہ تھا کہ حلیہ بگڑنے کے بعد مجھے گھر پہنچنے کے لیے بہت کم فاصلہ طے کرنا پڑا تھا جو ویران گلیوں پر مشتمل تھا ورنہ میں شہر کی کسی مصروف شاہراہ پر تماشا بن کر رہ جاتا۔

مجھے خوشی تھی کہ میں سی۔ ون کے کارندے کی خاطر خواہ ٹھکائی کرنے میں کامیاب رہا تھا۔ اب مجھے انتظار تھا کہ اس کے انجام سے واقف ہونے کے بعد سی۔ ون اپنے ردِعمل کا اظہار کس طرح کرتا ہے۔

غسل کے بعد میں نے گلے کی خراشوں کو صاف کر کے ان پر ٹنکچر لگائی تو تکلیف کی شدت سے آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ لباس بدل کر میں نے ٹائی لگائی تو خراشیں ضرور چھپ گئیں لیکن میرے لیے بند کالر میں گردن ہلانا دشوار ہو گیا۔ اس کے باوجود بائیں آنکھ کے اوپر ابھرے ہوئے نیلے نشان سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ میرے ساتھ کچھ نہ کچھ ہوا ہے۔ میں نے دل میں سوچا کہ جب ایک نشان چغلی کھا رہا ہے تو ٹائی لگا کر خود کو عذاب میں کیوں مبتلا کروں۔ بس یہی فرق پڑتا کہ غزالہ ذرا زیادہ پریشان ہو جاتی اور میں تو اس بات کے لیے مدت سے ترسا ہوا تھا کہ کوئی کبھی میرے لیے بھی پریشان ہو۔ میں نے ٹائی اتار کر ڈریسنگ ٹیبل پر ڈال دی اور دوبارہ گھر سے روانہ ہو گیا کیونکہ اچھی طرح اندازہ تھا کہ غزالہ فون پر بات ہونے کے بعد میرے انتظار میں ایک ایک منٹ گن کر گزار رہی ہو گی۔

اس نے میری گاڑی کا ہارن سنتے ہی فوراً پھاٹک کھولا تھا۔ شاید وہ پھاٹک سے ملحقہ لان پر میری آمد کی منتظر تھی۔ میں مسکراتے ہوئے گاڑی اندر مختصر سے پورچ میں لیتا چلا گیا کیونکہ اب میں اس گھرانے کا ایک رکن بن چکا تھا۔

"ادھر ہی آ جائیے۔" کار سے اترتے ہی میرے کانوں میں غزالہ کی آواز آئی۔ میں پلٹا تو لان پر پہلے سے میز اور دو کرسیاں پڑی ہوئی تھیں اور وہ پھاٹک بند کر کے اسی طرف بڑھ گئی تھی۔

"امی اور ڈیڈی کو تو سلام کر لوں۔" میں نے نسبتاً نیچی آواز میں کہا۔

"امی نہا رہی ہیں۔ ڈیڈی باہر گئے ہوئے ہیں۔" اس نے ہتھیلی پر شہادت کی انگلی مارتے ہوئے دونوں کی مصروفیات گنوائیں۔ "اب کدھر جائیں گے آپ؟"

"مجبوری ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تمہاری ہی دعوت قبول کرنا پڑے گی۔" یہ کہتے ہوئے میں اس کی طرف بڑھا تو میری آنکھ سے اوپر نیل دیکھ کر وہ بے تابانہ انداز میں میری طرف لپکی۔

"یہ کیا ہوا آپ کو؟ کس سے لڑ کر آ رہے ہیں؟" اس نے تشویش زدہ لہجے میں کہا پھر قریب آتے ہی اس کی نگاہیں میری گردن کی خراشوں میں الجھ گئیں۔ "آپ تو بہت زخمی ہیں، کیا ہوا؟ کس سے لڑائی ہوئی؟"

اس کی انگلیوں کا حرارت آفریں لمس اپنی پیشانی پر محسوس کر کے میں نے آنکھیں موند لیں اور ہولے سے بولا۔ "اس طرح مسیحائی کرو گی تو روز کسی نہ کسی سے سر پھٹول کر کے آیا کروں گا۔"

"مذاق میں نہ ٹالیں، سچ سچ بتائیں۔ کیا ہوا ہے آپ کو؟" وہ یکلخت سنجیدہ ہو گئی۔

"اپنا تعاقب کرنے والے کو للکار بیٹھا تھا۔" میں نے آنکھیں کھول کر ایک کرسی کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "اسے لہولہان کرنے میں تھوڑی بہت چوٹیں آ گئیں لیکن میں نے ٹنکچر لگا لی ہے، تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"لیکن وہ بدبخت تھا کون؟ اور کس لیے آپ کے پیچھے لگا تھا؟" وہ سراپا تجسس بنی ہوئی تھی۔

میں آرام سے کرسی پر بیٹھتے ہوئے ہنس پڑا۔ "تمہیں کیا بتاؤں؟ تمہیں تو کچھ بھی یاد نہ رہا ہو گا کہ میں کن لوگوں کے چنگل میں پھنسا ہوا ہوں اور کس طرح ان کے اشاروں پر ناچنے پر مجبور ہوں۔"

"مجھے سب یاد ہے۔" اس نے میرے مقابل بیٹھتے ہوئے پُر اعتماد انداز میں کہا۔ "سکندر علی نے آپ کو اس جال میں پھانسا تھا۔ وہ نمبر ٹو کی حیثیت سے آپ سے کام لیتا تھا۔ آپ اس کے گھر میں گئے تو اس کی ڈائری سے اے۔ ٹو، بی۔ ون، بی۔ ٹو اور سی۔ ون کے فون نمبر ملے۔ سکندر کو غفلت کے الزام میں معزول کر دیا گیا۔ اس کے اختیارات آپ کو اور سی۔ ون کو بانٹ دیے گئے۔ اسی دوران کسی نے سکندر علی کو اس کے باغات میں ہلاک کر دیا۔ یہی بتایا تھا نا آپ نے؟"

"حالات تیزی سے بدل رہے ہیں۔" میں سنجیدگی کے ساتھ بولا۔ "اب میں خود بی۔ فور ہوں۔ کل تک بی۔ ون کو جوابدہ تھا لیکن اس نے خودکشی کر لی۔"

"ہائیں!" حیرت سے اس کی غزالی آنکھیں پیشانی پر جا چڑھیں۔ "سکندر علی کو کسی نے مار دیا اور بی۔ ون نے خودکشی کر لی؟ ...... تت ...... تو کیا ......!" وہ میرے زخموں کی طرف اشارہ کر کے رہ گئی لیکن میں اس کا مدعا سمجھ گیا۔ وہ میرے زخموں کی بنا پر شبہ میں پڑ گئی تھی کہ بی۔ ون کہیں میرا ہی نشانہ نہ بنا ہو۔

"شاید تم نے آج کا اخبار نہیں دیکھا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آج کی سب سے بڑی خبر وہی ہے۔"

"تو۔ تو کیا مٹھا خان ہی بی۔ ون تھا؟" اس نے حیرت اور بے یقینی کے انداز میں سوال کیا۔

"حالات یہی بتاتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ایم۔ ٹی تھری ہنڈرڈ کی برآمدگی کے بعد اس بارے میں کوئی شبہ ہی نہیں رہا کیونکہ اس سے رابطے کے لیے اسی قسم کا ایک آپریٹس میرے پاس بھی موجود ہے۔"

"لیکن اخبار میں تو ہیروئن کی تجارت کا ذرہ برابر بھی تذکرہ نہیں ہے۔ وہ تو کھلا ہوا غداری اور جاسوسی کا معاملہ معلوم ہوتا ہے۔"

"وہ قدرت کے انتقام کا شکار ہوا ہے۔ انہیں اس کی حویلی سے جلے ہوئے آپریٹس کے علاوہ کوئی ثبوت نہیں مل سکا لہٰذا سارے قیاسات مخبر کی اطلاع پر مبنی ہیں۔ کسی کے گمان میں بھی نہ ہو گا کہ منشیات کے سوداگر اتنے نازک اور بیش قیمت مواصلاتی آلات استعمال کر رہے ہیں۔ لکھ کر رکھ لو کہ مٹھا خان کی اصل مصروفیات کی کسی کو بھنک بھی نہ مل سکے گی اور کچھ عرصے کی جدوجہد کے بعد غیر ملکی جاسوس کی خودکشی کی فائل داخلِ دفتر ہو جائے گی۔"

"لیکن آپ کس بنا پر اسے بی۔ ون قرار دے رہے ہیں؟" وہ قدرے سکوت کے بعد حیرت سے سنبھالا لیتے ہوئے بولی۔ "صرف آپریٹس کی یکساں ساخت تو اس اندازے کا جواز نہیں بن سکتی۔"

"صرف یہی یکسانیت میرے اندازے کی بنیاد نہیں ہے، اس کے پسِ پشت واقعات کا تسلسل ہے۔" یہ کہہ کر میں اسے مختصر الفاظ میں بی۔ ون کی پہلی فون کال سے ریکارڈ کیے ہوئے پیغام تک بتاتا چلا گیا اور وہ میری رائے سے متفق ہو گئی۔

"واقعی وہ بی۔ ون کے علاوہ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔" وہ تائیدی لہجے میں بولی۔ "لیکن اس نے آپ کو اے۔ ٹو کا جو نمبر دیا تھا اس کا کیا رہا؟ آپ نے بھی تو سکندر علی کی خوابگاہ سے اے۔ ٹو کا نمبر حاصل کیا تھا۔"

"دونوں نمبر یکساں تھے۔" میں نے انکشاف کیا اور اس کی آنکھوں میں تجسس کے سائے گہرے ہو گئے۔ میں نے اسے اس فون نمبر سے متعلق اپنے جملہ تجربات سنا ڈالے کیونکہ تنظیم سے باہر وہی میری

اکلوتی رازداں تھی۔

"یہ معاملہ تو حیرتناک اور ناقابلِ یقین معلوم ہوتا ہے۔" میرے خاموش ہونے پر وہ بولی۔ "رات کے ایک سے تین بجے تک وہ نمبر اے۔ ڈُو کے تصرف میں رہتا ہے۔ باقی وقت میں بیمار اور بوڑھی عورت کالیں ریسیو کرتی ہے۔ اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ وہ عورت اس کھیل میں پوری طرح ملوث ہے۔"

"نتیجہ اخذ کرنا اتنا آسان نہیں ہے۔" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "یہ مت بھولو کہ رازداری تنظیم کا بنیادی اصول ہے۔ ہر اوپر والا اپنے ماتحتوں کے لیے محض ایک آواز ہوتا ہے۔ فون نمبر کے ذریعے اس عورت کے گھر کا آسانی سے سراغ لگایا جا سکتا ہے اور پھر اے۔ ڈُو کو بے نقاب کرنا بائیں ہاتھ کا کھیل رہ جائے گا۔ وہ اتنا بڑا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ میری چھٹی حس کہہ رہی ہے کہ اس نمبر کی مدد سے اے۔ ڈُو تک پہنچنا اس قدر آسان نہیں ہو سکتا ورنہ یہ نمبر یوں تقسیم نہ کیا جاتا۔"

"لیکن اس نمبر پر آپ عورت کے علاوہ خود اے۔ ڈُو سے بات کر چکے ہیں؟" اس نے تحیّر زدہ انداز میں کہا۔

"یہی تو ساری الجھن ہے۔" میں نے سگریٹ کا گہرا کش لے کر کہا۔ "سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا گورکھ دھندا ہے۔"

وہ چند ثانیوں تک پُر خیال انداز میں خاموش رہی پھر اس کی آنکھوں میں تیز چمک عود کر آئی۔ "شاید میں معاملے کی تہ تک پہنچ گئی ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ ٹیلیفون ایکسچینج میں کوئی اے۔ ڈُو سے ملا ہوا ہو اور وہ مقررہ اوقات میں وہ نمبر اے۔ ڈُو کو منتقل کر دیتا ہو۔ وہ عورت بیمار اور بوڑھی ہے، اس کے رشتوں کو بھی علم نہ ہوتا ہوگا کہ رات کے ایک سے تین بجے تک اس کا فون ڈیڈ رہتا ہے۔ مقررہ وقت گزرتے ہی وہ نمبر نارمل کر دیا جاتا ہوگا۔"

اس کی گفتگو سنتے ہوئے میرا ذہن اس نکتے پر سوچنے لگا تھا۔ وہ خاموش ہوئی تو میں ذہنی طور پر اس طریقۂ کار کو مسترد کر چکا تھا۔ "یہ امکان ضرور ہے لیکن ان کی محتاط روی کے پیشِ نظر ناقابلِ عمل ہے کیونکہ ایک آدھ بار تو کسی کو شبہ میں ڈالے بغیر ایسا کیا جا سکتا ہے، اسے روز کا معمول نہیں بنایا جا سکتا پھر ایکسچینج میں ڈیوٹیاں تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ اس معمول کو برقرار رکھنے کے لیے کئی افراد کو اعتماد میں لینا پڑے گا پھر ایکسچینج والا آدمی تجسس کے فطری تقاضے سے مجبور ہو کر اے۔ ڈُو کی کالز بھی سن سکتا ہے۔ اس طرح تو رازداری کا پورا نظام ہی درہم برہم ہو کر رہ جائے گا اور میرے لیے یہ تسلیم کرنا ممکن ہے کہ اے۔ ڈُو بذاتِ خود ٹیلی فون کے محکمے میں ملازم ہوگا اور اپنی سہولت کے لیے ہر خطرہ مول لے کر مقررہ اوقات میں اس نمبر کو عورت کے گھر سے ڈسکنکٹ کر کے ایکسچینج میں خود ساری کالز وصول کرتا ہوگا۔"

"اور رخشی کو آپ ایک معمولی مہرے سے زیادہ حیثیت دینے کو تیار نہیں۔" وہ تفکر آمیز انداز میں بولی۔ "لیکن اے۔ ڈُو اس کا نام سن کر چونکا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ آپ اسے نظر انداز کر کے غلطی کر رہے ہوں!"

"وہ کیا؟ میرا تو خیال ہے سی۔ ون بھی اس نمبر کے راز سے واقف نہ ہوگا۔ پھر اے۔ ڈُو سے میری ملاقات اس وقت ہوئی جب رخشی کو ہوٹل میں چھوڑے مجھے کئی گھنٹے گزر چکے تھے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ سی ون اس عورت کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے۔ مجھے تو اسے بھول جانے کا حکم مل ہی گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب وہ ہرگز میرا رُخ نہیں کرے گی۔"

"ذرا غور کریں۔" وہ شریر لہجے میں بولی۔ "کہیں گردن کی خراشیں اسی رخشی کے ناخنوں سے نہ آئی ہوں۔"

"میں پیش قدمی کرتا تو وہ مزاحمت کرنے کے بجائے خوشی سے میری حوصلہ افزائی کرتی۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "وہ کل شام ٹکرائی تھی جب کہ میرے زخم تازہ ہیں۔"

"آپ نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ یہ زخم کیسے آئے؟" وہ سنجیدہ ہو گئی۔

"سی۔ ون تنظیم کے انتظامی اور حفاظتی شعبے کا سربراہ ہے۔ اس کے آدمی اکثر میرا تعاقب کرتے رہتے ہیں تاکہ یہ دیکھ سکیں کہ کوئی سرکاری ایجنسی یا دشمن کا کوئی آدمی میری راہ پر نہ لگا ہوا ہو۔ آج میں ایسے ہی ایک آدمی سے اُلجھ پڑا۔ وہ اس وقت بھی کہیں پڑا اپنے زخم چاٹ رہا ہوگا۔"

"یہ تصادم کیوں مول لے بیٹھے آپ؟"

"میں تمھاری طرف آ رہا تھا اور اس سے پیچھا چھڑانے کی کوئی صورت نہیں تھی لہٰذا اس سے بھڑ ہی گیا۔" میں نے اس کی تشویش سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔ "میں نہیں چاہتا کہ میرے حوالے سے تم بھی ان کے کسی آدمی کی نگاہوں میں آ جاؤ۔ انھوں نے گھر دیکھ لیا تو کسی بھی وقت دشواریاں کھڑی کر سکتے ہیں۔"

وہ پُراعتماد انداز میں مسکرانے لگی۔ شاید اسے خوشی ہوئی تھی کہ کوئی اس کے تحفظ کے لیے اس حد تک جانے کو تیار تھا۔ "کب تک میں ان کی نگاہوں سے بچی رہوں گی؟ ہو سکے تو مجھے بھی ان کی صفوں میں گھس جانا چاہیے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ کسی طرح میں رخشی کی جگہ ان کی طرف سے آپ کی مخبری پر مامور کر دی جاؤں۔"

"آئندہ ایسا خیال بھی دل میں نہ لانا۔" میں نے تیز نگاہوں سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "وہ بہت بڑے لوگ ہیں۔ ان کی نگاہوں میں انسانی لہو سے آبرو تک کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ رخشی جیسے

ہے؟ لیکن ان کے مقاصد کے حصول کے لیے وہ گھناؤنے روپ سے ٹکرائی تھی۔ اس نے ان کے مفادات کے لیے اپنا سب کچھ لگایا ہوا ہے لیکن جب اے۔ ڈُو کو میں نے بتایا کہ نشے میں وہ بہت کچھ اگل گئی تھی تو اس کا لہجہ تلخ اور سفاکانہ ہو گیا تھا۔

"اور اگر انھوں نے اسے ہلاک کرنے کا ہی فیصلہ کر لیا؟"

"یہ اس کا اپنا مقدر ہوگا۔ میرا ضمیر صاف ہے۔ بس انسانیت کے ناتے سے تھوڑا سا ملال ضرور ہوگا۔"

وہ میز پر کہنیاں ٹکا کر اپنا چہرہ ہتھیلیوں کے درمیان لیے ثانیوں تک خاموشی سے میری طرف دیکھتی رہی پھر دھیمی آواز میں "آپ ہمارے گھر کب منتقل ہو رہے ہیں؟"

"وہ کیوں؟" میں نے چونک کر سوال کیا۔

"روپوشی کا حکم ملا ہے نا آپ کو؟" اس نے مجھے یاد دلایا۔ "کہیں بھٹکنے کے بجائے اس غریب خانے کی عزت افزائی کیوں نہیں کرتے؟ مجھ سے چھٹی لے لوں گی۔"

"خیال بہت اچھا ہے لیکن میں اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر کل لاہور جانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اے۔ ڈُو کی گتھی وہاں جائے بغیر نہ سلجھے گی پھر وہیں ایشین سنڈیکیٹ لمیٹڈ کا دفتر بھی ہے۔ شاید اس سلسلے میں بھی کوئی کام کی بات میرے علم میں آ جائے۔ میں مہلت ویسے ہی کارروائی کرنا چاہتا ہوں۔"

"پھر میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی۔"

"تم!" میں نے حیرت اور بے یقینی سے کہا پھر ناصحانہ انداز میں "میرا وقت وہاں بھاگ دوڑ میں گزرے گا۔ تم ہوٹل میں اکیلی رہ جاؤ گی۔"

"میں تو آپ کا ہاتھ بٹانا چاہتی ہوں۔" وہ کرسی پر سیدھی ہو کر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "آپ نے مجھے بتایا تھا کہ ایشین سنڈیکیٹ لمیٹڈ لاہور کا کاروبار کہنے کو تو صاف ستھرا اور ظاہری طور پر بے ضرر ہے لیکن اس آڑ میں منشیات کی اسمگلنگ کرتی ہے۔ اس نے اپنے نمائندے کے طور پر آپ کو باہر بھی بھیجا تھا۔ میرا خیال ہے اگر میں وہاں ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی تو ان کی خفیہ سرگرمیوں کا سراغ لگانا دشوار نہ ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ اے۔ ڈُو اس فرم کے مالکان میں بھی شامل ہو۔"

اس کی تجویز واقعی شاندار اور خاصی محفوظ تھی۔ میں چند ثانیوں تک سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا۔ "تمھارا میرے ساتھ لاہور چلنا مناسب ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ تمھارے والدین اس پر راضی نہ ہوں۔"

"ہونہہ!" اس نے بُرا سا منہ بنایا۔ "میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ اب ان کی زیادہ پروا نہیں رہ گئی ہے۔ آپ سے ملاقات ہونے سے پہلے امی اور ڈیڈی میری گستاخی پر سخت برہم تھے، پتا نہیں آپ نے ڈیڈی پر کیا جادو کیا کہ زندگی میں پہلی بار میرے ایک فیصلے سے متفق ہو گئے ہیں۔"

"تم ان کی طرف سے شدید غلط فہمیوں میں مبتلا ہو۔" میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "مانا کہ وہ کامران کی تباہی کے ذمہ دار ہیں لیکن وہ حادثہ اتفاقی تھا اور تم اپنے دل میں نفرت کے بیج کو پروان چڑھاتی رہیں۔ وہ دونوں خود اپنے ضمیر کے مجرم ہیں۔ مجھے تو ان سے ہمدردی ہو گئی ہے۔ نفرت کی عینک سے تمھیں ان کا ہر فعل قابلِ ملامت نظر آتا ہے ورنہ وہ درحقیقت تمھارے خیرخواہ ہیں۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ ہرگز مجھے قبول نہ کرتے۔"

"ضمیر کے قیدی۔" اس نے سر جھٹک کر دہرایا۔ "تشدد، آتش زنی اور لوٹ مار میں ملوث ہو کر جیل جانے والوں کو ایمنسٹی انٹرنیشنل اس خطاب سے نوازتی ہے۔ اس اعتبار سے آپ درست ہی کہہ رہے ہیں۔" پھر اچانک اس کا لہجہ قدرے استہزائیہ ہو گیا۔ "امی کے ضمیر پر بوجھ ہوتا تو وہ مدتوں پہلے کوکین ترک کر چکی ہوتیں۔ وہ نشہ اس گھر کی فضا پر آج بھی حکمراں ہے۔"

"ہر کوشش ناکام ہو گئی، کوکین بہت موذی نشہ ہے عزالہ! تمھاری ماں اپنی اس عادت سے اُکتا گئی ہے لیکن مجبور ہے۔"

"یہ سب ڈھکوسلا ہے۔" وہ بے پروائی سے بولی۔ "قوتِ ارادی مضبوط ہو اور احساسِ جرم بیدار ہو جائے تو پل بھر میں نشہ چھوٹ سکتا ہے... انھوں نے واقعی آپ کو خوب بہلایا ہے۔"

"بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔" میں نے قدرے تیز لہجے میں کہا۔ "شاید تم ایڈکشن کی اصطلاح سے ناواقف ہو۔ اس کے لیے عادت کا لفظ بہت معمولی ہے۔ یہ بہت بھیانک مرض ہوتا ہے۔ کوکین، مارفین، ہیروئن، پیتھیڈین ایسے موذی نشے ہیں کہ آدمی کچھ عرصے تک تسلسل کے ساتھ استعمال کرے تو زندگی بھر کے لیے ان کا غلام بن کر رہ جاتا ہے، نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے ذہنی اور جسمانی معمولات کو برقرار رکھنے کے لیے نشے کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ وقت پر مقررہ خوراک نہ لے تو تشنج، اعصابی اختلال، درد، مروڑ، اینٹھن اور ہولناک مایوسی کی گرفت میں آ کر حواس کھو بیٹھتا ہے۔ تمھارے ڈیڈی نے مجھے بتایا کہ امی اپنی ناکام کوششوں میں کئی بار کربناک اذیت سے گزر چکی ہیں اور تمھارے ڈیڈی نے خوفزدہ ہو کر انھیں کوکین لینے پر مجبور کیا کہ کہیں تمھاری ماں بھی کامران کی طرح ہمیشہ کے لیے دیوانگی میں مبتلا نہ ہو جائے۔ تمھیں ان کے بارے میں اپنے رویّے پر نظرِ ثانی کرنا چاہیے۔"

میرے الفاظ اس کے لیے تحیّر خیز ثابت ہوئے۔ میں خاموش ہوا تو وہ بے یقینی کے عالم میں بڑبڑانے لگی۔ "اوہ میرے خدا! تو امی کی وہ حالت کوکین چھوڑنے کے سبب ہوا کرتی ہے۔ تین بار میرے سامنے ان کی حالت غیر ہوئی اور میں ہر بار غصّے میں گھر سے چلی گئی۔ میں ہمیشہ یہی سمجھتی رہی کہ کوکین کی زیادتی اپنا رنگ دکھا

رہی ہے لیکن میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ مجھے کبھی اعتماد میں نہیں لیا گیا۔ مجھے کسی نے کچھ نہیں بتایا۔ مجھے ہمیشہ اجنبیت کا احساس رہا جیسے میری لاعلمی میں یہاں چوری چھپے سازشیں کی جا رہی ہوں۔ حقیقت بتائی جاتی تو میں اتنی بے مغز نہیں تھی کہ ان کا احترام نہ کرتی۔"

"مجھے خوشی ہے کہ آج میں نے اس دیوار کو گرا دیا۔" میں نے اسے ذہنی جھٹکے کے اثرات سے چھٹکارا دلانے کی نیت سے مسکراتے ہوئے کہا۔ "لِٹ از نیور ٹو لیٹ۔ تمھارے والدین کو تمھارے بدلے ہوئے رویّے سے بہت سہارا ملے گا۔ تمھارے ساتھ انھوں نے بھی غلطیوں کا ارتکاب کیا جس کی سزا ذہنی گھٹن کی صورت میں تم سب ہی بھگت رہے ہو۔"

"آپ نے میری آنکھیں کھول دی ہیں ــــ" وہ کھوئی کھوئی آواز میں بولی۔ "مجھے ندامت ہو رہی ہے اپنے آپ پر۔ میں اب امّی کا سامنا کیسے کر سکوں گی؟ ان کے بارے میں بہت گِر گِر سوچتی رہی ہوں۔" اس نے پھریری لے کر اپنی کنپٹیاں دونوں ہتھیلیوں سے دبا لیں۔

وہ نفرت جو برسوں سے ماں اور بیٹی کے درمیان خاموشی سے پروان چڑھتی رہی، کس قدر چھوٹی غلط فہمی کی بنیاد پر پیدا ہوئی تھی۔ میرے لیے وہ زندگی کا ایک عجیب ترین تجربہ تھا۔ حقیقت کا انکشاف ہوتے ہی غزالہ اپنے ماضی کے رویّے کے بارے میں سوچ سوچ کر جذباتی ہیجان سے دوچار ہوتی رہی۔ میں بمشکل اسے قابو میں رہنے پر آمادہ کر سکا۔ پھر اسے ساتھ لے کر لان سے اندر گیا تو اس کی ماں ڈرائنگ روم میں بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھی۔

میری صورت دیکھتے ہی اس کی نگاہوں میں محبت آمیز چمک پیدا ہو گئی۔ نقاہت آلودہ چہرے پر ممتا کا نور سمٹ آیا اور وہ اخبار تپائی پر ڈالتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔ پھر اس نے غزالہ کی بدلی ہوئی کیفیت دیکھی تو حیران سی نظر آئی لیکن اس سے پیشتر کہ وہ کچھ بولتی، غزالہ بے اختیار آگے بڑھی اور والہانہ انداز میں اپنی ماں سے لپٹ گئی۔

غزالہ کی پشت میری جانب تھی لیکن اس کے بدن کی لرزش سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کے دل کی کدورت آنسوؤں کے سیلاب میں دُھل رہی تھی۔ وہ بے آواز سسکیوں کے ساتھ روتی رہی۔ شمع کو کچھ علم نہیں تھا کہ اس کی بیٹی کس انقلاب سے دوچار ہوئی ہے لیکن اس پر بھی رقّت طاری ہو چلی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ میں وہاں رُکا رہا تو شاید میری بھی آنکھیں نم ہو جائیں گی۔ میں سر جھکائے باہر نکل آیا اور دوبارہ لان پر بیٹھ گیا۔

کچھ دیر بعد کرنل زوار واپس لوٹا تو مجھے لان پر تنہا بیٹھے دیکھ کر بوکھلا گیا۔ "ارے تنویر میاں! تم اکیلے بیٹھے ہو؟ شمع کہاں ہے؟ غزالہ بھی گھر ہی پر تھی۔ آؤ میرے ساتھ اندر چلے آؤ۔"

"آپ بھی یہیں بیٹھ جائیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے احترام آمیز انداز میں کہا۔ "وہ دونوں اندر ایک جذباتی کشمکش سے گزر رہی ہیں۔ میں بھی انھیں چھوڑ کر باہر آ بیٹھا ہوں۔"

"اوہ!" وہ بے چارہ پریشان ہو گیا۔ "پھر لڑ پڑی اپنی ماں سے۔ پتا نہیں کیوں بات بات پر شمع سے اُلجھ جاتی ہے۔"

"لڑائی نہیں۔ وہ اپنی ماں سے معافی طلب کر رہی ہے... اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا مگر اسے میری بات پر یقین نہ آ سکا۔ اس کے لیے یہ بات ناقابلِ فہم تھی کہ برسوں کی کدورت پل بھر میں مٹ سکتی ہے۔ وہ اپنا تجسس مٹانے کی خاطر اندر جانے کے لیے مڑا ہی تھا کہ اچانک اسے میرے چہرے پر رونما ہونے والی تبدیلیوں کا خیال آ گیا۔ میں نے چوٹوں کے بارے میں ایک قابلِ قبول عذر پیش کیا اور وہ سر ہلاتا ہوا بے تابانہ انداز میں اندر چلا گیا۔

سورج بلند ہونے کے ساتھ لان پر پھیلا ہوا سایہ بھی سکڑتا جا رہا تھا۔ میں اٹھ کر گلاب کی کیاریوں کے قریب جا کھڑا ہوا۔ میرا ذہن بے نور مٹی اور غلاظت کے آمیزے سے نشوونما پانے والے حسن کی رنگینیوں میں کھو گیا۔ پھر ذہنی رو غزالہ کی ماں شمع کی طرف بھٹک گئی۔ کس قدر صابر اور مہربان تھی وہ عورت بھی۔ بیٹی کے تحقیر آمیز اور جارحانہ رویّے کو خاموشی سے جھیلتی رہی۔ حد تو یہ ہے کہ گھر کی تلخیاں بھی اس کے لہجے کے دھیمے اور میٹھے آہنگ میں سرایت نہ کر سکیں۔ وہ شریف النفس تھی اور اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کی ایک عادت کامران کی بربادی کا باعث بن گئی تھی لٰہذا اس نے خندہ پیشانی کے ساتھ ہر توہین کو اپنے جرم کی سزا سمجھ کر تسلیم کر لیا تھا ـــ ماضی میں گزارے ہوئے بُرے دن بھی اس کے اندر کی نیک عورت کو نہیں بدل سکے تھے۔

چند منٹ بعد کرنل زوار زیدی مجھے ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ ماں بیٹی وہاں سے جا چکی تھیں۔ کچھ دیر بعد دونوں واپس آئیں تو شمع کے چہرے سے مسرت پھوٹی پڑ رہی تھی۔ غزالہ منہ ہاتھ دھو کر آئی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں گریۂ ندامت کے آثار صاف پڑھے جا سکتے تھے۔ وہ سر جھکائے ماں کے ساتھ بیٹھ گئی۔

ان تینوں کے لیے وہ زندگی کی بہت سعید ساعتیں تھیں کہ گھر کی فضا پر چھائے ہوئے انتشار کے بادل غیر متوقع طور پر چھٹ گئے تھے۔ شاید غزالہ نے اس بارے میں اپنی ماں کو میرے کردار سے آگاہ کر دیا تھا کیوں کہ وہ میری بہت زیادہ ممنون نظر آ رہی تھی.... محبت آمیز نگاہوں سے مسلسل مجھے ہی دیکھے جا رہی تھی۔ گفتگو کی ابتدا ہوئی تو ہر ایک اپنی جگہ شرمسار اور اپنی ذات میں سمٹا ہوا تھا لیکن شمع کے حوصلہ افزا انداز نے تھوڑی ہی دیر میں فضا ہلکی کر دی۔

"ہمیں معلوم ہوتا کہ تمھارے قدم اس گھر کے لیے اتنے مبارک ہوں گے تو غزالہ سے پہلے ہم خود تمھیں ڈھونڈ نکالتے۔" شمع نے ہلکے سرور آمیز دھیمے لہجے میں کہا۔ "سچ پوچھو تو ہم نے آج برسوں سے کھوئی ہوئی بیٹی دوبارہ حاصل کی ہے۔ ہمارے یہ تو بس تم سے ملتے ہی فدا ہو بیٹھے تھے۔"

"نہ نہ۔" کرنل زوار جلدی سے بولا۔ "یہ الزام نہ لگاؤ مجھ پر۔ تمھارے بعد کسی پر فدا ہونے کی ہمت نہیں رہی مجھ میں۔" پھر وہ غزالہ کی طرف متوجہ ہو گیا جو وہاں سے کھسکنے کے لیے پر تول رہی تھی۔ "لڑکی! بھاگنے کی ضرورت نہیں، جب تک تنویر میاں سر پر سہرا سجا کر تمھیں نہیں لے جاتے، اس گھر میں تم ہی ان کی میزبان ہو۔"

تھوڑی دیر بعد وہ دونوں میاں بیوی وہاں سے چلے گئے۔ آنکھوں کے مسلسل استعمال سے شاید شمع کی بینائی بھی متاثر ہو رہی تھی۔ اور وہ کافی دیر بعد میری چوٹیں دیکھ سکی تھی لیکن کرنل نے اس کے اصرار کو ہنسی میں اڑا دیا۔ "کچھ نہیں۔ مار دھاڑ تو مرد بچوں کی شان ہے۔ ہُوا ہوگا کچھ۔ آؤ ذرا کامران کی خبر لیں۔ وہ بھوکا ہوگا۔"

وہ چلے گئے۔ میں غزالہ کو گھورتا رہا اور وہ سر جھکائے اپنے آپ سے کھیلتی رہی۔ ایک دو بار اس نے کچھ کہنے کے لیے سر اٹھایا پھر میری نگاہوں کا سامنا کرتے ہی اس کی قوتِ گویائی جواب دے گئی۔

"کیا کہنا چاہ رہی ہو تم؟" میں نے شوخ لہجے میں اسے سہارا دیا۔ "تو نہیں بدل گیا تمھارا؟"

اس نے شکایت آمیز نگاہوں سے مجھے گھورا پھر دھیمی آواز میں بولی۔ "میں آپ کے ساتھ لاہور چلوں گی۔"

"پھر وہی ہٹ دھرمی۔ والدین سے پوچھ لیا تم نے جو اتنے مزے سے فیصلہ سنا رہی ہو؟"

"شاید اب انھیں مجھ سے زیادہ آپ پر اعتماد ہو گیا ہے۔" اس نے کہا۔ "آپ کے ساتھ کہیں بھی جانے پر انھیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ میں ان کے مزاج سے اچھی طرح واقف ہوں۔"

"اور کالج کا کیا ہوگا؟"

"دس پانچ دن کی غیر حاضری سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ پھر میں تو وقت گزاری کے لیے کالج چلی جاتی تھی۔ اب آپ کا ہاتھ بٹا کر زیادہ خوشی ہوگی۔ آپ کی خواہش نہ ہو تو اور بات ہے۔ میرا گریجویشن کا آخری سال ہے۔"

"اور وہاں تم بھیڑیوں کے بھٹ میں ملازمت کرو گی۔" میں نے سوال کیا۔

"حرج ہی کیا ہے اس میں؟" اس نے جواب دینے کے بجائے مسکرا کر کہا۔ "اس خیال میں نہ رہیے گا کہ میں لڑکی ذات ہوں۔ میں اپنا تحفظ خوب کر سکتی ہوں۔ دو برس تک مارشل آرٹس کی باقاعدہ تربیت لی ہے۔"

"اوہ۔" میں نے ہونٹ سکیڑ کر استہزائیہ انداز میں کہا۔ "اب تو پانی سر سے گزر چکا ہے۔ پہلے بتایا ہوتا تو کچھ غور کرتا۔" پھر سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے بولا۔ "تم بضد ہو تو یہ تجربہ بھی سہی لیکن میں پھر بتا رہا ہوں کہ یہ لوگ بہت سفاک اور بے رحم معلوم ہوتے ہیں۔ تمھیں اپنے سائے تک سے ہوشیار رہنا ہوگا۔"

مجھے رضامند پاتے ہی اس کا چہرہ مسرت سے دمک اٹھا اور وہ پُرجوش انداز میں مجھے اپنا طریقۂ کار سمجھانے لگی جو بڑی حد تک کتابی محسوس ہو رہا تھا لیکن میں نے اسے کہیں لقمہ نہیں دیا۔ مجھے سب سے پہلی فکر کسی ٹھکانے کی تھی۔ ہوٹل میں رہتے ہوئے ایشین سنڈیکیٹ لمیٹڈ میں ملازمت کی کوشش کی بدترین خطرات کو دعوت دینے کے مترادف ہوتی۔ ادھر کا رُخ کرنے سے پہلے لاہور کی کسی بستی میں معقول سا مکان حاصل کرنا لازمی تھا۔

٭

میں وہاں سے روانہ ہوا تو ذہنی طور پر نہایت تر و تازہ تھا۔ غزالہ کے گھر والوں سے میرا کوئی لالچ وابستہ نہیں تھا لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ جوں جوں اس گھرانے سے میرے مراسم میں پختگی آ رہی تھی، اپنی ذات میں میرا اعتماد مستحکم ہوتا جا رہا تھا جیسے میری ذات کے تشنہ پہلوؤں کی تکمیل ہو رہی ہو۔

بی۔ ون تمام سرگرمیاں ترک کرنے کی ہدایت دے کر مکافاتِ عمل کے آفاقی فلسفے کے تحت جہنم واصل ہو چکا تھا۔ اے۔ ٹو نے اس کی ہدایت کی تائید کی تھی لیکن میری نگاہ میں اس ہدایت کی کوئی عملی اہمیت نہیں تھی۔ اخباری اطلاعات کی روشنی میں یہ وہم بھی دُور ہو چکا تھا کہ کہیں میری اور بی۔ ون کی گفتگو کسی نے نہ سُن لی ہو، لٰہذا ہر راز میری ذات تک محدود تھا اور یہ امکان باقی نہیں رہ گیا تھا کہ پیش قدمی کی صورت میں مَیں کسی ناگہانی جال میں پھنس جاؤں۔

لاہور میں ایشین سنڈیکیٹ لمیٹڈ اور اے۔ ٹو کے بارے میں کھوج لگنے سے قبل میری ترجیحات میں اڈیکشن کیور سوسائٹی کا نام سرِ فہرست تھا جس کی ناجیات رکنیت سکندر علی نے اپنی نیک نامی کے بل پر چندے دے کر حاصل کر لی تھی۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ سوسائٹی کون لوگ کن بنیادوں پر چلا رہے تھے اور اس پلیٹ فارم سے تنظیم کس طرح استفادہ کر رہی تھی۔

محمد علی ہاؤسنگ سوسائٹی میں تھوڑی دیر بھٹکنے کے بعد میں اس خوب صورت بنگلے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا جس پر سوسائٹی کے نام کا بورڈ لگا ہوا تھا اور کھلے ہوئے پھاٹک میں سے وہ بڑا

بیرونی کمرہ نظر آرہا تھا جس پر باہر ہی سے کسی دفتر کا گمان ہوتا تھا۔ میں نے پھاٹک سے آگے بڑھ کر گاڑی ایک کنارے سے پارک کر دی اور دروازے لاک کر کے اس کھلے ہوئے پھاٹک سے اندر داخل ہو گیا پھر برآمدے کے ایک ستون کی اوٹ میں چوبی اسٹول پر اونگھتا ہوا اس ادارے کا ایک کارندہ بھی نظر آ گیا۔ میں اس کے قریب پہنچا تو وہ ستون سے سر ٹکائے آنکھیں موندے بیٹھا ہوا تھا۔ میرے قدموں کی چاپ بھی اس کے آرام میں خلل انداز نہیں ہو سکی تھی۔ میں نے نرمی سے اس کا شانہ چھوا تو اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔

اس کی آنکھیں لال بھبھوکا ہو رہی تھیں۔ آنکھوں کی سکڑی ہوئی پتلیوں میں غیر معمولی چمک موجود تھی جسے دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ وہ علامات یقینی طور پر کسی نشے کے استعمال کی نشاندہی کر رہی تھیں۔ نشے کے روگ میں مبتلا مریضوں کے علاج کا دعویٰ کرنے والے ادارے میں ایک نشے باز کی موجودگی ہر اعتبار سے حیرت ناک تھی۔

"سوسائٹی کا دفتر کدھر ہے؟" میں نے سوال کیا تو اس نے سامنے والے دروازے کی طرف ہاتھ اٹھا دیا۔

"اندر نسیم صاحب بیٹھے ہیں۔ وہ سوسائٹی کے سکریٹری ہیں۔"

"اور تم یہاں گولی لگائے بیٹھے ہو۔" میں نے اسے گھورتے ہوئے خشک اور چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ اس کا چہرہ فق ہو گیا اور پھر وہ ہکلاتے ہوئے بمشکل میرے عائد کیے ہوئے الزام سے انکار کر سکا تھا۔

"جھوٹ مت بولو۔" میں نے دھیمی آواز میں اسے پھٹکارا۔ "میں نشے باز کو ہزاروں کے مجمع میں الگ پہچان سکتا ہوں۔ جھوٹ بولو گے تو ابھی کھڑے کھڑے نوکری سے نکلوا دوں گا۔"

وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر گھگھیانے لگا۔ "نسیم صاحب سے شکایت نہ کرنا صاحب۔ اب ڈیوٹی پر چرس کو ہاتھ بھی نہ لگاؤں گا۔"

میں بند دروازے کا ہینڈل گھما کر اندر داخل ہو گیا۔ وہ وسیع کمرہ ایئر کنڈیشنڈ تھا اور فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ کمرے میں دو میزیں پڑی ہوئی تھیں۔ بڑی میز کے عقب میں ریوالونگ چیئر خالی پڑی ہوئی تھی۔ دوسری میز کے پیچھے ایک ادھیڑ عمر لیکن صحت مند آدمی اخبار کھولے بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے اخبار میز پر ڈال دیا۔

"نسیم صاحب؟" میں نے اس کی میز کی طرف بڑھتے ہوئے استفسار طلب لہجے میں کہا اور وہ فوراً ہی مشینی انداز میں بول پڑا۔

"جی ہاں، میں اینڈکشن کیور سوسائٹی کا سکریٹری ہوں۔ تشریف رکھیے۔ کس سلسلے میں زحمت فرمائی آپ نے؟"

"آپ کی سوسائٹی کی نیک نامی یہاں کھینچ لائی۔" میں نے اس کے مقابل بیٹھتے ہوئے کہا۔ "طریقۂ کار کا علم ہو تو شاید میں بھی آپ کے پروگرام میں کچھ حصہ لے سکوں۔"

"ہم منشیات کی عادت میں مبتلا مریضوں کا علاج کرتے ہیں۔" وہ کسی مداری کے رٹائے ہوئے طوطے کی طرح بولنے لگا۔ "اور یہ خدمت بلا معاوضہ فراہم کی جاتی ہے۔ ہمارے اخراجات مخیر حضرات کے عطیات سے پورے ہوتے ہیں۔ سوسائٹی سماجی بہبود کے محکمے میں بھی رجسٹرڈ ہے لیکن سرکاری گرانٹ اخراجات کے مقابلے میں ناکافی ہوتی ہے۔"

میں نے دفتر کے لوازمات پر پھر ایک نگاہ دوڑائی۔ قالین، ایئر کنڈیشنڈ، الیکٹرک ٹائپ رائٹر، فون اور پردوں سے لے کر فرنیچر تک ہر چیز خاصی قیمتی تھی۔ اس کروفر کے پیش نظر سوسائٹی کے خطیر بجٹ کا اندازہ لگانا دشوار نہیں تھا جو سرکاری امداد سے کسی بھی طرح پورا نہیں ہو سکتا تھا۔

"پہلے ہمارے پاس خاصی تعداد میں رضاکار موجود تھے۔ جو منشیات کی وبائی لہر کی زد میں آئے ہوئے گنجان علاقوں میں گھر گھر جا کر لوگوں کو منشیات کی تباہ کاریوں سے آگاہ کرتے تھے۔ ہمارا ارادہ ایک گشتی فلم یونٹ بھی قائم کرنے کا تھا تاکہ لوگوں کو فلمیں دکھا کر منشیات کے نقصانات سے آگاہ کیا جائے لیکن بعض مقامات پر غنڈوں نے ہمارے رضاکاروں کو بہت بے رحمی سے پیٹ ڈالا۔ اس وقت یہ سلسلہ روک دیا گیا ہے لیکن علاج معالجہ بدستور جاری ہے۔" وہ رکے بغیر مسلسل بولتا ہی چلا گیا۔ پھر اس نے دراز سے ایک کتابچہ نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔ "اس کے مطالعے سے آپ کو ہماری کارکردگی کا اندازہ ہو سکے گا۔"

"مقامی انتظامیہ سے تحفظ حاصل کر کے اگر فلم شو کیے جائیں تو شاید انفرادی رابطے سے زیادہ مؤثر ثابت ہو سکتے ہیں۔" میں نے انگریزی زبان میں... چکنے کاغذ پر چھپے ہوئے کتابچے کی ورق گردانی کرتے ہوئے کہا۔

"ہو سکتا ہے کہ اس سلسلے میں کوئی تجویز زیرِ غور ہو۔" اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ "جو پالیسی مجھ تک پہنچتی ہے اس سے آگے مجھے کچھ علم نہیں ہوتا۔ کاغذی حد تک موبائل فلم یونٹ کی تجویز آج بھی زندہ ہے۔"

"سکریٹری ہوتے ہوئے آپ مجوزہ نکات سے لاعلم رہتے ہیں؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"میں دراصل یہاں کل وقتی ملازم ہوں۔" اس نے مسکراتے ہوئے وضاحت کی۔ "پالیسی کا انحصار محسن صاحب پر ہوتا ہے جو سوسائٹی کے بانی اور چیئرمین ہیں۔"

"وہ کب ملتے ہیں؟" میں نے سوال کیا۔

"دراصل ان کا کاروبار بہت پھیلا ہوا ہے۔ اکثر بیرونی دوروں پر جاتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھار فرصت ملتی ہے تو یہاں بھی آ جاتے ہیں۔ وہ دوسری میز انہی کی ہے۔"

...یے یہ انکشاف عجیب سا تھا۔ "پالیسی کا انحصار ان پر ...صروف رہتے ہیں تو سوسائٹی کا کام کیسے چلتا ہوگا؟"

...ہ مربیانہ انداز میں ہنس دیا۔ "ان کے داماد بڑے سائیکیٹرسٹ ...ن صاحب کی غیر موجودگی میں مجھے ان ہی سے ہدایات ملتی ...۔ زیادہ تر اجلاسوں میں وہی محسن صاحب کی نیابت ...۔"

...ت کسی حد تک میری سمجھ میں آنے لگی تھی۔ مکان کے اندر سے ...بچوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ جس کا مطلب تھا کہ اس کمرے ...بقیہ مکان رہائشی مصرف میں لیا جا رہا تھا۔ محسن صاحب کا ...یکیٹرسٹ تھا تو اس کا اپنا اسپتال یا مشاورتی کلینک ہونا ...محسن صاحب نے مستحکم بنیادوں پر سوسائٹی قائم کر کے اپنے ...ں میں دے دی تھی جس پر وہ خاصا مائل بہ کرم نظر آ رہا تھا۔ ...ی بھی نشے کا استعمال ذہنی اور جسمانی اثرات مرتب کرنے کے ...دی طور پر نفسیاتی مرض ہی ہوتا ہے جس کے علاج کے لیے ...یے سے رجوع کرنا لازمی ہوتا ہے تاکہ وہ مریض کی ان ذہنی ...دیکھ سکے جن کی بنا پر نشے کی طرف رغبت پیدا ہوتی ہو۔ ...ھے اس سوسائٹی میں دلچسپی پیدا ہونے لگی۔ ویسے بھی مجھے ...ر سوسائٹی میں اثر و نفوذ پیدا کرنا تھا کیوں کہ یہ پی۔ ون کا ...تھا لیکن وہ میرا پہلا رابطہ تھا لہٰذا نسیم مجھ سے کھل کر بات ...رہا تھا۔ میں نے فوری طور پر اس جمود سے چھٹکارا پانے کے ...غور کیا تو یہی تدبیر ذہن میں آئی کہ فوری طور پر چندے کی ...ادا کر دی جائے۔

...چندہ ادا کرنے کی کیا صورت ہوگی؟" میں نے سرسری لہجے میں ...

...نسیم کا چہرہ کھل اٹھا۔ اس نے باچھیں پھیلا کر کہا۔ "وہ میں ہی ...ہوں۔ آپ جس طرح چاہیں ادائیگی کر سکتے ہیں۔ آپ کو اس ...رسید جاری کی جائے گی۔ ہمیں دیے جانے والے عطیات ...قانون انکم ٹیکس کی ادائیگی سے مستثنیٰ ہیں۔"

...پانچ ہزار کی رسید کاٹ دیں۔" میں نے جیب سے چیک بک ...ہوئے کہا۔ "میں کراسڈ چیک دیے دیتا ہوں۔"

...چیک وصول کرتے ہی اس کے رویے میں نمایاں فرق آ گیا ...جانے کے لیے اس کے خلیقانہ اصرار کو نظر انداز نہیں کر سکا۔ ...بڑی تو اس بار نسیم معلومات کا منبع ثابت ہوا۔ اس نے ...کے چیئرمین کی دردمندی اور بے لوث بھاگ دوڑ کے حوالے ...و بتایا وہ میرے لیے خاصا اہم تھا۔ اس کی حاشیہ آرائی حذف ...نہ طور پر معاملات کو سمجھ لینا دشوار نہیں تھا۔

...اصل چکر یوں تھا کہ محسن کا ایک قریبی رشتہ دار وزارت صحت و سماجی بہبود میں ایک ایسے عہدے پر فائز تھا کہ بیک جنبش قلم کسی کو بھی خطیر فائدہ پہنچا سکتا تھا۔ ان دنوں محسن مالی دشواریوں سے دوچار تھا اور ایک مضافاتی بستی میں گھریلو استعمال کی کمتر درجے کی اشیا قسطوں پر فروخت کرتا تھا۔ اپنے رشتے دار کے اختیارات سے فیضیاب ہونے کے لیے اسی کی ایما پر محسن نے اینڈکشن کیور سوسائٹی کی بنیاد ڈالی کیوں کہ ان دنوں منشیات کے بڑھتے ہوئے استعمال کے خلاف بے چینی کی شدید لہر پھیلی ہوئی تھی اور سرکاری سطح پر اس سمت میں کی جانے والی ہر کوشش کی سرپرستی کی جا رہی تھی۔ ابتدا میں محسن کی دکان کے پتے سے سوسائٹی نے صرف چھپے ہوئے خوبصورت لیٹر پیڈ پر جنم لیا تھا لیکن قلیل سی مدت میں سوسائٹی کو متعلقہ محکمے سے رجسٹریشن کے ساتھ ہی گرانٹ بھی مل گئی۔

گرانٹ کی رقم ہاتھ آتے ہی محسن نے محمد علی سوسائٹی کے اس بنگلے میں دفتر قائم کیا اور ان ہی دنوں نسیم کو کل وقتی سکریٹری کے طور پر ملازم رکھ لیا۔ کام کی ابتدا برائے نام معاوضے پر سوشیالوجی کے طلبہ اور طالبات کی جز وقتی خدمات سے ہوئی۔ مختلف آبادیوں کے سروے کے دوران میں بہت سے پُرجوش رضاکار بھی فراہم ہو گئے پھر سروے رپورٹوں کے اعداد و شمار کی مدد سے اثر انگیز کتابچے چھپوائے گئے جو سرکاری محکموں کے ساتھ اچھی شہرت رکھنے والے مخیر شہریوں اور اداروں کو بھی ارسال کیے گئے۔ اس کے بعد وزارت صحت و سماجی بہبود کے اس بڑے افسر کی صدارت میں ایک ہوٹل میں عصرانے کے ساتھ انسداد اور ترک منشیات پر ایک تقریب منعقد کی گئی جس میں معززین شہر بھی مدعو کیے گئے تھے۔ جلسے میں خطیر عطیات دیے گئے کیوں کہ پروگرام بہت مؤثر اور کامیاب رہا تھا اور یوں اینڈکشن کیور سوسائٹی ابتدا ہی سے مستحکم بنیادوں پر چل نکلی۔

دو ڈھائی سال بعد محسن کا وہ محسن رشتے دار اپنے عہدے سے ریٹائر ہو گیا لیکن اینڈکشن کیور سوسائٹی کا نام تمام اہم سرکاری محکموں کی فائلوں میں درج ہو چکا تھا لہٰذا اپنے ماضی کی بنیاد پر اسے تمام سرکاری رعایتیں ملتی رہیں اور رفتہ رفتہ سوسائٹی کی سالانہ آمدنی کئی لاکھ روپے تک پہنچ گئی۔ اس کے تحت شہر کے تین علاقوں میں منشیات کے عادی مریضوں کے علاج کے لیے مراکز قائم تھے، جہاں اعزازی اور تنخواہ یافتہ ماہرین باری باری بیٹھتے تھے۔

سوسائٹی کے ساتھ ساتھ محسن کی کاروباری مصروفیات بھی بڑھتی چلی گئیں لیکن سوسائٹی سے اس کی وابستگی برقرار رہی۔ اس نے اپنی کوششوں سے سوسائٹی کے اسپتال کے لیے حکومت... سے ڈیڑھ ایکڑ زمین بھی حاصل کر لی تھی لیکن فنڈز کی کمی کے باعث اس وسیع پلاٹ پر ایک کمرے اور سائبان سے زیادہ کچھ نہ بن سکا تھا۔ سوسائٹی کے نام پر امپورٹ ڈیوٹی اور سیلز ٹیکس کی ادائیگی

سے منگنے بعض آلات اور مشینیں درآمد کے بعد بقول نسیم کے... بے مصرف پڑی ہوئی تھیں لیکن مجھے یقین تھا کہ ان سے محسن کا داماد کام لے رہا ہوگا۔

محسن اس کوشش میں لگا ہوا تھا کہ متعلقہ محکموں سے اس پلاٹ پر احاطے کے ساتھ دکانیں نکالنے کی اجازت مل جائے تو ان کی فروخت سے ہونے والی آمدنی سے اسپتال کی تعمیر کے کام کا آغاز کیا جا سکے۔ اسی کے ساتھ سوسائٹی اسپتال کی تعمیر کے لیے چندے کی فراہمی کی خصوصی مہم بھی شروع کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔

نسیم نے بتایا کہ منشیات کے استعمال کی وبا خوفناک پیمانے پر فروغ پذیر تھی۔ غریب اور پسماندہ بستیوں کے ساتھ تعلیمی ادارے اور عزت دار خوشحال گھرانے بھی اس کی زد میں آئے ہوئے تھے جو بدنامی کے خوف سے عام مراکز سے رجوع نہیں کر سکتے تھے۔ ایسے لوگوں کی خاصی تعداد مشورے کے لیے سوسائٹی سے رجوع کرتی تھی۔ ایسے مریض عموماً محسن کے داماد سے اس کے نجی کلینک میں رازداری کے ساتھ علاج کو ترجیح دیتے اور یوں پُرامن بقائے باہمی کی بنیاد پر وہ سارا چکر چل رہا تھا۔

دو ہفتے بعد سوسائٹی کی جانب سے ایک اسٹڈی گروپ لیاری کے علاقے میں منشیات کی خرید و فروخت اور کھپت کے بارے میں ایک خفیہ سروے کرنے والا تھا۔ گروپ کے اراکین اپنی حیثیت اور مقاصد کا اظہار کیے بغیر مقامی آبادی میں گھل مل کر معلومات حاصل کرتے۔ میرے لیے نچلی سطح پر کام کے انداز کو دیکھنے کا وہ ایک اچھا موقع تھا للٰہذا جب نسیم نے جھجکتے ہوئے مجھے اسٹڈی گروپ میں شمولیت کی دعوت دی تو میں بلا تامل تیار ہو گیا۔

میں وہاں سے روانہ ہوا تو نسیم میرا گرویدہ ہو چکا تھا اور میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں غزالہ کی ماں اور کامران کے سلسلے میں محسن کے داماد سے ضرور رجوع کروں گا تاکہ ان کے علاج کے ساتھ ہی اس شخص کو بھی قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع مل سکے۔

☆

میں نے کار گلی میں گھمائی تو تاریک شیشوں والی سرخ کرولا کو اپنے مکان سے ذرا پہلے کھڑا دیکھ کر چونک پڑا۔ میرے لیے وہ کار نئی نہیں تھی۔ میں ایک سے زائد بار سی۔ ون کو اس میں دیکھ چکا تھا لیکن مجھے اس کی کار کا نمبر یاد نہیں تھا للٰہذا میں نے سر جھٹک دیا۔ شہر میں اس رنگ اور ماڈل کی تاریک شیشوں والی نہ جانے کتنی کاریں رہی ہوں گی۔ وہ ایک اتفاق بھی ہو سکتا تھا۔ پھر سی۔ ون کو میرے پاس دوڑے آنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے اپنے تعاقب میں لگے ہوئے اس کے آدمی کی بے رحمی سے مرمت ضرور کی تھی لیکن اس بارے میں وہ اپارٹمنٹس پر بھی بات کر سکتا تھا۔

لیکن پورچ میں گاڑی سے اترتے ہی جب مجھے بتایا گیا کہ ڈرائنگ روم میں کوئی ملاقاتی ڈیڑھ گھنٹے سے میری واپسی کا انتظار کر رہا ہے تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ باورچی نے بتایا کہ خطرناک صورت والا ملاقاتی زبردستی انتظار کرنے پر مُصر تھا۔ اس نے دو تین مرتبہ میری تلاش میں فیکٹری بھی فون کیا تھا۔ گھر میں ایک ہی نمبر پر دو لائنیں ہونے کا واضح نقصان تھا کہ ملازمین کسی گستاخ ملاقاتی کو فون استعمال کرنے سے نہیں روک سکتے تھے۔ میں خواب گاہ میں جانے کے بعد ڈرائنگ روم والے فون کا سلسلہ منقطع کر دیتا تھا۔ یہ بات ملازم بھی جانتے تھے لیکن میری عدم موجودگی میں خواب گاہ مقفل ہونے کے باعث وہ کچھ بھی نہ کر سکے تھے۔

سی۔ ون ڈرائنگ روم میں داخلی دروازے کے عین مقابل براجمان تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ صوفہ چھوڑ کر اٹھ گیا۔ میں دروازے ہی میں رُک کر خشک نگاہوں سے اسے گھورنے لگا پھر سرد لہجے میں بولا۔ ”تم یہاں کیوں آئے ہو؟“

”مجبوری“ اس نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ ”مجھے یوں نہ گھورو، اندر چلے آؤ۔ میں بہت پریشان ہوں۔“

”تم اپارٹمنٹس پر بھی بات کر سکتے تھے۔“ میں نے اندر داخل ہوتے ہوئے دھیمے مگر ترش لہجے میں کہا۔

”تم نے اس پر رابطے سے منع کر دیا تھا۔“ وہ سنجیدہ ضرور تھا لیکن اس کے انداز سے بے پروائی مترشح تھی جیسے اسے میرے رد عمل کی کوئی فکر نہ ہو۔

”خوب۔“ میں نے بیٹھتے ہوئے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ ”اور گھر پر دوڑے چلے آنے کی اجازت دے دی تھی؟ گھر معلوم تھا تو تم فون نمبر معلوم کر کے اس پر بھی بات کر سکتے تھے۔“

میرے چبھتے ہوئے لہجے کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا اور وہ ایک گہرا سانس لے کر میرے قریب ہی بیٹھ گیا۔

”میں آیا تو کسی اور کام سے ہوں لیکن یہ بتا دوں کہ آج تم نے اچھا نہیں کیا۔“ وہ بغور میری طرف دیکھتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولا۔

”کیا اچھا نہیں کیا؟“ میں نے انجان بن کر رکھائی سے سوال کیا۔

”اسے اسپتال میں داخل کرانا پڑا ہے۔“ وہ دھیمے اور پُرسکون انداز میں بولا۔ ”تم نے میرے آدمی سے الجھ کر مجھ سے مخاصمت مول لینے کی کوشش کی ہے۔ تمہیں کیا ضرورت تھی اس پر ہاتھ اٹھانے کی؟“

”اوہ!“ میں نے ہونٹ سکیڑ کر تحیر زدہ آواز میں کہا۔ ”تو وہ سیاہ کار والا بھی تمہارا ہی آدمی تھا؟“

میری کامیاب اداکاری پر وہ سٹپٹا گیا اور اس کی آنکھوں میں الجھن کے آثار نظر آنے لگے۔ ”تو تمہیں شبہ تھا اس میں؟“

”شبہ۔“ میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ ”میرے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ تمہارا آدمی ہوگا۔ اس وقت حالات مخدوش ہیں۔ ہدایت شاید تمہیں بھی یاد ہو گی۔ پھر آج کے اخبارات دیکھنے کے بعد تو میں ضرورت سے زیادہ چوکنا ہو گیا تھا۔ تمہارے آدمیوں کو میں پہچانتا ہوں۔ سیاہ کار والے کو کسی گمنام دشمن کا ہرکارہ سمجھ کر گھیرا تھا۔ وہ تو غنیمت ہوا کہ میں مسلح نہیں تھا اور وہ بہت سخت جان تھا ورنہ میں تو اسے ختم ہی کرنے پر تُل گیا تھا۔“

اس کا چہرہ بگڑ گیا۔ جیسے مٹھاس کے دھوکے میں اس نے کڑوی چیز چبا ڈالی ہو۔ ”تم دشمن بھی سمجھے تھے تو اس سے الجھنے کے بجائے.... پیچھا چھڑا کر نکل جاتے۔ ان حالات میں ذرا سی غلطی گردن کا پھندا بن سکتی ہے۔ اگر پولیس کی کوئی گشتی پارٹی آ نکلتی تو کیا ہوتا۔ شاید تم طارق اور سکندر علی کا انجام بھول گئے ہو۔“

”مجھے سب کچھ یاد ہے اعادہ کرنے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ”مجھ پر اسی وجہ سے خون سوار ہوا تھا۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ کسی دشمن کی نگاہوں میں آ جاؤں۔ جہاں میں نے اسے گھیرا، وہ علاقہ میرا دیکھا بھالا ہے۔ اس کی چیخوں پر مداخلت کا امکان پیدا ہوتے ہی میں بھاگ نکلا تھا۔“ پھر فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ ”جب تمام سرگرمیاں موقوف کرا دی گئی ہیں تو تعاقب کا سلسلہ بھی فوراً بند ہونا چاہیے۔ ویسے بھی تمہارے آدمی اتنے ماہر نہیں کہ آسانی سے نگاہوں میں آ جاتے ہیں۔ آئندہ کے لیے یا تو اپنے ہر آدمی کا چہرہ دکھاؤ یا انھیں محتاط رہنے کا مشورہ دو ورنہ میرے ساتھ دوبارہ ایسی غلط فہمی پیش آ سکتی ہے اور اس بار اس کا انجام خونریزی سے کسی طرح کم نہ ہوگا۔“

”تم نے ابھی آج کے اخبارات کا حوالہ دیا تھا۔“ وہ قدرے توقف کے بعد ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”شاید تم بھی اسی نتیجے پر پہنچے ہو گے کہ بی۔ ون ختم ہو گیا۔ ایم۔ ٹی ہتھری ہنڈرڈ کے واقعے سے ہم لوگوں کے لیے یہ بات راز نہیں رہی ہے۔ عام حالات میں میں تمہارے مشوروں کا پابند تھا لیکن خصوصی حالات میں مجھے بی۔ ون سے براہ راست ہدایات ملتی تھیں۔ اس کے آخری احکامات سے واقف ہونے کے بعد کل میں نے اے۔ ٹو سے رابطہ کیا تھا۔“

وہ خاموش ہو کر سگریٹ سلگانے لگا اور میں متجسس انداز میں اس کے دوبارہ بولنے کا انتظار کرنے لگا۔ سگریٹ کے دو گہرے کش لے کر وہ میری طرف مخاطب ہوا۔ ”کل تمہاری بھی تو اے۔ ٹو سے بات ہوئی تھی؟“ اس کا لہجہ پُراعتماد اور تائید طلب تھا۔ میں جواباً محض سر ہلا کر رہ گیا۔

”اس نے مجھے ہدایت کی ہے کہ کنارہ کشی کی اس عبوری مدت میں بھی معمول کے مطابق میرے آدمی وقتاً فوقتاً لوگوں کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھیں گے۔ بی۔ ون کی موت کی خبریں آ جانے کے بعد میں فی الحال براہ راست اے۔ ٹو کو جواب دہ ہوں۔ اس لیے میرے آدمیوں کے بارے میں تمہیں مشورہ دینے کی ضرورت نہیں البتہ آئندہ کی کسی غلطی کے ازالے کے بارے میں تمہاری تجویز معقول ہے، میں اپنے آدمیوں سے کڑی بازپرس کروں گا کہ تمہاری نگاہوں سے خود کو کیوں محفوظ نہ رکھ سکے۔

”میرے پاس وقت کم ہے۔“ میں نے رسٹ واچ پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ ”تم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ تمہارے یہاں آنے کا مقصد کیا تھا۔ میری دانست میں تم نے یہاں آ کر بہت بڑی بے اعتدالی کا ارتکاب کیا ہے۔“

”مجھے احساس ہے۔“ اس نے نیم باز آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے اعتراف کیا۔ ”لیکن میں شدید الجھن سے دوچار ہوں۔ شاید کل تم نے اے۔ ٹو سے رخشی نامی لڑکی کی شکایت کی تھی۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم نے آخری بار اسے کہاں دیکھا تھا؟“

اس کی سنجیدگی اور تشویش پر میں اس کی کامیاب اداکاری کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا۔ ”اس سے کیا تعلق ہے تمہارا؟“

”اے۔ ٹو نے اسے ٹھکانے لگانے کا حکم دیا ہے لیکن میں سارے شہر کی خاک چھان کر بھی اس کا سراغ نہیں لگا سکا۔ وہ کل شام سے لاپتا ہے۔ تم نے اسے کہاں چھوڑا تھا؟“

میرا جی چاہا کہ اسے اس کی اداکاری پر کھری کھری سنا ڈالوں۔ میں نے رخشی سے ملنے والے نمبر پر فون کیا تو قاسم کے روپ میں سی۔ ون کی آواز صاف پہچانی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ میں نے اس پر اپنی شناخت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ میں اسے بتا چکا تھا کہ میں نے رخشی کو مدہوش حالت میں انڈس ہوٹل میں چھوڑا تھا جہاں مقفل کمرے کی چابی اندر ہی کھسکا دی تھی تاکہ وہ ہوش میں آ کر خاموشی سے واپسی کی راہ اختیار کر سکے لیکن مجھے زبان بند ہی رکھنی پڑی۔ اس مرحلے پر میری زبان سے طنز آمیز انکشاف سن کر وہ سوال کر سکتا تھا کہ میں نے اس کی آواز پہچان ہی لی تھی تو اسی وقت معاملہ صاف کیوں نہیں کیا تھا؟

”انڈس ہوٹل کے کمرہ نمبر ایک سو دو میں وہ نشے میں دھت پڑی ہوئی تھی۔“ میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”یہ تو تم مجھے بتا ہی چکے تھے۔“ اس نے گہرا سانس لے کر کہا اور میں چونک پڑا۔

”کب؟“ میں نے تحیر زدہ انداز میں سوال کیا۔ ”اس موضوع پر تو تم سے میری بات ہی نہیں ہوئی تھی۔“

”تمہیں پوری بات ہی بتانا پڑے گی۔“ وہ کمزور لہجے میں بولا۔ ”دراصل وہ میرے ہی گھر میں رہ رہی تھی لیکن مجھے اس کی مصروفیات

کا قطعی علم نہیں تھا کیوں کہ میں خود اپنے کاموں کے سلسلے میں دن بھر بلکہ رات گئے تک گھر سے باہر رہتا ہوں۔ مجھے ذرا بھی علم نہیں کہ وہ تمھارے پیچھے کیوں لگی تھی اور اسے اس کام پر کس نے اکسایا تھا؟ کل رات تم نے اس کے بارے میں فون پر مجھے دھمکیاں دیں تو میں نے تمھاری آواز پہچان لی تھی۔ میرا خیال تھا کہ تم بھی میری آواز شناخت کر لوگے لیکن تم اس معاملے میں بالکل ہی اناڑی ثابت ہوئے۔ وہ رات بھر گھر نہیں لوٹی۔ اسی اثنا میں مجھے اسے۔ تم سے اس کے بارے میں ہدایت مل چکی تھی۔ اکتا کر تین بجے میں نے ہوٹل فون کیا تو معلوم ہوا کہ زخشی رات سوا دو بجے سراسیمگی کے عالم میں وہاں سے ایک ٹیکسی میں روانہ ہوئی تھی اور اب میں اس کی تلاش میں ہوں۔"

"تو قاسم کے روپ میں فون پر تم ہی تھے؟" میں نے حیرت سے کہا لیکن حقیقی معنوں میں مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ اس نے کس مصلحت کے تحت میرے سامنے حقیقت کے اظہار کا فیصلہ کیا تھا؟

شاید اسے شبہ ہو گیا تھا کہ میں نے فون پر اس کی آواز پہچان لی تھی۔ اس طرح زخشی کے اعترافات کی روشنی میں سی ون کی طرف سے میرا بدظن ہونا لازمی تھا۔ اس نے میری نگاہوں میں اپنا مقام برقرار رکھنے کے لیے خود ہی بات کھول دی تھی اور ساتھ ہی یہ بھی واضح کرنے کی کوشش کی تھی کہ زخشی کا مجھ سے ٹکرانا اس کے یا تنظیم کے کسی پروگرام کا حصہ نہیں تھا جب کہ میرے لیے یہ بات ہر شبے سے بالاتر تھی کہ تنظیم کے کسی ذمے دار رکن نے سکندر علی کے بعد زخشی کو بالواسطہ طور پر میرے سر پر مسلط کرنے کی کوشش کی تھی تاکہ اس کے ذریعے میری جملہ مصروفیات پر نگاہ رکھی جا سکے۔

"روپ کیا؟ میرا نام ہی قاسم ہے۔" اس نے خفت آمیز انداز میں کہا۔ "اب تم یہ بتاؤ کہ میں اسے کہاں سے پیدا کروں؟"

"تم ہوٹل سے تصدیق کر چکے ہو کہ میرا بیان درست تھا۔ وہ دونوں مرتبہ مجھے سڑک پر ہی ٹکرائی تھی۔ مجھے اس کے بارے میں ایک فون نمبر کے علاوہ کچھ بھی معلوم نہیں ہے اور وہ نمبر بقول تمھارے تمھارا اپنا ہے۔ ویسے میں اسے بالکل فراموش کر چکا ہوں کیوں کہ اے۔ ٹو نے مجھے یہی حکم دیا تھا۔ اس کے مطابق اب زخشی کو دیکھنا تمھاری ذمے داری ہے۔"

"میں دوستانہ حیثیت میں تمھارے پاس آیا ہوں۔" وہ مصالحانہ لہجے میں بولا۔ "آج تک ایسا نہیں ہوا کہ مجھے کوئی حکم ملا ہو اور میں اس کی تعمیل سے قاصر رہا ہوں۔ رات گئے اس کا نشہ اتر بھی گیا تھا تو ذہن ضرور دھندلایا ہوا ہوگا۔ ایسی حالت میں اسے سیدھا گھر واپس آنا چاہیے تھا لیکن اس کا تو سراغ ہی نہیں مل رہا۔"

"ویسے وہ عورت ہے۔" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ اس کی پراگندہ ذہنیت بھانپ کر ڈرائیور کو شرارت سوجھی ہو۔ تمھیں انڈس ہوٹل سے ٹیکسی ڈرائیورز کے بارے میں معلومات حاصل کرنی چاہییں۔"

"مجھے بھی یہ شبہ ہوا تھا۔ میں ڈرائیور تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ بال بچے دار شریف آدمی ہے۔ اس کے ہاتھ صاف ہیں۔ اس نے زخشی کو ائیرپورٹ کے ایک ہوٹل پر اتارا تھا۔" ایک لمحے کے لیے رک کر اس نے سگریٹ کا کش لیا۔ پھر تھکے ہوئے لہجے میں بولا۔ "میں نے کوئی امکان نظر انداز نہیں کیا لیکن ٹیکسی سے اترنے کے بعد کسی نے اسے نہیں دیکھا۔ وہ ٹیکسی کو ہوٹل کے کمپاؤنڈ میں لے جانے کے بجائے پھاٹک کے قریب سڑک ہی پر اتر گئی تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے اسے نیم تاریک احاطے میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ٹیکسی کے روانہ ہوتے ہی دوبارہ باہر آ گئی ہو۔"

"وہ خطرناک نیت سے میرے پیچھے لگی تھی۔ اس لیے ہوش میں آتے ہی خود کو کمرے میں مقفل پا کر سمجھ لیا ہوگا کہ شراب پی کر اس نے غلطی کی تھی۔ شاید وہ اس غلطی کے انجام سے بھی بے خبر نہیں تھی۔ ہو سکتا ہے کہ جان کے خوف سے روپوش ہو گئی ہو۔" میں نے اس سے اپنی جان چھڑاتے ہوئے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

قاسم یا سی۔ ون کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی جیسے وہ باتوں میں الجھا کر میری زبان سے وہی نتیجہ سننے کا منتظر رہا ہو۔ "تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اگر وہ کہیں نظر آ جائے تو فوری طور پر مجھے اطلاع دے دینا... حالات تمھارے سامنے ہیں لیکن اس کی تلاش میں تاخیر کو ہر صورت میں میری نااہلی سمجھا جائے گا۔"

"لیکن یہ بات ابھی تک صاف نہیں ہوئی کہ تم یہاں کیوں دوڑے چلے آئے؟" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "کیا تم یہ سمجھ رہے تھے کہ میں نے اسے اغوا کر کے قید کیا ہوا ہے؟!"

"ارے نہیں۔" وہ جلدی سے بولا۔ "زخشی کے معاملے میں اے۔ ٹو نے بہت اختصار سے کام لیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ تم سے مل کر معلومات میں کچھ اضافہ ہو سکے گا اور ہاں، اب آ ہی گیا ہوں تو یہ بھی سن لو کہ کسی مشن کے لیے تم جن آدمیوں کا انتخاب کرنے والے ہو، ان کے کوائف سے مجھے باخبر کر دینا تاکہ میں ان کے بارے میں تحقیقات کر کے تمھیں باخبر کر سکوں کہ وہ کس حد تک قابلِ اعتماد ثابت ہوں گے۔"

"لیکن اس بارے میں مجھے تو کچھ نہیں بتایا گیا۔" میں نے اشتباہ آمیز لہجے میں کہا۔

"میں نے ہدایت تم تک پہنچا دی۔ عمل کرنا یا نہ کرنا تمھاری ذمہ داری ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اے۔ ٹو کو یہ نکتہ بعد میں یاد آیا ہو۔ ہنگامی حالات میں ایسی گڑبڑ ہو ہی جاتی ہے۔"

اس کے بعد وہ تو چلا گیا لیکن میرے ذہن میں کئی نئے پے

...شان ابھر آئے۔

بظاہر زخشی کے غائب ہونے کی معقول وجوہ موجود تھیں۔ جب ...در علی تنظیم میں بی۔ فور کے عہدے پر فائز رہا، وہ مسلسل اس کے ...ط رہی۔ پھر اسی نے سکندر علی کے مکان میں چوری کی خبر ...پہنچائی۔ اس دوران میں وہ دیکھ چکی تھی کہ کچھ لوگوں کی ...میں آجانے کے باعث طارق کو انتہائی غیر جذباتی انداز میں ...یا قاسم کے ہاتھوں ہلاک کرا دیا گیا۔ پھر حفاظتی انتظامات سے ...کے جرم میں سکندر علی کی جملہ خدمات کو فراموش کر کے معزول کر ...ر وہ خود قاسم جیسے سفاک قاتل کے پاس پناہ گزیں ہو گئی۔ وہ ...سے اچھی طرح واقف رہی ہوگی کہ وہ میری بادہ نوشی میں ...ہو کر غلطی کی مرتکب ہوئی تھی اور میں نے زبردستی اسے اتنی ...فی کہ وہ ہوش و حواس پر قابو نہ رکھ سکی۔ اس بے اعتدالی کی وجہ ...معلومات حاصل کرنے کا سنہری موقع کھو چکی تھی جس کی سزا ...بھیانک ہو سکتی تھی اور وہ اس انجام سے بچنے کے لیے روپوش ...لیکن میرا ذہن اس مفروضے کو قبول کرنے کو تیار نہیں تھا۔

قاسم نے زخشی کے بارے میں خاصی مکاری سے کام لیا تھا لیکن ...رویے سے مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے وہ زخشی کے معاملے ...اپنی بے بسی کا گواہ بنانے آیا ہو۔ یہی سوچتے سوچتے اچانک ...ال آیا کہ کہیں قاسم نے خود ہی زخشی کو نہ چھپا دیا ہو۔ ان دونوں ...ی مراسم تھے۔ اس بارے میں زخشی کا بے راہ رو ہونا میرے نزدیک ...تھا۔ شاید قاسم زخشی کی تمام مجبوریوں اور کمزوریوں کو جاننے کے ...دل کے ہاتھوں مجبور تھا اور جب اسے اے۔ ٹو کی جانب سے ...کے بارے میں آخری حکم ملا تو اس نے حکم کی تعمیل کے بجائے زخشی کو ...اور اس کی روپوشی کا ڈھونگ رچا کر میرے پاس دوڑتا چلا آیا تاکہ ...بے گناہی کا گواہ بنا سکے۔

کھانے کے دوران میں میرا ذہن اسی گتھی میں الجھا رہا۔ پھر میں ...اور پر اس معاملے کو دیکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ سلطان شاہ کو میں ایک ہزار ...ادا کر چکا تھا۔ اس کا پتا میرے پاس موجود تھا۔ میری دانست ...سے کام لینے کا وقت آ گیا تھا۔

کھانے سے فارغ ہو کر میں پٹھان کالونی کی طرف روانہ ہو گیا۔ ...وہ گنجان آباد علاقہ میرے لیے نیا نہیں تھا تو اتنا مانوس ...تھا۔ ان دنوں ندی پر نیا پل تعمیر نہیں ہوا تھا اور سارا ...ندی میں بنی ہوئی کھنڈر نما شکستہ اور ناہموار سڑک سے گزرتا ...کی وجہ سے اس راستے پر تقریباً ہر وقت ٹریفک کا اژدہام رہتا ...گلشن اقبال اور ناظم آباد سے سائٹ ہوتا ہوا وہاں پہنچا اور ...مسلے بائیں ہاتھ پر اس مختصر سے ناہموار میدان میں پارک ...ملک کے شمالی علاقوں کے لیے روانہ ہونے والی بسوں کا اڈہ بنا ہوا تھا۔

کار کے دروازے مقفل کر کے میں پلٹا ہی تھا کہ دس گیارہ برس کی عمر کا ایک سرخ و سفید بچہ میرے قریب آ پہنچا اور شکستہ لیکن دھیمے لہجے میں بولا۔ "صاحب مال چاہیے؟ بڑھیا سلاجیت اور چرس دیکھے گا تو تیرا طبیعت خوش ہو جائے گا۔"

میدان میں چارپائیوں پر بیٹھے اور لیٹے ہوئے لوگوں کے لیے نئی کار کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ ہر ایک بے فکری سے اپنی مصروفیات میں کھویا ہوا تھا۔ پشاوری طرز کے مخصوص چائے خانوں میں چولھوں پر چڑھی تام چینی کی کیتلیوں سے نکلنے والی بھاپ فضا میں دور تک پھیل رہی تھی لیکن اس کمسن لڑکے کی گفتگو مجھ تک محدود تھی۔ البتہ میں نے تقریباً فوراً ہی یہ بھانپ لیا تھا کہ ایک دکان کے سامنے افغان طرز کے لباس میں ملبوس ایک شخص پتھر پر بیٹھا میری طرف دیکھ رہا تھا۔

میرا دل چاہا کہ بات آگے بڑھا کر کم از کم غیر روایتی انداز میں دکاندار سے ہی واقفیت حاصل کی جائے لیکن میرے پاس وقت کم رہ گیا تھا۔ میں اس لڑکے کے بالوں میں ہاتھ پھیر کر مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

سڑک نما کھنڈرات کے کنارے کنارے بلندی سے بہہ کر آنے والے گندے پانی کی متعفن نالیوں سے بچ کر تھوڑی دور بڑھنے کے بعد ہی مجھے وہ درزی خانہ نظر آ گیا جہاں مجھے طوطی خان سے ملنا تھا۔ اس دکان کے ساتھ والی گلی میں داہنے ہاتھ پر ساتواں دروازہ سلطان شاہ کے گھر کا تھا۔ دکان مل جانے کے بعد میں چاہتا تو براہِ راست اس کے دروازے پر دستک دے سکتا تھا لیکن اس نے مجھے بتا دیا تھا کہ پہاڑی پتھروں اور گارے سے بنی ہوئی اس آبادی میں کسی اجنبی کا دروازے پر دستک دینا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ بے وقت کی مجبوری اور بات تھی لیکن اس وقت خود کو گلی میں سلطان شاہ کے پڑوسیوں کی نگاہوں کا مرکز بنانا مناسب نہیں تھا۔

طوطی خان پگڑی اور واسکٹ میں ملبوس ایک باریش نوجوان ثابت ہوا جو مشین کے عقب میں بیٹھا انہماک کے ساتھ سلائی میں مصروف تھا۔ میرے استفسار پر اس نے داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کاجل بھری آنکھوں سے میرا جائزہ لیا پھر مطلع کیا کہ وہ خود ہی طوطی خان تھا۔ سلطان شاہ سے ملاقات کا مدعا سنتے ہی اس نے پلٹ کر پشتو میں ایک لڑکے کو کچھ ہدایت دی اور وہ استری کا پلگ نکال کر فوراً ہی گلی میں دوڑتا چلا گیا۔

طوطی خان نے لکڑی کا ایک شکستہ اسٹول مختصر سی دکان کے باہر پتھروں سے بنے ہوئے چبوترے پر رکھ دیا۔ اس نے چائے پلانے پر اصرار کیا لیکن میں نے عجلت کا بہانہ کر کے اسے ٹال دیا۔ پھر بھی اس میں اتنا اخلاق پایا جاتا تھا کہ جب تک سلطان شاہ نہیں آیا، وہ کام روکے میری طرف متوجہ رہا کیوں کہ میں اس کا گاہک نہیں بلکہ اس کا مہمان تھا۔

سلطان شاہ کو دیکھتے ہی میں طوطی خان سے گرمجوشی سے ہاتھ ملا کر سنگی چبوترے سے نیچے اتر آیا اور سلطان شاہ کو ساتھ لے کر اپنی کار کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

"میں تو سمجھا تھا کہ تم مجھے بھول ہی گئے۔" سلطان شاہ پُرمسرت لہجے میں بولا۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ "کچھ دن اور نہ آتے تو میں دوسرے کام کی تلاش شروع کر دیتا۔"

"ایسی حماقت نہیں کرو گے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "تمھیں وقت پر تنخواہ ملتی رہے گی۔ چھوڑنا ہوگا تو پہلے بتا دوں گا۔"

"لیکن صاحب تنخواہ کے ساتھ کام بھی تو ہونا چاہیے۔" اس نے احتجاج آمیز لہجے میں کہا۔ "گھر پر پڑے پڑے ہاتھ پیروں میں زنگ لگ رہا ہے۔ زیادہ دن گھر پر پڑا رہا تو دیکھنے والے شبہ کرنے لگیں گے کہ میرے پاس اخراجات کے لیے رقم کہاں سے آ رہی ہے۔"

"عقل سے بھی ادھورے ہی ہو۔ اتنے بڑے شہر میں دو چار گھنٹے کہیں بھی گزار سکتے ہو۔ ویسے اب تمھارے لیے کام نکل آیا ہے۔" میں نے کہا۔

کار میں اسے ساتھ لے کر واپس روانہ ہوتے ہوئے میں نے اسے زخشی کے بارے میں ہر وہ امکانی شناخت بتانی شروع کر دی جو اس وقت مجھے یاد تھی۔ قاسم کے بارے میں مجھے اتنا زیادہ نہیں بتانا پڑا۔ اس کا چہرہ اتنا خوفناک اور منفرد تھا کہ اسے ہزاروں کی بھیڑ میں بھی آسانی سے پہچانا جا سکتا تھا۔

قاسم کا پتا میں نمبروں کی ترتیب والی ٹیلیفون ڈائرکٹری سے پہلے ہی نوٹ کر چکا تھا۔ جب سلطان شاہ کو یہ معلوم ہوا کہ اس پتے پر رہنے والے بدصورت شخص کے ذریعے اسے لڑکی کا سراغ لگانا ہے تو وہ پُرجوش نظر آنے لگا۔ میں نے اسے اس امکان سے بھی باخبر کر دیا تھا کہ زخشی کہیں قاسم ہی کے گھر میں روپوش نہ ہو۔

وہ آدمی قابلِ اعتماد تھا لہٰذا میں نے اسے اپنا فون نمبر یاد کرا دیا۔ اس نے نمبر نوٹ کرنا چاہا تو میں نے اسے سختی سے منع کر دیا۔ اس مہم میں اگر وہ پھنس جاتا تو اس کے پاس سے برآمد ہونے والا نمبر فوری طور پر میرے اور اس کے تعلق کی نشاندہی کر سکتا تھا۔ رازداری اور احتیاط کے بارے میں اسے مختصر سا لیکچر دے کر میں نے اسے لسبیلہ پر اتار دیا۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق اسے آٹھ بجے فون پر مجھے اپنی کارکردگی کی اطلاع دینا تھی۔

میں ساڑھے چار بجے انڈس ہوٹل پہنچ گیا۔ وہاں منیجر نے مجھے دیکھتے ہی میری طرف لپکا تھا۔ اس نے رات گئے زخشی کی واپسی کے بارے میں بتاتے ہوئے اپنی دانست میں انکشاف کیا کہ صبح تین بجے کسی شخص نے ہوٹل فون کر کے زخشی کے بارے میں خاصی معلومات حاصل کی تھیں جس میں زخشی کو لے جانے والی ٹیکسی کا نمبر بھی شامل تھا جو زخشی کی بے وقت روانگی کے باعث استقبالیہ کلرک نے احتیاطاً نوٹ کر لیا تھا۔

"سب ٹھیک ہے تمھیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔" میں بے پروایانہ انداز میں اسے تسلی دیتا ہوا سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا لیکن وہ میرے پیچھے ہی لگا چلا آیا۔

"اور سر ایک فون اور آیا تھا ابھی تھوڑی دیر پہلے۔" اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ "وہ جاننا چاہتا تھا کہ آپ ہوٹل کے کس کمرے میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔"

"ہاں، میرے پاس چار پانچ مہمان آنے والے ہیں۔" میں نے مڑ کر کہا۔ "ان ہی میں سے کوئی رہا ہوگا۔"

اس سے جان چھڑا کر اپنے کمرے میں پہنچا تو میرے ذہن پر ایک بوجھ سا سوار تھا۔ اگر قاسم یاسین واقعی زخشی کی محبت میں مبتلا تھا تو میرے لیے ایک الجھن کا آغاز ہو چکا تھا۔ اسے یقینی طور پر یہ بات پسند نہ آئی ہوگی کہ میں نے زخشی کی چال اس حد تک اسی پر لوٹا دی تھی کہ . . . . اسے۔ ٹو نے اس کے لیے سزائے موت کا فیصلہ صادر کر دیا تھا۔ بظاہر ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ قاسم نے اسے۔ ٹو کی حکم عدولی کا الزام اپنے سر لیے بغیر زخشی کو بچانے کا فیصلہ کر لیا تھا اور غالباً خود ہی اسے کوئی کمیں گاہ فراہم کر کے اس کے لاپتا ہونے کی کہانی اس چالاکی سے پھیلا رہا تھا کہ اس کی تلاش کی مصنوعی مہم میں اس نے ہر اس شخص سے رابطہ قائم کر لیا تھا جو پچھلی رات کسی بھی طرح زخشی سے مل چکا تھا۔

زخشی کے بارے میں میرے محتاط رویے پر وہ دل میں مجھ سے بدظن ضرور رہا ہوگا لیکن ایک تنظیم سے وابستگی کی بنا پر وہ کھُل کر مجھ سے مخالفت مول نہیں لے سکتا تھا کیوں کہ زخشی کے معاملے میں اے۔ ٹو کی ہدایت نے مجھے تحفظ فراہم کر دیا تھا لیکن میں اس وقتی کامیابی پر فی الحال مطمئن نہیں تھا۔ قاسم میرے لیے دوست کے روپ میں چالاک دشمن کی حیثیت اختیار کر گیا تھا اور وہ اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے مجھ پر بے خبری میں کوئی مہلک وار بھی کر سکتا تھا۔

معاملہ اگر دوبدو تصادم کا ہوتا تو شاید مجھے اپنی فکر لاحق نہ ہوتی ایسی صورت میں طاقت اور ذہنی صلاحیتوں کے استعمال سے ہر خطرے کا تدارک کیا جا سکتا تھا لیکن موجودہ حالات میں صرف محتاط روی ہی کام آ سکتی تھی کیوں کہ میرے پاس اس کے خلاف کوئی واضح ثبوت نہیں تھا۔ الیکٹرانکس اور دوسرے جدید حربوں کے بارے میں قاسم کی مہارت کا مظاہرہ میں جیوا ہاؤز کے تین نمبر کمرے میں ایم ٹی تھی ہینڈ رڈ کی منتقلی وغیرہ کے موقع پر دیکھ ہی چکا تھا۔ اس کے لیے فلوسین سے کیمرے اور ٹیپ ریکارڈر کے بجائے کوئی ہتھیار منسلک کرنا بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

ہاں اگر مجھے کسی طرح یہ ثبوت مل جاتا کہ زخشی واقعی اسی کی تحویل میں ہے تو نہ صرف میں خود براہِ راست قاسم کی گوشمالی کر سکتا ...اے۔ ٹو کو صحیح صورتِ حال سے آگاہ کر کے قاسم کے خلاف ...محاذ تیار کر سکتا تھا اور اس کا تمام تر انحصار سلطان شاہ کی ...ی پر تھا۔

میں اسی ادھیڑبُن میں مبتلا تھا کہ فون کی گھنٹی نے مجھے چونکا ...ریسیور اٹھانے پر آپریٹر نے مجھے کسی عورت کی کال کی اطلاع دے ...حیران کر دیا۔ اس نے لائن ملائی تو اپنی ہیلو کے جواب میں میں ...شی کی آواز فوراً پہچان لی۔

"تم نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔" اس کا لہجہ بے حد تلخ تھا۔ ...ے بس اندازے کی غلطی ہوئی کہ تمھاری مکاری نہ سمجھ سکی۔ تم ...ا باپ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ البتہ میں تمھاری زندگی تلخ کر ...گی۔"

"اچھا نہیں تو کچھ ایسا بُرا بھی نہیں کیا۔" میں نے کہا۔ "بگاڑنا چاہتا ...قابل بھی نہ چھوڑتا کہ تم اپنی ٹانگوں پر چل کر ہوٹل سے جا سکو۔ ...باپ کو مرے ہوئے مدّت گزر چکی ہے۔ وہ تمھیں کیوں یاد ...ہے؟"

"مجھے معلوم ہے کہ تمھاری حیثیت چڑی کے غلام سے زیادہ نہیں ...اس کی آواز تحقیر آمیز ہو گئی۔ "تم جس کے اشاروں پر ناچتے ہو، ...ہی بتا دینا کہ میری پشت پر مضبوط لوگ ہیں . . .

"بڑے بد ذوق لوگ ہیں۔" میں نے اس کی بات کاٹ کر ...لی کے ساتھ قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "لیکن میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ ...ہاتھ کیوں ہوئی ہو؟"

"تم احمق ہو، اس لیے مجھے چابی سمیت بے ہوش چھوڑ گئے ...تمھارا آقا اس بات کو درگزر نہ کر سکے گا کہ اس کے کسی آدمی کی مخبری کا اعتراف ...والی آزادی سے زندہ رہ سکے . . . اب تم مجھ سے ہوشیار رہنا۔"

"پیشگی انتباہ کا شکریہ۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "لیکن میں ...ضرور بتانا چاہوں گا کہ میں نے اپنی پوری زندگی میں کبھی کسی عورت ...پر نہیں اٹھایا ہے۔"

"اب عورت ہی تم پر ہاتھ اٹھائے گی۔" اس کے ساتھ ہی ...طرف سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا اور لائن بے جان ہو گئی۔

زخشی کا یوں فون پر دھمکیاں دینا میرے اندیشوں کی تائید ...تھا۔ اگر وہ قاسم کو اعتماد میں لیے بغیر روپوش ہوتی تو اس قلیل سی ...میں کسی کی پشت پناہی حاصل ہونا ناممکن تھا اور اسے خوف ...عالم میں خاموشی کے ساتھ اپنی کمیں گاہ میں روپوش رہنا چاہیے ...اس طرح کچھ عرصے بعد اس کا نام بھی ذہن سے محو ہو سکتا تھا

لیکن وہ مجرموں کے سے پیشہ ورانہ انداز میں مجھے للکار بیٹھی تھی۔ ہر قسم کی دھمکیاں دینے کے باوجود اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ خود بھی میرے اوپر والوں کے تابع تھی اور اس نے سزا کے خوف میں روپوشی کے ساتھ بغاوت کی راہ اختیار کی تھی۔

اسے مجھ سے بدلہ لینا ہی تھا تو مجھے ہوشیار کیے بغیر بے خبری میں کوئی بھی وار کر سکتی تھی۔ اس کے فون کرنے کا مقصد کچھ اور ہی معلوم ہوتا تھا اور اس منصوبے کے پسِ پشت لازماً قاسم کا ذہن کارفرما تھا۔

اس نے زخشی کو روپوش ظاہر کرنے کی ہر ممکن کوشش کر ڈالی تھی لیکن وہ میرے لہو کا پیاسا ہو گیا تھا۔ مجھ پر کوئی وار کرنے سے پہلے اس نے مجھے زخشی سے دھمکیاں دلوائی تھیں۔ اسے امید رہی ہوگی کہ یہ خبر میرے ذریعے اے۔ ٹو تک پہنچ جائے گی۔ پھر جب قاسم مجھ پر حملہ آور ہوتا تو اپنی ذات کو ہر شبہ سے بالاتر رکھتے ہوئے اس کارروائی کو زخشی کے حامیوں سے منسوب کر کے اے۔ ٹو کی جوابدہی سے صاف بچ جاتا۔

اگر میرا یہ قیاس درست تھا تو وہ رات میرے لیے محفوظ تھی۔ قاسم مجھے اتنا وقت ضرور دیتا کہ میں رات کے ایک سے تین بجے کے درمیانی وقفے میں اے۔ ٹو کو فون پر زخشی کی دھمکیوں کی اطلاع دے سکوں۔ اس دوران میں مجھے خوفزدہ کرنے اور زخشی کی دھمکی میں زور پیدا کرنے کے لیے کوئی چھوٹی موٹی کارروائی کی جا سکتی تھی جس میں شاید میرے لیے زیادہ خطرہ نہ ہوتا۔ ہاں اگلی صبح سے اس محاذ پر بھرپور کارروائی کا آغاز ہو سکتا تھا۔

میرے خیالات کا تسلسل زیادہ دیر تک برقرار نہ رہ سکا۔ دستک کے جواب میں میں نے دروازہ کھولا تو حامد حسبِ وعدہ تین نوجوان اور خوش پوش لڑکوں کے ساتھ موجود تھا۔ میں راستہ چھوڑ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ میری نگاہیں ناقدانہ انداز میں ان تینوں کی ایک ایک حرکت کا جائزہ لے رہی تھیں۔

اس وقت پہلی بار مجھے اپنی ایک غلطی کا احساس ہوا یا شاید قاسم کے پیدا کردہ خطرات کے باعث میں زیادہ حساس ہو گیا تھا کہ ان تینوں کو ایک ساتھ طلب کرنا مناسب نہیں تھا۔ وہ لاکھ قابلِ اعتماد ہوں لیکن تھے ناتجربہ کار نوجوان ہی۔ اگر ان میں سے کوئی ایک پکڑا جاتا تو تشدّد کے نتیجے میں دوسروں کی نشاندہی بھی کر سکتا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ انتخاب کے بعد ان میں سے کسی کو دوسروں کے پروگرام سے واقف نہ ہونے دوں گا۔

ان میں سے دو یونیورسٹی کے طالب علم تھے۔ تیسرا شہر کے ایک کالج میں زیرِ تعلیم تھا۔ وہ تینوں ہی حامد کے قابلِ اعتماد دوست تھے اور ہر قیمت پر دنیا دیکھنے کے متمنی تھے۔ ان میں سے ایک ایسا

تھا جو اچھے نمبروں کے باوجود میڈیکل کالج میں داخلہ لینے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا اور اب مجبوراً آرٹس کر رہا تھا۔ اس کی دلی تمنا تھی کہ کسی طرح برطانیہ یا یورپ پہنچ کر کسی طبی درس گاہ میں داخلے کی کوشش کر سکے کیوں کہ خط و کتابت کی طوالت میں اسے مایوسی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آیا تھا البتہ یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ ذاتی طور پر بھاگ دوڑ کر کے کہیں نہ کہیں کامیابی ہو سکتی ہے۔

دوسرا لاابالی مزاج کا مالک نظر آتا تھا اور ہمیشہ زندگی کے ہلکے پھلکے رخ پر نگاہ رکھنے کا عادی معلوم ہوتا تھا۔ تیسرے کی طبیعت میں ادبا غتی کا عنصر نمایاں تھا۔ شاید وہ مغربی ممالک کی نام نہاد آزادیوں کے قصے سن سن کر ان سے لطف اندوز ہونے پر تلا ہوا تھا لیکن ان سے گفتگو کے بعد میں حامد کے انتخاب کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا... انسانوں کی پرکھ کے بارے میں میرے تجربات کی روشنی میں ان تینوں میں ایک عنصر مشترک تھا۔ ان سے آسانی کے ساتھ کوئی راز اگلوانا تقریباً ناممکن ہی نظر آتا تھا۔ ہاں تشدد کے سامنے جسمانی مزاحمت جواب دے جاتی تو اور بات تھی۔

چائے وغیرہ پلانے کے بعد میں نے ان تینوں کو رخصت کر دیا۔ اس رسمی تعارف کے بعد میں بقیہ معاملات ہر ایک سے مختلف اوقات میں الگ الگ طے کرنا چاہتا تھا۔

”تم نے تو کوئی بات نہیں کی ان سے؟“ تخلیہ ہوتے ہی حامد برہم ہو کر بولا اور میں اس کی جرأت مندی پر ہنس دیا۔

”بات الگ الگ ہو گی تاکہ ایک کو دوسرے کے پروگرام کا علم نہ ہو۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”ویسے تینوں ہی لڑکے کارآمد ہیں۔ اس طرح مجھے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ وہ ایک دوسرے کو کس حد تک اعتماد میں لیتے ہیں۔“

”اس کا تو مطلب یہ ہوا کہ تم مجھے بھی نہ گھسیٹو گے۔“ وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں کہہ چکا ہوں کہ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے نہ مجھے لالچ ہے، میں جو کچھ کر رہا ہوں، میرے لیے وہی کافی ہے۔“

”اب تم ان تینوں میں سے ہر ایک سے الگ الگ ملو گے اور اسے بتاؤ گے کہ صرف اسی کا انتخاب ہوا ہے، باقی دو مسترد کر دیے گئے ہیں لہٰذا وہ فوری طور پر اپنا پاسپورٹ بنوانے کے لیے تصاویر تمہیں دے دے۔ ان تینوں کی تصاویر تم مجھے پہنچا دو گے بلکہ پاسپورٹ کے فارم بھی مکمل کروا لینا۔ ان کی فوٹو اسٹیٹ کی صورت میں کوائف میرے پاس محفوظ رہیں گے۔“

”تو وہی کیوں نہ اپنے پاسپورٹ بنوالیں؟ فارم کی نقلیں میں تمہیں لا دوں گا۔“

”کسی دفتر میں ان کا ایک دوسرے سے سامنا ہو سکتا ہے۔ یہ کام میں خود کراؤں گا۔“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”تم دو تین روز میں ان سے فارم مکمل کرا لو۔ موقع ملتے ہی میں خود تم سے رابطہ قائم کر لوں گا۔“

اس کے لبوں پر تیکھا سا تبسم تیر گیا۔ ”یہ بہت اچھی بات ہے کہ اب تک تم نے اپنے ٹھکانے کے بارے میں مجھے کچھ نہیں بتایا۔ اس طرح مجھ پر کسی ذمے داری کا بار نہیں ہے۔“

”ٹھکانا۔“ میں نے جلدی سے بات بناتے ہوئے کہا۔ ”میں نے تمہیں بتایا تو تھا کہ دوسرے شہر سے آیا ہوں۔ یہاں میں اسی ہوٹل میں ٹھہرتا ہوں۔ آج رات ضروری کام سے باہر جا رہا ہوں۔ واپسی ایک دو روز میں بھی ہو سکتی ہے اور ہفتہ بھی لگ سکتا ہے۔ اسی لیے میں نے خود رابطہ قائم کرنے کی بات کی تھی ورنہ مجھے تم پر پورا اعتماد ہے۔“

یہ کہتے ہوئے میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا ہی تھا کہ حامد نے مجھے روک دیا۔ وہ ان تینوں کی روانگی کا پروگرام طے ہونے کے بعد ہی رقم لینے کا ارادہ رکھتا تھا۔

اس کے چلے جانے کے بعد میں نے پچھلی رات کی بچی کھچی بوتل پُرسکون انداز میں اپنے معدے میں منتقل کی اور پھر کمرے کا الوداعی جائزہ لے کر باہر نکل آیا۔ کاؤنٹر پر حساب کتاب صاف کر کے تھوڑی دیر بعد میں باہر نکلا تو فضا پر خاصا دھندلکا پھیل چکا تھا اور کھمبوں پر لگے ہوئے اسٹریٹ لیمپس روشن ہو چکے تھے۔ میں نے رسٹ واچ کا جائزہ لیا تو آٹھ بجنے میں خاصی دیر باقی تھی۔ میں... اطمینان سے گھر پہنچ کر سلطان شاہ کے پیغام کا انتظار کر سکتا تھا۔

انڈس ہوٹل شہر کے اس قدیم کاروباری علاقے میں واقع تھا، جہاں زمین کا ہر انچ سونے کا مول رکھتا تھا لہٰذا عمدہ عمارت کے باوجود وہ ہوٹل پارکنگ کی سہولت کے معاملے میں بالکل ہی یتیم تھا۔ میں مختصر سے پورچ سے نکل کر فٹ پاتھ پر آیا اور اس گلی کی طرف چل دیا جہاں میں نے اپنی کار چھوڑی تھی۔

کار کا دروازہ کھولتے ہوئے میں بہت چوکنا تھا۔ میرے ذہن میں یہ امکان موجود تھا کہ کہیں قاسم یا اس کے کسی حواری نے موقع پا کر کوئی کارگزاری نہ دکھا دی ہو۔ ہوٹل میں رخشی کی کال سے یہ ظاہر ہو چکا تھا کہ وہ لوگ اس وقت میری انڈس ہوٹل میں موجودگی سے باخبر تھے اور ان کے لیے قرب و جوار میں تھوڑی سی تلاش کے بعد میری کار تک پہنچنا آسان تھا۔

دروازے کے کی ہول میں چابی گھماتے ہوئے مجھے کسی دھماکے کا خوف لاحق تھا لیکن جب کچھ بھی نہ ہوا تو اپنی ذہنی کیفیت پر مجھے خود ہی غصہ آنے لگا۔ سی ون یا قاسم لاکھ ذہین اور تکنیکی آدمی سہی لیکن میری ہی طرح ایک انسان تھا۔ اپنے ذہن پر اس کی ماہرانہ برتری کا خوف مسلط کر کے میں ناقابلِ تصور تباہی سے دوچار ہو سکتا تھا۔ میں نے سر جھٹک کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور اگنیشن آن کر کے انجن اسٹارٹ کیا اور تیزی کے ساتھ

سے روانہ ہو گیا۔

میں کسی بھی واقعہ سے دوچار ہوئے بغیر بحفاظت گھر پہنچ گیا تو رخشی اور قاسم کی حکمتِ عملی کے بارے میں اپنا پہلا خیال درست نظر آنے لگا۔ فون پر رخشی کی دھمکیوں کے بعد قاسم مجھے اتنی مہلت دینا چاہتا تھا کہ میں فون پر اسے... ٹوکو اپنے خطرے سے آگاہ کر سکوں۔ اگر میں قاسم ... کے بارے میں کچھ کہے بغیر اسے... ٹوکو رخشی کے بارے میں آگاہ کرتا تو وہ اس حوالے سے سی ون یعنی قاسم کو معاملہ صاف کرنے کی ہدایت کرتا۔ وہ رخشی کی روپوشی کے عذر کے ساتھ ہدایت کی تعمیل کا وعدہ کر لیتا اور اس طرح اسے میرے خلاف من مانی کارروائیوں کی کھلی چھوٹ مل جاتی۔ میرے ساتھ پیش آنے والی ہر واردات کو وہ بلا تکلف رخشی اور اس کے مفروضہ حمایتیوں سے منسوب کر دیتا۔

میرے لیے مشکل یہ تھی کہ قاسم تنظیم کے اہم اراکین میں شمار ہوتا تھا اور رخشی کے خلاف فیصلہ جاری ہونے تک پوری طرح تنظیم کا وفادار بھی تھا جس کی بنا پر وہ اسے... ٹوکے لیے قابلِ اعتماد تھا۔ اگر میں ٹھوس ثبوت کے بغیر اس کے خلاف زبان کھولتا تو لازمی طور پر ٹوکی ملامت کا نشانہ بن جاتا۔ وہ لوگ جو خطرے کا ذرا بھی امکان دیکھتے ہی اپنے اہم ترین کارندوں کو بے دریغ راستے سے ہٹانے پر تل جاتے تھے، اس بات کو کبھی برداشت نہ کرتے کہ ان کا کوئی آدمی صرف ذہنی قلابازیوں کی بنیاد پر کسی دوسرے پرانے کارکن کو اپنی تنقید کا نشانہ بنائے۔ سی ون کے مقابلے میں میری سرخروئی سلطان شاہ کی کارگزاری سے وابستہ تھی۔ اگر وہ رخشی کے بارے میں سراغ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو قاسم کے خلاف سخت ترین قدم بھی اٹھا سکتا تھا۔ گو اسے... ٹو نے اس بارے میں مجھے کوئی اختیار نہیں دیا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ ہنگامی حالت کے تحت کی گئی میری کارروائی پر وہ ضرور صاد کر دے گا۔

گھر میں گھستے ہی خانساماں نے تشویش زدہ صورت بنا کر مجھے چند منٹ قبل کسی عورت کے فون کی اطلاع دی تو میں چونک پڑا۔

”کون تھی؟ کیا کہہ رہی تھی وہ؟“ میں نے اس سے ایک ہی سانس میں دو سوال کر ڈالے۔

”صاحب! وہ خود کو آپ کی سوتیلی ماں کہہ رہی تھی۔“ خانساماں نے جھجکتے ہوئے کہا اور میرے وجود میں سنسنی کی ایک عجیب سی لہر سرایت کر گئی۔ آخر کار بڑی ماں کو اپنے اکلوتے سوتیلے بیٹے کا خیال آ ہی گیا تھا۔ میرے لیے یہ بات حیران کن تھی کہ برسوں پہلے اپنی چوکھٹ سے نفرت و حقارت کے ساتھ دھتکارنے کے بعد اب اچانک انہیں کیسے معلوم ہو گیا تھا کہ میں کراچی میں ہوں۔ یہی نہیں بلکہ اس قدامت پرست عورت نے میرے فون نمبر کا بھی سراغ لگا لیا تھا۔ لحظہ بھر میں میرے ذہن کے پردے پر لاتعداد تصویریں اور مناظر گزرتے چلے گئے۔ ”آپ کو پیار کہا ہے انہوں نے۔“ خانساماں نے اپنی بات پوری کر ڈالی اور میرے دل پر بوجھل پن طاری ہونے لگا۔ انسان طاقت اور اختیار کے نشے میں جو چاہے سو کر لے لیکن وقت بہت ظالم ہوتا ہے اور کبھی نہ کبھی انسان کے ضمیر کو کچوکے دے کر اپنے احتساب پر مجبور کر ہی دیتا ہے۔

”پتا لیا تھا تم نے ان کا؟“ میں نے پُرجوش لہجے میں خانساماں سے سوال کیا۔

اس کے چہرے پر تذبذب کے آثار ابھر آئے۔ کچھ کہنے کے لیے ہونٹ کھلے اور پھر بند ہو گئے۔ ”کیا بات ہے؟ چپ کیوں ہو گئے ہو؟“ میں نے حیرت سے کہا۔ ”کیا پتا معلوم کرنا بھول گئے ہو؟“

”وہ... وہ جی، بس کیا بتاؤں، پہلے اس نے بدتمیزی سے آپ کے بارے میں پوچھا تھا۔“ وہ نظریں جھکا کر جھجکتے ہوئے کہنے لگا۔ ”آواز سے کوئی نوجوان عورت معلوم ہو رہی تھی۔ پہلے کبھی ایسا فون نہیں آیا... میں نے نام پوچھا تو اس نے خود کو آپ کی ماں بتایا... جی میں پریشان ہو گیا۔ میں نے اس سے کہا کہ آواز تو جوانوں جیسی ہے، صاحب کی والدہ تو عمر رسیدہ ہوں گی۔ اس پر وہ ہنس پڑی اور کہا کہ وہ آپ کی سوتیلی ماں ہے۔ آپ کی غیر موجودگی کی اطلاع پر اس نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا کہ آپ آئیں تو آپ کو اس کی طرف سے پیار کہہ دوں۔“

میرا خون کھول اٹھا۔ وہ حرکت یقینی طور پر رخشی ہی کی ہو سکتی تھی، اپنے اضطراری ردِعمل پر میں خانساماں کے سامنے خفت محسوس کر رہا تھا۔ اس نے کہنے کو تو سب کچھ کہہ دیا تھا مگر میری کیفیت سے بے خبر مجرمانہ انداز میں بدستور نظریں جھکائے کھڑا تھا جیسے اپنے گستاخانہ قیاسات پر میری طرف سے سخت سست سننے کا منتظر ہو۔

خانساماں نے پوری بات بتا دی تھی لہٰذا میں اس سے ایک لفظ بھی کہے بغیر غصیلے انداز میں اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ رخشی غصے کی شکل میں رفتہ رفتہ میرے اعصاب پر سوار ہوتی جا رہی تھی۔

اسے انڈس ہوٹل تو خیر میں اپنے ساتھ ہی لے گیا تھا لیکن اس کے لیے اتنی جلدی میرے گھر کا پتا لگانا ناممکن تھا۔ میرے گھر کا نمبر اسے یقیناً قاسم ہی سے ملا ہو گا۔ اس کے ہر اقدام سے میرا یہ یقین تقویت اختیار کرتا جا رہا تھا کہ اس نے قاسم سے ساز باز کر لی تھی اور ان دونوں کا اتحاد میرے لیے خطرناک تھا۔

میں نے ڈرائنگ روم والے فون کا تار نکال دیا اور خواب گاہ میں ایک آرام کرسی پر نیم دراز ہو کر ایک رسالے کی ورق گردانی کرنے لگا کیونکہ مجھے کسی بھی لمحے سلطان شاہ کی فون کال آنے کی توقع تھی لیکن وقت دھیمے دھیمے سرکتا رہا۔ رسٹ واچ کی سوئیوں کا سفر جاری رہا۔ آٹھ کے بعد سوا آٹھ بھی بج گئے لیکن فون بدستور بے جان رہا تو میرے ذہن پر تشویش سوار ہونے لگی۔ رسالہ میری گود میں پھیلا ہوا تھا لیکن میرے لیے سطروں پر نظریں جمائے رکھنا دشوار ہونے لگا تھا۔ آخر میں نے اکتائے ہوئے انداز میں رسالہ ایک طرف ڈال دیا اور سگریٹ سلگا کر بے تابی

سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔

اچانک فون کی گھنٹی بجی تو میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔ ریسیور کان سے لگاتے ہی رخشی کی آواز ابھری تھی۔

"کیا بات ہے؟" اس کی آواز پہچان کر میں نے خشک لہجے میں کہا۔

"میرا پیغام تو مل ہی گیا ہوگا؟" وہ ہنس پڑی۔ "اب میں تمہارے پیچھے لگ گئی ہوں۔"

"تم چھچھوری حرکتوں پر اتر آئی ہو۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "میرا پیچھا نہ چھوڑا تو پچھتانے کا موقع بھی نہ مل سکے گا۔"

"میں نے تمہیں صرف یہی جتلانے کے لیے فون کیا ہے کہ اس وقت تم میرے سامنے کتنے بے بس ہو۔" اس کے لہجے میں شوخی بدستور جاری رہی۔ "میں چاہتی تو تم اس وقت اسپتال میں زخمی یا مردہ حالت میں پڑے ہوتے۔"

میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی لیکن میں نے مضحکہ اڑانے والے لہجے میں سوال کیا۔ "پھر میں صحیح سلامت کیوں ہوں؟"

"تمہاری بے بسی سے لطف اندوز ہونا چاہتی ہوں۔" اس کی آواز آئی۔ "یقین نہ ہو تو اپنی کار کی ڈکی کھول کر دیکھ لو۔ اس میں ایک چھوٹا سا ٹائم بم رکھا ہوا ہے جو ٹھیک نو بج کر بیس منٹ پر پھٹ جائے گا۔ میں چاہتی تو اسے اگنیشن سے بھی منسلک کیا جاسکتا تھا۔ تم کار میں بیٹھ کر جیسے ہی اگنیشن میں چابی گھماتے کار کے چیتھڑے اڑ سکتے تھے۔"

"اطلاع کا شکریہ۔" میں نے اپنی تشویش پر قابو پاتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "اس حرکت کا کوئی مقصد بھی رہا ہوگا۔ بہتر ہے کہ اب وہ مقصد بھی بتادو۔"

"وقت آنے پر وہ بھی معلوم ہوجائے گا۔" اس کا لہجہ سرسری تھا۔ "فی الحال اس ٹائم بم کو کسی ویرانے میں ٹھکانے لگانے کا بندوبست کرو۔ یہ یاد رکھنا کہ ایک مرتبہ سیٹ کیے جانے کے بعد اب اسے کسی طرح بھی ناکارہ نہیں بنایا جاسکے گا۔ وہ مقررہ وقت پر ایک دھماکے کے ساتھ پھٹ جائے گا۔"

اسی کے ساتھ اس نے سلسلہ منقطع کردیا۔ میں چند ثانیے ریسیور ہاتھ میں لیے خالی الذہنی کے عالم میں بے حس و حرکت کھڑا رہا پھر ریسیور کریڈل پر ڈال کر تیزی سے خواب گاہ سے نکل آیا۔

پورچ میں پہنچ کر میں نے ڈکی کھولی تو میری نگاہیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔ ڈکی کے وسط میں ایک ڈبے میں سیاہ رنگ کا ایک بیضوی خول رکھا ہوا تھا جس میں سے ٹک ٹک کی ہلکی سی آواز آرہی تھی۔ میں نے آہستگی اور احتیاط سے وہ ڈبہ اٹھالیا اور بم کا معائنہ کرنے لگا۔ رخشی نے جو کچھ کہا، درست ہی کہا تھا کیوں کہ بم کو حرکت میں لانے والا میکینزم اس آہنی خول کے اندر ہی پوشیدہ تھا۔ البتہ اس خول میں ایک جگہ سوراخ موجود تھا۔ ایسا معلوم ہورہا تھا کہ اندرونی میکینزم کو سیٹ کرنے کے لیے اس سوراخ کے اوپر کوئی آلہ نصب تھا جسے کام پورا ہونے کے بعد اکھاڑ دیا گیا تھا۔

میں نے بم کو احتیاط سے اگلی نشست پر رکھا اور فوری طور پر تیز رفتاری کے ساتھ یونیورسٹی روڈ کی طرف روانہ ہوگیا تاکہ ان اطراف میں پھیلے ہوئے کسی ویرانے میں اسے ٹھکانے لگا سکوں۔ اس وقت وہ بم میری نگاہوں میں سلطان شاہ کی فون کال سے زیادہ اہمیت اختیار کرگیا تھا۔

"وہ عورت اُسی مکان میں تھی۔" سلطان شاہ کی آواز میں ہلکا سا خوف نمایاں تھا۔ "شام کے چھ بجے وہ خطرناک صورت والے مرد کے ساتھ دو سوٹ کیس وغیرہ لے کر تاریک شیشوں والی سُرخ کرولا میں روانہ ہوئی تھی۔ میں نے ان دونوں کو دیکھتے ہی پہچان لیا تھا، ایسا معلوم ہورہا تھا جیسے وہ کسی لمبے سفر پر روانہ ہورہے ہوں۔ مجھے خوش قسمتی سے ایک پٹھان ٹیکسی ڈرائیور مل گیا۔ ہم زبان ہونے کی وجہ سے اُس نے فوراً ہی میری کہانی پر یقین کرلیا۔ اُس کے تعاون کی وجہ سے میں کامیابی کے ساتھ اُن کا تعاقب کرسکا۔ خطرناک صورت والے نے دونوں سوٹ کیسوں سمیت عورت کو گلشنِ اقبال کے ایک بنگلے پر اتارا اور پھر فوراً ہی وہاں سے چل دیا تھا۔ انڈس ہوٹل کے قریب کی ایک گلی میں اُس نے تمہارے جیسی کار کی ڈکی کھول کر اس میں کوئی چیز رکھی، پھر ڈکی بند کرکے وہاں سے روانہ ہوگیا۔ میں نے سہراب گوٹھ تک اس کا پیچھا کیا لیکن وہ کہیں رُکتا نظر نہیں آیا۔ شاید وہ شہر سے باہر گیا ہے۔ میں وہاں سے واپس لوٹ کر گلشنِ اقبال والے مکان پر گیا لیکن پھر اندر جانے کا ارادہ ترک کرکے قرب و جوار سے معلومات حاصل کرکے ابھی ابھی فارغ ہوا ہوں۔ اسی وجہ سے مجھے رپورٹ دینے میں تاخیر ہوگئی۔"

اس کی کامیابی کی اطلاع میرے لیے کسی بڑی خوش خبری سے کم نہیں تھی۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ اُس کا فون آنے تک میں اپنی کار کی ڈکی سے برآمد ہونے والے بم کو ایک ایسے ویرانے میں ڈال کر لوٹ آیا تھا جہاں اس کے دھماکے سے کسی جانی یا مالی نقصان کا کوئی اندیشہ نہیں تھا۔ اعصاب پر سے بم کا خوف دور ہوتے ہی راستے میں مجھے یہ فکر لاحق ہوگئی تھی کہ کہیں سلطان شاہ میری عدم موجودگی کی خبر پاکر اپنے گھر واپس نہ لوٹ جائے اور پھر اُس سے رپورٹ لینے کے لیے مجھے پٹھان کالونی کی طرف دوڑ لگانا پڑے۔

وہ شخص میری توقع سے بڑھ کر چالاک ثابت ہوا تھا ورنہ قاسم جیسے چالاک آدمی کو شبہے کا موقع دیے بغیر کامیابی سے اس کا تعاقب کرنا آسان کام نہیں تھا۔ اس نے نہ صرف رخشی کا ٹھکانا دیکھ لیا تھا بلکہ میری کار کی ڈکی سے برآمد ہونے والے ٹائم بم کا معمہ بھی حل کردیا تھا۔ اب یہ بات بالکل واضح ہوگئی تھی کہ قاسم نے خود رخشی کو چھپایا تھا اور اپنی دوست کے زیرِ عتاب آنے کا انتقام لینے کے لیے میرے پیچھے لگ گیا تھا۔

"گلشنِ اقبال میں ریلوے لائن سے آگے بائیں طرف کی نئی آبادی میں وہ سبز مکان تو نہیں تھا؟" میں نے اپنی ذولا کے حوالے سے متعارف ہونے والی پروین نامی کال گرل کے مکان کے بارے میں سوچتے ہوئے سوال کیا۔

"نہیں، وہ مکان راشد منہاس روڈ پر داہنی طرف واقع ہے، سفید رنگ کا ایک منزلہ مکان ہے۔ اس کا پھاٹک مقفل تھا اور چابی عورت کے پاس موجود تھی۔" اس نے جواب دیا۔

"اس مکان میں ٹیلی فون کے تار تو جاتے نظر نہیں آئے تھے؟" میں نے موہوم سی اُمید پر سوال کیا کیوں کہ کسی اناڑی کے لیے ایسی جزئیات پر توجہ دینا بہت مشکل تھا لیکن میں صرف یہ اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ آٹھ بجے کے قریب ڈکی میں ٹائم بم کی موجودگی کی اطلاع دینے کے لیے رخشی نے کہاں سے فون کیا تھا۔

"دوبارہ میں یہی سب دیکھنے گیا تھا۔" سلطان شاہ کے جواب نے مجھے حیران کردیا۔ "اس گھر میں ٹیلی فون کی لائن گئی ہوئی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے مکان کا نمبر بھی بتا ڈالا اور میں سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ سلطان شاہ ایسے کاموں میں اتنا اناڑی نہیں تھا جتنا اپنے طور طریقے سے نظر آتا تھا۔

"اس مکان کے بارے میں اور کیا معلوم کیا تم نے؟" میں نے ...میں سوال کیا۔

"وہ سال ڈیڑھ سال پہلے ہی مکمل ہوا ہے۔ اس کا مالک وڈیرا ہے جو شروع میں چھ سات مہینے تک بال بچوں کے ساتھ یہاں رہا تھا لیکن بچوں کو آب و ہوا راس نہ آنے کی وجہ سے ...چلا گیا۔ جب سے وہ مکان زیادہ تر مقفل رہتا ہے۔ ...کبھار کچھ دنوں کے لیے وڈیرے کے دوست اور مہمان ...ہیں۔ ہمیشہ انھیں لانے والا وہی خطرناک صورت آدمی ہوتا ...جس کا میں نے سہراب گوٹھ تک پیچھا کیا تھا۔ لوگوں کا ...ہے کہ وہ وڈیرے کا مقامی منیجر یا منشی ہے۔ بہت بدزبان ...اور آدمی ہے۔ ایک بار کسی محلے دار نے مکان کو مستقل آباد ...کے سلسلے میں اس سے بات کرنا چاہی تھی تو اس نے صاف ...کہہ دیا تھا کہ مکان کرائے پر وہ دیتے ہیں جن کو روٹیوں کے لالے ...پڑے ہوں، وہ دس بیس مکان اور خریدنے کی استطاعت ...رکھتے ہیں۔"

"گڈ۔" میں نے تحسین آمیز لہجے میں کہا۔ "تم میری توقع سے کہیں زیادہ کارآمد ثابت ہوئے ہو۔ اب یہ بتاؤ کہ اگر گھر لوٹنے میں دیر ہوئی تو کوئی ہرج تو نہیں ہوگا؟"

"ہفتے بھر بھی گھر نہ گیا تو کسی کو پریشانی نہیں ہوگی۔" اُس نے فراخ دلانہ لہجے میں کہا۔ "بس تم کام بتاؤ مجھے۔"

"تمہیں یقین ہے کہ خطرناک صورت والا شہر سے باہر ہی گیا ہے؟"

"یقین کیا، بس اندازہ ہے۔" اس کی آواز اُبھری۔ "سپر ہائی وے پر اور کہاں جائے گا وہ؟"

اس کی بات معقول تھی۔ ان دنوں سپر ہائی وے پر پُل عبور کرنے کے بعد باڑہ کی طرز کا بازار تھا یا پھر خاردار تاروں کی باڑھ میں گھرے ہوئے وسیع قطعاتِ آراضی جہاں مستقبل میں رہائشی عمارتوں کی تعمیر کے منصوبے بن رہے تھے۔

"بہت احتیاط سے اس کے گھر کا جائزہ لے ڈالو اور پھر میرے پاس لوٹ آؤ۔" میں نے لحظہ بھر توقف کے بعد کہا۔

"لیکن کہاں؟"

میں نے اُسے اپنے گھر کے نمبر کے ساتھ ہی تفصیل کے ساتھ محلِ وقوع بھی بتا ڈالا۔ "لیکن یہ یاد رکھنا کہ احتیاط بہت ضروری ہے۔ اس کا گھر تمہارے لیے چوہے دان بھی ثابت ہوسکتا ہے۔ چہرے پر رومال وغیرہ باندھ لینا تاکہ کوئی دیکھ بھی لے تو دوبارہ تمہیں شناخت نہ کرسکے۔" میں نے جیوا ہاؤز کے مین نمبر میں فوٹو سیل سے منسلک خودکار کیمرے کا تصور کرتے ہوئے کہا۔

اس کی ہنسی کی آواز اُبھری۔ "تم فکر نہ کرو۔ تمہارے شہر میں پہلے بیس پچیس دن مجھے چوریاں کرکے بھی پیٹ بھرنا پڑا ہے۔ اس کے بعد ہی مقرب خان نے کام سے لگوایا تھا۔"

سلسلہ منقطع کرکے میں سوچ میں پڑ گیا۔ رخشی یا اے۔ لوٹ۔ ان دونوں میں سے کون میرے لیے زیادہ اہم تھا؟

تنظیم کے سلسلے میں میں اپنے لیے ایک راستہ طے کرچکا تھا۔ میرے سامنے اصل مشن تنظیم کے سب سے بڑے شخص تک پہنچنا تھا اور اس وقت تک اوپر سے ملنے والے ہر حکم کی تعمیل کرنا تھی لیکن رخشی کی وجہ سے قاسم زبردستی میرے آڑے آرہا تھا۔ اس معاملے میں بنیادی غلطی بی۔ ون سے ہوئی تھی۔ اگر وہ مجھے براہِ راست رخشی کو مددگار کے طور پر ساتھ رکھنے کا حکم دیتا تو میرے لیے اس سے انکار ممکن نہیں تھا مگر بی۔ ون کو شاید رخشی کی صلاحیتوں پر ضرورت سے زیادہ اعتماد تھا اور وہ یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ میں بھی سکندر علی کی طرح اس کا شکار بن جاؤں گا۔ اب یہ میری یا رخشی کی بدقسمتی تھی کہ میں سکندر علی کے مکان میں اُسے دیکھ چکا تھا۔ پھر خود سکندر نے قتل سے

پہلے مجھے اس کے بارے میں بہت کچھ بتا دیا تھا۔ لہٰذا سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے میں رخشی کے دام میں پھنسنے کے لیے ذہنی طور پر آمادہ نہ ہو سکا۔ اس کے مسلط ہو جانے کے بعد میرے لیے تنظیم کے خلاف اپنے خفیہ مشن کو آگے بڑھانا دشوار ہو جاتا۔ میں نے نہ صرف رخشی کو اس کی اپنی نگاہوں میں بے نقاب کر دیا بلکہ اے۔ ڈ کو بھی اس کے بارے میں آگاہ کر دیا اور وہ حسبِ توقع یہ بات برداشت نہ کر سکا کہ رخشی نے کام پر مامور ہوتے ہوئے اعتدال سے زیادہ شراب پی کر بہکے ہوئے ذہن کے ساتھ اپنے پوشیدہ عزائم کا راز فاش کر دیا۔

رخشی خود روپوش تھی اور قاسم اپنی دوست کی ناکامی پر جھلا کر میرے پیچھے پڑ گیا تھا اس کی ذہنی کیفیت جو بھی رہی ہو، وہ میرے حق میں بہت خطرناک ثابت ہو رہا تھا۔ اس نے سلطان شاہ کے سامنے میری کار کی ڈکی میں ٹائم بم رکھ کر مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

اگر وہ مجھے مارنا چاہتا تو اُسے رخشی کے ذریعے مجھے ہوشیار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ٹائم بم کی دریافت سے پہلے تک میرا خیال یہ تھا کہ قاسم اس وقت تک خاموش رہے گا جب تک اُسے یہ یقین نہ ہو جائے کہ میں نے رخشی کی دھمکیوں کے بارے میں اے۔ ڈ کو اطلاع دے دی ہے۔ اس کے بعد وہ مجھ پر کہیں بھی وار کر سکتا تھا لیکن گاڑی میں بم رکھنے اور پھر خود ہی مطلع کرنے سے یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ فی الحال وہ مارنے کے بجائے اپنی قوت اور رسائی کا مظاہرہ کر کے مرعوب کرنا چاہ رہا تھا۔ پھر اچانک ہی میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ وہ واقعات جس تسلسل اور تیزی کے ساتھ رونما ہوئے تھے، ان کا منطقی تقاضا یہ تھا کہ میں پہلی فرصت میں اے۔ ڈ کو اپنی مشکلات سے آگاہ کروں۔ ان اطلاعات پر وہ میرے تحفظ کے بارے میں سی۔ ون ہی کا سہارا لیتا اور پھر قاسم کچھ وقت گزارنے کے بعد اے۔ ڈ کو مطلع کرتا کہ رخشی تنظیم سے ٹوٹ کر کسی اور گروہ سے جا ملی ہے اور میری ذات اُس کے آدمیوں کی نگاہ میں آ گئی ہے۔ قاسم کی یہ اطلاع تنظیم میں میری شمولیت برقرار رہنے کے سارے امکانات یکسر ختم کر دیتی اور اے۔ ڈ میرے بارے بلا تاخیر وہی روایتی حکم جاری کر دیتا جو اس سے پہلے میرے علم میں تھا۔ ایک طرف اے۔ ڈ کی طرف سے موت کا پروانہ اور دوسری طرف قاسم کی قوت سامنے ہوتی تو شاید اس نازک موڑ پر قاسم میرے سامنے آ جاتا۔ میں اس کی بالادستی تسلیم کر لیتا تو شاید وہ رخشی کی طرح مجھے بھی روپوش ہونے کا مشورہ دے کر اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتا اور اگر میں جھکنے سے انکار کر دیتا تو وہ بلا تامل اے۔ ڈ کے حکم کو عملی جامہ پہنانے پر تل جاتا۔

بظاہر اس تمام کھیل کا ایک ہی مقصد سمجھ میں آتا تھا کہ مقامی بازار میں ہیروئن کی غیر متوقع کھپت اور زبردست منافع دیکھ کر قاسم کی نیت خراب ہو گئی تھی۔ میرے ہٹ جانے سے ایک طرف تو تنظیم کے مقامی معاملات پر اس کی گرفت مضبوط ہو جاتی اور دوسری طرف وہ میرے تجربے اور تعلقات کو کام میں لا کر اپنے کاروبار کی داغ بیل ڈال دیتا۔ اگر میرے قیاسات درست تھے تو اپنا متوازی دھندا چلانے کا قاسم کا منصوبہ فوری نوعیت کا نہیں تھا۔ وہ نجانے کب سے یہ خواہش اپنے دل میں پال رہا ہو گا۔ یہ بس اتفاق ہی تھا کہ میرے ساتھ رخشی کا معاملہ بگڑنے سے اُسے اپنے خواب کو عملی جامہ پہنانے کا سنہرا موقع میسر آ گیا۔ رخشی نہ اُس کی دوست رہی ہو گی اور نہ ہی رازداں ہو گی بلکہ اتفاقی ضرورتوں کے تحت وہ دونوں ایک دوسرے سے متعارف ہوئے ہوں گے اور قاسم نے موقع ملتے ہی رخشی کے نام سے بھرپور فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کر لیا ہو گا۔

اپنی بدنیتی کو بروئے کار لانے کے لیے اس وقت قسمت بھی قاسم کا ساتھ دے رہی تھی۔ برسوں سے مستحکم بنیادوں پر چلتا ہوا کام اچانک ہی حادثات کی زد میں آ گیا۔ پہلی کڑی سکندر علی نے اپنے عاجلانہ فیصلے سے فراہم کی تھی جب اُس نے مقرب خان کی نظروں میں آ جانے کی وجہ سے سی۔ ون یعنی قاسم کے ہاتھوں طارق کو بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتروا دیا۔ اس ضمن میں تسلسل کے ساتھ چار آدمی مارے گئے جن میں مقرب خان پہلا اور طارق آخری مقتول تھا اور یہ چاروں خون قاسم ہی کے کھاتے میں شامل تھے۔ طارق کے قتل کے جذباتی اثرات کے تحت میں نے اپنی توجہ سکندر علی پر مرکوز کر دی اور اُس کی غیر حاضری میں، رات کے سناٹے میں اس کے مکان میں جا گھسا۔ میری اس کارروائی کے نتیجے میں سکندر علی کو بی۔ فور کے منصب سے معزول کر دیا گیا اور پھر وہ سکندر فارمز میں میرے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ مقامی افراتفری کی یہ فضا دبنے نہ پائی تھی کہ مٹھا خان کی بدنصیبی اُسے للکار بیٹھی اور وہ ایم۔ ٹی تھری ہنڈرڈ کو نذرِ آتش کر کے خودکشی کرنے پر مجبور ہو گیا۔ کسی کو کانوں کان بھی علم نہیں ہو سکا تھا کہ مٹھا خان شہر میں ہیروئن کو تجارتی پیمانے پر متعارف کرانے والوں میں بی۔ ون کے اعلیٰ منصب پر فائز تھا لیکن اُس کی خودکشی نے تمام کڑیاں ہلا کر رکھ دی تھیں۔ تنظیم کی مواصلاتی باقاعدگی ابتری کا شکار ہو گئی تھی اور وقتی طور پر اُوپر والوں کے لیے میری اور قاسم کی ذات پر اعتماد کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ فی الحال قاسم میری جان لینے کے درپے

تھا۔ سلطان شاہ اُس کے خالی مکان کی تلاشی لینے گیا ہوا رخشی کی کمین گاہ میرے علم میں آ چکی تھی۔ لہٰذا اس معاملے کو روز کے لیے ملتوی کرنا ممکن نظر آ رہا تھا جب کہ اے۔ ڈ کا فوری توجہ کا متقاضی تھا۔ شہر میں میری ذمے داریوں کی ت ایسی تھی کہ عام حالات میں میرے لیے ایک دن کے لیے شہر چھوڑنا ناممکن تھا مگر اس وقت بی۔ ون کی خودکشی کے میں تمام سرگرمیاں یکلخت موقوف کر دی گئی تھیں۔ اگر میں یہ گنوا دیتا تو پھر قوتوں لاہور کا رُخ کرنے کی نوبت آتی نظر نہیں تھی۔ دوسری طرف اے۔ ڈ کے بارے میں لاہور پہنچے بغیر معلومات ل ہونا دشوار تھیں۔

میں نے فیصلہ کر لیا کہ فی الحال رخشی اور قاسم کو بھول کر ہی کا رُخ کیا جائے۔ اس سفر میں سلطان شاہ میرے قابلِ اعتماد سہارا ثابت ہو سکتا تھا لیکن ایک بات طے تھی رخشی کی دھمکیوں یا اپنی کار کی ڈکی میں پائے جانے والے بم کے بارے میں اے۔ ڈ کو ایک لفظ بھی نہیں بتانا تھا۔ اس کے نتیجے میں قاسم زیادہ کھل کر سامنے آنے پر مجبور ہو سکتا گلشن اقبال میں رخشی کی کمین گاہ کا پتا میرے پاس قاسم کے بہت مضبوط کارڈ تھا۔ میں جب بھی چاہتا، اے۔ ڈ پر حقیقت منکشف کر کے قاسم کو سلنے کے باضابطہ اختیارات ل کر سکتا تھا۔

شہر سے چند روز کے لیے روانہ ہونے سے قبل ضروری تھا مقامی سطح پر تنظیم کے کاموں کے بارے میں آخری رپورٹ حاصل کرتا۔ اس ضمن میں بی۔ فور کی حیثیت سے صرف جہانگیر سے رابطہ تھا، اس سے آگے بازار میں مال پھیلانا اور رقم وصول جہانگیر کی ذمے داری تھی۔ میں بی۔ ون کا آخری پیغام سننے کے بعد جہانگیر کو مخدوش حالات کے حوالے سے محتاط رہنے کی ہدایت کر چکا تھا لیکن اس بے چارے کو نہ بی۔ ون کے بارے میں معلوم تھا، نہ وہ ایم۔ ٹی۔ تھری ہنڈرڈ کے وجود سے باخبر میرا خیال تھا کہ اس لاعلمی کی وجہ سے جہانگیر نے اخبارات مٹھا خان کی خودکشی کی خبر سرسری انداز میں پڑھی ہو گی اور ذرا بھی اندازہ نہ ہو سکا تھا کہ اس وقت تنظیم کیسی کٹھن صورت حال سے دوچار تھی۔

جہانگیر سے اپارٹمنٹ پر رابطے کے لیے رات آٹھ سے سوا آٹھ بجے تک کا وقت مقرر تھا جب کہ اس وقت نو بھی بج چکے ملنا چاہتا تو بی۔ فور کی حیثیت سے اُسے فون کر کے اپارٹمنٹ نہ کرنے کا حکم دے سکتا تھا لیکن اس طرح اس کی بیوی، سلمیٰ لتی تھی اور میں سلمیٰ کی ہلکی سی باغیانہ روش کو پسند کرنے کے

باوجود ان دونوں کی ازدواجی زندگی میں کسی نئی تلخی کا اضافہ نہیں کرنا چاہتا تھا لہٰذا میں نے اس سے اپنے طور پر بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

دوسری طرف سے فون سلمیٰ نے ریسیو کیا تھا ”کہاں غائب ہیں آپ؟“ وہ میری آواز پہچان کر دلآویز لہجے میں بولی ”آنکھیں ترس گئی ہیں آپ کو دیکھنے کو؟“

”بس چکروں میں پھنسا ہوا ہوں اپنے“ میں نے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔ ”جہانگیر کہاں ہے؟“

”لان پر کتوں کی سیوا کر رہے ہوں گے“ اس کے لہجے میں تلخی عود کر آئی۔ ”محافظ ہٹا دیے ہیں، چراغاں ختم ہو گیا ہے۔ اب ساری توجہ ان منحوس کتوں پر مرکوز ہے جن کی شکلیں دیکھ کر ہی مجھے دہشت ہونے لگتی ہے۔“

”ذرا بلا دیں گی اسے؟“ میں نے اس کے نجی مسائل پر گفتگو سے گریز کرتے ہوئے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

”آپ ہولڈ کریں“ اس کا لہجہ یک بیک غصیلا ہو گیا شاید اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ میں اس سے کترانے کی کوشش کر رہا تھا۔

چند منٹ بعد جہانگیر لائن پر آیا تو اس کی آواز خاصی جاندار تھی ”یار! کہاں غائب ہو تم؟“

”بس اسٹینڈ بائی ہوں“ میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ”دیکھنا ہے کہ کب اور کس محاذ پر جھونکا جاتا ہوں۔“

”کئی بار تم سے ملنے کا ارادہ کیا لیکن ہمت نہیں پڑی..... دن بھر کے کام سے تھک کر چور ہو جاتا ہوں“ کہتے کہتے اس نے تھوڑے سے توقف کے بعد ایک دم بات کا رخ بدل دیا۔

میرے لبوں پر معنی خیز تبسم ابھر آیا۔ ”شاید بھابی آ گئی ہیں جو تم نے ایک دم بات بدل دی۔“

ریسیور میں اس کی بے ڈھنگی سی ہنسی سنائی دی ”اوہ.... ہاں ہاں .... تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔ فرصت ہو تو چلے آؤ، تھوڑی دیر گپ شپ رہے گی۔“

”میری بھی ہمت نہیں پڑتی۔“ میں نے ذومعنی لہجے میں کہا۔ ”باخبر لوگ ہیں، اس میل جول کی بھنک بھی مل گئی تو حکم کی خلاف ورزی پر کوئی سزا سنا دی جائے گی، تم میں حوصلہ ہو تو چلے آؤ۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔“

”تم نے میرے دل کی بات کہی ہے“ اس نے مبہم الفاظ میں اپنا ما فی الضمیر بیان کر دیا ”دال روٹی کے چکر نے ہمیں کسی مصرف کا نہیں رکھا، بس وقت کے غلام ہو کر رہ گئے ہیں۔“ پھر اس کا لہجہ اچانک رازدارانہ ہو گیا۔ ”چلی گئی۔ تم ملنے کی کوئی صورت نکالو، میرے پاس کئی گرما گرم خبریں جمع ہو گئی ہیں۔“

"مثلاً ؟" میں نے استفسار طلب لہجے میں کہا۔

"اپنی سرگرمیاں بالکل موقوف کردی گئی ہیں اور بازار میں کئی افغان بھی اپنا مال لے آئے ہیں۔ شاید اب اجارہ داری برقرار رکھنا مشکل ہوجائے۔"

"سرگرمیاں کیوں موقوف ہیں ؟" میں نے انجان بن کر سوال کیا۔

"بس ایک ہی بات ہے کہ حالات مخدوش ہوگئے ہیں۔" اس نے بیزار لہجے میں کہا۔ "مجھے تو دور دور بھی کوئی خطرے والی بات نظر نہیں آتی۔ آخری کھیپ ٹھکانے لگانے کے بعد نئے حکم کا انتظار ہے۔"

"آج کل میرا پیچھا کیا جارہا ہے۔ کسی وقت میدان صاف ہوا تو تمھاری طرف آؤں گا۔"

"پیچھا ہورہا ہے۔" اُس کی بوکھلائی ہوئی آواز سنائی دی۔ "پھر کوئی خطرہ مول لینے کی ضرورت نہیں۔ کسی نے اِدھر کا رُخ کرتے دیکھ لیا تو بلاوجہ دونوں عتاب میں آجائیں گے۔"

میں دل ہی دل میں ہنس پڑا۔ خطرے کے امکان سے باخبر ہوتے ہی اُس کی مل بیٹھنے کی خواہش دب گئی تھی میں نے سنجیدگی کے ساتھ سوال کیا۔ "تین نمبر میں میرے داخلے کا کیا رہا ؟ بات ہوئی تمھاری اس سے ؟"

"بات تو ہوئی تھی لیکن وہ عجلت میں تھا، اس موضوع کو چھیڑنے کی نوبت ہی نہ آسکی۔" اس نے کہا۔ "لیکن اس بارے میں تم ضرور کوئی اہم بات مجھ سے چھپا رہے ہو۔"

"کیسی اہم بات ؟" میں نے تحیر آمیز لہجے میں پوچھا۔

"یہ بات حلق سے نہیں اُترتی کہ تم تین نمبر میں بس کچھ وقت گزار کر باہر آجاتے ہو۔" اُس کی آواز اُلجھن آمیز تھی۔ "تین نمبر کو ممنوعہ علاقہ قرار دیے جانے سے پہلے ایک دن کے لیے اس طرح خالی کرایا گیا تھا کہ وہاں چڑیا کا بچہ بھی نہیں تھا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اس دوران میں وہاں کچھ اہم چیزیں پہنچائی گئی ہوں گی لیکن تم نے ابھی تک اس کمرے میں کوئی غیر معمولی تبدیلی یا اضافے کا ذکر نہیں کیا۔"

"کچھ بھی نہیں ہے وہاں۔ یقین نہ ہو تو کسی وقت خود گھُس کر دیکھ لو۔"

ریسیور میں اُس کی خوف زدہ سی ہنسی سنائی دی۔ "ہاں، مروانے کا ہی مشورہ دوگے، گھُسنا تو دور کی بات ہے، اسے میرے ایسے کسی ارادے کا علم بھی ہوگیا تو کھال میں بھُس بھروادے گا۔ ویسے تم بے فکر رہو، اب اس سے بات ہوگی تو میں تین نمبر میں تمہارے داخلے کا معاملہ بھی صاف کرلوں گا۔"

"کیونکہ یہ تمھاری ہی ذمے داری ہے۔" میں نے لقمہ دیا۔ "جیوا ہاؤز تمھاری ہی تحویل میں ہے۔"

"تمھیں تین نمبر میں جانے کا حکم کون اور کس طرح دیتا ہے ؟" وہ موضوع چھڑ جانے کے بعد اس کے ذہن میں تجسس بے دار ہوگیا تھا۔

"اس وقت ہم دونوں ہی کی عقل پر پتھر پڑے ہوئے ہیں۔" میں نے وہ سوال ٹالنے کی نیت سے چونکنے کی کامیاب اداکاری کرتے ہوئے تیز لہجے میں کہا۔

"کیوں ؟ کیا ہوا ؟" وہ ایک مرتبہ پھر بوکھلا گیا۔

"تعاقب کے ساتھ میرا فون بھی سُنا جاسکتا ہے۔ ہمیں فون پر گفتگو کرتے ہوئے محتاط ہی رہنا چاہیے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"خدا تم سے سمجھے۔" وہ شاید دانت پیس کر بولا۔ "تمھیں ہر بات دیر ہی سے سوجھتی ہے، میری تو نیند اُڑ جائے گی۔"

"بہتری کی اُمید رکھو اور بدترین کے لیے تیار رہو۔" میں نے اُسے ایک انگریزی محاورے کا ترجمہ سنایا۔ "جو ہوگیا سو ہوگیا آئندہ محتاط رہنا اگر یہ گفتگو سُنی گئی ہے تو صبح سے پہلے کچھ نہ کچھ ہوکر رہے گا، ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔"

وہ اتنا پراگندہ خاطر ہوگیا کہ اُس نے مزید کچھ کہے بغیر شاید ریسیور کریڈل پر ڈال دیا اور میں اُسے ٹالنے میں کامیابی پر مسکراتا ہوا ڈرائنگ روم میں چلا آیا۔

وال کیبنٹ سے پرانی اسکاچ کی بوتل نکال کر میں نے ایک لارج پیگ تیار کیا اور اس میں برف کے ڈلے ڈال کر صوفے پر آبیٹھا۔

سلطان شاہ کی واپسی کے انتظار میں سُست رفتاری کے ساتھ شراب نوشی کرتے ہوئے میں نے خانساماں کے ذریعے چوکیدار کو اطلاع بھیج دی تھی کہ سلطان شاہ نامی کوئی شخص مجھ سے ملنے کے لیے آئے تو اُسے بلا تامل اندر بلالیا جائے۔ لہٰذا گیارہ بجے کے لگ بھگ سلطان شاہ چوکیدار کی رہنمائی میں نشست گاہ میں داخل ہوا تو اس کے بشرے پر حیرت کے آثار تھے۔ دروازے سے اندر گھسنے کے بعد وہ چند ثانیوں تک کھڑا گہری اور معنی خیز نگاہوں سے کمرے میں موجود اسباب کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر ایک گہرا سانس لے کر میری طرف بڑھتا چلا آیا۔

"تم تو خاصی بڑی آسامی معلوم ہوتے ہو۔" اُس نے میرے قریب بیٹھتے ہوئے بے پروایانہ لہجے میں کہا۔ مجھے یہ بات پسند آئی کہ وہ میری امارت کے مشاہدے سے مرعوب نہیں ہوا تھا۔

"احکام کی تعمیل کرتے رہے تو تھوڑے ہی دنوں میں تم بھی اسی ٹھاٹ باٹ سے رہ سکو گے۔" میں نے گلاس سے اپنے لبوں کو تر کرکے کہا۔ "آسامی بنانے کی کوشش کی تو شاید پچھتانے کا موقع بھی نہ مل سکے۔"

"جس میں وفا نہ ہو، وہ آدمی نہیں خنزیر کا بچہ ہوتا ہے۔" وہ لہجے میں بولا۔ پھر داہنا ہاتھ چھاتی پر مار کر قدرے پُرجوش لہجے بولا۔ "حکم دے کر دیکھو، تمھارے پسینے پر دُشمن کا خون نہ بہادوں ...ر مار کر نکال دینا۔" لحظہ بھر کے لیے وہ خاموش ہوا پھر بولا۔ "...آج کا کام مجھے پسند نہیں آیا۔"

"کیا ہوا ؟" میں نے تجسس آمیز لہجے میں سوال کیا

"وہ گھر تو پورا بھوت بنگلہ ہے۔" وہ حسب عادت ایک ...را سانس لے کر بولا۔ "کوئی چور چکار ہوتا تو جوتے چھوڑ کر ہی ...ل نکلتا، لیکن میں نے بزدلی سے بھاگنے کے بجائے ڈٹ کر مقابلہ ...نے کا فیصلہ کیا تو پتا چلا کہ وہاں نہ کسی آدمی کا وجود تھا نہ بھوت ...بس کچھ شعبدے تھے جنھیں میں تہس نہس کر آیا۔"

"پوری تفصیل بتاؤ۔" میں نے اس کے کارنامے میں دلچسپی لیتے ...ئے کہا۔ "شراب پیوگے ؟ عمدہ قسم کی پرانی اسکاچ ہے۔"

"تم بھی مت پیو صاحب !" وہ بُرا سا منہ بنا کر بولا۔ "شراب ...دم حرام ہے، میں نے زندگی میں کبھی اُسے ہاتھ نہیں لگایا۔"

"پھر تم کسی کا خون کیا بہاؤ گے ؟" مجھے اس کے جواب سے ذرا ...ی سی ہوئی تھی۔

"کیوں ؟" وہ حیرت سے تیوریاں چڑھا کر بولا۔ "کسی کی طرف ...رہ تو کرکے دیکھو، اس کا سر گردن سے اتار کر تمھارے قدموں ...میں لا ڈالوں تو میرے منہ پر تھوک دینا۔"

"وقت آیا تو شاید تم انسانی خون کی حرمت کے بارے میں سوچنے ...لگے۔" میں نے کہا۔

وہ اُلجھی اُلجھی نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا پھر آہستگی سے ...لا۔ "دیکھو صاحب ! یہ سب مجھے نہیں معلوم۔ شراب حرام ہے تو ...ن حرام ہے۔ خون میں ملتی ہے تو دماغ پر اندھیری چادر تان دیتی ...ہے رشتوں کا احساس مٹادیتی ہے لیکن خون کی بات دوسری ہے۔ ...ں تمھارا ملازم ہوں۔ جو تمھارا دُشمن ہے، وہ میرا دُشمن ہے۔ ...تمھارے ہر حکم کی تعمیل میرا فرض ہے۔ تمھارے حکم سے منہ موڑا ...تو وفادار کے بجائے دغاباز کہلاؤں گا اور میری روزی خراب ...ہوجائے گی۔"

بہت ہی عجیب اور ناقابلِ فہم تھا اُس کا فلسفہ۔ بس ذہن ...کی بات تھی، جو بات جم گئی وہ اپنی جگہ اٹل تھی اور دُنیا کی کوئی ...طاقت اس میں تبدیلی نہیں لاسکتی تھی۔ اس کے نزدیک وفا کا بس ...ایک مفہوم تھا کہ اپنے مالک کے حکم کی تعمیل میں ذہن پر کوئی زور ...ڈالے بغیر سر دھڑ کی بازی لگادی جائے۔ میں نے نہ انسانی خون کی ...حرمت کے مسئلے کو مزید کُریدا اور نہ اُس سے یہ دریافت کیا کہ اگر میں ...اسے شراب نوشی کا حکم دوں تو اس کا ردِعمل کیا ہوگا ؟ میرے لیے ...اتنا ہی کافی تھا کہ وہ میرا وفادار تھا اور اس معاملے میں بہت کٹر واقع ہوا تھا۔

"ہاں تو وہ تفصیل نہیں بتائی تم نے ؟" موضوع کی تبدیلی کے ساتھ ہی میں اُس کے ساتھ پیش آنے والے واقعات بھی سُننے کے لیے بے چین تھا تاکہ قاسم لیعنی سی۔ ون کے بارے میں کوئی پختہ رائے قائم کرسکوں۔

"میں عقبی گلی سے احاطے کی دیوار پھاند کر بڑے سکون سے اندر پہنچ گیا تھا۔" وہ بتانے لگا۔ "اندر کئی کمروں کی کھڑکیاں روشن تھیں لیکن عمارت بالکل ویران نظر آرہی تھی۔ میں نے دو مرتبہ پوری عمارت کا طواف کیا لیکن ہر کھڑکی میں شیشوں کے پیچھے مضبوط آہنی گرل لگی ہوئی تھی، جسے موڑنا میرے بس سے باہر تھا۔ عمارت سے احاطے میں نکاسی کے لیے صرف دو دروازے تھے اور دونوں ہی مقفل تھے۔ میں نے قسمت آزمائی کے لیے عقبی دروازے کا انتخاب کیا۔ تالا کھولنا میرے بس سے باہر تھا اور مکان خالی تھا لہٰذا تھوڑی سی کوشش کے بعد میں نے لوہے کی ایک سلاخ اڑا کر دروازے یا تالے کو توڑنے کی کوششیں شروع کردیں۔ خاصی آوازیں پیدا ہوئیں لیکن کہیں سے کوئی مداخلت نہیں ہوئی۔ دروازے نے جب جگہ چھوڑی تو میں کئی منٹ تک دیوار سے لگا ہوا سُن گُن لیتا رہا لیکن اندر موت کا سناٹا طاری تھا۔ پھر جوں ہی میں دروازہ کھول کر اندر گھسا، کہیں سے کرخت اور گونجیلی مردانہ آواز اُبھری، 'پکڑلو اس بدمعاش کو۔ بچ کر نہ نکلنے پائے'، اسی کے ساتھ کچھ قدموں کی آوازیں اُبھریں اور میں بوکھلانے کے باوجود آہنی سلاخ لے کر بیرونی دیوار سے چپک کر کھڑا ہوگیا تاکہ جیسے ہی کوئی ٹوٹے ہوئے دروازے سے باہر نکلے میں اس کی کھوپڑی پر ضرب لگاسکوں۔ جب کافی دیر تک نہ کوئی باہر نکلا، نہ کوئی آہٹ سنائی دی تو میں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ آگے بڑھا لیکن اس بار کچھ بھی نہیں ہوا۔ اندر سارے دروازے غیر مقفل تھے اور وہاں کوئی متنفس موجود نہیں تھا۔ میں اس کرخت مردانہ آواز کے بارے میں سخت پریشان تھا کہ ایک خوابگاہ کا دروازہ کھولتے ہی پھر وہی آواز اُبھری اور میں اس سے بھڑ جانے کے خیال سے جنون کے عالم میں کمرے میں گھُس گیا۔ لیکن کمرہ خالی تھا اور ایک ٹیپ ریکارڈر سے وہ آواز اُبھر رہی تھی۔ میں نے سلاخیں مار مار کر ٹیپ ریکارڈر کے ٹکڑے کرڈالے۔ معاملہ سمجھ میں آنے کے بعد ڈرائنگ روم میں میز کے نیچے دوسرا ٹیپ ریکارڈر بھی مل گیا جس کا اسپیکر عقبی راہداری میں دروازے کے عین اُوپر لگا ہوا تھا، میں نے جھلاہٹ میں وہ سب چیزیں برباد کرڈالیں، کیوں کہ خالی خوابگاہ میں مردانہ آواز سُن کر لحظہ بھر کے لیے میرا ذہن کسی آسیبی چکر کی طرف چلا گیا تھا۔ پھر حقیقت سامنے آتے ہی وہ پریشانی، غصّے اور جھلاہٹ میں بدل گئی تھی۔ پورے مکان

میں اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا لیکن اس خواب گاہ میں ایک ٹامی گن، ایک رائفل اور دو پستول موجود تھے۔ میں نے رائفل کی نال ٹیڑھی کر دی، ٹامی گن بھی توڑ دی، دونوں پستول ساتھ لے آیا۔"

"پستول کہاں ہیں؟" میں نے اضطراری لہجے میں سوال کیا۔

وہ معنی خیز انداز میں ہنسا۔ "میں پاگل نہیں ہوں صاحب جو انھیں ساتھ لیے پھرتا۔۔۔ میں نے سوچا کہ پتا نہیں کتنی دیر تک تمہارا گھر ڈھونڈنا پڑے، بھاری جیبوں کو ہر ایک شبے کی نظر سے دیکھتا لہٰذا میں نے اس مکان سے نکلتے ہی دونوں پستول ایک تھیلی میں ڈال کر جھاڑیوں میں چھپا دیے تھے۔ اب جاتے ہوئے اُنھیں نکال لوں گا۔"

"وہاں کسی عورت کی رہائش کے آثار بھی ملے تھیں؟" میں نے پوچھا۔

"ایسے ویسے۔" اُس نے بُرا سا منہ بنایا۔ "معلوم ہوتا ہے وہ بڑی بے ڈھنگی اور بے پروا عورت ہے۔ اس کے استعمال کے کپڑے وہاں اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے۔"

"مجھے خوشی ہے کہ آج میں نے تمھیں دو کام سونپے جو تم نے بہت عمدہ طریقے سے سرانجام دیے۔ اب یہ بتاؤ کہ میرے ساتھ شہر سے باہر جانے کے لیے بھی تیار ہو یا۔۔۔!"

"تیار نہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا صاحب!" وہ میری بات کاٹ کر بولا۔ "حکم دو گے تو جہنم کے سرے تک بھی تمہارا ساتھ دوں گا۔"

میں دل ہی دل میں ہنس پڑا۔ اُس نے جو کچھ کہا وہ سادگی کے ساتھ محاورۃً ہی کہا تھا لیکن اس سادگی میں بھی وہ جہنم کے سرے تک ہی ساتھ دینے کو تیار تھا' اس سے آگے کا معاملہ مبہم چھوڑ دیا تھا۔ تھوڑے سے توقف کے بعد میں نے کہا۔ "اب تم یہیں ٹھہرو گے، کل ہم لاہور روانہ ہو جائیں گے۔"

"لیکن وہ دونوں پستول۔۔۔؟" اُس کے چہرے پر اچانک سوالیہ لکیروں کا جال سا اُبھر آیا۔

"وہ تمہارا مالِ غنیمت ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اُس کی فکر نہ کرو، ابھی جا کر لے آئیں گے۔"

اُس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔ "وہ بہت مہنگے بکیں گے۔ ساتھ چلو گے تو میں پستول میرزمان کو دے آؤں گا، وہ کسی سے بھی سودا کر لے گا۔"

"اتنی عجلت کی ضرورت نہیں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "فی الحال کسی کو ان پستولوں کی ہوا بھی نہ لگنے دینا۔ رقم کی ضرورت ہے تو مجھے بتاؤ، میں تمھاری مدد کر دوں گا۔"

"ضرورت وروت تو کچھ نہیں ہے۔" وہ کھنچے ہوئے لہجے میں بولا۔ "بس ذرا شوق کی بات تھی، دشمن کا اسلحہ چھین لینا یا چُرا لینا بہت عزت کی بات ہے، میرزمان پستول دیکھے بغیر میری بات کا ہرگز یقین نہیں کرے گا۔"

"تم اپنی کسی سرگرمی کے بارے میں کسی کو ایک لفظ بھی نہیں بتاؤ گے۔" میں نے اس کے رجحانات کا اندازہ ہوتے ہی سخت لہجے میں کہا۔ "ورنہ کسی قابل ہونے سے پہلے ہی تمھارے ہاتھوں میں آہنی زیور سج جائیں گے۔۔۔ میرے ساتھ رہنا ہے تو رازداری پر سختی سے عمل کرنا ہو گا ورنہ تم اپنے ساتھ مجھے بھی مروا دو گے۔"

"چلو تم کہتے ہو تو یہ بھی سہی۔" اُس نے نیم دلی کے انداز میں کہا۔ "میرزمان میرے لیے بھائی کی طرح ہے، وہ کسی سے بھی ایک لفظ نہ کہتا۔ تمھاری خاطر میں اُسے بھی کچھ نہ بتاؤں گا لیکن بستر لانے کے لیے گھر تو جانا ہی ہو گا۔۔۔ لاہور کا سفر لمبا ہے۔ بستر کے بغیر میں لکڑی کی برتھ پر نہ سو سکوں گا۔"

"یہاں بستر بہت ہیں۔" میں نے اس کی محدود سوچ سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔ "لیکن ہم جہاز سے جائیں گے، ریل سے نہیں، تمھیں لباس بھی انگریزی وضع کا پہننا ہو گا۔"

"کوٹ پتلون تو خیر میں بھی کبھی کبھی پہنتا رہا ہوں۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "لیکن اب یہ نہ کہہ دینا کہ مجھے اپنا نام بھی بدلنا ہو گا۔"

"فی الحال نہیں تو ضرورت اور حفاظت کے پیشِ نظر کسی وقت نام بھی بدلنا پڑے گا۔ ان سب باتوں کے لیے خود کو تیار کر لو۔۔۔ ویسے تم داڑھی بڑھا لو تو یہ تبدیلی تمھارے حق میں بہتر رہے گی۔ عیسیٰ خان، اُس کے ملازمین یا پُرانے واقف کاروں میں سے کوئی تمھیں نہ پہچان سکے گا۔ ورنہ تمھارے بدلتے ہوئے حالات ہر ایک کو تمھارے بارے میں تجسّس میں مبتلا کر دیں گے۔"

"یعنی تمھارے خیال میں اگر میں ماضی سے رشتے توڑ کر تمھارے ساتھ بالکل نئی زندگی کا آغاز کروں تو یہ میرے حق میں بہتر رہے گا؟" اُس نے پُرخیال لہجے میں سوال کیا۔

"تم بہت عقل مند ہو، کچھ ایسا ہی سمجھ لو۔"

"بس پھر کل سے داڑھی بڑھتی چلی جائے گی۔"

کھانا اُس نے راستے میں ایک ہوٹل سے کھا لیا تھا لہٰذا میں اس کی یاددہانی پر قاسم کے مکان سے چُرائے ہوئے پستولوں کی بازیابی کے لیے اس کے ساتھ روانہ ہو گیا۔

سلطان شاہ دیکھنے میں سادہ لوح لیکن عملاً بہت چالاک آدمی تھا۔ اُس نے وہ پستول ایک ایسی ویران جگہ پر جھاڑیوں کی جڑوں میں چھپائے تھے کہ وہ دو چار دن بھی وہاں پڑے رہتے تو اُن کی طرف کوئی متوجہ نہ ہوتا۔

گھر کی طرف واپس لوٹتے ہوئے میرے ذہن پر کامیابی

خمار طاری ہونے لگا تھا۔ سلطان شاہ کی کہانی پہلے تو میں سطحی [ذہن] کے ساتھ سُنتا چلا گیا تھا لیکن اب مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ [سلطان] شاہ نے قاسم کو بہت بڑی دشواری میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس [کے] گھر میں کسی نامعلوم آدمی کی آزادانہ مداخلت تنظیم کے حفاظتی نقطۂ [نظر] سے بہت خطرناک تھی۔ یہ غفلت اس قدر سنگین تھی کہ سکندر علی [کے] گھر میں میرے خفیہ داخلے کے نتیجے میں اُسے ماضی کی تمام ترخدمات [کے] باوجود بیک جنبشِ قلم معزول کر دیا گیا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد [تھا] کہ سکندر علی نے سکندر رفارمز پر میرے ہاتھوں مارے جانے سے [پہلے] بڑی حسرت سے کہا تھا کہ اگر اس کا بس چلتا تو وہ اُوپر والوں [کو] اپنے گھر میں کسی نامعلوم اجنبی کے گھُسنے کی ہوا بھی نہ لگنے دیتا [لیکن] اس پر اوپر والوں نے رخشی کو مسلط کیا ہوا تھا جس نے سکندر علی [کی] واپسی سے پہلے ہی اوپر والوں کو اس سنگین واردات کی اطلاع [دے] دی تھی۔ اس معاملے میں سکندر علی، رخشی کے ہاتھوں مار کھا [گیا] تھا لیکن قاسم کے ہاتھ کھلے ہوئے تھے۔ اوّل تو رخشی اُس [کی] نگراں نہیں تھی بلکہ ایک دوست کی طرح اس کے ساتھ رہ رہی [تھی]۔ پھر سُلطان شاہ کی مداخلت سے پہلے ہی قاسم نے رخشی کو [اپ]نے مکان سے گلشنِ اقبال منتقل کر دیا تھا لہٰذا اس کے مکان میں [کس]ی کی بھی مداخلت کا کوئی گواہ نہیں تھا۔ اپنی تمام تر اُلجھن اور پریشانی [کے با]وجود وہ چاہتا تو اوپر والوں کو اس واقعے کی ہوا بھی نہ لگنے [دیتا] اور اس طرح اپنے ریکارڈ کو بے داغ رکھنے میں کامیاب [رہت]ا۔

[میرے] لیے وہ معاملہ ثانوی تھا جسے لاہور سے واپسی کے [بعد] کرنا تھا۔ لہٰذا گھر پہنچ کر میں نے سلطان شاہ کو اس ہدایت [کے] ساتھ سونے کے لیے ایک کمرہ دے دیا کہ وہ میرے ملاقاتیوں [کی ن]گاہوں سے حتی الامکان دور ہی رہے گا۔

میں نے یہ سوچ ہی لیا تھا کہ رخشی کی دھمکیوں یا کار کی ڈکی [سے] ملنے والے ٹائم بم کے بارے میں اے۔ ڈی کو ایک لفظ بھی نہیں [بتاؤ]ں گا تاکہ قاسم کا منصوبہ ناکارہ ہو کر رہ جائے۔ دوسری طرف [اے۔ ڈ]ی نے بھی مجھے کسی قسم کے رابطے سے منع کر دیا تھا۔ بس باہر [لے] جانے والوں کا انتخاب مکمل ہونے کے بعد مجھے اس کو [اطلا]ع دینا تھی۔ اس لیے اے۔ ڈی کو فون کرنے کی کوئی ضرورت [نہ]تھی۔ میں نے اُس دن کا آخری پیگ بنا کر مسہری کے سرہانے [رکھے] نائٹ بلب آن کر کے روشنیاں گُل کر دیں اور بستر پر [دراز] ہو گیا۔

ذہن پر سرور کی کیفیت طاری تھی لیکن نیند کا کوسوں بھی [پتا] نہ تھا۔ میں بستر پر پڑا ایک ناول کا مطالعہ کرتا رہا۔ ناول [دلچس]پ تھا۔ بڑی طاقتوں کی سرد جنگ کی کہانی کو مغربی مصنف [نے خوب]صورتی سے بڑھائے گیا تھا کہ بعض خفیہ مقاصد کی تکمیل کے لیے

اُس نے روسی ایجنٹوں کے مضبوط حصار میں امریکی صدر کی بیوی کی جگہ اُس کی ہم شکل اور تربیت یافتہ روسی جاسوسہ کو صدرِ امریکہ کے ہمراہ دکھایا تھا۔ اس جاسوسہ کی تربیت اور اداکاری اس قدر مکمل تھی کہ صدرِ امریکہ کو شبہ تک نہ ہو سکا تھا کہ اُس کی بیوی واشنگٹن سے ہزاروں میل دور روسی قید میں تشدد کی صعوبتیں جھیل رہی تھی اور اُس کے ساتھ ایک جاسوسہ موجود تھی۔ کہانی میں میری دل چسپی اس لیے اور بھی بڑھ گئی تھی کہ میں یونیسکو کے تحت ہونے والے کھلے اجلاس میں امریکی مندوب کی زبانی روسی عزائم کی ناقابلِ یقین کہانی سُن چکا تھا اور اُسی وقت سے یہ خیال مسلسل میرے ذہن میں کچوکے لگا رہا تھا کہ اپنی سرزمین پر ہیروئن کی تیاری، درآمد اور تجارت میں ملوّث ہر چھوٹا بڑا مہرہ دانستہ یا نادانستہ طور پر ایک بھیانک سازش کا آلۂ کار بنا ہوا تھا جس کے مقاصد حصولِ زر سے زیادہ جغرافیائی اور سیاسی تھے۔

میں کہانی میں اس کے ایک کردار کی طرح ڈوبا ہوا تھا کہ اچانک خواب گاہ کے سناٹے میں فون کی گھنٹی چیخی اور چند ثانیوں کے لیے میرے اعصاب بکھر کر رہ گئے۔ بے اختیار میری نگاہیں وال کلاک کی طرف اُٹھ گئیں جو اس وقت دو بجے کے عمل کا اعلان کر رہا تھا۔ گھنٹی کی آواز دوبارہ کسی گھُٹی گھُٹی آسیبی چیخ کی طرح گونجی، تو میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ ہاتھ بڑھا کر ریسیور اُٹھا لیا۔

لائن پر سناٹا رہا، شاید فون کرنے والا میری طرف سے گفتگو میں پہل کا منتظر تھا لیکن میں دانستہ خاموش رہا پھر آخر ریسیور پر قاسم کی آواز اُبھری۔ "کیا تم جاگ رہے تھے؟"

"کیا یہی پوچھنے کے لیے میری نیند خراب کی ہے؟" میں غصیلے لہجے میں غرّایا۔ کثرتِ شراب [نو]شی سے میری آواز ویسے ہی بھاری ہو رہی تھی۔ لہٰذا مجھے لہجے کو خمار آلود بنانے کے لیے اداکاری کی ضرورت نہیں پڑی۔

"میں اس وقت بہت پریشان ہوں۔" اس کا تھکا ہوا لہجہ اس کے الفاظ کی عکاسی کر رہا تھا لیکن میرے دل میں اُس کے لیے ہمدردی کی ذرا بھی رمق پیدا نہ ہو سکی کیوں کہ میں اچھی طرح واقف ہو چکا تھا کہ وہ رخشی کے نام کی آڑ لے کر مجھے بلیک میل کرنے کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ "ورنہ یوں بے وقت تمھیں تنگ نہ کرتا۔"

"پریشانی کا سبب بھی بتا ڈالو۔" میں نے جذبات سے عاری، سرد لہجے میں کہا۔ "ابھی وقت باقی ہے، میں تمھارے مسائل سے اوپر والے کو آگاہ کر دوں گا۔"

"نہ۔۔۔ نہ۔" اُس کی کھُردری آواز میں بوکھلاہٹ عود کر آئی۔ "یہ کوئی آفیشل معاملہ نہیں ہے، میں نے تمھیں دوست

سمجھ کر فون کیا ہے اور اس پریشانی کا تعلق تم سے بھی ہے۔"
"دوستی کا تو کوئی تعلق نہیں ہے ہمارے درمیان۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "کل تک تم میرے اوپر تھے، آج تابع ہو... ایسے میں دوستی کی کوئی گنجائش کہاں نکل سکتی ہے؟"

"تو پھر معاملے کی بات ہی سہی۔" قدرے سکوت کے بعد اس کی آواز میں بھی تندی عود کر آئی۔ "رخشی کا کچھ پتا چلا؟"

"میں اس معاملے سے بالکل بری الذمہ ہوں، اس کا سراغ لگانا تمہارا کام ہے۔"

"تم سے اس کا کوئی رابطہ یا فون کال وغیرہ؟" میں اس کے لہجے کی بے چینی بھانپ گیا۔ رخشی نے پہلے مجھے فون پر دھمکیاں دیں پھر فون ہی پر کار کی ڈکی میں بم کی موجودگی سے آگاہ کیا تھا، اور اس نے دونوں بار یقیناً قاسم ہی کے مشورے پر عمل کیا تھا لیکن اس بارے میں میری پُراسرار خاموشی قاسم کو کھل رہی تھی۔ وہ اپنے حفاظتی اختیارات کی آڑ میں مجھ سے سچ اگلوانا چاہ رہا تھا لیکن میں نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔

"وہ بہت چالاک عورت ہے۔ خطرہ بھانپ کر ہی روپوش ہوئی ہے۔ وہ کیوں مجھ سے رجوع کر کے کوئی خطرہ مول لینے لگی؟"

ریسیور پر اس کے ایک گہرے سانس کی آواز آئی۔ "لیکن میری اطلاعات کچھ اور بتاتی ہیں۔" اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔

"پھر مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو؟" میں نے چڑچڑے لہجے میں سوال کیا۔

"صرف تصدیق کے لیے۔ رخشی نے مجھے فون کیا تھا کہ وہ تمہاری وجہ سے مصیبت میں پڑی ہے اور تمہیں ہرگز معاف نہیں کرے گی۔ بزدلی کے ساتھ وار کرنے کے بجائے اس نے تمہیں فون کر کے اپنے عزائم سے آگاہ بھی کر دیا ہے۔" مجبوراً اسے ایک کہانی تراشنا ہی پڑ گئی۔

"میرے لیے یہ سمجھنا دشوار ہے کہ اسے تم سے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی؟ تم تو اسے مجھ سے زیادہ جانتے ہو۔"

"تو تم اب بھی اس سے کسی رابطے سے انکار پر اڑے ہوئے ہو؟" اس کا لہجہ تلخ ہو گیا تھا۔

"گرمی کھانے کی ضرورت نہیں۔" میں نے ناصحانہ لہجے میں کہا۔ "شاید وہ ہم دونوں کو لڑوانا چاہتی ہے۔ تھوڑی دیر پہلے شاید اسی کے کسی ساتھی نے مجھے فون کیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ قاسم کے گھر کا کباڑا کر دیا گیا، اس کے ستارے اچھے تھے جو وہ گھر پر نہیں ملا ورنہ ذبح ہی کر دیا جاتا۔ میں نے تو تم سے کریدنے کی کوشش نہیں کی کہ تمہارے گھر پر کیا ہوا؟"

"کچھ بھی نہیں ہوا۔" اس کی آواز میں مدافعانہ بوکھلاہٹ نمایاں تھی۔ "میرے گھر میں میری مرضی کے بغیر پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا اور کیا بکواس کی تھی اس نے؟"

"مجھے بھی دھمکیاں دے رہا تھا۔ ہو سکتا ہے رخشی نے اسی کی بابت تمہیں بتایا ہو۔"

"ہو سکتا ہے۔" اس کی مصالحانہ آواز ابھری لیکن وہ اس کی کھلی منافقت تھی۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ میں رخشی کے بارے میں جھوٹ بول رہا تھا۔ بات صرف اتنی تھی کہ میری زبان سے اپنے گھر میں کسی کی مداخلت کا ذکر سن کر وہ تذبذب میں پڑ گیا تھا اور اس بات کی اہمیت گھٹانے کی کوشش میں فی الوقت رخشی کے بارے میں میرا جھوٹ تسلیم کرنے پر آمادہ ہو گیا تھا۔

"ہمیں پوری طرح ہوشیار رہنا چاہیے۔ کوئی بھی خطرہ محسوس ہو تو بے دریغ مجھ سے رجوع کرنا۔ ویسے فون کرنے والے کی آواز سے کچھ اندازہ تو لگایا ہو گا تم نے اس کے بارے میں؟"

"پختہ عمر کا کوئی خرانٹ آدمی معلوم ہوتا تھا۔ تمہارے بارے میں بہت نازیبا الفاظ استعمال کر رہا تھا، اس نے تو یہاں تک کہا تھا کہ وہ ہم لوگوں کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے اور جلد ہی ہماری اینٹ سے اینٹ بجا دے گا۔" میں نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت شوشہ چھوڑا۔

"اچھا ہوا کہ تم نے بتا دیا۔ اب میں اسے بھی دیکھ لوں گا۔" اس کی آواز تفکر آمیز ہو گئی۔

"تم نے اپنی الجھن کے بارے میں نہیں بتایا ابھی تک؟" میں نے اسے چھیڑا۔

"رخشی کے فون کا معاملہ تھا۔" اس کی آواز اس بار نرم تھی۔ "میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس معاملے کو کیسے ہینڈل کروں مگر اب تمہیں فون کرنے والا زیادہ اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ پہلے میرا ہی رخ کرے۔"

وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ مجھے یہ تاثر دینا چاہتا تھا جیسے اس کے گھر میں کوئی غیر معمولی واقعہ رونما نہ ہوا ہو اور میں نے اس پر کسی ردِعمل کا اظہار کیے بغیر سلسلہ منقطع کر دیا۔

ہم دونوں کے درمیان سرد جنگ کے ساتھ ہی عملی معرکہ آرائی بھی جاری تھی اور ابھی تک ہر اعتبار سے میرا پلہ بھاری تھا کیونکہ اس کی اور رخشی کی ملی بھگت میرے سامنے آ چکی تھی۔ سلطان شاہ نے بچشمِ خود اسے میری کار کی ڈکی میں کوئی ڈبا رکھتے ہوئے دیکھا تھا لیکن قاسم سمجھ رہا تھا کہ اس کی ساری حرکات مجھ سے پوشیدہ ہیں۔ دوسری طرف سلطان شاہ نے اس کے گھر میں جو کارروائی کی تھی، اس کا رخ میں نے کسی انجان شخصیت کی طرف موڑ دیا تھا۔ مجھے پوری امید تھی کہ میری لاہور سے واپسی تک قاسم اسی کے چکر میں

رہے گا



اگلی صبح سب سے پہلے میں نے فون پر غزالہ کو مطلع کیا کہ ہو روانگی کے لیے تیاری مکمل کر لے۔ اس کے بعد میں نے ان شاہ کو رقم دے کر بازار روانہ کر دیا تاکہ وہ اپنے لیے کچھ قمیصیں اور ایک چھوٹا سوٹ کیس لے آئے۔ اس مرحلے پر میں اسے کے شہر میں کہیں دیکھا جانا پسند نہیں کرتا، اگر وہ لاہور کے سفر میں ں کا پارسا ثابت ہو جاتا تو میرا ارادہ تھا کہ اسے مستقل طور پر غزالہ ہاں پہنچا دوں گا۔ وہاں وہ گھریلو کام کاج کے ساتھ بظاہر چوکیدار تے داری بھی سنبھال سکتا تھا اور جب مجھے ضرورت ہوتی، وہ ے کام بھی آ سکتا تھا۔

اگلے مرحلے پر میں نے جہانگیر کو بی۔ فور کی حیثیت سے فون کر کے ی طور پر آپریٹس پر کال کرنے کی ہدایت کی اور دس منٹ بعد س سے ٹرانسمیٹر ریسیور پر بات ہو گئی۔ ٹرک نمبر ٹی۔ آر صفر تین نو شہر پہنچنے والے مال کی مقدار اتنی کافی تھی کہ اس کے اندازے طابق پورا ہفتہ اطمینان سے گزر سکتا تھا۔ اس نے پہلی بار یے تین نمبر میں داخلے کے بارے میں زبان کھولی تو میں نے ۔ فور کی حیثیت سے اسے بتا دیا کہ فی الحال جیوا ہاؤس کے تین نمبر ے میں میرے سوا ہر ایک کا داخلہ ممنوع رہے گا۔ پھر اس نے بکے ہوئے بازار میں دوسرے ذرائع سے ہیروئن کی فروخت کا ذکر ر دیا۔

"وہ لوگ کون ہیں اور کہاں سے مال لا رہے ہیں؟ اوور۔" ہ نے بدلی ہوئی آواز میں سوال کیا تھا۔

"فی الحال صرف دو آدمی نگاہوں میں آ سکے ہیں سر۔" جہانگیر ی آواز ابھری۔ "اور وہ دونوں ہی افغان ثابت ہوئے ہیں۔ پتا چلا ہے کہ آزاد علاقے میں پائندہ گل نامی ایک افغان قبائلی سردار ہیروئن بنا رہا ہے۔ وہ دونوں براہِ راست اسی سے مال لے تھے۔ اس بار وہ چار چھ سو گرام پاؤڈر لائے تھے لیکن بھاری ع کے باعث اگلی بار شاید دوگنی مقدار لائیں گے۔ اس کی نقل و حمل میں سہولت کے باعث کچھ اور لوگ بھی میدان میں آئے ہیں۔ لیکن فی الحال ہمارے آدمیوں کی نگاہوں میں نہیں آ سکے۔ اوور۔"

"ایسے ہر شخص پر کڑی نگاہ رکھو۔" یہ کہتے ہوئے میرے ذہن میں امریکی نمائندے آرتھر کے الفاظ گھوم گئے۔ ہزاروں میل دور دوسرے برِاعظم سے آنے والے اس شخص کی معلومات اس یقینی تھیں کہ اس نے پائندہ گل کی ہیروئن ساز فیکٹری کا مال بازار نے سے پہلے اس کی کامیابی کی اطلاع دے دی تھی۔ جہانگیر کی پائندہ گل کے بارے میں آرتھر کی اطلاعات کی پوری پوری

تائید کر رہی تھی۔" ان دونوں افغانوں پر آدمی لگا دیے جائیں گے، ان کے کوائف کیا ہیں؟ اوور۔"

ان دونوں کے کوائف نوٹ کر کے میں نے سلسلہ منقطع کر دیا اور آپریٹس کی ٹرانسمیشن فری کوئنسی تبدیل کر کے سی ون سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

"سی کنگ ریسیونگ۔" اس نے پہلی ہی کال کے جواب میں کہا۔

"ابھی ابھی میں دوسری فری کوئنسی پر تمہاری اور ڈی ون کی گفتگو سن رہا تھا۔ اسی لیے کال کیا ہے نا؟ اوور۔"

"واقعی تم بہت ذہین ہو۔" میں نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔" پھر تم نے یہ بھی سُن لیا ہو گا کہ نزار خان اور تازہ گل سہراب گوٹھ کی ایک سستی سی سرائے میں مقیم ہیں۔ انھیں بے رحمی کے ساتھ زدو کوب کر کے ہر اُس چیز سے محروم کر دو جو اُن کی تحویل میں ہو۔ اُنھیں دوسروں کے لیے عبرت کا شاہکار ہونا چاہیے۔ رقم کمانے کے لالچ میں اگر ہر ایک شخص ایک آدھ کلو ہیروئن کے ہیر پھیر میں لگ گیا تو مارکیٹ خراب ہو جائے گی، ایسی ہر کوشش کی حوصلہ شکنی ہونا چاہیے... اوور۔"

"پتہ ہی صاف نہ کرا دوں دونوں کا تاکہ ہیروئن پر ہاتھ ڈالتے ہوئے ہر ایک کا پتہ پانی ہو جائے؟ اوور۔"

"نہیں۔" میں نے سختی سے کہا۔" اُنھیں زندہ رہنا چاہیے تاکہ اُن کی کہانی اُن ہی کی زبانی پھیلے۔ اُنھیں اچھی طرح یہ معلوم ہو جانا چاہیے کہ اُنھیں شہر میں ہیروئن بیچنے کی پاداش میں سزا دی گئی ہے۔ وہ مر گئے تو اُن کے قریبی دو چار لوگوں کے سوا کسی کو معلوم نہ ہو سکے گا کہ وہ کون تھے؟ اور کیوں مارے گئے؟ اوور۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ فوری طور پر میری رائے سے متفق ہو گیا۔ "اس واقعے کی تشہیر ہمارے مفاد میں ہو گی... اوور۔"

"وہ تمہاری طرف پہنچا یا نہیں؟ اوور۔" کام کی بات ختم ہوتے ہی میں نے اس کی دُکھتی رگ چھیڑ دی۔

"کون؟ اوور۔" اس نے تحیّر آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"وہی جس نے فون پر مجھے تمہارے گھر کا کباڑا ہو جانے کی اطلاع دی تھی۔ اوور۔" میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے میٹھے لہجے میں کہا۔

"میں تو اس کا انتظار ہی کرتا رہا۔" وہ جلدی سے بولا۔" اچھا ہوا کہ تم نے مجھے اطلاع دے دی، کوئی بھی اس طرف آیا تو زندہ بچ کر نہ جا سکے گا.... رخشی سے کوئی رابطہ ہوا تمہارا؟ اوور۔" اپنی صفائی پیش کرنے کے ساتھ ہی اس نے اپنی دانست میں مجھے ذہنی کچوکا دینے کی کوشش کی کیوں کہ اُسی کے ایما پر رخشی نے مجھے فون پر پہلے دھمکیاں دی تھیں۔ پھر کار کی ڈکی میں ٹائم بم کی موجودگی کی اطلاع دی تھی لیکن میں رخشی سے کسی رابطے سے ہی صاف انکار کر رہا تھا۔

"فکر نہ کرو۔ رابطہ ہوتے ہی تمھیں مطلع کروں گا۔ میرا خیال ہے کہ اُسے کوئی بڑبولا ساتھی مل گیا ہے جو دھمکیاں دینے کے معاملے میں حاتم ہے لیکن عملاً ناکارہ ہے... موقع ملا تو میں کسی تدبیر سے رخشی کو گھیر ہی لوں گا، پھر اس کی وہ دُرگت بناؤں گا کہ وہ بھی یاد رکھے گی... اوور۔"

"میں نے پورا شہر چھان مارا لیکن اس کا کہیں سراغ نہیں مل سکا۔ وہ جس انداز میں روپوش ہوئی ہے اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کچھ کر گزرنے پر تُل گئی ہے اور آسانی کے ساتھ ہمارے ہاتھ نہ آ سکے گی لیکن پھر بھی اگر وہ تمہارے ہاتھ لگ ہی جائے تو اس پر تشدد وغیرہ کیے بغیر میرے حوالے کر دینا... وہ میرا کیس ہے، میں دیکھوں گا کہ وہ کتنے پانی میں ہے۔ اوور۔"

میں ہنس پڑا۔" ارے درگت سے میری مُراد تشدد نہیں تھا۔ میں بالکل ہی پتھر نہیں ہوں۔ اچھی خاصی جمالیاتی حِس کا مالک ہوں... اوور۔" میں نے بات بنا دی ورنہ درگت کا ذو معنی لفظ میں نے محض اس کا ردِ عمل دیکھنے کے لیے ہی استعمال کیا تھا۔ رخشی کا کردار کچھ بھی سہی لیکن وہ قاسم کی دوست تھی...

اس نے اضطراری طور پر میرے تشدد سے اختلاف کیا تو میں نے اس کے دل میں رقیبانہ جذبات کو ہوا دے کر اس کی کھوپڑی کو گرما دیا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ اُس نے اپنے ردِ عمل پر قابو پانے کی کوشش کی ہو گی لیکن وہ بولا تو اس کی آواز میں تلخی موجود تھی۔

"تم جو چاہو کر سکتے ہو، میں تمھیں حکم نہیں دے سکتا لیکن بہتر یہی ہو گا کہ تم اُس سے دور ہی رہو۔ وہ بہت چالاک ہے، تمھیں رجھا کر کسی چکنی مچھلی کی طرح تمہاری گرفت سے نکل جائے گی اور تم اس کی تلاش میں شہر کی خاک چھانتے رہ جاؤ گے۔ اوور۔"

"کہاں ہم اس مفروضے میں اُلجھ گئے۔" میں نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔" وہ ہاتھ آئے گی تو دیکھا جائے گا۔ فی الحال فوری طور پر نزار خان اور تازہ گل کا بندوبست کرو۔ اوور اینڈ آل۔"

باہر آ کر میں نے اپنا کمرہ مقفل کر دیا اور خانساماں کو ہدایت کر دی کہ سلطان شاہ لوٹ کر آئے تو میری واپسی تک اسے گھر پر ہی روک لیا جائے۔ اس طرف سے فارغ ہو کر میں دفتر کے لیے روانہ ہو گیا۔

راستے بھر میری نگاہیں عقب نما آئینے کا بار بار جائزہ لیتی رہیں لیکن مجھے پیچھے کوئی ایسی کار نظر نہ آئی جس پر تعاقب کرنے

شبہ کیا جا سکتا۔ میرے لیے یہ خوشی کی بات تھی۔ قاسم میرے ہاتھوں ایک آدمی کی بے رحمانہ پٹائی کے بعد محتاط ہو گیا تھا ورنہ نگرانی نے والوں سے پیچھا چھڑائے بغیر میرے لیے لاہور روانگی کے پروگرام ں کرنا دشوار تھا۔

دفتر میں معمولات سے فارغ ہو کر میں نے عملے کے سینئر اراکین مختصر الفاظ میں بریف کرتے ہوئے آگاہ کیا کہ شہر میں باہر سے ہوئے چند مہمانوں کی وجہ سے یہ امکان ہے کہ شاید میں دو چار دفتر پر توجہ نہ دے سکوں، لہٰذا جملہ معاملات اُنھیں ہی نمٹانے گے۔ میں نے یہ قدم اس لیے اٹھایا تھا کہ کہیں قاسم کو میری روپوشی کی بھنک نہ مل جائے۔ ایسی صورت میں وہ اپنا تجسس دور کرنے کی خاطر میرے دفتر سے بھی رجوع کر سکتا تھا۔

اپنے ایجنٹ سے کراچی تا لاہور آمد و رفت کے تین اوپن ٹکٹ حاصل کر کے میں غزالہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ تینوں ٹکٹ شام کی پرواز کے لیے کنفرم تھے لیکن ان پر کسی مسافر کے نام کا اندراج نہیں تھا۔ میں ایئر پورٹ پر چیک ان ہونے سے پہلے ہر طرح محتاط رہنا چاہتا تھا۔ میں غزالہ کے گھر پہنچا تو وہ اپنے باپ کے ساتھ بازار گئی ہوئی تھی۔ اس کی ماں نے محبت اور مٹھاس کے ساتھ میرا استقبال کیا۔

"تم دونوں کہاں جا رہے ہو بیٹا؟" اس نے چند ثانیوں کے توقف کے بعد محبت آمیز لہجے میں سوال کیا۔

'مر گئے!' میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ نجانے غزالہ نے سفر کے بارے میں اپنے گھر والوں کو کیا بتایا تھا، اگر میرے منہ سے کوئی متضاد بات نکل جاتی تو معاملہ گڑبڑ ہو سکتا تھا۔

"لاہور کا ارادہ ہے۔" میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ مختصر ترین الفاظ استعمال کرتے ہوئے محتاط لہجے میں جواب دیا۔

"یہ تو ہمیں معلوم ہے۔" اس نے صوفے کی پشت گاہ سے ٹیک لگا کر پُر اسرار انداز میں کہا۔" لیکن نام کیا ہے اُس ڈاکٹر کا؟"

'ڈاکٹر؟' میری کھوپڑی پر گویا کوئی وزنی ہتھوڑا آ گرا۔ مجھے بے اختیار غزالہ پر غصہ آنے لگا۔ اگر اس نے اپنے گھر والوں سے کوئی بہانا کیا تھا تو اس کا فرض تھا کہ مجھے بھی ہوشیار کر دیتی۔ اب وہ خود غائب تھی اور میں کڑی مشکل سے دوچار ہو گیا تھا۔ میں چند سیکنڈ تک گھبرائے ہوئے انداز میں شمع سے نگاہیں چراتا رہا پھر مجھے ایک گول مول سا جواب سوجھ ہی گیا۔" ڈاکٹر شوکت علی۔ بہت مشہور ہے۔ ہیروئن کے بڑے مریضوں کا کامیاب علاج کر چکا ہے... اللہ تعالیٰ نے اس کے ہاتھ میں بڑی شفا دی ہے۔"

شمع کے پتلے پتلے گلابی ہونٹوں پر تبسم سا تیر گیا۔" کامران کے سلسلے میں مشورہ کرو گے اس سے؟"

"جی... جی ہاں۔" میں نے اطمینان کا گہرا سانس لیتے ہوئے جلدی سے کہا۔ اس نے کامران کا نام لے کر خود ہی میری مشکل آسان کر دی تھی اور اب میں اس سے گھنٹوں اس موضوع پر بات کر سکتا تھا۔" بہت قابل آدمی ہے... بس گنے چُنے کیس ہی لیتا ہے۔ لالچ تو اس کی طبیعت کو چھو کر بھی نہیں گزرا۔"

"تو کامران کو بھی ساتھ لے جاتے۔ بھلا مریض کو دیکھے بغیر وہ کیا بتا سکے گا؟" اس کے لبوں کا تبسم گہرا ہو گیا۔ بڑی بڑی خوب صورت آنکھوں میں نشے کی ویرانی کی جگہ بچوں جیسی معصومانہ چمک اُبھر آئی۔

"کامران کو لے جانا غیر محفوظ ہو سکتا ہے۔" میں نے جلدی سے کہا۔" اگر دورانِ سفر اس پر دورہ پڑ گیا تو دشواری پیدا ہو جائے گی۔ میری کوشش ہو گی کہ ڈاکٹر شوکت کو واپسی پر ساتھ ہی لے آؤں۔ اگر اسے بہت زیادہ مصروفیت ہوئی تو پھر کامران کو کار کے ذریعے لے جانا پڑے گا۔"

"اور جا کب رہے ہو؟" وہ بدستور مسکرائے جا رہی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اپنے ہونے والے داماد کو سامنے پا کر خوشی محسوس کر رہی ہو۔

"بس آج ہی۔ شام کی پرواز پر نشستیں محفوظ کرا لی ہیں میں نے۔" میں نے جیب سے ٹکٹ نکالتے ہوئے کہا۔

"خدا تم دونوں کو سلامت رکھے اور ساتھ خیر کے واپس آؤ۔" وہ دعائیہ انداز میں بولی۔" ہم تو زمین کا بوجھ بن کر رہ گئے ہیں بیٹے! شاید اب تمہاری خوشیاں دیکھ کر جینے کا حوصلہ مل جائے۔ ہمارے لیے تو یہی ایک خوشی برداشت سے باہر ہوئی جا رہی ہے کہ تمہارے طفیل غزالہ بیٹی نے ہم سے جیتے جی صلح کر لی ہے ورنہ اس کی نفرت سے جلتی ہوئی آنکھیں شاید قبر میں بھی ہماری روح کو بے چین ہی رکھتیں۔"

اسی اثنا میں غزالہ تقریباً دوڑتی ہوئی ڈرائنگ روم میں گھس آئی۔ شاید اُس نے باہر میری گاڑی دیکھ کر میری موجودگی کا اندازہ لگا لیا تھا اور سیدھی ادھر ہی آئی تھی کیونکہ اُس کے ہاتھ میں پھولا ہوا شاپنگ بیگ جھول رہا تھا۔

"لو بیٹی! اب تم سنبھالو تنویر میاں کو۔" شمع تھکے ہوئے انداز میں اُٹھتے ہوئے بولی۔" تھوڑی دیر بیٹھتے میں تو ہماری ہڈیاں تک دُکھنے لگتی ہیں۔" احتراماً میں کھڑا ہو گیا۔

"کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی؟" ماں کے جاتے ہی غزالہ نے تجسس آمیز سرگوشیانہ لہجے میں سوال کیا۔

"تم نے تو مروانے میں کسر نہیں چھوڑی تھی، بس کان پہ سے گزر گئی..." میری بات ادھوری رہ گئی کیونکہ اُسی لمحے کرنل زوار

زیدی پُرتپاک انداز میں میری مزاج پُرسی کرتا ہوا اندر داخل ہوا تھا۔ بیوی کی طرح آدمی وہ بھی سمجھدار تھا۔ کھڑے کھڑے خوشدلی سے چند باتیں کرنے کے بعد لباس تبدیل کرنے کا بہانہ کرکے اندر چلا گیا اور ہم دونوں ایک دوسرے کے مقابل بیٹھ گئے۔

"کوئی بہانا کیا تھا تو مجھے کیوں اندھیرے میں رکھا؟" میں نے غزالہ کو گھورتے ہوئے خشک لہجے میں سوال کیا۔

"بس خیال ہی نہیں رہا تھا کہ آپ میری غیر موجودگی میں بھی گھر آ سکتے ہیں۔" وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "ہوا کیا تھا؟"

"ہوتا کیا، تمہاری اماں جان اچانک ہی لاہور کے ڈاکٹر کا نام پوچھ بیٹھی تھیں۔" میں نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔ "بس فوراً ہی مجھے ایک نام سوجھ گیا ورنہ خواہ مخواہ کرکری ہو جاتی۔"

"بازار میں مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا تھا۔" وہ ہنستے ہوئے بتانے لگی۔ "لیکن یہ تسلی تھی کہ آپ خاصے حاضر دماغ ہیں۔ بات بگڑنے نہ دیں گے۔"

"بگڑنے میں کوئی کسر تو نہیں رہ گئی تھی۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "وہ کامران کو بھی ساتھ لے جانے کا مشورہ دے بیٹھی تھیں۔"

"کامران کو؟" اس کی مسکراہٹ ایک دم کافور ہو گئی اور آنکھوں میں تحیر کی جھلکیاں تیرنے لگیں۔ "مگر کیوں؟"

"میں نے ڈاکٹر شوکت علی کا نام لے کر خطرناک امراض میں اس کی مہارت کا ذکر کیا تو . . . ."

"مروا دیا آپ نے۔" وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام کر گھبرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "اور اس پر کہہ رہے ہیں کہ کان پر سے گزر گئی۔"

"کیا مروا دیا؟" میں چیخ کر بولا۔ "حماقت خود تمہاری ہے اور الزام مجھ پر لگا رہی ہو۔ کیا کیا میں نے؟"

"آپ مریضوں والے ڈاکٹر کا ذکر کرتے رہے اور امّی نے کچھ نہیں کہا؟"

"کیا کہتیں، بس سمجھا ہی دیا اُنھیں کہ فی الحال کامران کو لے جانا مناسب نہ ہوگا۔ بہت دعائیں دے رہی تھیں۔"

"میں نے اُن سے ادب کے ڈاکٹر کا بہانا تراشا تھا۔" اُس کی وضاحت سُنتے ہی میری کھوپڑی بھق سے اُڑ گئی۔ "میں نے اُن سے کہا تھا کہ ہم دونوں عابدہ کی کتاب پر ایک نامور نقاد سے تبصرہ لکھوانے لاہور جا رہے ہیں تاکہ جلد ہی اس کی اشاعت کا بندوبست ہو سکے۔"

"لیکن اُنھوں نے تو میری تردید میں ایک لفظ بھی نہیں کہا۔" میں نے کمزور مدافعانہ لہجے میں کہا۔

"اُن میں ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔" وہ بولی۔

"اب تو صحت سے مجبور ہیں ورنہ دوسروں کی کمزوریوں سے خوب لُطف اندوز ہوتی تھیں۔ میرا جھوٹ پکڑنے پر وہ دل ہی دل میں خوش ہو رہی ہوں گی۔"

"لیکن میں اب اُن کا سامنا نہ کرسکوں گا۔" میں نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "کیا سوچا ہوگا اُنھوں نے میرے بارے میں! یہی نا کہ میں بھی تمہاری طرح لاابالی اور بہانے باز ہوں۔"

"آپ کو اس قدر سنجیدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔" وہ ہنسنے لگی۔ "میں بات سنبھال لوں گی، لاہور میں ہمیں دو نوں ہی کام کرنے ہیں۔ ایک میں نے بتا دیا، دوسرا آپ نے۔"

"لیکن یہ کس قدر شرم کی بات ہے کہ ہم کامران جیسے قابلِ رحم لڑکے کا نام استعمال کریں۔" میں نے ملامت آمیز لہجے میں کہا۔

"اس گھر کی فضا اب بالکل بدل گئی ہے تنویر صاحب!" وہ سنجیدگی کے ساتھ بولی۔ "شبہات کی دُھند صاف ہوتے ہی ہم تینوں حیرت ناک سرعت سے ایک دوسرے کے قریب آئے ہیں لیکن تمام تر بے تکلفی کے باوجود ہمارے معاشرے میں ابھی وہ مقام نہیں آیا کہ کوئی لڑکی کسی معقول بہانے کے بغیر اپنے دوست کے ساتھ باہر کہیں جانے کا ارادہ کرسکے۔ وہ میری اپنی ذہنی اُپج تھی ورنہ امّی اور ڈیڈی تو آنکھیں بند کرکے آپ پر بھروسا کرنے لگے ہیں۔" وہ لحظہ بھر کے لیے خاموش ہو گئی پھر بولی۔ "ہم کامران کا نام ہرگز استعمال نہیں کر رہے ہیں، وہ تو آپ غلط فہمی میں پھنس گئے، مجھے یقین ہے کہ اس بے چارے کے لیے آپ مجھ سے زیادہ دُکھی نظر آتے ہیں۔ انشاء اللہ اُسے بھی کسی نہ کسی کو دکھائیں گے۔"

میرے دل میں آئی کہ اُسے ایڈکشن کیور سوسائٹی کے بارے میں بتا دوں لیکن وہ موضوع بہت گنجلک تھا۔ ایک بار بات چھڑ جاتی تو پھر کافی وقت ضائع ہو جاتا لہٰذا میں نے اُسے روانگی کے پروگرام سے باخبر کرتے ہوئے کہا۔ "میں چھ بجے تمھیں لینے آؤں گا۔ تمارہنا، زیادہ سامان لادنے کی ضرورت نہیں۔"

وہ چند ثانیوں تک پُرخیال انداز میں میری طرف دیکھتی رہی، پھر آہستہ سے بولی۔ "میرا خیال ہے کہ یہ مناسب نہ ہوگا۔"

"کیا مناسب نہ ہوگا؟" میں نے چونک کر سوال کیا۔

"ہمارا یہاں سے ایک ساتھ روانہ ہونا۔" اس نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "میرا ٹکٹ مجھے دے دیں، میں براہِ راست ائرپورٹ پہنچ جاؤں گی۔ میدان صاف ہونے کا اطمینان کرنے کے بعد آپ مجھ سے آملیں۔"

اُس کی تجویز نہایت معقول تھی۔ روانگی سے پہلے میں شہر میں جتنا گھومتا، اُسی قدر میرے دیکھ لیے جانے کے خطرات پیدا ہو جاتے اور شاید کوئی میرے پیچھے بھی لگ لیتا۔ قاسم سے کچھ بعید

ں تھا کہ نجانے کس وقت وہ کیا حرکت کر بیٹھے لہٰذا میں فوری طور پر اِر کی رائے سے متفق ہو گیا اور ٹکٹ اُس کے حوالے کرکے وہاں ہ اُٹھ گیا۔

گھر پہنچا تو پتا چلا کہ سلطان شاہ اپنے کمرے میں گھسا ہوا ہے۔ بلا ضد میرے قدم اس کے کمرے کی طرف اٹھ گئے۔

کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا لیکن اندر کا منظر دیکھتے ہی میرے م ٹھٹک گئے۔ وہ ہلکی نیلی پتلون اور سفید قمیص پہنے قدِ آدم آئینے کے امنے کھڑا ٹائی باندھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آئینہ دروازے کے ابل ہونے کے بجائے بغلی دیوار کے ساتھ لگا ہوا تھا لہٰذا وہ میری سے باخبر نہ ہو سکا اور جسم کو بل دے دے کر انہماک کے ساتھ ٹائی گرہ لگانے کی کوشش کرتا رہا۔

مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ اپنی دانست میں کام پورا کے اُس نے بڑے اسٹائل سے دونوں سرے پکڑ کر ٹائی کی گرہ ست کرنے کی کوشش کی اور فوراً ہی بوکھلا گیا۔ صلیب کی اس ٹھ کا پھندا اس کے گلے میں تنگ ہو گیا تھا۔ اُس نے فوری طور پر ڈھیلی کرنے کی کوشش کی لیکن اس کی گھبراہٹ سے مجھے اُس ں کا اندازہ ہو گیا۔

وہ کسی سے مدد لینے کی نیّت سے باہر کی طرف دوڑ لگانے دے سے پلٹا تھا مگر کھلے ہوئے دروازے کے وسط میں تے ہی اس کے سُرخ چہرے پر بے بسی کے آثار پھیلتے چلے گئے۔ بانے پہلی بار دیکھا کہ ٹائی کا حلقہ اس کی گردن کے گرد اس گیا تھا کہ اس کے قرب و جوار کی رگیں پھول گئی تھیں، اور پر بھی دباؤ نظر آ رہا تھا۔

یہ پھنس گئی۔ ذرا اسے کھول دو، ورنہ قینچی سے کاٹ دوں بھرّائی ہوئی آواز میں بولا۔ "میرا تو دم گھٹنے لگا ہے۔"

تھیں مشورہ کس نے دیا تھا ٹائی لگانے کا؟" میں نے اُس کی ہتے ہوئے قہقہہ لگا کر سوال کیا۔

بس دُکان دار کی باتوں میں آکر دو خرید لی تھیں تو سوچا کہ بھی دیکھ لوں۔" اُس نے ٹھوڑی اُوپر اٹھاتے ہوئے سے کہا۔

س کی ٹائی میں کچھ عجیب طریقے سے دوہری گرہ لگی ہوئی تھی۔ سے کھولتے ہوئے ہنس کر کہا۔ "میں نے انگریز بننے کے لیے انتھا قمیص پتلون ٹائی کے بغیر بھی پہنی جا سکتی تھی۔"

س نے پھندے سے چھٹکارا ملتے ہی گلا سہلا کر ایک گہرا ا اور ٹائی گلے سے اتار کر ایک طرف پھینک دی۔ "کوا ہنس ہ چلنے کی کوشش میں اپنی چال بھی بھول جاتا ہے۔" وہ خفت ی کے ساتھ بولا۔ "جیتے جی گلے میں پھندا لگانا اپنے بس

سے باہر ہے۔"

"کسی کسی وقت تمہارے بارے میں مجھے اُلجھن ہونے لگتی ہے۔" میں نے بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے پُرخیال لہجے میں کہا۔

"وہ کیوں؟" وہ بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"تمہارے بارے میں میرا اندازہ تھا کہ تم دلیر، وفادار اور سادہ لوح آدمی ہو۔" میں نے اس کے چہرے کے بدلتے ہوئے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "لیکن تم میری توقع سے کہیں بڑھ کر چالاک اور محتاط ثابت ہو رہے ہو۔"

وہ ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے گہرا سانس لے کر ہنس پڑا۔

"تم نے تو جان ہی نکال دی تھی میری۔ میں سوچ میں پڑ گیا تھا کہ مجھ سے کیا خطا سرزد ہوئی ہے جو تم الجھنے لگے ہو۔ تم یہ نہ سمجھنا کہ میں دو وقت کی روٹی کی تلاش میں کراچی آکر علیمی خان کے پاس نوکری کر رہا تھا۔ روٹی کی طرف سے تو مجھے گاؤں میں بھی بے فکری تھی۔ بس مال بنانے کی دُھن میں کراچی کا رُخ کیا تھا۔ پہلے یہاں چھوٹی چھوٹی چوریاں کرکے گزرا کیا۔ پھر مقرب خان نے نوکری دلا دی۔ وہ میرے ہی گاؤں کا رہنے والا تھا اور وہاں خاصا عزت دار تھا لیکن اس نے مجھے اپنے دھندوں کی ہوا بھی نہ لگنے دی۔ خود اعتمادی میں کُتّے کی موت مارا گیا... جہاں تک ہوشیاری اور چالاکی کا تعلق ہے تو تم آزاد علاقوں کی زندگی سے لاعلم ہو۔ وہاں یہ صلاحیتیں پیدائشی ہوتی ہیں کیوں کہ ہم ساری عمر تقریباً حالتِ جنگ میں گزارتے ہیں... آپس کی دُشمنیاں نسل در نسل چلتی ہیں اور ایک جھگڑا نمٹنے سے پہلے دوسرے محاذ کھل جاتے ہیں... ذرا بھی چُوک ہو جائے تو بس موت ہی مقدر ہوتی ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ تھوڑی سی تربیت سے تم بہت کارآمد ثابت ہو سکو گے۔"

"وہ تو بعد کی بات ہے، ابھی تک تو تم نے مجھے اس قابل بھی نہیں سمجھا کہ اپنے کام کے بارے میں ہی... کچھ بتا دیتے، مگر میں بھاگنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ جو کہو گے آنکھیں بند کرکے کروں گا اور پھر ایک دن تم مجھ پر اعتماد کرنے پر مجبور ہو جاؤ گے۔" اس کا لہجہ پُراعتماد تھا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ شاید وہ وقت جلد ہی آ جائے گا۔"

"شاید تمھیں دل چسپی نہ ہو، لیکن میرے پاس ایک خبر ہے۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

"میں سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ "کیسی خبر؟"

"میں کپڑے لینے کے لیے صدر میں گھوم رہا تھا تو میں نے دلاور خان کو دیکھا تھا۔" وہ بتانے لگا۔ "لیکن وہ مجھے نہیں دیکھ

سکا۔ بہت سفاک اور بے رحم آدمی ہے۔ شہروں کی زندگی سے اُسے نفرت ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ وہ یہاں مقرب خان اور عقرب خان کے خون کا انتقام لینے آیا ہے۔"

"ان دونوں سے اس کا کیا تعلق ہے؟" میں نے تجسس آمیز لہجے میں کہا۔

"وہ ان کا ماموں ہے۔ میرے آنے تک جو خون کر چکا تھا اُسے اپنے بھانجوں کے قاتل کی بھنک بھی مل گئی تو اس کی ہڈیاں تک چبا ڈالے گا۔"

میرے ذہن میں فوراً ہی ایک تدبیر اُبھر آئی۔ "وہ کہاں ٹھہرا ہوا ہے؟"

سلطان شاہ نے بے پروائی سے شانے اُچکائے۔ "مجھے کیا معلوم، میں تو اس کی نگاہوں سے بچ کر نکل گیا تھا۔ بہت تُند خو اور بدمزاج آدمی ہے۔ گاؤں میں بھی لوگ اس سے بلا ضرورت بات نہیں کرتے۔" پھر چونک کر بولا۔ "تمھیں اس کی ذات سے اچانک کیوں دلچسپی پیدا ہو گئی؟"

"خطرناک صورت والا ہمارا حریف ہے۔" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ "اور وہی مقرب خان اور عقرب خان کا قاتل بھی ہے۔ اگر دلاور خان کو اس کے پیچھے لگا دیا جائے تو حساب برابر ہو جائے گا۔"

اُس نے بُرا سا منہ بنایا۔ "یہ بات تھی تو مجھ سے ہی کہا ہوتا، چڑیا کے بچے کی طرح کہیں بھی اُسے مسل دیتا... مجھ سے اس کا پیچھا کراتے رہے اور اب پکا پکایا شکار دلاور خان کی گود میں ڈالنے کی سوچ رہے ہو۔"

"اس معاملے میں میں اپنے کسی آدمی کو ملوث نہیں کرنا چاہتا۔" میں نے اُس کے طنزیہ لہجے کو نظر انداز کرتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ "بہرحال۔ اب تو ہمارے پاس وقت بھی نہیں ہے، واپسی پر دیکھا جائے گا، ہو سکتا ہے کہ دلاور خان خود ہی سراغ لگا کر اس تک پہنچ جائے۔"

"تو ہم جہاز ہی سے جائیں گے نا؟" روانگی کا ذکر آتے ہی فضائی سفر کے بارے میں اس کا شوق عود کر آیا۔

"ہاں۔ یہاں سے ہم الگ الگ روانہ ہوں گے۔" میں نے جیب سے ٹکٹ نکالتے ہوئے کہا۔ "یہ رہا تمھارا ٹکٹ لیکن یہ یاد رکھنا کہ کوئی گڑبڑ نہیں ہونا چاہیے۔ لاہور میں تمھیں مجھ سے الگ ہی رہنا ہو گا۔"

"تم فکر نہ کرو۔" وہ ٹکٹ کی ورق گردانی کرتے ہوئے مسرور لہجے میں بولا۔ "تمھیں مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہو گی، پتا نہیں تم سے پہلے ملاقات کیوں نہیں ہوئی میری؟"

میں ہنستا ہوا اُس کے کمرے سے نکل آیا۔

رخشی کی پناہ گاہ میرے علم میں آ چکی تھی اور مجھے یقین تھا کہ وہ میری واپسی تک پوری بے خوفی کے ساتھ وہیں مقیم رہے گی۔ قاسم یا سی۔ ون کے بارے میں سلطان شاہ کی اطلاع میرے لیے حیرت ناک ثابت ہوئی تھی۔ رخشی کو محفوظ ٹھکانا فراہم کرنے کے بعد سپر ہائی وے کے ذریعے اس کی روانگی سے میرے ذہن میں بس ایک ہی خیال جنم لے رہا تھا کہ اسے اے۔ ٹو نے بی۔ ون کے معاملے کی چھان بین پر نہ مامور کر دیا ہو۔

سی ون ابھی تک تنظیم میں اپنی اہمیت برقرار رکھنے میں کامیاب رہا تھا۔ جب کہ سکندر علی بُری طرح میری زد میں آ کر مارا گیا تھا اور اس کا منصب مجھے سونپ دیا گیا۔ اس کے بعد بی۔ ون کا نام سامنے آیا لیکن اس بے چارے کو زیادہ دنوں تک مجھ پر اپنی برتری جتانے کا موقع نہ مل سکا اور وہ اپنی ہی ایک حماقت کے ہاتھوں جہنم واصل ہو گیا۔ اس طرح میں براہِ راست اے۔ ٹو سے وابستہ ہو گیا تھا لیکن میں اس اعزاز کا اکلوتا مالک نہیں تھا سی۔ ون کو بھی براہِ راست اسی سے ہدایات مل رہی تھیں۔

اس وقت میرے لیے یہ کام بہت آسان تھا کہ رخشی کے معاملے میں سی۔ ون کی حکم عدولی بلکہ بغاوت کی اطلاع اے۔ ٹو تک پہنچا کر اس کا پتہ صاف کرا دوں کیوں کہ اے۔ ٹو نے سی۔ ون کو رخشی کو ہلاک کرنے کا حکم دیا تھا لیکن اس مردود نے اس کو چھپا کر اُس کی روپوشی کا افسانہ تراش لیا تھا۔ اگر میں اے۔ ٹو کو گلشن اقبال کے اس مکان کے پتے سے آگاہ کر دیتا جہاں قاسم نے رخشی کو رکھ چھوڑا تھا تو دنیا کی کوئی طاقت ان دونوں کو اے۔ ٹو کی انتقامی کارروائی سے نہیں بچا سکتی تھی۔ اس تنظیم کی رفاقت میں میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اُن کے نزدیک وقتی کاروباری مفادات سے زیادہ اہمیت ڈسپلن کی تھی اور محض اسی کڑے ڈسپلن کے باعث اتنے عرصے سے رازداری کے ساتھ منشیات فروشی کا کام چل رہا تھا۔

بظاہر سی۔ ون کے راہ سے ہٹ جانے سے مجھے فائدہ ہو سکتا تھا۔ اس جیسے پرانے اور قابلِ اعتماد کارکن سے ہاتھ دھونے کے بعد اے۔ ٹو لامحالہ مجھے زیادہ اختیارات سونپنے پر مجبور ہو جاتا۔ اگر سی۔ ون کی جگہ باہر سے کوئی دوسرا آدمی بھی بھیجا جاتا تو مقامی معاملات کو سمجھنے کے لیے اُسے میری مدد کی ضرورت ہوتی اور یوں میں مقامی سطح پر بلا شرکتِ غیرے اپنی باضابطہ بالادستی قائم کرنے میں کامیاب ہو جاتا لیکن میں فوری فائدے کے بجائے اصل آدمی کی نشان دہی کرنا چاہتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ لاہور پہنچنے کے بعد میں اس سمت میں کوئی بڑی کامیابی ضرور حاصل

ہوں گا۔ مختلف مدارج میں جس طرح اے۔ ٹو تک میری رسائی ہوئی تھی، اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ اے۔ ٹو کے اوپر والا ہی تنظیم کا اصل اور حقیقی سربراہ ہو گا اور اس کی گردن پر ہاتھ ڈالتے ہی نیچے سے اوپر تک تنظیم کا شیرازہ بکھر کر رہ جائے گا۔

لیکن پھر مجھے یونیسکو کے تحت ہونے والے کھلے اجلاس میں ...ی مندوب، آرتھر کی مدلل تقریر یاد آ گئی۔ اگر وہ سچا تھا تو اے۔ ٹو ...ں کے اوپر والوں پر ہاتھ ڈالنے میں کامیابی اتنی آسان نہیں ہوتی ...یں سمجھ رہا تھا اور پھر اگر منشیات کی اس غیر قانونی تجارت کے پشت واقعی کوئی غیر ملکی سازش کارفرما تھی تو مقامی مہروں کا ...یا کرنے کے باوجود اس تجارت کو روکنا ناممکن تھا۔ ایک دو ...ہ جاتے تو اُن کے غیر ملکی آقا معقول معاوضے پر دوسروں کو ...ی جگہ مامور کر دیتے، لہٰذا بہتر یہی تھا کہ عجلت کے بجائے تحمل ...کام لیا جاتا اور کسی بھی کارروائی سے پہلے اس کے مضمرات پر ...طرح غور کر لیا جاتا۔

میں ایئرپورٹ کے لیے روانگی تک اسی اُدھیڑبُن میں اُلجھا رہا۔ ...روانگی کے لیے مجھے کوئی خاص تیاری نہیں کرنا تھی۔ البتہ احتیاط ...ہ پر سکندر علی سے ملا ہوا وہ بریف کیس میں نے تیار کر لیا تھا جس ...ٹرونک قفل صرف میرے انگوٹھوں کے نشانات سے کھل سکتا ...ر اگر اس کے ساتھ زبردستی کی جاتی تو خودکار میکنزم کے ...وہ بریف کیس زبردست بارودی دھماکے کے ساتھ ...ونابود ہو جاتا۔

سلطان شاہ مقررہ وقت پر ٹیکسی کے ذریعے ایئرپورٹ ...کے ارادے سے نکلا تو میں نے اُسے روک لیا۔ وہ لاکھ ہوشیار ...لاک سہی لیکن اُسے ابھی تک اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ ہمارے ...کس قدر منظم لوگ ہیں۔

قاسم شہر سے باہر گیا ہوا تھا لیکن امکان تھا کہ اُس نے ...ہدایت سے انحراف کرتے ہوئے کسی کو میری نگرانی پر مامور ...کر دیا ہو۔ اگر میرے مکان کے قرب و جوار میں اس کا کوئی گرگا ...تھا تو میرے معمولات سے واقفیت کی جستجو میں وہ سلطان ...طرف بھی متوجہ ہو سکتا تھا اور وہ بے خبری میں اُسے اپنے پیچھے ...رٹ تک لے جاتا۔ ایسی صورت میں میری لاعلمی میں ایئرپورٹ ...ا کی نگرانی ہو سکتی تھی۔ لہٰذا بہتر یہی تھا کہ سلطان شاہ ...بلا چھوڑنے کے بجائے میں اپنے ساتھ ہی لے جاتا تاکہ پوری ...صورتحال میری نگاہ میں رہتی۔

گھر سے روانہ ہونے کے چند منٹ بعد ہی میرے شبہے کی ...تصدیق ہو گئی۔ دن میں میری نگرانی کی ضرورت نہیں سمجھی گئی تھی، ...اس وقت ایک سفید کار میرے تعاقب میں لگی ہوئی تھی جس

میں صرف ایک ہی آدمی نظر آ رہا تھا۔

"ہاتھ پیروں سے پوری طرح چاق و چوبند ہونا؟" میں نے عقب نما آئینے کا جائزہ لے کر مسکراتے ہوئے سلطان شاہ سے سوال کیا۔

"ہاں، لیکن کیوں؟" وہ میرے معنی خیز لہجے پر چونک گیا۔

"ایک سفید کار ہمارا پیچھا کر رہی ہے۔ میں اُسے گھیرنے کی کوئی تدبیر کرتا ہوں، جیسے ہی تمھیں اشارہ دوں، نیچے اُتر کر اُسے کار سے باہر گھسیٹ لینا... تمھاری دو چار ضربیں ہی اس کے اوسان خطا کرنے کے لیے کافی ہوں گی لیکن اس کی کار کی چابی پر قبضہ کرنا نہ بھولنا تاکہ وہ دوبارہ تعاقب جاری نہ رکھ سکے۔"

اس نے اضطراری طور پر سر گھما کر فوراً ہی سفید کار دیکھ لی جو تین گاڑیوں کے بعد ہمارے پیچھے چلی آ رہی تھی۔ "اس کے تو میں دانت توڑ دوں گا۔" وہ میرے خاموش ہونے پر جوشیلے لہجے میں بولا۔ "لیکن اسے تم گھیرو گے کیسے؟ ذرا بھی شبہ ہو گیا تو وہ دُم دبا کر بھاگ نکلے گا۔"

"بس دیکھتے جاؤ۔" میں نے پُرخیال لہجے میں کہا۔

ٹریفک سگنل سے طارق روڈ پر گھومنے کے بعد میں نے اپنی کار پٹرول پمپ میں گھما دی۔ تعاقب کرنے والے کے لیے میری وہ حرکت غیر متوقع تھی۔ لہٰذا جس وقت میں نے اپنی کار پٹرول پمپ پر روکی تو سفید کار آگے نکلتی چلی گئی تھی۔

"وہ آگے رُکا ہو گا۔ بس اب تم جاؤ۔" میں نے پمپ والے کو چابی دے کر سلطان شاہ سے کہا اور وہ ایک لفظ بھی کہے بغیر گاڑی سے اُتر کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا آگے روانہ ہو گیا۔

سلطان شاہ کو وقت دینے کی غرض سے میں نے پٹرول ڈلوانے کے بعد سروس بوائے سے انجن کا تیل اور ریڈی ایٹر میں پانی چیک کرایا۔ پھر پیسے ادا کر کے گاڑی کے ٹائروں میں ہوا چیک کرانے لگا۔

پنکچر لگانے والے کا لڑکا پہلے ٹائر کی ہوا دیکھ کر فارغ ہوا ہی تھا کہ اچانک طارق روڈ کی پُرسکون فٹ پاتھوں پر رواں ہجوم میں بھگدڑ اور سنسنی کے آثار پیدا ہو گئے۔ بیشتر لوگ اُسی طرف سر اُٹھا اُٹھا کر دیکھ رہے تھے جدھر سلطان شاہ سفید کار والے کی گردن ناپنے گیا تھا۔

میرے اعصاب پر تناؤ سوار ہونے لگا، اس وقت میرے لیے ایک ایک لمحہ قیمتی تھا، سلطان شاہ کو زیادہ دیر تک وہاں چھوڑنا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ وہ کارروائی کا آغاز کر چکا تھا اور اس مصروف علاقے میں پولیس ہر واردات میں فوری طور پر ملوث ہو جاتی تھی کیوں کہ وہاں گشت کے لیے سپاہیوں کی

خاصی تعداد مامور تھی۔

اگلے دو پہیوں کی ہوا چیک ہوتے ہی میں نے سروس بوائے کو ایک روپیہ تھمایا اور تیزی سے کار پمپ سے باہر لے آیا۔ سڑک پر آتے ہی بائیں طرف، تھوڑے فاصلے پر ایک ہجوم نظر آیا۔ سڑک اور فٹ پاتھ پر پھیلے ہوئے ہر فرد کی کوشش تھی کہ ہجوم کے وسط میں پہنچ سکے۔

کچھ تو سڑک گھر گئی تھی، کچھ کار نشینوں کو اس ہنگامے کے بارے میں تجسس تھا لہٰذا ٹریفک رینگتا ہوا آگے... بڑھ رہا تھا پھر اچانک ہی میرا دل باغ باغ ہو گیا کیوں کہ سلطان شاہ کسی عام تماشائی کی طرح بھیڑ سے یوں باہر نکلتا ہوا نظر آیا کہ کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔

میں نے دو مرتبہ لمبا ہارن بجایا۔ جواباً دوسری گاڑیوں سے بھی شور بلند ہونے لگا لیکن اس اثنا میں سلطان شاہ میری گاڑی دیکھ چکا تھا۔ وہ مسکراتا ہوا میری رینگتی ہوئی کار کی طرف آیا اور دروازہ کھول کر بے پروائی سے میرے پہلو والی نشست پر بیٹھ گیا۔

"کیا ہوا؟ بڑی آسانی سے لوٹ آئے؟" میں نے اشتیاق آمیز لہجے میں سوال کیا۔

اس نے مٹھی میں دبی ہوئی چابی میری گود میں ڈال دی اور ہنستے ہوئے بولا "اس کی تو ہڈیاں ہی سُرمہ ہو جائیں گی۔"

"اس کے ساتھ حرکت کیا کی تم نے؟" میں نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"بس گریبان پکڑ کر اسے باہر گھسیٹتے ہوئے میں نے اونچی آواز میں عورتوں سے پرس چھیننے پر ملامت کی تھی۔ آناً فاناً میں اس پر ہر طرف سے یلغار ہو گئی... شاید قرب و جوار کے دکان دار پیش پیش تھے۔ انھوں نے اسے سنبھالا اور میں چابی نکال کر کھسک آیا سچ پوچھو تو میں اسے ایک بھی بھرپور ضرب نہ لگا سکا۔"

میں دل ہی دل میں اس کی مکاری کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔

شاید یہ اتفاق ہی تھا کہ اس نے اپنے حریف پر کسی عورت سے پرس چھیننے کا الزام لگایا تھا لیکن یہ حقیقت تھی کہ ان دنوں طارق روڈ اور قرب و جوار کی گلیوں میں ایسے واقعات بکثرت ہو رہے تھے جن کی بنا پر اکیلی عورتیں اس علاقے میں خریداری سے گریز کرنے لگی تھیں اور شاید علاقے کے دکان دار بھی دھندا خراب ہونے پر ایسے اچکوں پر جھلائے ہوئے تھے جو اسکوٹر یا کار میں سوار ہونے کی وجہ سے کبھی گرفت میں نہیں آتے تھے۔ سلطان شاہ نے جوں ہی پرس چور کا شوشہ چھوڑا ہو گا، ہر ایک اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے اس کے شکار پر ٹوٹ پڑا ہو گا جو پیدل آنے والی آفت سے بے خبر پیٹرول پمپ سے میری کار کی روانگی کا منتظر تھا۔

مجھے خوشی تھی کہ سی۔ ون یا قاسم کے آدمیوں کو میرے ہاتھوں دوسری بار بھاری زک اٹھانا پڑی تھی لیکن اس بار میں لاہور روانگی کے باعث اس کی بے لبسی سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا تھا۔

سلطان شاہ نے اپنا رول اس خوش اسلوبی سے ادا کیا تھا کہ نہ اس کے جسم پر کہیں خراش آئی تھی، نہ لباس شکن آلود ہوا تھا۔ لہٰذا میں سیدھا ائیر پورٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔ سلطان شاہ کی دی ہوئی چابیاں میں نے راستے ہی میں جھاڑیوں میں اچھال دیں کیونکہ ہمارے لیے وہ بے مصرف تھیں۔

ان دنوں ائیر پورٹ پر پارکنگ کے باضابطہ طریقۂ کار کا نفاذ نہیں ہوا تھا۔ لہٰذا میں نے بے فکری سے اپنی گاڑی ایک درخت کے سائے میں پارک کی اور دروازے مقفل کر کے سلطان شاہ کے ہمراہ لاؤنج کی طرف چل دیا۔

سڑک عبور کرتے ہوئے ناگہاں میری نظر کرنل زوار زیدی پر پڑی تو میں بوکھلا گیا۔ الگ الگ روانگی کا پروگرام طے کرتے ہوئے میں یہ بھول ہی گیا تھا کہ غزالہ کو کوئی نہ کوئی ائیر پورٹ پر چھوڑنے ضرور آئے گا۔ اگر میں تنہا ہوتا تو شاید مجھے کوئی فکر نہ ہوتی لیکن سلطان شاہ کی موجودگی کے بارے میں غزالہ کے باپ کو مطمئن کرنا دشوار ہو جاتا۔

میں کرنل زوار زیدی سے بچ کر سلطان شاہ کو ہدایت دینے کے بارے میں سوچنے بھی نہ پایا تھا کہ اس نے مجھے دیکھ لیا اور بے تابانہ انداز میں ہاتھ ہلاتا ہوا بھیڑ سے نکل آیا۔ شاید غزالہ اندر جا چکی تھی اور وہ بے چارہ میری تلاش میں مسافروں کے ساتھ آنے والوں کی بھیڑ میں کسی کٹی ہوئی پتنگ کی طرح چکراتا پھر رہا تھا۔

اس نے بے تابانہ انداز میں فٹ پاتھ سے اتر کر سڑک کے کنارے ہی میرا استقبال کیا۔ "اکیلے چلے آ رہے ہو؟ سامان کہاں ہے تمہارا؟" اس نے استفسار کیا پھر اس کی نگاہیں میرے ساتھ کھڑے ہوئے سلطان شاہ پر مرکوز ہو گئیں۔ "یہ کون ہے تمہارے ساتھ؟"

میں ہنس پڑا۔ "یہ میرا پی۔ اے سلطان شاہ ہے، لاہور کا کوئی لمبا چوڑا پروگرام تو ہے نہیں لہٰذا ایک دو جوڑے بریف کیس ہی میں ڈال لیے ہیں۔"

"تو یہ سلطان شاہ بھی تمہارے ساتھ جہاز سے جائے گا؟"

کرنل کا ذہن اسی میں الجھ کر رہ گیا تھا۔

"ظاہر ہے۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

"چلو۔ تم آگے چلو۔" کرنل نے سلطان شاہ کو ٹوکا۔ "ہم بات ہے ہیں، یہاں تمہاری موجودگی ضروری نہیں۔" اس کا لہجہ آمیز تھا جیسے میراثی۔ اے ہونے کے باعث سلطان شاہ کا بھی غلام رہا ہو لیکن سلطان شاہ کی پیشانی پر شکن تک نہ دروہ تفہیمی انداز میں سر ہلا کر آگے بڑھ گیا۔

"یہ میرا بہت ہی قابلِ اعتماد مددگار ہے..." میں نے ان شاہ کی اہمیت ذہن نشین کرانے کی نیت سے بات لیکن کرنل نے بے پروائی کے انداز میں میری بات اڑا دی۔

"ہو گا... ضرور ہو گا... لیکن ہے تو وہ تمہارا ملازم ہی، وں کو اتنا منہ نہیں لگانا چاہیے۔ کیا ضرورت تھی اسے جہاز لے جانے کی؟ ریل سے بھیج دیتے... اس طرح ملازم سر ھ جاتے ہیں۔"

کرنل زوار زیدی نے جو کچھ کہا، میری ہمدردی ہی میں کہا تھا اس کی وہ کھلی مداخلت مجھے پسند نہیں آئی۔ پھر اصولی طور خادم و مخدوم کے اس روایتی نظریے کا سخت مخالف تھا جو غزالہ کے باپ کی کھوپڑی میں پوری جزئیات سمیت بری طرح ت نظر آ رہا تھا لہٰذا میں خاموش نہ رہ سکا۔

"اوّل تو یہ سر چڑھنے والوں میں سے نہیں ہے۔ پھر ریل سے تک یہ لاہور پہنچے گا، میں شاید واپسی کے بارے میں سوچ ں گا۔ ہر شخص اپنی ترجیحات کو خوب سمجھتا ہے۔"

"خیر۔ تمہاری مرضی ہے، میں نے تو بس ایک مشورہ دیا" وہ جلدی سے بولا۔ "دراصل میں نے دس برس فوج میں انگریز کری سے یہی سیکھا کہ حفظِ مراتب کو نظر انداز کرنے والا کبھی منتظم نہیں بن سکتا۔" پھر اس نے میرے چہرے کے تاثرات پ کر فوراً ہی موضوع بدل دیا۔ "غزالہ چیک ان ہو گئی ہے۔ میں بے چینی سے تمہارا منتظر تھا۔"

"آپ بے فکر رہیں، میں اسے دیکھ لوں گا۔" میں نے مسکراتے نرم لہجے میں کہا پھر چند فقروں کے تبادلے کے بعد میں اس سے مت ہو کر اندر روانہ ہو گیا۔

"یہ کون تھا؟" ہال میں پہنچنے کے بعد سلطان شاہ نے مجھ سوال کیا۔

"مجھے اندازہ ہے کہ اس کا رویّہ تمہارے لیے اذیت ناک لگا لیکن اب اسے بھول جاؤ، وہ مجھ سے علیحدگی میں بات نے کے لیے بے چین تھا۔ تمہیں میرے ساتھ دیکھ کر اس کا خراب ہو گیا تھا ورنہ وہ دل کا برا آدمی نہیں ہے۔" میں نے ان شاہ کے شانے پر ہاتھ مار کر کہا اور وہ بے چارا مسکرا ہ گیا۔

ہال مسافروں سے بھرا ہوا تھا لیکن غزالہ اس بھیڑ سے الگ تھلگ میرے انتظار میں کھڑی ہوئی تھی، مجھے دیکھتے ہی وہ تیزی سے میری طرف لپکی تھی۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن میرے ساتھ ایک اجنبی کی موجودگی کا احساس کرتے ہی کچھ کہے بغیر ہونٹ بند کر لیے۔

"یہ سلطان شاہ ہے، میرا دستِ راست سمجھ لو۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "لاہور میں تمہاری دیکھ بھال اسی کے ذمے ہو گی۔" پھر میں سلطان شاہ سے مخاطب ہو گیا۔ "یہ میری منگیتر، غزالہ ہے۔"

شاید سلطان شاہ کے لیے کسی خوب صورت لڑکی سے یوں متعارف ہونے کا وہ پہلا موقع تھا۔ لہٰذا وہ بے لبسی سے دانت نکال کر رہ گیا۔ اور غزالہ میرے قریب کھسک آئی۔

"آپ کو کافی دیر ہو گئی۔" اس نے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔ "مجھے تشویش ہونے لگی تھی۔"

"باتیں بعد میں ہوں گی، پہلے بورڈنگ کارڈ لے لوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور سلطان شاہ کو ساتھ لے کر کاؤنٹر کے سامنے لگی ہوئی قطار میں کھڑا ہو گیا۔

"باہر ملنے والا سسر تو نہیں تھا تمہارا؟" سلطان شاہ نے دھیمی آواز میں سوال کیا اور میں چونک پڑا۔

"تمھیں کیسے معلوم ہوا؟"

"بس اندازہ۔" وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بھرپور انداز میں مسکرایا۔ "پہاڑوں سے سمندر تک ویسے تو چار صوبے ہیں مگر بہت سی باتیں ہر جگہ مشترک ہیں، ہماری طرف بھی ہر شخص اپنے داماد کو دھونس میں لینے پر تلا رہتا ہے۔"

"تم احمق ہو... وہ مجھے دھونس میں نہیں لے رہا تھا، بس ذرا جھلّایا ہوا تھا۔"

وہ اس موضوع پر بلاوجہ مجھ سے الجھنے لگا اور میں بھی وقت گزاری کے لیے اس کی گفتگو میں دلچسپی لینے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ بعض علاقوں میں شادی کے لیے خطیر رقم لڑکیوں کے والدین کو ادا کی جاتی تھی اور بڑے شہروں میں لوگ پیسے کے بل پر اچھے داماد خریدنے کی فکر میں رہتے تھے لیکن دامادوں کے ساتھ ہر سسر کا رویّہ ایک ہی ہوتا ہے، خواہ وہ زر خرید ہو یا خریدار۔

کاؤنٹر پر باری آنے پر ہی وہ موضوع ختم ہو سکا۔ بورڈنگ کارڈ لینے کے بعد ہم تینوں سیکیورٹی کے مرحلے سے فارغ ہوئے اور پھر لاؤنج کی طرف جانے والی راہداری میں داخل ہو گئے۔

"اسے ساتھ لینا تو ہمارے پروگرام میں شامل نہیں تھا۔"

عزالہ نے پُرتجسس لہجے میں پوچھا۔

"قابلِ اعتماد آدمی ہے۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا "ضرورت پیش آئی تو تمہارے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دے گا۔"

"لیکن وہاں ایسی نوبت ہی کیوں آئے گی؟"

"حالات بدلتے دیر نہیں لگتی۔ جب ہم جا ہی رہے ہیں تو کیوں نہ پوری تیاری کے ساتھ جائیں اور کچھ نہیں تو سلطان شاہ کم از کم تمہاری ہی دیکھ بھال کرتا رہے گا۔"

عزالہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تیر گئی۔ "تو یوں کہیے کہ اُسے میرے محافظ کے طور پر ساتھ لیا ہے لیکن آپ دیکھ لیں گے کہ کوئی بُرا وقت آیا تو میں اپنا دفاع خود ہی کر لوں گی اور وہ تماشا دیکھتا رہ جائے گا۔"

میں سر ہلا کر رہ گیا۔

وسیع و عریض کیبن کی فضا میں طیارے کے جیٹ انجنوں کا شور ایک دھیمے تسلسل کے ساتھ گونج رہا تھا۔ تقریباً ساری ہی نشستوں پر مسافر موجود تھے لیکن ہر ایک اپنے ہی خول میں مگن تھا۔ مجھے اور سلطان شاہ کو کھڑکی سے متصل نشستیں ملی تھیں۔ جب کہ عزالہ درمیانی حصے میں ہم سے خاصی دور بیٹھی تھی۔ طیارہ فضا میں بلند ہونے کے بعد جب حفاظتی بیلٹ باندھے رکھنے سے متعلق روشن ہدایات معدوم ہو گئیں تو میں نے سلطان شاہ کو آگے بھیج کر عزالہ کو اپنے ساتھ والی نشست پر بلا لیا تھا تاکہ لاہور میں اُترنے کے بعد کے پروگرام پر گفتگو ہو سکے۔

جب تک میں کراچی میں رہا، لاہور کا پروگرام بناتے ہوئے کسی بھی لمحے میری طبیعت میں کوئی جذباتی اُبال نہیں آیا لیکن طیارہ فضا میں بلند ہوتے ہی مجھے لاہور کی سرزمین سے اپنے بچپن اور لڑکپن کے جذباتی رشتے یاد آنے لگے۔

لاہور کی سرزمین پر میں نے اپنی اس بدنصیب ماں کی کوکھ سے جنم لیا تھا جو زیادہ دن تک اپنے سہاگ کی خوشیاں نہ منا سکی اور میں بچپن ہی میں یتیم ہو گیا۔ بڑی ماں جو میرے والد صاحب کی پہلی بیوی تھیں، بہت تُند خو اور تحکم پسند تھیں۔ ان کی میری ماں سے کبھی نہ بن سکی۔ دوسری طرف شاید ان ہی کی شہ پر میرے دونوں سوتیلے بھائی بھی میرے ساتھ تحقیر آمیز سلوک کرتے تھے۔ والد صاحب کی وفات کے بعد ہم دونوں کچھ ہی دن اس چھت کے نیچے رہ سکے اور پھر ہمیں خانماں برباد کر دیا گیا۔

ماں۔ میرے وجود کی گہرائیوں سے ایک دردناک چیخ اُبھری جو لبوں تک پہنچنے سے پہلے ہی دم توڑ گئی۔ کس قدر قربانیاں دی تھیں میری ماں نے میرے لیے؟ کتنی آرزوؤں کے ساتھ مجھے تعلیم کے زیور سے آراستہ کر رہی تھی وہ؟ سہاگ سے محرومی کے بعد اس کے مستقبل کی ہر اُمید کا محور محض میری ذات بن کر رہ گئی تھی لیکن میں خود کو ماں کی اُمیدوں کا اہل ثابت نہ کر سکا۔

گمبھیر گھریلو فضا میں، میرے ذہن میں بچپن کی معصومانہ سوچ کبھی پیدا نہ ہو سکی۔ میں اپنے گرد و پیش میں یہی دیکھتا تھا کہ ہر گھرانے میں کفالت کی ذمّے داری مردوں کے شانوں پر تھی۔ عورتیں محض گھریلو ذمّے داریاں پوری کرتی تھیں جب کہ میری ماں گھر سنبھالنے کے ساتھ کمانے پر بھی مجبور تھی کیونکہ میں کسی قابل نہیں تھا۔

پھر ایک اچھے جذبے کے تحت میرا ذہن غلط راستے پر بھٹک گیا، پہلی بار ماں نے مجھے بے دردی سے پیٹا پھر خود بھی بلک بلک کر روئی مگر میرے ذہن میں کمانے کا تصور پختہ ہو چکا تھا اس میں جائز اور ناجائز کی کوئی تمیز نہیں تھی۔

میری اس روش کا انجام وہی ہوا جو ہونا تھا۔ میں پولیس کی گرفت میں آیا تو ماں کے سارے سہانے سپنے ریت کے خیالی گھروندوں کی طرح بکھر گئے۔ وہ میرے لیے زندہ تھی اور میں نے زندہ رہنے کے لیے تباہی کے راستے کو اپنا لیا تھا۔ پھر دم بے چاری اپنی اس بھیانک شکست پر کس طرح سے زندہ رہتی؟

ماں نے خودکشی کر لی۔

بڑی ماں نے مجھے پناہ دینے سے انکار کر دیا۔

لاہور میرے لیے اجنبی ہو گیا اور میں نے سبزے کی گود میں بسے ہوئے اس سوندھے سہانے شہر کو چھوڑ کر کراچی کا رُخ کر لیا جہاں ہر طرف مشینوں کا راج تھا اور انسان بھی محض پیسہ بنانے کی مشین نظر آتے تھے۔ اس شہر میں سب ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے۔ قریے قریے سے آئے ہوئے اس شہر کے باسیوں میں آپس کی کوئی شناخت باقی نہیں رہی تھی۔ بس پیسہ ہی ایک حقیقت بن کر رہ گیا تھا۔ نہ کوئی کسی کو نسب سے جانتا تھا۔ نہ ذات سے پہچانتا تھا۔ تن پر اُجلے کپڑے سجائے، چار پہیوں پر سوار، اونچے اور وسیع مکانوں کے مکین اس شہر میں ہر اعتبار سے معزز سمجھے جاتے تھے۔

میرے لیے وہ صورتِ حال زرخیز تھی... میں نے کراچی میں قدم رکھتے ہی گناہوں کی فصل کی آبیاری شروع کر دی اور اس کام میں کبھی دال روٹی کا گھاٹا محسوس نہیں کیا۔ قانون کی دسترس سے دور رہتے ہوئے میں نے اپنا سفر جاری رکھا، پھر بی۔ فور کے ایک معمولی کارندے کی حیثیت سے دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹنے لگا۔

اور اس وقت میں بذاتِ خود بی۔ فور تھا۔

آبرو کی نقاب کے طور پر میں شہر میں ایک فیکٹری کا مالک تھا، لاکھوں کی ریل پیل تھی اور دوسری طرف میں شہر میں ہیروئن کی تقسیم اور فروخت کا ذمّے دار تھا۔ معاشرے میں خفیہ طریقے

نشیات کا زہر پھیلانے میں مصروف تھا جس نے نہ جانے کتنی
لاؤں کے بھائیوں کے دماغ اُلٹ دیے تھے۔

کچھ عرصے پہلے تک میں نشے کی سوداگری کرتے ہوئے اسے
برا نہیں سمجھتا تھا لیکن اب میری سوچ میں انقلاب آ چکا تھا۔
اپنی بقا کی جنگ سے صحیح سلامت گزر چکا تھا جس میں سب
جائز تھا۔ اب مجھے حق اور ناحق میں تمیز محسوس ہونے لگی تھی پھر
یلت کے اس وسیع سیلاب کا مخرج سرحد پار نظر آنے لگا تھا۔
وص مفادات کے حصول کے لیے لوگوں کو دانستہ اس منفعت
ں اور مہلک کاروبار پر مجبور کیا جا رہا تھا اور میں اس مہم کا ایک
بننے کے لیے تیار نہیں تھا۔

پہلے میں لاہور سے نکلا تو مجھے بدی کی تلاش تھی، کمانے کی
ان راہوں کی جستجو تھی اور اب اسی بُرائی کی بیخ کنی کے
یں پی آئی اے کے دیو پیکر طیارے میں لمحہ بہ لمحہ لاہور سے
ب تر ہوتا جا رہا تھا۔

وقت ہر درد کا بہترین درماں ہوتا ہے۔ اس کا صحیح
وم مجھے اسی وقت معلوم ہوا۔ برسوں پہلے، جب بڑی ماں
سوتیلے بھائیوں کے مظالم تازہ تھے تو میرے دل میں ان تک
کے لیے کوئی نرم گوشہ نہیں تھا لیکن اس وقت میں عزالہ کے
تھ بیٹھا کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔

بڑی ماں لاکھ بُری اور تند خو سہی لیکن میری ماں تھیں۔ سگی
کو کھو دینے کے بعد میرے لیے وہ سوتیلا رشتہ بھی محترم ہو
تھا۔ پھر جس طرح وقت نے میری سوچ کا دھارا موڑ دیا
۔ مجھے یقین تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑی ماں
بھی اپنی زیادتیوں پر پشیمانی کا احساس ہونے لگا ہو گا شاید
ی کبھی انھیں بھی اپنی سوکن اور اپنے سوتیلے بیٹے کی یاد
ستاتی ہو۔

میں نے فیصلہ کر لیا کہ لاہور میں اُترنے کے بعد میں عزالہ
سلطان شاہ کی حفاظت میں کسی اچھے ہوٹل میں ٹھہراؤں گا
خود بڑی ماں کی قدم بوسی کے لیے حاضری دوں گا۔ اگر انہوں نے
ھ کر گلے سے لگا لیا تو ماضی کی تلخ یادوں کو فراموش کر کے ان
کے گھر رہوں گا۔ ٹھکرا دیا تو کم از کم میرے دل میں کوئی خلش باقی
نہ رہے گی۔

"کس سوچ میں ڈوب گئے آپ؟" عزالہ کی دھیمی، ترنم ریز آواز
نے مجھے چونکا دیا۔

"لاہور پہنچنے کے بعد ہماری حکمتِ عملی کیا ہونا چاہیے؟" میں
نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پُرخیال لہجے میں سوال کیا۔

"ہمارا مقصد ایک ہی ہے لیکن محاذ مختلف ہیں۔" اس نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

"میں سمجھا نہیں۔" میں نے اُلجھن آمیز لہجے میں کہا۔

"مجھے سنڈیکیٹ کی سرگرمیوں کے بارے میں کھوج لگانا ہے اور آپ کو لے۔ ٹو کا سراغ لگانا ہے۔" وہ تقریباً سرگوشیانہ لہجے میں بولی۔ "ہمیں الگ الگ رہ کر کام کرنا ہو گا تاکہ کسی ایک کی وجہ سے دوسرے کے کام میں رکاوٹ پیدا نہ ہو، ویسے بھی ہم الگ رہ کر ایک دوسرے کے لیے زیادہ مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔"

"سطحِ سمندر سے پینتیس ہزار فٹ کی بلندی پر تمہاری عقل خوب کام کر رہی ہے۔" میں نے کہا۔ "سچی بات تو یہ ہے کہ اس وقت میں بھی ان ہی خطوط پر سوچ رہا تھا۔"

"لیکن مشکل یہ ہے کہ میں پہلی مرتبہ لاہور آئی ہوں۔" وہ بولی۔ "ایسا نہ ہو کہ اجنبیت کی وجہ سے کسی ناگہانی دشواری سے دوچار ہو جاؤں۔"

"اس کا کوئی حل سوچ لیا جائے گا۔ فی الحال تم ایئرپورٹ سے سیدھی ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل جاؤ گی۔ سلطان شاہ بھی وہیں الگ کمرے میں تمہارے قریب رہے گا۔ باقی پروگرام بعد میں طے کریں گے۔"

"اور آپ کہاں ٹھہریں گے؟" اس نے بھویں چڑھا کر سوال کیا۔

"اب لاہور آ ہی گیا ہوں تو بڑی ماں سے ملنے کی کوشش کروں گا... ان کی ممتا کو جوش آ گیا تو ان ہی کے ساتھ ٹھہروں گا ورنہ کسی ہوٹل کی راہ لوں گا۔"

"مجھے خوشی ہے کہ آپ ماضی کی تلخیوں کو بھول کر ایسا سوچ رہے ہیں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "میں ہمت نہیں کر پا رہی تھی کہ آپ سے آپ کی سوتیلی ماں اور بھائیوں کا ذکر چھیڑوں۔ خون کے رشتے اٹوٹ ہوتے ہیں، وہ آپ کو دیکھ کر خوش ہو جائیں گی۔"

میں بے اختیار مسکرا دیا۔ ہم دونوں کے حالات میں بڑی حد تک یکسانیت پائی جاتی تھی۔

چند ہی روز پہلے کی بات تھی کہ وہ اپنی ماں سے سخت برہم تھی اور میں اسے اس کی ماں کے خلوص کے بارے میں سمجھا رہا تھا اور اِس وقت وہ مجھے اٹوٹ رشتوں کا فلسفہ سمجھا رہی تھی۔

"کیا میں نے کوئی احمقانہ بات کہہ دی ہے؟" اس نے میرے لبوں پر مسکراہٹ تیرتی دیکھ کر سوال کیا

"نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔" میں نے اُسے ٹالنا چاہا۔

"پھر آپ میری بات پر ہنس کیوں رہے تھے؟" اس کا لہجہ اشتباہ آمیز تھا۔

"سوچ رہا تھا کہ کہیں تمہاری لاہور تک کی بھاگ دوڑ بے سود ہی ثابت نہ ہو۔" میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

"وہ کیوں؟" اس نے چونک کر سوال کیا۔

"ضروری تو نہیں کہ ایشین سنڈیکیٹ میں کوئی اسامی ضرور خالی ہو۔ جگہ خالی بھی ہوئی تو لازمی نہیں کہ وہ لوگ تمہیں منتخب کر ہی لیں، ایسی صورت میں بھلا تم کیا کر سکو گی؟"

"کوئی نہ کوئی راستہ تو نکالنا ہی ہوگا، میرے ذہن میں علاوہ تین متبادل صورتیں ہیں، کوئی نہ کوئی تو کارگر ہو ہی جائے گی۔ آپ میری فکر نہ کریں، ایسا نہ ہو کہ میری اُلجھن میں آپ کا اپنا کام ادھورا رہ جائے۔"

کام کا ادھورا رہنا یا نہ رہنا تو آنے والے حالات پر منحصر تھا لیکن اس وقت طیارے کے کیبن کی راہداریوں میں ٹرالیاں گردش میں آنے کے سبب ہماری گفتگو مزید ادھوری رہ گئی۔

نئے دور کی آسائشوں میں یہ بھی ایک بڑی سہولت ہے کہ دیو ہیکل طیارے سیکڑوں مسافروں کو اپنے خول میں سمیٹ کر دنوں کے فاصلے گھنٹوں میں طے کر لیتے ہیں۔ تھوڑی سی گفتگو کے بعد مشروبات سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ طیارے کے پیجنگ سسٹم پر لاہور پہنچنے کا اعلان گونجنے لگا۔

میرے اشارے پر غزالہ اپنی جگہ واپس چلی گئی اور سلطان شاہ میرے پہلو میں اپنی نشست پر آ کر حفاظتی بیلٹ باندھنے لگا۔ پہلے فضائی سفر کے خوشگوار تجربے کا دبا دبا سا جوش اس کے چہرے کے ہر نقش سے پھوٹ رہا تھا اور لبوں پر ہلکی سی معنی خیز مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔

"بہت خوش نظر آ رہے ہو؟" میں نے آہستگی سے اُسے چھیڑا۔

"اب تو تمہاری خوشی میں میری خوشی ہے۔" اس نے برجستہ جواب دیا۔ "تمہارا انتخاب واقعی لاجواب ہے، بھابی اچھے اخلاق والی معلوم ہوتی ہیں۔"

"لاہور میں تم اُسی کے قریب ایک کمرے میں رہو گے۔ اس کی نگہداشت تمہارے ذمے ہوگی۔" میں نے اُسے آگاہ کیا۔

"کیوں؟" وہ حیران سا نظر آنے لگا۔

"میں الگ رہوں گا۔ تمہیں ساتھ لانے کا اصل مقصد بھی یہی تھا۔"

"لیکن میرا تو خیال تھا کہ ہم کسی خطرناک مہم پر نکلے ہیں۔" اس کی حیرت میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔

"تمہارا خیال درست ہے۔ اسی وجہ سے غزالہ کی حفاظت ضروری ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"لیکن بھابی کو ساتھ لانے کی کیا ضرورت تھی؟" وہ اُلجھن آمیز لہجے میں بولا۔ "اس طرح تو ہماری توجہ بٹی رہے گی اور شاید ہم پوری یکسوئی کے ساتھ اپنا کام بھی سرانجام نہ دے سکیں۔"

"وہ اپنا کام کرے گی، میں اپنا کام کروں گا۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "دراصل وہ یہ مقصد میرے ساتھ نہیں آئی ہے بلکہ وہ خود اپنی دیکھ بھال کر سکتی ہے لیکن مزید احتیاط کے طور پر میں تمہیں بھی لے آیا ہوں۔"

اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "اوہ، تو بھابی بھی اس مہم میں ہمارا ساتھ دے گی۔"

"ہم کسی سے زور آزمائی یا آتشیں ہتھیاروں کی جنگ کرنے نہیں آئے ہیں۔" میں نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "یہ عقل کی لڑائی ہے۔ اس میں کامیابی ہو گئی تو پھر شاید خالص مردانہ جنگ ہو گی۔"

اس کی آنکھوں میں ہلکا سا جوش عود کر آیا۔ "اُس وقت تم دیکھنا کہ سلطان شاہ کس قدر کارآمد آدمی ہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ جھلا کر دونوں ہتھیلیوں سے اپنے کان رگڑنے لگا۔

"کان بند ہو رہے ہیں؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟" میری قیاس آرائی پر وہ حیران رہ گیا۔

"جہاز میں عموماً ایسا ہوتا رہتا ہے، چیونگم کھانے کے انداز میں جبڑے چلاتے رہو گے تو کان کھلے رہیں گے۔"

اور وہ فوراً آہستہ آہستہ جبڑے چلانے لگا جیسے کسی مرغ کی ٹانگ چبا رہا ہو۔

تھوڑی دیر بعد جہاز لینڈ کر گیا۔ اگر غزالہ کے ساتھ ایک سوٹ کیس نہ ہوتا تو ہم فوراً باہر نکل گئے ہوتے۔ وہ انتظار میرے لیے خاصا صبر آزما تھا کیوں کہ دس منٹ بعد سامان کی پہلی کھیپ آنے کے بعد وقفہ طویل ہونے لگا۔ مسافروں کی بھیڑ میں ہر شخص گردن اٹھا اٹھا کر سامان لانے والی ٹرالی کو دیکھنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ چند منٹ بعد پتا چلا کہ ایک پورٹر اپنے سپروائزر سے تیزی دکھانے کا حکم ملنے پر چراغ پا ہو گیا تھا جس کے نتیجے میں مسافروں کے اسباب کو چھوڑ چھاڑ کر اس کے ساتھیوں نے رن وے پر ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا... خدا خدا کر کے کافی دیر بعد وہ ہنگامہ فرو ہوا اور اعلیٰ افسران کی مداخلت پر سامان کی آمد شروع ہو گئی۔

باہر نکلنے کے بعد ہم تینوں ایک ٹیکسی میں ایک بڑے ہوٹل کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہاں تیسری منزل پر ایک دوسرے سے متصل دو کمرے بآسانی خالی مل گئے۔ میں غزالہ اور سلطان شاہ کو ان کے کمروں میں پہنچا کر وہاں سے لوٹ آیا۔

ٹیکسی میں اپنے آبائی محلّے کی طرف جاتے ہوئے میں ناقابلِ بیان ہیجان میں مبتلا ہونے لگا۔ میرے ذہن میں اس گلی کا ایک ...شہ گھومنے لگا جس میں میں نے اپنے بچپن کا کچھ حصہ نہایت ...وں کے ساتھ گزارا تھا۔ میں اسی گلی میں باپ کے سائے ...م ہو کر سوتیلے بھائیوں کے رحم و کرم پر رہ گیا تھا۔ وہ وقت ... تھا۔ اس کے بعد بھی ایک طویل مدت گزر چکی تھی، مجھے اُمید ...وقت کے خاموش دھارے نے سوتیلے بھائیوں کے دلوں ...ر نفرت کی آگ کو سرد کر دیا ہوگا اور جب طویل مدت ... مجھے اچانک اپنے روبرو پائیں گے تو خون کا جوش ہر ... پر حاوی ہو جائے گا اور وہ بے اختیار مجھے اپنے گلے سے ... گے۔

ٹیکسی میرے بتائے ہوئے راستوں پر بڑھتی رہی، کھلی ...ں کے بعد قدرے تنگ اور پُرپیچ راستوں کی باری آئی تو ...ری توجہ سے ڈرائیور کی راہنمائی کرنا پڑی لیکن اس نے ایک ...ی روک دی تو میں چونک پڑا۔

"...رک کیوں گئے؟ گلی میں تھوڑی ہی دور چلنا ہے۔" میں نے ...کو ٹوکا۔

"گاڑی آگے نہیں جا سکتی باؤ جی!" ڈرائیور نے میری طرف ...گھما کر بے بسی سے دیکھا۔ "آگے کافی چوڑی کھلی ہوئی نالی ...تہ بند کیا ہوا ہے۔"

بیس بائیس برس کی پہاڑ جیسی مدت گزر گئی تھی لیکن گلی کے ...پر وہ کھلی نالی جوں کی توں موجود تھی۔ پہلے بھی اس نالی کی ...ے کوئی سواری گلی میں داخل نہیں ہو پاتی تھی۔ اس زمانے ...یدے پہلوان کے بیٹے کے پاس محلّے کی اکلوتی موٹر سائیکل ...ی تھی جسے لے جانے کے لیے اس نے نالی کے ایک ... پر تختہ رکھ کر مٹی اور گارے میں دبا دیا تھا۔ اس طویل مدت ...ا سطح پر نجانے کتنی بار نمائندے چُنے گئے تھے، لیکن وہ ...نالی جوں کی توں موجود تھی۔ شاید اس لیے کہ اس گلی کے ...ت زدہ مکینوں میں کوئی بھی اس قابل نہیں ہو سکا تھا کہ ...یدی ہوئی کار کو گھر کے دروازے پر کھڑا کرنے کا ارمان ...کے۔

...میں کرایہ ادا کر کے اُترا اور گلی کی طرف بڑھتے ہوئے غیر ارادی ... بائیں سرے پر نگاہ ڈالی تو دھندلائی ہوئی روشنی میں نالی ...ا شیدے پہلوان کے بیٹے کا تختہ تک جوں کا توں نظر آیا۔ ...محلّے کی غلاظت کو سمیٹ کر قریبی نالے میں دفن کرنے والی ...اس قدر متعفن تھی کہ دیمک نے بھی اس تختے کا رُخ کرنے کی ...نہیں کی تھی۔

اندر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ایستادہ اسٹریٹ لیمپس کی ناکافی روشنی میں گلی میں خاصی رونق تھی۔ بچوں کی بھاگ دوڑ اور چیخ پکار میں بڑوں کے ہیولے بھی نظر آ رہے تھے۔ میں ماضی کے دُھندلکوں میں ڈوبا ہوا گلی میں آگے بڑھتا رہا، میری سحرزدہ نگاہیں چہروں کا طواف کر رہی تھیں لیکن وہاں چھوٹے سے بڑے تک، ہر چہرہ میرے لیے اجنبی تھا۔ البتہ گلی اور اس کے مکانات شناسا تھے۔ ان میں رنگ و روغن کا فرق آ گیا تھا یا پھر بعض در و بام سے بوسیدگی کے آثار ظاہر ہونے لگے تھے۔ اس کے سوا سب کچھ وہی تھا جو میں نے برسوں پہلے آخری بار دیکھا تھا۔

مشینی انداز میں میرے قدم اُٹھتے رہے اور پھر میں اس بند چوبی دروازے کے سامنے ٹھہر گیا جس پر ٹاٹ کا پردہ جھول رہا تھا۔

پہلے میرے دل میں خیال آیا کہ اچانک ہی دروازہ کھول کر اندر چلا جاؤں اور بڑی ماں کو حیران کر دوں لیکن مجھے اپنے اس خیال پر زیادہ غور کرنے کی مہلت نہیں مل سکی۔ ایک اجنبی کو دروازے کے سامنے رُکا ہوا دیکھ کر قریبی چبوترے سے ایک کڑیل نوجوان تیر کی طرح میری طرف آیا تھا۔

"کیا بات ہے؟ کس سے ملنا ہے؟" اس نے کڑے تیوروں سے میرے سراپا کا جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا۔

اپنے آبائی محلّے میں اپنے ہی گھر کے سامنے وہ بازپُرس مجھے کچھ پسند نہ آئی اور میں نے اُسے گھورتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا۔

"جس سے ملنا ہے، اُسے خود تلاش کر لوں گا، تمہیں مشغلچی بننے کی ضرورت نہیں۔"

اس نے غراتے ہوئے بلا تامل میرے گریبان پر ہاتھ ڈالنا چاہا لیکن اُسی لمحے میرا بایاں ہاتھ تیزی کے ساتھ گردش میں آیا اور وہ بے خبری میں کنپٹی پر گھونسا کھا کر لڑکھڑاتا ہوا زمین پر گر گیا۔

شاید چبوترے پر بیٹھے ہوئے لڑکوں کی ٹولی اسی طرف متوجہ تھی کیوں کہ میرے حریف کے گرتے ہی گلی میں شور ہو گیا اور پھر ہم دونوں کے دوبارہ صف آرا ہونے سے قبل ہمارے گرد بھیڑ جمع ہو گئی۔ مجھ سے مار کھانے والا کئی لوگوں کی گرفت میں تھا اور مغلظات بکتے ہوئے بار بار میری طرف جھپٹنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ اس اثنا میں شور و غل کے نتیجے میں گلی کے بہت سے مکانوں کے دروازے کھل گئے تھے۔

ٹاٹ کے بوسیدہ پردے کے پیچھے بھی دروازہ وا ہو۔ میری نگاہیں مسلسل اسی طرف مرکوز تھیں، پردہ ہلا اور لمحہ بھر کے لیے میری آنکھیں خیرہ ہو گئیں، برجستہ میرے ذہن میں ٹاٹ اور مخمل کی مثال اُبھری تھی کیوں کہ بڑی بڑی وحشت زدہ آنکھوں

سے سجا ہوا وہ حسین اور مخملی چہرہ کسی بھی دل میں آگ لگانے کے لیے کافی تھا۔

نجانے وہ کون تھی؟ بڑی ماں کے گھر میں کیا کر رہی تھی؟ پھر مجھے خیال آیا کہ کہیں وہ بڑی ماں کی بہو یعنی میری بھاوج نہ رہی ہو۔ بہرحال وہ جو بھی تھی، اس محلے کی تھی اور شاید اُسی کے حسنِ فتنہ خیز کے باعث گلی کے لڑکے اس چوکھٹ کی رضاکارانہ دربانی پر تُلے رہتے تھے۔ میں کسی اور دروازے کے سامنے رُکا ہوتا تو شاید کوئی مجھ سے کسی قسم کا تعرض نہ کرتا۔

وہ گھبرایا ہوا حسین و جوان چہرہ ایک جھلک دکھا کر بند دروازے کے پیچھے روپوش ہوا تو مجھے اچانک ہی اپنی خطرناک پوزیشن کا احساس ہوا۔

وہ لاکھ میرا آبائی گھر سہی مگر اس وقت میں محلے میں اجنبی تھا۔ اگر لوگوں کے اس غول کو میری نیّت پر ذرا بھی شبہ ہو جاتا تو بڑی مشکلات سے دوچار ہو سکتا تھا، لہٰذا میں نے فوراً ہی بولنا شروع کر دیا۔

"میں منشی اقبال مرحوم کا بیٹا ہوں ... یہ ہمارا آبائی گھر ہے ... میں اپنی بڑی ماں سے ملنے آیا تھا کہ یہ بلاوجہ مجھ سے اُلجھ پڑا۔" میں نے مجمع میں کسی کو مخاطب کیے بغیر اُونچی آواز میں کہا۔

"جھوٹا ہے یہ ......" میرا حریف غصیلے لہجے میں دہاڑا۔

"یہاں کون چھوٹی بڑی ماں رہتی ہے؟" کسی نے مضحکانہ لہجے میں دوسروں سے سوال کیا۔

"ضرور نازو کے گھر میں تاک جھانک کرنے آیا ہوگا..." کسی اور نے رائے زنی کی۔

لیکن اس سے قبل کہ ایسے تبصرے مجمعے کو مشتعل کرتے، اچانک ایک بھاری آواز نے سب کی توجّہ اپنی طرف مبذول کرالی۔ "ٹھہرو، مجھے بات کرنے دو اس سے۔"

میری نگاہیں اُسی طرف اُٹھ گئیں۔ ایک سفید ریش لیکن صحتمند شخص بھیڑ میں راستہ بناتا ہوا میری طرف بڑھ رہا تھا۔

"کون ہو تم؟" اس شخص نے میرے مقابل رُک کر عقابی نگاہیں میرے چہرے پر مرکوز کرتے ہوئے سوال کیا۔ "نام کیا ہے تمھارا؟"

"میں منشی اقبال مرحوم کا بیٹا ہوں، میرا نام تنویر ہے۔" میں نے پُراُمید لہجے میں جلدی سے جواب دیا۔

"تنویر؟" سفید ریش شخص نے پُرخیال، دھیمے لہجے میں دُہرایا جیسے مجھے شناخت کرنے کے لیے اپنے ذہن پر زور دے رہا ہو اور اس کی شکن آلود پیشانی کے نیچے دمکتی ہوئی آنکھوں کو میں نے اچانک ہی پہچان لیا۔

"ہاں۔ میں تنویر ہوں رمضان چاچا!" میں نے بے تابانہ لہجے میں کہا۔

میری زبان سے اپنا نام سُن کر وہ چونک پڑا۔ بچپن کی بھولی بسری، موہوم سی یادوں کے ہجوم سے اس کا نام اچانک ہی میرے ذہن میں اُبھرا تھا۔ وہ شخص ہمارا پُرانا محلے دار تھا اور شاید واحد شخص تھا جس نے والد مرحوم کی وفات کے بعد ہمارے گھریلو جھگڑوں میں دخل انداز ہو کر اپنی سی ہر کوشش کر ڈالی تھی کہ بڑی ماں مجھے اور میری ماں کو دربدر کی ٹھوکریں کھلانے کے ارادے کو ترک کر دیں۔ مگر وہ بے چارہ ہمارے نوشتۂ تقدیر کو کسی طرح نہیں بدل سکا تھا اور جب ہمیں آخرکار گھر سے نکالا گیا تو وہ محض تماشا ہی دیکھتا رہ گیا۔

"تنویر!" بوڑھے نے سر ہلاتے ہوئے شناسائی کے انداز میں دہرایا اور پھر اس کا محبت آمیز داہنا ہاتھ میرے شانے پر جم گیا "ہاں، مجھے یاد آ گیا۔ برسوں پُرانی بات ہے، منشی اقبال کی وفات کے بعد تم اپنی ماں کے ساتھ یہاں سے نکالے گئے تو شاید تمھاری عمر چار پانچ برس کی تھی ... اب تو ماشاءاللہ جوان ہو گئے ہو، کہاں ہو؟ اور آج اِدھر کیسے آ نکلے؟"

میں جواب میں ایک لفظ بھی نہ کہہ سکا۔ بوجھل اور دل گرفتہ انداز میں خاموش کھڑا رہا۔ رمضان چاچا سے ہونے والی گفتگو نے گلی کے لڑکوں کو شرمندہ کر دیا تھا البتہ میرے ہاتھوں پٹنے والا بدستور مجھے خشمناک نگاہوں سے گھورے جا رہا تھا۔

"جاؤ۔ تم لوگ یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو۔" رمضان چاچا نے بزرگانہ شان سے ان سب کو جھڑکا۔ "یہ اسی گلی کا بچہ ہے۔ برسوں بعد اِدھر آیا ہے۔ آؤ بیٹے!"

یہ کہتے ہوئے رمضان چاچا میرا ہاتھ تھام کر ایک طرف چل دیے۔

"مگر چاچا! اس نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا ہے۔" میرے ہاتھوں پٹنے والے نے احتجاج آمیز لہجے میں شکایت کی۔

"دفع ہو جا۔" رمضان چاچا کی غراہٹ گونجی۔ "میں سب سُن رہا تھا، سب دیکھ رہا تھا، پہلے تو نے ہی اس کے گریبان پر ہاتھ ڈالا تھا، بدمعاش کہیں کا۔"

اور وہ بھی مایوسانہ انداز میں وہاں سے کھسک گیا۔

رمضان چاچا محبت آمیز اپنائیت کے ساتھ مجھے اپنے گھر کی بیٹھک میں لے گئے اور میرے بھرپور انکار کی پروا کیے بغیر میرے لیے چائے تیار کرالی۔ مجھ پر اس وقت ایک ایک لمحہ بھاری گزر رہا تھا۔ دل و دماغ میں ایک عجیب سا ہیجان برپا تھا اور میری پوری کوشش تھی کہ جلد از جلد بڑی ماں اور سوتیلے بھائیوں کے

...بات شروع کر دوں۔

...تنے عرصے سے تم کہاں تھے بیٹے؟" آخرکار رمضان چاچا کو ...ے میں بات چھیڑنے کا خیال آ ہی گیا۔

...راچی چلا گیا تھا۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ "میرے شہر کی ...تنگ ہو گئی تھی لیکن کراچی میں اتنے برسوں میں مجھے ایک ...ے بھی اجنبیت کا احساس نہیں ہوا۔"

...وں۔" رمضان چاچا نے پُرخیال انداز میں اپنے سر کو یوں ...ی جیسے برسوں پُرانی بھولی بسری یادوں کو ذہن میں مجتمع ...ہوں پھر قدرے سکوت کے بعد بولے۔ "ماں کی موت ...س شہر میں تمھارا رہ ہی کون گیا تھا، اچھا ہی ہوا کہ تم ...وڑ دیا۔ وقت اور فاصلہ ہر زخم کے لیے مرہم کا کام دیتا ...ہی دیکھ لو کہ آج تم بڑی ماں کو ڈھونڈتے اس محلے میں ...جہاں سے بڑی بے دردی کے ساتھ نکالے گئے تھے ..."

...گر بڑی ماں کہاں ہیں رمضان چاچا؟" میں نے موقع ملتے ...بات کاٹ کر سوال کر ڈالا۔ "مجھے تو اب اپنے آبائی گھر کی ...ہ اجنبی سی لگ رہی ہے۔"

...ہ لوگ برسوں پہلے مکان بیچ کر چلے گئے۔" رمضان چاچا کی ...ر پڑ گئی۔ "اب وہاں صادق بابو رہتا ہے۔ تمھارے بھائیوں ...نے مکان خریدا تھا۔"

...ہ لوگ خود کہاں گئے؟" میں نے تجسّس آمیز لہجے میں ...

...ا نہیں، پہلے سُنا تھا کہ وہ یہاں سے گھر بیچ کر گلبرگ چلے ...تھوڑے دن کچھ محلے داروں سے بھی ملنا جلنا رہا پھر ...نہیں۔ شاید انھوں نے گلبرگ والا مکان بھی چھوڑ دیا۔ ...رائے پر گئے تھے۔"

...انکشاف میرے لیے تحیّر خیز تھا۔ نیم پختہ مکانوں پر مشتمل گندی ...ہ گلبرگ جیسے صاف سُتھرے علاقے میں منتقلی کے لیے ...لی حیثیت بہت ضروری تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ...تیلے بھائیوں نے اپنی محنت اور مشقت سے اپنے ...ی حد تک بدل لیے تھے۔

...یا کام کر رہے تھے میرے بھائی؟" میں نے تجسّس آمیز ...رمضان چاچا سے سوال کیا۔

...مضان چاچا مغموم انداز میں ہنس دیے۔ "انھیں بھول ...وہ ایک کوڑی سے بھی تمھاری مدد نہیں کریں گے۔ ...نے سے پہلے ہی ان کے دماغوں میں تکبّر آ گیا تھا۔ جن ...سے برسوں روٹی ہانڈی کا سلجھا رہا، ان تک سے ملنا ...ند دیا تھا۔"

میں پہلو بدل کر رہ گیا۔ رمضان چاچا نے میرے سوال کا مفہوم غلط سمجھا تھا۔ "خدا کا شکر ہے چاچا کہ میں کسی کی مدد کا محتاج نہیں ہوں۔" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ کام دھندے کی جگہ پر ہی کسی سے اُن کا پتا ٹھکانا معلوم ہو جائے۔"

"محلے میں پوچھ گچھ کروں گا، شاید کسی کو کچھ معلوم ہو، فرصت ملے تو کل شام کو چکر لگا لینا۔"

رمضان چاچا نے مجھے محلے کے اوباش لڑکوں سے تصادم سے تو بچا لیا تھا لیکن اس سے آگے وہ میری کوئی مدد نہیں کر سکے لہٰذا ان کے پاس تھوڑا وقت گزار کر میں وہاں سے لوٹ آیا۔

ہوٹل پہنچا تو غزالہ کو اتنی جلدی میری واپسی کی اُمید نہیں تھی۔ دستک کے جواب میں دروازہ کھول کر اس نے میری صورت دیکھی تو حیران رہ گئی۔ "بہت جلد لوٹ آئے آپ؟" اس نے تحیّر آمیز لہجے میں کہا۔

"وہ لوگ نہیں مل سکے غزالہ!" میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

"نہیں مل سکے؟" اس نے تحیّر آمیز لہجے میں دُہرایا۔ "تو اب کیا ہوگا؟"

"قدرت کو منظور ہوا تو شاید کوئی اتفاق ہی بہانا بن جائے ویسے تو کوئی اُمید نہیں ... نجانے وہ لوگ کہاں چلے گئے ہیں۔" میں نے بستر پر جوتوں سمیت دراز ہوتے ہوئے کہا۔

پھر میرے ذہن میں خیالات کا تانا بانا اُلجھنے لگا۔ پہلے بی فور کا صفایا ہوا اور اس کی جگہ کراچی کی حد تک سارے تنظیمی معاملات میں مجھے خود مختار بنا دیا گیا۔ تین سو میل کی حد میں کام کرنے والا طاقتور ٹرانسمیٹر ایم ڈی تھری ہنڈرڈ بھی میری تحویل میں آ گیا۔ اس کے بعد پورے شہر میں صرف سی۔ ون یا قاسم ہی ایک ایسا شخص تھا جو میری من مانیوں کی راہ میں رکاوٹ بن سکتا تھا مگر اُسے میں نے نہایت خوب صورتی کے ساتھ دوسری اُلجھنوں میں پھانس لیا تھا، پھر مجھ سے اُوپر والا بھی قدرت کے بھیانک انتقام کا شکار ہو گیا۔ اخبارات میں اُسے مٹھا خان کہا گیا لیکن تنظیم والوں کے لیے وہ بی۔ ون تھا۔ اس کی عبرت ناک خودکشی کے بعد میرا براہِ راست اے۔ ٹو سے مواصلاتی رابطہ قائم ہو گیا۔

اے۔ ٹو کون تھا؟ اس کی نقاب کشائی کی دُھن میں ہی میں کراچی سے لاہور تک دوڑا چلا آیا تھا۔ میرے پاس اس کا صرف ایک ہی حوالہ تھا۔ وہ پُراسرار ٹیلی فون نمبر جس پر رات ایک سے تین بجے تک خود اے۔ ٹو پیغامات وصول کر کے ہدایات

جاری کرتا تھا۔ بقیہ وقت میں اس نمبر پر ایک بوڑھی اور بیمار عورت کی آواز سنائی دیتی تھی۔

میں بڑی ماں کا سراغ لگانے میں ناکام رہا تھا۔ لہٰذا مجھے بھی لامحالہ ہوٹل میں ہی قیام کرنا تھا۔ لے۔ لوٹ کی تلاش میں نکلنے سے پہلے میں یہ مسئلہ حل کرنا چاہتا تھا۔

وہ کمرہ غزالہ ہی کے نام پر بک ہوا تھا مگر وہ ڈبل بیڈروم تھا، میں چاہتا تو اسی میں قیام کر سکتا تھا مگر میں نے اُسے مناسب نہ سمجھا۔ غزالہ کو میں نے پاکیزہ جذبوں کے ساتھ چاہا تھا، اور میں نہیں چاہتا تھا کہ کسی وقت بھی احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے۔

غنیمت ہوا کہ مجھے اُسی فلور پر ایک کمرہ مل گیا۔ چابی حاصل کرنے کے بعد میں اپنے کمرے میں جانے کی نیت سے اٹھا تو غزالہ کی استفسار طلب نگاہیں قدموں کی زنجیر بن گئیں۔

"کیا کھانا بھی ساتھ نہیں کھائیں گے؟" اس نے تشکایتی لہجے میں سوال کیا۔

"ہمیں انجان بن کر رہنا ہے غزالہ!" میں نے اُسے محبت آمیز لہجے میں سمجھایا۔ "میری وجہ سے تم کسی دشواری میں بھی گرفتار ہو سکتی ہو۔ میں آج رات ہی سے اپنے کام کا آغاز کرنا چاہ رہا ہوں۔"

"آج رات سے؟" اس نے تحیّر آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"ہاں۔" میں نے آہستگی سے کہا۔ "مجھے اس گھر کا سراغ لگانا ہے جہاں وہ فون لگا ہوا ہے، ہو سکتا ہے کہ میں آج رات ہی اس گھر میں گھس کر صورتِ حال کا جائزہ لے ڈالوں۔"

"آپ اکیلے جائیں گے؟" اس کے لہجے میں تشویش اُمڈ آئی۔

"سوچ رہا ہوں کہ سلطان شاہ کو بھی ساتھ لے لوں۔ تم ذرا محتاط رہنا۔"

وہ آسودہ انداز میں ہنس پڑی۔ "ابھی کون سی احتیاط کی ضرورت ہے مجھے۔ میرا کام تو کل سے شروع ہوگا جب میں ایشین سنڈیکیٹ لمیٹڈ سے رجوع کروں گی۔"

"کل نہیں۔" میں نے بغور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "وہاں جانے سے پہلے مجھے تمہاری رہائش کا کوئی بندوبست کرنا ہوگا۔"

"رہ تو رہی ہوں یہاں۔" اس نے میری بات نہ سمجھتے ہوئے حیرت سے کہا۔

"اگر اس دفتر کی آڑ میں کوئی گھپلا ہو رہا ہے تو وہ لوگ تمہارے بارے میں چھان بین ضرور کریں گے اور انھیں بھڑکانے کے لیے یہی ایک بات کافی ہوگی کہ تم ہوٹل میں رہ رہی ہو۔ تمہارے لیے کسی آبادی میں رہائش کا بندوبست کرنا ہوگا جہاں تمہارے بارے میں کوئی ہمدردانہ گواہی بھی دے سکے۔"

"بڑی ماں کا گھر تو ملا نہیں پھر اب کون سا ٹھکانا تلاش کریں گے؟"

"ابھی وہ محلہ باقی ہے جہاں میں نے ماں کے ساتھ اپنا بچپن گزارا تھا۔" میں نے دل میں درد کی ہلکی سی کسک محسوس کرتے ہوئے کہا۔ "ماں کام پر چلی جاتی تھی تو میں اسکول سے واپسی کے بعد اپنا وقت ایک منہ بولی خالہ کے گھر گزارتا تھا، ہو سکتا ہے اس بار بھی وہی گھر میرا سہارا بن جائے۔"

غزالہ کو سمجھانے کے بعد میں اس کے کمرے سے نکل آیا۔ اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر میں اندر داخل ہوا تو بلب روشن کرتے ہی حیران رہ گیا۔ کمرے کے وسط میں پڑی ہوئی گدّے دار کرسی پر سلطان شاہ نہایت اطمینان سے براجمان تھا۔

"تت .... تم یہاں کیسے؟" بدقت تمام میرے منہ سے نکلا۔

"میں ڈیوٹی پر ہوں۔" وہ مسکرایا۔ "میرے اور بھابی کے کمروں کے سوئچ بورڈ شاید ایک ہی دیوار پر ہیں اور درمیان میں کوئی ناقص سا گتا لگا ہوا ہے۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد میں تم دونوں کی ساری گفتگو سننے میں کامیاب ہو گیا، پھر سوچا کہ کیوں نہ تم کو اچانک ہی حیران کر دوں۔"

"اور کمرے کی چابی کہاں سے آئی تمہارے پاس؟" میں نے اس کے مقابل مسہری پر بیٹھتے ہوئے سوال کیا۔

"چابی!" وہ بے ڈھنگے پن سے ہنسا اور پھر جیب سے ایک مڑا ہوا تار نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔ "حکم دو تو سارے کمروں کے تالے اسی ایک تار سے کھولتا چلا جاؤں۔"

"مجھے خوشی ہے کہ تم خود کو میری توقعات کا اہل ثابت کر رہے ہو۔ کھانا تو کھا لیا ہوگا تم نے؟"

"الحمدللہ۔" اس نے فراخدلی سے کہا۔ "اب تم کام بتاؤ۔"

"تم یہیں ٹھہرو۔ میں تھوڑی دیر میں واپس آتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے میں کمرے سے نکل گیا۔ میں چاہتا تو نمبروں کی ترتیب والی ٹیلیفون ڈائرکٹری کمرے میں بھی منگوا سکتا تھا لیکن اس طرح میں اُسے زیادہ اہمیت نہیں دینا چاہ رہا تھا۔ نیچے اتر کر میں نے استقبالیہ کاؤنٹر سے وہ ڈائرکٹری لی اور ایک صوفے پر بیٹھ کر اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔

چند ہی منٹ بعد مجھے مطلوبہ نمبر مل گیا۔ وہ مسز دلدار بھٹی کے نام پر تھا جس کی سکونت ماڈل ٹاؤن کے علاقے میں تھی۔ میں نے وہ مختصر سا پتا ذہن نشین کر کے ڈائرکٹری استقبالیہ کلرک کو لوٹا دی۔

اصل مہم کے آغاز سے پہلے میں مطلوبہ ٹھکانے کا محلِ وقوع

[ذہن] نشین کرنا چاہتا تھا لہٰذا اسی وقت سلطان شاہ کو ساتھ [لے ک]ر ہوٹل سے روانہ ہو گیا۔

ماڈل ٹاؤن وسیع اور پُرشکوہ مکانات پر مشتمل ایک صاف [ستھ]ری آبادی تھی جہاں شہر جیسی بھیڑ بھاڑ کا دور تک پتا [نہیں] تھا۔ ٹیکسی چھوڑنے کے بعد ہم دونوں کو بمشکل ایک [گھ]نٹہ برباد کرنا پڑا اور آخرکار ہم اس وسیع احاطے کے سامنے [پہنچ] گئے جہاں پھاٹک پر مسز دلدار بھٹی کے نام کی تختی [آوی]زاں تھی۔

اس علاقے میں ہر مکان وسیع احاطے میں گھرا ہوا دوسر[ے مک]انات سے بالکل الگ تھلگ واقع تھا اور خوبی کی بات یہ تھی [کہ س]امنے پختہ سڑک ہونے کے باوجود عقبی حصے میں تاریک [گ]لیاں موجود تھیں جدھر شاید فراہمی اور نکاسیٔ آب کا [نظا]م واقع تھا۔

پہلے میرا خیال تھا کہ میں اس مکان میں رات گئے گھسنے [کی کو]شش کروں گا مگر اس مکان پر اس وقت بھی بے رونقی [چھائی] تھا۔ احاطے میں روشن دو تین بتیوں کے علاوہ عمارت [میں] ایک ہی کھڑکی روشن نظر آ رہی تھی۔ میں نے رسٹ [واچ پ]ر نگاہ ڈالی تو وہ رات کے پونے گیارہ بجا رہی تھی۔

"کیا ارادہ ہے؟" سلطان شاہ نے مجھے رسٹ واچ کی طرف [دیکھت]ا پاکر معنی خیز لہجے میں سوال کیا۔

"بس یہ تسلی کرنا ہے کہ اندر کُتے تو نہیں کھلے ہوئے ہیں۔" [میں نے] اُس کے ہمراہ ایک طرف چلتے ہوئے کہا۔

"ابھی پتا چل جاتا ہے۔" وہ یہ کہتے ہوئے واپس ہو لیا اور [ا]یک لیمپ پوسٹ سے ٹک کر وقت گزاری کے لیے سگریٹ [پی]نے لگا مگر میری نگاہیں بدستور سلطان شاہ کا تعاقب [کر رہ]ی تھیں۔

[آگے ب]ڑھتے ہوئے اس نے راستے میں جُھک کر شاید چند پتھر [اٹھا]ئے اور پھر میں نے اُسے مسز دلدار بھٹی کے مکان کے قریب [سے گز]رتے ہوئے مختصر سے وقفے سے دو بار کوئی چیز اندر احاطے [میں اچ]ھالتے دیکھا۔ وہ میری توقع سے بڑھ کر ہوشیار ثابت ہو [رہا تھ]ا۔ میں نے اُسے محض قابلِ اعتماد سمجھ کر اپنے ساتھی کے [طور پر م]نتخب کیا تھا لیکن وہ ہر مرحلے پر یہ ثابت کرتا آ رہا تھا کہ [اس میں] ذہانت اور بروقت فیصلے کی صلاحیت بھی موجود ہے۔

احاطے میں کُتوں کی موجودگی کا اندازہ لگانے کے لیے سناٹے [میں س]نگباری سے بہتر کوئی نسخہ نہیں تھا۔ سلطان شاہ اپنی [کار]روائی کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا گیا۔ اسٹریٹ لیمپس کی نیم [روشنی] میں اس کا ہیولا دور تک بڑھنے کے بعد واپس آنے لگا تھا۔

واپسی میں بھی اس نے مسز دلدار بھٹی کے مکان میں پتھر اُچھالے اور اس بار چند ثانیوں کے لیے وہاں رُک کر اندر سے کسی قسم کے ردِ عمل کا انتظار کرتا رہا۔ اور آخر کار ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ لیے میرے پاس آ موجود ہوا۔

"لگتا ہے کہ اندر کوئی بھی نہیں ہے۔ نہ کُتا نہ کوئی چوکیدار۔" اس نے آتے ہی پُراعتماد لہجے میں اعلان کیا اور میں اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اُسے اپنے ساتھ لیتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

وہ شہر کے آسودہ حال لوگوں کی آبادی تھی اور میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اس دور میں دولت آسانی کے ساتھ نہیں کمائی جاتی۔ اوّل تو دولت کی دیوی دور دور سے درشن کراتی رہتی ہے پھر جب آتی ہے تو انسان کو احساس ہوتا ہے کہ پیسے کے ساتھ اس نے کچھ روگ بھی کما لیے ہیں۔

ان میں سب سے بڑا روگ بے خوابی کا ہوتا ہے۔ بڑی آمدنی کی بڑی فکریں سب سے پہلے راتوں کے سکون پر شب خون مارتی ہیں اور انسان خواب گاہ کے اندھیرے میں نرم بستر کی آغوش چھوڑ کر کھلے ہوئے دریچوں میں یوں آ کھڑا ہوتا ہے جیسے اُسے کسی کا انتظار ہو۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کسی کھڑکی سے اندھیرے میں بھٹکتی ہوئی نگاہیں مجھے اور سلطان کو وہاں مشتبہ انداز میں کھڑا ہوا دیکھیں۔ لہٰذا میں نے چلتے چلتے اپنی بات جاری رکھی۔

"میدان صاف ہے تو پھر ہمیں اسی وقت کام دکھانا ہوگا۔" میں نے دبے دبے، ہیجان آمیز لہجے میں کہا۔

"اندر کودو گے؟" اس نے آہستگی سے سوال کیا۔

"ہاں۔" میں نے قدرے تحیّر کے ساتھ کہا کیوں کہ اس کا سوال کرنے کا انداز عجیب سا تھا، ویسے بھی وہ عموماً حکم کی تعمیل سے غرض رکھتا تھا۔ سوالات کم ہی کرتا تھا۔

"اب تک تم جو کچھ بتاتے رہے، اس پر میں آنکھیں بند کر کے عمل کرتا رہا ہوں۔" اس نے ٹھہرے ہوئے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "لیکن ضرورت سے زیادہ بے خبری کسی وقت بھاری نقصان کا سبب بھی بن سکتی ہے۔ میں نے ہوٹل کے کمرے میں تمہاری اور بھابی کی جو گفتگو سنی تھی، اس سے میں نے نتیجہ اخذ کیا تھا کہ تمھیں اپنے کسی نامعلوم دشمن کی تلاش ہے۔ اگر تمھیں شبہ ہے کہ تمہارا دشمن اسی مکان کو کمیں گاہ کے طور پر استعمال کر رہا ہے تو تمھیں نہتا اندر نہیں گھسنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے اندر کے انتظامات اتنے مضبوط ہوں کہ اُنھوں نے احاطے کے حفاظتی پہلوؤں کو اہمیت دینے کی ضرورت ہی نہ

محسوس کی ہو۔"

"میں تصادم کے ارادے سے نہیں آیا۔" میں نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "آج تو بس حالات کا اندازہ لگانا ہے۔ جہاں بھی ٹکراؤ کا خطرہ محسوس ہوا، اُلٹے قدموں لوٹ آؤں گا۔"

وہ سر ہلا کر رہ گیا۔

"عمارت احاطے کے تقریباً وسط میں بنی ہوئی ہے۔ پچھلی گلی بالکل تاریک اور ویران ہوگی، میں اسی سمت سے اندر گھسنے کی کوشش کروں گا.....۔"

"اور میں کیا کروں گا؟" میری بات پوری ہونے سے قبل وہ تجسس آمیز لہجے میں بول پڑا۔

"تم باہر رہ کر نگرانی کرو گے۔ بیرونی مداخلت کا خطرہ محسوس کرتے ہی ایک طویل سیٹی بجا دینا تاکہ میں نکلنے کی فکر کرسکوں، بس یہ بات ذہن میں رکھنا کہ اس مرحلے پر میں تصادم سے بچنا چاہ رہا ہوں ورنہ دُشمن ہوشیار ہو جائے گا اور ہم ایک بار پھر اندھیرے میں بھٹکتے رہ جائیں گے۔"

اپنے پروگرام پر گفتگو کرتے ہوئے ہم دونوں کافی دور نکل گئے۔ لیکن جب ہم دس منٹ بعد مذکورہ مکان پر اپنی طے شدہ ذمے داریاں سنبھالنے کے لیے ایک دوسرے سے الگ ہوئے تو ہمارے ذہنوں پر صورتِ حال کی سنگینی کا احساس کسی حد تک طاری ہو چلا تھا۔

اس وقت میری رسٹ واچ سوا گیارہ بجا رہی تھی۔ کراچی کی جاگتی راتوں کے لحاظ سے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی لیکن اس علاقے میں لاہور والوں کا اجتماعی انداز حاوی تھا۔ ہر سُو سناٹا چھایا ہوا تھا، دور سے آوارہ کتوں کی آوازیں اُبھر اُبھر کر معدوم ہو رہی تھیں اور بیشتر مکانوں کے اقامتی حصے تاریک پڑے ہوئے تھے۔

میں عمومی رفتار سے چلتا ہوا اس نکڑ تک پہنچا، جہاں سے مجھے تاریک عقبی گلی میں گھسنا تھا۔ لحظہ بھر کے لیے رُک کر میں نے قرب و جوار کا جائزہ لیا، میدان بدستور صاف پڑا ہوا تھا، سلطان شاہ کا کہیں پتا نہیں تھا۔ شاید اس نے اپنے لیے کوئی بہت ہی بہتر کمین گاہ چُنی تھی۔

میں پھرتی سے آگے بڑھا اور گلی میں پھیلی ہوئی تاریکی میں تحلیل ہو گیا۔ گلی تاریک لیکن صاف ستھری تھی۔ میں بائیں ہاتھ پر تیسرے احاطے کی سپاٹ دیوار کے قریب رک گیا۔ عام تعمیری رواج کے مطابق شاید کسی بھی مکان کے عقبی احاطے میں کوئی دروازہ یا پھاٹک نہیں تھا لیکن مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ شہری سہولتوں کی فراہمی کے لیے اسی عقبی گلی کو استعمال کیا گیا تھا۔ اندھیرے کا عادی ہو جانے کے بعد مجھے پانی، گیس اور بجلی وغیرہ کے لوازمات نظر آنے لگے تھے۔ اچانک ہی میری خوشی کی انتہا نہ رہی جب میں نے اپنے مطلوبہ مکان کی دیوار کے تقریباً ساتھ کنکریٹ کی چوکی پر محکمہ ٹیلی فون کی اُونچی سی کیبنٹ لگی دیکھی جس سے علاقے کے لوگوں کو کنکشن دیے گئے ہوں گے۔

میں اس آہنی کیبنٹ پر چڑھ کر بآسانی آٹھ فٹ اُونچی دیوار کے اس پار کا جائزہ لینے کے بعد اندر کود سکتا تھا۔

میں احتیاط کے ساتھ اس کیبنٹ پر چڑھا، دھیرے دھیرے سر اٹھا کر احاطے کے اندر پھیلی ہوئی ویرانی کا جائزہ لیا اور پھر توکل بہ تقدیر ہو کر دیوار پر چڑھ کر نرم لان پر کود گیا۔

عمارت کے مکین میری توقع سے بڑھ کر بے فکرے اور بے پروا ثابت ہوئے۔ میں پھونک پھونک کر قدم آگے بڑھاتا رہا اور بدستور یکساں سناٹا چھایا رہا۔ نگہبانی کے لیے وہاں کتوں وغیرہ کا امکان تو پہلے ہی رد ہو چکا تھا اور اس وقت چوکیدار کی موجودگی بھی مشکوک سی نظر آ رہی تھی یا شاید وہ بھی اپنے آقاؤں کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد کسی گوشے میں جا سویا تھا۔

احاطے میں روشنی نہ ہونے کے برابر تھی لیکن اس کے باوجود میں نے اپنا رُخ عمارت کی عقبی سمت ہی کی طرف رکھا۔ سناٹے کی بنا پر سامنے کے رُخ پر کسی دروازے وغیرہ کے کھلے ہونے کی اُمید حماقت ہی ہوتی البتہ یہ امکان تھا کہ شاید کوئی کھلی ہوئی کھڑکی میرے لیے سہولت پیدا کر سکے۔

میرے حواس پوری طرح کام کر رہے تھے لیکن تمام تر حوصلے کے باوجود میرے اعصاب پر سنسنی چھائی ہوئی تھی جس کا سبب یہ احساس تھا کہ میں اس وقت لے۔ ٹو کی کمین گاہ میں موجود تھا۔

لے۔ ٹو جو موت کے سوداگروں کی ٹولی میں ایک پُراسرار نام تھا، جس کا وجود ہر شخص کے لیے ایک راز تھا لیکن میں اپنی کوششوں سے اس کی دہلیز پر چڑھ کر اُسے للکارنے کی پوزیشن میں آچکا تھا۔

میں نے عقبی سمت کا پوری طرح سے جائزہ لے ڈالا لیکن کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آسکی۔ مکان کی ساخت کچھ ایسی تھی کہ اس طرف کھڑکیاں ہی کم تھیں اور جو تھیں، وہ بند نظر آ رہی تھیں لیکن کونے پر پہنچتے ہی خوشی سے میرا دل بلیوں اچھل پڑا کیونکہ بغلی دیوار میں ایک کھڑکی کھلی ہوئی نظر آئی تھی جس کے شیشوں پر اندر سے آنے والی مدھم سبز روشنی کا ہلکا سا انعکاس ظاہر کر رہا تھا کہ وہ کھڑکی کسی خوابگاہ میں کھلتی تھی۔ لے۔ ٹو یا اس کے کسی معتمد کی خوابگاہ کی دریافت میرے

لیے معمولی بات نہیں تھی، میں دبے قدموں آگے بڑھا پھر رات کی تاریکی میں دھیمے دھیمے سر اٹھا کر اندر کا جائزہ لینا چاہا تو یک ت دو انکشافات ہوئے۔

اوّل تو کھلی ہوئی کھڑکی کے پیچھے چوبی فریم میں مضبوط آہنی ل نصب تھی دوئم یہ کہ خوابگاہ میں پھیلی ہوئی مدھم سبز روشنی میں ب انسانی ہیولا کھڑکی کی طرف پشت کیے، چادر اوڑھے بے خبر ہا تھا۔

میرے وجود میں اضطراب کی لہر سرایت کر گئی، شکار نے موجود تھا اور اپنے سر پر منڈلانے والے خطرے سے بر گہری نیند سویا ہوا تھا۔ کمرے میں داخل ہو کر میں اسے نی زیر کر سکتا تھا۔

میری نگاہیں بے چینی سے دیوار پر پھیلنے لگیں پھر اچانک یں اپنی خوش نصیبی پر جھوم اٹھا۔ اس رات ستارے میرا ساتھ رہے تھے، میں بآسانی اس خواب گاہ تک آ پہنچا تھا اور وہاں ھسنے کی راہ بھی نظر آ رہی تھی۔

کمرے کے ایک سرے پر دیوار میں ایک چوکور خلا موجود جسے اندر سے ہارڈ بورڈ لگا کر بند کر دیا گیا تھا۔ اس خلا کے رد گرد دیوار گیر آہنی بریکٹ لگے ہوئے تھے جن سے ظاہر ہو تا کہ وہاں کسی وقت ائیر کنڈیشنر لگا ہوا ہوگا جسے مستقل طور مرمت کے لیے ہٹا کر میرے لیے ایک راستہ تیار کیا گیا تھا۔

ہارڈ بورڈ پر میں نے باہر سے بتدریج دباؤ ڈالا تو چوبی فریم نگ خوردہ کیلوں کی جگہ چھوڑنے کی مدھم سی آواز پیدا ہوئی اور نے فوراً دم سادھ کر اپنا ہاتھ پیچھے ہٹا لیا۔ چند ثانیوں تک ی طرح بیٹھا رہا پھر میں نے کھڑکی کے قریب پہنچ کر محتاط میں اندر کا جائزہ لیا تو یہ دیکھ کر دل کو تسلی ہوئی کہ بستر پر ہوئے شکار کی پوزیشن میں ذرا بھی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

میں نے چوکنے انداز میں آہستہ آہستہ ہارڈ بورڈ کو اس کی جگہ سے اکھاڑ س وقت میرے..... ذہن میں خیالات کی آندھیاں سی تھیں۔ اے۔ ٹو کے فون نمبر کے ذریعے میں اس مکان میں تھا۔ اس نمبر پر میری لے۔ ٹو سے بات بھی ہو چکی تھی لیکن بر پر لے۔ ٹو سے بات کرنے کے لیے رات ایک سے تین وقت مقرر تھا۔ ایک بجے سے پہلے اس نمبر پر کال ایک عمر بوڑھی عورت نے وصول کی تھی جس کے بیان کے مطابق یں کوئی مرد نہیں رہتا تھا۔

نجانے بستر پر کون سویا ہوا تھا؟ بوڑھی اور بیمار عورت لو؟

میرے لیے اعصابی اضطراب پر قابو پانا دشوار ہو رہا تھا لہٰذا میں نے آخری بار گرد و پیش کا جائزہ لیا اور پھر ائیر کنڈیشنر کے کھلے ہوئے سوراخ میں سے گزر کر خواب گاہ میں داخل ہو گیا۔

بستر پر وہ انسانی ہیولا بدستور بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔ میں آگے بڑھا اور پھر میرے وجود میں مایوسی کی لہر دوڑتی چلی گئی۔

وہ ایک فربہ اندام بوڑھی عورت تھی جو دنیا و مافیہا سے بے خبر گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔ میری نگاہیں عورت سے ہٹ کر کمرے کا طواف کرنے لگیں اور مجھے ایک گوشے میں تپائی پر رکھا ہوا ٹیلی فون انسٹرومنٹ بھی نظر آ گیا۔ میں دبیز فرشی قالین پر تیزی سے اس طرف بڑھا اور ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا تو فون پر ٹون آ رہی تھی۔

میں نے ریسیور رکھنے سے قبل اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی تو وہاں رات کے پونے بارہ بج رہے تھے۔ میں نے گہرا سانس لے کر ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

ٹیلی فون اور اس مکان تک میری رسائی ہو چکی تھی لیکن لے۔ ٹو کے بارے میں کوئی سراغ ملتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ عورت جس انداز میں گہری نیند سوئی ہوئی تھی اس کی بنا پر مجھے یقین ہو چلا تھا کہ وہ واقعی بیمار تھی ورنہ عمر کی اس دہلیز پر انسان اتنی گہری نیند کبھی نہیں سو سکتا۔ شاید اس پر کسی خواب آور دوا کے گہرے اثرات تھے۔

اس مخصوص صورتحال میں میرے لیے ایک ہی راستہ باقی رہ گیا تھا کہ میں اسی کمرے میں ٹھہر کر ایک بجنے کا انتظار کروں اور پھر ٹیلی فون کے بارے میں رونما ہونے والی کسی متوقع تبدیلی کا خود سراغ لگاؤں۔ محض اسی طرح میں کوئی پیش رفت کر سکتا تھا۔

اس خواب گاہ میں باہر کھلنے والی کھڑکی کے علاوہ دو دروازے نظر آ رہے تھے۔ ان کے بارے میں یہ اندازہ لگا لینا ذرا بھی دشوار نہیں تھا کہ ان میں سے ایک ملحقہ باتھ روم میں کھلتا تھا اور دوسرا اس خواب گاہ کو عمارت کے اندرونی حصوں سے ملاتا تھا۔

میں نے بڑھ کر اندرونی حصے میں کھلنے والے دروازے کا جائزہ لیا تو اندر سے کنڈی لگی ہوئی تھی۔ میں نے اندر سے کنڈی کھول کر دروازہ کھولا اور چند ثانیوں تک دوسری طرف چھائے ہوئے گہرے سناٹے پر کان جمانے کے بعد نیم روشن راہداری میں رینگ گیا۔

عمارت خاصی وسیع ثابت ہوئی لیکن وہاں چار نفوس ہی دریافت ہو سکے جو سب گہری نیند سو رہے تھے۔ راہداری میں عمر رسیدہ عورت کی خوابگاہ سے ملحق کمرے میں ایک جوان العمر لڑکی

سوئی ہوئی تھی یا پھر کچن کے قریب ایک کمرے میں دو ادھیڑ عمر ملازم سوتے نظر آئے۔

میں آگے بڑھتا ہوا مکان کا داخلی دروازہ کھول کر برآمدے میں نکل گیا لیکن وہاں کوئی بھی نظر نہ آیا۔ اس صورتحال سے حوصلہ پاکر میں برآمدے سے پختہ روش پر اترا اور تھوڑی دیر بعد یہ فیصلہ کرتا ہوا واپس لوٹ آیا کہ واپسی میں چوروں کی طرح عقبی دیوار پھاندنے کے بجائے میں پھاٹک کی ذیلی کھڑکی ہی استعمال کروں گا واپسی پر میں عمارت کے اندرونی دروازوں کو حسبِ سابق بند کرنا نہیں بھولا تھا۔ اس تمام جائزے سے فارغ ہو کر میں دوبارہ بوڑھی عورت کی خوابگاہ میں پہنچا تو گھڑی کی سوئیاں بارہ کے ہندسے پر رکی ہوئی نظر آئیں۔ اس کا مطلب تھا کہ کچھ ہونے کے لیے مجھے کم از کم ایک گھنٹہ انتظار کرنا تھا۔

میں مسہری کے قریب فرشی قالین پر اس طرح دراز ہو گیا کہ سوئی ہوئی عورت پر نگاہ رکھ سکوں۔ طویل انتظار کے آغاز نے دل میں سگریٹ سلگانے کی خواہش کو جنم دیا لیکن میں نے فوراً ہی اپنی طلب کا گلا گھونٹ دیا۔ بڑھیا بیمار تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں اسے سگریٹ کی بو سے الرجی نہ ہو۔ اگر میری سگریٹ نوشی کی بنا پر وہ کھانستی ہوئی بیدار ہو جاتی تو میرے پورے منصوبے پر پانی پھر سکتا تھا۔

قالین پر لیٹے لیٹے میرا ذہن سلطان شاہ کی طرف بھٹک گیا۔ عیسٰی خان کے گروہ سے ٹوٹا ہوا وہ شخص اس وقت تک میرے لیے بہت کارآمد ثابت ہو رہا تھا۔ یوں تو میری تنظیم کی جڑیں دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ میرے نیچے کام کرنے والوں میں بھانت بھانت کے لوگ موجود تھے لیکن میری مجبوری یہ تھی کہ ان سب سے میں [illegible] اور صرف تنظیم کے مفادات کے لیے ہی کام لے سکتا تھا جب کہ میرے دل میں بغاوت جنم لے چکی تھی۔ اپنے باغیانہ منصوبوں کی تکمیل کے لیے صرف سلطان شاہ ہی ایسا آدمی تھا جس پر میں کھلے دل کے ساتھ اعتماد کر سکتا تھا۔

لے۔ ٹو تنظیم کا سربراہ اور بہت زیادہ باخبر آدمی تھا لیکن وہ بھی سلطان کے وجود سے باخبر نہیں تھا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ کراچی چھوڑنے تک میں نے اسے خود سے دور ہی رکھا تھا۔ اگر ایک بار وہ کھل کر سامنے آجاتا تو شاید میرے لیے اس کی افادیت محدود ہو کر رہ جاتی۔

گھر سے ایئرپورٹ روانہ ہونے کے لیے پہلے میں نے سلطان شاہ کو ٹیکسی سے علیحدہ بھیجنے کا ارادہ کیا تھا لیکن بعد میں مصلحت کی بنا پر اسے ساتھ ہی لے کر روانہ ہوا تھا اور راستے میں میرے اندیشے کی تصدیق بھی ہو گئی کہ قاسم نے میری ہدایت سے انحراف کرتے ہوئے اپنے کسی گرگے کو میری نگرانی پر مامور کیا ہوا تھا۔

لیکن نگرانی کرنے والا اس قدر احمق تھا کہ خود کو میری نگاہوں سے پوشیدہ نہ رکھ سکا اور پھر میری ہدایت پر طارق روڈ پر سلطان شاہ نے اس کی یادگار طریقے پر مرمت کر ڈالی تھی۔ مجھے پورا یقین تھا کہ اپنے آدمی کے حشر کا علم ہونے کے بعد قاسم تلملا تا رہ جائے گا اور واقعات کی کڑیاں ملانے کے بعد اس دوسرے آدمی کی تلاش میں مصروف ہو جائے گا جسے اس کے گرگے نے مکان سے نکلتے ہوئے میرے ساتھ دیکھا تھا۔

مٹھا خان کی موت کے بعد حالات نے اچانک ڈرامائی موڑ لیا تھا اور عارضی طور پر لے۔ ٹو نے ہنگامی حالات کا اعلان کر کے باہمی روابط کو سختی سے محدود کر دیا تھا۔ ان حالات میں مجھے کراچی ہی میں رکنا تھا لیکن میں اس افراتفری سے فائدہ اٹھا کر لاہور آپہنچا تھا۔ قاسم جب اپنی کوششوں کے بعد شہر میں میرا یا میرے معاون کا سراغ نہ پاتا تو یقینی طور پر الجھن میں پڑ جاتا لہٰذا میری کوشش یہی تھی کہ جلد از جلد اپنی مہم ختم کر کے واپس کراچی پہنچوں، اور حامد کے ذریعے حاصل ہونے والے تین نوجوان کارندوں کے ذریعے مال باہر بھیجنے کی کوشش کروں کیونکہ اس ہنگامی دور میں بھی لے۔ ٹو نے اس کام کو تعطل میں نہیں ڈالا تھا اور مجھے رابطہ رکھنے کی ہدایت دی تھی۔

سوئیوں کا سفر دھیمے دھیمے جاری رہا اور میرا ذہن خیالات کی دلدل میں ڈوبا رہا۔

میں بذاتِ خود فون نمبر کے حوالے سے لے۔ ٹو کا کھوج لگانے کی کوششوں میں مصروف تھا کیونکہ میرے علم کے مطابق اب تک وہی تنظیم کا سربراہ نظر آرہا تھا لیکن تنظیم میں حروفِ تہجی اور نمبروں کے اشتراک سے عہدوں کی باہمی شناخت کا جو طریقہ رائج تھا اس کی بنا پر میرا یہ قیاس تھا کہ لے۔ ٹو سے اوپر دو درنہ کم از کم ایک آدمی ضرور مامور ہونا چاہیے تھا اور اس کی امکانی شناخت لے۔ ون یا صرف لے ہونا چاہیے تھے۔

انسدادِ منشیات کے بارے میں ہونے والی بین الاقوامی کانفرنس میں امریکی مندوب نے جو بھیانک تصویر کشی کی تھی وہ میرے ذہن میں ہر لمحے تازہ تھی۔ ہیروئن بیچنے والے ہر درجے کے لوگ بظاہر اپنے مالی مفادات کے لیے اس گھناؤنے کام میں مصروف تھے لیکن درحقیقت ان میں سے ہر شخص ایک بڑی سازش کا ایندھن بنا ہوا تھا۔ بیرونی دماغ منصوبہ بندیاں کر رہے تھے۔ ان کی نگاہیں طویل میعاد کے سیاسی اور معاشی مفادات پر مرکوز تھیں اور پاکستان کی سرزمین سے گزرنے والا ہیروئن کا ذرہ ذرہ انھیں اپنی سازش میں کامیابی کی منزل سے قریب تر لے جا رہا تھا۔

شاید لے۔ ٹو کسی بیرونی آقا کو ہی جوابدہ تھا۔ اے۔ ٹو لاہور [illegible]ہ کر کراچی تک کے معاملات کی دیکھ بھال کرتا تھا اس لیے [illegible]ازہ لگانا دشوار نہیں تھا کہ پاکستان کی حد تک تنظیم کے سارے [illegible]ے اس کی صوابدید پر منحصر تھے۔ شاید قرب و جوار کے ممالک [illegible]نڈیوں میں اس جیسے کئی اور بھی مقامی سربراہ رہے ہوں [illegible]ہ سب ایک ہی آقا کے تابع ہوں۔

[illegible] تنظیم ہی کی جانب سے کچھ عرصے پہلے مجھے ایک بین الاقوامی [illegible]ے کی تکمیل کے لیے جاپان بھیجا گیا تھا۔ وہ سفر میں نے [illegible]ر کی ایک فرم ایشین سنڈیکیٹ لمیٹڈ کے نمائندے کے طور [illegible] کیا تھا، دوسری طرف سے آنے والی ایشلے ہاؤز کی نمائندہ تھی، [illegible]سے مذاکرات کے انتظار میں مجھ پر ایک خوفناک جاپانی [illegible] کے وجود کا انکشاف ہوا جو مقدر کی بے رحم ٹھوکریں [illegible] کے بعد غنڈہ گردی اور گروہ بندی پر اتر آئی تھی۔ اس کا [illegible]ہی منشیات کی اسمگلنگ کے گرد گھومتا تھا۔

مرد، عورت، مقامی اور غیر ملکی سب ہی دولت کمانے کی [illegible] دوڑ میں نسلوں اور خاندانوں کو تباہی کے مہیب غار [illegible]یلنے پر تلے ہوئے تھے۔ غزالہ کی ماں کی دردناک زندگی کا [illegible] شاہد تھا، کامران کی دیوانگی بھی آنکھوں دیکھی بات تھی۔ [illegible]ہی تجربوں نے مجھے اور غزالہ کو موت کے سوداگروں کی بیخ [illegible] سایا تھا۔

میں اس وقت خوابگاہ کے فرشی قالین پر پڑا آنے [illegible]ات کا منتظر تھا اور شاید غزالہ بھی اپنے بستر پر پڑی ایشین [illegible]ٹ لمیٹڈ کے بارے میں اپنی حکمتِ عملی کے بارے میں سوچ [illegible]ی۔

اچانک میں چونک پڑا۔

خواب گاہ میں رکھے ہوئے ٹیلیفون کی گھنٹی ایک بار دھیمے [illegible]سک کر رہ گئی، میں چند ثانیوں تک گھنٹی بجنے کا منتظر رہا لیکن [illegible]لاتی آلہ بدستور خاموش رہا۔

بوڑھی عورت بدستور سو رہی تھی اور میری رسٹ واچ پورا [illegible]ا رہی تھی میں دھڑکتے دل کے ساتھ اٹھا اور فون کا ریسیور کان [illegible]ایا تو بے اختیار حلق سے ایک گہرا سانس آزاد ہو گیا۔ ایک [illegible] فون کی لائن بے جان ہو چکی تھی میں چند ثانیوں تک ریسیور [illegible]لیے خالی الذہنی کے عالم میں کھڑا رہا پھر فوراً ہی میرا ذہن [illegible]نے لگا۔

وہ عورت سچی تھی، اس کا لے۔ ٹو سے کوئی تعلق نہیں۔ [illegible]جتے ہی اس کا فون جس طرح بے جان ہوا، اس کی بنا پر مجھے [illegible] اندازہ درست ہوتا نظر آرہا تھا کہ ٹیلی فون ایکسچینج میں لے۔ ٹو کا کوئی ہرکارہ موجود تھا جو مقررہ اوقات میں وہ نمبر لے۔ ٹو کو منتقل کر دیتا تھا۔

پھر آخر رازداری کیسے برقرار تھی، ایکسچینج میں ڈیوٹیاں بدلنے کی صورت میں کتنے آدمی اعتماد میں لیے گئے ہوں گے اور کیا وہ فطری تجسس کے تحت لے۔ ٹو کی فون کالز نہ سنتے ہوں گے۔

میرے پاس وقت کم تھا، تین بجے سے پہلے پہلے کوئی کارروائی ممکن تھی۔ پھر مجھے اندر آئے بہت دیر ہو چکی تھی، سلطان شاہ نہ جانے کس طرح وقت گزار رہا تھا۔

ریسیور رکھ کر میں اسی راستے سے باہر نکلا جس کے ذریعے کمرے میں گھسا تھا لیکن عمارت سے واپسی کے لیے احاطے کی عقبی دیوار پھاندنے کے بجائے میں پھاٹک کی طرف ہو لیا۔ ذیلی راستے سے باہر نکل کر میں نے وہ آہنی کھڑکی اس طرح بند کر دی کہ بادی النظر میں وہ محفوظ نظر آئے۔

پھاٹک کے ایک طرف ستون پر چوبی نیم پلیٹ پر مسز دلدار بھٹی کا نام نظر آرہا تھا۔ اسے ذہن نشین کر کے میں بے پروایانہ انداز میں آگے بڑھتا چلا گیا جدھر سلطان شاہ سے ملاقات کی امید تھی۔

تھوڑی سی کوشش کے بعد میں سلطان شاہ کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ عقبی گلی کی تاریکی سے نکل کر سامنے آیا تو اس کے بشرے سے تکان اور بیزاری کے آثار مترشح تھے۔

"کہاں رہ گئے تھے؟" اس نے چھوٹتے ہی سوال کیا تھا۔ "مجھے تو فکر ہو چلی تھی کہ کہیں پکڑے ہی نہ لیے گئے ہو۔"

"اندر میدان صاف تھا۔" میں نے ہنستے ہوئے پُرجوش لہجے میں کہا۔ "میرا اندازہ رائیگاں نہیں گیا۔ ایک بجتے ہی فون بے جان ہو گیا اور مجھے یقین ہے کہ تین بجتے ہی لائن بحال ہو جائے گی۔"

"میں سمجھا نہیں۔" وہ قدرے حیرت کے ساتھ بولا۔ "تمھاری اور بھابی کی گفتگو میں کسی فون کا ذکر تو آیا تھا لیکن اس کا وقت سے کیا تعلق تھا؟"

میں خفت آمیز انداز میں ہنس پڑا۔

وہ درست ہی کہہ رہا تھا۔ اپنی مہم کے سلسلے میں میں اسے ساتھ تو لیے پھر رہا تھا لیکن میں نے اسے پوری طرح اپنے مقاصد سے آگاہ نہیں کیا تھا، نہ ہی اس نے کسی مرحلے پر ضرورت سے زیادہ کچھ جاننے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ وہ سراسر حکم کا بندہ تھا اور یہ سمجھ رہا تھا کہ میں کسی ارادے سے ایک مکان میں چوروں کی طرح گھسوں گا اور وہ باہر رہ کر خطرے

کی صورت میں میرے اشارے کا منتظر رہے گا۔
"مجھے ایک آدمی کی تلاش ہے۔" میں نے اسے آگاہ کیا "اس سے رات کے ایک سے تین بجے تک ایک فون نمبر پر گفتگو کی جا سکتی ہے۔ وہ نمبر اسی گھر کا ہے۔ مقررہ اوقات کے علاوہ فون کرنے پر ایک بوڑھی اور بیمار عورت کی آواز سنائی دیتی ہے جو اس شخص سے سراسر لاعلم ہے۔ وہ عورت اس وقت بھی اپنی خوابگاہ میں بے خبر سو رہی ہے۔ پہلے اس کا فون صحیح تھا لیکن ایک بجتے ہی ناکارہ ہو گیا۔ شاید ایکسچینج سے...."

"بہت بڑی چوک ہو گئی مجھ سے۔" وہ گہرے متاسف لہجے میں بولا۔ "کاش تم نے یہ سب پہلے ہی بتا دیا ہوتا تو اس وقت تمھارا شکار تمھارے قبضے میں ہوتا۔"

"وہ کیسے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"تمھیں وہ ٹیلیفون کیبنٹ یاد ہے جس پر چڑھ کر تم اندر کودے تھے۔" اس نے کہا اور میں نے جلدی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ایک بجنے سے چند منٹ پہلے ایک دبلا پتلا پستہ قامت آدمی میری آنکھوں کے سامنے گندی گلی میں گھسا تھا۔" اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "اس نے اسی کیبنٹ کے پاس رک کر کچھ گڑبڑ کی تھی۔ میں نے اس کی ٹارچ کی روشنی میں کیبنٹ کا دروازہ کھلا دیکھا تھا۔ بمشکل چند منٹ بعد وہ کیبنٹ کا دروازہ بند کر کے دوسری طرف سے نکلا چلا گیا۔ میں سمجھا کہ محکمے کا کوئی فرض شناس ملازم ہو گا جو اتنی رات گئے کسی کی شکایت پر کام کرنے آیا ہے... مجھے معلوم ہوتا تو میں اس مردود کو رنگے ہاتھوں چھاپ لیتا۔"

"تم نے بہت بڑا کام کیا ہے۔" میں نے اضطراری لہجے میں کہا۔ "اب سارا معاملہ صاف ہو گیا۔ اس معاملے کا ایکسچینج سے کوئی تعلق نہیں، ساری گڑبڑ اسی کیبنٹ سے کی جاتی ہے۔ تاروں کی ذرا سی ردوبدل سے وہ نمبر کہیں اور منتقل ہو جاتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ میرا مطلوبہ آدمی آس پاس ہی کہیں رہتا ہے اور اس کے فون کی لائن بھی اسی کیبنٹ سے نکلی ہے... وہ پستہ قامت اب تین بجے پھر آئے گا اور تاروں کو واپس اصل جگہ جوڑ دے گا۔ کسی کو کانوں کان بھی پتا نہیں چلے گا کہ کچھ ہوا تھا۔"

"ان ڈبوں سے اتنی بڑی گڑبڑ ہو سکتی ہے تو یہ کھلے کیوں رہتے ہیں؟" اس نے حیرت سے سوال کیا۔

"یہ مقفل رہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس شخص نے کسی طرح اس کیبنٹ کی جعلی چابی بنوالی ہو یا شاید وہ پستہ قامت محکمے ہی کا کوئی لائن مین ہو۔"

"میں سمجھا۔" وہ تفہیمی انداز میں سر ہلا کر بڑبڑایا۔ "جبھی فون رکھنے والے زیادہ بل کو روتے رہتے ہیں۔ اگر تمھارا مطلوبہ آدمی ایک سے تین بجے تک دنیا جہان سے فون پر باتیں کرتا ہے تو بل بڑھیا کو ہی ملے گا جبکہ اس بیچاری کے فرشتوں کو بھی اس ردوبدل کا علم نہیں ہو گا۔"

میں نے اس سے کچھ نہیں کہا لیکن مجھے دل ہی دل میں اے۔ ٹو کی عیاری کا اعتراف کرنا پڑا۔ اس نے بہت ہوشیاری کے ساتھ چھان بین کے بعد اپنے مقاصد کے لیے مسز دلدار بھٹی کے فون نمبر کا انتخاب کیا تھا۔ اس نے اپنے وسائل سے معلوم کر لیا ہو گا کہ بڑھیا بیماری اور تنہائی کے سبب رات میں فون استعمال ہی نہیں کرتی۔ دوسری طرف وہ خود مقررہ اوقات میں اس نمبر پر صرف پیغامات وصول کرتا تھا۔ شاید خود کوئی بھی کال نہ کرتا ہو... بل کی رقوم میں کوئی اضافہ نہ ہونے کی وجہ سے بیچاری بڑھیا پورے معاملے سے بے خبر تھی یعنی اے۔ ٹو نے محض ایک آدمی کے ذریعے اپنی ذات کے گرد ایک حصار کھڑا کیا ہوا تھا۔ صرف فون نمبر کے ذریعے اس تک پہنچنا ناممکنات میں سے تھا۔ اگر کسی نے کھوج لگانے کی کوشش بھی کی ہو گی تو بڑھیا کے مکان تک پہنچ کر یہی سمجھا ہو گا کہ مسز دلدار بھٹی ہی اے۔ ٹو کے کھیل میں پوری طرح شریک ہے اور اے۔ ٹو شاید اسی کی چھت کے نیچے رہتا ہے۔ اس حد تک معلوم کرنے کے بعد تنظیم کے کسی رکن کی مجال نہیں تھی کہ اس معاملے پر مزید دماغ سوزی کرتا۔

مختلف سڑکوں سے گزر کر ہم ایسی سڑک پر نکلے جہاں سے واپسی کے لیے کسی سواری کے ملنے کے امکانات تھے تو سلطان شاہ چونک پڑا۔

"کیوں؟ اب کیا ارادہ ہے؟"

"واپسی۔" میں نے اس کی حیرت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔

"تو کیا تین بجے اس ٹھگنے کو ناپنے کا ارادہ نہیں ہے؟" اس نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔

"گتھی سلجھ گئی ہے۔ اب اگلا قدم سوچ سمجھ کر اٹھانا ہو گا۔ اس شخص کو تو کسی بھی وقت پکڑا جا سکتا ہے کیونکہ نمبروں کے ساتھ یہ کارروائی روز ہی ہوتی ہے۔"

"ضرور سوچو سمجھو۔" وہ بھاری آواز میں بولا۔ "لیکن یہ یاد رکھنا کہ میں بے کاری سے اکتا گیا ہوں، کسی وقت دماغ سنک گیا تو کسی کے بھی سر ہو جاؤں گا۔"

"فی الحال ہم غیر مسلح ہیں۔ اصولی طور پر تو مجھ کو ایسی حالت میں اس گھر میں بھی نہیں گھسنا چاہیے تھا۔ غلط کاموں میں مصیبت

کرنازل نہیں ہوتی، پھر لاہور میں ہمارے پاس کوئی ٹھکانا بھی
ین ہے۔ اسے پکڑ لیا تو قید کہاں کریں گے۔ آزاد کیا تو وہ
پنے باپ کو ہوشیار کر دے گا۔"

"قید کرنے کی کیا ضرورت ہے؟" وہ تیوریوں پر بل
ل کر بولا۔ "پوچھ گچھ کے بعد نرخرا دبایا اور قصہ ختم۔"

"مقررہ اوقات میں فون نمبروں میں ردوبدل نہ ہوا تو
ی اوپر والا ہوشیار ہو جائے گا، یہ نہ بھولو کہ ہمارا مقابلہ بہت
لاک اور منظم لوگوں سے ہے۔" میں نے اسے سمجھاتے ہوئے
"پستہ قامت کو تو چھیڑنا ہی نہیں ہے... اب ہمیں کسی طرح
ی نمبر کا پتا چلانا ہے جس پر بڑھیا کا نمبر منتقل ہوتا ہے۔ میں
نے شکار کو بے خبری میں دبوچنا چاہتا ہوں۔ اسے میرے
ئم کی ذرا بھی بھنک مل گئی تو ہم دونوں کو کہیں امان نہ مل
ہم۔"

وہ یوں شانے اچکا کر رہ گیا جیسے میری باتیں اس کے
ابلِ فہم رہی ہوں۔
وہ براہِ راست مرنے مارنے والا آدمی تھا۔ ایسے معاملات
، سوچ بچار کا قائل نہیں معلوم ہوتا تھا۔

***

امکان تو نہیں تھا کہ میں آواز بدل کر فون کرتا تو اے۔ ٹو
ان لیتا لیکن میں نے پھر بھی محتاط رہنا مناسب سمجھا۔
نچنے کے بعد میں نے غزالہ کو مسز دلدار بھٹی کے نمبروں پر فون
ی ہدایت کی تو اس کے استفسار پر مجھے اپنی کارکردگی
ا اسے سنانا پڑ گیا۔ سلطان شاہ اپنے کمرے میں چلا گیا
یں نے روانی میں اس کے بے تابانہ رویے کے بارے
بتا ڈالا اور غزالہ پھریری لے کر رہ گئی۔
"بہت خونخوار آدمی ہے وہ۔"
"خونخوار نہیں، جوشیلا اور ناتجربہ کار کہو۔" میں نے اس کی
" جو کام ذرا سی ذہنی ورزش سے ہو سکتا ہے وہ اسے
ت کے بل پر انجام دینا چاہتا ہے، تھوڑی سی تربیت
ندن بن جائے گا۔"
ایک بات سچ سچ بتائیں۔" وہ براہِ راست میری آنکھوں
ے ہوئے سنجیدہ لہجے میں بولی۔
وہ کیا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔
سکندر علی کیسے مرا تھا؟"
مجھے کیا پتا۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "نہ مرتا تو ضرور بیرک
را جاتا۔"
سلطان شاہ تو صرف باتیں بنانا جانتا ہے ورنہ میرا

اندازہ ہے کہ اپنے دشمنوں کے حق میں آپ پتھر کی طرح سخت اور بے رحم ہیں۔"

"یہ کیا قصہ لے بیٹھیں تم۔" میں نے چڑچڑے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "آپریٹر کو نمبر دو جلدی سے۔"

اس نے ہوٹل کی آپریٹر کو مسز دلدار بھٹی کا نمبر دے دیا۔

تھوڑی دیر بعد آپریٹر نے اطلاع دی کہ نمبر میں کوئی گڑبڑ ہے۔ نمبر ملتا ہے مگر دوسری طرف سے ریسیور اٹھانے والا مسز دلدار بھٹی کا نام سنتے ہی رانگ نمبر کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیتا ہے۔

ریسیور رکھ کر وہ معنی خیز انداز میں میری طرف دیکھنے لگی۔

ہوٹل میں یہی ایک دشواری تھی کہ فون اپنی مرضی کے مطابق استعمال نہیں کیا جا سکتا تھا مگر پھر بھی میں نے ایک راہ نکال ہی لی۔

غزالہ نے آپریٹر پر کال کی اہمیت واضح کرتے ہوئے براہِ راست کمرے میں لائن مانگی اور آپریٹر نے فوراً ہی اس کی درخواست قبول کر لی۔ پھر غزالہ نے نمبر ملانا شروع کیا تو ریسیور میرے کان سے لگا ہوا تھا۔

پہلی ہی گھنٹی پر ریسیور اٹھا لیا گیا اور میرے کانوں میں ہیلو کی مخصوص غراہٹ گونج اٹھی۔

میں نے جلدی سے غزالہ کو اشارہ کیا اور وہ اپنا منہ ماؤتھ پیس کے قریب لے آئی۔ "مسز دلدار بھٹی موجود ہیں؟"

لیکن اس کا فقرہ مکمل ہونے سے پہلے اے۔ ٹو نے غصیلے انداز میں رانگ نمبر کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔ اس نمبر پر اپنے کانوں سے اے۔ ٹو کی آواز سننے کے بعد ہر ثبوت سامنے آ گیا تھا۔

"کون تھا؟" غزالہ نے تجسس آمیز لہجے میں پوچھا۔

"ہم صحیح خطوط پر آگے بڑھ رہے ہیں، وہی تھا جس کی مجھے تلاش ہے۔"

"پھر اب کیا کریں گے آپ؟"

"ٹیلی فون کے محکمے کے کسی آدمی کو پکڑنا ہو گا۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، کیبنٹ سے ہر نمبر کے لیے کیبل کا ایک علیحدہ پیئر نکلتا ہے۔ یہ دیکھنا ہو گا کہ اس کیبنٹ پر مسز دلدار بھٹی کے علاوہ اور کون کون سے نمبر ہیں پھر انھیں یکے بعد دیگرے دیکھنا ہو گا۔"

"کیوں نہ چھپ کر اس آدمی کا پیچھا کریں جو رات کو تاروں میں گڑبڑ کرتا ہے، ہو سکتا ہے کہ وہ اے۔ ٹو ہی کے مکان میں رہتا ہو۔" اس نے تجویز پیش کی۔

”اوّل تو اس جیسے محتاط اور پُراسرار آدمی سے یہ امید نہیں کہ اس نے تار بدلنے والے کو اپنے گھر میں رکھ چھوڑا ہوگا ہو سکتا ہے کہ تار بدلنے والے کو خود علم نہ ہو کہ وہ کس کے لیے کام کر رہا ہے۔“ اسے منہ کھولتے دیکھ کر میں نے جلدی سے وضاحت کی۔ ”فون نمبر معلوم ہونا اور بات ہے لیکن آدمی سے وہ لاعلم ہوگا۔ بس کسی نہ کسی طرح اسے مقررہ وقت پر اپنا معاوضہ مل جاتا ہوگا۔ پھر اگر اسے تعاقب کا شبہ ہوگیا اور وہ کسی سے اس کا ذکر کر بیٹھا تو نہ صرف اسے مار دیا جائے گا بلکہ ہم ہمیشہ کے لیے اے۔ ٹو کا سراغ کھو دیں گے۔ میں تنظیم کے طریقۂ کار سے اچھی طرح واقف ہوں۔ یہاں راز داری پہلی ضرورت ہے۔ اس کے لیے وہ کسی بھی مہرے کو ٹٹولنے سے دریغ نہیں کرے گا۔“

وہ پورے وجود سے کانپ گئی۔ ”میرے تو رونگٹے کھڑے ہونے لگے ہیں۔ ہمیں صرف ایک آدمی کو تلاش کرنا ہے اور اس سے باز پرس کرنی ہے لیکن آپ کی باتوں سے تو ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے یہ کوئی خونریز مقابلہ ہو۔ سلطان شاہ آپ کا ساتھی ہے اور خون کا پیاسا ہے۔ دوسری طرف آپ کا مقابل اے۔ ٹو سے ہے جو اپنی ذات کو خطرات سے بالاتر رکھنے کے لیے کسی کا بھی لہو بہا سکتا ہے۔“

”مجبوری ہے۔“ میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے بے پروائی سے کہا۔ ”جب خون کے پیاسوں سے مقابلہ ہو تو ان ہی کے انداز میں جوابی کارروائی کی تیاری کرنا پڑتی ہے۔“

”میں تو اب کچھ اور ہی سوچ رہی ہوں۔“ وہ پُرخیال انداز میں بولی۔

”وہ کیا؟“ میں نے پُرتجسس لہجے میں سوال کیا۔

”اگر حالات اس قدر خوفناک ہیں تو کیوں نہ ہم کنارہ کشی اختیار کرلیں۔“ وہ سنجیدگی کے ساتھ بولی۔ ”دشمن پر غالب آنا تو بعد کی بات ہے، اگر آپ کو کچھ ہوگیا تو کیا ہوگا؟“

اس کی پیشانی پر فکرمندانہ لکیریں دیکھ کر میں ہنس پڑا۔ ”فی الحال تو بھاڑ کمزور سا رشتہ ہے ہم دونوں کا۔ ہم مسلمان ہیں۔ ہندو ہوتے تو شاید تمھیں ستی ہونا پڑتا۔ میرے بے جان جسم کے ساتھ۔“

وہ جھلا گئی۔ ”بعض اوقات آپ بلاضرورت بولتے ہیں۔ مجھے اپنی نہیں، آپ کی سلامتی زیادہ عزیز ہے۔“

”میری مانو تو تم خاموشی سے کراچی واپس چلی جاؤ، ایسا نہ ہو کہ ایشین سنڈیکیٹ تمھارے لیے ایک بھیانک جال بن جائے۔ اکیلا رہ کر میں زیادہ یکسوئی سے اپنا کام کر سکوں گا۔“

وہ چند ثانیوں تک اپنی ٹھوڑی داہنی ہتھیلی پر ٹکائے پُرخیال نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی پھر بولی۔ ”اب مجھے بھی اندازہ ہو رہا ہے کہ کہیں میری ذات آپ کے لیے دشواریاں نہ پیدا کردے، اکیلے رہ کر آپ اپنی پوری توجہ ایک ہی محاذ پر مرکوز کر سکیں گے۔ پھر بھی جانے سے پہلے ایک بار میں ایشین سنڈیکیٹ لمیٹڈ کے دفتر کا چکر ضرور لگاؤں گی، اس ادارے کی طرف سے میرے ذہن میں گہرا تجسس انگڑائیاں لے رہا ہے۔“

”غنیمت ہے کہ تم نے بہت جلد خود ہی صورتحال کا اندازہ لگا لیا، اگر مجھ سے ذرا بھی چوک ہوگئی تو مجھے قابو میں کرنے کے لیے وہ تم پر ہاتھ ڈال سکتے ہیں۔“ میں نے گہرا سانس لے کر کہا۔

”سلطان شاہ اب کیا کرے گا؟“ چند ثانیوں کے بعد غزالہ نے کسمساتے ہوئے سوال کیا۔

”کل تم ایشین سنڈیکیٹ جاؤ گی تو وہ دور رہ کر تمھاری نگرانی کرے گا، میں بھی یہاں سے جلد از جلد واپس لوٹنا چاہتا ہوں تاکہ کسی کو کراچی سے میری غیر حاضری کا علم نہ ہو سکے۔ اس ہنگامی دور میں بھی ایک اہم کام میرے سپرد ہے جسے اب مکمل ہو جانا چاہیے ورنہ میری پوزیشن مخدوش ہو جائے گی۔“

”کون سا اہم کام؟“ اس نے حیرت سے سوال کیا۔

”کیریئرز کے ذریعے ہیروئن کی بیرون ملک اسمگلنگ۔“ میں نے ایک بار پھر گہرا سانس لیا۔ ”اس وقت تنظیم کی ساری سرگرمیاں معطل ہیں لیکن یہ کام بہرصورت ہونا ہے، آدمیوں کا انتظام کرتے ہی مجھے اے۔ ٹو سے رابطہ پیدا کرنا ہوگا تاکہ اس سے بقیہ ہدایات لے سکوں۔“

”آپ گلے تک اس دلدل میں دھنسے ہوئے ہیں۔“ وہ تاسف آمیز لہجے میں بولی۔ ”خدا کرے کہ ہم دونوں جلد ہی اس منحوس تنظیم کا شیرازہ منتشر کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔“

میں اس کی معصوم سی خواہش پر دل ہی دل میں ہنس کر رہ گیا۔ اگر محض بددعاؤں سے بدی کا مٹنا ناممکن ہوتا تو شاید دنیا اس وقت جنت بن چکی ہوتی۔

❦❦❦

مکان وسیع و عریض تھا۔ پھاٹک سے لے کر در و دیوار تک، ہر چیز سے تزک و احتشام جھلک رہا تھا لیکن ان سب تاثرات پر ویرانی کا احساس بری طرح حاوی تھا۔

پھاٹک کے قریب دیوار پر چڑھی ہوئی پھولدار بیلوں کے سبز پتوں پر جمی ہوئی گرد کی تہوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہاں دیکھ بھال کا عنصر نہ ہونے کے برابر تھا۔ پھاٹک کے سامنے سے گزرتے ہوئے نجانے کیوں میری چھٹی حس نے وہاں ویرانی کا اعلان کیا تھا۔

صبح میں نے غزالہ کی دیکھ بھال کے بارے میں سلطان شاہ کی بریفنگ کی تھی۔ اس کے بعد وہ دونوں الگ الگ ہوٹل سے روانہ ہوگئے تھے۔ ان کے جانے کے بعد میں کافی پیتے ہوئے مسلسل غزالہ کو درپیش امکانی خطرات کے بارے میں سوچتا رہا۔ پھر ذہنی رو میں تبدیلی کے خیال سے اخبار لے بیٹھا مگر خبریں پڑھنے کے باوجود ذہن میں چلتے ہوئے چرخے کا سلسلہ منقطع کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

دس بجے میں مشتبہ کیبنٹ کا نمبر لے کر علاقے کے ٹیلیفون ایکسچینج میں پہنچا تھا۔ وہاں تھوڑی دیر کے بعد میں سائیکل پر روانہ ہونے والے محکمے کے ایک کارکن سے رابطہ قائم کرنے میں کامیاب ہوگیا جو میری گفتگو سے مرعوب ہوگیا۔

میں نے اپنے مقصد پر آنے سے قبل سو روپے کا ایک نوٹ اسے تھمایا جسے اس نے کچھ کہے سنے بغیر اپنی جیب میں ڈال لیا۔ شاید اس قسم کا لین دین اس کے معمولات میں شامل تھا البتہ نوٹ کی مالیت اس کے لیے حیران کن رہی تھی۔

کیبنٹ کا نمبر اس نے غور سے دیکھا تھا پھر چند منٹ میں واپسی کا وعدہ کر کے دفتر کی عمارت میں چلا گیا۔ جاتے جاتے اپنی سائیکل وہ میری تحویل میں دے گیا تھا۔

واپس آیا تو کاغذ کے پُرزے کی پشت پر سات نمبر درج تھے۔ اس نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ ان نمبروں میں میرے دلچسپی لینے کا سبب کیا ہے۔

اس سے رخصت ہو کر میں نے جی۔ پی۔ او کال آفس سے نیومیریکل ڈائرکٹری لے کر نمبروں کے مطابق ساتوں پتے نوٹ کیے اور اپنی مہم پر روانہ ہوگیا۔

یکے بعد دیگرے میں نے ان ساتوں مکانوں کا جائزہ لے لیا جن میں ایک مسٹر دلدار بھٹی کا مکان تھا جو میرے نزدیک ہر طرح کے شبہے سے بالاتر ثابت ہو چکا تھا۔ بقیہ چھ میں سے پانچ مکان بارونق اور پوری طرح آباد تھے لیکن چھٹا اپنے تمام تر تزک و احتشام کے باوجود مشتبہ نظر آ رہا تھا۔

اس ابتدائی جائزے کے بعد میں نے قرب و جوار میں گھوم پھر کر خاصا وقت برباد کیا۔ اس دوران میں معلوم ہوا کہ بقیہ پانچوں مکانات میں علاقے کے شرفا کا قیام تھا جو عیالدار ہونے کے ساتھ ساتھ لگے بندھے معمول کے عادی تھے۔ میرے نزدیک اس شہر میں کسی شخص کے معزز اور شریف ہونے کے لیے محض مالی اعتبار سے باحیثیت ہونا کافی تھا اور جب تک کسی آسودہ حال شخص کے بارے میں پولیس یا کسی اور ذریعے سے قانون کی خلاف ورزی کا انکشاف نہ ہو اس کے پڑوسی وغیرہ اسے معزز سمجھتے رہتے ہیں۔ اس فلسفے کی روشنی میں ان پانچوں امکانات کو بھی میں نے اپنی فہرست سے خارج نہیں کیا تھا لیکن چھٹا ویران مکان عملی سہولتوں کی بنا پر میری نگاہ میں زیادہ اہمیت اختیار کر گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس وقت میں دوبارہ اس ویران مکان کے قرب و جوار میں منڈلا رہا تھا۔

بظاہر وہاں مکمل ویرانی کا راج تھا لیکن مجھے پورا یقین تھا کہ اندر کوئی نہ کوئی رکھوالا ضرور مقیم ہوگا کیونکہ دونوں آہنی پھاٹکوں میں سے کوئی بھی باہر سے مقفل نہیں تھا۔

اس روز میں نے ہوٹل سے خالی ہاتھ نکلنے کی حماقت نہیں کی تھی۔ میری جیب میں وہ مختصر سا پستول بھرے ہوئے چیمبر کے ساتھ موجود تھا جو سی ون کے ذریعے بارودی بریف کیس میں مجھ تک پہنچا تھا۔

اس مکان میں داخلے کے لیے بقیہ تین سمتوں سے کسی کوشش کا کوئی امکان نہیں تھا کیونکہ پشت اور دونوں پہلوؤں پر اس کے احاطے کی دیواریں دوسروں کے ساتھ مشترک تھیں۔ لے دے کر بس سامنے والی دیوار ہی سے کود کر یا پھاٹک کے ذریعے اندر داخل ہوا جا سکتا تھا۔

خود کو کسی کی نگاہ میں لائے بغیر میں چار بجے تک اسی علاقے میں منڈلاتا رہا پھر کوئی قدم اٹھانے سے پہلے ایک قریبی فون بوتھ سے ہوٹل فون کر ڈالا۔

میں ہوٹل کے عملے پر غیر ضروری طور پر سلطان شاہ اور غزالہ کے تعلق کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا لہٰذا میں نے دو مختلف کالز میں آپریٹر سے ان کے کمروں کے نمبر مانگے لیکن دونوں بار ہی مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔

ان دونوں کی ہوٹل سے طویل غیر حاضری میرے لیے باعثِ تشویش تھی لیکن اس وقت میں ان کے معاملے میں بے بس تھا لہٰذا میں نے دھندلکا پھیلتے ہی اپنی کارروائی کے آغاز کا فیصلہ کرلیا۔

ایک ہوٹل میں بھاری ناشتا کرنے کے بعد آخر کار ساڑھے چھ بجے میں اس مکان پر جا پہنچا۔

پھاٹک کے داہنی جانب والے ستون میں کال بیل کا پُش بٹن نظر آ رہا تھا۔ میں نے تن بہ تقدیر ہو کر بٹن پر انگلی رکھ دی۔ چند سیکنڈ میں میں نے بٹن سے انگلی ہٹالی۔ اس دوران میں اندر سے کوئی بھی آواز نہیں سنائی دی۔ اگر وہ بٹن واقعی کسی گھنٹی سے منسلک تھا تو گھنٹی مکان کے کسی ایسے دور افتادہ گوشے میں نصب تھی جہاں سے اس کی آواز کا سنائی دینا ناممکنات میں سے تھا۔

تھوڑے تھوڑے وقفے سے تین کوششوں کے بعد مایوس ہو کر میں نے آہنی پھاٹک پھلانگنے کا ارادہ کیا مگر فوراً ہی اسے ترک کر دیا۔ اگر وہ مکان واقعی ویران پڑا ہوا تھا تو اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے بجائے شور شرابا کر کے دوسروں کو اپنی طرف متوجہ کرنا حماقت کے مترادف ہوتا۔

میں نے قرب و جوار کا جائزہ لیا لیکن شام کے دھندلکے میں مجھے کوئی ایسا شخص نظر نہیں آیا جس کا خوف مجھے پیش قدمی سے روکنے کا باعث بنتا، میں پھرتی سے آہنی پھاٹک پر چڑھا اور اندر نیم پختہ روِش پر کود گیا۔

میں کود کر اپنے قدموں پر سیدھا ہونے بھی نہ پایا تھا کہ سامنے سے بجلی کی سرعت کے ساتھ کوئی لپکا اور اپنے بھاری بھرکم وجود کے ساتھ مجھ پر آ پڑا۔ میں اس ناگہانی مصیبت سے فوری طور پر اپنا کوئی دفاع نہیں کر سکا اور حلق سے بے معنی سی غراہٹ نکالتا ہوا، پشت کے بل اس کے نیچے ڈھیر ہو گیا۔

وہ جو کوئی بھی تھا، ضرورت سے زیادہ مغلوب الغضب معلوم ہوتا تھا اور مجھے ایک لمحے کی بھی مہلت دینے کے لیے آمادہ نہیں تھا۔ مجھے گراتے ہی اس نے اپنے چوڑے چکلے ہاتھوں سے وحشیانہ انداز میں میرا گریبان تھام لیا اور پھر میں نے ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں بھانپ لیا کہ وہ میرا آخری موقع تھا۔ اگر اس وقت میں غفلت سے کام لیتا تو وہ پوری قوت سے میرے چہرے پر ٹکر رسید کر کے مجھے پوری طرح زیر کر لیتا۔

سرعت کے ساتھ دونوں پہلوؤں سے میرے ہاتھ حرکت میں آئے اور اس سے قبل کہ وہ میرے چہرے پر ٹکر رسید کرنے میں کامیاب ہوتا، میں نے دونوں ہتھیلیوں کے بھاری حصوں سے اس کی کنپٹیاں بجا دیں۔ میرے اس غیر متوقع وار نے لحظہ بھر کے لیے اس کے اوسان خطا کر دیے اور میں نے اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر اس خونخوار آدمی کو اپنے سینے سے اچھال پھینکا۔

مجھے اس کے بوجھ سے تو نجات مل گئی مگر اس کے ہاتھ جونکوں کی طرح میرے گریبان سے الجھے رہے، میں تڑپ کر زمین سے اٹھا اور اٹھتے ہی اس کے وزنی جبڑے پر ایک بھرپور مکہ رسید کر دیا۔

اس کے حلق سے خوفناک سی غراہٹ آزاد ہوئی اور وہ گریبان چھوڑ کر غضب ناک انداز میں میری کمر سے لپٹ گیا۔ اس کی گرفت اس قدر خطرناک تھی کہ میں شپٹا گیا۔ وہ زور لگا کر شاید میری کمر توڑ ڈالنا چاہتا تھا اور اسی کے ساتھ مجھے اوپر اٹھا کر زمین پر پھینک دینے کے لیے بھی کوشاں تھا۔ میرے ہاتھ بھی اس کی گرفت میں پھنسے ہوئے تھے اور میں جیب سے پستول نکالنے کے معاملے میں بے بس ہو کر رہ گیا تھا۔

میں پوری طرح چوکنا تھا اور اپنے بدن کو اکڑا لیا تھا، وہ بار بار کچکچا کر زور لگاتا تھا اور ہر بار مجھے رگیدتا ہوا پھاٹک سے کچھ دور لے جاتا تھا جہاں دھندلکا چھانے کے باوجود وسیع لان پر لمبی لمبی گھاس کے ساتھ خودرو پودوں پر مشتمل جھاڑ جھنکار نظر آ رہے تھے۔

ایک بار جیسے ہی مجھے چند ثانیوں کے لیے قدم جمانے کی مہلت ملی میرا داہنا گھٹنا تیزی سے حرکت میں آیا اور پوری قوت سے اس کے پیٹ کے نچلے حصے میں گھس گیا۔

فوراً ہی اس کی گرفت ختم ہو گئی اور وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ تھامے، تکلیف سے کراہتا ہوا پیچھے الٹ گیا، میرے لیے وہ موقع غنیمت تھا، میں نے پھرتی سے جیب میں ہاتھ ڈالا تو دل دھک سے رہ گیا۔ اس مار دھاڑ میں پستول میری جیب سے کہیں گر چکا تھا۔

میں اپنی بدنصیبی کو دل ہی دل میں کوس کر رہ گیا۔ میں غیر مسلح ہو چکا تھا اور میرا حریف جسمانی اعتبار سے مجھ سے کہیں برتر تھا۔ مجھے لمحے بھر کے لیے خیال آیا کہ شاید وہ بھی غیر مسلح ہی تھا۔ اس کے پاس کسی قسم کا اسلحہ موجود ہوتا تو میرے اندر کودنے پر وہ مجھ پر حملہ آور ہونے کے بجائے اسلحہ کی زد پر مجھے للکار کر اپنا قیدی بنانے کی کوشش کرتا۔

میرے سامنے دو ہی راستے رہ گئے تھے۔ فوری طور پر بھاگ کر لان پر پھیلے ہوئے خودرو جنگل میں پناہ لوں اور موقع ملتے ہی باہر فرار ہونے کی کوشش کروں یا پھر ڈٹ کر مقابلہ کروں اور اسے ہر قیمت پر نیچا دکھانے کی کوشش کروں۔

اس وقت بازی الٹ ضرور گئی تھی لیکن میری ذات بھیانک خطرات سے محفوظ تھی۔ اندھیرے کے باعث میرا حریف ہرگز میرے خدوخال کا اندازہ نہیں لگا سکتا تھا۔ اگر وہ اے۔ ٹو کا ہی نمک خوار تھا تو میرے نکل جانے پر اپنے آقا کو کسی نامعلوم آدمی کی مداخلت کی اطلاع دیتا اور اے۔ ٹو شاید اس مکان کو استعمال کرنا ترک کر دیتا، ہو سکتا تھا کہ فون نمبر کے بارے میں اپنی حکمت عملی [illegible] تا اور اس کے سراغ کے سلسلے میں مجھے از سر نو محنت کرنا پڑتی لیکن اسے بھول کر بھی مجھ پر شبہ نہ ہوتا۔ دوسری طرف اگر میرا حریف اپنی بے پناہ طاقت کے بل پر مجھے اپنا قیدی بنا لینے میں کامیاب ہو جاتا تو میرا انجام یقیناً عبرتناک ہوتا — باز پرس کے دوران میرے لیے اپنی شناخت چھپانی ناممکن ہوتی اور اے۔ ٹو اپنے ایک باغی ماتحت کے حق میں موت کا فیصلہ صادر کرنے میں ذرا بھی تردد نہ کرتا۔

یہ سارے خیالات ایک تیز رفتار فلم کی طرح پل بھر میں ذہن میں گھوم گئے لیکن اس سے پیشتر کہ میں کوئی فیصلہ کرتا، میرا وحشی حریف اپنی تکلیف پر قابو پا کے میری طرف پلٹ چکا تھا۔

اس بار وہ براہِ راست مجھ پر حملہ آور ہونے کے بجائے چند قدم دور رُکا تھا۔ جیسے حملہ کرنے کے لیے میرے کسی کمزور پہلو کا متلاشی ہو پھر اسی لمحے میں نے کسی گراری دار چاقو کے کھلنے کی آواز سنی اور میرے دل کی دھڑکنیں یک بیک تیز ہو گئیں۔

صورتحال اچانک ہی گمبھیر ہو گئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں دبے ہوئے چاقو کا پھل، اس کے ہاتھ کی جنبش کے ساتھ کسی کسی زاویے پر چمک اٹھتا تھا اور وہ دانت پیس کر مغلظات بکتا میری طرف بڑھ رہا تھا۔

وہ طاقت کے گھمنڈ میں پُراعتماد تھا اور آخری وار کرنے سے پہلے بھپکیاں دے دے کر مجھے خوفزدہ کرنے کی کوششوں میں مصروف تھا اور میں آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتا جا رہا تھا، یوں ہم دونوں کے درمیان چند قدم کا فاصلہ مسلسل برقرار تھا۔

"آج تیرا نخرا نہ کاٹا تو نام نہیں۔" وہ ایک مرتبہ پھر چاقو والا ہاتھ اچانک آگے بڑھا کر نفرت آمیز لہجے میں غرایا۔

اس بار مجھے وہ موقع نظر آ ہی گیا جس کے انتظار میں میں پسپائی اختیار کرتا ہوا تاریک لان کی طرف سرک رہا تھا۔ میں نے سرعت کے ساتھ اپنی جگہ چھوڑی اور اس پر جا پڑا۔ اسے میری پیش قدمی کی ذرا بھی توقع نہیں تھی پھر بھی آخری لمحے پر اس نے میری زد سے بچنے کی بہت کوشش کی لیکن میں نے اپنی کلائی پر چاقو کے پھل کی چند خراشوں کی پروا کیے بغیر اس کی داہنی کلائی اپنی گرفت میں لے کر پوری قوت سے موڑنا شروع کر دی۔

اس کے لیے شاید وہ مقابلہ کھیل تھا مگر میرے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ تھا۔ اس کا چاقو والا داہنا ہاتھ نیچے تک لے جانے کے بعد میں نے ایک وحشیانہ جھٹکے کے ساتھ کلائی موڑ کر اسے شانے کے نیچے کمر سے لگا دیا اور وہ تکلیف سے کراہتا ہوا بے اختیار قدرے آگے جھک گیا۔

میں مسلسل اوپر ہی زور لگاتا رہا تاکہ داہنے شانے کے جوڑ پر دباؤ میرے حریف کے لیے ناقابلِ برداشت ہو جائے اور وہ شانہ اکھڑنے سے پہلے چاقو چھوڑ دے۔

خاموش مگر جانگسل زور آزمائی جاری رہی۔ اس نے دو بار میری ٹانگوں پر لات مار کر میرا توازن بگاڑنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا پھر جب تیسری بار اس نے بائیں ٹانگ چلائی تو میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ کر اس کی وہی ٹانگ لپک لی اور وہ حلق سے کریہہ آوازیں نکالتا ہوا ڈھیر ہو گیا۔ گرتے ہوئے اس کے حلق سے غیر ارادی طور پر نکلنے والی اوہ کی درد میں ڈوبی ہوئی آواز میرے لیے بہت فرحت بخش تھی۔

میں نے ذرا دور ہٹ کر دیکھا تو اس کا داہنا ہاتھ پسلیوں سے نیچے پیٹ کے نیچے دبا ہوا تھا اور وہ آہستہ آہستہ پہلو بدل رہا تھا۔ پھر اس کا لہولہان لباس سامنے آ گیا۔ گرتے ہوئے چاقو کا پھل بری طرح اس کے پیٹ میں اتر گیا تھا اور زخم سے تیزی سے خون بہہ کر زمین میں جذب ہو رہا تھا۔

اس نے کراہتے ہوئے بدقت تمام چاقو اپنے پیٹ سے باہر نکالا، اب وہ میری طرف متوجہ نہیں تھا۔ اس نے کہنیاں ٹیک کر اٹھنا چاہا پھر ایک دم پشت کے بل زمین پر گر کر دونوں ہاتھوں سے یوں زخم کو تھاما تھا جیسے کھلے ہوئے پیٹ سے آنتیں باہر نکل پڑنے کا خوف ہو۔

میں نے بڑھ کر بے رحمی سے اس کی کنپٹی پر ایک ٹھوکر رسید کی اور پھرتی سے پیچھے ہٹ آیا۔ اس وقت اپنے حریف کے بارے میں میرا دل نفرت یا ہمدردی کے جذبات سے یکسر عاری تھا۔ میری نگاہ میں وہ محض ایک مہرہ تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ نسبتاً خاموشی کے ماحول میں ہونے والے مقابلے کے بھیانک انجام کو اپنی یقینی موت کی صورت میں بھانپ کر کہیں وہ چیخ پکار شروع نہ کر دے تاکہ قرب و جوار کے لوگ ادھر متوجہ ہو جائیں اور میرے فرار کی راہیں مسدود ہو جائیں۔ ٹھوکر کھا کر وہ کراہا اور اس کا پورا بدن زمین سے کئی انچ اوپر اچھلا، اس کے بعد اس کی آواز معدوم ہوئی اور جسم ہلکے سے تشنج سے گزر کر ساکت ہو گیا۔

میں نے بہت احتیاط سے اس کا جائزہ لیا تو وہ واقعی بےہوش ہو چکا تھا۔ چاقو اس کے قریب ہی زمین پر پڑا ہوا تھا اور اس کے اپنے لہو میں ڈوب چکا تھا۔

اس کی نبضوں کی رفتار بھی قدرے سست ہو گئی تھی اور بہنے والے خون کی بھاری مقدار کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں تھا کہ اسے فوری طبی امداد نہ ملی تو وہ مر جائے گا۔

مقابلے کے کسی بھی مرحلے پر میں نے اسے قتل کرنے کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ وہ ضرور میرا نخرہ کاٹنے کے بارے میں ہرزہ سرائی کر رہا تھا جب کہ میں سراسر مدافعت ہی کرتا رہا اور اگر اس کے باوجود وہ مر رہا تھا تو یہ اس کا اپنا مقدر تھا جسے تبدیل کرنے کا نہ مجھے کوئی اختیار تھا نہ حق۔

طبلِ جنگ بج چکا تھا۔ اے۔ ٹو اور اس کی تنظیم کے خلاف میری جنگ کا آغاز ہو چکا تھا اور اس جنگ میں فتح کے لیے سب کچھ جائز تھا۔

جاں بلب دشمن کی موت کا انتظار کرنے کے بجائے میں اپنے گمشدہ پستول کی تلاش میں مصروف ہوگیا۔ میرے لیے اس کا حصول بہت ضروری تھا ورنہ اس معاملے میں میری ذات بے نقاب ہوسکتی تھی۔

ہم دونوں کا مقابلہ مختصر سے رقبے میں ہوا تھا لہٰذا جلد ہی میں اپنا پستول تلاش کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ مجھے یقین تھا کہ اصل عمارت میں داخلے کے لیے اب شاید اس ہتھیار کے استعمال کی نوبت نہیں آئے گی۔ اس عمارت میں اگر کوئی اور متنفس موجود ہوتا تو ضرور اپنے ساتھی کی مدد کو آتا۔ غالباً وہی اس عمارت کا اکلوتا رکھوالا تھا۔

بظاہر اس عمارت کا واحد مکین میرے ہاتھوں بے ہوش ہو کر موت کی راہ پر گامزن ہوچکا تھا اور عمارت میں میرے لیے کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن میں تنظیم اور اس کے بڑوں کے طریقۂ کار سے خوب واقف تھا۔ وہ لوگ ارتکابِ جرم کے روایتی طریقوں کے عادی نہیں تھے بلکہ جدید دور کی ایجادات سے بھرپور استفادے کے قائل تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ سی۔ ون نے جیوا ہاؤز کے جس کمرے میں طاقتور ٹرانسمیٹر ایم۔ ٹی۔ تھری ہنڈرڈ نصب کیا تھا وہاں کسی کی مداخلتِ بے جا سے نمٹنے اور رواقف رہنے کے لیے دوسرے شعبدوں کے علاوہ خود کار کیمرہ بھی نصب کیا گیا تھا تاکہ مداخلت کار کی تصویر لے کر بعد میں جوابی کارروائی کی جاسکے۔

ہر وہ جگہ جہاں آدمی کو نظرانداز کر کے کسی مشین پر اعتماد کیا جاسکتا تھا تنظیم میں وہاں مشینی بندوبست نافذ تھا اور اگر وہ عمارت واقعی کسی اہمیت کی حامل تھی تو وہاں بھی مخصوص حصّوں میں کیمرے یا کسی اور حفاظتی انتظام کی موجودگی کے تمام تر امکانات تھے۔

عمارت کی طرف بڑھنے سے قبل میں نے جیب سے نائلون کا موزے نما نقاب نکال کر سر...... پر منڈھ لیا اور پھر احتیاط سے عمارت کے برآمدے کی طرف بڑھنے لگا۔

اس وقت میرے ذہن پر عجیب وغریب خیالات نے یلغار کی ہوئی تھی۔ موت کے سوداگر ہیروئن کی تجارت میں بے اندازہ پیسہ کما رہے تھے اور اس پیسے کی مدد سے اوپر والوں نے اپنے گرد ناقابلِ شکست حصار قائم کیا ہوا تھا۔ ان تک پہنچنا تو درکنار، ان کی شناخت تک ناممکن تھی۔ پھر بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ اس پُرشکوہ مکان میں داخلے کا راستہ محض ایک آدمی کی لاش سے گزرتا ہو۔

میری رفتار سست پڑ گئی۔

کہیں برآمدے میں جا بجا فوٹو سیل پوشیدہ نہ ہوں، کہیں ان کا سلسلہ کسی خفیہ اور بے آواز گن سے منسلک ہو کہ میرے فوٹو سیل کی زد میں آتے ہی اچانک نامعلوم سمت سے بے آواز گولیاں چلیں اور میرا بدن چھلنی ہو کر رہ جائے، میں جھرجھری لے کر رہ گیا۔ تاریکی میں ڈوبی ہوئی پُرشکوہ عمارت کے خدوخال مجھے آسیبی ہیولے کی طرح نظر آنے لگے۔

جیوا ہاؤز میں سی۔ ون نے ایم۔ ٹی۔ تھری ہنڈرڈ اور اس کے حفاظتی انتظام کی تنصیب میری موجودگی میں کی تھی اور میں فوٹو سیل کے کام کرنے کے اصول سے واقف تھا۔ فوٹو سیل اور روشنی کے مخرج کے درمیان شعاعیں منقطع ہوتے ہی حفاظتی نظام حرکت میں آسکتا تھا۔ اسے آزمانے کے لیے میرا بذاتِ خود اس خطرناک برآمدے پر چڑھنا ضروری نہیں تھا۔

میں فوراً ہی رک گیا۔ لان میں پھیلا ہوا جنگل میرے تجربے کے لیے خاصا مواد فراہم کرسکتا تھا۔

میں نے لان سے ایک قدِ آدم خودرو پودا جڑوں سمیت اکھاڑ لیا لیکن خاصی دیر وہاں بھٹکنے کے باوجود دوسرے لوازم دستیاب نہ ہوسکے آخر کار میں عمارت کے بغلی حصّے کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں مجھے دو کمروں پر مشتمل وہ رہائش گاہ بھی نظر آگئی جو شاید میرے شکار کے استعمال میں تھی۔ بلب جلانے پر وہاں ضرورت کی ہر چیز نظر آئی مگر انھیں استعمال کرنے والا باہر اپنے خون میں نہایا ہوا پڑا تھا۔

اس طرف تلاش کے دوران میں مجھے ایک بانس کا پھٹا ہوا لمبا سا ٹکڑا مل گیا جو غالباً نالیوں وغیرہ کی صفائی کے کام میں آتا ہوگا۔ میں وہ ٹکڑا روشن کمرے کے سامنے لے آیا۔

معاً مجھے اپنی کلائی پر آنے والی خراشوں میں سوزش کا احساس ہوا اور میں نے دیکھا کہ میری داہنی آستین کا نچلا حصّہ خون کے داغوں سے بھرا ہوا تھا۔ دو جگہ سے آستین بھی کٹی ہوئی تھی اور میں اس حالت میں ہوٹل تو درکنار، شہر کے کسی روشن یا بارونق علاقے کا رُخ بھی نہیں کرسکتا تھا۔

اس کمرے میں باقاعدہ طبی امداد کا تو کوئی سامان نہیں تھا البتہ آفٹر شیو لوشن کی خاصی مقدار موجود تھی۔ میں نے لوشن سے داہنی کلائی کی خراشوں کو صاف کیا جن میں صرف ایک ذرا گہری تھی مگر اس پر بھی خون کی پپڑی جم چکی تھی۔ پھر میں نے اپنی قمیص اتار کر ایک کاغذ میں لپیٹی اور اپنے حریف کے کپڑوں میں سے ایک بش شرٹ پہن کر باہر آگیا۔

پھٹے ہوئے بانس کے ٹکڑے کے سرے پر قدِ آدم پودے کو باندھ کر میں دوبارہ برآمدے کی طرف چل دیا۔ وہاں پہنچ کر میں نے احتیاط سے دیوار کی اوٹ میں پوزیشن سنبھالی اور بانس کے ٹکڑے کو آہستہ آہستہ اس طرح آگے بڑھانے لگا کہ اس کے سرے پر بندھا ہوا پودا عمودی حالت میں رہے۔

وہ پودا برآمدے پر چند فٹ ہی بڑھا ہوگا کہ میں سناٹے [...]یا، بانس کا ٹکڑا میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور میرے بدن [...]ے مساموں کے دہانے کھل گئے۔

[...]ہلکے سے تین کھٹکوں کے ساتھ تین گولیاں زناٹے کے [...]پودے میں سے گزری تھیں، فائر بے آواز ہتھیاروں سے [...] تھے۔

[...]میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے برآمدے میں پڑے ہوئے پودے [...]رتا رہا۔ اگر مجھے بروقت وہ احتیاطی تدبیر نہ سُوجھی ہوتی تو اس [...]پودے کی جگہ میرا چھلنی بدن تڑپ رہا ہوتا۔

[...]بظاہر ویران اور غیر مخدوش نظر آنے والی اس عمارت میں [...]جنبی مداخلت کار کے لیے موت کے بھیانک اور ناقابل[...]ت پھندے کی موجودگی کا صاف مطلب تھا کہ میں خوش قسمتی [...]یح عمارت میں داخل ہوا تھا۔

[...]جیوا ہاؤز میں الیکٹرانک آلات سے منسلک حفاظتی نظام [...]خود شاہد تھا، سی ون کے مکان میں اسی قسم کے غیر مہلک [...]دھندے سے سلطان شاہ دوچار ہوچکا تھا اور اب اس [...]عریض مگر بظاہر غیر آباد عمارت میں فوٹو سیل سے منسلک [...]ر بارودی ہتھیاروں کی خفیہ تنصیبات، سب ایک ہی سلسلے [...]اں تھیں اور یقینی طور پر اس عمارت کو اسے۔ ٹو کے معاملات [...] اہمیت حاصل تھی۔

[...]عمارت کا خونخوار محافظ اپنے ہی ہتھیار سے بُری طرح زخمی [...]ا اور بے ہوشی کی حالت میں لحظہ بہ لحظہ موت کی وادی [...]بڑھ رہا تھا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ اس بدنصیب کو عمارت [...]ت پر مامور کرتے ہوئے اندر داخلے کی ممانعت ضرور [...]دگی مگر وہ برآمدے میں نصب شیطانی جال سے سراسر لاعلم [...]ہوگا تاکہ کبھی اس کے دل میں ہدایات سے انحراف [...]پیدا ہو تو وہ اس خودکار نظام کے تحت کیفرِ کردار کو [...]ے۔

[...]میں اسے۔ ٹو کے ایک ٹھکانے میں داخل ہونے میں [...]ہوچکا تھا۔ مقدّر میری یاوری کر رہا تھا۔ محافظ میرے [...]ضرر تھا، اندھیرے میں موجود خطرے سے میں باخبر ہوچکا [...]لیے برآمدے میں کھلنے والے دروازوں کا رُخ کرنے کا سوال [...]پیدا ہوتا تھا۔

رفتہ رفتہ میرے اعصاب پُرسکون ہوئے تو میں وہاں سے [...]پہلے میں نے اپنے شکار کا جائزہ لیا تو وہ بدستور بے ہوش [...]ی نگاہیں دُھندلکے کی عادی ہوچکی تھیں پھر بھی میں نے [...]کا جائزہ لیا تو زمین کے خاصے بڑے حصّے پر خون کے داغ اور

لوتھڑے نظر آئے۔ میں اپنے جوتوں کو خون میں آلودہ ہونے سے بچاتے ہوئے اس کے بے حس وحرکت بدن کے قریب پہنچا اور نبضیں ٹٹولیں تو وہاں موت کا بھیانک سکوت طاری تھا۔

وہ میرا دشمن تھا مگر اس کی موت پر میں نے اپنے دل پر بھاری پن سا محسوس کیا۔ وہ جو بھی تھا، بہت نچلے درجے کا آدمی تھا اور نجانے کن مجبوریوں کے باعث گناہوں کی اس فصل کی آبیاری کر رہا تھا۔ پھر مجھے بے اختیار طارق یاد آگیا جسے تنظیم کے بڑوں نے خطرات میں گھرا ہوا دیکھ کر کسی کتے کی طرح بے رحمی سے مروا دیا تھا، میرا خون جوش کھانے لگا۔

اور طارق ہی نے حامد کے ساتھ اس کی مجبوریوں کا سودا کیا تھا۔ ایک صاف ستھرے نوجوان اور امن پسند شہری کو اس نے سنہرا باغ دکھا کر منشیات فروشی کے دھندے میں لگایا تھا۔ حامد کی اپنی مجبوریاں تھیں اور وہ محض ایک سمجھوتے کے تحت اس کام میں ملوث ہوا تھا اور حد سے آگے بڑھنے پر ہرگز آمادہ نہیں تھا۔ اگر وہ بدنصیب کسی موقع پر ایسے ہی کسی حادثے کا شکار ہوجاتا تو بھی میں اسی طرح دل گرفتہ ہوتا کیونکہ وہ اور اس جیسے بہت سے دوسرے اس گھناؤنے کاروبار میں شامل ہونے کے باوجود ہمدردیوں کے مستحق تھے۔

حامد کے ذریعے میں نے کراچی میں چند ایسے لڑکوں اور لڑکیوں کا بندوبست کیا تھا جو ہیروئن لے کر بیرونِ ملک سفر پر روانہ ہوتے، یہ کام اتنا اہم تھا کہ اسے۔ ٹو نے تمام سرگرمیاں موقوف کرانے کے باوجود محض اس معاملے میں مجھے ہدایات لیتے رہنے کا حکم دیا تھا اور میں کراچی چھوڑ کر لاہور آ بیٹھا تھا۔

مجھے بے چینی سی محسوس ہونے لگی۔

اس عمارت میں ایک خون ہونے کے بعد اسے۔ ٹو لازماً اس فون نمبر کے بارے میں محتاط ہوجاتا جس کے ذریعے میں اس عمارت تک پہنچا تھا کیونکہ اس فون کا اس عمارت سے کوئی نہ کوئی تعلق ضرور قائم تھا... بھیڑیا زخم کھانے کے بعد بہت چالاک اور چوکنا ہوجاتا ہے۔ میرا یہی خیال اسے۔ ٹو کے بارے میں تھا۔ اگر اس کی ذہنی رو اس بحران میں میری طرف منتقل ہوجاتی تو میری اپنے ٹھکانے سے غیرحاضری میری پوزیشن کو مشکوک بنا سکتی تھی۔ اسے۔ ٹو کو اپنے مدِمقابل کسی باخبر اور خطرناک حریف کی موجودگی سے باخبر کرنے کے بعد میرا فوری کراچی لوٹنا بہت ضروری ہوگیا تھا۔

میں عمارت کی طرف بڑھا پھر میں نے وسیع وعریض رقبے پر بنی ہوئی اس عمارت کا پورا طواف کر ڈالا لیکن کہیں بھی کوئی ایسا راستہ تلاش کرنے میں کامیاب نہ ہوسکا جس سے میرا اندر داخل ہونا ممکن ہوتا۔ کھڑکیوں میں شیشے ضرور تھے لیکن شیشوں کے عقب میں ہر جو کھٹ

پر مضبوط آہنی گرل لگی ہوئی تھی جسے کاٹے بغیر اندر گھسنا ناممکنات میں سے تھا۔

کافی دیر غور و خوض کے بعد ایک تجویز میرے ذہن میں آ ہی گئی۔

برآمدے میں فوٹو سیل سے منسلک ہتھیار خود کار ضرور تھے مگر ان میں میگزین کی ایک محدود مقدار ہی لوڈ ہو سکتی تھی۔ چھ سات گولیاں اور پھر میدان صاف ہوتا۔

میں نے دوبارہ برآمدے کے سامنے اپنا محفوظ مورچہ سنبھال لیا پھر جونہی میں نے پھٹے ہوئے بانس کے ٹکڑے کو گھما کر برآمدے کے فرش پر پڑے ہوئے قد آدم خودرو پودے کو اوپر اٹھایا، دوبارہ تین کھٹکوں کے ساتھ تین فائر ہوئے اور گولیاں پودے سے گزر کر باہر پھیلے ہوئے اندھیرے میں کہیں دور جا گریں۔

جہاں تک مجھے معلوم تھا، بارودی ہتھیاروں میں پستول اور ریوالور ہی پر سائلنسر استعمال کیا جا سکتا تھا اور ان اسلحوں میں چیمبر ہونے کی وجہ سے گولیوں کی تعداد محدود ہوتی ہے۔ بھاری میگزین یا گولیوں کی پیٹیوں پر انحصار کرنے والے اسلحے کی ساخت نہ صرف بہت بھاری ہوتی ہے بلکہ اس کی آواز پر قابو پانا بھی ناممکن ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے چھ سات فائروں کے بعد برآمدہ خطرات سے عاری ہو جانا چاہیے تھا اور ہوا بھی یہی۔

میں اس قد آدم پودے کو بار بار آگے پیچھے سرکا کر فوٹو سیل کے نظام کو حرکت میں لاتا رہا اور ہر بار گولیاں چلتی رہیں مگر آٹھویں بار ٹریگرز کے کھٹکے ضرور سنائی دیے لیکن کوئی فائر نہیں ہوا۔

اپنے اطمینان کے لیے میں نے مزید دو کوششیں کیں جب ہر مرتبہ [illegible] میں نے پھٹے ہوئے بانس کے ٹکڑے کو کھینچ کر [illegible] کے سرے پر سے پودے کو کھولا اور اجاڑ لان پر پھیلے ہو[illegible] میں پھینک دیا۔ بانس کی لکڑی واپس اس کی جگہ پر ڈ[illegible] تاکہ بعد میں تفتیش کے لیے آنے والے اے۔ ٹو کے ہرکاروں کو یہ معلوم نہ ہو سکے کہ ان کے اسلحے کو کس ترکیب سے [illegible] لیا گیا [illegible]

[illegible] کی موجودگی کے خطرے کے پیش نظر میں نے اپنے چہرے پر [illegible] تھی۔ جب میں نے برآمدے کی [illegible] احتیاطی تجربات سے مطمئن ہو جانے کے باوجود [illegible] غیر معمولی حد تک تیز تھی۔

[illegible] سے برآمدے کے فرش پر پہنچا تو میرا دل [illegible] رہا تھا، پنڈلیوں پر [illegible] سی لرزش طاری ہو چلی [illegible] محسوس وقفوں سے

تقریباً بیک وقت تین ٹرائیگر چلے اور میں آگے بڑھ گیا۔

میں نے برآمدے میں کھلنے والے نسبتاً کمزور دروازے کے ہفضی قفل پر ایک تار کے مڑے ہوئے سرے سے قسمت آزمائی کی اور ایک ڈیڑھ منٹ کی محنت کے بعد تالا کھل گیا۔

میں نے دروازے کے پٹ اندر دھکیلے تو نتھنوں سے عجیب سی بو ٹکرائی جیسے وہ دروازہ مدت دراز سے بند رہا ہو۔ میں نے جھجکتے ہوئے چوکھٹ عبور کر ڈالی، اس وقت میرے اعصاب پر ایک بار پھر تناؤ کی کیفیت طاری ہو چلی تھی۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں دوسری دفاعی لائن کے طور پر اندھیرے میں کوئی نیا شعبدہ میرا منتظر نہ ہو۔

باہر سے روشنی دیکھ لیے جانے کے خوف سے میں نے بلب روشن کرنے کا خطرہ مول نہیں لیا، بس پنسل ٹارچ کی محدود روشنی میں پھونک پھونک کر قدم آگے بڑھاتا رہا۔ پیش قدمی کے ساتھ ہی میں سمتوں کو بھی ذہن نشین کرتا جاتا تھا تاکہ اندھیرے میں اس بھول بھلیاں سے واپسی ممکن ہو سکے۔

ہر طرف سے کھڑکیاں، دروازے بند ہونے کے باعث اندرونی فضا میں گھٹن اور عجیب سی بو رچی ہوئی تھی۔ بیرونی ساخت کی طرح اندر سے بھی وہ مکان بہت شاندار اور پوری طرح آراستہ تھا لیکن قدم قدم پر یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ کافی عرصے سے وہاں کی کوئی چیز انسانی استعمال میں نہیں آئی تھی۔ فرنیچر وغیرہ پر گرد کی باریک سی تہہ جمی ہوئی تھی جو نجانے کہاں سے گزر کر اندر پہنچتی رہی تھی۔ آخر کار قالین اور بیش قیمت فرنیچر سے آراستہ ایک لابی کے گوشے میں مجھے ٹیلیفون انسٹرومنٹ بھی نظر آ گیا۔ میں تیزی سے اسی طرف بڑھتا چلا گیا کیونکہ وہی میری پوری مہم کا مرکز تھا۔

فون کی تپائی کے نیچے تقریباً فون ہی کے سائز کا ایک خوبصورت چوکور ڈبہ رکھا ہوا تھا جس کے اوپر سرخ رنگ کا ایک بلب روشن تھا اور اس سے نکلنے والے تار فون کی ڈبیہ سے منسلک تھے۔ اسے دیکھ کر میرے منہ سے بے اختیار ایک گہرا سانس آزاد ہو گیا۔

ان دنوں کراچی کے بہت سے دفاتر اور گھرانوں میں کارڈلیس، ہینڈ فون رواج پا چکے تھے اور وہ میرے لیے نئی چیز نہیں تھے۔ فون کے ساتھ الیکٹرونک سرکٹ پر مشتمل بکس منسلک کرنے کے بعد ایک مختصر سے لاسلکی فون پر محدود حلقے میں چلتے پھرتے اس نمبر کی کالز ریسیو کرنے کے ساتھ حسب مرضی نمبر بھی ڈائل کیے جا سکتے تھے۔

اس عمارت کی حالت اور فون پر تنے ہوئے مکڑی کے جالوں سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ اس مکان سے فون کی سہولت

ت سے استعمال نہیں کی گئی مگر فون سے منسلک آپریٹس نے یقہ کار واضح کر دیا تھا۔

میں نے اس آپریٹس کی نیم پلیٹ پر درج تفصیلات کا زہ لیا تو پتا چلا کہ اس کا دائرہ کار سو میٹر پر مشتمل تھا۔ اس طلب تھا کہ اے۔ ٹو اس عمارت میں داخل ہوئے بغیر سو ر کے فاصلے پر بآسانی اس نمبر پر آنے والی ہر کال وصول کر سکتا ۔ اس طرح ٹیلیفون تک پہنچ جانے کے باوجود اے۔ ٹو کی ب کشائی ناممکن ہو کر رہ گئی تھی۔ اس نے اپنی ذات کے گرد م حصار کو برقرار رکھنے کے لیے اس قدر پیچیدہ طریقہ اختیار کیا کہ اس تک رسائی کی کوئی بھی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی ۔ اول تو نمبر کے سہارے کی جانے والی ہر کوشش مسز دلدار بھٹی تک پہنچ کر م ہو جاتی اور میں اپنی دانست میں بہت بڑی کامیابی حاصل کے اس مکان تک آ بھی گیا تھا تو یہ اندازہ لگانا دشوار تھا کہ خود ۔ ٹو نے اس ویران عمارت میں قدم بھی رکھا ہو گا۔ عمارت موجود فون سے منسلک آلے کا حیطۂ عمل سو میٹر پر مشتمل تھا یہ ضروری نہیں تھا کہ اس حد میں اے۔ ٹو مستقل طور پر قیام پذیر ۔ مقررہ اوقات میں چلتے پھرتے یا کسی ٹھکانے پر پہنچ کر وہ پیغامات وصول کر سکتا تھا۔

اس ناکامی نے میری ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ تنظیم رازداری کے مرحلے میری توقعات سے کہیں بڑھ کر پیچیدہ اور ار ثابت ہو رہے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ مدت دراز سے یہ ا غیر قانونی کاروبار کامیابی کے ساتھ چل رہا تھا۔

ناکامی کے تکدر اور اشتعال کے عالم میں میں نے بر احتیاط لائے طاق رکھ کر اس فون کا نمبر نوٹ کیا اور پھر بیش قیمت ا صوفے ادھیڑ کر فوم کو دیا سلائی دکھا دی۔

واپسی میں میں نے جا بجا مختلف مقامات پر ساز و سامان ل دکھاتے ہوئے یہ اندازہ کر لیا تھا کہ میری واپسی کے دو اہی گھنٹوں میں پوری عمارت آگ کے فلک بوس شعلوں کی ٹ میں آ جائے گی۔

عمارت ویران اور غیر آباد تھی۔ احاطے کی دیواروں سے اصل ت کا فاصلہ کافی زیادہ تھا لہٰذا اس آگ سے قرب و جوار کے ات کو کوئی نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہیں تھا۔ اس سے پیشتر ے عمارت سے باہر خشک گھاس پھوس تک پہنچتی اس علاقے دوسرے مکین شعلوں کی سرخی دیکھ کر فائر بریگیڈ کو طلب کر تے۔

اے۔ ٹو کی ذات رازداری کے آہنی پردوں میں چھپی ہوئی ن اس اہم عمارت میں آتش زنی اور وہاں سے برآمد ہونے والی لاش اس کے اعتماد کو متزلزل کر سکتی تھی۔

میرا مقصد بھی یہی تھا کہ اسے کسی طاقتور حریف کی موجودگی کا احساس دلا دوں تاکہ بوکھلاہٹ کے عالم میں اس سے غلطیوں کا ارتکاب ہونے لگے اور میں کسی طرح اس کے گریبان پر ہاتھ ڈال سکوں۔

واپسی کے لیے میں نے پھاٹک کی راہ اختیار کی اور تھوڑی ہی دیر بعد ٹیکسی پکڑ کر ہوٹل جا پہنچا۔

غزالہ کمرے میں بے چینی سے میری منتظر تھی۔ اس کے چہرے سے گھبراہٹ اور خوف کے آثار نمایاں تھے۔ میری دستک کے جواب میں اس نے دروازہ کھول کر پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ میرا استقبال کیا تو میں نے فوراً ہی کسی گڑبڑ کے امکان پر سوچنا شروع کر دیا۔

"یہ... یہ بش شرٹ؟ آپ کی تو نہیں ہے یہ؟" اس نے سب سے پہلا سوال یہی کیا تھا۔ وہ لاکھ تعلیم یافتہ اور روشن خیال سہی مگر تھی ایک عورت ہی اور عورتوں کی نگاہیں لباس کے بارے میں ضرورت سے زیادہ حساس ہوتی ہیں۔

میں نے کاغذ میں لپٹی ہوئی خون آلود قمیص ایک طرف اچھال دی "میری قمیص گندی ہو گئی تھی اس لیے بدلنا پڑ گئی، یہ بتاؤ کہ تم واپس کب آئیں؟"

"ابھی آٹھ بجے آئی ہوں" وہ آنکھیں بند کر کے جھرجھری لیتے ہوئے بولی "آج کا تجربہ مجھے مدتوں یاد رہے گا، مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ شاید میں آج آپ تک پہنچ ہی نہ سکوں گی۔"

"تسلی سے مجھے تفصیل بتاؤ۔" میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے کہا "عملی زندگی تصورات سے عموماً بہت زیادہ کٹھن ہوتی ہے، خصوصاً جب واسطہ بڑے لوگوں سے ہو۔"

"ایشین سنڈیکیٹ تو مجھے بہت صاف ستھرا ادارہ محسوس ہوا تھا۔" اس نے ایک کرسی میں بیٹھتے ہوئے کہا "دفتر شاید تین کمروں پر مشتمل ہے۔ باہر دو مرد اور تین لڑکیاں اپنے کاموں میں مصروف تھیں۔ میں نے ان ہی میں سے ایک سے [illegible] اپنا مدعا ظاہر کیا تو تھوڑی دیر کے بعد مجھے دوسرے کمرے میں بھیج دیا گیا۔ [illegible] بہت خوبصورت اور شاندار دفتر تھا اور وہاں بڑی سی سیاہ میز کے پیچھے ایک نرم خو لیکن ادھیڑ عمر شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس کو یہ جاننے کی خواہش تھی کہ مجھے اس دفتر میں کس نے بھیجا [illegible] میں نے اسے بتایا کہ میں ملازمت کی تلاش میں کئی دفاتر سے ہوتی ہوئی اتفاقاً وہاں بھی پہنچ گئی تھی تو اس کے [illegible] اطمینان کے آثار نظر آئے تھے پھر اس نے تعلیم [illegible] میرے ذاتی کوائف کریدنے شروع کر دیے جس [illegible]

ایک گھسی پٹی کہانی تراشنی پڑ گئی۔ ارے کھانا بھی کھایا آپ نے؟" بات کرتے کرتے وہ چونک کر بولی۔

میں کرسی کی پشت گاہ سے سر ٹکا کر مسکرا دیا۔ "روم سروس کو ہدایت دے دو۔"

فون پر ہدایت دے کر وہ دوبارہ بتانے لگی۔ "میں پوری طرح محتاط رہی لیکن میرا خیال ہے کہ وہ میری طرف سے کھٹک گیا تھا۔ اس نے آزمائشی طور پر مجھے ایک لڑکی کے حوالے کر دیا۔ اور میں سارا دن مختلف فائلوں میں بکھرے ہوئے کاغذات کو ترتیب سے یکجا کر کے فائل کرتی رہی۔ سارے ہی کاغذات کا تعلق فرم کے برآمدی کاروبار سے تھا۔ غالباً دنیا کے بیشتر ممالک سے ان کے تجارتی روابط ہیں۔"

"تو اس میں الجھنے کی کیا وجہ تھی، تمھیں تو خوش ہونا چاہیے کہ تمھاری کوشش کامیاب رہی اور تمھیں ایشین سنڈیکیٹ لیمیٹڈ میں جگہ مل گئی۔"

"کھانے کے وقفے کے بعد نصیر خان نے دوبارہ مجھے بلایا تھا۔۔۔"

"نصیر خان کون ہے؟" میں نے اس کی بات کاٹ کر سوال کیا۔

"وہی ادھیڑ عمر شخص۔ باہر کام کرنے والی لڑکیوں سے مجھے معلوم ہوا کہ وہ ادارے کا جنرل منیجر ہے۔ فرم کے ایم۔ ڈی کا کمرہ ہمیشہ خالی رہتا ہے، اسے عملے کے کسی فرد نے کبھی دفتر آتے نہیں دیکھا۔ عملاً نصیر خان ہی سیاہ سفید کا مالک نظر آتا ہے۔ اس وقت وہ اپنے دفتر میں کچھ پی رہا تھا۔ فضا میں رچی ہوئی بُو کی بنا پر مجھے یہ اندازہ لگانے میں دشواری نہیں ہوئی کہ وہ کسی قسم کی وائن پی رہا تھا کیونکہ ڈیڈی بھی کبھی کبھار یہ شوق کرتے ہیں۔ اس نے دوبارہ میری کہانی کا ذکر چھیڑ دیا۔ میں اس سے ایک آدھ جھوٹ بول چکی تھی جسے اس کی جرح کے جواب میں نہ نباہ سکی اور تین بجے کے قریب اس نے خشک لہجے میں مجھے دفتر سے رخصت کر دیا۔"

"کہانی کیا تراشی تھی تم نے؟"

"وہی روایتی سی چڑھتی عمر کی لغزش کی کہانی۔" وہ نظریں چراتے ہوئے خفت آمیز لہجے میں بولی تو اس کا چہرہ گلنار ہو گیا۔

"تفصیل نہیں بتاؤ گی؟" میں نے سگریٹ کا گہرا کش لیتے ہوئے شوخ لہجے میں سوال کیا۔

"میں نے اسے اپنا نام پروین بتایا تھا۔ آبائی شہر پنڈی بتایا تھا۔ شاید یہی میری سب سے بڑی غلطی تھی کیونکہ میرا لب و لہجہ جھوٹ کی چغلی کھا رہا تھا۔ اس نے پنجابی میں ۔۔۔۔۔۔۔۔ دو تین سوال کیے تو میں نے جوابات اردو ہی میں دیے اور اسے بتایا کہ میں ایک شخص کے ہمراہ والدین کو چھوڑ کر خاموشی سے لاہور چلی آئی ہوں۔ پیسے ختم ہونے کے بعد دونوں ہی الگ الگ ملازمت کے لیے مقدر آزمائی کر رہے ہیں۔ اس نے میرا لاہور کا پتا پوچھا تو میں صرف اتنا بتا سکی کہ پرانی انارکلی میں اپنے ساتھی کے کسی عزیز کے گھر مقیم ہوں۔ مکان نمبر وغیرہ مجھے معلوم نہیں۔ دوپہر میں اس نے مجھ سے میرا پنڈی کا پتا معلوم کیا اور میں بوکھلا گئی کیونکہ پنڈی میرے لیے قطعی اجنبی شہر ہے۔ اخبارات میں کبھی پڑھا ہو گا لہٰذا گوال منڈی کا نام لے دیا۔ اس نے لئی نالے کا ذکر چھیڑ دیا، راجہ بازار کے حوالے سے راستہ پوچھنے لگا۔ مکان کا نمبر تو میں نے الل ٹپ بتا دیا لیکن محل وقوع اور راستوں کے بارے میں پے در پے غلطیاں کرتی رہی کیونکہ اس کا رویّہ فوراً ہی بدلنے لگا۔ آخر میں اس نے طنزیہ لہجے میں کہا تھا کہ کسی جوان لڑکی کو اگر اپنے گھر واپسی کا راستہ معلوم نہ ہو تو اسے کسی اجنبی کے ساتھ باہر نہیں نکلنا چاہیے ورنہ وہ راستے کی تلاش میں زندگی بھر بھول بھلیوں میں بھٹکتی رہتی ہے۔"

"تین بجے سے آٹھ بجے تک تم کیا کرتی رہیں؟"

"دفتر سے نکلنے تک سلطان شاہ مجھے کہیں نظر نہیں آیا تھا۔ کسی سواری کی تلاش میں تھوڑی ہی دور گئی تھی کہ گہرے رنگ کی ایک کرولا میرے پاس آ رکی۔ اس میں کوئی اوباش سا آدمی سوار تھا۔ اس نے مجھے میری منزل تک پہنچانے کی پیشکش کی جسے میں نے ٹھکرا دیا۔ اس نے گاڑی ذرا آگے بڑھائی اور انجن بند کر کے میرے راستے میں حائل ہو گیا۔ اس نے دھمکی دی کہ میں خاموشی سے گاڑی میں نہ بیٹھی تو وہ اس بھری پُری سڑک سے زبردستی مجھے اُٹھا لے جائے گا، چند ثانیوں تک اس سے تکرار ہوئی۔ شاید سلطان شاہ نے صورتِ حال دور ہی سے بھانپ لی۔ وہ اچانک نمودار ہوا بھر وہاں بھگدڑ مچ گئی کیونکہ سلطان شاہ نے اسے بری طرح مارنا شروع کر دیا تھا۔ میں تیزی سے علیحدہ ہو کر تماشائیوں میں مل گئی۔ سلطان شاہ بہت بے خوف اور دلیر ثابت ہوا۔ اس نے ذرا سی دیر میں اس شخص کو خاک چاٹنے پر مجبور کر دیا پھر پھرتی سے اسی کی کرولا میں جا بیٹھا، چابی شاید اگنیشن میں موجود تھی۔ اس کے ہاتھ کا اشارہ پاتے ہی میں بھی تیزی سے آگے بڑھی اور کار میں جا بیٹھی۔ اس طرح ہم وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو سکے۔ ایک ویران علاقے میں اس نے گاڑی چھوڑ دی، اس کا خیال تھا کہ گاڑی کی وجہ سے ہم دوبارہ گھیرے جا سکتے ہیں۔ اس نے مجھے فوراً ہوٹل واپس لوٹ کر آپ کی واپسی تک کمرے میں محدود رہنے کا مشورہ دیا مگر میں خوف کے باعث آمادہ نہ ہوئی۔ دوسری طرف کپڑے پھٹ جانے اور خون کے دھبّوں کی وجہ سے وہ دن کے اجالے میں لوگوں کی نظروں میں نہیں آنا چاہتا تھا۔ مجبوراً ہم ویران علاقوں میں بھٹکتے رہے، اندھیرا پھیلنے کے بعد ایک رکشے والے کو روکا تو اس نے سلطان شاہ کا حلیہ دیکھتے ہی اپنے کان پکڑ لیے۔ اس کا کہنا تھا کہ شام کے وقت شہر کے مختلف علاقوں میں پھٹے حال پھرنے والے تین نوجوان گداگروں کو نامعلوم قاتلوں نے گولیاں مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ یہ سن کر میں دہل گئی۔ آخر کار سلطان شاہ نے مجھے تنہا واپس لوٹنے پر آمادہ کر ہی لیا۔"

"اور وہ خود کہاں ہے؟"

"کچھ پتا نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ابھی تک کسی ویرانے میں روپوش ہو۔"

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ روم سروس کا ویٹر کھانا لے کر آیا تھا۔

کھانے کے دوران میں مَیں غزالہ کو اپنی مہم کا حال سناتا رہا اور وہ شدید حیرت کے عالم میں خاموشی سے پوری داستان سنتی رہی۔ میری کلائی کے زخم دیکھ کر وہ بے چین ہو گئی تھی لیکن میں نے ہنس کر اسے کھانے پر توجہ دینے پر مجبور کر دیا۔

"اب تک تو وہ عمارت شعلوں میں گھر چکی ہو گی۔" میرے خاموش ہونے پر اس نے تحیّر زدہ لہجے میں کہا۔

"شاید۔" میں نے آہستگی کے ساتھ کہا۔

"سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ ایک دم کیا ہونے لگا۔" وہ سہمے ہوئے، الجھن آمیز لہجے میں بولی۔ "پہلے ہی راؤنڈ میں تشدد اور خونریزی کا یہ عالم ہے تو ہم کب تک خود کو بچا سکیں گے؟"

"ہمیں فوراً لاہور چھوڑ دینا ہو گا۔" میں نے پُرخیال لہجے میں کہا۔ "اگر نوجوان گداگروں کے قتل کے بارے میں رکشہ ڈرائیور سچا تھا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ سلطان شاہ مار دھاڑ کرنے کے باوجود شناخت نہیں کیا جا سکا۔ گداگروں کے قتل اور سلطان شاہ کے تصادم میں کوئی تعلق ہے تو گداگر شاید اسی کی قامت و جسامت کے رہے ہوں گے اور اس کے ہاتھوں پٹنے والا محض کوئی اوباش شخص نہیں تھا بلکہ وہ تمھارے اغوا کی ایک سوچی سمجھی سازش تھی جسے سلطان شاہ کی مداخلت نے ناکام بنا دیا۔ لاہور میں اب سب سے زیادہ خطرہ تمھارے لیے ہے وہ تمھیں کہیں بھی پہچان لیں گے۔"

بے اختیار اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ "آخر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔" وہ روہانسی آواز میں بولی۔ "میری وجہ سے آپ کے لیے دشواریاں پیدا ہو گئیں۔"

"کسی کام کا آغاز کیا جائے تو دشواریاں آتی ہیں۔ یہی کیا کم ہے کہ اس طرح ایشین سنڈیکیٹ لیمیٹڈ کا کردار کھل کر ہمارے سامنے آ گیا۔" میں نے اس کی دلجوئی کی خاطر کہا۔

"مجھے بہلانے کی کوشش نہ کریں۔" وہ اسی لہجے میں بولی۔ "اس کا کردار تو پہلے ہی سامنے تھا، آپ نے اس کے نمائندے کے طور پر مشرقِ بعید کا طویل سفر کر کے ایشلے ہاؤز والوں سے ہیروئن کی فروخت کا معاہدہ کیا تھا۔"

"وہ غیر اہم بات تھی۔ کسی بھی نام سے تم کاغذات چھپوا سکتی ہو۔ ایشین سنڈیکیٹ والوں کا نام اس کی لاعلمی میں محض شناخت کے لیے استعمال ہو سکتا تھا۔۔۔ سودا کرنے والی پارٹی کوئی اور ہی ہوتی۔۔۔ یہ نہ بھولو کہ رازداری کے معاملے میں یہ لوگ ضرورت سے زیادہ حساس ہیں۔ اے۔ ٹو نے رابطے کے لیے فون کا معاملہ اس قدر پیچیدہ بنایا ہوا ہے کہ کسی کو اس کے بارے میں بھنک بھی نہیں مل سکتی۔"

"اب خطرات سامنے آ ہی گئے ہیں تو پہلی پرواز سے کراچی لوٹ چلیں۔" اس نے ضد کی۔

"اوّل تو میں سلطان شاہ کو نہیں چھوڑ سکتا پھر ہماری روانگی اتنی آسان نہیں ہو گی، ہمارا مقابلہ ایک بڑی تنظیم سے ہے ائیرپورٹ اور ریلوے اسٹیشن پر ان کے آدمی تمھاری تلاش پر مامور ہوں گے۔ ان کی پوری کوشش یہی ہو گی کہ ہمیں لاہور ہی میں گھیر لیا جائے، اس عمارت میں آتش زنی کی خبر پا کر وہ لوگ جوشِ انتقام میں اپنے سارے وسائل دشمن کی تلاش میں جھونک دیں گے۔"

"اور دشمنوں میں وہ صرف مجھے ہی پہچان سکتے ہیں۔" اس نے اداس لہجے میں کہا پھر قدرے سکوت کے بعد بولی۔ "آپ کیسے کہتے ہیں کہ وہ میرے اغوا کی منظم سازش تھی۔"

"سیدھی سی بات ہے۔ نصیر خان نے تمھیں کام میں لگا کر وقت حاصل کیا تھا تاکہ تمھارے بارے میں اپنے اوپر والے کو مطلع کر کے ہدایات لے سکے اور دفتر سے نکلتے وقت تمھاری نگرانی کا بندوبست کرا سکے۔ شاید ایسے کاموں میں وہ اپنے دفتری عملے کو ملوث نہیں کرتا۔ اوپر جو کوئی بھی ہے بہت چالاک ہے کیونکہ اس سے گفتگو کے بعد نصیر خان کا انداز ہی بدل گیا اور بقول تمھارے اس نے تمھارے جھوٹ کا اندازہ لگا لیا لیکن اوپر والا اس سے پہلے تمھیں اٹھوانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ تشدد کے سامنے مضبوط سے مضبوط عورت بھی بہت کمزور ثابت ہوتی ہے۔"

"ہیروئن کی تیاری اور تجارت میں بہت بڑے ہاتھ ملوث ہیں۔" چند ثانیوں کے بعد وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "پولیس اور حکومت کے بہتیرے طاقتور اور با اختیار ادارے بھی مل کر اس پر قابو نہیں پا سکے۔ مجھے تو یہ محسوس ہو رہا ہے کہ ہم نے اس مہم کا آغاز کر کے ہی غلطی کی ہے۔ ہم انھیں تھوڑا بہت نقصان ضرور پہنچا سکتے ہیں لیکن ان کی بیخ کنی ناممکنات میں سے نظر آتی ہے۔"

"حکومت کے جن اداروں کا تم ذکر کر رہی ہو، ان کی ناکامی

کی ٹھوس وجوہ ہیں۔" میں نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "چار چھ ہزار روپے ماہانہ تنخواہ پانے والوں میں کالی بھیڑیں بھی ہوتی ہیں۔ اس کام میں نفع کا تناسب سو گنا کے لگ بھگ ہے۔ جو بھی یہ کام کرتا ہے وہ بھاری رشوتیں اور نذرانے دے کر کالی بھیڑوں کو خرید لیتا ہے اور انسدادِ منشیات کی بہتر سے بہتر حکمتِ عملی بھی دھری رہ جاتی ہے، میں ان کے اندر کا آدمی ہوں، مجھے اندازہ ہے کہ کس طرح ان کا منہ کچلا جا سکتا ہے، تم دیکھو گی کہ ایک دن مجھے ضرور کامیابی ہو گی۔"

"میری بھی یہی آرزو ہے، میرا تو پورا گھرانہ برباد ہوا ہے نشے کے ہاتھوں۔ مجھ سے بڑا، اس کا دشمن کون ہو گا لیکن قتل، خونریزی انتقام اور بارود کی اس برسات میں آپ کب تک ٹھہر سکیں گے؟"

"نہ ٹھہر سکا تو مر ہی جاؤں گا۔" میں نے خوش دلی کے ساتھ کہا۔ "میں سمجھوں گا کہ میں نے اس طرح زندگی بھر کے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا... یہ کیوں بھول رہی ہو کہ فی الحال میں بھی ان ہی میں سے ہوں۔ پہلے چرس تقسیم کراتا تھا اب ہیروئن کا تقسیم کنندہ ہوں اور چاہتے ہوئے بھی ان سے گلو خلاصی نہیں حاصل کر سکتا۔ میری آزادی ان کی تباہی سے وابستہ ہو کر رہ گئی ہے، کب تک میں گھروں کے چراغ گل کر کے اپنا سکھ اور چین برقرار رکھ سکوں گا۔ کیا کامران کی ویران آنکھیں ہر وقت تمھیں نہیں ڈستی رہتیں جب کہ اس کی بربادی میں تمھارا کوئی ہاتھ نہیں ہے لیکن میں جب بھی کہیں کسی نشے کو ترسے ہوئے انسان کو کربناک اذیتوں میں مبتلا دیکھتا ہوں تو بے اختیار میرے وجود پر ملامت کا غبار چھانے لگتا ہے، میں تو کسی قیمت پر بھی اس مہم سے دستبردار نہیں ہو سکتا غزالہ!"

کمرے میں سکوت چھا گیا۔ غزالہ کے پاس میرے دلائل کا کوئی جواب نہیں تھا۔

میں سگریٹ سلگا کر سلطان شاہ کے بارے میں سوچنے لگا۔۔۔ اچانک فون کی گھنٹی نے کمرے میں چھایا ہوا سکوت توڑ دیا۔ غزالہ نے لپک کر ریسیور اٹھا لیا۔

ریسیور کان سے لگتے ہی اس کے چہرے پر حیرت اور مسرت کے آثار نظر آئے تھے۔ چند ثانیوں بعد اس نے کچھ کہے بغیر ریسیور رکھ دیا اور مڑ کر مجھے بتایا کہ سلطان شاہ انٹرکام پر اپنی بخیریت واپسی کی اطلاع دے رہا تھا۔

***

مقابلے میں سلطان شاہ کو بھی معمولی سے زخم آئے تھے لیکن وہ بہت خوش تھا کہ طویل وقفے کے بعد اسے اپنی کسلمندی دور کرنے کا موقع ملا تھا۔ کراچی سے روانگی کے وقت قاسم کے گرگے کی ٹھکائی کو وہ چھیڑ چھاڑ سے زیادہ اہمیت دینے کو تیار نہیں تھا۔

غزالہ کو روانہ کرنے کے بعد وہ کافی دیر تک کسی بھولے بھٹکے شکار کی تلاش میں بھیڑ بھاڑ سے دور بھٹکتا رہا پھر اس نے چاقو کے زور پر ایک راہ گیر کو گھیر ہی لیا۔ اس کی قمیص اتروا کر سلطان شاہ نے خود زیبِ تن کی اور اس بیچارے کی کنپٹی پر ایک جچا تلا ہاتھ جڑ کے اسے بے ہوش کیا یوں وہ ہوٹل واپس آنے کے قابل ہو سکا۔ اپنی خون آلود قمیص کی دھجیاں اس نے راستے میں پھینک دی تھیں۔

اپنی کتھا سنانے کے بعد وہ میری کہانی جاننے کا شائق تھا۔ یوں مجبوراً مجھے ایک بار پھر اپنی کہانی دہرانی پڑی اور اس کی آنکھوں کی چمک لحظہ بہ لحظہ بڑھتی چلی گئی۔

"کاش میں تمھارے ساتھ ہوتا۔ کم از کم اسے اپنے ہی ہاتھوں ہرگز نہ مرنے دیتا۔" میرے خاموش ہونے پر اس نے ملال آمیز لہجے میں کہا۔

"چاہے غزالہ اغوا ہو جاتی۔"

"نہ نہ۔" وہ جلدی سے بولا۔ "میں تمھارے ساتھ جاتا تو بھابی ہوٹل ہی میں رہتی۔ میرے حساب سے تو اس کا باہر نکلنا ہی غلط تھا۔ عورت بہت نازک ہوتی ہے، اس کی تو ہم آخر دم تک حفاظت کرتے ہیں۔ اپنی عورت دشمن کے ہاتھ پڑ جائے تو مقابلے کے بغیر ہی شکست مقدر بن جاتی ہے، پتا نہیں تم بھابی کو ساتھ کیوں لے آئے۔"

اس کے بے لاگ تبصرے نے مجھے شرمندہ کر دیا۔ "یہ اسی کی ضد تھی مگر پہلے ہی تجربے نے اس کا سارا جوش ٹھنڈا کر دیا۔ آج کے واقعہ پر وہ تمھاری بہت احسان مند ہے۔"

"غرق کرو احسان کو۔" وہ اپنی رو میں بولا۔ "اگر وہ اسے لے جانے میں کامیاب ہو جاتا تو تم میری صورت دیکھنے کو ترس جاتے، پٹری پر گردن رکھ کر ہی میں اس بدنامی کا حساب پورا کر سکتا تھا۔" پھر مجھے بولنے کا موقع دیے بغیر اس نے فوراً ہی موضوع بدل دیا۔ "اب آگے کیا ارادہ ہے؟"

"اب ہم پھر اندھیرے میں ہیں، لاہور رکنا اب بیکار ہے۔ ہمیں جلد از جلد کراچی واپس پہنچنا ہے تاکہ وہاں سے ہماری غیر حاضری کا راز فاش نہ ہو سکے۔"

"اور نصیر خان کا کیا ہو گا؟" اس نے سوال کیا۔

"نصیر خان۔" میں چونک پڑا۔ "ہاں۔ اسے بھی دیکھا جا سکتا ہے، بظاہر وہ ایشین سنڈیکیٹ لمیٹڈ کے سیاہ و سفید کا مالک ہے لیکن کسی سے ہدایات ضرور لیتا ہے۔ اس ادارے کے ایم ڈی کی شخصیت بھی بہت پراسرار ہے۔ نصیر خان سے کچھ نہ کچھ معلومات ضرور حاصل ہوں گی۔"

"بس اس کا پتا دے دو، جہاں چاہو گے اسے گھسیٹتا ہوا لے جاؤں گا۔" اس نے کہا۔

میں آہستگی سے ہنس دیا۔ "لاہور میں ہمارا کوئی ٹھکانا نہیں ہے اسے کہاں لے جاؤ گے؟"

"دیکھی جائے گی۔ تم پتا تو بتاؤ اس کا!"

نصیر خان کے پتے کے لیے ایک مرتبہ پھر ٹیلیفون ڈائرکٹری سے رجوع کرنا پڑا۔

وہ بظاہر ہر بکھیڑے سے الگ تھلگ ایشین سنڈیکیٹ لمیٹڈ کا کام چلا رہا تھا لیکن درحقیقت منشیات کی غیر قانونی تجارت میں اس کا کردار کلیدی اہمیت کا حامل تھا۔ ہیروئن کی برآمدی تجارت کے لیے اسی نے ایک آڑ فراہم کی ہوئی تھی اور بظاہر سیدھے سادے تجارتی سودوں میں اس زہر کی آمیزش کیا کرتا تھا۔ منزلِ مقصود پر اس کے گرگے عام تجارتی مال سے ہیروئن الگ کر کے خریداروں تک پہنچا دیتے ہوں گے اور غیر ملکی زرِ مبادلہ میں رقم تنظیم کے حسابات میں جمع ہو جاتی ہو گی۔

نصیر خان کی اہمیت اس اعتبار سے بھی واضح ہو گئی تھی کہ غزالہ نے اس سے ملازمت کے لیے رجوع کیا اور انٹرویو کے دوران اپنی ذات کو شبہات سے بالاتر نہ رکھ سکی جس کے نتیجے میں دفتر سے نکلتے ہی اس کے اغوا کی کوشش کی گئی جو سلطان شاہ کی بروقت مداخلت کی بنا پر ناکام ہو گئی۔

نصیر خان کا پتا حاصل کرنے کے بعد میں نے دوبارہ غزالہ سے رجوع کرنا مناسب نہیں سمجھا اور ہم دونوں پوری تیاری کے ساتھ ہوٹل سے روانہ ہو گئے۔

رات کے ایک بجے وہ رہائشی علاقہ بالکل سنسان پڑا ہوا تھا۔ آبادی درمیانے درجے کے مکانات پر مشتمل تھی اور خاصی حد تک باقاعدہ تھی لہٰذا ہم تھوڑی سی تلاش کے بعد مطلوبہ مکان تک پہنچ گئے۔

یہ غنیمت تھا کہ ٹیلیفون ڈائرکٹری میں نصیر خان کے گھر کا پتا اور فون نمبر ایشین سنڈیکیٹ لمیٹڈ کے ساتھ ہی درج تھا ورنہ عام صفحات میں نصیر خان کے نام سے کم از کم بیس مختلف افراد کے پتے اور فون نمبر درج تھے اور ان سب کی فرداً فرداً جانچ پڑتال کیے بغیر صحیح ٹھکانے پر پہنچنا ناممکنات میں سے تھا۔

دوسری کال بیل کے جواب میں بند دروازے کے عقب میں قدموں کی چاپ سنائی دی پھر ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ "کون ہے؟"

"دروازہ کھولو، نصیر خان کے لیے ایک اہم پیغام ہے۔" میں نے سلطان شاہ کا شانہ دبا کر اتنی دھیمی آواز میں کہا کہ اندر والی میرا جواب سن سکے۔

شاید اس عورت کے لیے اس قسم کا مبہم سا جواب غیر متوقع نہیں تھا کیوں کہ اس نے فوراً ہی دروازہ کھول دیا تھا اور دو نقاب پوشوں پر نگاہ پڑتے ہی اس کی آنکھیں خوف سے پھیلتی چلی گئیں۔ خوف کے باعث غیر ارادی طور پر شاید وہ چیخ پڑتی لیکن سلطان شاہ نے تیزی سے آگے بڑھ کر اس خوبصورت عورت کے دہانے پر مضبوطی سے اپنا ہاتھ رکھ دیا اور اس کے پیچھے میں نے بھی اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا۔

وہ دروازہ کھولتے ہی میرے ہاتھ میں موجود پستول کی جھلک دیکھ چکی تھی لہٰذا اس کی دہشت سے پھٹی ہوئی، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔

"تم نے ذرا بھی آواز نکالی یا کوئی ہوشیاری دکھانے کی کوشش کی تو بے دریغ گولی مار دوں گا۔" میں نے پستول کی نال اس کی گردن سے لگاتے ہوئے سفاکانہ لہجے میں سرگوشی کی اور وہ بے بسی سے سر کو خفیف سی جنبش دے کر رہ گئی کیونکہ اس کا دہانہ بدستور سلطان شاہ کی بے رحمانہ گرفت میں تھا۔

اس اثنا میں میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ عورت صورتحال کی نزاکت سے بخوبی واقف ہو چکی تھی لہٰذا میں نے سلطان شاہ کو اشارہ کیا اور اس نے عورت کو آزاد کر دیا۔ آزادی ملتے ہی اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھیں یوں رگڑی تھیں جیسے اسے اپنی بصارت پر شبہ ہو رہا ہو۔

"نصیر خان کہاں ہے؟" میں نے عورت کے قریب ہو کر سرگوشیانہ لہجے میں سختی سے سوال کیا۔

"اندر، خوابگاہ میں سو رہا ہے۔" اس کے حلق سے خوفزدہ سی منمناتی ہوئی آواز نکلی۔

"گھر میں تم دونوں کے علاوہ اور کتنے لوگ موجود ہیں؟"

"کوئی بھی نہیں۔" وہ میرے ہاتھ میں دبے ہوئے پستول پر نظریں جما کر بے بسی سے بولی۔

"تم سے اس کا کیا رشتہ ہے؟"

"دوستی... میں... مم... میں کبھی کبھار ہی اس سے ملنے آتی ہوں۔"

نصیر خان کا پیشہ کچھ بھی رہا ہو لیکن دوستی کے معاملے میں وہ خوش نصیب تھا۔ پہلے میں نے اس عورت کو بے ہوش کرنے کے بارے میں سوچا لیکن پھر وہ ارادہ ملتوی کر دیا۔

میری رائے میں وہ زندگی اور زندہ دلی سے محبت کرنے والی ایک خوش باش عورت تھی جو عملی زندگی میں سمجھوتوں کی اہمیت سے اچھی طرح واقف تھی لہٰذا اس کی طرف سے کسی چالاکی کا اندیشہ

نہیں تھا۔ وہ اندازہ لگا چکی تھی کہ اس کے روایتی ہتھیار ہم دونوں کے لیے قطعی بے اثر تھے جب کہ میرا پستول کسی بھی لمحے اسے زندگی کی جملہ خوشیوں سے محروم کرنے پر قادر تھا۔

نصیر خان کی خوابگاہ تک اس نے بے چون وچرا ہماری رہنمائی کی جہاں وہ بستر پر پڑا ہوا بے خبر سو رہا تھا۔ سرہانے ایک تپائی پر بوتل اور گلاس کے علاوہ کمرے کی محدود فضا میں الکحل کی بو رچی ہوئی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ اس کمرے میں محفلِ نشاط جمانے کے بعد وہ نشے میں بے سدھ پڑا ہوا تھا۔

اسے بیدار کرنے کے لیے سلطان شاہ کو خاصی محنت کرنا پڑی۔ نصیر خان نشے کے عالم میں یہی سمجھتا رہا کہ اس کے ساتھ والی اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کر رہی تھی۔ وہ بار بار سلطان شاہ کے ہاتھ جھٹک کر کچھ ناقابلِ فہم سے الفاظ بڑبڑاتا اور پہلو بدل کر پھر سو جاتا مگر جب اس کے سر پر ٹھنڈے پانی سے بھرا ہوا جگ انڈیلا گیا تو اس نے ہڑبڑا کر بستر چھوڑ دیا۔

بالوں سے ٹپکتے ہوئے پانی سے گلوخلاصی کے لیے وہ سر جھٹک کر غصیلے لہجے میں کچھ بولا پھر اس کی جھپکتی ہوئی سرخ آنکھیں ہم دونوں پر پڑیں تو اس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

”یہ... یہ کون ہیں نشاط؟“ اس نے ہکلاتے ہوئے تحیر زدہ لہجے میں عورت سے پوچھا۔ اس کی زبان پر بسیار نوشی کے سبب نشے کی لکنت طاری تھی۔

نشاط۔ اس کی زبان سے عورت کا نام سن کر میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ محفلِ نشاط کی ترکیب کا سب سے بہتر استعمال نصیر خان ہی کے ہاتھوں ممکن ہو سکا تھا۔

”تم بے احتیاطی کے مرتکب ہوئے ہو نصیر خان! ہم تمھیں اس کوتاہی کی سزا دینے آئے ہیں لہٰذا جلد از جلد اپنے اوسان یکجا کرلو۔“ میں نے دانستہ مبہم الفاظ استعمال کرتے ہوئے کہا۔

”نن... نہیں۔ مجھ سے کوئی کک... کوتاہی نہیں ہوئی۔“ وہ لکنت آمیز لہجے میں بولا۔ ”تمھیں ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔“

”غلط فہمی اسے ہوئی ہوگی جس کے تم نمک خوار ہو، ہم تو محض حکم کے بندے ہیں، دونوں ہاتھ سر پر رکھو اور بستر سے نیچے آجاؤ۔“ میں نے اسے الجھاتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔

اس کا نشہ تیزی سے ہرن ہو چلا تھا۔ صورتِ حال کی سنگینی نے اس کے دل و دماغ سے سرور کی آخری رمق تک نچوڑ لی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ سر پر رکھے اور بستر سے نیچے آگیا۔ بنیان اور انڈرویئر پر مشتمل لباس میں وہ بہت زیادہ مضحکہ خیز نظر آ رہا تھا۔

”مم... مجھ سے کوئی غلطی نہیں ہوئی، اگر میں چوکنا نہ ہوتا تو وہ مجھے جُل دے کر نکل جانے میں کامیاب ہو جاتی، میں نے اس کے عزائم بھانپ کر اوپر اطلاع دے دی تھی۔ اگر وہ بچ کر نکل گئی تو خالد قصوروار ہے، میرا تو اس میں کوئی قصور نہیں تھا۔“ وہ جلدی جلدی مدافعانہ لہجے میں بولا۔

”ہو سکتا ہے کہ اب تک خالد کا حساب بے باق کیا جا چکا ہو۔“ میں نے اپنی زبانی قلابازی پر کامیابی سے عمل کرتے ہوئے کہا۔ ”ہمارے سپرد صرف تمھارا معاملہ کیا گیا ہے۔“

”تمھاری شناخت؟“ اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ اس کے اوسان قدرے بحال ہو چلے تھے۔

”کوئی نہیں۔“ میں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ ”شاید تمھیں معلوم نہیں کہ جس شخص کے بارے میں سزا کا فیصلہ صادر ہو چکا ہو وہ اپنے ہر اختیار اور حق سے محروم ہو جاتا ہے۔“

”پھر میں مزاحمت کروں گا۔“ اس نے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اسی حالت میں فوراً مرنا چاہتے ہو تو مزاحمت ضرور کرو۔“ میں نے پستول کی نال سے اس کے سراپا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ورنہ میں ذاتی طور پر تنظیم کے چند اصولوں کے خلاف ہوں، ہو سکتا ہے کہ مرنے سے پہلے تمھیں آخری بار اپنی پوزیشن کی وضاحت کا موقع دے دوں۔“

وہ کچھ نہ بولا۔ اس کی آنکھوں میں الجھن کے آثار صاف پڑھے جا سکتے تھے۔

”اگر تمھیں کوئی حکم دیا ہی جا چکا ہے تو تم اس کی تعمیل کے پابند ہو۔“ اس نے قدرے توقف کے بعد زبان کھولی تو اس کے لہجے سے بے اعتباری مترشح تھی۔ ”تم مجھے کیا رعایت دے سکو گے؟“

”تم میرے سامنے اوپر والے سے بات کر سکتے ہو، اس نے اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کرلی تو فون ہی پر مجھے واپسی کا حکم دے سکتا ہے ورنہ میں اپنے کام سے پوری طرح واقف ہوں۔“

اس دوران میں نشاط فرطِ خوف سے دبی دبی سسکیوں کے ساتھ رونے لگی تھی۔ گفتگو گمبھیر ہونے کے ساتھ اس کی رونے کی آواز بھی قدرے بلند ہونے لگی۔

”آواز بند کرو۔“ سلطان شاہ جھلّاتے ہوئے لہجے میں اس پر برسا۔

”تم جو چاہے کرتے رہو لیکن خدا کے لیے مجھے واپس جانے دو۔“ وہ روتے ہوئے خوشامدانہ لہجے میں بولی۔ ”میں وعدہ کرتی ہوں کہ اپنی زبان بند رکھوں گی اور کسی سے ایک لفظ بھی نہیں کہوں گی۔“

”خاموش رہو ورنہ پچھتانے کا موقع بھی نہ مل سکے گا۔“

سلطان شاہ غرایا اور مشینی انداز میں وہ یک بیک خاموش ہو گئی۔ اس دوران میں نصیر خان کی آنکھیں گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

”تمھاری باتیں مجھے کچھ عجیب سی لگ رہی ہیں۔“ آخر وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ اس کی زبان کی لکنت اب ختم ہو چکی تھی اور وہ پوری طرح ہوش و حواس میں نظر آ رہا تھا۔

”کیا عجیب لگ رہا ہے تمھیں؟“ میں نے پوچھا۔

”اس کو یہاں سے ہٹا دو تاکہ میں کھل کر بات کر سکوں۔“ وہ نشاط کی طرف اشارہ کر کے بولا اور اس کی ریل گاڑی ایک بار پھر چل پڑی۔

اس بار وہ نہ صرف رو رہی تھی بلکہ نصیر خان کو برا بھلا بھی کہہ رہی تھی۔ اس کی باتوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ نصیر خان کی شریکِ کار نہیں تھی۔ ان کا تعلق بس محدود سا تھا۔ نشاط کے لیے یہ انکشاف حیرتناک تھا کہ نصیر خان کسی ایسی تنظیم کا رکن تھا جو اپنے آدمیوں کی لغزش پر سزا کے فیصلے سنانے اور نافذ کرنے کا اختیار رکھتی تھی۔

”اسے دوسرے کمرے میں لے جاؤ۔“ میں نے سپاٹ لہجے میں سلطان شاہ سے کہا اور وہ اس کی فریاد پر کان دھرے بغیر اسے وہاں سے نکال لے گیا۔

ان دونوں کے نکل جانے پر لمحہ بھر کے لیے میری توجّہ نصیر خان کی طرف سے ہٹی تھی کہ وہ حیرتناک سُرعت کے ساتھ مجھ پر آ پڑا لیکن بے خبری کے باوجود میرا اضطراری ردِعمل بہت ہی وحشیانہ تھا۔ میں نے ٹرائیگر سے انگلی ہٹا کر آہنی پستول سے اس کے چہرے پر پے در پے ایسی بھرپور ضربیں لگائیں کہ وہ بلبلاتا ہوا پیچھے الٹ گیا۔

وہ اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں دبائے بری طرح تڑپ رہا تھا۔ اس کی انگلیوں کے درمیان سے رسنے والے خون سے ظاہر ہو رہا تھا کہ میرے ہاتھوں اس کا چہرہ ادھڑ کر رہ گیا تھا۔

اسی اثنا میں سلطان شاہ دھینگا مشتی کی آوازیں سن کر نشاط سمیت دوبارہ وہاں آ پہنچا۔

”نہیں۔“ سلطان شاہ کو نصیر خان کی طرف لپکتے دیکھ کر میں نے اسے ٹوک دیا۔ ”اسے میرے ہاتھوں خاصی سزا مل گئی ہے۔ موقع پاتے ہی اس نے مجھ پر حملہ کیا تھا۔“

”اچھا کیا... یہ اسی قابل ہے۔“ نشاط نے نفرت آمیز لہجے میں تبصرہ کیا۔ ”محض کھلونا سمجھ رکھا تھا اس نے مجھے۔“

”سیدھے ہو کر جواب دو میرے سوالات کا۔“ میں نے نصیر خان کی کمر پر آہستہ سے ٹھوکر مار کر کہا۔

”میں تمھارے کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا۔“ اس نے اپنا خون آلود چہرہ اوپر اٹھا کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ اس کا چہرہ خون میں ڈوب کر اس قدر بھیانک ہو گیا تھا کہ نشاط نے جھرجھری لے کر اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

”زبان بند رکھی تو میں چمڑی ادھیڑ کر رکھ دوں گا۔“

”اب مجھ سے کوئی فریب نہیں چلے گا۔ تمھارا ہم لوگوں سے کوئی تعلق نہیں ہے، ہم میں سے جس کو جتنا حکم دیا جائے اسی قدر کام کرتا ہے۔ اپنی مرضی سے احکامات میں ردّوبدل نہیں کر سکتا۔ شاید تم اسی عورت کے ساتھی ہو؟“

”گڈ۔ پھر تمھیں اندازہ ہو جانا چاہیے کہ ہم کسی رو رعایت سے کام نہیں لیں گے۔“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ”صبح کے اخبارات سے تمھیں پتا چلے گا کہ آج کا دن تم لوگوں پر کس قدر بھاری گزرا ہے۔“

اس کی آنکھوں میں بے یقینی سی لہرانے لگی۔ صبح کے اخبارات کا میں نے دانستہ ذکر کیا تھا تاکہ اسے زندگی کے امکانات کی طرف بھی توجہ دلا سکوں اور وہ میرا اشارہ بھانپ گیا تھا لیکن یہ نہیں سمجھ سکا تھا کہ میں واقعی رعایت دینے پر آمادہ تھا یا اسے بہلاوا دے رہا تھا۔

”تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“ آخر زندہ رہنے کی امید اس کی ہٹ دھرمی پر غالب آ ہی گئی۔

”تم براہِ راست کس کو جوابدہ ہو؟“

”اپنی فرم کے ایم۔ ڈی کو۔“ اس نے بلا توقف جواب دیا۔

”اس کا نام اور پتا؟“ میں نے اپنے ہاتھ میں موجود اعشاریہ تین دو کے اسمتھ اینڈ براؤنی کو جنبش دے کر سوال کیا۔

”سب اسے باس ہی کہتے ہیں، کاغذات میں اس کا نام ٹی۔ اے ملک درج ہوتا ہے پتے سے میں واقف نہیں۔“ اس نے بلا جھجک جواب دیا جس کا مطلب تھا کہ وہ سچ ہی بول رہا تھا۔

”اس سے ہدایات کیسے لیتے ہو، اہم کاغذات پر تو اسی کے دستخط ہوتے ہیں، اس کا طریقۂ کار کیا ہے؟“

”مجھے فرم کے ہر معاملے میں پوری آزادی ہے۔ اس کی طرف سے مجھے مختارنامہ ملا ہوا ہے۔ ہر اہم اور غیر اہم کاغذ پر میرے ہی دستخط چلتے ہیں۔ کوئی خاص معاملہ ہو تو وہ خود فون کر لیتا ہے۔“

”تم نے اسے دیکھے بغیر ادارے کی ملازمت کیسے اختیار کرلی؟“

”میں چھ برس سے ہوں۔ مجھے ملازم رکھنے والا میری جگہ ہوا کرتا تھا۔ دو ماہ بعد باس نے فون پر براہِ راست مجھے پورا

چارج سنبھالنے کی ہدایت کی اور مجھے ملازم رکھنے والا اگلے روز ہی مجھے چارج دے کر رخصت ہوگیا۔ ایم ڈی سے براہِ راست ملاقات کی کبھی نوبت ہی نہیں آئی۔ نہ اس کے بعد چارج دینے والا کبھی نظر آیا۔"

"مختار نامہ وغیرہ تم تک کیسے پہنچا؟"

"ایسے معاملات ڈاک کے ذریعے طے پاتے ہیں۔"

"اور تمھیں کبھی یہ طریقۂ کار غیر فطری یا مشکوک محسوس نہیں ہوا؟"

"ہمیشہ ہی شبہات کا شکار رہا ہوں۔ لیکن مجھے خطیر تنخواہ مل رہی ہے، کوئی کسی فعل کے بارے میں باز پُرس نہیں کرتا تو مجھے کیا پڑی ہے کہ اس کا کھوج لگانے کی کوشش کروں؟"

"اور وہ کبھی دفتر نہیں آیا؟"

"کم از کم میرے علم میں نہیں۔" اس نے باوثوق لہجے میں کہا۔

"ہیروئن کی برآمد میں اسی کا ہاتھ ہے؟" میں نے براہِ راست سوال کیا تو اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

"ہیروئن؟ ہرگز نہیں۔ ایشین سنڈیکیٹ دستکاریوں وغیرہ کا برآمدی ادارہ ہے... ہیروئن یا ایسے کسی گندے دھندے سے ہمارا کوئی واسطہ نہیں۔"

سلطان شاہ اس کے قریب کھڑا تھا۔ میرا اشارہ پاتے ہی اس نے نصیر خان کی گردن پر بھرپور ہاتھ رسید کیا اور وہ ہل کر رہ گیا "یہ زیادتی ہے... سراسر زیادتی ہے۔" وہ اپنی گردن سہلاتے ہوئے احتجاج آمیز لہجے میں بولا۔

"سیدھا سادا کام کرتے ہو تو اس لڑکی کے دفتر سے نکلنے کے بعد اسے اغوا کرنے کی کوشش کیوں کی گئی تھی؟" میں نے اہانت آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"کاروباری رقابت....."

وہ اپنی بات پوری نہ کرسکا کیوں کہ اس بار سلطان شاہ نے پوری قوت سے اس کا جبڑا سہلا دیا تھا۔

"صرف سچ سننا چاہتا ہوں۔" میں نے زہریلے لہجے میں کہا "ورنہ یہ یاد رکھنا کہ موت کی آرزو کے باوجود آسانی سے نہ مر سکو گے، تمھارا ایک ایک عضو کاٹ کر الگ کردوں گا۔"

"خدا کے لیے مجھے جانے دو۔" نشاط رو دینے والے لہجے میں گڑگڑائی "یہ سب مجھ سے نہ دیکھا جاسکے گا۔"

"آنکھیں بند کرلینا اپنی۔" سلطان شاہ نے بے رحمانہ لہجے میں کہا۔

"تم لوگ کون ہو؟" آخر نصیر خان نے تھوک نگلتے ہوئے سوال کیا۔

"تمھارے حریف۔" میں نے تیکھے لہجے میں کہا "اب زیادہ دن اس میدان میں تمھاری اجارہ داری برقرار نہیں رہ سکے گی۔ تمھارا باپ صرف اسی لیے بار بار بدعہدی کا ارتکاب کرتا ہے کہ وہ خود پردہ نشین ہے جو مہرے ہمارے سامنے لاتا ہے ان کے پٹ جانے کا اسے ذرا بھی ملال نہیں ہوتا لیکن اب ہم اس چوہے کو اس کے بل سے نکال کر سرِعام رُسوا کریں گے۔"

"اس بارے میں وہ براہِ راست احکام جاری کرتا ہے۔" اس نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

"طریقۂ کار کیا ہوتا ہے؟"

"وہ براہِ راست مجھے فون پر مطلع کرتا ہے کہ فلاں انکوائری میں شوگر کی کتنی مقدار شامل ہوگی۔ اسی کے مطابق دام دیے جاتے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے وہ خاصا خوفزدہ نظر آنے لگا تھا۔

"اس کا مطلب ہے کہ وہ روزمرّہ کی دفتری خط وکتابت سے پوری طرح باخبر رہتا ہے؟"

وہ سر ہلا کر رہ گیا۔

"دفتر میں آنے والی لڑکی کے بارے میں تم نے فون پر کس اوپر والے کو اطلاع دی تھی؟" اسے چند ثانیوں تک سوچنے کی مہلت دینے کے بعد میں نے سوال کیا۔

"اوہ خدایا۔" اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا، اس کے خون آلود چہرے پر کرب میں ڈوبی ہوئی لکیریں ابھر آئیں۔ "میں کس امتحان میں پڑ گیا۔" ایسا معلوم ہورہا تھا جیسے اس کے اعصاب بکھر کر رہ گئے ہوں۔

"جواب دو۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔" میں نے اسے دھمکی دی۔

"اتنا کچھ بتانے کے بعد اگر تم نے زندہ چھوڑ دیا تو وہ مجھے معاف نہیں کرے گا۔ پہلے میں دھوکا کھا گیا تھا، اگر شبہ بھی ہو جاتا تو میری زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلتا۔" وہ شکست خوردہ لہجے میں بولا۔

"یہ اور بھی اچھا ہے۔" میں نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ "ہم خود سے تو اسے بتانے سے رہے کہ ہمیں معلومات فراہم کرنے والے تم ہو۔"

"میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ اسے ہٹا دو۔" وہ نشاط کی طرف اشارہ کرکے بولا "یہ بظاہر میری دوست ضرور ہے لیکن تم ان لوگوں کے طریقۂ کار سے واقف نہیں ہو، ہوسکتا ہے کہ مجھ پر نگاہ رکھنے کی نیت سے میرے قریب آئی ہو۔"

"یہ تمھارا اپنا معاملہ ہے، چاہو گے تو جاتے ہوئے اس کا پتا صاف کردیں گے۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔

وہ ایک بار پھر بلک کر رو پڑی "نن... نہیں مجھے نہ مارنا، میں مرتے دم تک زبان نہیں کھولوں گی۔ میں کسی کی مخبری نہیں کرتی۔ میرا کسی سے کوئی واسطہ نہیں۔"

"ختم کرو۔" میں نے جھلّائے ہوئے لہجے میں نشاط کو ڈانٹا اور وہ سہم کر خاموش ہوگئی لیکن اس کے ہونٹوں کے لرزتے ہوئے گوشے اس کی ابتر حالت کی چغلی کھا رہے تھے۔

"بولو۔" اس بار میں نے نصیر کو ٹوکا۔

"اب اسے دوسرے کمرے میں بھیج دو۔" اس نے گویا ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

"تاکہ تم دوبارہ مجھ پر حملہ کرسکو؟" میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔

"اب کچھ باقی نہیں رہا، مزاحمت کس لیے کروں گا۔" اس کے لہجے میں بے پناہ مایوسی امڈ آئی تھی۔

سلطان شاہ میرے اشارے پر نشاط کو اپنے ہمراہ لے گیا۔

"مجھے کوئی بات ایم ڈی تک پہنچانی ہو تو میں اس نمبر پر رجوع کرتا ہوں۔" تخلیہ ہوجانے پر اس نے ایک فون نمبر دہراتے ہوئے کہا "اس نمبر پر بلیک گن کے کوڈ سے ایک شخص سے بات ہوتی ہے جس کا اصل نام کمال ہے۔ وہ میرا پیغام آگے بڑھا دیتا ہے اور میں نے خط وکتابت کے بارے میں غلط کہا تھا روزمرّہ کی ساری خط وکتابت کی ایک نقل میں شام کو دفتر میں یکجا کرکے اپنی میز پر چھوڑ آتا ہوں۔ اگلی صبح وہ نقول دفتر سے غائب ہوتی ہیں. اگر ان میں کوئی قابلِ ذکر بات ہو تو ایم ڈی مجھے فون پر ہدایات دے دیتا ہے۔"

"یعنی چھٹی کے بعد کوئی دفتر میں داخل ہوتا ہے؟"

"آتا ہی ہوگا ورنہ فوٹو کاپیاں کہاں جاتی ہیں، یہ برسوں سے لگا بندھا معمول چلا آرہا ہے۔" وہ اپنا سینہ رگڑتے ہوئے اداس لہجے میں بولا۔

"اور تم نے اس بارے میں کبھی جاننے کی خواہش محسوس نہیں کی؟"

"شدید خواہش کے باوجود کبھی جسارت نہ کرسکا۔" وہ گہرا سانس لے کر بولا "دفتر کا وقت صبح نو سے پانچ تک ہے۔ مجھے سخت تاکید ہے کہ زیادہ سے زیادہ پانچ بج کر دس منٹ پر دفتر خالی ہوجانا چاہیے اور اگلی صبح نو سے پہلے کوئی بھول کر بھی دوبارہ دفتر کا رُخ نہ کرے ورنہ عبرتناک سزا دی جائے گی۔"

"چوکیدار سے بھی کچھ معلوم نہ ہوسکا؟"

"ڈر لگتا ہے، کہیں وہ بھی بلیک گن کا نمک خوار نہ ہو۔"

"نشاط کا کیا جغرافیہ ہے؟"

"دفتر میں کام کرتی ہے چار سال پہلے شادی ہوئی تھی۔ سات روز بعد شوہر نوکری کے سلسلے میں مشرقِ وسطیٰ چلا گیا۔ وہ بیوی کو بلانے سے کتراتا ہے۔ ہر سال چھٹیوں پر آتا ہے اور بہلاوے دے کر چلا جاتا ہے۔ نشاط کو ضد سی ہوگئی ہے کہ جب تک وہ مستقل طور پر نہیں آئے گا یا اسے اپنے پاس نہیں بلائے گا، وہ نوکری کرتی رہے گی۔ وہ خود کو نہ سہاگن سمجھتی ہے نہ بیوہ۔ بس اسی گھٹن میں گمراہ ہوگئی ہے۔ اس کی ماں کو شاید اپنی بیٹی کے دکھ کا احساس ہے کیونکہ وہ ہفتے عشرے میں ایک آدھ رات کی غیر حاضری پر اس سے کوئی باز پرس نہیں کرتی۔"

"پھر تمھیں اس پر شبہ کیوں ہے؟"

"حالات۔ جن حالات سے میں دوچار ہوں ان میں اپنے سائے سے بھی خوف آنے لگتا ہے۔ پھر یہ تو اس کی کہانی ہے۔ سچ نجانے کیا ہوگا۔"

"تم اپنے موجودہ حالات سے مطمئن ہو؟"

"جب تک تہی دست تھا ساری باتیں بہت سنسنی خیز اور شاندار نظر آتی تھیں۔ اب یکسانیت اور پابندیوں سے اکتا گیا ہوں لیکن نجات کے سارے راستے بند ہیں۔ میں چلتے پھرتے کسی کتے کی موت نہیں مرنا چاہتا۔"

"آئندہ تعاون کرو گے؟"

وہ بے جان انداز میں ہنسا "کرنا ہی پڑے گا۔ پہلے ملازمت کے سلسلے میں بلیک میل ہورہا ہوں اب غداری کے لیے تم ہر وقت دھونس دے سکتے ہو۔"

اس سے تین نام ایک فون نمبر معلوم ہوا تھا جو میں نے اس کی تصدیق کے بعد وہیں نوٹ کرلیا۔ اس کے علاوہ بھی اس سے بہت سی کارآمد باتیں معلوم ہوئی تھیں جن میں اہم ترین یہ تھی کہ ایشین سنڈیکیٹ کی آڑ میں کام کرنے والی خفیہ تنظیم کا کوئی اہم ہرکارہ پانچ بجے کے بعد اس دفتر میں ضرور آتا تھا۔

"تم صورت نہیں دکھاؤ گے اپنی۔" اس نے فرمائش کی۔

"حالات۔" میں نے اسی کے انداز میں دہرایا "دکھانا ہوتی تو چھپانے کی کیا ضرورت تھی ہمیں؟"

پھر میں نے آواز دے کر سلطان شاہ کو بھی وہیں بلا لیا۔

اس کی رائے تھی کہ روانگی سے پہلے ان دونوں کو اچھی طرح باندھ دیا جائے لیکن نصیر خان گڑگڑانے لگا۔ ہماری روانگی کے بعد وہ اپنی حالت درست کرنا چاہتا تھا تاکہ کسی اور کو اس کی بپتا کا علم نہ ہوسکے آخر یہ طے پایا کہ فون کے تار کاٹ کر ان دونوں کو

ایک ایسے کمرے میں بند کر دیا جائے جہاں سے وہ تھوڑی دیر بعد آزاد ہو سکیں۔

انھیں کمرے میں بند کر کے ہم دونوں نے اپنے چہروں سے نقاب آتارے اور پھر نصیر خان کے مکان سے نکل کر اندھیرے میں تیزی سے ایک طرف بڑھ گئے۔

"یہ تو کچھ بھی نہ ہوا۔" کچھ دور نکل آنے کے بعد سلطان شاہ نے کہا۔

"بہت کچھ ہوا۔" میں نے خوش دلی کے ساتھ کہا "ضروری نہیں کہ مار دھاڑ کے بغیر کوئی بڑی کامیابی نہ ہو۔"

"میں تو سمجھ رہا تھا کہ بھابی کے ساتھ ہونے والی زیادتی پر تم اس کی کھال گرا دو گے۔"

"اسے نقصان پہنچا ہوتا تو ضرور یہی کرتا لیکن وہ بعد میں بھی ہمارے کام آتا رہے گا۔ اس سے بہت کارآمد باتیں معلوم ہوئی ہیں۔"

"پھر اب کہاں کا ارادہ ہے؟"

"فی الحال ہوٹل۔" میں نے کہا۔ "ہم غزالہ کو بتلائے بغیر آئے ہیں وہ پریشان ہو رہی ہوگی۔"

وہ ہنسا۔ "عورت کو میں اسی لیے دُم کہتا ہوں۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟"

"دُم کا کوئی مصرف نہیں ہوتا لیکن ہر وقت اس کی فکر ہی کرنا پڑتی ہے۔ بھابی ساتھ نہ ہوتی تو اسی ایک رات میں ہم نجانے کیا کچھ کر گزرتے۔"

"میں تھک گیا ہوں۔ پھر یہ بھی نہ بھولو کہ تمھاری بھابی ہی کی وجہ سے ہم نصیر خان پر ہاتھ ڈالنے میں کامیاب ہو سکے ورنہ میں تو اس دفعہ شاید ایشین سنڈیکیٹ کا رُخ بھی نہ کرتا۔"

وہ معصومانہ شوخی کے ساتھ ہنسا۔ "چلو میں اپنی تصیح کیے لیتا ہوں۔ ساری عورتیں دُم ہوتی ہیں علاوہ بھابی کے۔"

♣

اگلی صبح کے اخبارات کی چنگھاڑتی ہوئی سرخیاں رات کے واقعات سے بھری ہوئی تھیں۔

شہر کے ایک فیشن ایبل اور صاف ستھرے رہائشی علاقے کی ایک عمارت میں ہولناک آتش زنی ہوئی تھی جس کی اطلاع ملنے پر آگ بجھانے والا عملہ جائے وقوع پر پہنچا تو اس مکان کے احاطے سے خون میں لتھڑی ہوئی ایک بھیانک لاش دریافت ہوئی جس کا پیٹ بے رحمی کے ساتھ چاک کر دیا گیا تھا اور مقتول کی آنتیں نیم پختہ زمین پر بکھری ہوئی تھیں۔

آخری اطلاعات آنے تک آگ کے فلک بوس شعلوں پر قابو نہیں پایا جا سکا تھا۔ اخبارات کے اشاعت کے لیے جانے تک عمارت میں سے ہولناک دھماکوں کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا جس کی وجہ سے گرم راکھ، سلگتا ہوا ملبہ اور چنگاریاں دور تک اٹھنے لگی تھیں لہٰذا آگ بجھانے والوں کو پیچھے ہٹنا پڑا جس کے نتیجے میں ان کی کارروائیوں کا اثر کمزور پڑ گیا۔

عینی شاہدوں کے مطابق وہ دھماکے بارودی محسوس ہو رہے تھے اور ان کا تسلسل آتش زدہ عمارت میں بھاری مقدار میں آتشگیر مادّوں کے ذخیرے کی نشاندہی کر رہا تھا۔

دوسری خبر چلتی کار دن سے اندھا دھند فائرنگ کے ذریعے شہر کے مختلف علاقوں میں تین نوجوان گداگروں کے قتل کے بارے میں تھی۔ مقتولین میں کئی باتیں مشترک تھیں۔ وہ نوجوان اور صحت مند تھے، کیونکہ قامت و جسامت کم و بیش یکساں تھی تینوں کے جسموں پر پھٹے ہوئے لباس تھے۔

نامہ نگاروں کے قیاس کے مطابق تینوں وارداتوں کے مجرم ایک ہی تھے کیونکہ ہر واردات ایک ہی انداز میں کی گئی تھی۔ پولیس کی تفتیش جاری تھی لیکن اخبار والوں نے رائے ظاہر کی تھی کہ قاتلوں نے جنون کے عالم میں وہ قتل کیے تھے۔ شاید انھیں اپنے کسی ایسے حریف کی تلاش تھی جس سے وہ خود پوری طرح واقف نہیں تھے لیکن شبہ تھا کہ ان کے مطلوبہ شخص کا حلیہ مرنے والے بدنصیب گداگروں سے ملتا جلتا رہا ہوگا۔ تین مرنے والوں میں سے دو ذہنی طور پر قطعی ناکارہ اور بے ضرر تھے۔ اس بنیاد پر عام رائے یہی تھی کہ وہ تینوں دھوکے میں مارے گئے ورنہ قاتلوں کو تلاش کسی اور ہی کی تھی۔

کسی بڑی پیش رفت کا انحصار لاشوں سے نکالی جانے والی گولیوں کے تجزیے پر منحصر تھا۔ اگر وہ ایک ہی ہتھیار سے چلائی گئی تھیں تو پولیس اپنی ساری کوششیں ایک ہی سمت میں مرکوز کر دیتی ورنہ وہ تین مختلف معاملات تصور کیے جاتے۔

"یہ تو اودھم برپا کرا دیا آپ نے پورے شہر میں۔" غزالہ نے اخبارات ایک طرف ڈالتے ہوئے تحیر آمیز لہجے میں کہا۔

"جب گروہ بند آپس میں ٹکراتے ہیں تو یہی کچھ ہوا کرتا ہے۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"گروہ بند؟" اس نے حیرت سے کہا۔ "آپ کب سے اس زمرے میں آ گئے؟"

"تمھارے ساتھ کراچی چھوڑتے ہی میرا گروہ بن چکا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ ہم صرف تین ہیں اور وہ لاتعداد۔ اور یہ تو ابتدائے عشق ہے، شاید یہ معاملہ کچھ زیادہ ہی سنگین صورت اختیار

کر لے گا۔"

"اس سے زیادہ کیا سنگین ہوگا؟"

"بارودی دھماکوں نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"ہاں۔ یہ تو میں بھول ہی گئی تھی، دھماکوں کا کیا چکر ہے؟"

"وہ یقیناً بارودی دھماکے ہیں، شاید اس عمارت میں اسلحہ اور بارود کے بڑے ذخائر پوشیدہ تھے جو حدّت سے پھٹنے لگے ہیں۔ یہ لوگ بہت گھناؤنے کاموں میں ملوث نظر آتے ہیں۔"

"یعنی اسلحہ بھی بیچتے ہیں؟"

"جو لوگ ہیروئن جیسے سفوف کی سوداگری کرتے ہوں وہ اسلحے کی اسمگلنگ کا خطرہ ہرگز مول نہیں لے سکتے۔ ایک من ہیروئن سے وہ اتنا کما سکتے ہیں جو ٹنوں اسلحے کی اسمگلنگ میں نہیں ملے گا، یہ تو کوئی اور ہی چکر معلوم ہوتا ہے۔"

"مجھے بھی تو کچھ بتائیے نا۔"

"میں نے تمھیں بتایا تھا کہ بین الاقوامی سیمینار کے کھلے اجلاس میں کیا کچھ کہا گیا تھا۔ شاید وہ سب درست ہی تھا۔ ہیروئن ہمارے ملک کے لیے ایک نیا نشہ ہے۔ اس کی مہلک ٹکنالوجی خطیر رقوم صرف کر کے پہلے افغانستان برآمد کی گئی وہاں سے ہیروئن سرحد پار ہمارے گھر پہنچا دیا گیا۔ یہ دراصل ہماری حکومت کے دشمنوں اور غیر ملکی ایجنٹوں کے لیے ایک کھلا انعام ہے جب اے ٹو اور اس کی تنظیم اس انعام سے فیضیاب ہو رہی ہے تو اسے فریقِ ثانی کے مفاد میں بھی کام کرنا پڑے گا۔ مجھے شبہ ہے کہ اس ویران عمارت میں جو اسلحہ آگ کی زد میں آیا ہے کسی مناسب موقع پر یہاں افراتفری اور انتشار پھیلانے کے لیے جمع کیا گیا تھا۔"

"لیکن آپ نے اسے تباہ کر دیا۔" وہ فخریہ لہجے میں بولی۔

"فخر نہ کرو غزالہ! یہ رونے کا مقام ہے۔ تنظیم کے بڑوں کو بھنک بھی مل گئی تو میں زندہ نہ رہ سکوں گا۔ وہ بہت رسوخ کے مالک ہیں، معاشرے میں باعزت مقام رکھتے ہیں۔ سکندر علی تمھیں یاد ہی ہوگا۔ اس دیسی مافیا سے ٹکرانا آسان نہیں ہے۔ اس اسلحے اور ہیروئن کے تعلق کے بارے میں میں جانتا ہوں لیکن پورے ملک میں ہر ایک اسے اسلحے کی اسمگلنگ کا سیدھا سا معاملہ سمجھے گا۔"

"آپ کسی سرکاری ایجنسی کے ذمّہ دار افسر کو اعتماد میں لے سکتے ہیں؟" وہ بولی۔

"اور اس کے چند ہی گھنٹوں کے اندر میری کھوپڑی میں چند تولے پگھلا ہوا سیسہ اتار دیا جائے گا... تم یہ کیوں بھول رہی ہو کہ یہ لوگ تمھارے تصور سے کہیں زیادہ با اثر ہیں۔ ہر حلقے میں اعلیٰ درجے کے محبِ وطن شہری سمجھے جاتے ہوں گے۔ دفتروں کا اپنا لگا بندھا طریقۂ کار ہے سو وہاں معلومات ایک شخص تک محدود رکھ کر کوئی کارروائی نہیں کی جا سکتی۔ فائل بنتی ہے اور بہت سے ہاتھوں سے گزرتی ہے ان ہی میں سے کوئی ہاتھ بکا ہوا ہوتا ہے اور یوں ہر مخلصانہ کوشش ناکام ہو جاتی ہے۔ مجھے راستے سے ہٹانے کے بعد وہ اس وقت تک محفوظ و مامون رہیں گے جب تک ان کی صفوں میں کوئی دوسرا باغی پیدا نہیں ہوتا۔ ان کا نظام تم نے دیکھ ہی لیا کہ پوری کوشش کے باوجود اے۔ ٹو میرے لیے محض ایک خواب بنا ہوا ہے۔"

"مجھے حیرت ہے کہ پھر باقی راز کیسے محفوظ رہتے ہیں؟"

"ہر شخص اپنے مفاد کے پیچھے دوڑتا ہے اس سے آگے ہر ایک، خواہ وہ مجرم ہی ہو، محبِ وطن ہوتا ہے۔ ہیروئن کے سوداگر سمجھ رہے ہیں کہ وہ اپنے مفاد کے لیے کام کر رہے ہیں۔ سازشیں اور بیرونی دلچسپیاں ان کی نگاہوں سے اوجھل ہیں۔ اگر انھیں عقل آ جائے تو شاید وہ آج ہی راہِ راست پر آ جائیں لیکن دولت کی بے پناہ ریل پیل نے ان کی آنکھوں پر پردے ڈال دیے ہیں۔"

"میں نے کسی سے سنا تھا کہ ہماری حکومت منشیات فروشوں پر ظلم کرتی ہے۔ یہ ہمارے ملک کے لیے زرِ مبادلہ کماتے ہیں اور پھر مغرب کی نئی نسل کو نت نئے نشوں کے سرور میں الجھا کر ان سے اپنا صدیوں پرانا انتقام بھی لے رہے ہیں۔" وہ میری گفتگو سے متاثر ہو کر بولی۔

"یہ خام خیالی ہے۔ وہ اپنا سرمایہ غیر ملکوں میں رکھتے ہیں اس کا تھوڑا بہت حصّہ کالا دھن بن کر ملک میں آتا ہے تو معیشت کو استحکام دینے کے بجائے تباہ کرنے لگتا ہے... اور انتقام کی بات کرو تو ذرا کامران کو بھی یاد کر لو، وہ کون سے مغرب کا شہری ہے، اب تو گلی گلی ہیروئن بکنے لگی ہے۔ یہ نشہ مغرب تک تو بعد میں پہنچتا ہے پہلے اپنی گزرگاہوں پر تباہیاں بکھیرتا چلا جاتا ہے اور یہ راستے ہمارے گھروں کے دالان سے گزرتے ہیں۔"

"تو یہ چکر یوں ہی چلتا رہے گا؟" اس کے بشرے پر مایوسی ابھر آئی۔ نجانے کامران کے نام کا اثر تھا یا میری باتوں کا۔

"شاید نہیں۔" میں نے پُر یقین لہجے میں کہا۔ "اب تک ساری کوششیں باہر سے ہو رہی تھیں۔ اب میں اندر سے بیخ کنی پر تُل گیا ہوں۔"

"اے۔ ٹو ہی تنہا تو ہیروئن نہیں بیچتا ہوگا۔"

"چھوٹے موٹے بے شمار لوگ ہیں لیکن میں نے اس تنظیم

کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ اپنے ڈسپلن اور طریقۂ کار کے سبب عملاً وہ منشیات کی دنیا کا بے تاج بادشاہ ہے جس دن وہ تباہ ہوا، سارے خود رو تاجر چوہوں کی طرح اپنے بلوں میں دبک جائیں گے۔"

"نصیر خان بھی اس کی نشاندہی نہ کر سکا۔" وہ تاسف آمیز لہجے میں بولی۔

"وہ تو شاید اے۔ ٹو کے وجود سے بھی لاعلم ہے۔ وہ بہت نچلے درجے کا آدمی ہے لیکن بہت سی کام کی باتیں معلوم ہوئی ہیں اس سے۔"

"ان تین ناموں سے کوئی بات نہیں بنتی؟"

اور میں چونک پڑا۔ "تم نے خوب یاد دلایا۔ تھوڑی سی چھیڑ چھاڑ کا موقع ملا ہے تو اسے ضائع نہیں کرنا چاہیے۔"

"کیسی چھیڑ چھاڑ؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"نصیر خان سے ملنے والے دو نام میرا نشانہ بنیں گے۔" میں ہنستے ہوئے بولا۔ "کمال کا فون نمبر ہے میرے پاس، دوسرے کا نام خالد ہے۔ اس آتش زنی کے سلسلے میں پولیس بہت پریشان ہو گی۔ دو نام میں فراہم کیے دیتا ہوں۔ وہ پکڑے جائیں گے تو اے۔ ٹو کو ضرور تشویش لاحق ہو گی۔"

"لیکن کیسے؟" میری تجویز اس کی سمجھ میں نہ آ سکی۔

"آئی جی کو ایک گمنام فون کیے دیتا ہوں کہ کمال اور خالد کو آتش زنی اور اسلحے کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہے اسی سلسلے میں خالد نے شبہے کی بنا پر تین گداگروں کو ہلاک کیا تھا لیکن ان لوگوں کا مطلوبہ دشمن ان کی نگاہوں سے بچ کر ہتھیاروں کے ذخیرے کو تباہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ پولیس الٹا لٹکا کر تھرڈ ڈگری آزمائے گی تو دونوں ہی بول پڑیں گے چھوٹے مجرموں کا معاملہ ہے لہٰذا اپنے سر سہرا باندھنے کے لیے کوئی مخبری کا ذکر نہیں کرے گا اور اے ٹو بوکھلا کر رہ جائے گا۔"

"واقعی بہت اچھی تجویز ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اس پر پہلے غور نہیں کیا۔"

"یہ کیسے اندازہ لگا لیا تم نے؟"

"اس طرح تو آپ کراچی آنے والی ساری ہیروئن پکڑوا سکتے تھے۔"

"وہ پورا انتظام بہت محفوظ ہے۔ جب تک مال میری یا میرے کسی آدمی کی تحویل میں آنے والا نہ ہو کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ شہر میں کس راستے سے کتنا مال آ رہا ہے۔"

پھر میں اس کے کمرے سے اٹھ گیا۔ میرے پاس وقت کم تھا میں اپنا کام نمٹانے کے بعد جلد از جلد کراچی روانہ ہونا چاہتا تھا تاکہ حالات خراب ہونے سے پیشتر دوبارہ اپنی جگہ سنبھال سکوں۔

◆

سلطان شاہ میری تجویز سن کر جھوم اٹھا۔ "بس ایسے کام ہوتے ہیں تو میرا دل لگا رہے گا، فون کہاں سے کرو گے؟"

"ڈائریکٹری سے نمبر لے کر باہر چلیں گے۔"

"پھر ایک چکر ادھر کا بھی ہو جائے گا۔ اخبار میں تو بڑا دھوم دھڑکا ہے تمہارے کارنامے کا، اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لوں گا۔"

ڈائریکٹری سے آئی جی، ڈی آئی جی اور دو تین دوسرے اعلیٰ افسران کے فون نمبر لے کر ہم ہوٹل سے باہر آ گئے۔ تھوڑے ہی فاصلے پر جنرل پوسٹ آفس تھا۔ میں نے نمبر ڈائل کرنے شروع کیے تو پولیس کے اعلیٰ افسران میں سے کوئی بھی دفتر میں موجود نہیں تھا آخر میں نے ماڈل ٹاؤن پولیس اسٹیشن کا نمبر ملا کر ایس ایچ او کو وہ معلومات فراہم کیں تو اس کا پُر اخلاق لب و لہجہ میرے لیے قابلِ رشک تھا۔

وہ بے چارہ گفتگو کو طول دینے کا متمنی تھا لیکن میں طوالت کے مضمرات سے آگاہ تھا۔ ہمارا ملک لاکھ پسماندہ سہی لیکن پولیس والوں کے مطالبے پر شاید ٹیلیفون والے انھیں اس بوتھ کا سراغ فراہم کر ہی دیتے جہاں سے میں بات کر رہا تھا لہٰذا میں نے کام کی بات پوری کرتے ہی ریسیور کریڈل سے لٹکا دیا۔

اس کام سے نمٹ کر ہم رکشے کے ذریعے جائے واردات کی طرف روانہ ہو گئے۔

میرا خیال تھا کہ رکشا جلی ہوئی عمارت سے چند فرلانگ دور رکوا لیا جائے گا لیکن وہاں تو دور تک راستہ بند تھا، گلیوں میں اور راستوں میں انسانوں کے سر ہی سر نظر آ رہے تھے فضا میں دھواں اور بارود کی تیز بو رچی ہوئی تھی۔

کرایہ ادا کر کے ہم آگے بڑھے تو ایسا معلوم ہوا جیسے سارا لاہور اے۔ ٹو کی سیہ بختی کی ابتدا کا تماشا دیکھنے وہاں اُمڈ آیا ہو۔

رفتہ رفتہ ہجوم ناقابلِ عبور ہوتا چلا گیا لیکن ہم لوگوں کے تبصروں کی پروا کیے بغیر کندھوں اور کہنیوں سے راستہ بناتے آگے پیچھے بڑھتے ہی رہے اور آخر کار وہ عبرتناک منظر نگاہوں کے سامنے آ ہی گیا۔

پوری وسیع عمارت جلنے کے بعد زمیں بوس ہو چکی تھی۔ بعض جگہ ملبہ سطحِ زمین سے بھی نیچے نظر آ رہا تھا ہر طرف سرخ رنگ کے فائر انجن نظر آ رہے تھے اور نیلی وردیوں والے کارکن تیز دھاروں کے ساتھ، کثیف دھواں اگلتے ہوئے ملبے پر پانی پھینک رہے تھے، پولیس کی بھاری نفری نے ملبے کے گرد وسیع گھیرا ڈالا ہوا تھا، اس گھیرے میں بہت سی فوجی گاڑیاں اور وردیاں بھی نظر

آ رہی تھیں۔ شاید اسلحہ اور بارود کی موجودگی کی بنا پر شہری حکام نے فوجی ماہرین کی مدد طلب کر لی تھی۔

میری نگاہیں پُر شکوہ عمارت کے غلیظ ملبے پر جمی ہوئی تھیں مگر کان گرد و پیش کے تبصروں پر لگے ہوئے تھے۔

لوگ جو کچھ کہہ رہے تھے اگر وہ سچ ہی تھا تو قدرت نے میرے ہاتھوں ایک بڑا کام انجام دلوایا تھا۔ لوگوں کے کہنے کے مطابق دھماکوں سے پورا علاقہ لرز اٹھا تھا، دو کمزور مکان گر گئے تھے۔ شیشے تو نجانے کتنے مکانات کے ٹوٹے تھے۔

ہمیں وہاں کھڑے چند ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ اچانک خوابیدہ ملبے میں ایک ہولناک دھماکا ہوا، سیاہ ملبے اور دھویں کی ایک طویل و عریض چادر فضا میں اٹھتی چلی گئی اور مجمع میں بھگدڑ مچ گئی، میں سلطان شاہ کا ہاتھ تھامنے کے لیے پلٹا تو اس کا دور دور تک کوئی پتا نہیں تھا۔

اس بھگدڑ میں سلطان شاہ کو تلاش کرنے کی کوشش حماقت کے مترادف ہوتی لہٰذا میں نے بھی وہ مخدوش جگہ چھوڑ دی، میرے ذہن میں رہ رہ کر یہی سوال چبھ رہا تھا کہ اے ٹو سے تعلق رکھنے والی اس عمارت میں اسلحہ اور بارود کی موجودگی کا کیا مطلب تھا؟

میں نے اسلحہ کی غیر قانونی تجارت کے پہلو پر بہت غور کیا۔ لیکن وہ نظریہ کسی بھی طرح فٹ ہوتا نظر نہیں آیا۔ بات ہر پھیر کر یہیں نظر آتی تھی کہ۔ اے ٹو جیسا محتاط اور منظم آدمی جب ہیروئن کی تھوڑی سی مقدار اسمگل کر کے کروڑوں کا نفع حاصل کرنے پر قادر تھا تو اسے کیا ضرورت تھی کہ وہ اسلحے کی اسمگلنگ کے پُرخطر کام میں ملوث ہوتا۔

بظاہر امکان یہی نظر آ رہا تھا کہ اے۔ ٹو کو اپنی خواہش کے برعکس، کسی دو طرفہ سمجھوتے کے تحت اسلحہ کے معاملات میں ملوث ہونا پڑا ہو گا۔ میں نے بذاتِ خود اس ویران عمارت کا جائزہ لیا تھا لیکن اندرونی حصوں میں کہیں بھی ایسے آثار دریافت کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا جن سے پتا چلتا ہو کہ وہ عمارت کسی کے استعمال میں رہی ہو۔ خاص طور پر فون پر تنے ہوتے مکڑی کے جالے سے تو یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ مہینوں سے کسی شخص نے اس عمارت میں قدم رکھنے کی جرأت نہیں کی تھی۔

اے۔ ٹو جو کوئی بھی تھا، بہت ذہین اور مضبوط اعصاب کا مالک تھا۔ میرے ہاتھوں سکندر علی مارا گیا پھر مٹھا خان نے خودکشی کر لی۔ اس کی حویلی سے فوجی حکام نے ایم۔ ٹی تھری برآمد کر لیا جس کے نتیجے میں بالائی سطح پر مواصلاتی رابطہ بکھر کر رہ گیا لیکن اے۔ ٹو ثابت قدمی کے ساتھ اپنے کام میں مشغول رہا۔

اب لاہور میں اس کے خلاف یک بیک کارروائیوں کا آغاز ہو گیا تھا۔ فون والی ویران عمارت کا رکھوالا میرے خلاف مزاحمت کرتے ہوتے اپنے ہی چاقو سے بُری طرح زخمی ہو کر ہلاک ہو گیا، عمارت کو میں نے نذرِ آتش کر دیا اور اس آتشزنی کے نتیجے میں نہ صرف عمارت خاک ہوئی اور اسلحہ تباہ ہو گیا بلکہ اعلیٰ مقامی حکام بھی اس عمارت سے تعلق رکھنے والوں کی طرف متوجہ ہو گئے ہوں گے۔

دوسری طرف غزالہ ملازمت کی تلاش میں براہِ راست ایشین سنڈیکیٹ لمیٹڈ کے دفتر جا پہنچی، اس ادارے سے یقینی طور پر اے۔ ٹو کے وسیع مفادات وابستہ تھے لہٰذا وہاں کا کرتا دھرتا اجنبیوں کے بارے میں بہت محتاط تھا، غزالہ اسے اپنی طرف سے مطمئن کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی اور نصیر خان نے ایک مشکوک لڑکی کے بارے میں کمال یا بلیک گن کو اطلاع دے دی اور وہ اطلاع یقینی طور پر مختلف مراحل سے ہوتی ہوئی اے۔ ٹو تک ضرور پہنچی ہو گی کیونکہ اس کا نظام ایسا تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح ہر چھوٹی سے چھوٹی بات سے بھی باخبر رہتا تھا۔

پھر غزالہ کے اغوا کی کوشش ہوئی جسے سلطان شاہ کی بے باکانہ مداخلت نے بُری طرح ناکام بنا دیا۔ اس کے ہاتھوں پٹنے والے نے اشتعال کے عالم میں تین ایسے غیر متعلقہ آدمیوں کو سرِعام مروا دیا جو لمبے قد و قامت اور پھٹے ہوئے لباس کی بنا پر سلطان شاہ سے مشابہ تھے۔

پھر ایشین سنڈیکیٹ لمیٹڈ کا عملی سربراہ نصیر خان ہماری زد میں آ گیا۔ وہ اے۔ ٹو سے واقف نہیں تھا لیکن یہ ضرور جانتا تھا کہ وہ جن لوگوں کے لیے کام کر رہا تھا وہ اپنی صفوں میں کسی ایسے آدمی کا وجود برداشت کرنے کے عادی نہیں تھے جس کی وفاداری پر انہیں ذرا بھی شک ہو۔ خود مجھے بھی طارق مرحوم کے معاملے میں اے ٹو کے سنگدلانہ فیصلوں کا تجربہ ہو چکا تھا لہٰذا نصیر خان کی طرف سے مجھے پورا یقین تھا کہ وہ کسی بھی صورت میں میری مداخلت اور راز پرسی کا معاملہ اپنی ذات سے آگے نہیں بڑھنے دے گا۔

اے۔ ٹو کے مفادات پر آخری ضرب لگاتے ہوئے میں نے پولیس کے محکمے کو بھی فریق بنا لیا تھا اور نصیر خان سے ملنے والے دو نام آتش زنی کی واردات کے حوالے سے پولیس تک پہنچا دیے تھے۔ مجھے پورا یقین تھا کہ متعلقہ پولیس افسر نے اپنی فرض شناسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے رات ہی میں دونوں کو دھر لیا ہو گا۔ فون نمبر کے حوالے سے کمال تک رسائی بہت آسان تھی اور خالد غالباً لاہور کا کوئی مشہور غنڈہ تھا۔ انہیں تحویل

میں لیتے ہی پولیس والوں نے اپنے روایتی انداز میں تشدد آمیز بازپرس کا سلسلہ شروع کر دیا ہوگا۔ اب یہ دونوں کی قوتِ برداشت پر منحصر تھا کہ پولیس کی مار کے سامنے کیا کچھ اعترافات کرتے۔

آتش زنی کے معاملے سے وہ واقعی لاتعلق تھے لیکن میں نے اے۔ ٹو کو الجھانے کے لیے پولیس افسر کو یہی بتایا تھا کہ وہ دونوں عمارت کو آگ لگانے والے کی تلاش میں انتقاماً شہر میں قتل و غارتگری کرتے پھر رہے ہیں اور ایسے ہر شخص کو ہلاک کرنے پر تل گئے ہیں جو ان کے مطلوبہ دشمن سے ذرا سی بھی مشابہت رکھتا ہو۔

دیکھنا یہ تھا کہ ان کارروائیوں کا اے۔ ٹو پر کیا اثر ہوتا ہے؟ اے۔ ٹو کے لیے یہ تصور کرنا بھی محال ہوتا کہ ان کارروائیوں کے پس پشت میرا ہاتھ کارفرما ہے۔ خرابی بس یہ تھی کہ غزالہ اس کے آدمیوں کی نگاہوں میں آگئی تھی۔

سارے گورکھ دھندے کی ابتدا اس فون نمبر سے ہوئی تھی جس پر میں مخصوص اوقات میں اے۔ ٹو سے بات کیا کرتا تھا۔ ایم۔ ٹی تھری ہنڈرڈ کا استعمال ترک کرنے کے بعد اس نمبر کی اہمیت بڑھ گئی تھی لیکن عمارت کی تباہی کے بعد وہ نمبر ناکارہ ہوکر رہ گیا تھا۔

واقعات کے تسلسل سے کوئی بھی یہ قیاس نہیں کرسکتا تھا کہ کوئی فون نمبر کے ذریعہ سراغ لگا کر اس عمارت تک پہنچا ہوگا۔ اے۔ ٹو کے زاویہ سے پوری صورتحال کچھ یوں بنتی تھی کہ غزالہ کسی گروہ کی رکن تھی اور وہ گروہ کسی بنا پر اے۔ ٹو کے مفادات کے درپے ہوگیا تھا لہٰذا غزالہ نے ایشین سنڈیکیٹ لمیٹڈ میں ملازمت حاصل کرنے کی کوشش کی جب یہ کوشش ناکام ہوئی تو اس کے ساتھیوں نے رکھوالے کو ہلاک کرکے عمارت کو آگ لگا دی۔ انہیں یا کسی پولیس افسر کو بھی اندازہ ہی نہیں ہوسکتا تھا کہ مرنے والا اپنی بدنصیبی کا شکار ہوا تھا۔

ان حالات میں ہمارا لاہور میں رہنا خطرناک ہوسکتا تھا۔ ایک طرف غزالہ کی شناخت کا خطرہ تھا اور دوسری طرف میری کراچی سے غیر حاضری کا راز فاش ہوجانے کا اندیشہ تھا۔

بھیڑ بھاڑ سے باہر آنے کے بعد میں انارکلی کی طرف روانہ ہوگیا تاکہ غزالہ کے لیے برقع خرید سکوں۔ ہمارے معاشرے میں خواتین میں ٹوپی برقعے یا اسی قسم کے پردے کا رواج بہت تیزی کے ساتھ ختم ہوچلا ہے۔ چند مستثنیات کو چھوڑ کر یہ رواج محض بوڑھی خواتین یا تعلیمی اعتبار سے پسماندہ گھرانوں ہی کی بدولت زندہ ہے جنہیں اس جدید عہد میں بھی اپنی روایات عزیز ہیں

لیکن میری دانست میں عورتوں کے لیے یہ عادت بہت بھلی ہے کیونکہ اس طلسم کدۂ کائنات میں زندگی کے بارے میں رنگ عورت ہی کے دم سے برقرار ہیں جو ہمیشہ سے اسرار کے پردوں میں لپٹی رہی ہے اور عورت کی ذات سے وابستہ یہی اسرار اس کے بارے میں مرد کے جذبۂ شوق کو مہمیز دیتے رہے ہیں۔ ایک اعتبار سے برقع بھی عورت کے وقار میں اضافے کے ساتھ اس کی پراسراریت میں بھی اضافہ کرتا ہے لہٰذا اشتہاری زیب و زینت کے ساتھ کھلے بندوں پھرنے کے بجائے اگر معقول پردہ استعمال کیا جائے تو بہت سے نامعقول تجربات سے گلوخلاصی ہو سکتی ہے۔ میں اس بارے میں اور بھی نجانے کیا کیا سوچتا رہا۔ غزالہ کے سامنے برقع پیش کرنے سے پہلے میں خود کو ذہنی طور پر اس عارضی تبدیلی کے لیے تیار کر رہا تھا۔ ورنہ یہ امکان بھی موجود تھا کہ وہ خطرے کا احساس کرنے کے باوجود برقع پہننے سے انکار کر دے۔

برقع کی خریداری کے بعد میں ہوٹل پہنچا تو سلطان شاہ پہلے ہی وہاں موجود تھا۔

میں سیدھا اسی کے کمرے میں جا پہنچا۔

"تم کہاں رہ گئے تھے؟" دروازہ کھولتے ہی اس نے حیرت کے ساتھ سوال کیا۔

"میں رہ گیا تھا یا تم مجھے چھوڑ کر بھاگ نکلے تھے؟" میں نے اسے غصیلی نگاہوں سے گھورتے ہوئے کہا۔

وہ بے ساختہ ہنس پڑا۔ "بھاگتے ہوئے لوگوں کے ریلے میں پھنس گیا تھا، دھماکوں کے ساتھ ملبہ دور دور تک اڑ رہا تھا۔ اس سے پہلے بھی ملبے کی بوچھاڑ سے کئی تماشائی زخمی ہوچکے تھے۔ اس لیے وہاں بھگدڑ مچی تھی۔"

"ہم اب پہلی پرواز سے کراچی لوٹ رہے ہیں۔" میں نے کرسی سنبھالتے ہوئے کہا۔

"ذرا یہ دیکھ لو۔" اس نے میری بات سنی ان سنی کرکے ایک مقامی اخبار کا یک ورقی ضمیمہ میری طرف بڑھا دیا۔

سرخی دیکھتے ہی میں چونک پڑا۔ موٹے موٹے حروف میں ملک کی تباہی کی ہولناک سازش کا انکشاف موجود تھا اور اس انکشاف کا رشتہ عمارت میں آگ لگنے کی واردات سے جوڑا گیا تھا۔

میں نے سگریٹ سلگا کر جلدی جلدی پوری خبر پڑھ ڈالی۔ متن میں میرے لیے بہت سے دلچسپ نکات موجود تھے۔ لیکن سرخی سے متعلقہ مواد کہیں نظر نہیں آیا بس خبر کے آخر میں ایک سطر میں نامہ نگار نے اس امید کا اظہار کیا تھا کہ اسلحے کی موجودگی کا سلسلہ یقینی طور پر ملک کی تباہی کی کسی ہولناک سازش سے متعلق تھا۔

یہ کوئی نئی بات نہیں تھی سنسنی خیزی کے ذریعہ صحافت کو کامیاب کاروبار بنانے والے ملک بھر میں بالعموم یہی کر رہے تھے ہر خبر کا عنوان ڈھونڈ کر چھاپا جاتا تھا تاکہ قارئین کو سرخیوں میں الجھا کر بوگس متن کا خریدار بنایا جائے۔ بسا اوقات تو یوں بھی ہوتا تھا کہ سرخی کا پوری خبر میں ذکر بھی نہ ہوتا تھا۔

اس ادارے نے شہر کی سنسنی خیز فضا سے فائدہ اٹھانے کے لیے وہ ضمیمہ چھاپا تھا جس میں عام قارئین کے لیے کوئی خاص بات نہیں تھی لیکن میرے لیے بہت سی اہم اطلاعات تھیں۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" مجھے خاموش پاکر سلطان شاہ نے ٹوکا۔

"یہی کہ اس ضمیمے میں کون سی اہم بات چھپی ہے۔" میں نے ہلکے سے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"ساری خبریں پڑھی ہیں یا ایک ہی خبر پڑھ کر مراقبے میں چلے گئے تھے؟" اس نے خوش دلی سے پوچھا۔

اور اس بار میں نے ایک گوشے میں وہ چھوٹی سی اہم ترین خبر دیکھ لی۔

شہ سرخی کے ضمن میں میرے لیے بہت سی اطلاعات موجود تھیں۔ شدید آتش زنی اور پوری عمارت کی بربادی کے باوجود اس کی ملکیت کا کوئی دعویدار سامنے نہیں آیا تھا۔ پولیس شہری اداروں سے رجوع کرنے کے امکانات کا جائزہ لے رہی تھی۔ وہاں سے ملنے والی لاش کی شناخت بھی نہیں ہوسکی تھی۔ پولیس نے شبہ کی بنیاد پر متعدد افراد کو حراست میں لے لیا تھا۔ بقیہ کارروائی کے لیے ملبے میں ہونے والے بارودی دھماکوں کے خاتمے کا انتظار تھا۔ تاکہ آتش گیر مادوں کے فوجی ماہرین ملبے کا جائزہ لے کر اس کے غیر مخدوش ہونے کا اعلان کرسکیں۔ اس کے بعد ہی ملبے وغیرہ کی تلاشی لے کر بچے کھچے آثار کی بنا پر تفتیش کی کارروائی آگے بڑھانی ممکن تھی۔

لیکن چھوٹی خبر میں واضح طور پر دو جانے پہچانے نام درج تھے۔

آتش زنی کی واردات کے بعد پورے شہر کی پولیس حرکت میں آگئی تھی اور ماڈل ٹاؤن پولیس اسٹیشن کے فرض شناس ایس۔ ایچ۔ او نے اپنے خصوصی ذاتی ذرائع سے کھوج نکال کر کمال نامی ایک مشتبہ ملزم کو حراست میں لیا تھا۔ اسی کے ساتھ مذکورہ افسر کو ایک اور نام کا علم ہوا تھا۔ کمال سے بڑی بازپرس کی گئی تو اس نے بوکھلا کر دوسرے ملزم خالد سے اپنے تعلق کا اعتراف کرتے ہوئے اس کی کمین گاہ کی نشاندہی کردی اور اسے بھی فوری طور پر گرفتار کرلیا گیا۔

گرفتاری اور ابتدائی بازپرس کے بعد رات گئے دونوں ملزموں کو حوالات میں بند کر دیا گیا۔ صبح سویرے جب پولیس اسٹیشن پر ذمہ دار افسران موجود نہیں تھے اور نچلے عملے کے اراکین بھی آرام کر رہے تھے، ایک شخص کھانے کا کچھ سامان لے کر تھانے پہنچا اور ملزمان سے ملنے کی خواہش ظاہر کی جسے پہرے پر مامور سپاہیوں نے سختی سے رد کردیا۔

وہ لوگ اچھی طرح جانتے تھے کہ تازہ قیدیوں سے ملاقات کی اجازت خلافِ مصلحت ہوتی ہے۔ عدالت سے جسمانی ریمانڈ حاصل کرنے سے پہلے ہی ملزمان کے بہی خواہوں کو تشدد کا علم ہو جائے تو عدالت سے ریمانڈ لینا دشوار ہوجاتا ہے اس خالص تکنیکی بنیاد پر ملاقات کی تو اجازت نہیں دی گئی لیکن اجنبی کا لایا ہوا کھانا اس پیغام کے ساتھ ملزمان تک پہنچا دیا گیا کہ وہ خاطر جمع رکھیں؛ جلد ہی ان کی ضمانت کرالی جائے گی۔

کھانا کھاتے ہی دونوں ملزموں کی حالت اچانک بگڑنے لگی پہرے دار سمجھے کہ وہ حوالات کا دروازہ کھلوانے کے لیے مکر کر رہے ہیں اور دروازہ کھلتے ہی فرار کی کوشش کریں گے۔ اس سے پیشتر کہ ذمہ دار افسران موقع پر پہنچ کر صورتحال کی سنگینی کا اندازہ لگاتے، دونوں نے چند ہی منٹ میں تڑپ تڑپ کر دم توڑ دیا۔ پولیس مرنے والوں کے لیے کھانا لانے والے کی تلاش میں تھی۔

میں نے گہرا سانس لے کر اخبار ایک طرف ڈال دیا۔

طارق کی ذات سے اے۔ ٹو کو تنظیم کے لیے خطرات لاحق ہوتے محسوس ہوئے تو اس نے سی ون کے ہاتھوں اس کو سنگدلی سے ہلاک کرا دیا۔ اب پھر اس نے وہی حرکت دہرائی تھی۔

مرنے والے اس کے آدمی تھے۔ اسے ہرگز یہ گوارا نہیں تھا کہ اس کا کوئی آدمی پولیس کی نگاہ میں آئے جب کہ کمال اور خالد کو تو پولیس نے گرفتار کر ہی لیا تھا۔ اے۔ ٹو کو خدشہ رہا ہوگا کہ وہ دونوں پولیس کے تشدد کے سامنے ہتھیار نہ ڈال دیں لہٰذا ان کی گرفتاری کی خبر ملتے ہی اس نے دو ٹوک فیصلہ صادر کردیا۔

"صورتحال یک بیک سنگین ہوگئی ہے۔" میں نے تشویش زدہ لہجے میں کہا۔

"لیکن اس طرح تم نے اپنے دشمن کو خود اپنی طرف متوجہ کرلیا ہے۔" سلطان شاہ بولا۔ "شاید وہ سارے نقصانات خاموشی سے برداشت کرلیتا لیکن اپنے دو آدمیوں سے ہاتھ دھونے کا فیصلہ اس نے بڑے دکھ کے ساتھ کیا ہوگا۔"

میں آہستہ سے ہنس دیا۔ "وہ بہت بے درد انسان ہے بہت ٹھنڈے ماتھے کے ساتھ ایسے دو ٹوک اور ظالمانہ فیصلے

صادر کرتا ہے... یہ تم نے کیسے کہہ دیا کہ میں اسے اپنی طرف متوجہ کر بیٹھا ہوں۔"

"اس کے دو خاص آدمی جو پکڑے گئے ہیں۔"

"میں تو ان کے وجود سے بھی لاعلم تھا۔" میں نے اس کی دلیل سن کر پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔ "غزالہ کے معاملے میں وہ سامنے آنے اور کیفرِ کردار کو پہنچ گئے، اس میں میری نشان دہی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ساری توجہ غزالہ کی تلاش پر مرکوز رہے گی، اس کے بارے میں محتاط رہنا ہوگا۔"

"کیوں نہ نصیر خان کا ردِعمل دیکھا جائے۔" سلطان شاہ نے کہا۔ "اب تک تو وہ بھی ان دونوں کے حشر سے باخبر ہو چکا ہوگا۔"

"وہ یقیناً خوف زدہ ہوگا۔" میں نے کہا۔ "اگر کسی کو یہ بھنک بھی مل گئی کہ مرنے والوں کی نشاندہی نصیر خان نے کی تھی تو اس کا انجام بھی مختلف نہ ہوگا۔"

"بات کرلو، آئندہ کے لیے لائن بنی رہے گی۔"

"لیکن اس وقت وہ دفتر میں ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ دفتر کا فون اس کی لاعلمی میں ٹیپ ہوتا ہو، ایسا ہوا تو وہ بے موت مر جائے گا۔" میں نے کہا۔

"گفتگو ترکیب سے شروع کرنا، خطرہ ہوا تو وہ اجنبی بنا رہے گا ورنہ کھل کر بات کرے گا۔" اس وقت سلطان شاہ کا ذہن واقعی خوب کام کر رہا تھا۔

لاہور چھوڑنے سے پہلے ایک بار نصیر خان سے بات کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔

نیچے جا کر میں نے کاؤنٹر کے بجائے ایک طرف لگے ہوئے پبلک فون سے ایشین سنڈیکیٹ لمیٹڈ کا وہ نمبر ڈائل کیا جو میرے قیاس کے مطابق براہِ راست نصیر خان کے پاس ہونا چاہیے تھا۔

دوسری طرف سے حسبِ توقع نصیر خان نے ہی ریسیور اٹھایا۔

"جن آدمیوں نے لڑکی پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تھی، ان کا انجام تم نے دیکھ ہی لیا ہوگا۔" میں نے بدلی ہوئی آواز میں ہلکی سی غراہٹ کے ساتھ کہا۔

"اوہ، تم کون ہو؟" اس کی آواز سے گھبراہٹ مترشح تھی۔

"ہم تک کبھی نہ پہنچ سکو گے، نقابوں کی کوئی شناخت نہیں ہوتی۔"

"پہیلیاں نہ بجھواؤ، کھل کر بات کرو، پتا نہیں تم کن کے انجام کی بات کر رہے ہو؟"

اس کی طرف سے اشارہ مل گیا تھا، پھر بھی میں نے وضاحت مناسب سمجھتے ہوئے پوچھا۔ "تمہیں یقین ہے کہ تمہارا فون ٹیپ نہیں کیا جا رہا۔"

"مطمئن رہو... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

"رات تم نے کماں اور خالد کی نشاندہی کی تھی، میری مخبری پر پولیس نے دونوں کو پکڑ لیا مگر صبح سویرے انہیں حوالات میں زہر دے کر ہلاک کر دیا گیا۔"

"اوہ۔" اس کی تحسین آمیز آواز سرگوشیانہ ہو گئی۔ "تمہیں کیسے علم ہوا؟"

"بازار میں ضمیمہ بک رہا ہے، خرید کر پڑھ لو۔" میں نے کہا۔ "یہ یاد رکھنا کہ تمہاری معمولی سی حماقت یا لغزش تمہیں بھی اس انجام سے دوچار کر سکتی ہے۔"

"میں سمجھتا ہوں، بار بار اسے دہرانے کا کوئی فائدہ نہیں۔" دوسری طرف سے خشک لیکن مدافعانہ لہجے میں کہا گیا۔ "خود میری سلامتی اب اسی میں پوشیدہ ہے کہ تم ہم لوگوں کی گرفت میں نہ آؤ، اسی سلسلے میں میں تمہیں ہوشیار کرنا چاہتا ہوں، وہ لڑکی تمہارے لیے دشواریاں پیدا کر سکتی ہے۔"

"کون لڑکی؟ جو تمہارے ساتھ تھی؟"

"جی نہیں۔" ہلکے سے طنز کے ساتھ کہا گیا۔ "جسے تم نے میرے دفتر میں ملازمت حاصل کرنے بھیجا تھا۔"

"مجھے معلوم ہے، اسے تم ہی نہیں، تمہارے دفتر کے لوگ بھی پہچان سکتے ہیں۔"

"میرا دفتری عملہ ان سب گھپلوں سے لاتعلق ہے لیکن تم ہمارے کام کی نوعیت سے بخوبی واقف ہو میرے دفتر میں ایک ایسا طاقتور اور خودکار کیمرہ خفیہ طور پر نصب ہے جس کے ذریعے میں اپنی میز کی دراز میں لگا ہوا بٹن دبا کر کسی بھی ملاقاتی کی تصویر لے سکتا ہوں اور اس کے فرشتوں کو بھی علم نہیں ہو پاتا۔ ہمیں مشتبہ لوگوں کے بارے میں ہمیشہ محتاط رہنا پڑتا ہے، میرے لیے وہ لڑکی مشکوک تھی اور میں نے اس کی تصویر لے لی تھی۔"

"تم اسے ضائع کر سکتے ہو؟" اس کے انکشاف پر میں نے اپنے وجود میں خوف کی ایک سرد سی لہر سرایت ہوتی ہوئی محسوس کی۔

"دفتر بند ہونے کے بعد جو شخص کاغذات کی فوٹو کاپیاں لے جاتا ہے وہی کیمرے سے فلم بھی لے جاتا ہے وہ فلم کل شام ہی کسی اور کے قبضے میں جا چکی تھی۔ میں نے آج آتے ہی کیمرہ چیک کیا تو اس میں نیا رول موجود تھا۔ اس تصویر کی بنیاد پر وسیع پیمانے پر اس کی تلاش شروع ہو سکتی ہے۔"

"تم کہہ سکتے ہو کہ وہ تصویر کسی اور کی تھی، معاملہ دب جائے گا۔" اس وقت میں حقیقی طور پر ذہنی دباؤ میں آگیا تھا۔ اس

وقت سلطان شاہ کے مشورے پر نصیر خان کو فون کرنا بہت سود مند ثابت ہوا تھا ورنہ میں اس اہم ترین پہلو سے بے خبر ہی رہتا۔

"میرے بس سے باہر ہے۔" ریسیور میں اس کی معذرت خواہانہ آواز ابھری۔ "جب میں نے دفتر سے فون پر کمال کو اس لڑکی کی آمد سے آگاہ کیا تھا تو اسی وقت بیٹھا تھا کہ میں نے لڑکی کی تصویر لے لی ہے۔"

"خیر۔ میں اسے بھی دیکھ لوں گا۔"

اسی وقت برابر والے بوتھ میں ایک عورت آکھڑی ہوئی اور میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

چند ثانیوں تک میں خالی الذہنی کے عالم میں وہیں کھڑا رہا — پھر جب سوچنے سمجھنے کی صلاحیت دوبارہ بحال ہوئی تو میں نے وہیں سے فون پر دوپہر کی پرواز سے اپنی تین نشستیں بک کرالیں ٹکٹ ہمارے پاس موجود ہی تھے کیونکہ کراچی سے میں نے دوطرفہ ٹکٹ خریدے تھے۔

میں نے سلطان شاہ کو نئی اطلاع نہیں سنائی لیکن اسے فوری طور پر ہوٹل چھوڑ کر ائیرپورٹ پہنچنے کی ہدایت کر دی۔ اسے کراچی پہنچنے کے بعد بھی ہم دونوں سے الگ رہ کر تنہا گھر پہنچنا تھا۔

اس سے فارغ ہو کر میں غزالہ کے پاس پہنچا تو وہ مختصر سا سامان سمیٹ کر واپسی کے لیے تیار نظر آئی۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے میری لائی ہوئی تھیلی کو دیکھ کر سوال کیا

"برقع۔" میں نے مختصر سا جواب دیا اسی کے ساتھ میں ناقدانہ نگاہوں سے اس کے خدوخال اور سراپا کا جائزہ لے رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ قدرت نے اسے ایسے بے پناہ حسن اور جسمانی تناسب سے نوازا تھا کہ ایک بار... دیکھنے والا دوبارہ نہایت آسانی سے اسے شناخت کر سکتا تھا۔

"یہ میرا پہلا موقع ہوگا۔" خلافِ توقع اس نے کسی مزاحمت کے بغیر کہا۔ "برقع میں شدید الجھن ہوگی، ہوسکتا ہے کہ چال ہی بدل کر رہ جائے۔"

"مجبوری ہے۔" میں نے شانے اچکا کر کہا۔ "نہ صرف برقع پہننا ہوگا بلکہ کسی سگھڑ بی بی کی طرح نقاب بھی گرائے رکھنی ہوگی، اپنے گھر پہنچنے کے بعد ہی اس سے جان چھوٹ سکے گی۔"

"یہ تو ناممکن ہے۔" وہ احتجاج پر مجبور ہو گئی۔ "جگہ جگہ اتنی ٹھوکریں لگیں گی کہ تماشا بن کر رہ جاؤں گی، یہ میرے بس سے باہر ہے۔"

"سمجھنے کی کوشش کرو، معاملات بہت سنگین ہو گئے ہیں۔ ورنہ میں تمہیں ہرگز مجبور نہ کرتا۔" میں نے نیم ناصحانہ لہجے میں کہا۔

"ضرورت سے زیادہ احتیاط بھی گلے کا ہار بن سکتی ہے۔ اوّل تو آپ ان لوگوں کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دے رہے ہیں، بالفرض ان میں سے کسی نے مجھے پہچان ہی لیا تو میں بھی اسے شناخت کرلوں گی، دفتر میں جن لوگوں نے مجھے دیکھا تھا میں ان سب کو جانتی ہوں۔"

میں ایک گہرا سانس لے کر کرسی کی پشت گاہ سے ٹک گیا۔ "یہی تو سب سے بڑی مشکل ہے۔ نصیر خان کے علاوہ دفتر کا کوئی آدمی اس معاملے میں ملوث نہیں ہے..."

"اور اس مردود کو تو آپ دونوں بھی پہچان لیں گے۔" اس نے میری بات درمیان ہی سے اچک لی۔

"دفتر میں خفیہ کیمرے سے تمہاری تصویر لی گئی تھی۔" ناچار مجھے اس کو بتانا ہی پڑا۔ "ہمارے نصیر خان تک پہنچنے سے بہت پہلے سرِشام ہی وہ فلم کوئی نکال لے گیا تھا۔ اب تک اس کے سیکڑوں پرنٹ بن چکے ہوں گے اور اس تصویر کی بنا پر لے ڈوبنے کے ہرکارے ہر طرف تمہاری بو سونگھتے پھر رہے ہوں گے۔"

حیرت اور خوف سے غزالہ کی غزالی آنکھیں پھیلتی چلی گئیں اور وہ سرسراتی ہوئی خوف زدہ آواز میں بولی۔ "مگر یہ آپ کو کیسے پتا چلا؟"

"میں ابھی فون پر نصیر خان سے بات کر کے آرہا ہوں۔ وہ خود تصویر کی وجہ سے فکرمند ہے ہم لوگ اس ڈوبنے کے ہاتھ آگئے تو اس کی بھی خیر نہیں ہوگی۔"

"اب تو کوئی چارہ ہی نہیں رہا۔" وہ بے جان آواز میں بولی، اس کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ چکا تھا۔

"خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔" میں نے اس کی ہمت بندھائی۔ "بس ذرا محتاط رہنا ہوگا۔"

وہ کچھ نہ بولی، اس کی آنکھیں کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

ڈیو پیکر طیارہ لاہور سے کراچی کے لیے روانہ ہوا تو کم و بیش ساری نشستیں بھری ہوئی تھیں۔ اس بار نہ چاہتے ہوئے بھی ہم تینوں کو برابر برابر نشستیں ملی تھیں لیکن سلطان شاہ ہم دونوں سے بالکل لاتعلق تھا مجھے خوشی تھی کہ وہ کام کے ساتھ اداکاری میں بھی خاصا کامیاب تھا۔

غزالہ کے لیے برقع شدید الجھن کا سبب بنا تھا لیکن ہوٹل کے کمرے میں تھوڑی سی مشق کے بعد وہ ائیرپورٹ روانہ ہوئی تو خاصی سنبھل چکی تھی جیسے۔ یہ جالی دار نقاب گرانے کے بعد وہ سر جھکائے یوں چلی تھی جیسے سورج کی روشنی میں چار دیواری

سے باہر کسی نے اس کا چہرہ نہ دیکھا ہو۔

ایئر پورٹ پر میں نے عقابی نگاہوں سے ہر طرف کا جائزہ لے ڈالا مگر کسی ایسے آدمی کی نشاندہی میں کامیاب نہ ہو سکا جس پر نگرانی کا شبہ کیا جا سکتا۔ جہاز میں سوار ہونے کے بعد مجھے پورا اطمینان ہو گیا کہ ہم لوگ کسی کی نگاہوں میں آئے بغیر لاہور سے نکلنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔

طیارے کے مقررہ بلندی پر پہنچ جانے کے بعد جب حفاظتی بند باندھنے کی روشن ہدایات غائب ہو گئیں تو بند کھلنے کی کھٹا کھٹ میں کئی مسافر نشستوں سے اٹھے اور عقبی سمت میں بڑھنے لگے۔ میں بظاہر بے پروایانہ انداز میں بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا لیکن میری نگاہیں ہر چہرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔

کچھ نوجوان اپنی عادت سے مجبور مسافر لڑکیوں کو تکتے ہوئے گزر رہے تھے لیکن اس بھیڑ میں بھی مجھے کوئی ایسا شخص نظر نہ آ سکا جس پر کسی قسم کا شبہ کیا جا سکتا پھر طیارے کی نشستوں کے درمیان دونوں راہداریوں کے اگلے پچھلے سروں پر سروس ٹرالیاں گردش میں آ گئیں۔

ایک ہوسٹس ٹرالی لیے ہمارے پاس آئی اور مسکراتے ہوئے گرم گرم لنچ ٹرے مسافروں کے سامنے ٹیبل پر لگاتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ لنچ ٹرے رکھتے ہوئے اس نے کونے کی نشست پر موجود غزالہ سے کچھ بات کرنا چاہی تھی لیکن غزالہ کسی شرمیلی عورت کی طرح سکڑی سہمی خاموش بیٹھی رہی۔

ابھی میں اپنے کھانے کی طرف متوجہ بھی نہ ہونے پایا تھا کہ غزالہ ہلکی سی آواز کے ساتھ اچھلی اور ہماری عقبی نشستوں پر کھانا سرو کرنے والی ہوسٹس بے اختیار اس پر جھک گئی۔

غزالہ کے برقع کی ٹوپی اس کے سر سے کھسکی ہوئی تھی۔ اگر اس نے برقع مضبوطی سے تھاما نہ ہوا ہوتا تو یقیناً وہ بے پردہ ہو جاتی۔ ہوسٹس اس کے سامنے جھکی بار بار مشینی انداز میں معذرت کیے جا رہی تھی۔ میک اپ کی دبیز تہہ کے باوجود اس کے چہرے پر خوف کی زردی چھائی ہوئی تھی۔

یہ سب اس قدر دھیمے انداز میں ہوا کہ آس پاس کے مسافر بھی کچھ نہ سمجھ سکے لیکن ہوسٹس کی معذرت اور غزالہ کی غصیلی منمناہٹ سے میں نے یہ اندازہ لگا لیا کہ ایئر ہوسٹس کی کسی غلطی سے غزالہ کے سر سے برقع اترتے اترتے رہ گیا تھا۔

میں کینہ توز نگاہوں سے ایئر ہوسٹس کو گھورنے لگا۔

"سس... سر غلطی سے میرا ہاتھ ان کے سر سے لگ گیا تھا، میں شرمندہ ہوں ــــ" مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر وہ بوکھلائے ہوئے انداز میں ہکلائی پھر میرے جواب کا انتظار کیے بغیر ٹرالی کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"مجھے محسوس ہوا تھا جیسے اس نے دانستہ میرے سر سے برقع اتارنے کی کوشش کی۔" غزالہ میرے کان کے نیچے منمنائی۔ "اگر برقع میری کہنیوں کے نیچے دبا ہوا نہ ہوتا تو وہ کامیاب ہو گئی ہوتی۔"

میں کھانے سے فارغ ہو کر سیدھا فلائٹ کچن میں جا پہنچا جو خالی پڑا ہوا تھا۔ چند منٹ کے انتظار کے بعد مجھے وہی ایئر ہوسٹس راہداری میں آتی دکھائی دی لیکن میری جھلک دیکھتے ہی واپس لوٹ گئی۔ اس نے میرے تحکمانہ اشارے کو واضح طور پر دیکھ لینے کے باوجود نظر انداز کر دیا تھا۔

میں نے غصے میں اس کے پیچھے جانے کا ارادہ کیا لیکن اسے عملی جامہ نہ پہنا سکا، بات بڑھانے کی صورت میں میرے ساتھ غزالہ بھی جہاز کے تمام مسافروں کی نگاہوں کا مرکز بن جاتی۔

چند ثانیوں بعد وہی ایئر ہوسٹس چیف اسٹیورڈ کے ہمراہ فلائٹ کچن کی طرف آتی نظر آئی۔ میں سامنے سے ہٹ کر کچن میں سرک گیا۔

اسٹیورڈ نے آتے ہی ادب کے ساتھ مجھے سلام کیا پھر براہ راست بولنے لگا۔ "میں شرمندہ ہوں جناب۔ مجھے اپنی ندامت کے اظہار کے لیے الفاظ نہیں مل رہے، یہ جینی کی سراسر غلطی تھی جو اس سے اضطراری طور پر سرزد ہو گئی، یہ بے چاری خود اپنے کیے پر نادم ہے۔ دراصل اس کے ساتھ بھی کسی نے شرارت کی تھی۔"

"کیسی شرارت؟" میں دبی دبی آواز میں غرایا۔ "تمہارے یا اس کے دو الفاظ کہہ دینے سے میری کوفت کا ازالہ تو نہیں ہو جاتا۔"

اس نے کچھ کہے بغیر ایک مڑا تڑا کاغذ جیب سے نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔

"سیٹ نمبر چوبیس سی پر برقع میں ایک مرد سفر کر رہا ہے کہیں ہائی جیک نہ ہو۔" اس رقعہ پر جلدی میں گندے اردو رسم الخط میں لکھا ہوا تھا۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات دوسرے حصے میں ملاحظہ فرمائیں